

حميد اختر



علامہ عبد الستار عاصم



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

11 B

حمید اختر



..... مؤلف

علامہ عبدالستار عام

(چیئرمین قلم فاؤنڈیشن انٹرنیشنل)

ناشر

رضویہ ٹرسٹ سنٹرل کمرشل مارکیٹ ماڈل ٹاؤن لاہور

0323-4393422 / 042-35855537 / 042-36175173

111008

جملہ حقوق محفوظ ہیں



اشاعت اول	:	اکتوبر 2012ء
نام کتاب	:	حمید اختر
مرتب	:	علامہ عبدالستار عاصم
ناشر	:	قلم فاؤنڈیشن انٹرنیشنل
سرورق	:	انیس یعقوب
قیمت	:	2000/-

ISBN NO. 789-651-9615-00-4

ملنے کا پتہ:

مقبول ایڈمی

سرکلر روڈ چوک اردو بازار لاہور

انتساب



جناب حمید اختر کی جانشین

صبا و حمید

کے نام

انتساب ثانی

ایڈیٹر روزنامہ ”ایکسپریس“

جناب ایاز خان صاحب

کے نام

فہرست

17	حمید اختر، مختصر رنج، ابتدائی زندگی (تحریر: عامر رحمن محمود)	1
27	کچھ دیں کچھ باتیں (1)	2
32	کچھ دیں کچھ باتیں (2)	3
36	حمید اختر کا کالج دور	4
48	حمید اختر شخصیت اور فکر	5
52	حمید اختر لاہور میں	6
55	جو وہ خوار پرانے تھے	7
59	حمید اختر اور فلمی دنیا	8
65	حمید اختر چلے گئے	9
68	حمید اختر دیں باتیں	10
71	بیاد رفتگاں	11
73	آخری دیدار	12
76	چھوڑ گئے ساتھ	13
80	انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان	14
88	کچھ منشاء اور حمید اختر کے بارے میں	15
92	حمید اختر اور منشاء	16
97	سجاد ظہیر اور حمید اختر کا میدان عمل	17

104	حمید اختر اور تقسیم ہندوستان	18
124	لاہور: حمید اختر اور دیگر مہاجرین احباب	19
133	سجاد ظہیر، حمید اختر اور دیگر ترقی پسند	20
140	کیونسٹ پارٹی کے ترجمان اخبارات اور حمید اختر	21
149	حمید اختر کی دوسری قید	22
156	حمید اختر جیل میں (تیسری بار)	23
160	حمید اختر بے مثال صحافی	24
169	حمید اختر کی شادی	25
173	ترقی پسند صحافت، مارشل لاء اور حمید اختر	26
181	حمید اختر کے اپنے لکھے ہوئے کالم	27
182	حفیظ جالندھری	28
185	سچائی کی تلاش	29
187	اولاد زینہ کے لئے	30
189	یادوں کے جھروکے سے	31
192	جنم بھومی کی طرف	32
194	فیض شناسی	33
196	میری زندگی	34
201	خوش آمدید	35
204	”کہانی ان دنوں کی“ پر تبصرہ	36
207	حمید اختر کا خط بنام وقار احمد	37
208	حمید اختر کی پہلی قید ”کال کوٹھڑی“ سے اقتباسات	38

343	حمید اختر کے لکھے چند افسانے	39
344	آؤ بچو	40
349	پیسے کی کہانی	41
356	ایک ہی بات	42
367	علاج	43
370	مرزا دیر الحسن کیسے مرے	44
385	انجمن ترقی پسند مصنفین بمبئی کے 1946-47 کے چند اجلاسوں کی روداد	45
533	ماخذ احوالے	46

پیش لفظ

برٹنڈرسل کے فلسفہ کے مطابق فلسفی، شاعر اور ادیب دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جن کے فلسفہ کو ان کی ذات سے الگ کر کے دیکھا جاسکتا ہے اور دوسری قسم وہ جن کا فلسفہ خیال اور تصور ان کی زندگی سے معنی پاتا ہے جس کی صداقت ان کی ذات کی صداقت پر منحصر ہوتی ہے۔ حمید اختر اپنے افسانوں اور تحریروں میں جس کردار کو ہیرو بناتے ہیں وہ ان کی اپنی ذات سے عکس پاتا ہے۔ اور یہی چیز حمید اختر کو دوسرے لکھنے والوں اور اکثر ترقی پسندوں سے ممتاز کرتی ہے کہ انہوں نے جو لکھا اپنی ذات کے کینوس پر ہی مصوری کی ہے اپنی تحریروں میں جس کردار کو انہوں نے محبوب کہا ہے وہ کردار وہ خود ہیں۔

جس طرح کہ فیض نے اپنی نظم دو ”عشق“ میں ارضی محبوب کے عشق کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے

آنکھوں سے لگایا ہے کبھی دست صبا کو
ڈالی ہیں کبھی گردن مہتاب میں بانہیں

اور پھر کہا ہے۔

چاہا ہے اسی رنگ میں لیلائے وطن کو
تڑپا ہے اسی طور سے دل اس کی لگن میں

اور پھر۔

اس عشق اور اس عشق پر نام ہے مگر دل
ہر داغ ہے اس دل میں بجز داغ ندامت

فیض کے یہ دونوں عشق الگ نوعیت کے ہیں، لیکن وطن سے عشق کے اظہار میں انہوں نے جو امیجری استعمال کی ہے وہی ہے جو ان کے ارضی محبوب کے لئے وقف ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں محبوب کا تصور ایک اجتماعی شان لئے

ہوئے ہوتا ہے اور فرد کی تجسیم بھی۔

اس فرد کی تجسیم اگر کی جائے تو حمید اختر بنتا ہے۔ حمید اختر نے نکلور کمپ میں اور بعد ازاں پاکستان میں تین بار کی قید میں اور زندگی کے معاشی جبر میں جس طرح اپنی ذات، اپنے کردار کو مثبت، تعمیری اور مصلح رکھا۔ اپنے نظریاتی ساتھیوں کی طرح قیدیں کاٹیں، جیلوں کی صعوبتیں برداشت کیں۔ اور تاحیات قلم کی مزدوری کر کے اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالتے رہے۔ ان کی دنیا داری اور مال و منال سے نفرت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب وہ ہجرت کر کے پاکستان تشریف لائے تو دیگر مہاجرین کلیسوں کے چکر میں پڑ کر اپنے لئے مکان اور جائیدادیں حاصل کر رہے تھے جبکہ یہ اپنی عوام کو سیاسی شعور اور آگاہی دینے کے لئے سیاسی کام میں مصروف تھے انہوں نے نہ تو تقسیم کے وقت کوئی جائیداد بنائی اور نہ ہی بعد میں۔ تادم مرگ بغیر مکان کے ہی رہے آخری دنوں میں وہ اپنی بیٹی صبا حمید کے گھر میں قیام پذیر تھے۔

حمید اختر (مرحوم) ایک اچھے ادیب، کہانی کار، افسانہ نویس ہونے کے ساتھ ساتھ ایک منجھے ہوئے صحافی بھی تھے۔ شروع میں تو انہوں نے ادارہ نویسی بھی کی تھی مگر حالیہ دور میں انہوں نے کالم نویسی شروع کر دی تھی۔ موجودہ دور میں وہ مختلف اخبارات میں کالم لکھ رہے تھے۔ اور مرتے دم تک لکھتے رہے اپنے آخری دنوں میں وہ روزنامہ ”ایکسپریس“ کے لئے کالم لکھتے تھے۔

راقم کی عرصہ 15 سال سے ان سے سلام دعا تھی اور وہ جب بھی ملتے راقم کو اپنے اعلیٰ ترین خیالات سے نوازتے۔ راقم چونکہ عمر اور مرتبہ میں ان سے کافی چھوٹا تھا مگر پھر بھی ان کی نوازشات اور برتاؤ برابری کی سطح پر ہوتا تھا۔ راقم کے مشوروں اور تجاویز پر انہوں نے درجنوں کالم لکھے اور چونکہ راقم کا شعبہ بھی انسانی خدمت ہے اس لئے زیادہ تر کالم انہوں نے راقم کی تجویز پر انسانی حقوق کی بازیابی اور لوگوں کے چھوٹے چھوٹے مسائل پر لکھے۔

حمید اختر مرحوم کے آخری دنوں میں راقم کو اور ان کے دیگر احباب کو معلوم ہو چکا تھا کہ اب انہیں دوا کی نہیں دعا کی ضرورت ہے سو ان کے رب کریم سے زندگی اور صحت کی بے شمار دعائیں کی گئیں مگر شاید ان کا جانا ٹھہر گیا تھا اس طرح ملک اور عوام ایک مخلص قلم کار اور ادیب سے محروم ہو گئے ان کی رحلت دنیائے ادب و صحافت کے لئے ایک حادثہ سے کم نہ تھی جس پر ملک کے تقریباً تمام سرکردہ کالم نویسوں نے ان پر کالم لکھے۔

راقم تصنیف و تالیف کے شعبہ سے بھی وابستہ ہے اس لئے راقم نے یہ اپنا فرض سمجھا کہ ان کی یاد میں ایک کتاب مرتب کی جائے جو ان کے متعلق تمام نہیں تو زیادہ تر معلومات کی حامل ہو۔ لہذا یہ کتاب آپ کے ہاتھ میں ہے۔ اس کتاب میں کوشش کی گئی ہے کہ ان کی اپنی چنیدہ تحاریر بھی شامل کی جائیں ان کے حالات زندگی پر دیگر تحاریر بھی شامل کی جائیں

اور ان کے منتخب افسانے بھی شامل اشاعت ہوں۔ اب مزید فیصلہ قارئین کے ہاتھ میں ہے۔ ان کی پہلی برسی پر ان پر شائع کی جانے والی یہ پہلی کتاب ہے الحمد للہ کہ راقم کو ہی ان پر ان کی وفات کے بعد پہلی کتاب شائع کرنے کا شرف حاصل ہوا ہے جناب ملک مقبول احمد، ایاز احمد خان، ڈاکٹر انور سدید، شہزاد فراموش، محمد شعیب مرزا، رانا محمد آصف، کنول عاصم، شاہد بخاری، فرخ سہیل گوئندی، افتخار مجاز کا مشکور ہوں کہ انہوں نے ہمیشہ کتاب دوستی کو فروغ دینے کیلئے مفید مشوروں سے نوازا ہے اچھے مشوروں سے ہی انسان انسانیت کی معراج حاصل کر سکتا ہے۔ آخر میں مرحوم حمید اختر کی اولاد اور اعزاء کے لئے ڈھیروں دعاؤں کے ساتھ میں یہ اپنی حقیر کوشش نذر قارئین کرتا ہوں۔

عبدالستار عاصم

چیرمین قلم فاؤنڈیشن انٹرنیشنل

0323-4393422

103 اکتوبر 2012ء

بزرگ صحافی ادیب ایکسپریس کے کالم نگار حمید اختر انتقال کر گئے

عمر 87 برس تھی، کینسر کے مرض میں مبتلا تھے، تین بیٹیاں ایک بیٹا سوگوار چھوڑے ہیں

کئی کتابیں تصنیف کیں، نماز جنازہ کل ڈیفنس میں ادا کی جائے گی

لاہور (سیاسی رپورٹر) بزرگ صحافی، ادیب اور روزنامہ ایکسپریس کے کالم نگار حمید اختر گزشتہ روز طویل علالت

کے بعد مقامی ہسپتال میں انتقال کر گئے، وہ کافی عرصہ سے کینسر کے موذی مرض میں مبتلا تھے، عمر 87 برس تھی۔ مرحوم نے

ٹی وی آرٹس صبا پرویز سمیت تین بیٹیاں ایک بیٹا سوگوار چھوڑا ہے۔ مرحوم لدھیانہ میں پیدا ہوئے، ترقی پسند تحریک میں

انہوں نے شاندار خدمات انجام دیں اور قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرتے رہے۔ ان کے ساتھیوں میں فیض احمد

فیض، ساحر لدھیانوی، سبط حسن خاص طور پر شامل تھے۔ مرحوم کئی کتابوں کے مصنف تھے جن میں ”آشنائیاں کیا

کیا“ اور ”کال کوٹھڑی“ قابل ذکر ہیں۔ مرحوم کی نماز جنازہ منگل کو ڈیفنس میں ادا کی جائے گی۔

17 اکتوبر 2011ء

بزرگ صحافی حمید اختر کی نماز جنازہ آج ادا کی جائے گی

نماز جنازہ جامع مسجد ڈی بلاک ڈیفنس میں ہوگی۔ صدر، وزیراعظم کا اظہار افسوس

وفات سے اردو ادب کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا: اہل قلم

لاہور (شو بزر رپورٹر، کامرس رپورٹر) بزرگ، صحافی، ادیب، دانشور اور انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان کے

سیکرٹری جنرل حمید اختر کا جنازہ آج سہ پہر چار بجے ان کی رہائش گاہ BB 52 ڈی ایچ اے لاہور سے اٹھایا جائیگا، نماز

جنازہ بعد از نماز عصر جامع مسجد ڈی بلاک ڈیفنس میں ادا کی جائے گی اور تدفین بھی ڈیفنس کے قبرستان میں ہی ہوگی، ان کی

وفات کی خبر عام ہوتے ہی ادیبوں، شاعروں اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے عہدیداروں اور اہل قلم کی بڑی تعداد اظہار

تعزیت کیلئے انکی رہائش گاہ پر پہنچ گئی، صدر، وزیراعظم، نواز شریف، شہباز شریف، عمران خان، شجاعت اور دیگر سیاسی

رہنماؤں، ادیبوں، شاعروں اور اہل قلم نے ان کی وفات پر گہرے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے اسے صحافت اور ترقی پسند

ادب کیلئے بہت بڑا نقصان قرار دیا ہے، افسانہ نگار انتظار حسین نے کہا کہ انکی وفات سے اردو ادب کو بہت بڑا نقصان پہنچا

ہے، پرائیڈ آف پرفارمنس اظہر جاوید نے کہا کہ حمید اختر جیسا صحافی، ادیب اور اچھا دوست ملنا بہت مشکل ہے، انہوں نے افسانہ نویسی، صحافت، فلم کے میدان میں جس قدر ٹھوس کام کیا اس کی مثال نہیں ملتی، رشید مصباح نے کہا کہ حمید اختر ان شخصیات میں سے تھے جو حالات سے کبھی مایوس نہیں ہوتے تھے، وہ تادم مرگ اپنے نظریات سے وابستہ رہے، انجمن کے صوبائی سیکرٹری عابد حسین عابد نے کہا کہ ان کی کئمنٹ ترقی پسندی کے نام پر انتشار پھیلانے والوں کیلئے مشعل راہ تھی، آصف اے شیخ نے کہا کہ ان کی وفات سے ترقی پسند ادب کو بہت نقصان پہنچا ہے، سلیمہ ہاشمی نے کہا کہ حمید اختر صاحب جہاں علم و ادب کی بڑی شخصیت تھے وہیں انکا مزاج بھی بہت اعلیٰ تھا، وہ اکثر محفلوں میں ہو جانے والی تلخ کلامی کو ختم کرنے کیلئے ایسی بات کر دیتے کہ ماحول، منٹوں میں تبدیل ہو جاتا، مشکلات اور جسمانی تکالیف سے بے خوف اپنے مقصد کیلئے کام کرتے تھے، اصغر ندیم سید نے کہا کہ حمید اختر نے اپنے نظریات کی خاطر بہت سی مالی قربانیاں بھی دیں اور جیل بھی کاٹی، انہوں نے بہت اچھی زندگی گزاری اور کبھی اپنے نظریات اور اقدار کا سودا نہیں کیا، اداکار قوی خان نے کہا کہ حمید اختر گفتگو کرتے تو میں خاموشی سے سنتا رہتا، ان کا جو حلقہء احباب تھا وہ ایسے لوگوں پر مشتمل تھا کہ میں اس مقام کے خود کو قابل نہیں سمجھتا تھا، بھارت کے معروف شاعر و نغمہ نگار گلزار نے کہا کہ حمید اختر کا تعلق ترقی پسند تحریک سے رہا اور انہوں نے اس تحریک کی کامیابی کیلئے جو کاوشیں کیں ان کو سلام پیش کرتا ہوں، انکی تحریر کردہ کتابوں اور یادداشتوں کے ذریعے ان سے پورا تعلق رہا، جب بھی میری شبانہ اعظمی سے ملاقات ہوتی اور ہم ماضی کے جھروکوں میں جھانکتے ہوتے تو عموماً حمید اختر صاحب کی بات بھی ضرور کرتے، ایک آدھ مرتبہ میرے دوستوں نے ان سے فون پر میری بات بھی کروائی۔ وہ بہت خوش مزاج شخص تھے، شاعر و نغمہ نگار جاوید اختر نے کہا کہ حمید اختر میرے والد کے دوستوں میں سے تھے، ان کے ساتھ بیٹے لمحے بہت اچھے رہے، دل چاہتا تھا کہ ان کی باتیں گھنٹوں سنتے رہیں، ان کی کتابیں اور یادداشتیں ایک اہم ورثہ ہے۔

18 اکتوبر 2011ء



حمید اختر پر

لکھے گئے کالم

حمید اختر، مختصر تاریخ، ابتدائی زندگی

تحریر انا عامر رحمن محمود 27 ستمبر 2012ء

انسان کی شخصیت بنانے میں اس کے باپ دادا کے جینز حتیٰ کہ آدم سے لے کر اس کے باپ تک کے جینز کا فرما ہوتے ہیں۔ اس حقیقت کے علاوہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انسان کی پیدائش کے بعد اس کے گھریلو حالات، اس کا رہن سہن، تہذیب و تمدن اور معروضی حالات بھی کارفرما ہوتے ہیں۔ معروف ادیب، دانشور، مصنف، کالم نویس اور ترقی پسند سیاسی ورکر حمید اختر مرحوم کی ذات کردار اور نفسیات کو بنانے میں ان کے ماحول و حرکات کا بھی کافی دخل ہے۔ آئیے ان کے حالات زندگی کا جائزہ لیتے ہیں کہ آیا ان کے معروضی حالات نے انہیں مخلص سیاسی کارکن بنایا یا ان کی تعلیم و تربیت نے ان پر اپنے انمٹ نقوش رقم کئے۔

پنجاب کے ضلع لدھیانہ کا ایک چھوٹا سا قصبہ 'تھاڑا' تاریخ میں ہمیشہ اس لیے زندہ رہے گا کہ یہاں حمید اختر پیدا ہوئے تھے۔ پیدائش کے وقت ان کا نام اختر علی رکھا گیا لیکن انہوں نے حمید اختر کے نام سے شہرت پائی۔ خود ان کی اپنی بیان کردہ روایات کے مطابق "ان کی والدہ کا نام بیگم اور والد کا نام رحمت علی تھا۔ آباؤ اجداد کی نسبت سے رحمت علی کا تعلق پیروں کے سادات خاندان سے تھا، جن کا سلسلہ عہد وسطیٰ کے مشہور صوفی بزرگ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی سے جا ملتا ہے۔" (بحوالہ حمید اختر، ترقی پسند تحریک کی نمائندہ آواز)

یہ تعلق حمید اختر کے لیے بجا طور پر قابل فخر رہا ہوگا لیکن انہوں نے اسے کبھی اپنی وجہ شہرت بنانے کی کوشش نہیں کی۔ حالیہ برسوں میں ان پر تحقیقی کام میں اس نسبت کا نمایاں طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ (مقالہ وجہہ طارق سے اقتباس) خود حمید اختر نے اس بارے میں جو کچھ بتایا ہے اس کے مطابق "ان کے بزرگوں نے تین پشتوں سے نہ معلوم کیوں اس فیصلے کا اعلان کر دیا کہ ان کی اولاد اپنے خاندانی نسب کو ظاہر نہیں کرے گی۔" روایت یہ تھی کہ ان کے دادا مرحوم کی روحانی قوت کسی چیلنج میں ظاہر ہو گئی تھی۔ اس کے فوراً بعد وہ انتقال کر گئے مگر یہ وصیت بھی کر گئے کہ ان کی آنے والی نسلیں پیری

مریدی کا خاندانی پیشہ ترک کر کے خود محنت کر کے کمائیں اور کھائیں۔ چنانچہ ان کے والد اور تایا اور پھر ان کی اولاد کام پر لگ گئی۔ یہ بھی فیصلہ تھا کہ نام کے ساتھ سید نہیں لکھیں گے۔ (نازیہ بخاری "حمید اختر ترقی پسند ادبی تحریک کی نمائندہ آواز" سے اقتباس)

حمید اختر کے اپنے لفظوں میں:

"ہمارا خاندان پیری مریدی سے وابستہ تھا مگر دادا جان نے وصیت کی کہ آئندہ کوئی پیری مریدی نہیں کرے گا اور نہ ہی سید کہلائے گا۔

ایک اور مقام پر انہوں نے یہ بات قدرے تفصیل سے کی ہے:

"میرے والد اور تایا کی نسل تک ہمارا گزارہ پیری مریدی سے ہوتا تھا ہماری زمینوں پر مزارع ہوتے تھے۔ ہم خود کوئی کام نہیں کرتے تھے۔ روایت ہے کہ ہمارے دادا نے مرتے وقت وصیت کی تھی کہ اب پیری کے ذریعے کمائی کا سلسلہ بند کر دیا جائے اور نہ ہی نام کے ساتھ سید لکھا جائے۔ لہذا میرے والد اور تایا نے سرکاری ملازمت اختیار کر لی۔۔۔۔" (انٹرویو شہلہ نرگس)

اپنی پیدائش اور خاندان کے حوالے سے انہوں نے ہمیشہ اختصار سے کام لیا۔ ان سے جتنی بار گفتگو ہوئی وہ دو چار جملے کہہ کر آگے بڑھ گئے گویا ان باتوں کی کوئی اہمیت ہی نہ ہو۔۔۔ "عزت ساوات" کے تقاضے سے بڑے بڑے ترقی پسند بھی نہیں بچ سکے۔ لیکن حمید اختر کے لیے شاید اس سے زیادہ اہم بات 'عزت' کر رہی ہے۔۔۔ یہی وہ متاع بے بہا ہے جو زندگی بھر ان کی شخصیت کا حصہ رہی ہے۔

حمید اختر ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو اپنے بارے میں بات کرتے ہوئے جھجکتے ہوں۔ ان سے کئی بار تفصیلی گفتگو ہوئی ہے۔ ممبئی کا قیام، تقسیم اور نکودرکیمپ کے واقعات، پاکستان پہنچنے کے بعد کی صورت حال، ترقی پسند تحریک اور کمیونسٹ پارٹی کے ساتھ گہری وابستگی، داستان اسیری، اپنی بعد کی زندگی کے واقعات، غرض آپ نے جو بھی موضوع چھیڑا، اس پر کھل کر بات کی۔ صرف بات ہی نہیں کی بلکہ اپنی یادداشتوں کے درجن بھر سلسلوں میں بھرپور انداز میں تمام حالات و واقعات پر روشنی ڈالی۔ تاہم اپنی پیدائش، بچپن اور ابتدائی زندگی کے بارے میں وہ سرسری انداز میں گزر گئے۔ آپ سے تفصیلات جاننے کے لیے مزید سوالات کیے گئے تو وہ ایک آدھ بات کا اضافہ کر کے آگے بڑھ گئے۔ انہوں نے خود بھی جو کچھ لکھا، اس میں بعد کے واقعات کی تفصیل تو ہے لیکن ابتدائی زندگی کے بارے میں معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں۔

اس کے تین اسباب ہو سکتے ہیں۔ جب وہ صرف تین سال کے تھے تو ان کے والد انتقال کر گئے۔ گھر کی ذمہ

دارپوں کا تمام بوجھ والدہ پر پڑ گیا۔ والدہ نے انہیں حفظ قرآن کے لیے مدرسے میں داخل کرادیا۔ شاید اس دور کی تلخیوں کا ذکر ان کے لیے مشکل رہا ہو لیکن اگر یہی سبب ہوتا تو وہ تقسیم کی ہولناکیوں سے بھی صرف نظر کر جاتے۔ دوسرا سبب یہ ہو سکتا ہے کہ وہ خاندانی تقاضے سے قطعاً متاثر معلوم نہیں ہوتے۔ تیسرا سبب غالباً قرین قیاس اور سب سے اہم ہے۔۔۔۔۔ اگر بعد کی زندگی کے بارے میں انہوں نے تفصیلی گفتگو کی ہے تو وہ ”دوسروں“ کے بارے میں زیادہ ہے اور اپنے بارے میں کم۔ گویا ان کی اپنی ذات، کبھی بھی ان کی گفتگو کا محور و مرکز نہیں رہی۔ ان کے بیان کردہ واقعات میں سارے کردار خارجی ہیں۔ اپنا ذکر صرف اس لیے آگیا کہ وہ ان واقعات کے چشم دید گواہ اور راوی ہیں۔۔۔۔۔

ابتدائی زندگی

انہوں نے جو کچھ بھی بتایا ہے اس سے ان کے آغاز و ارتقاء پر مناسب روشنی پڑتی ہے۔۔۔۔۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اپنے والد کی وصیت کے مطابق ان کے تایا اور والد نے سرکاری ملازمت اختیار کر لی۔ خاندان میں کام کرنے کی اس سے پہلے کوئی روایت نہ تھی چنانچہ انہیں اس میں یقیناً مشکلات پیش آئی ہوں گی۔ حمید اختر کے تایا، جو فارسی زبان پر عبور رکھتے تھے، محکمہ پولیس میں تھانیدار کی ملازمت اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔ ان کے والد ریاست فرید کوٹ میں پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ (پی ڈبلیو ڈی) کے محکمے سے وابستہ ہو گئے۔۔۔۔۔ حمید اختر کی والدہ، جن کا نام بیگم تھا، بھی اپنے بچوں کے ساتھ فرید کوٹ منتقل ہو گئیں۔ ان کے بچوں نے وہیں تعلیم حاصل کی۔ حمید اختر کے بڑے بھائی جعفر علی تعلیم میں بہت ہوشیار تھے لیکن والد کی علالت کے باعث، تعلیم ادھوری چھوڑ کر محکمہ تار میں ملازم ہو کر لاہور چلے آئے۔ دوسرے بھائی اصغر علی نے بھی میٹرک کر کے ریلوے میں ملازمت کر لی۔ اپنے بھائیوں کے اس ایثار کو حمید اختر نے ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ (احمد سلیم کی حمید اختر سے گفتگو، نازیہ بخاری، مقالہ ص۔ 4 محمد راشد علی خان، مقالہ ص۔ 1)

حمید اختر کے تین بھائی اور دو بہنیں تھیں۔ دو بھائیوں کا ذکر ہو چکا ہے۔ تیسرے بھائی، صفدر علی بعد ازاں بجلی کے محکمے میں ملازم ہوئے۔ حمید اختر سب سے چھوٹے تھے۔ ان کی دونوں بہنیں دو بڑے بھائیوں کے بعد پیدا ہوئیں۔ ان کے تمام بہن بھائی اپنے اپنے اعتبار سے کامیاب زندگیاں گزار کر اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔

حمید اختر صرف تین سال کے تھے جب ان کے والد انتقال کر گئے۔ یہ عمر کسی یادداشت کی متحمل نہیں ہو سکتی لیکن نازیہ بخاری سے اپنی گفتگو کے مطابق انہیں ”والد کی ایک دھندلی سی شکل یاد ہے جب والد کو غسل دیا جا رہا تھا، تب کسی نے انہیں گود میں اٹھا کر والد صاحب کا چہرہ دکھایا تھا۔ وہ وجیہ شکل و صورت کے تھے۔“ (مقالہ وجیہ طارق)

حمید اختر کی والدہ، جو ایک گھریلو خاتون تھیں، نے اس موقع پر جس بلند حوصلگی، صبر اور استقامت کا مظاہرہ کیا،

حمید اختر اس کا ذکر بہت محبت اور احترام سے کرتے ہیں۔ گھر میں غربت کے سائے منڈلا رہے تھے۔ ان کی خودداری ان کا عزم ان کا استقلال یہ سب خوبیاں بظاہر عام سی بات لگتی ہیں لیکن ایک گھریلو خاتون پر جب چھ بچوں کا بوجھ آن پڑے تو خودداری ایک طرف رہ جاتی ہے اور صبر و استقلال دوسری طرف۔ ایسے میں ان کی والدہ نے تنگی و ترشی کو ترجیح دی لیکن کیا اپنے کیا غیر کسی کے آگے نہ ہاتھ پھیلا یا نہ مدد کی پیشکش قبول کی۔ حمید اختر اپنی والدہ کے بارے میں ایسے ہی ایک واقعے کا ذکر کرتے ہیں جس سے اس خاتون کے کردار کی پختگی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

”جب والد کا انتقال ہوا، گھر میں نقد ایک روپیہ تک نہ تھا۔ والدہ کا زیور والد کی بیماری کی دوران پک گیا تھا۔ تائی کے پاس تیس چالیس تو لے سونے کے کڑے تھے۔ انہوں نے والدہ کو دیے کہ یہ لے لیں بعد میں واپس کر دیجیے گا۔ انہوں نے لینے سے انکار کر دیا۔ بچوں نے کہا جب بعد میں آپ نے واپس ہی کر دینے تھے تو ضرورت کے وقت لے لیتیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ زندگی میں وہ (تائی) کبھی بھی احسان جتا سکتی تھیں کہ اُس وقت ہم نے مدد کی تھی۔ خوددار بہت تھیں۔۔۔۔“ (مقالہ وجیہ طارق)

بڑے بھائی کی ملازمت، گھر کی سبزیوں اور اجناس سے حاصل ہونے والی آمدنی، والدہ کی کفایت شعاری، ان سب کو ملا کر گھر کا گزارہ چلتا تھا۔ ہر مہینے بڑے بھائی کی طرف سے دس روپے کا منی آرڈر آ جاتا جو گھر کی بنیادی اور اہم آمدنی تھی۔ تنگی کے باوجود انہوں نے بچوں کو کسی محرومی کا احساس نہ ہونے دیا۔ ننھے حمید اختر کی غذائی ضروریات کا وہ خاص طور پر خیال رکھتی تھیں۔ کم آمدنی والے گھرانوں میں عام طور پر محرومی کا احساس پایا جاتا ہے۔ چڑچڑاپن، بچوں کے درمیان لڑائی جھگڑے، دنیا جہان کی شکایتیں اور مقدر سے شکوہ لیکن اس گھر میں ایسا کچھ نہ تھا اور یہ سب ان کی والدہ کی ہمت اور صبر و استقامت کے سبب ممکن ہو سکا۔ بہن بھائیوں کے درمیان محبت کا رشتہ بہت مضبوط تھا۔ (گفتگو حمید اختر، احمد سلیم)

والدہ کی مستقل مزاجی

ان کی والدہ ایک دیندار خاتون تھیں۔ بیوہ ہونے کے بعد انہوں نے اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کو حافظ قرآن بنانے کا فیصلہ کیا۔ بڑے بچے پہلے سے اپنے عام تعلیمی سلسلے کا آغاز کر چکے تھے۔ بڑا بیٹا والد کے انتقال کے بعد اپنی تعلیم سے دستبردار ہو کر ملازمت اختیار کر چکا تھا۔ میٹرک کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد دوسرے بیٹے نے بھی یہی کہا۔

حمید اختر کو گھر کے پیچھے واقع مدرسے میں داخل کر دیا گیا تاکہ انہیں حافظ قرآن بنایا جاسکے۔ یہ مدرسہ کبھی خود ان کے بزرگوں نے قائم کیا تھا۔ ان کے اپنے لفظوں میں ”بظاہر اس کی کوئی ضرورت نہ تھی، سوائے اس کے کہ انہیں کسی

نے بتا دیا تھا، حافظ قرآن کی سات پشتیں بخشی جاتی ہیں۔ (گفتگو حمید اختر، احمد سلیم) انہیں افسوس صرف سات پشتوں کی محرومی کا تھا۔ اپنی عاقبت کی کبھی فکر نہ کی۔

مدرسے کا تجربہ ان کے لیے تلخ ثابت ہوا لیکن اپنے اندر تلخی پیدا کرنے کی بجائے انہوں نے اسے بھی اپنے سماجی شعور کے حصول کا ذریعہ بنا لیا۔ استاد کی مار آگے چل کر ان کے لیے ایک سبق ثابت ہوئی۔ پتہ چلا کہ حافظ صاحب، خود زمانے کے ستائے ہوئے تھے۔ اپنے بچپن میں انہیں اپنی سوتیلی ماں کے ظلم سہنا پڑے تھے۔ یہ ظلم اس حد تک بڑھے کہ ایک روز وہ گھر سے فرار ہو گئے۔ دھکے کھاتے کھاتے کسی خیراتی مدرسے تک پہنچے جہاں سے وہ حافظ قرآن بن کر نکلے۔ انہوں نے زندگی بھر دوسروں کی روٹیوں پر گزارہ کیا تھا۔ ذلت برداشت کی تھی، ماں باپ کی محبت سے محروم رہے تھے۔ ان حالات کا ردِ عمل یہ تھا کہ جب وہ خود حفظ قرآن کی تعلیم دینے کے لیے اس مدرسہ سے وابستہ ہوئے تو ان کا سارا غصہ معصوم بچوں پر نکلنے لگا۔ (مقالہ محمد راشد علی خان، مقالہ نازیہ بخاری) یہ طبقاتی معاشرے کا عام مگر فطری چلن تھا۔

ظاہر ہے حافظ جی کی مار پیٹ کا بچوں پر یہی اثر ہونا تھا کہ وہ ان کی اتھارٹی کو مکمل طور پر قبول کر لیں۔ کوئی حرف شکایت لب پر نہ لائیں۔ یہ مدرسہ چونکہ حمید اختر کے پُرکھوں نے قائم کیا تھا، اس لیے وہ یہ تاثر بھی دینا چاہتے تھے کہ مالکوں کے بچے بھی سزا سے نہیں بچ سکتے۔ بقول حمید اختر ”نماز قضا ہونے کی صورت میں حافظ صاحب مرغا بنا کر کمر پر دو اینٹیں رکھ دیتے۔ اس ڈر کی وجہ سے فجر کی اذان کے ساتھ ہی صبح اٹھ بیٹھتے اور مسجد کا رخ کرتے لیکن چونکہ باجماعت نماز خوف کی وجہ سے ادا کرتے اس لیے برس ہا برس بغیر وضو کے منہ پر چھینٹے مار کر ہی پڑھتے رہے۔ باقی نمازوں سے پہلے البتہ وضو کر لیتے تھے۔ (مقالہ محمد راشد علی خان)

حمید اختر بتاتے ہیں کہ ”کئی برس بعد جب وہ پاکستان آچکے تھے، مولوی صاحب نے ان سے اپنے سابقہ رویوں کے لیے معذرت کی تھی۔ تاہم حمید اختر پر اس کا منفی اثر پڑنا تھا، سو پڑا۔ اگرچہ وہ پانچ سال کی عمر سے ہی نمازوں خصوصاً فجر کی نماز کے سختی سے پابند تھے مگر چودہ پندرہ سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے وہ اپنے آپ کو ان پابندیوں سے آزاد کر چکے تھے۔ ان کے اپنے بیان کے مطابق:-

”میں نے دس برس سے کم عمر میں ہی قرآن پاک حفظ کر لیا تھا مگر اس دینی مدرسے میں طلباء سے جو سلوک ہوتا تھا، اس کے عمل کے نتیجے میں میں بلوغت تک پہنچتے پہنچتے تمام دینی رشتوں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ میں ایسے لوگوں سے سخت نفرت کرتا ہوں، جو زندگی بھر لوٹ مار، چوری، دھوکہ بے ایمانی اور ہر قسم کے لہو و لعب میں مصروف رہتے ہیں اور آخری عمر میں داڑھی بڑھا کر تسبیح ہاتھ میں لے لیتے ہیں۔۔۔۔“ (اقتباس ”آشنائیاں کیا کیا“)

مار پیٹ قرآن پاک کی تعلیم مکمل ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے سماجی شعور کی پختگی کے لیے بھی اہم ثابت ہوئی۔ طبقاتی تفریق کے اہم سوال سے لے کر مذہبی، اخلاقی منافقت بھی ان پر عیاں ہو گئی۔۔۔۔۔ خود اپنی والدہ کی جدوجہد بڑے بھائی کی قربانی اور اپنے بچپن کی بے فکری، سرمستیوں سے محرومی نے ان کے مزاج میں تلخی کا رنگ بھر دیا۔ اگرچہ دس سال کی عمر میں انہوں نے رمضان کے دوران نماز تراویح میں قرآن پاک سنایا لیکن اس کے بعد ان کا معصوم ذہن رد عمل کا شکار ہونا شروع ہو گیا اور اگلے تین چار برسوں میں وہ ان پابندیوں سے آزاد ہو گئے۔ نماز روزے کی پابندی نہ کرنے پر اگر کوئی پوچھ بیٹھے تو ان کا جواب ہوتا ”میں بچپن میں ہی اپنا کوٹہ پورا کر چکا ہوں“ (اقتباس ”آشنائیاں کیا کیا“)

اس جواب میں لطافت کے پہلو سے زیادہ ایک سنجیدہ اور قابل توجہ تشبیہ ہے اس لیے کہ اکیسویں صدی کی پہلی دہائی کے ختم ہوتے ہوتے مدرسہ کی تعلیم کے سنگین نتائج ہمارے سامنے ہیں جس نے معاشرے کے تار و پود بکھیر کر رکھ دیئے ہیں۔

حمید اختر نے اپنی یادداشتوں میں اپنے بچپن کے کئی دلچسپ بزرگوں کا بھی ذکر کیا ہے جن کے بلا واسطہ یا بلا واسطہ اثرات ان کی شخصیت پر پڑے لیکن انہوں نے منفی رد عمل ظاہر کرنے کی بجائے ان واقعات سے بھی اپنے کردار کی تعمیر کا مثبت کام لیا۔

”کیسے کیسے لوگ“ میں وہ ایسے ہی بزرگوں کے واقعات دہراتے ہیں۔

چند واقعات

”ہمارا بچپن میں ہی واسطہ کچھ ایسے لوگوں سے پڑا جن کی بعض عادتیں ہمیں اس وقت سمجھ میں نہیں آتی تھیں اگرچہ بعد میں نفسیاتی تجزیوں کی مدد سے ان کی ذہنی کیفیات کے بارے میں فیصلہ کرنا ممکن ہو گیا۔ مثلاً ہمارے ایک بزرگ گاؤں سے باہر جاتے تو واپسی پر جونہی ان کی گھوڑی گاؤں کی حدود میں داخل ہوتی وہ ہر سامنے آنے والے کی مرصع گالیوں سے تواضع کرتے۔ ہم نے ایک روز ان سے پوچھا کہ وہ یہ کام کیوں کرتے ہیں اور لوگوں کو خواہ مخواہ گالیاں کیوں دیتے ہیں تو کہنے لگے ”کیسے پتہ چلے گا کہ ہم اپنے گاؤں کی حدود میں داخل ہو چکے ہیں اس خوشی میں سامنے نظر آنے والے کو گالی نہ دیں تو کیا کریں؟“

”یہ نوے سالہ بزرگ بڑے دھڑلے کی شخصیت کے مالک تھے ان کے پوتے کو پرائمری کے بعد گاؤں سے باہر شہر کے ہائی سکول میں بھیجا گیا تو انگریزی میں نہ چل سکے۔ بچے کو کسی وجہ سے انہی دنوں بخار ہو گیا تو وہ اسے سکول سے

اٹھالائے۔ ان کی بہو یعنی بچے کی ماں نے لاکھ کوشش کی کہ وہ اسے دوبارہ سکول بھیجے لیکن وہ نہ مانے۔ ان کا کہنا تھا کہ انگریزی بچے کو گرمی کرتی ہے اور موافق نہیں آتی اس لیے اسے انگریزی پڑھنے سے بخار ہو جاتا ہے وہ ہرگز سکول نہیں جائے گا۔ یہی بچہ بڑا ہوا تو تحریک پاکستان نے زور پکڑا تو اس نے اخبار کی خریداری کے لیے گھر والوں پر زور ڈالا چنانچہ سالانہ چندہ بھیجا گیا اور ڈاک کے ذریعے ایک اخبار روزانہ لاہور سے گاؤں پہنچنے لگا۔

”نوجوان نے دو چار روز اخبار شوق سے پڑھا پھر اس میں اس کی دلچسپی ختم ہو گئی انہی دنوں ہم گرمیوں کی چھٹیوں میں لدھیانہ سے اپنے گاؤں گئے تو ہم روزانہ مدرسے میں جہاں سے ڈاک تقسیم ہوتی تھی خود جا کر اخبار لاتے اور دیوان خانے میں بیٹھ کر بڑے غور سے دیر تک اس کا مطالعہ کرتے رہتے۔ ہم نے دیکھا کہ یہ بزرگ بڑی ناپسندیدگی سے ہماری طرف دیکھتے اگرچہ منہ میں کچھ نہ بولتے اور خاموشی کے ساتھ بیٹھے حقہ پیتے رہتے لیکن ان کی نظروں سے ناپسندیدگی کے آثار واضح طور پر نظر آتے۔ آخر ایک روز مطالعے کے خاتمے کے بعد جب ہم نے اخبار رکھا اور اُس نوجوان نے آکر پڑھنے کے لیے اٹھایا تو یہ بزرگ اچھل کر چارپائی سے اٹھے اخبار اس کے ہاتھ سے چھینا اور بڑے درشت لہجے میں بولے ”سارے اخبار تو حمید اختر پڑھ چکا ہے اب تمہارے لیے اس میں کیا باقی رہ گیا ہے۔“

”ہمارے گاؤں کے ایک اور بزرگ دس بیس کوس کے فاصلے پر پیدل روانگی سے قبل چارپائی سر پر اٹھا لیتے۔ راستے میں جہاں سستانے کی ضرورت محسوس ہوتی کسی درخت کی گھنی چھاؤں میں چارپائی بچھا کر اس پر آرام کرتے۔ کچھ دیر سستانے کے بعد اٹھتے۔ چارپائی کو سر پر جھاتے اور آگے روانہ ہو جاتے۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی میں سینکڑوں ہزاروں میل کا سفر سر پر چارپائی اٹھا کر کیا۔ آخری عمر میں گھر والوں نے ان سے یہ چارپائی چھین لی مگر وہ مرتے دم تک اس کی واپسی پر مصر رہے۔“

”مجھے اپنے بچپن کے ایک اور بزرگ یاد آ رہے ہیں جو گاؤں سے بے وقت شہر جانے کے لیے تانگے والے سے دیر تک جھگڑتے رہے۔ یہ ”بہوکارٹ“ قسم کے تانگے گاؤں سے شہر جانے اور سات میل کے فاصلے کے لیے دو آنے سواری کے لیتے تھے۔ یہ بزرگ ایسے وقت میں اڑے پر پہنچے جب اور کوئی سواری موجود نہیں تھی چنانچہ ان سے سالم تانگے کے لیے ڈیڑھ روپیہ طلب کیا گیا۔ یہ ایک روپے پر اڑے رہے جب وہ نہ مانا تو ان کی اپنی زبان میں ”میں نے سر سے پگڑی اتار کر کمر کے گرد لپیٹی اور پیدل چل پڑا سات میل کی تو بات ہے، پندرہ بیس منٹ میں پہنچ جاؤں گا۔“

اب ہوا یہ کہ دو قدم آگے بڑھے تو تانگے والے نے بلند آواز میں کہا ”واہ بھئی بڑے شاہ بنے پھرتے ہیں۔ ڈیڑھ روپیہ خرچ نہیں کر سکتے؟ بس پھر کیا تھا۔ گھر واپس آنے پر یہ واقعہ دہراتے ہوئے بولے ”مجھے یہ بات سن کر سخت غصہ آ گیا

جیب میں ہاتھ ڈال کر میں نے ایک بڑا سا نوٹ نکالا۔ ہوگا کوئی دس بارہ روپے کا اور تانگے والے کے منہ پر مارتے ہوئے تانگے پر سوار ہو گیا۔“

ابتدائی بغاوت

حافظ قرآن بنانے کے بعد گھر والوں کو غالباً احساس ہوا کہ بیٹے نے دین تو کمالیا اب دنیا بھی کمالے اس لیے انہیں سکول کی تعلیم کے لیے گاؤں سے بڑے بھائی کے پاس لدھیانہ بھیج دیا گیا۔۔۔ مدرسے کی تعلیم کا رد عمل اب کھل کر سامنے آ رہا تھا چنانچہ جب انہیں سکول میں داخل کیا جانے لگا تو انہوں نے زندگی کی پہلی بغاوت کر دی۔ خاندانی روایت کے مطابق ان کا نام اختر علی رکھا گیا تھا۔ ان کے والد رحمت علی تھے۔ تایا کا نام حیدر علی تھا۔ بھائیوں کے نام جعفر علی، اصغر علی اور صفا علی تھے گویا خاندان میں ہر نام کے ساتھ علی لکھنا بزرگوں کی روایت تھی۔ اس مرحلے پر انہوں نے اصرار کیا کہ سکول میں ان کا نام اختر علی کی بجائے حمید اختر لکھوایا جائے۔ یہ شاید ان کی زندگی کا پہلا آزادانہ فیصلہ تھا جس پر وہ اڑ گئے۔ گھر والوں کو ان کی ضد کے سامنے ہار ماننا پڑی۔ حمید اختر کہتے ہیں کہ انہوں نے ”یہاں سے بغاوت کا آغاز کیا“ (آشنائیاں کیا کیا“ اقتباس)

لیکن پہلی بغاوت کے بعد جلد ہی انہوں نے دوسری بغاوت کر دی۔ مدرسے کے ماحول اور سکول کے ماحول میں وہی فرق تھا جو اختر علی اور حمید اختر کے نام میں تھا۔ یہاں حافظ جی کی وہ سختی نہ تھی جو بچوں کو ”ڈرپوک“ بنا کر رکھ دیتی ہے۔ سکول پہنچ کر ایک طرف تو انہیں نسبتاً کھلی فضا میں سانس لینے کا موقع ملا مگر دوسری طرف وہ ان بچوں کے مذاق کا نشانہ بھی بننے لگے جو مدرسے سے نکل کر نہیں آئے تھے۔ انہیں تیسری جماعت میں داخل کروایا گیا لیکن وہ اپنے ہم جماعت بچوں میں نہ صرف عمر میں بڑے تھے بلکہ طویل قامت ہونے کے باعث وہ ان سے کہیں بڑے نظر آتے تھے۔ پانچویں جماعت تک تو جیسے تیسے گزارہ کر لیا مگر چھٹی جماعت میں ہم جماعتوں کی طرف سے ”لمبو“ کا خطاب سامنے آیا تو ان کے لیے اسے برداشت کرنا آسان نہ تھا۔ انہوں نے اپنی دوسری بغاوت کا اعلان کر دیا۔ ان کے اپنے بیان کے مطابق

”اسی زمانے میں ایک روز گھر آ کر بستہ پھینک دیا اور اعلان کر دیا کہ دیوبند جا کر مولوی بنوں گا۔ دلیل یہ تھی کہ صحیح وقت پر سکول میں داخل کرانے کی بجائے مسجد میں قرآن کریم حفظ کرانے بٹھا دیا تھا تو اب انگریزی تعلیم کی کیا ضرورت ہے۔ اصولاً اب مجھے مولوی بننا چاہیے۔۔۔“ (حمید اختر ”آشنائیاں کیا کیا“ ص 175)

اس بغاوت کے سماجی اور نفسیاتی محرکات واضح ہیں۔ یوں لگتا ہے وہ اپنی عمر سے بڑھ کر سوچ اور بول رہے تھے۔ بارہ تیرہ سال کا ایک دیہاتی بچہ عام حالات میں اس لب و لہجے میں بات نہیں کر سکتا۔ دراصل یہ بغاوت شروع ہی سے ان میں بھری ہوئی تھی جسے مولوی کی مارنے دبا رکھا تھا۔ بستہ پھینکنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ وہ سچ سچ مولوی بننا چاہتے تھے۔ ان کا

اعلان بغاوت دراصل ایک طرح کا احساس تاسف تھا کہ ان کی زندگی کو جس رُخ پر ڈال دیا گیا ہے وہ ان کا راستہ نہیں تھا۔ یہاں بھی گھر والوں کو ان کی دلیل کے سامنے لا جواب ہونا پڑا۔ طے پایا کہ انہیں سکول سے اٹھالیا جائے۔ گھر میں تیاری کروا کے ایک سال میں تین سال کا فاصلہ طے کروایا جائے تاکہ ان کے ”گمشدہ برسوں“ کا ازالہ بھی ہو سکے اور وہ اپنے ہم جماعتوں کے مذاق سے بھی محفوظ رہیں۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ حمید اختر جو جدید تعلیم کے تصور تک سے آشنا نہ تھے، کیسے برق رفتاری سے پڑھائی کی منزلیں طے کرتے چلے گئے، شاید احساس زیاں سے نکلنے کے لیے انہیں اپنی نئی تعلیم میں کہیں رکاوٹ محسوس نہ ہوئی اور جب انہوں نے پرائیویٹ طور پر ورینیکلر فائنل یا آٹھویں جماعت کا امتحان پاس کر لیا تو وہ مکمل طور پر ایک بدلے ہوئے حمید اختر تھے۔

والدہ کا انتقال

اسی اثناء میں 1940-41ء میں جب وہ لڑکپن سے نکل کر نوجوانی کی حدود میں داخل ہو رہے تھے، ان کے سر سے والدہ کا سایہ بھی اٹھ گیا۔ وہ صرف تین سال کے تھے، جب ان کے والد کا انتقال ہوا تھا اور اب ان کی والدہ جنہوں نے حمید اختر کی تربیت اور نشوونما میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کیا تھا، اس جہان سے چل بسیں۔ وہ اپنی والدہ کے کردار اور ان کی قربانیوں سے بہت متاثر تھے لیکن اپنی تحریروں میں انہوں نے اسے جذباتی رنگ میں کبھی پیش نہیں کیا۔ زبانی گفتگو میں بھی وہ اس سے سرسری گزر جاتے ہیں۔ تاہم والدہ نے ان کے لیے اور دوسرے بہن بھائیوں نے جو کچھ کیا، اس کا ذکر انہوں نے ہمیشہ جذباتی لگن کے ساتھ کیا۔ والدہ کی غیور طبیعت کا وہ خاص طور پر ذکر کرتے ہیں جس نے خود حمید اختر کی شخصیت اور کردار پر بھی کافی اثر ڈالا اور انہوں نے زندگی میں کبھی کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کیا اور آخری دم تک وہ اپنی محنت پر انحصار کرتے رہے۔

ابن انشاء سے تعلق

اب وہ دوبارہ سکول جاسکتے تھے۔ یہ کامیابی ان کے اپنے شعوری اور آزاد فیصلوں کا نتیجہ تھی جس نے انہیں ایک نیا اعتماد بخشا۔ لدھیانہ ہائی سکول میں نویں جماعت کے طالب علم کے طور پر ان کے نئے سفر کا آغاز ہوا۔ جس میں ایک ادیب کے طور پر ان کی منزل کا تعین ہونا تھا۔ یہاں انہیں معروف شاعر اور مزاح نگار ابن انشاء کی رفاقت ملی جو ان سے ایک سال آگے تھے اور لکھنے کا آغاز کر چکے تھے۔ ابن انشاء سے ان کا تعلق عمر بھر کی رفاقت میں بدلنے والا تھا۔ یہ ابن انشاء ہی تھے جنہوں نے حمید اختر کو سب سے پہلے ادب کی راہ پر ڈالا۔ وہ دسویں جماعت کے طالب علم تھے جب ان کی پہلی تحریر ”آوازیں“ اپنے دور کے معروف ادبی مجلے ہمایوں میں شائع ہوئی، لیکن بہتر ہوگا اگر اس اجمال کی تفصیل خود حمید اختر سے سنی جائے:

تو میں نے احتجاج کیا کہ اس موضوع پر پانچویں جماعت سے لکھتے آرہے ہیں۔ کوئی ایسا موضوع دیجیے جس پر زور قلم آزما سکیں۔ انہوں نے کہا 'اگر آپ ذہین ہو تو پرانے موضوع میں بھی جان ڈال سکتے ہو۔ چنانچہ ہم نے پرانے موضوع میں جان ڈالنے کی کوشش کی۔ ایک انوکھا مضمون تحریر کیا جس میں ریلوے سٹیشن پر سنی جانے والی مختلف آوازوں کو یکجا کر دیا گیا تھا۔ چونکہ اس میں مستورات کا ذکر اور مسافر خواتین کے نقش و نگار پر رواں تہرے بھی شامل تھے اس لیے مولوی برکت نے دس میں سے چار نمبر دیئے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ مجھے اردو کے جواب مضمون میں نو سے کم نمبر ملے تھے۔ اس لیے میں شام کو گھر آ کر بڑی دیر تک روتا رہا۔ اسی شام وہ (ابن انشاء) آ گیا۔ رازداں کے آنے کے بعد ظاہر ہے شکایتوں کے دفتر کھل گئے۔ اس نے بہت تسلی دی اور کہا 'اپنی کاپی مجھے دے دو ہم پر اس کی لیاقت کا بڑا رعب تھا۔ سمجھا شاید اپنی دلیلوں سے مولوی لائق صاحب کو قائل کرنے کی کوشش کرے گا مگر اس نے دوسرے روز وہ کاپی بغیر کسی تبصرے کے واپس کر دی۔ کوئی ایک ماہ بعد وہ 'ہمایوں' کا پرچہ لے کر آیا تو یہ عقده کھلا کہ اُس رات اُس نے یہ مضمون نقل کر کے 'ہمایوں' کو بھیج دیا تھا۔ یہ میرا پہلا مضمون تھا جو کسی ادبی رسالے میں شائع ہوا۔ یہ 1942ء کا ذکر ہے۔ چنانچہ اگلے روز ہم دونوں مولوی صاحب کے پاس پرچہ لے کر گئے اور ان سے دادرسی کے طالب ہوئے کہ جس مضمون کے آپ نے چار نمبر دیئے تھے وہ "ہمایوں" جیسے معیاری ادبی رسالے میں شائع ہو گیا۔ انہوں نے صرف اتنا کہا "اپنا اپنا معیار ہوتا ہے۔" (حمید اختر "آشنائیاں کیا کیا" ص 130)

دوسری عالمی جنگ (1939-42ء) کے ابتدائی برسوں میں انہوں نے سکول کی تعلیم مکمل کی۔ 1943ء میں میٹرک کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ یہ جنگ آزادی کا زمانہ تھا۔ مسلم لیگ نے 1940ء میں لاہور کے منٹو پارک میں مسلمانوں کے لیے جداگانہ وطن کی قرارداد منظور کی تھی۔ 1939ء میں کانگریس نے صوبائی وزارتوں سے استعفیٰ دے کر آزادی کی تحریک کا عمل تیز کر دیا تھا۔ 1942ء میں کانگریس نے "ہندوستان چھوڑ دو" کی تحریک چلائی۔ پنجاب میں لاہور اس تحریک کا مرکز تھا۔ حمید اختر کانگریس کے ساتھ ساتھ احرار سے بھی متاثر ہوئے اور سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے۔

اسی سال جرمنی نے سوویت یونین پر حملہ کر دیا۔ سوویت یونین اب تک جنگ سے باہر تھا اور اسے سامراجی جنگ قرار دیتا تھا۔ حملے کے بعد مادر وطن کے دفاع کے لیے سوویت یونین نے برطانیہ، فرانس اور امریکہ وغیرہ کے ساتھ مل کر نازی ملکوں کے خلاف اتحاد قائم کیا اور اس جنگ کو عوامی جنگ قرار دیا۔ حمید اختر ان حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اس اثناء میں انہوں نے گورنمنٹ کالج لدھیانہ میں داخلہ لے لیا اور میدانِ عمل میں کود پڑے۔



کچھ یادیں کچھ باتیں (1)

عباس اطہر (کنکریاں) روزنامہ ”ایکسپریس“ 01 نومبر 2011ء

پرسوں صبح میں بسترے سے اٹھا تو ساٹھ کی دہائی کے متنازعہ جدید شاعروں کے گروہ کے ایک رکن کی ایک نظم بلا وجہ میرے دماغ میں گھوم رہی تھی۔ میں نے گزشتہ رات کے خوابوں کی گٹھڑی کھول کر دیکھی تو کہیں میاں شہباز شریف ”گوزرداری گو“ کے نعرے لگاتے نظر آئے تو کہیں ڈاکٹر بابر اعوان کا جوابی حملہ دکھائی دیا اور کہیں ایم کیو ایم کی ریلی اور لاہور میں عمران خان کے جلسہ عام کے بارے میں پٹیشن گوئیوں کی جھلکیاں نظر آئیں۔ خیر پہلے وہ نظم پڑھ لیں۔ جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔

آکا باکا چڑی چڑا کا

سائیاں دے گھر ہو یا کا کا

کا کے ماری چیک

کا کا ٹپ گیا میت

یہ نظم 1963-64ء میں بحث کیلئے حلقہ ارباب ذوق میں پیش ہوئی تھی۔ اکثر شرکاء نے اسے بے معنی کہہ کر مسترد کر دیا۔ اختر احسن جو آج کل امریکہ میں ہیں بہت مستند ماہرین نفسیات میں شمار ہوتے ہیں۔ اس نظم کے معاملے میں اپنے موقف پر اڑے رہے جو یہ تھا ”حضرات اپنا دماغ لڑائیے یا تو اس میں میں آپ کو نظر آ جاؤں گا یا آپ اپنے آپ کو ڈھونڈ لیں گے۔ آپ کوشش نہیں کرنا چاہتے تو بھاڑ میں جائیں۔ میں نے نظم لکھ کر اپنا کام پورا کر دیا ہے اور آپ سے معاوضہ نہیں لیتا کہ تشریح بھی کروں۔“

اتوار کی صبح جب یہ نظم میرے دماغ میں گردش کر رہی تھی تو مجھے یاد آیا کہ اختر احسن فوج میں سرونگ میجر تھے، ایوب خان کا زمانہ تھا، اس نظم میں انہوں نے آنے والے زمانوں میں کچھ ایسے ”کاکوں“ کی نشان دہی بھی کی، جو آگے

چل کر چھوٹے موٹے گھر کے بجائے مینار پاکستان جیسی وسیع جگہوں پر پیدا ہوں گے اور ”چیک“ مارنے کے بجائے دوسروں سے ایسی چیکیں مروانے کی ناقابل تسخیر طاقت رکھتے ہوں گے۔ ایوب خان کے بعد ”سائیوں“ نے یحییٰ خان کی شکل میں کا کا پیدا کیا۔ اس کا کے نے سب سے خوفناک ”چیک“ ماری اور اس دوران منہ اتنا کھول لیا کہ آدھا ملک اندر دھنس گیا۔ اس عمل کے دوران اس کا کے کے سائیوں کے گھر ایک سویلین کا کا پیدا ہوا۔ وہ بہت سخت جان تھا۔ لیکن 1979ء میں زمین بھٹی اور چیخ مارے بغیر زمین کے اندر اتر گیا۔ میرزا دوں کے بارے میں ایک روایت ہے کہ ان کے گھر بیٹا پیدا ہو جائے تو چوم چوم کر مارتے ہیں۔ ہماری جمہوری روایات کی انفرادیت یہ ہے کہ گھر والے چوم چوم کر ”کا کے“ کو ادھ موا کرتے ہیں اور بے اولاد پڑوسی صدقہ دے کر اولاد کی خواہش پوری کر لیتے ہیں۔

طویل عرصے کی غیر حاضری سے مجھے کئی نقصانات ہوئے۔ سہیل ظفر صاحب فوت ہو گئے۔ میں کالم نہیں لکھ سکا۔ 1964ء میں ہم اکٹھے روزنامہ ”انجام“ کراچی میں ملازم ہوئے تھے۔ یہ دوستی روزنامہ ”ایکسپریس“ میں ان کے آخری دم تک قائم رہی۔ ہم دونوں نے بہت سے کارنامے مل کر انجام دیئے۔ جن میں سے ایک یادگار کارنامہ حاضر خدمت ہے۔ 1988ء میں جنرل ضیاء کے انتقال کے بعد ہم دونوں اپنے دوست ضیاء الاسلام انصاری مرحوم کے دفتر میں بیٹھے تھے۔ اس وقت وہ پریس ٹرسٹ کے چیئرمین تھے اور ایوان صدر میں میٹنگ کیلئے گئے ہوئے تھے۔ وہاں پر وہ ایسے پھنسے کہ ہم بور ہو کر تخلیقی کام میں مصروف ہو گئے۔ باتوں باتوں میں فیصل مسجد میں ضیاء الحق کے مزار کا ذکر آیا تو میں نے انہیں کہا کہ یار کیوں نہ ان کے مزار سے ملحقہ چوک کا نام ”جبر اچوک“ رکھ دیا جائے۔ انہوں نے فوری طور پر اس نام کی منظوری دے دی۔ پھر میں نے انہیں کہا کہ ضیاء الاسلام انصاری صاحب پتہ نہیں کب واپس آئیں گے۔ اس وقت ان کا سرکاری فون ہماری صوابدید پر ہے۔ شہر میں بہت سارے نامور لوگ تمہارے واقف ہیں۔ ہم دونوں نے مل کر جو یہ شہ پارہ تخلیق کیا ہے اسے آپ اپنے اہم اور بے تکلف شناساؤں کو فون کر کے رجسٹر کروادیں۔ ہماری کوشش کامیاب رہی اور چند دن بعد اس چوک کا عوامی نام ہی ”جبر اچوک“ بن گیا۔ مجھے دعویٰ ہے کہ یہ موزوں نام میری تخلیق اور سہیل ظفر کی پیشکش تھی لیکن اس کا خیر کا کوئی اور دعویٰ دار ہو تو براہ کرم مجھ سے رابطہ کرے تاکہ اس کی کاوش ضائع نہ ہو۔

حمید اختر صاحب کی وفات پر بھی مجھ سے کچھ نہیں لکھا گیا۔ حالانکہ میرا ان کے ساتھ 45-46 سال کا تعلق تھا۔ درمیان میں ساہا سال ملاقات کے بغیر بھی گزرے لیکن اس تعلق میں کوئی کمزوری نہیں آئی۔ میں روزنامہ ”امروز“ میں سب ایڈیٹر تھا اور وہ اسٹنٹ ایڈیٹر ”بکار خاص“ تھے۔ چلتے چلتے ان کے فرائض کی بھی وضاحت کرتا چلوں۔ وہ اس زمانے میں روزنامہ ”امروز“ کے ایڈیٹر ظہیر بابر کے بعد سنیا رٹی میں دوسرے نمبر پر تھے۔ یعنی شیڈ و ایڈیٹر تھے۔ لیکن ظہیر

صاحب کسی وجہ سے ان سے ناراض تھے۔ اس لئے انہیں ہر اہم کام سے فارغ کر کے ایڈیٹر کی ڈاک کا انچارج بنا رکھا تھا۔ حمید اختر صاحب خوبصورت آدمی تھے۔ خوش لباس بھی تھے۔ کبھی سر کے بالوں کی کمی کی زیادہ پروا نہیں کرتے تھے لیکن پردہ داری کیلئے عام طور پر فلیٹ ہیٹ پہن کر اپنی ذاتی گاڑی پر دفتر آتے اور اپنے کمرے میں بیٹھ کر چائے کا ”لنکر“ کھلا رکھتے۔ وہ مختلف امور پر باتیں کرنے کیلئے ملاقاتی جمع کر لیتے۔ آخر میں جلدی جلدی ایڈیٹر کی ڈاک نمٹا کر گھڑی دیکھتے ”اچھا بھائی خدا حافظ“ کہہ کر چلے جاتے۔ وہ ”امروز“ اور ”پاکستان ٹائمز“ میں بہت مقبول تھے لیکن ایڈیٹر ظہیر بابر کے زیر عتاب تھے اس لئے انہیں بطور سزا فارغ بیٹھنا پڑتا۔ میں نیوز سیکشن میں سب ایڈیٹر تھا اور مجھے 8 گھنٹے مسلسل ڈیوٹی کرنا پڑتی تھی اس لئے بہت تنگ تھا۔ ظہیر بابر صاحب مجھ پر بہت مہربان تھے لیکن حمید اختر صاحب کو دیکھ دیکھ کر مجھ میں بھی زیر عتاب آنے کا شوق پیدا ہوا۔ میں مولانا چراغ حسن حسرت کے صاحبزادے ظہیر جاوید اور ”امروز“ میں حمید اختر صاحب کی کیلگری کے ایک اور زیر عتاب فخر ہمایوں کا بھی بہت مداح تھا۔ ان کی صدارت میں ظہیر جاوید اور میں نے پنجاب یونین آف جرنلسٹس کے ”امروز“ یونٹ کو الگ سے یونین رجسٹرڈ کر لیا اور کسی بڑے چھوٹے سے مشورہ کے بغیر انتظامیہ کو ہڑتال کا نوٹس بھجوا دیا۔ ظہیر بابر صاحب اس کارروائی پر بہت ناخوش ہوئے۔ دوسری طرف ہم بڑے حوصلہ میں تھے۔ ہمارے تمام کولیگز ہمیں اس بہادری پر داد دیتے رہے لیکن آخر میں جب یہ ہڑتال کا نوٹس جنرل باڈی میننگ میں پیش ہوا تو ظہیر بابر صاحب کے مقابلے میں ہم پر اپنی مقبولیت کی قلعی کھل گئی۔ 30 کے ایوان ہم صرف تین تھے۔ شرمسار ہو کر ظہیر جاوید اور میں نے استعفیٰ دے دیا۔ میرا استعفیٰ نامنظور اور ظہیر جاوید کا استعفیٰ منظور ہو گیا۔ بعد میں کچھ سنیر ساتھیوں نے مداخلت کر کے ظہیر بابر صاحب کو راضی کر لیا کہ وہ ظہیر جاوید کا استعفیٰ نامنظور کر دیں لیکن ظہیر بابر واپس آنے کیلئے تیار نہیں ہوا۔ مجھے سزا ملی تو سہی مگر حمید اختر صاحب سے بالکل الٹی۔ کچھ عرصے تک مجھے ڈبل ڈیوٹیاں ملتی رہیں کہ کبھی میں دن کی شفٹ سے فارغ ہوتا تھا کہ نیوز ایڈیٹر صاحب تحریری حکم بھیج دیتے تھے کہ رات کی شفٹ میں ایک آدمی کم ہو گیا ہے اس لئے تم اور ٹائم کرو۔

چند ماہ بعد پی پی ایل ورکرز یونین قائم ہوئی۔ جس میں اخبارات کے تمام شعبوں کے کارکن شامل تھے اور یہ اپنی نوعیت کی پہلی اور سب سے طاقتور یونین تھی۔ اسی سال پنجاب یونین آف جرنلسٹس کے انتخابات ہوئے اور حمید صاحب اس کے صدر منتخب ہو گئے۔ اے ٹی چودھری صاحب کو پی پی ایل ورکرز یونین کا بلا مقابلہ صدر منتخب کر لیا گیا اور خدا جانے کس نے دھکا دے کر مجھے جنرل سیکرٹری بنا دیا۔ ایک آدھ ماہ بعد وٹج بورڈ ایوارڈ کیلئے ہڑتال ہونے والی تھی۔ میں نے اپنی صحافتی یونینوں کے حوالے سے لیبر قوانین کے ماہروں سے مشورہ کیا تو مجھے پتہ چلا کہ پی ایف یو جے اور صحافیوں کی

تمام صوبائی یونینوں کی کوئی قانونی حیثیت نہیں۔ میرے والد صاحب لاہور میں لیبر آفیسر تھے۔ وقت بہت کم تھا۔ لیکن میں نے ان کی مدد سے اپنی پی پی ایل ورکرز یونین کو باضابطہ طور پر رجسٹرڈ کروالیا اور قانون کے تمام تقاضوں کے مطابق اس ہڑتال کیلئے مقررہ مدت میں اپنی یونین کی طرف سے ہڑتال کانٹنس الگ سے بھجوادیا۔ ملک بھر میں تمام صحافی ہڑتال پر چلے گئے۔ دوسرے ہی دن پی پی ایل انتظامیہ اور ادارے نے کارکنوں کے تمام مطالبات منظور کر لئے جس کے بعد ہم قانونی طور پر ہڑتال جاری نہیں رکھ سکتے تھے۔ میں نے حمید اختر صاحب سے اس معاملے پر بات کی اور مشورہ دیا کہ ہمیں اپنی ہڑتال ختم کر دینی چاہیے اور دوسرے اداروں کی حمایت کیلئے جلسے جلوس نکالنے چاہئیں۔ انہوں نے میری عدم موجودگی میں میری تجویز کو یونین کے دوسرے لیڈروں کے سامنے پیش کیا اور مجھے ”بزدل“ قرار دے کر میرے خلاف متفقہ فتویٰ لے لیا۔ ٹھیک چار دن کے بعد وہی کچھ ہوا جس سے میں نے حمید اختر صاحب کو خبردار کیا تھا۔ ادارے کو پریس ورکر یونین جو انتظامیہ کے کہنے پر ہمارے ساتھ ہڑتال میں شامل تھی اپنے تمام ورکرز کو لے کر واپس دفتر میں ڈیوٹی پر چلی گئی۔ اسی شام نثار عثمانی صاحب کے دفتر میں میٹنگ ہوئی۔ شیخ حامد محمود نیشنل پریس ٹرسٹ کے سابق چیئرمین اس میٹنگ میں ہمارے ساتھ شریک تھے۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ کل تمہارے مزید ساتھی ہڑتال توڑ کر دفتر میں واپس جانے والے ہیں۔ اس لئے ہڑتال کال آف کر کے اپنی جان چھڑالو۔ میرے دماغ میں حمید اختر صاحب کا طعنہ پھنسا ہوا تھا۔ اس لئے میں نے کہا کہ حمید اختر صاحب سے پوچھ لیں کہ بعد میں اسے بہادری کہا جائے گا یا کہ بزدلی۔ حمید صاحب بڑے صاف دل آدمی تھے۔ انہوں نے اس بات کا برا بھی نہیں مانا اور میری بات ہنسی میں اڑا کر شیخ حامد محمود صاحب کی تجویز مان لی۔ اگلے دن ہم سب سر نیچے کر کے دفتر کی سیڑھیاں چڑھ گئے۔ ٹھیک تین دن بعد انتظامیہ نے اے ٹی چودھری صاحب، عبداللہ ملک صاحب، حمید اختر صاحب، آئی اے رحمان صاحب، منہاج برنا صاحب اور میرے علاوہ سات پریس ورکرز برطرف کئے اور دفتر کے اندر داخلے پر پابندی لگا دی۔ برطرفی کے پروانے لینے والے باقی لیڈر تو گھر چلے گئے اور برطرف ہونے والے پریس ورکرز صرف آئی اے رحمان صاحب، عبداللہ ملک صاحب اور میری ذمہ داری بن گئے۔ ہم ان کی کفالت کیلئے چندہ بھی جمع کرتے اور مقدمے بھی لڑتے تھے۔ انتظامیہ کے خلاف جنرل سیکرٹری کے طور پر میں ہر مقدمے میں مدعی تھا۔ اے ٹی چودھری کے اصرار پر میں نے ایک غلطی کی تھی۔ لیکن آخری مقدمے کے اختتام پر جب انتظامیہ کے وکیل آئی اے رحمان (جو بعد میں بھٹو کیس میں اعجاز بٹالوی صاحب کے معاون تھے) نے مجھے کٹھن میں کھڑا کیا اور جرح شروع کی تو میں نے یہ موقف اختیار کیا کہ ہماری یونین نے قانون سے کوئی انحراف نہیں کیا۔ ہمارے تمام مطالبات نہیں مانے گئے۔ (میں نے چند نام بھی گنوائے جن پر ایوارڈ نافذ نہیں ہوا تھا) اس لئے ہم نے ہڑتال جاری رکھی۔ انہوں نے ایک خط

ہی لکھ دیا کرتے تھے۔ اس خط کی کوئی قانونی حیثیت نہیں۔ یہ ایک ذاتی خط ہے جس کا یونین کے ریکارڈ میں کوئی اندراج نہیں۔ تھوڑی دیر بعد عدالت کا وقفہ ہوا تو انتظامیہ کے وکلاء نے عبداللہ ملک صاحب اور آئی اے رحمان صاحب کو پیشکش کی کہ ہم (Dismissal) کو (Termination) میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ آپ اپنے واجبات لے لیں، لمبی مقدمہ بازی میں آپ کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ یاد رکھیں کہ ریٹائرڈ چیف جسٹس ایس اے رحمان نیشنل پریس ٹرسٹ کے چیئرمین ہیں اور قانون یا انصاف ہمارے ہاتھ میں ہے۔ انتظامیہ کے وکیل ایم اے رحمان صاحب وقفے کے دوران جج صاحب سے چیئرمین ملاقات کے بعد یہ پیشکش لائے تھے۔ ہمیں یاد تھا کہ ہائیکورٹ میں ہماری ایک پٹیشن میں میاں محمود علی قصوری وکیل تھے اور جج صاحب نے پوری بات سنے بغیر ہی رد کر دی۔ ہم نے یہ آپشن قبول کر لی۔ اس ساری جھل خواری میں حمید اختر صاحب ہمارے ساتھ شامل نہیں ہوئے تھے۔ یہ ان کا سائل تھا۔ اس کے باوجود جب انہیں واجبات ملے تو ان کی تمام رقم ہم لوگوں نے بحق سرکار ضبط کر لی۔ اس ”بحق سرکار“ اکاؤنٹ کا نام روزنامہ ”آزاد“ تھا۔ وہ اپنے مقدموں کے بارے میں بے پروا تھے اور ان مقدموں سے حاصل ہونے والی رقم بھی اسی بے پروائی سے اخبار کے چندے میں جمع کرادی۔ یہ قصہ مزید ابھی آگے چلے گا لیکن یاد رکھیں کہ چڑی چڑا کوں کی کہانی بھی ضرور سناؤں گا۔



کچھ یادیں کچھ باتیں (2)

عباس اطہر (کنکریاں) روزنامہ ”ایکسپریس“ 02 نومبر 2011ء

عبداللہ ملک صاحب اور رحمان صاحب نے پی پی ایل (پاکستان ٹائمز اور امروز) انتظامیہ کے ساتھ مقدمات سے فارغ ہوتے ہی اخبار نکالنے کے منصوبے پر غور شروع کر دیا۔ میں ہر مشورے میں شامل رہا لیکن کبھی یہ سمجھ نہیں آئی کہ پیسہ کہاں سے آئے گا۔ اسی زمانے میں حنیف رامے صاحب روزنامہ ”مساوات“ نکالنے کی تیاری میں تھے اور وہاں میری پکی نوکری کا اعلان کر چکے تھے لیکن میرے پاؤں میں عبداللہ ملک صاحب اور رحمان صاحب نے بیڑیاں ڈال رکھی تھیں۔ حمید اختر صاحب نے اس معاملے میں کوئی خاص دخل نہیں دیا۔ شاید یہ ان کا لائف سٹائل تھا کہ کبھی کبھار بڑی بڑی اور انتہائی سنگین باتوں کو اس طرح نظر انداز کر دیتے تھے جیسے ان کے ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہو۔ وہ ادارہ لکھ کر فارغ ہو جایا کرتے تھے لیکن 7 دسمبر 1970ء کے الیکشن کی رات ایڈیٹوریل سیکشن میں دو بجے رات تک وہ ملک صاحب اور رحمان صاحب کے ساتھ تھے۔ میں نیوز روم میں اکیلا اپنی کاپی نگری دکھاتا رہا۔ عزیز اختر کے ساتھ مل کر ایک یادگار اخبار بنایا۔ پرنٹنگ کیلئے کاپی بھجوانے کے بعد حمید اختر صاحب کے کمرے میں آیا تو اچانک ہم چاروں کو پتہ چلا کہ ہم نے تو ابھی تک کھانا بھی نہیں کھایا۔ ”مکمل طعام“ کی توقع صرف عبداللہ ملک صاحب سے لگائی گئی۔ وہ سخاوت کے موڈ میں تھے۔ ہم چاروں ان کے گھر چلے گئے۔ صبح چار بجے حمید اختر صاحب کی کار میں اخبار مارکیٹ جانے کی سوچھی۔ حمید اختر صاحب کارڈرائیو کر رہے تھے۔ رحمان صاحب ان کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھے تھے اور میں پچھلی سیٹ پر نیم غنودگی کی کیفیت میں تھا کہ ماڈل ٹاؤن والے نہر کے پل پر اچانک ایک زوردار دھماکہ ہوا۔ تیز رفتار کار کوئی ایک فٹ ہوا میں اچھل کر واپس سڑک پر اتری اور اسی رفتار سے دوڑتی ہوئی آگے آگے چلتی گئی۔ رحمان صاحب نے پوچھا ”کیا ہوا ہے۔“ جواب ملا کچھ نہیں ہوا۔ وہ دوسری طرف کوئی تیز رفتار بس آرہی تھی جو ہماری کار سے ٹکرائی ہوگی۔ دفتر واپس پہنچ کر کار کی بیرونی حالت کا معائنہ کیا تو پتہ چلا کہ پچھلا دروازہ پچک کر آدھی سیٹ پر لیٹا ہوا ہے۔ میں اور رحمان صاحب چپ تھے لیکن جان بچ جانے پر خدا کا شکر ادا کرنے کے بجائے حمید اختر صاحب نے ماہرانہ ڈرائیونگ پر اپنے آپ کو داد کا موقع ہاتھ سے

نہیں جانے دیا۔

واپس چلتے ہیں روزنامہ ”آزاد“ کے اجراء کی طرف، جو اصل میں عبداللہ ملک صاحب اور آئی اے رحمان صاحب کا خواب تھا۔ حمید اختر ”منظوری“ دینے کے لئے تھوڑا بہت وقت نکال لیا کرتے تھے اور میں اپنی ہنڈ افسٹی سی سی سمیت رحمان صاحب کا مستقل مشقتی تھا۔ وہ خود بھی رات بھر جاگنے کے عادی تھے لیکن ”نائٹ برڈ“ کہہ کر خود کو بے قصور سمجھنے کا طعنہ ہمیشہ میرے حصے میں آیا کرتا تھا۔ روزنامہ ”آزاد“ کا ڈیکوریشن عبداللہ ملک صاحب نے اپنے ایک پرانے کامریڈ دوست شیخ ریاض سے ”ادھار“ لیا۔ پھر ایک تہ خانے میں دفتر بنایا گیا۔ ابھی مالی انتظامی معاملات زیر غور ہی تھے اور انتظامات کی شکل بھی نہیں بنی تھی کہ کراچی تک کے بے روزگاروں نے ”آزاد“ کا رخ کر لیا۔ اکثر سینئر لوگوں کی تنخواہیں ہماری اوقات سے باہر تھیں لیکن ”آزاد“ اور اس کے منتظمین شاف بھرتی کرتے گئے۔ ہم میں سے کوئی تنخواہوں میں رعایت مانگتا تو حمید اختر صاحب کی دریا دلی آڑے آجاتی۔ اخبار نکلنے سے پہلے سب سے دلچسپ واقعہ یہ ہوا کہ جب ایڈیٹر کا فیصلہ ہونے لگا تو حمید اختر نے روزنامہ ”امروز“ سے بھاری تنخواہ لینے والے ایک صحافی کا نام پیش کر دیا۔ کچھ دیر سناٹا طاری رہا لیکن آخر مجھے ہی سچ بولنا پڑا جو حمید اختر صاحب کو بہت برا لگا ہوگا۔ میں نے کہا کہ میری صحافتی عمر تو ابھی صرف پانچ سال ہے۔ آپ تینوں حضرات ساہا سال سے مسلمہ ایڈیٹروں میں شمار ہوتے ہیں اور موجودہ صحافت کے درجن ڈیڑھ درجن برانڈ ڈناموں میں شامل ہیں۔ ابھی تک بلا تنخواہ ایڈیٹر بننے کے قابل بھی نہیں بن سکے۔ مختصر سے ایک اور سناٹے کے بعد حمید اختر صاحب (مدیر مسؤل) آئی اے رحمان اور عبداللہ ملک صاحب پر مشتمل مجلس ادارت قائم ہوئی۔ مجھے چیف نیوز ایڈیٹر مقرر کیا گیا۔ ہم چاروں کی شرائط ملازمت میں بلا تنخواہ اخباری کام کرنے کے علاوہ چندے جمع کر کے کارکنوں کو تنخواہیں دینا شامل تھا۔

عبداللہ ملک صاحب کے ملک بھر کے سیاستدانوں سے تعلقات بہت وسیع تھے۔ نئی کار کے مالک تھے، شاندار کپڑے پہنتے تھے۔ مولانا مفتی محمود اور مولانا کوثر نیازی کے ساتھ دو ملاقاتوں میں وہ مجھے بھی ساتھ لے گئے تھے۔ میں نے دیکھا کہ اخبار کے فنڈ مانگتے وقت انہیں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی تھی۔ رحمان صاحب کو میری ہنڈ افسٹی سی سی پر جانا پڑتا تھا۔ اس لئے عام طور پر شرمندگی کے ساتھ وعدہ فردا پر بھی قناعت کرنا پڑتی ہے۔ ابتدائی انتظامات مکمل ہوتے ہی اخبار نکل آیا۔

ہمارا پہلا ہی دن تھا جب ایک مذہبی جنونی نے کراچی ایئر پورٹ پر پولینڈ کے نائب وزیر خارجہ کو گاڑی سے کچل کر قتل کر دیا۔ دوسرے اخبار ڈرگئے لیکن میں نے بالکل سیدھی سرخی لگا دی کہ ”اسے قتل یا ہلاک کر دیا گیا“۔ اگلی صبح ہم

چاروں اخبار مارکیٹ میں گئے تو کچھ ایجنٹوں اور ہاکروں کا خیال تھا کہ حکومت اسی روز ہی ”آزاد“ کو بند کر دے گی لیکن ہمارا اخبار پہلے ہی روز ہٹ ہو گیا۔ اگلے تین دن میں نے مزید حقائق اور مختلف اطلاعات جمع کر کے اصل منصوبے کو بے نقاب کر دیا۔ قاتل جماعت اسلامی کا کارکن تھا اور مولانا مودودی کا سچا پیروکار تھا۔ چار دن میں ”آزاد“ کی دھوم مچ گئی۔ حمید اختر صاحب ادارتی صفحات مکمل ہونے پر چلے جاتے تھے۔ ملک صاحب آدھی رات سے کچھ پہلے تک ساتھ دیتے، میں اور آئی اے رحمان صاحب آخری کاپی تک کام کرتے۔ ادارہ اور میگزین کے صفحات کے ساتھ انتظامی معاملات بھی ان کے ذمے تھے۔ نیوز سیکشن کا انچارج میں تھا۔ میں نے ایسی ایسی سرخیاں لگائیں کہ تاریخ کا حصہ بن گئیں۔ کئی سرخیوں پر عبداللہ ملک صاحب بہت ناراض ہوئے لیکن میری آزادی میں رکاوٹ نہیں ڈالی۔ ”ادھر تم ادھر ہم“ سمیت چند ”مہلک“ سرخیوں پر وہ مجھ پر پھٹ پڑے لیکن میں اپنی اس بات پر اڑا رہا کہ آپ اس ملک کو ٹوٹنے سے نہیں بچا سکتے۔ ملک صاحب اور رحمان صاحب، شیخ مجیب اور بھٹو صاحب کے درمیان کسی نہ کسی تصفیے کے حق میں تھے۔ عبداللہ ملک صاحب کو ایک دن پاکستان کے لئے تحریری اور تقریری جنگ لڑنے کا یہ انعام بھی ملا کہ انہیں بنگالیوں کا حامی قرار دے کر مارشل لاء عدالت نے ایک سال قید کی سزا سنائی۔ یہ مقدمہ بھٹو صاحب کے روزنامہ ”مساوات“ کے مطالبے پر قائم ہوا جس نے ان کی ایک تقریر کو سیاق و سباق سے علیحدہ کر کے انہیں ”غداری“ کا ملزم بنانے کے لئے پورا زور لگا رکھا تھا۔ ”مساوات“ بھٹو صاحب کے نام پر بکتا تھا۔ میں نے یہی ”کارڈ“ زیادہ خوبصورتی سے کھیلا اور ”مساوات“ کی سرکولیشن ہتھیالی۔ ایک موقع ایسا بھی آیا کہ بھٹو صاحب ”آزاد“ کے کنٹرولنگ شیئرز کو خریدنے کے لیے تیار تھے۔ وہ جب بھی لاہور آتے ”مساوات“ اور ”آزاد“ کو آمنے سامنے رکھ کر یہ سوال پوچھا کرتے تھے کہ ان میں سے میرا اخبار کونسا ہے۔ بھٹو صاحب کی حد تک یہ پالیسی سرکولیشن بڑھانے کیلئے میری کامیاب حکمت عملی تھی۔ صرف بھٹو صاحب کے معاملے میں ہی نہیں، میں نے دوسرے اہم واقعات میں سرخیوں اور تصویروں سے ایسے ایسے رنگ بھرے کہ جو امردی کے باوجود ”آزاد“ اردو صحافت کے منفرد دور کی یادگار بن گیا۔

قومی اسمبلی کے انتخابات کے نتائج آنے پر میں نے اتنا خوبصورت اخبار نکالا تھا کہ مارکیٹ میں جاتے ہی ہاتھوں ہاتھ بک گیا۔ اگلے روز منیر نیازی مرحوم نے مجھے بتایا کہ ہاکروں نے تمہارے اخبار کا صرف صفحہ اول دکھانے پر لوگوں سے سات روپے وصول کئے۔ میں نے یہ کہانی اس لئے لکھی ہے کہ ”آزاد“ کی ٹیم میں سے کوئی لکھ یا کروڑ پتی نہیں تھا۔ لیکن واجبی سے کم وسائل کے باوجود ہم نے ”آزاد“ کو ہمیشہ یاد رہنے والا اخبار بنا کر دکھا دیا تھا۔ عبداللہ ملک صاحب مشکل وقت میں ہمیں ”کھو بے“ سے نکال لیا کرتے تھے لیکن مارشل لاء کے مقدمے میں جیل جانے کے بعد جب ان کے

اپنے اٹائے منجھد ہو گئے تو ہمیں ہارمانی پڑی اور اخبار بند ہو گیا۔ میں نے اپنے ”ہنڈا فرینڈ“ رحمان صاحب سے اجازت لے کر اپنی ہنڈا ففٹی سی سی بیچ کر قرضے چکائے اور ”مساوات“ کانیز ایڈیٹر بننے کیلئے رامے صاحب کی پیشکش قبول کر لی۔ یونین میں میرا اپنا گروپ بھی تھا اس لئے میں تو بے عزتی سے بیچ گیا لیکن انہی کارکنوں نے جنہوں نے ”آزاد“ مانگ تا نگ کر ایک سال تک زندہ رکھا تھا، ملک صاحب، حمید اختر، رحمان صاحب کے احسانات کا بدلہ خوب چکایا۔ میں ان کے بارے میں دیواروں پر لگے ہوئے پوسٹر اور سڑکوں پر لٹکتے ہوئے بینر دیکھتا تو میرا دل پھٹنے لگتا تھا، پھر مجھے یاد آتا کہ ہم بے قصور تو نہیں تھے جب ہم بڑی بڑی تنخواہوں والے بے روزگار اور ناکارہ لوگوں پر ترس کھا رہے تھے اور حمید اختر صاحب، رحمان صاحب اور ملک صاحب چندوں، امدادوں، قرضوں کے علاوہ برطرفی کے عوض ملنے والے ذاتی واجبات احسان فراموشوں کی نذر کر رہے تھے۔ انہوں نے مالک بن کر اپنے بارے میں کیوں نہیں سوچا۔ پی ایف یو جے کے عظیم رہنما منہاج برنا صاحب بھی پی پی ایل سے ہمارے ساتھ برطرف ہوئے۔ کچھ برا وقت انہوں نے روزنامہ ”آزاد“ کی تنخواہ پر گزارا۔ جب حالات بہتر ہوئے اور دوبارہ وہ پی ایف یو جے کے صدر بھی بن گئے پھر انہی کے حکم پر پی ایف یو جے کے تین بنیادی ستونوں آئی اے رحمان، عبداللہ ملک اور حمید اختر کو پی ایف یو جے کی رکنیت سے نکالا گیا، بعد میں ایک مرحلے پر میں نے برنا صاحب کے مخالف ضیاء الاسلام انصاری مرحوم کے گروپ کی مدد سے ایگزیکٹو کے اجلاس میں ان کی رکنیت بحال کروائی لیکن اب جب یہ فیصلہ جنرل باڈی کے اجلاس میں پیش ہوا تو ایک خاص گروپ سے ان کے خلاف شرمناک نعرے لگوائے گئے۔ میں شرمندہ ہو کر اجلاس سے باہر نکل آیا۔

حمید اختر صاحب کے بارے میں ابھی بہت سی باتیں باقی ہیں اور ایک سوال کا قرض بھی کئی سالوں سے مجھ پر واجب الادا ہے کہ ”رد انقلاب“ کا مرتکب ہو کر میں لاہور میں دائیں بازو کے ٹریڈ یونین لیڈر ضیاء الاسلام کا ساتھی کیوں بن گیا تھا۔ یہ اسی کہانی سے جنم لینے والی ایک اور کہانی ہے..... لکھوں گا لیکن ”کاکے“ کی ”چیک“ کاراز بتانے کے بعد!



حمید اختر کا کالج دور

تحریر: خاور نعیم ہاشمی 28 ستمبر 2012ء

حمید اختر کے میٹرک کرنے کے بعد سوویت یونین پر جرمن حملے کے بعد دوسری عالمی جنگ میں شدت آگئی تھی۔ ہندوستان آزادی کی جنگ میں اہل رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ترقی پسند تحریک جس کا باقاعدہ آغاز 1936ء میں ہو چکا تھا اور جس کے قائدین میں سجاد ظہیر اور فیض نمایاں تھے، نوجوان اہل قلم کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ جنگ نے ہندوستان میں عوام کی غربت، مہنگائی، بے روزگاری اور بھوک میں بے پناہ اضافہ کیا تھا۔ بنگال کا قحط اپنی تمام ہولناکیوں کے ساتھ جاری تھا اور ترقی پسند ادیب اور شاعرا سے اپنی تحریروں کا موضوع بنا رہے تھے۔ برطانیہ سمیت اتحادی فوجوں کا سوویت یونین کے ساتھ اتحاد ہو چکا تھا، اس کے نتیجے میں ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی، جس پر 1942ء تک پابندی تھی، اب نسبتاً آزادانہ فضا میں کام کر رہی تھی۔ کمیونسٹ پارٹی نے حق خود ارادیت کی بنیاد پر مسلمانوں کے لیے ایک جداگانہ ملک یعنی پاکستان کے قیام کو اصولی طور پر تسلیم کر لیا تھا اور اسکی کھل کر حمایت کر رہی تھی۔

اس فضا میں ہندوستان بھر کے آزادی پسند اور انقلابی نوجوان نئی صف بن دیاں کر رہے تھے۔ پنجاب میں بھی بیداری کی لہر پوری شدت سے ابھر رہی تھی۔ پنجاب کے ساتھ ساتھ موجودہ پاکستان کے دوسرے خطے بھی اس لہر کی لپیٹ میں آ رہے تھے۔ پشاور، چارسدہ، کراچی، حیدرآباد، سکھر، لاہور، راولپنڈی اور کوئٹہ وغیرہ ترقی پسند تحریک کا حصہ بن رہے تھے۔ مشرقی پنجاب میں امرتسر اور لدھیانہ تحریک کے اہم مرکز تھے۔

گورنمنٹ کالج لدھیانہ

لدھیانہ میں گورنمنٹ کالج انقلابی اور ادبی ہنگاموں کا مرکز بن گیا۔ 1942-43ء کے دوران یہاں ایسے نوجوانوں نے داخلہ لیا جو آگے چل کر برصغیر پاک و ہند کے نامور ادیب اور شاعر بنے۔ ان میں پیش پیش عبدالحی نامی ایک نوجوان تھا جس نے ساحر لدھیانوی کے نام سے شہرت پائی۔ دوسرے نوجوانوں میں حمید اختر، سید انور، ظہور نظر، احمد ریاض

ابن انشاء، فیض الحسن چودھری، غلام اسحاق ساقی، اکرم یوسفی اور اعجاز اکرم نمایاں تھے۔ (مقالہ نازیہ بخاری) ساحر، ظہور نظر اور احمد ریاض نے شاعری میں دھومیں مچائیں۔ ابن انشاء نے شعر کے علاوہ نثر میں بھی اپنے کمالات دکھائے۔ سید انور افسانہ نگار کے طور پر نمایاں ہوئے جبکہ حمید اختر نے بیک وقت افسانہ نگاری، صحافت، فلم اور سیاست کے میدانوں میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ ساحر، ابن انشاء اور دوسرے ساتھی کالج میں ان سے ایک ایک سال سینئر تھے۔ (مقالہ نازیہ بخاری) ساحر لدھیانوی سے حمید اختر کا بچپن کا تعلق تھا۔ (انٹرویو ظہیر احمد بابر) جو کالج میں بے حد گہرا ہو گیا۔ ان کے اپنے لفظوں میں "میں نے ہوش سنبھالا تو ساحر لدھیانوی سے تعلق جوڑا" (انٹرویو ظہیر احمد بابر) یا "ساحر ترقی پسندی کا اسیر" اس نے حافظ حمید اختر کو بھی ادھر گھسیٹ لیا" (روزنامہ "ایکسپریس" 14 فروری 2007) یہ دو تین حوالے ساحر اور حمید اختر کے گہرے تعلق کا واضح ثبوت ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اس گروہ میں دوسرے نوجوانوں سے ان کی دلچسپی نہیں تھی۔ ابن انشاء، فیض الحسن چودھری اور باقی دوستوں سے بھی ان کے گہرے یارانے تھے۔ ان کی تحریروں میں ان تمام دوستوں کا بار بار ذکر ملتا ہے۔ ان دوستوں کا بھی جو بعد ازاں ادب میں نمایاں مقام حاصل نہ کر سکے۔ وہ ان سب سے متاثر بھی تھے اور کئی مقامات پر انہوں نے اس کا برملا اظہار کیا۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"یہ لوگ بہت اچھی اچھی باتیں کرتے۔ سیاسی اور سماجی کام بھی کرتے۔ لکھنے پڑھنے میں کم دلچسپی لیتے مگر ساتھ ہی ساتھ اپنی ذاتی زندگی بنانے کی ضرورت سے غافل نہ ہوتے۔ ان میں کسی نے تعلیم ادھوری نہیں چھوڑی، سوائے ساحر کے۔" ("آشنائیاں کیا کیا" ص 176)

نوجوان حمید اختر آزادی اور انقلاب کے رومانس میں بری طرح جکڑے گئے۔ (محمد راشد علی خان، مقالہ) تعلیم کے ساتھ ساتھ انقلاب کے خواب، عوام کی بھوک، ننگ سے نجات کے لیے جدوجہد۔ یہ سب تصورات ان کے شعور کا حصہ بننے لگے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ انقلاب کا خواب محض رومانس نہیں تھا۔ حمید اختر سمیت یہ تمام نوجوان اپنی فکر اور جدوجہد میں بے حد سنجیدہ تھے اور اس کا ثبوت انہوں نے اپنی زندگی بھر کی جدوجہد سے دیا۔ خصوصاً حمید اختر کی زندگی کے پچاسی برس کھلی کتاب کی طرح ہمارے سامنے ہیں اور ان کا سفر اسی جوش و جذبے سے تاحیات جاری رہا جو آغاز سفر میں تھا۔

ساحر لدھیانوی مثالی طالب علم نہیں تھے بلکہ کسی حد تک وہ تعلیم سے بیزار تھے۔ انگریزی تعلیم؟ کیا ہمیں انگریز کی نوکری کرنی ہے؟ پھر اسے کیوں حاصل کریں؟ ان کی دلیل ہوتی۔ یہ دلیل دوسرے دوستوں کو تو قائل نہ کر سکی لیکن حمید اختر اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

حمید اختر کے بھائی ملازم پیشہ تھے۔ ان کے لیے بھی زندگی آسان نہیں تھی۔ عالمی کساد بازاری کے جلو میں دوسری جنگ عظیم ایک عفریت کی طرح اپنے نیچے گاڑ رہی تھی اور سرکاری محکموں میں ملازمت کرنے والے لوگ اپنے خون کا آخری قطرہ تک دے کر بمشکل زندہ رہ پارہے تھے۔ خود اپنے بارے میں اپنے مضمون "ہیوقوف" میں انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں ان تمام حالات کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:

"----- سا حرنے بڑی جامع دلیلوں سے واضح کر دیا کہ ہمیں انگریزی تعلیم حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم نے انگریز کی نوکری کرنی ہی نہیں ہے بلکہ اس ملک کو آزاد کرانا اور عام لوگوں کی حالت بہتر بنانی ہے۔ جنگ کی وجہ سے گرانی نے ملازم پیشہ لوگوں کی زندگی اجیرن کی ہوئی تھی۔ بڑے بھائیوں کے جو سبھی ملازم تھے حالات دیکھ کر موصوف (حمید اختر) نے تعلیم ادھوری چھوڑ دی اور سیاسی تحریکوں اور ادبی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے۔ کبھی لاہور، کبھی لدھیانہ، کبھی شملہ اور کبھی انبالہ میں نظر آتے۔-----"

ابن انشاء نے انبالے میں ملٹری اکاؤنٹس کے محکمے میں ملازمت کر لی تھی۔ اُس نے رہائش کا انتظام کر کے حمید اختر کو انبالے آنے کی دعوت دی۔ حمید اختر کے لفظوں میں

"انبالے لال گرتی میں ایک مزار کے اوپر ایک چوبارہ کرائے پر لے کر اطلاع دی کہ آ جاؤ۔ چنانچہ میں ہر ہفتے کی شام کو لدھیانہ سے بغیر ٹکٹ کے روانہ ہوتا اور اتوار کی رات کو واپس ہوتا۔ میرے بھائی ریلوے میں تھے اور انہوں نے زندگی بھر کبھی ٹکٹ یا پاس کے بغیر سفر نہیں کیا۔ مگر میں نے ان کے نام پر ہزاروں سفر بغیر ٹکٹ کے کیے انبالے کی راتوں کی یہ ملاقاتیں ڈیڑھ دو برس جاری رہیں۔ ان میں ہم اپنے دکھوں، غموں، خوشیوں اور حسرتوں کی باتیں کرتے۔ یہ ترقی پسند ادب کی تحریک کے عروج کا زمانہ تھا۔ متحدہ ہندوستان آزادی کے نعروں سے گونج رہا تھا۔ پاکستان کی تحریک بھی زور پکڑ رہی تھی۔ ہم نے ایک ہفتے میں جو کچھ پڑھا ہوتا اس پر تبادلہ خیال کرتے ایک دوسرے کو مفید مشورے دیتے اور اگلے ہفتے ملنے کا وعدہ کر کے رخصت ہو جاتے۔"

ساحر اس وقت تیزی سے ہردلعزیزی کی منزلیں طے کر رہے تھے۔ اس دوران ان کی نظم 'تاج محل' نے مقبولیت کے تمام ریکارڈ توڑ دیے تھے۔ دوسرے ساتھیوں میں ابن انشاء اپنی تعلیم مکمل کر کے انبالہ میں ملٹری اکاؤنٹس کے دفتر میں کام کر رہے تھے۔ حمید اختر کے لیے وہ دور جدوجہد، مایوسی، تذبذب لیکن ساتھ ہی ساتھ ایک نئی صبح کے طلوع ہونے پر پختہ یقین کا دور بھی تھا۔ وہ شہروں شہروں بھٹک رہے تھے۔ انگریزی ملازمت ان کے مزاج کے خلاف تھی لیکن بھائیوں کے حالات دیکھتے ہوئے وہ کچھ نہ کچھ کرنے پر مجبور تھے۔ 1944ء میں وہ کالج چھوڑ چکے تھے۔ اب وہ تھے اور پنجاب کے

شہروں کی سڑکیں۔ انہوں نے سال ڈیڑھ سال کے مختصر عرصہ میں کئی ملازمتیں کیں۔ کوئی ملازمت خود چھوڑ دی، کہیں سے نکال دیئے گئے۔ بظاہر یہ دوران کی ناکامی کا دور نظر آتا ہے لیکن یہی دور حمید اختر کو حقیقی معنوں میں حمید اختر بنا گیا۔ اپنے نظریات اور اپنی جدوجہد پر ان کا یقین پختہ ہوا۔ وہ دنیا ہار رہے تھے اور دل جیت رہے تھے۔ کسی بھی اعتبار سے یہ گھائے کا سودا نہیں تھا۔ اس بات کا اندازہ اُن کی اُس دور کی سرگرمیوں سے کیا جاسکتا ہے جن میں وہ اور ان کا پورا لدھیانہ گروپ جان کی بازی تک لگا دینے کو تیار رہتا تھا۔ ایسا ہی ایک واقعہ حمید اختر بیان کرتے ہیں:

”1943-44ء کے زمانے میں جب قحط بنگال کے موضوع پر کرشن چندر کا دل ہلا دینے والا افسانہ ’ان داتا‘ چھپ کر آیا تو ہم دوستوں نے فیصلہ کیا کہ بنگال ریلیف فنڈ جمع کرنے کے لیے اس افسانہ کو سٹیج پر پیش کیا جائے، اس فیصلے کا روح رواں ساحر تھا۔ ہر کرشن آرٹسٹ نے جس کی تاریخ پیدائش بھی اور پیدائش کا سال بھی وہی تھا جو ساحر کا تھا (غالباً مارچ 23) اس افسانے کو ”ٹیبلوز“ کی شکل میں پیش کرنے کی تجویز پیش کی (واضح رہے کہ ہر کرشن نے بھی جس کا انتقال تقریباً دس برس قبل بمبئی میں ہوا ہے، نے ساحر کی طرح زندگی بھر شادی نہیں کی تھی) طے یہ ہوا کہ سٹیج پر ایک بھوکا بنگالی ننگے بدن کنٹری کے ساتھ ساتھ خاموش اداکاری کے جوہر دکھائے گا۔ کچھ اور کردار جن میں ایک لڑکا اور لڑکی بھی تھے اسی طرح خاموش اداکاری کا مظاہرہ کریں گے، لدھیانہ کے معروف سینما ریکھی تھیٹر والوں سے بات ہوئی تو انہوں نے اس نیک مقصد کے لیے ہال مفت دیدیا۔ ہفتے بھر کی ریہرسل کے بعد جب مقررہ دن یہ ڈرامہ سٹیج کرنے کا وقت آیا تو دیکھتے ہی دیکھتے نہ صرف ہاؤس فل ہو گیا بلکہ سینکڑوں لوگوں نے ڈیڑھ دو گھنٹے کھڑے رہ کر اسے دیکھا۔ ساحر نے پردے کے پیچھے سے ”ان داتا“ افسانہ پورے کا پورا متن پڑھا اور اپنی آواز کے زیر وبم سے لوگوں کو رولا دیا۔ فیض الحسن نے جو ہم سب میں سے سب سے کمزور اور لاغر تھا، بھوکے بنگالی کے کرب و اضطراب کی لاجواب اداکاری کی۔ ڈیڑھ گھنٹے تک پورا ہال دم سادھے بیٹھا رہا اور جب بتیاں روشن ہوئیں تب بھی کافی دیر تک لوگ اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھے رہے۔ ڈرامہ دیکھنے والے حضرات اور خواتین نے ٹکٹ کی رقم کے علاوہ نقد رقم بھی جمع کرائی اور اس طرح قحط بنگال کے لیے اچھا خاصا فنڈ جمع ہو گیا۔ ابھی ہم لوگ اپنی اس کامیابی کا پوری طرح جشن بھی نہیں منا پائے تھے کہ تیسرے ہی روز ہم سب لوگوں کے نام سمن جاری ہو گئے اور ہمیں بتایا گیا کہ ہم نے حکومت وقت کے خلاف باغیانہ ڈرامہ سٹیج کیا، ہم ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر کی عدالت میں پیش ہو کر وجہ بیان کریں کہ کیوں نہ ہمارے خلاف قانونی کارروائی کی جائے؟ تھوڑی سی تگ و دو کے بعد ہمیں یہ پتہ چلا کہ اس ڈرامے کے خلاف تحریری اطلاع لطفی صاحب نے ڈی سی لدھیانہ کو بھجوائی تھی، نیز یہ بھی پتہ چلا کہ ہمارا جرم ثابت ہونے پر کارروائی ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے تحت ہوگی۔ ڈرامہ اتنا سخت ہے کہ ایسا ڈرامہ کرنے والوں میں سے ہر شخص

گیا۔۔۔“ (اقتباس ”آشنائیاں کیا کیا“ ص-176)

بظاہر لطیف پیرائے میں خود اپنے بارے میں لکھے گئے اس دلچسپ طنزیے کو ایک اور جگہ انہوں نے سنجیدہ انداز میں امریکی سامراج کی اخلاقی حالت کو اپنے استہزا کا نشانہ بنایا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل انہوں نے اپنے ایک کالم ”ہاؤس وائف اور ہاؤس سپینڈ“ میں بیان کی ہے:-

”یہ 1944ء یعنی دوسری جنگ عظیم کا زمانہ تھا۔ ہماری عمر اس وقت بیس اکیس برس تھی اور ہم ٹیلی فون ریونیو اکاؤنٹس آفس میں ملازمت کے سلسلے میں دہلی میں مقیم تھے۔ ملازمت کے تیسرے مہینے میں ہم نے وہاں کسی مسئلہ پر ہنگامہ کر کے ہڑتال کرادی۔ جنگ کا زمانہ تھا۔ ہڑتال کرنے والوں کو ڈیفنس آف انڈیا کے تحت گرفتار کر کے ٹھکانے لگانے کے حکم سے آگاہی ہمیں ہڑتال کرانے کے بعد ہوئی، چنانچہ ہم دہلی کی یہ ملازمت اور 25 دن کی تنخواہ چھوڑ کر (جس کا ہمیں آج تک افسوس ہے) شملہ پہنچ گئے۔ گھر جا نہیں سکتے تھے کہ گھر والوں نے ہماری مرضی کے خلاف ہمیں متذکرہ نوکری پر بھیجا تھا۔ شملہ میں ایک دوست کے ساتھ خفیہ قیام کے دوران ہمیں پتہ چلا کہ ایک جگہ لوگ نوکری کے لیے قطار میں کھڑے ہیں چنانچہ ہم بھی اپنی سندت اور کاغذات لے کر وہاں پہنچ گئے اور انٹرویو کرنے والے امریکی کرنل صاحب نے ساٹھ ستر آدمیوں میں سے ہمیں منتخب کر کے شملہ سے کچھ فاصلے پر واقع ایک مقام سباتھو میں واقع امریکیوں کے ریسٹ کیمپ میں بطور سپر وائزر متعین کر کے بھجوا دیا۔ سباتھو کے اس ریسٹ کیمپ میں امریکی فوجی آرام (بلکہ عیش) کرنے کے لیے محاذ سے پندرہ روز کے لیے آتے تھے۔ ان کے خورد و نوش کا انتظام ہمارے ذمہ تھا۔ ہم نے اپنا کام سنبھالا تو تیسرے روز ہی ہمیں حکم ملا کہ صبح دس بجے میڈیکل ٹیسٹ کے لیے ہسپتال پہنچ جاؤ، جب ہم وہاں پہنچے تو ایک ادھیڑ عمر امریکی ڈاکٹر اور دونو جوان امریکی ڈاکٹروں کا بورڈ ہمارے معائنے کے لیے منتظر بیٹھا تھا۔ چند ابتدائی سوالات کے بعد انہوں نے کہا ”کپڑے اتار دو“ ہم نے جھجکتے ہوئے قمیض اتاری تو ایک بت طنز نے پتلون کی طرف اشارہ کیا۔ اب ہمارے جیسا نو جوان جو دس برس کی عمر تک گاؤں میں اور پھر لدھیانہ جیسے چھوٹے شہر میں رہا ہو یہ جرأت اور وہ بھی خواتین کی موجودگی میں کیسے کر سکتا تھا۔ چنانچہ ہم نے ان کو ٹالنے کی بہت کوشش کی مگر یہ لوگ کہاں باز آنے والے تھے انہوں نے کھلے دروازے اور کھڑکیوں والے اس کمرے میں جہاں مرد اور دو خواتین موجود تھیں ہمیں مکمل قدرتی لباس میں اٹھا بٹھا کر ہمارا معائنہ مکمل کیا اور ہمیں پاس بھی کر دیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ آئندہ چند روز تک ہمیں اس راستے کی طرف سے گزرنے کی جرأت تک نہ ہو سکی بعد میں ہمیں وہاں امریکی طرز زندگی کے مطالعے کے بہت سے مواقع میسر آئے اور ہم کئی ماہ تک یہ منظر دیکھتے رہے کہ آٹھ دس امریکی سپاہی کندھوں پر تو لیے ڈال کر اسی قدرتی لباس میں اجتماعی غسل خانے تک روزانہ باجماعت مارچ کرتے اور

اسی حالت میں خراماں خراماں اپنی بارکوں میں واپس چلے جاتے۔ امریکیوں کے لیے یہ معمول کی بات تھی البتہ ہندوستانی ملازمین انہیں اس حالت میں دیکھ کر منہ دوسری طرف پھیر لیتے۔ خیر یہ چونکہ ریستہ کمپ تھا اور یہاں کھانے پینے کی اشیاء کی فراوانی تھی جن کا چارج ہمارے پاس تھا اور جن کے استعمال پر کسی قسم کی پابندی یا جواب دہی کا خطرہ نہ تھا۔ اس لیے ہم نے اپنے دوست ساحر لدھیانوی کو خط لکھا کہ ہمارے پاس آ کر چند روز قیام کرو۔ تمہیں عیش کرائیں گے، چند روز بعد ساحر ہمارے مشترکہ دوست شورش کاشمیری کے ساتھ جوان دنوں انبالے میں اپنے سسرال آئے ہوئے تھے سب باتھو پہنچ گئے۔ ہم نے دو تین روز ان کی خوب مہارت کی۔ جب وہ دونوں سباتھو سے انبالہ کے لیے روانہ ہوئے تو ان کے تین گھنٹے کے بعد ہمیں کمپ کے دفتر میں طلب کیا گیا اور برخواستگی کے کاغذات معہ واجبات کے ہمیں تمہا دیئے گئے یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ برخواستگی کے حکم نامے میں شورش کاشمیری جیسے خطرناک آدمی کی میزبانی کو اس کارروائی کی وجہ قرار دیا گیا تھا۔ ساحر تو اس وقت تک خطرناک نہیں ہوا تھا مگر شورش کاشمیری انگریز کے خلاف تقریروں کے جرم میں تین چار برس کی سزا بھگتتے کے بعد کچھ عرصہ قبل ہی رہا ہوا تھا اور خفیہ پولیس مسلسل اس کی نگرانی پر مامور تھی۔

خیر یہ ذکر تو محض فوج سے کسی نہ کسی قسم کے تعلق کے اظہار کے سلسلے میں آ گیا جس کے نتیجے میں ہماری امریکہ سے کشمکش شروع ہوئی جو عمر بھر جاری رہی۔ ہمارے ایک دوست کا جو ماہر نفسیات ہیں، کہنا ہے کہ امریکی 1944ء میں تمہارے کپڑے نہ اتروا تے تو تم امریکی سامراج کے خلاف عمر بھر مورچے نہ لگائے رہتے۔“ (حمید اختر، ”پرسش احوال“ ص 175-176)

یہ سارے واقعات ظاہر کرتے ہیں کہ حمید اختر برطانوی حکمرانی کا کل پُرزہ بننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ غربت کی گود میں پل کر جوان ہونے والے ادیب کو غیر سنجیدہ ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ تو یہ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ کالج چھوڑنے سے ملازمتیں چھوڑنے تک انہوں نے برطانوی نظام کا حصہ بننے سے انکار کر دیا۔ انہیں اپنے بھائیوں کی قربانیوں کا شدید احساس تھا۔ وہ نہ غیر سنجیدہ تھے نہ بے حس۔ بلکہ حد سے زیادہ بڑھے ہوئے احساس نے ہی انہیں ایسا بنا دیا تھا۔ غیر شعوری طور پر وہ یہ بھی ظاہر کر رہے تھے کہ انہیں نہ آج اور نہ آئندہ برسوں میں غلامی کے استحصالی نظام کا حصہ بننا ہے، انہوں نے ہمیشہ اپنے قلم سے زمین کھودی اور اس میں سے روٹی اگائی۔ اپنے لیے بھی اپنے خاندان کے لیے بھی جبکہ ان کا فن اہل وطن کے لیے وقف تھا۔ جس کا انہوں نے کبھی ڈھنڈورا نہیں پیٹا۔ ان کی تحریریں بھی اس طرح کی خود پسندی سے عاری ہیں۔ وہ ان دلچسپ واقعات کو بیان کرتے ہوئے کبھی نہیں تھکتے تھے جن کا وہ خود بھی حصہ تھے اور لدھیانہ گروپ سے وابستہ ان کے تمام ساتھی بھی۔ مثلاً ایک بار ان کے گروپ کے ایک ساتھی جے دیورما، جو بعد میں ہندوستان کے

مشہور موسیقار بنے اور کچھ عرصہ طلعت محمود کرساتھ لکھنؤ کے میوزک کالج میں رہتے تھے نے آکر ساحر کو بتایا کہ طلعت محمود نے اس کی تین چار غزلیں ریڈیو پر گانے کے لیے منگوائی ہیں۔ ساحر نے جو ”تاج محل“ اور ”چکے“ جیسی نظمیں لکھ کر معروف ہو چکا تھا اس وقت تک چند ہی غزلیں لکھی تھیں جن میں

محبت ترک کی میں نے، گریباں سی لیا میں نے

قابل ذکر تھی۔ خیر گروپ کے دوستوں نے اسی وقت تین غزلیں نقل کر کے بے دیو کے حوالے کر دیں اور اب ریڈیو سے ان کے نشر ہونے کا انتظار ہونے لگا۔ ایک روز لکھنؤ سے خبر آئی کہ غزلیں مل گئی ہیں اور ان کی شمولیت کا فیصلہ کر لیا گیا ہے۔ انہیں نشر کرنے کی تاریخوں کا فیصلہ ہونے پر دوسرے خط میں اطلاع دی جائے گی۔ اس واقعہ کو حمید اختر نے اپنی باکمال جزئیات نگاری کے ساتھ بیان کیا ہے:

”کافی دن گزر گئے بہر حال ایک روز وہ خط موصول ہوا جس میں اس پروگرام کی تاریخ اور وقت درج تھا جس میں دو غزلیں گائی جانے والی تھیں۔ جہاں تک مجھے یاد ہے۔ ساحر کے سوا ہم میں سے کسی اور کے پاس ریڈیو نہیں تھا ساحر کا ریڈیو بھی خاصا پرانا اور معمولی سا تھا تاہم اس سے لاہور اور دہلی ریڈیو کے پروگرام آسانی کے ساتھ سنے جاسکتے تھے۔ متذکرہ خط ملنے کے بعد ہم لوگ گھنٹوں لکھنؤ ریڈیو ڈھونڈنے کی کوشش کرتے رہے بالآخر کامیاب بھی ہو گئے مگر اس کے پروگرام صاف اور واضح سنائی نہیں دیتے تھے۔ رات کو نو دس بجے تک تو کسی حد تک آواز صاف ہو جاتی مگر اس سے پہلے خاصی کھڑکھڑ سنائی دیتی رہتی۔ ریڈیو کی مرمت کرائی گئی انیٹنا وغیرہ کو خاصی بلندی تک لیجا کر فکس کیا گیا اور مقررہ تاریخ کو تمام دوست اس چھوٹے سے کمرے میں جمع ہو گئے جو ساحر کے تین مرلے کے گھر کی بالائی منزل پر تھا اور جس میں ایک پلنگ کے علاوہ صرف تین یا چار کرسیاں رکھنے کی جگہ تھی۔ پروگرام کے مقررہ وقت سے ایک گھنٹہ قبل ہی لکھنؤ ریڈیو آن کر دیا گیا۔ پوربی پروگرام بھی یار لوگوں نے سنے اور بکے گانوں سے بھی دل بہلایا گیا۔ بالآخر وہ گھڑی آپہنچی جب ریڈیو لکھنؤ کے اناؤنسر نے اعلان کیا کہ اب طلعت محمود ساحر لدھیانوی کی غزل گائیں گے۔ غزل شروع ہوئی۔ ابھی پہلا مصرع ہی مکمل ہوا تھا کہ ریڈیو سے کھڑکھڑ کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔ کمرے میں مکمل خاموشی طاری تھی ہر شخص ریڈیو کی آواز بہتر بنانے کے لیے اپنی سی کوشش کر رہا تھا۔ سوئی گھماتے آخر شیشین ہی غائب ہو گیا۔ کافی محنت کے بعد جب دوبارہ آواز سنائی دی تو طلعت محمود غزل کے چوتھے شعر کا دوسرا مصرع گارہا تھا۔ ابھی ہم لوگ اس سے لطف اندوز ہونے کی کوشش ہی کر رہے تھے کہ ساحر کے مکان کے پچھواڑے سے ریلوے لائن پر سے ایک تیز رفتار گاڑی گزرنے کی آواز کے شور میں ساری آوازیں دب گئیں۔ یہ مکان ایسی جگہ واقع تھا اور اتنا ہوائی قسم کا تھا کہ گاڑی گزرتے وقت پورا مکان ہلنے لگتا تھا۔

اس وقت جب ہم سب اپنے دوست کی ریڈیو پر پہلی گائی جانے والی غزل سننے کی کوشش کر رہے تھے۔ ریل گاڑی کے اس سفر نے نہ صرف مکان کو ہلا دیا بلکہ غزل کا پانچواں شعر بھی غائب کر دیا۔ بہر حال یہ ایک تاریخی شام تھی اس روز تو ہم پورے پروگرام سے لطف اندوز نہ ہو سکے مگر بعد میں 1944ء کے دوران متعدد بار لکھنؤ سے طلعت محمود کی آواز میں ساحر کی غزلیں سنتے رہے اور یوں اس سے ہم سب کا ایک تعلق قائم ہو گیا۔“

لیکن ایک اور واقعہ جس کا ذکر حمید اختر بار بار کرتے ہیں وہ ساحر کی کالج بدری کے حوالے سے ہے۔ ان کے خیال میں یہ ایسا واقعہ تھا جس نے ساحر کی زندگی کا رخ بدل دیا اور ساحر کے کچھ دشمنوں نے ایک سکھ لڑکی ایشور سے اس کے معاشقے کی بنیاد بنا کر اسے کالج سے نکلوا دیا۔۔۔۔۔ ساحر کی بعد کے دور کی ایک نظم ’نذر کالج‘ اسی پس منظر کو اجاگر کرتی ہے جس کا ایک مصرعہ تھا۔

گریاں نہیں تو یاں سے نکالے ہوئے تو ہیں

کالج بدری کے اس واقعہ کے درجنوں راوی ہیں لیکن ان میں سے زیادہ تر نے سنی سنائی باتوں میں اپنا رنگ اور مصالحو ڈال کر نشر کیا ہے۔

اس کے بعض چاہنے والوں نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ لڑکی محض بہانہ تھی، دراصل اسے اپنی باغیانہ اور انقلابی سرگرمیوں کی وجہ سے کالج بدر کیا گیا تھا لیکن حمید اختر کے بیان سے اس بات کی تصدیق نہیں ہوتی اگرچہ وہ بھی ساحر کے باغیانہ مزاج کا برملا اظہار کرتے ہیں لیکن سیاق و سباق کے ساتھ۔ ان کے بقول:

”اس کی والدہ نے اسے شہزادوں کی طرح پالا تھا۔ اپنا زیور سامان غرض یہ کہ جو کچھ بھی تھا وہ سب بیچتی رہی۔ پھر اسے اپنے بھائیوں کے آگے دست طلب دراز کرنا پڑا۔ یہ سب ساحر کو پسند نہیں تھا۔ مگر اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ اس لیے وہ ابتدائی زندگی ہی سے سماج کا باغی بن گیا۔۔۔ اس کی ابتدائی نظمیں میرٹھ سے زیر زمین شائع ہونے والے پرچے ”کرتی لہر“ میں چھپیں جن میں غیر ملکی حکومت اور موجودہ سماجی ڈھانچے سے نفرت کا اظہار ہوتا تھا۔ پھر اس نے پہلا عشق بھی ایک سیاسی کارکن کی بیٹی مس پریم چودھری سے کیا جو خود بھی ایک پر خلوص سیاسی کارکن تھی۔ بد قسمتی سے یہ لڑکی تپ دق سے مر گئی۔ ساحر اس کے لیے بہت رویا کئی ہفتے افسردہ رہا۔ یہ اسکی کالج کی زندگی کے بالکل ابتدائی دنوں کی بات ہے۔ تھوڑے عرصے کے بعد کالج کی دلچسپیوں نے اس خاتون کا غم بھلا دیا۔ اس زماں میں کالج کے پرنسپل ایک نہایت متوازن ذہن کے مالک انگریز مسٹر ہاروے تھے۔ وہ روایتی قسم کے انتہائی مشفق ماہر تعلیم تھے اور طلباء سے بچوں کی طرح پیار کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ لدھیانہ گورنمنٹ کالج انتہائی ترقی پسندانہ سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بنا رہا۔ دوسری

جنگ عظیم کے دوران سخت گیر ملکی قوانین کے باوجود ساحر کالج میں اپنی باغیانہ اور انقلابی نظموں کی وجہ سے مقبول ہوتا گیا۔ اس کے گروپ میں تین چار ایسے ہی اور لڑکے بھی موجود تھے۔ چودھری غلام مرتضیٰ، فیض الحسن چودھری، سراج الحق حافظ، مس اقبال ڈار اور متعدد دوسرے طلباء یونین لٹریچر سوسائٹی پر قابض تھے۔ اس لیے ان کی باغیانہ سرگرمیاں کالج بلکہ شہروں کی حدوں میں بھی گونجنے لگیں۔ کالج سے باہر کے دوستوں میں میرے بڑے بھائی صفدر علی جو بہت اچھا ادبی ذوق رکھتے تھے شامل تھے۔“

”جہاں تک ایشر کور کی بات ہے وہ دہلی پتلی خاموش طبیعت، بلکہ انتہائی شرمیلی لڑکی تھی۔ اس کی آنکھیں بہت خوبصورت تھیں، بڑی بڑی بولتی ہوئی، مگر حزن ویاس سے بھری ہوئیں۔ وہ کسی سے بات نہیں کرتی تھی۔ یار لوگوں نے اس کا نام نسوانیت رکھا ہوا تھا۔ ہوسٹل میں رہتی تھی۔ ساحر اس پر فدا ہو گیا۔ مگر کافی عرصے تک اس نے اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ لیکن آخر کار وہ بھی اس میں دلچسپی لینے لگی۔ چھٹی کے دن تنہائی میں ان دونوں کو ساتھ دیکھ کر شور مچا دیا گیا۔ ایک سکینڈل بن گیا جو لدھیانہ جیسے چھوٹے سے شہر کے لیے بہت بڑی بات تھی۔ کسی نے کہا ساحر ایشر کو بھگا کر لے جا رہا تھا۔ کسی نے کہا کچھ لڑکوں اور پروفیسروں نے ساحر کو اس لڑکی کے ساتھ رنگے ہاتھوں پکڑ لیا ہے۔ بہر حال نوبت یہاں تک پہنچی کہ انتظامیہ نے ان دونوں کو کالج سے نکال دیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ انواہیں جب اس کے والد تک پہنچیں تو وہ اپنے گاؤں سے گھوڑے پر بیٹھ کر ساحر کے گھر آیا اور اس سے کہا ”تم نے یہ کیا غضب کیا؟ سکھ لڑکی پر ہاتھ ڈالا۔ کوئی مسلمان لڑکی پسند کرتے تو میں خود اسے اٹھا کر تمہارے پاس لے آتا“ ساحر بہت کمزور اور نحیف و نزار قسم کا نوجوان تھا جب کہ اس کا والد اس عمر میں بھی مضبوط کاٹھی کا مالک تھا۔ اس نے بجا طور پر سوچا کہ اٹھا کر لانے کا کام یہ نوجوان تو نہیں کر سکتا۔ ساحر یہ واقعہ ہمیشہ اپنے دوستوں کو مزے لے لے کر سنا تا تھا۔“ (حمید اختر ”پرسش احوال“ ص۔ 20-919)

لیکن ساحر اور ایشر کور کی کہانی یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی، جب تک ساحر زندہ رہا، اس کی بازگشت سنائی دیتی رہی بلکہ اس کی موت کے بعد بھی ساحر کے بچپن کے دوست اور اس واقعہ کے معتبر ترین گواہ اور راوی حمید اختر نے اسے ہر قسم کا مبالغہ آرائیوں سے پاک رکھنے کے لیے اسے بار بار بیان کیا۔ بعد کے واقعات کے سلسلے میں ان کا بیان ہے کہ

”ایشر کور کا تعلق لدھیانہ سے آٹھ میل کے فاصلہ پر واقع ایک گاؤں بدووال سے تھا۔ اس کا باپ اچھا خاصہ زمیندار تھا۔ جب ساحر اور اسے لدھیانہ گورنمنٹ کالج سے نکال دیا گیا اور وہ گاؤں چلی گئی تب بھی ہمارے ایک مشترکہ دوست پرکاش کی بیوی کے ذریعے جو اس گاؤں کی رہنے والی تھی۔ ان کے درمیان نامہ و پیام کا سلسلہ جاری رہا۔ ایک دفعہ کچھ دوستوں کے ہمراہ ساحر اس کے گاؤں گیا بھی تھا۔ اتفاق سے اس وقت گھر پر ایشر کور کا والد موجود نہیں تھا۔ ایشر کور نے

ساحر اور اس کے ساتھی کو دیکھتے ہی کہا کہ یہاں سے فوراً بھاگ جاؤ۔ میرا باپ آگیا تو وہ تم لوگوں کو قتل کر کے اس حویلی میں دفن کر دے گا اور کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا۔ یہ سن کر یہ لوگ واقعی وہاں سے بھاگ آئے۔ کچھ عرصے بعد ایشر کو راپنا گھر چھوڑ کر لدھیانہ ساحر کے گھر آگئی۔ وہ اس سے شادی کے لیے تیار تھی۔ ہم سب دوستوں کا مشورہ بھی یہی تھا کہ وہ شادی کر لے مگر ساحر اپنی روایتی بزدلی اور عدم تحفظ کے احساس کی وجہ سے اس کے لیے تیار نہیں ہوا۔ چنانچہ ایک رات اس کے گھر قیام کرنے کے بعد وہ اگلی صبح بمبئی چلی گئی جہاں اس نے اپنے کسی دُور کے رشتے دار سے شادی کر لی۔ اس کے جانے کے فوراً بعد سے ساحر نے بمبئی جا کر فلمی گیت لکھنے اور شہرت اور دولت حاصل کرنے کے منصوبے بنانے شروع کر دیئے۔ 1942ء سے لے کر 1946ء تک وہ اٹھتے بیٹھتے ایک ہی بات کرتا تھا کہ وہ فلمی گانوں کے ذریعے کامیابی اور شہرت حاصل کرے گا تو ایشر کو خود ہی اس سے ملنے کے لیے آئے گی۔“

ساحر کی دیگر محبتوں میں امرتا پریت، لتا منگیشکر، سدھا ملہوترا اور اردو کی ایک معروف افسانہ نگار سے قریب ہو کر دُور بھاگ جانے کی کہانیوں کے بیان کا یہ موقع نہیں ہے لیکن اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ جب چند سال پہلے حمید اختر کی امرتا پریت سے تفصیلی ملاقات ہوئی تو وہ اسے بھولی نہیں تھی وہ ان سے بار بار یہی پوچھتی رہیں کہ بمبئی میں ساحر کی ایشر کو سے ملاقات ہوئی تھی یا نہیں۔

پریت نگر

ان برسوں میں حمید اختر کا 'پریت نگر' سے تعلق بھی قائم ہوا۔ جس طرح مہا کوی ٹیگور نے شانتی نکلتین میں ایک تعلیمی بستی آباد کی، اسی طرح پیشے کے اعتبار سے ایک کامیاب انجینئر لیکن پنجابی کے ترقی پسند ادیب سردار گور بخش سنگھ نے امرتسر سے چند میل کے فاصلے پر 'پریت نگر' نامی بستی بسائی۔ وہاں سے انہوں نے پنجابی اور اردو زبان میں ماہنامہ 'پریت نگر' بھی جاری کیا جو نوتج سنگھ کے بیٹے اور ان کے پوتے سمیت سنگھ کی بیوہ ابھی تک نکال رہی ہیں۔ سردار گور بخش سنگھ کے بیٹے نوتج سنگھ بھی پنجابی کے ترقی پسند ادیب تھے۔ 'پریت نگر' کو پورے شمالی ہندوستان کے ترقی پسند ادیبوں اور سماجی انقلاب کے لیے جدوجہد کرنے والے سیاسی کارکنوں کے مرکز کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ 'پریت نگر' ابھی تک پرانی روایات کے امین کے طور پر قائم دائم ہے لیکن سردار گور بخش سنگھ اور نوتج سنگھ کے بعد اپنی آب و تاب کھو چکا ہے۔

حمید اختر نے 1943ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ 1944ء میں وہ اور ساحر پریت نگر کے ایک اجتماع میں شریک ہونے کے لیے پریت نگر گئے۔ سردار گور بخش سنگھ ہر سال ادیبوں، شاعروں اور انسان دوست دانشوروں کا اجتماع منعقد کرتے، جس میں ہندوستان کے کونے کونے سے ادیب، شاعر اور انسان دوست دانشور شریک ہوتے۔ حمید اختر نے

”بیٹے دنوں کی یادیں“ میں اس اجتماع کا سرسری ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ وہاں انہوں نے ”پہلی بار امرتا پر تیم کو دیکھا“ وہ سترہ اٹھارہ برس کی ایک خوبصورت بھرپور سکھ خاتون تھی اور جب رات کو مشاعرے میں اس نے اپنی پنجابی نظم سنائی تو مشاعرہ لوٹ لیا۔ ساحر حُب معمول اس پر فوراً عاشق ہو گیا لیکن ایک سرسری اور رسمی ملاقات سے زیادہ بات چیت نہ ہو سکی۔

البتہ 1945ء میں جب حمید اختر اور ساحر لاہور میں اکٹھے تھے تو امرتا کی شادی ہو چکی تھی لیکن اس کی امرتا سے چند ملاقاتیں ہوئیں جو زندگی بھر کے رومانس پر پھیل گئیں۔ شاید ”پریت نگر“ کی اس ملاقات نے دونوں کے جذباتی اور تخلیقی ارتقاء میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ امرتا کے لفظ ہیں:

”ساحر کی محبت میں میں نے اپنے من کا وہ عالم دیکھا ہے جب مجنوں لیلیٰ لیلیٰ پکارتا خود لیلیٰ بن جاتا ہے جب آدمی خود سے خدا ہو جاتا ہے۔۔۔“



حمید اختر: شخصیت اور فکر

افتخار قریشی، یکم اکتوبر 2012ء

پاکستان کے نامور ادیب، صحافی، دانشور، بائیں بازو کے مفکر، تحریک ترقی پسند مصنفین کے اہم رہنما، حمید اختر طویل علالت کے بعد سرطان کی بیماری کے باعث، 16 اکتوبر 2011ء کو 88 سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ ان کے پس ماندگان میں بیوی سعدی حمید، چار بیٹیاں بشری حمید، صبا حمید، ہما حمید اور لالہ رخ اور ایک بیٹا عمر شامل ہیں۔

حمید اختر مشرقی پنجاب کے ضلع لدھیانہ کے گاؤں تہاڑا (تخصیل جگراؤں) میں 1924ء میں پیدا ہوئے۔ وہاں ان کا سید خاندان اکبر بادشاہ کی طرف سے دی گئی پانچ سو ایکڑ اراضی کا مالک تھا۔ یہ ذہن میں رہے کہ مغلیہ دور میں ملک کی تمام اراضی حکومت کی ملکیت میں تھی اور صرف امتیازی خدمات پر چند افراد کو ملکیتی زمین دی جاتی تھی۔ یہ اراضی ان کے خاندان کے اکبر بادشاہ کے ہم عصر شاہ دیوان کو جو کہ شاہی فوج میں اچھے عہدے پر فائز تھے، کو اپنی مرضی سے فوج چھوڑنے کے موقع پر دی گئی تھی۔ جس شاہی فرمان کے تحت یہ اراضی دی گئی تھی وہ ان کے خاندان میں تقسیم ہند کے موقع تک موجود تھا۔ انہی بزرگ کے فوت ہونے پر اکبر بادشاہ کی طرف سے 100 ایکڑ مزید اراضی ان کے مزار کے لئے وقف کی صورت میں دی گئی۔ یہ مزار اب تک شاہ دیوان کے مزار کے نام سے جانا جاتا ہے اور ارد گرد کے سینکڑوں دیہات کے لوگوں کے لئے، لاہور کے دائرہ بار کی طرح مرجع خلافت ہے۔ جس پر اب ہندو اور سکھ مرد و خواتین اپنی دعاؤں کے لئے ہر جمعرات (یا باقی دنوں میں) حاضری دیتے ہیں اور نذرانہ چڑھاتے ہیں۔ (مزار اب بھات کے محکمہ اوقاف کی تحویل میں ہے)۔

حمید اختر کے خاندان کا سلسلہ نصب خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے ساتھ جا ملتا ہے۔ ان کے دادا نے بوقت مرگ بعض وجوہ کی بنا پر نصیحت کی کہ ان کی اولاد آئندہ کے لئے پیری مریدی نہ کرے اور خود کام کر کے روزی کمائے۔ کئی قسم کے حالات و واقعات ان کی زندگی پر اثر انداز ہوئے اور ان کی زندگی کے رخوں کو مرتب کیا۔ انہوں نے

دس سال کی عمر میں اپنے ہی خاندان کے قائم کردہ مدرسہ سے جوان کے دیوان خانے سے ملحق تھا، قرآن پاک حفظ کیا۔ (اس مدرسہ کا تمام خرچ ان کا خاندان برداشت کرتا تھا) بعد میں وہ لدھیانہ شہر کے گورنمنٹ ہائی سکول میں داخل کرائے گئے۔ ان کے سکول کے ساتھیوں میں ساحر لدھیانوی، شیر محمد جو بعد میں ابن انشاء کے نام سے مشہور ہوئے اور معروف اور بے مثال کارٹونسٹ انور (ننھا کارٹون والے) شامل تھے۔

انہوں نے سکول کے زمانے میں ماسٹر برکت علی کے کہنے پر ”آوازیں“ کے عنوان سے ایک مضمون لکھا جس پر ماسٹر صاحب نے ان کو دس میں سے چار نمبر دیئے جو ان کے تعلیمی ریکارڈ کے پیش نظر ان کے لئے مایوسی کا باعث بنے۔ انہوں نے یہ مضمون ابن انشاء کو دکھایا اور کم نمبر ملنے کا گلہ کیا۔ ابن انشاء نے مضمون گھر پر پڑھنے کے لئے اپنے پاس رکھ لیا اور اگلے دن واپس کیا اور مضمون کی تعریف بھی کی۔ ابن انشاء نے حمید اختر کو بتائے بغیر مضمون نقل کر کے اس زمانے کے موقر ادبی جریدہ ”ہمایوں“ کو بھیج دیا۔ یہ مضمون قابل اشاعت قرار پایا۔ یوں سولہ سال کی عمر میں حمید اختر ایک سکھ بند، ادیب بن گئے۔

ساحر لدھیانوی کے ساتھ ان کا روز کا اٹھنا بیٹھنا تھا۔ جس کی تحریک ترقی پسند مصنفین سے وابستگی نے حمید اختر کو اس حلقہ میں شامل ہونے کی ترغیب دی۔ حمید اختر نے میٹرک پاس کرنے کے بعد کالج میں داخلہ لیا تو ساحر نے کالج کی تعلیم کو جاری رکھنے کی مخالفت کی اور کہا کہ انگریز کی تعلیم کے بعد انگریز کی نوکری نہیں کرنی بلکہ انگریز سے آزادی حاصل کرنے کی جدوجہد کرنی ہے انہی دنوں 1995ء میں ساحر کو بمبئی کی فلم ”آزادی کی راہ پر“ کے لئے گانے لکھنے کی پیش کش ہوئی تو اس نے اس فلم کے لئے مکالمات لکھنے کی ملازمت حمید اختر کے لئے حاصل کر لی۔ یوں وہ دونوں کالج چھوڑ کر بمبئی کے لئے روزانہ ہو گئے۔

بمبئی میں ان کا قیام ممتاز ترقی پسند ادیب کرشن چندر کے گھر پر تھا جہاں حمید اختر کی ملاقات سید سجاد ظہیر سے ہوئی جو عمر بھر کی دوستی اور کمیونسٹ پارٹی سے وابستگی کا باعث بنی۔ وہیں ان کی ملاقات مشہور دانش ور سید سبط حسن سے ہوئی جن سے بعد میں ہمیشہ قربت رہی۔

وہ دولت کی مناسب تقسیم کی بنا پر ایک انصاف پسند معاشرے کے قیام کے متمنی تھے جو مساوات پر مبنی ہو اور سوشلزم اور اسلامی سوشلزم کی نمائندگی کرتا ہو۔ جو سرمایہ دارانہ نظام کے استحصال سے نجات دلا سکے اور انسان دوستی کی قدروں پر استوار ہو۔ اس کے لئے وہ عمر بھر کوشش کرتے رہے اس دوران ان کو متعدد بار پابند سلاسل کیا گیا۔ ان کی سوچ محض نظریاتی نہ تھی بلکہ وہ انسان دوستی کے حوالے سے مختلف موقعوں پر دیہات میں جا کر غریب و نادار لوگوں کے مکانوں

کی تعمیر یا تعمیر نو کے لئے بطور مزدور کام کرتے رہے۔

وہ بہت محبت کرنے والے انسان تھے، سب انسانوں سے محبت کے علاوہ بچوں سے ان کی محبت ان کی شخصیت کا ایک نمایاں پہلو تھا۔ وہ بچوں کی موجودگی میں ان کے ساتھ گھل مل جاتے تھے اور بالغ لوگوں کی موجودگی کو نظر انداز کرتے تھے۔ وہ بچوں سے ان کی ذہنی سطح پر گھنٹوں باتیں کرتے رہتے تھے اور خوش دکھائی دیتے تھے۔ بچے بھی باسانی ان کے ساتھ مانوس ہو جاتے تھے اور ان کی رفاقت سے لطف اٹھاتے تھے۔

حمید اختر فیض احمد فیض کے نہایت قریبی اور خاندانی دوست تھے اور ان کے آخری ساتھی تھے۔ فیض نے ایک موقع پر اپنی بیٹی سلیمہ کا رشتہ طے کرنے کا اختیار بھی ان کو دیا۔

حمید اختر کئی اہم کتابوں کے مصنف تھے جن میں ”آشنائیاں کیا کیا“ (خاکوں کا مجموعہ)، ”کال کوٹھڑی“ (زندگیاں میں بیتے دنوں کی یادیں)، ”روداد انجمن“ (انجمن ترقی پسند مصنفین کی تاریخ)، اور ”لامکاں“ (افسانوں کا مجموعہ) شامل ہیں۔ ان کی کتاب ”کال کوٹھڑی“ حبیبیہ پر ادب کی اہم ترین کتاب ہے جس میں انہوں نے اپنے اوپر بیتنے والی سختیوں کے علاوہ جرائم کے ذمہ دار ٹھہرائے گئے لوگوں کی نفسیات اور ان کے جرائم کے ذمہ دار معاشی اور معاشرتی عوامل کی نشان دہی نہایت دل سوزی سوا اور انسانیت کے حوالے سے کی گئی ہے۔ زنداں کی زندگی پر بعد میں لکھنے والوں نے ان کی کتاب ”کال کوٹھڑی“ سے استفادہ کیا۔ یوں یہ کتاب ایک تاریخ ساز اور بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ مختلف موقعوں پر جیل اصلاحات کے لئے بننے والی کمیٹیوں نے بھی ان کی کتاب ”کال کوٹھڑی“ سے استفادہ کیا۔ اس کتاب کے اب تک دس ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

انہوں نے اپنے ادبی کیریئر کی ابتداء افسانہ نگاری سے کی۔ ”لامکاں“ ان کے افسانوں کا مجموعہ ہے اور اس کا عنوان ایک معنوی حیثیت لئے ہوئے ہے اس لئے وہ قریباً آخری عمر تک ”لامکاں“ رہے۔ (جب تک ان کی بیٹی صبا حمید نے مکان نہ خرید لیا جس کی قیمت ادا کرنے میں کچھ حصہ انہوں نے بھی ڈالا)۔ بعد میں صحافت میں آنے پر وہ اپنی افسانہ نگاری پر توجہ نہ دے سکے لیکن جتنے افسانے انہوں نے لکھے (ان کے کچھ افسانے اس مجموعہ میں شامل نہ ہیں) وہ معیار میں چھوٹی کے افسانہ نگاروں کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی سے کم نہیں۔ ان کا ایک افسانہ ”ملاقات“ قتل کے جرم میں پھانسی کی سزا پانے والے ایک شخص کی اپنے اقرباء سے آخری ملاقات اور اس موقع پر اس کے احساسات کا بہت اچھا ادراک ہے۔

اس افسانے کا شمار اردو ادب میں لکھے جانے والے اہم ترین افسانوں میں ہوتا ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ

صحافت سے اور ادب سے ایک اہم افسانہ نگار چھن گیا۔

حمید اختر کو ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان کی طرف سے پرائڈ آف پرفارمنس کا ایوارڈ دیا گیا۔ ان کو بھارت کی ساحر کلچرل اکیڈمی کی طرف سے امن عالم اور خطہ میں امن کے لئے کی گئی ان کی کوششوں پر بھی ایوارڈ دیا گیا (جس کو وصول کرنے کے لئے ان کو بھارت جانے کی اجازت نہ دی گئی)۔

اپنے صحافتی کیریئر کا آغاز انہوں نے ”امروز“ جیسے روشن خیال اور معیاری روزنامہ سے کیا جس کے وہ بعد میں ایڈیٹر بھی رہے۔ ”امروز“ کی ادارت انہیں ضیاء کے سیاہ آمریت کے دور میں چھوڑنی پڑی۔ بعد میں وہ کچھ عرصہ انگریزی کے روشن خیال روزنامہ ”دی سن“ کے لاہور بیورو کے انچارج رہے۔ اردو روزنامہ ”دن“ کے اجرا پر انہوں نے اس میں اپنی کالم نگاری کا آغاز کیا۔ بعد میں روزنامہ ”ایکسپریس“ کی اشاعت شروع ہونے پر انہوں نے اس میں اپنا کالم ”پرسش احوال“ کے ادبی عنوان سے لکھنا شروع کیا۔ ان کے کالم بیشتر کالم نگاروں کے برعکس غیر سیاسی موضوعات پر مشتمل ہوتے تھے اور ادبی و تہذیبی رنگ لئے ہوتے تھے ان میں اکثر اعلیٰ درجہ کا لطیف مزاح بھی ہوتا تھا جو ان کی تحریر کی اضافی خوبی تھی۔ ان کی روزمرہ کی بات چیت میں بھی مزاح کا رنگ دیکھنے کو ملتا تھا۔

آخری دنوں میں جب وہ اپنی بیماری کے باعث ہسپتال میں داخل تھے، ایک بہت حسین چہرے والی بہت موٹی عورت کو دیکھ کر انہوں نے پاس بیٹھی اپنی بیٹی سے کہا کہ ”دیکھو یہ حسن کا پہاڑ“ ہے۔

وہ اپنے کالموں میں ملک بھر سے نادار لوگوں کے خط موصول ہونے پر مخیر حضرات کو ان کے امراض کے علاج یا ان کی لڑکیوں کی شادی کے لئے مدد دینے پر آمادہ کرتے رہتے تھے۔ ان کی قلمی کاوشوں اور مخیر حضرات کی دریادلی سے بہت سے غریب لوگوں کا علاج یا ان کی بچیوں کی شادیاں ممکن ہوئیں جو ان کے لئے تاحیات دعائیں کرتے رہیں گے۔

حمید اختر ایک ہمہ جہت شخصیت اور ایک قومی اثاثہ تھے۔ ان کی چھوڑی ہوئی تحریریں ایک قومی اثاثہ ہیں۔



حمید اختر لاہور میں 1944-45ء

تحریر: حکیم محمد عزیز الرحمن جگر انوی 28 ستمبر 2012ء

1944-45ء کے دوران پاؤں کی گردش حمید اختر اور ساحر کو کچھ عرصہ کے لیے لاہور بھی لے آئی۔ اس دور سے متعلق کئی واقعات جڑے ہوئے ہیں جو حمید اختر نے اپنے مختلف کالموں میں بیان کیے ہیں۔ حمید اختر اور ساحر سے پہلے میٹرک کرنے کے بعد ان کے دوست شیر محمد قیصر (ابن انشاء) 1942ء میں لاہور آچکے تھے۔ اس بارے میں حمید اختر لکھتے ہیں۔

”میٹرک میں نمایاں کامیابی اور وظیفہ حاصل کرنے کے باوجود انہوں (ابن انشاء) نے مرحوم حمید نظامی مدیر نوائے وقت کو جن سے ان کی خط و کتابت تھی، لکھا کہ گھریلو حالات کی وجہ سے وہ وظیفے کے باوجود تعلیم جاری رکھنے کی بجائے ملازمت کرنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ مرحوم حمید نظامی نے انہیں تعلیم چھڑی رکھنے، اسلامیہ کالج میں داخلہ دلانے اور کچھ مالی وسائل مہیا کرنے کے وعدہ پر لاہور آنے کے لیے مجبور کیا جہاں پہنچ کر وہ اسلامیہ کالج میں داخل ہو گئے اور بیڈن روڈ کے ایک مکان کی اوپر کی منزل میں واقع ’نوائے وقت‘ کے دفتر میں مقیم ہوئے۔ ہم اپنے پرانے دوست کے نئے حالات کے بارے میں معلومات حاصل کرنے پہلی بار لاہور پہنچے اور تلاش کرتے کرتے بیڈن روڈ پر واقع ’نوائے وقت‘ کے دفتر میں پہنچے تو ہم نے ابن انشاء مرحوم اور حمید نظامی مرحوم دونوں کو ہفتہ وار ’نوائے وقت‘ کے فولڈ کیے ہوئے پرچے کے ڈھیر پر ٹکٹ چسپاں کرتے ہوئے دیکھا۔۔۔۔“ (حمید اختر ”احوال واقعی“ ص 373)

حمید اختر کو پہلی ہی بار لاہور بھا گیا، جو مستقبل میں ہمیشہ کے لیے ان کا شہر بننے والا تھا۔ کچھ عرصہ بعد ابن انشاء ملازمت کی غرض سے انبالہ چلے گئے اور حمید اختر کے پاؤں کی گردش جاری رہی۔ وہ دوبارہ اس وقت لاہور آئے جب گورنمنٹ کالج لدھیانہ سے نکالے جانے کے بعد ساحر بغرض تعلیم لاہور آ گئے۔ انہیں ملنے حمید اختر ہر ہفتے لاہور آ جاتے۔ یوں روشنیوں کے اس شہر سے ان کی پہچان اور محبت بڑھتی گئی۔ ان دنوں کے لاہور کے بارے میں حمید اختر بیان کرتے

ہیں:

”1944-45ء میں اسے (ساحر کو) ادب لطیف کی ادارت مل گئی۔ ہم چونکہ بیکار پھر رہے تھے اس لیے اس زمانے میں ہم نے تقریباً چھ ماہ اس شہر میں مستقل قیام کیا۔ ان دنوں لاہور شہر کتنا خوبصورت اور دل لبھانے والا تھا، آج اس کا اندازہ کرنا بھی مشکل ہے۔ آبادی تین لاکھ کے قریب تھی۔ شہر کی بڑی اور اہم سڑکوں پر روزانہ چھڑکاؤ کیا جاتا تھا۔ ڈاک دن میں دو بار تقسیم ہوتی تھی۔ شامیں اتنی بھرپور اور ثقافتی پروگراموں کی اس قدر کثرت ہوتی تھی کہ شام گزارنے کا فیصلہ مشکل ہو جاتا۔ کہیں کنسرٹ ہے تو کہیں موسیقی کی محفل برپا ہے۔ اوپن ایئر تھیٹر میں اس وقت بھی ڈرامے سٹیج ہوتے تھے۔ دہلی دروازے کے باہر عظیم الشان سیاسی جلسوں کا زور رہتا۔ اس کے علاوہ دن بھر ہوٹلوں اور ادبی پرچوں کے دفاتر میں جو محفلیں برپا ہوتیں ان کا ایک اپنا ہی انداز تھا۔ انارکلی میں نگینہ بیکری میں باری علیگ، گوپال متل، میاں طفیل محمد اور بہت سے دوسرے سیاسی اور ادبی لوگ بحث میں مصروف نظر آتے۔ کافی ہاؤس میں بھی رونقیں لگی رہتیں۔ یہ ہماری جوانی کا زمانہ تھا جس میں انسان زمین پر قدم رکھتے ہوئے بھی آسمان کی طرف محور پرواز رہتا ہے۔ ہم ان دنوں شب بیداری اور خالص آوارہ گردی کے جنون میں مبتلا تھے۔ مجھے یاد ہے ایک رات نصف شب کے بعد ہم چائے کی تلاش میں دہلی دروازے کے باہر اس چائے والے کورٹ بھر ڈھونڈتے رہے جس کے بارے میں سنا تھا کہ اس کے چائے کے دیکچے میں احمد شاہ ابدالی کے وقت سے لے کر آج تک پانی ختم نہیں ہوا۔ چنانچہ ہم نے اسے ڈھونڈا اور پھر اکثر راتیں اس چائے خانے کے تھڑے پر گزاریں۔ شورش کاشمیری ان دنوں چار پانچ برس کی قید کے بعد رہا ہو کر نیا نیا لاہور آیا تھا۔ اس سے ملاقاتیں بھی رہیں جو بڑی پکی دوستی میں بدل گئیں۔ اس کے توسط سے مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری جیسے عظیم اور بڑے لوگوں کی صحبتیں بھی میسر آئیں۔ خود شورش بھی اپنی ذات میں کسی انجمن سے کم نہیں تھا۔ (حمید اختر ”احوال واقعی“ ص-267)

دہلی دروازے کا وہ چائے خانہ دہلی دروازے کے سامنے واقع ایک عمارت کے، جس کی بالائی منزل پر مجلس احرار اور مجلس اصلاح چار سو بیسوں کے بڑے بڑے بورڈ برابر آویزاں تھے، حمید اختر کا محبوب چائے خانہ بن گیا۔ جہاں انہوں نے ساحر کے ساتھ مستقبل کے کتنے ہی خواب دیکھے اور مستقبل کے کتنے ہی منصوبے بنائے۔ لاہور میں دونوں کا ٹھکانہ سرکلر روڈ پر بھائی اور لوہاری دروازے کے درمیان واقع ”ادب لطیف“ کے دفتر میں تھا، جہاں وہ ایک پرچھتی پر سوتے تھے۔ انہی دنوں حمید اختر کی ملاقات اختر شیرانی مرحوم سے انتہائی عجیب و غریب حالات میں ہوئی۔ ایک رات بلکہ آخر شب کوئی تین چار بجے ان کی رہائش گاہ کا دروازہ زور زور سے کھٹکھٹایا گیا۔ حمید اختر نے آنکھیں ملتے ہوئے

جب دروازہ کھولا تو ان کے سامنے اپنے دور کے سب سے بڑے رومانی شاعر اختر شیرانی کھڑے تھے۔ عظیم رومانی شاعر نے حمید اختر اور ساحر کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور کہا کہ ایک ضروری کام کے سلسلے میں انہیں ان کی مدد درکار ہے۔ بقول حمید اختر، انہیں انکار کرنے کی ہمت کس میں تھی۔ دونوں ان کے ساتھ تانگے میں بیٹھ گئے۔ پہلے تو وہ لوہاری دروازے کے باہر اس دکان پر گئے جو قیام پاکستان کے کچھ عرصے بعد مکتبہء جدید کی تحویل میں آئی۔ مگر اس وقت وہاں شراب کا ٹھیکہ تھا۔ یہ دکان رات کو بھی کھلی رہتی تھی۔ اختر شیرانی نے وہاں سے اپنی ضرورت کی چیز خریدی اور تانگے والے کو لاء کالج اور اورینٹل کالج کے عقبی حصے کی طرف چلنے کو کہا۔ جب کئی چکر لگانے کے بعد انہیں وہ جگہ نہ ملی جسے وہ ڈھونڈ رہے تھے تو حمید اختر کے پوچھنے پر بتانے لگے کہ وہ کیف عرفانی کا گھر ڈھونڈ رہے ہیں کیونکہ اسے زد و کوب کرنا ہے کیونکہ اس نے یہ بیہودہ فلمی گیت ”ہماری گلی آنا اچھا جی“ لکھا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ اول تو ہماری گلی آنا ہی قابل اعتراض ہے لیکن یہ اچھا جی کا اضافہ تو بالکل ناقابل برداشت ہے۔ خوش قسمتی سے کیف عرفانی کا گھر نہیں ملا اور وہ اختر شیرانی کی مار سے محفوظ رہے۔

اس تمام عرصہ میں ساحر سے جو تیزی سے شہرت اور مقبولیت کے زینے چڑھ رہے تھے ان کا مستقل رابطہ اور ملاقاتیں رہیں۔ 1945ء کے اواخر تک ساحر کی زندگی میں بھی اور خود حمید اختر کی زندگی میں بھی ایک بڑا موڑ آنے والا تھا۔ ان کے پیروں کی گردش ایک واضح رخ اختیار کرنے والی تھی۔ تمام دوست اپنی اپنی منزل کا تعین کرنے کے لیے اپنی اپنی راہیں تلاش کر رہے تھے۔ ساحر اور حمید اختر کی بچپن کی دوستی اب ایک اور انداز کی رفاقت میں بدلنے والی تھی۔



جو بادہ خوار پرانے تھے اٹھتے جاتے ہیں

سعد اللہ جان (زیر لب) روزنامہ ”ایکسپریس“ 26 اکتوبر 2011ء

محترم حمید اختر بھی اس دور کے پرانے بادہ خوار تھے جب ابھی نہ تو ادب کمرشل نر ہوا تھا اور نہ صحافت انڈسٹری بنی تھی یہ دونوں اس زمانے میں ”فن“ ہوا کرتے تھے اور قلم کو بھی ”ماڈل گرل“ کا عظیم الشان مرتبہ نہیں ملا تھا، قلم کو قوم کی امانت جیسا بے ”فیض“ اور ”نکھٹو“ نام دیا جاتا تھا، اس زمانے میں ”لفظوں“ کی اپنی ایک حرمت اور عصمت ہوا کرتی تھی جو نہ بیچی جاتی تھی اور نہ خریدی جاسکتی تھی، اہل قلم ”مزدوری“ کرتے تھے عصمت فروشی نہیں کرتے تھے۔

من نہ آں رندم کہ ترک شاہدو ساغر کنم
مکتب داند کہ من این کارہا کمتر کنم
قلم کار نتیجے میں بھوکے اور مفلوک الحال رہتے تھے، طاعت وزہد کا ”ثواب“ ان کو معلوم ہوتا تھا لیکن ”طبیعت“ ادھر نہیں آتی تھی حمید اختر بھی ان ہی میں سے ایک تھے کہ

سرمہ مفت نظر ہوں میری قیمت یہ ہے
کہ رہے چشم خریدار پر احسان میرا
بعد میں دور بدلنا شروع ہو گیا تو لوگ بھی بدلتے گئے قلم بھی دکانوں کا مال اور جنس تجارت ہو گیا لیکن حمید اختر آخر تک ”ثواب طاعت وزہد“ کی طرف مائل نہ ہو سکے

سب کچھ سیکھا ہم نے نہ سیکھی ہوشیاری
سچ ہے دنیا والو کہ ہم ہیں اناڑی
اتنے بڑے اناڑی تھے کہ عمر بھر اناڑی ہی رہے اور اناڑی ہی مر گئے
”ہماری جان پہ بھاری تھا غم کا افسانہ“

سنی نہ بات کسی نے تو مر گئے چپ چاپ

ان کے اناڑی پن کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ اتنے بڑے قلم کار صحافی اور تجربہ کار اہل قلم ہونے کے باوجود لمحہ آخر تک کاغذ کے ”کھیت“ میں قلم کا ”ہل“ چلاتے رہے ان سے کہیں بعد میں آنے والے، بے ہنر اور جعلی لوگوں نے بڑے بڑے کھیت، مربعے اور فارم ہاؤس بنائے لیکن ان کے پاس وہی چھوٹا سا خاندانی ”کاغذ کا کھیت“ ہی رہا ”ضمیر“ اور ”ایمان“ نامی لاغر، ضعیف اور بوڑھے ”بیل“ ہی ان کا اثاثہ تھے جبکہ یار لوگوں نے ”زمینوں“ کے ساتھ ”ٹریکٹر“ بھی خرید لئے

یار ان تیز گام نے مہل کو جا لیا

ہم محوالہ جس کارواں رہے

آخری سانس تک ”ہل“ ہی چلاتے رہے ظاہر ہے کہ ایک بنجر سے کھیت میں ”جسم و جاں“ کے لاغر بیلوں کی جوڑی سے وہ کر بھی کیا سکتے تھے

مری تعمیر میں مضمحل ہے اک صورت خرابی کی

ہیولہ برق کا ہے خون گرم دہقان کا

محترم حمید اختر کے پاس تقریباً پوری صدی کی ادبی صحافتی اور سیاسی تاریخ تھی بلکہ وہ خود ہی اس دور کی مکمل سرگزشت تھے، چاہتے تو اس طویل عرصے میں کیا کچھ نہیں کر سکتے تھے لیکن ایک اچھے اور سچے کسان کی طرح انہیں اپنے کھیت اور ”ہل“ کے علاوہ اور کسی چیز سے سروکار نہیں تھا حتیٰ کہ متصل دوسرے کھیتوں اور کسانوں کی طرف بھی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے تھے کہ کس نے اپنے کھیت میں کیا بویا اور کیا کاٹا، انہیں صرف اپنی کھیتی اور بیلوں کی لاغر جوڑی سے سروکار تھا بلکہ خود اپنے بارے میں بھی نہیں سوچتے تھے کہ جس ”شورزدہ“ زمین میں وہ ”ہل“ چلا رہے ہیں فصل بورے ہیں پسینہ بہا رہے ہیں اس میں کیا اگتا اور کیا کاٹنا پڑتا ہے۔

سراپا رہن عشق و ناگزیر الفت ہستی

عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

بقدر ظرف ہے ساقی خمار ”تشنہ کامی“ بھی

جو تو دریائے مے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

میں ان کے پڑوس میں کچھ عرصے سے رہنے لگا تھا یا یوں کہئے کہ ان کا کھیت پڑوسی تھا چونکہ یہ پڑوس صرف

”ایکسپریس“ میں قائم ہوا تھا اور ہم دونوں کے درمیان یہ پشا اور اور لاہور کا فاصلہ بھی تھا اس لیے ملاقاتیں تو دو چار ہی ہوئی تھیں لیکن ان دو چار ملاقاتوں میں بھی ہم نے ایک دوسرے کو اچھی طرح پہچان لیا تھا کیونکہ ”ولی“ ”را“ ”ولی“ ”می شناسد، یا یوں کہئے کہ ایک پشتو کہاوت کے مطابق بیوہ کو بیوہ کی صحبت میں تسلی ملتی ہے۔

تیرا مجھ سے ہے پہلے کا ناتا کوئی

یو نہی نہیں ہے دل لبھاتا کوئی

ٹیلی فون کا ایک ذریعہ ہمارے پاس تھا لیکن وہ بھی ان کی ”ثقل سماعت“ کے باعث کچھ زیادہ مؤثر ذریعہ نہیں تھا مگر نہ ہونے سے پھر بھی کچھ تو تھا اس لئے کبھی کبھار کچھ آدھی ادھوری سی بات چیت ہو جاتی تھی میں کوشش کرتا تھا کہ ان کے ساتھ وہی طریقہ اپناؤں جس کا تقاضا انہوں نے تو نہیں لیکن غالب نے کیا تھا کہ

بہرا ہوں میں تو چاہئے دونا ہو التفات

سنتا نہیں ہوں بات مقرر کہے بغیر

بہر حال وہ مختصر سی چھوٹی سی، ننھی سی دوستی بھی فلک کو پسند نہیں آئی اور وہ اس راستے پر چلے گئے جس پر ہر کسی کو ایک نہ ایک دن جانا ہی ہے

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے

کیا خوب قیامت کا ہے گویا کون دن اور

کوئی کہہ سکتا ہے کہ انہوں نے دنیا میں بہت سارے مہ و سال گزار لئے تھے اور ہر حال میں جانا ضرور تھا یا عام دنیاوی زبان میں کہئے تو وہ خوش قسمت تھے کہ عمر کی اتنی نقدی پاسکے، لیکن مسئلہ نہ ان کی عمر کا ہے نہ میری عمر کا، بلکہ ہماری اس دوستی کا ہے جو ابھی سن بلوغ تک بھی نہیں پہنچی تھی اور صرف آٹھ دس سال کی جوان جہان بلکہ طفولیت میں داغ مفارقت دے گئی وہ نہ سہی لیکن ہمارا یہ تعلق تو کم عمر تھا

ہاں اے فلک پیر جواں تھا ابھی عارف

کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

قسمت کی بات ہے میں کوئی چھ مہینے سے ارادے باندھ رہا تھا اور ہر رواں ہفتے میں اگلے ہفتے کا پروگرام بناتا تھا لیکن یہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے کہ بندے کو کسی بھی چیز پر اختیار نہیں رہتا، نہ دنیا پر نہ اپنی اولاد پر اور نہ وقت پر، بلکہ خود اپنے آپ پر بھی اختیار باقی نہیں رہتا۔

مضمحل ہو گئے قوی غالب

وہ عناصر میں اعتدال کہاں

وہ گزرے وقتوں کی صحافت، ادب، سیاست، فلم و فن اور ان تمام شعبوں سے تعلق رکھنے والوں کا مکمل انسائیکلو پیڈیا تھے ساحر لدھیانوی سے لے کر کیفی اعظمی کے رومانوں تک، سجاد ظہیر سے لے کر سبط حسن کی داستانوں اور کرشن چندر اور امرتا پریتم کے افسانوں تک وہ بہت سی چیزوں، واقعات و صادرات کے چشم دید گواہ ہی نہیں ”شریک جرم“ (یہ الفاظ انہی کے ہیں) رہے تھے مختلف اخبارات و رسائل کے دفاتر سے لے کر جیل کی کوٹھڑیوں اور فلمی نگار خانوں سے سرکاری عقوبت خانوں تک کے مقامات آہ و فغاں سے گزرے تھے اگرچہ انہوں نے اس بارے میں لکھا بھی بہت ہے لیکن جو مزا بزبان خود ان سے سننے میں تھا ان کا اپنا ایک ذائقہ تھا جو میں نے بہت کم چکھا تھا لیکن پھر بھی خوش ہوں کہ ایک پوری تاریخ ایک پورے عہد اور ایک پورے انسائیکلو پیڈیا سے مجھے تھوڑا سا تعلق رہا اور مرنا تو

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں

بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں



حمید اختر اور فلمی دنیا

تحریر: گروپ کیپٹن ریٹائرڈ شہزاد منیر 12 اگست 2012ء

یہ 1945ء کے آخری مہینے تھے۔ اگست میں ہیروشیما اور ناگاساکی پر امریکہ کی ایٹمی بمباری کے نتیجے میں انسانیت ایک المناک انجام سے دوچار ہو چکی تھی۔ غالباً انہی دنوں ساحر کے اندر کہیں اس کی معروف نظم 'پرچھائیاں' کے تصور نے جنم لیا ہوگا۔ پورا پنجاب، پورا ہندوستان ہی نہیں، پوری دنیا اس المناک تباہی پر کراہ اٹھی تھی۔ ہندوستان ایک اور انگریزی لے کر اپنی آزادی کے لیے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ انہی دنوں حمید اختر اور ساحر لدھیانوی کو بمبئی سے بلاوا آیا۔ ایک قوم پرست فلم ساز کلونت رائے "آزادی کی راہ پر" کے عنوان سے ایک فلم بنا رہے تھے جس کے گیت لکھنے کے لیے انہوں نے ساحر لدھیانوی کو بمبئی بلایا تھا۔ اس وقت ساحر کی شاعری سچ مچ اپنا جادو جگا رہی تھی۔۔۔ حمید اختر لکھتے ہیں:

"1945ء کے آخری مہینوں میں جب اس کی دیرینہ آرزو برآئی اور اسے ایک فلم کے گانے لکھنے کے لیے بمبئی جانے کی پیشکش ہوئی تو اس نے تقریباً تین ہفتے تک بمبئی کا سفر اختیار نہیں کیا۔ بالآخر اس نے اس فلمی یونٹ سے جہاں وہ ملازم ہو کر جا رہا تھا، میرے لیے بھی بطور ایک مکالمہ نویس پیشکش حاصل کی اور یوں ہم دونوں جنوری 1946ء میں بمبئی جا پہنچے۔" (حمید اختر "آشنائیاں کیا کیا" ص۔ 93)

اس سفر کے بارے میں بہت سی الٹی سیدھی کہانیاں مشہور ہیں۔ ایک کتاب میں تو یہاں تک لکھا ہوا ہے کہ ساحر لدھیانوی 1946ء میں ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے حیدرآباد دکن گئے ہوئے تھے۔ بمبئی میں ان کے دوست "آزادی کی راہ پر" کے عنوان سے ایک فلم بنا رہے تھے۔ انہوں نے ساحر لدھیانوی کو بمبئی بلایا۔ یہ اور اس طرح کی بے سرو پا کہانیوں کی تردید کرتے ہوئے حمید اختر کہتے ہیں:

"ساحر لدھیانوی کو 1946ء میں کلونت رائے نے اپنی فلم 'آزادی کی راہ پر' کے گانے لکھنے کے لیے بمبئی بلایا۔ ساحر نے وہاں میرے لیے بھی مکالمہ نگاری کی اجازت حاصل کر لی کیونکہ ساحر کو ہمیشہ بیساکھی چاہیے ہوتی

تھی۔۔۔۔۔“ (مقالہ نازیہ بخاری ص 215)

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ساحر لدھیانہ سے اکیلا بمبئی جانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس میں خود اعتمادی کی بہت کمی تھی۔ اس کی والدہ بھی اسے تنہا بمبئی بھیجنے میں متامل تھیں چنانچہ حمید اختر کو بجلی کے محکمے میں ملنے والی نئی نوکری چھوڑ کر ساحر کے ساتھ بمبئی جانا پڑا۔ انہوں نے حمید اختر کا پروانہ حاصل کرنے کے لیے اپنا سفر پندرہ بیس روز تک موخر کیا اور سیٹھ کی طرف سے تقرری کا خط آنے پر دونوں بمبئی چلے گئے۔

اس فلم کا موضوع تحریک آزادی تھا جس کا مرکزی خیال خلافت تحریک، آل انڈیا کانگریس اور اس عہد کی اہم سیاسی شخصیات کے گرد گھومتا تھا۔ ہندوستان کے آئینی مستقبل کو زیر بحث لاتے ہوئے ایک آزاد اور متحدہ ہندوستان کی تجویز پیش کی گئی تھی۔ فلمی گیت نگار کے طور پر ساحر کی اور مکالمہ نگار کے طور پر حمید اختر کی یہ پہلی فلم تھی۔ مکالمہ نگاری کے اس عمل میں حمید اختر کے ساتھ ساتھ ابراہیم جلیس، ہاجرہ مسرور اور محمود بریلوی بھی شامل تھے۔ حمید اختر نے اس فلم میں ایک مختصر کردار بھی ادا کیا جو پہلی ہی ٹیک میں فلم بند ہو گیا۔ فلم کے سینئر اداکاروں پر تھوی راج، بے راج اور جگدیش سیٹھی نے ان کے کام کو سراہا اور اداکاری جاری رکھنے کی تلقین کی۔ انہیں دوسری فلموں میں کام کرنے کی پیشکش بھی ہوئی لیکن اس وقت وہ اس کے لیے آمادہ نہیں ہوئے کیونکہ ان کے بقول وہ ”ادب کے آدمی تھے“ البتہ اپنی کتاب ”آشنائیاں کیا کیا“ میں لکھتے ہیں کہ انہیں دو نئی فلموں میں بطور سائیڈ ہیرو کے منتخب کر لیا گیا تھا۔ معاہدے بھی ہو گئے اور پانچ چھ ہزار روپے کی رقم بطور ایڈوانس بھی مل گئی تھی جو اس زمانے میں خاصی بڑی رقم تھی۔

حمید اختر اپنے خاکے ’بیوقوف‘ میں اپنے بمبئی پہنچنے کی کہانی سناتے ہیں:

”اس زمانے میں ساحر اور حمید اختر بمبئی پہنچ گئے۔ ایک دوست نے وہاں فلم کمپنی بنائی تھی اور آل انڈیا کانگریس کی تاریخ کو کہانی کی شکل میں فلم بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے ان دونوں کو فلم کے گانے اور مکالمے لکھنے کے لیے بلوایا تھا۔ بمبئی میں تقریباً دو سال گزارے۔ اس بیوقوف (حمید اختر) نے یہاں بھی کمپنی میں بے قاعدگیوں کے خلاف مورچہ لگایا اور چند ہی ماہ بعد اس سے الگ ہو کر دالکیشو روڈ پر سید سجاد ظہیر کے گھر رہنے لگا۔“

اس بارے میں ایک اور جگہ حمید اختر کا بیان یہ ہے کہ فلم کی تکمیل کے دوران کمپنی کے مالی حالات خراب ہوئے تو اس کے عملے کو دو تین مہینے تک تنخواہیں نہ ملیں۔ عملے نے ہڑتال کی تو مالکوں نے بغیر معاوضہ ادا کیے سب لوگوں کو ملازمت سے نکال دیا۔ حمید اختر ان کے اس رویے کی شکایت لے کر اس وقت سب سے زیادہ معاوضہ لینے والے فنکار پر تھوی راج جو اس فلم میں مفت کام کر رہے تھے کے پاس گئے۔ اپنے عہد کا یہ لیجنڈ اداکار حمید اختر کے ساتھ ہندوستان کلا

مندرجہ ذیل دفتر میں آیا اور مالکان کو دھمکی دی کہ اگر ملازمین کی تنخواہیں ادا نہ کی گئیں تو وہ اس فلم میں کام نہیں کرے گا۔ کمپنی کو مجبوراً سب کی تنخواہیں ادا کرنے کا اہتمام کرنا پڑا اور جب تک سب کو ادا کیے نہیں ہو گئی وہ سیٹ پر نہیں آیا۔

کمپنی نے رہائش کے لیے انہیں ایک کمرہ دے رکھا تھا جس میں حمید اختر، ساحر لدھیانوی، ابراہیم جلیس اور کمپنی کا منیجر ویرنر دیویاس اکٹھے مقیم تھے۔ کلامندر نامی فلم کمپنی نے پہلے انڈیا گیٹ کے پاس سلیمان چیمبرز میں ایک کمرہ دیا۔ بعد ازاں انہیں کمپنی ہی کی طرف سے ایک کمرہ وارڈن روڈ پر واقع کمپنی کے دفتر میں ملا۔ حمید اختر کے بقول ویاس ان کا ہم عمر تھا اور ایف سی کالج لاہور سے تازہ تازہ ایم اے کر کے بمبئی آیا تھا۔ بعد میں اس نے انڈین سول سروس جوائن کر لی تھی اور مدت تک بمبئی میں سنسور بورڈ کا چیئر مین بھی رہا۔ دور درشن کے ابتدائی دنوں میں دکھائی جانے والی اکثر فلموں کے سنسور ٹیفیکیشنس پر ایم ڈی ویاس کے دستخط ہی ہوتے تھے۔ ستر کے عشرے کے آخر میں وہ لکھنؤ کا کمشنر تھا اور وہیں اس کا انتقال ہوا۔ ویرنر کو انگریزی اور ہندی پر پورا عبور تھا۔ پنجابی اس کی مادری زبان تھی لیکن اردو اسے بالکل نہیں آتی تھی۔ البتہ وہ ان دوستوں پر رعب ڈالنے کے لیے اردو کے سنے سناے مشکل اور موٹے موٹے الفاظ گفتگو میں ضرور استعمال کیا کرتا تھا۔ ساحر کو ان دنوں 'نیا ادب' میں اپنے لکھے ہوئے ادارے سنانے کا خطرہ رہتا تھا۔ ساحر اپنا ایک ادارہ اسے دوبار سنا چکا تھا۔ اگلے روز جب کسی بہانے جب اس نے تیسری دفعہ اسے اپنا ادارہ سنانے کی کوشش کی تو اس نے سخت احتجاج کرتے ہوئے کہا "یار بس کراب تو تیرا یہ ایڈیٹوریل میرے دماغ کے نیلگوں کنوئیں میں گھس گیا ہے۔" ایک روز وارڈن روڈ پر سامنے سے آتی ہوئی ایک نہایت خوبصورت گوری چٹی لڑکی کو دیکھ کر اس نے نعرہ لگایا "واہ کیا شعلہ آبنوس سامنے سے چلا آ رہا ہے۔"

اس کمرے کے باقی تینوں باسی حقیقتاً ایک کمیون کی صورت میں رہتے تھے۔ اپنے ان دنوں کی یادیں تازہ کرتے ہوئے حمید اختر لکھتے ہیں:

”بمبئی میں ساحر، جلیس اور میں کمپنی کی طرف سے مہیا کردہ کمرے میں اکٹھے رہتے تھے۔ اس زمانے میں ہماری تینوں کی تنخواہوں کی مجموعی رقم ہزار بارہ سو روپے بنتی تھی جو ہم مشترکہ طور پر خرچ کرتے تھے۔ اس میں بھی وہ (ساحر) ہمیشہ فضول خرچی کا مظاہرہ کرتا۔ مثلاً ہم کمپنی کے دفتر سے کھانا کھانے کے لیے نکلتے تو وہ بس میں بیٹھنے کی بجائے ٹیکسی پر سفر کرنے کو ترجیح دیتا حالانکہ اس زمانے میں بمبئی کی بس سروس نہایت اعلیٰ اور بسیں بہت آرام دہ ہوا کرتی تھیں۔ اس کی دلیل یہ تھی کہ وہ ٹیکسی کے لیے زیادہ دام جسمانی آرام کے لیے ادا نہیں کرتا بلکہ آواز دے کر ٹیکسی کو انگوٹھے کے اشارے سے بلانے میں جو اسٹامٹ ہوتی ہے اس کے لیے اس سواری سے کام لیتا ہے۔ ان فضول خرچیوں کی وجہ سے پیسے ختم ہو

جاتے تو وہ مجبوراً بس میں سفر کرنے پر بھی تیار ہو جاتا لیکن بس سٹینڈ پر ہر پانچ منٹ بعد آنے والی بس میں بیٹھنے سے پہلے وہ یہ دیکھتا کہ اس میں بالوں میں پھولوں کا گجرا پہنے کوئی ایسی خاتون بھی بیٹھی ہے جس کی عقبی نشست خالی ہو۔ مہاراشٹر میں تقریباً سبھی خواتین سر کے بالوں میں پھولوں کا بوڑا سجا کر گھر سے نکلتی تھیں اور بمبئی کی بسوں میں مردانہ زنانہ کی الگ الگ نشستیں نہیں ہوتی تھیں۔۔۔ ساحر ایسی خاتون کی تلاش میں دو تین بسیں مس کر دیتا جس میں بوڑے والی خاتون کی عقبی نشست خالی ہو جہاں جا کر ہم بیٹھ سکتے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ کسی ایسی خاتون کی برابر والی نشست پہ ہرگز قابض نہ ہوتا بلکہ اس کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر اور لمبی لمبی سانس لے کر پھولوں کی خوشبو سے لطف اندوز ہوتا رہتا۔“ (حمید اختر، ”کچھ پرانی یادیں“ روزنامہ ”دن“ 25 جولائی 2000ء)

ساحر لدھیانوی کی فضول خرچی کے حوالے سے حمید اختر نے متعدد واقعات کا ذکر کیا ہے۔ ان کے بقول:

”مالی لحاظ سے یہ کوئی اچھے دن نہیں تھے۔ تنخواہ دس تاریخ تک اس ترتیب سے ختم ہو جاتی کہ سب سے پہلے کھانے پینے اور سفر کے تمام اخراجات ساحر ادا کرتا تھا۔ اس کے بعد میں سب کے نان و نفقہ کا ذمہ دار ہوتا اور پھر جلیس کی باری آتی اور جب سب کی جیبیں خالی ہو جاتیں تو ایڈوانس کے لیے جدوجہد شروع ہو جاتی۔ اس زمانے میں فاقے بھی آئے۔ جھگڑے بھی ہوئے، بُر وقت بھی دیکھا۔ مگر دوستی میں فرق نہیں آیا۔

پیسے ختم ہو جاتے تو ہم سب باری باری ایڈوانس لیتے۔ جنرل نیجر اپنا ہی تھا اس لیے اس میں کچھ زیادہ مشکل پیش نہ آتی۔ تاہم ہر چیز کی حد ہوتی ہے۔ ہمارا خراب ریکارڈ دیکھ کر ایک دن بیٹھنے نے تینوں کو بلایا اور ایک فالتو تنخواہ دینے کا اعلان کیا بشرطیکہ ہم اس کے بعد ایڈوانس نہ مانگیں۔ ہم نے وعدہ تو کر لیا مگر بہت تنگ ہوئے۔ اس زمانے میں افسانہ نگار سید انور جو ہندوستانی بحریہ کا اعلیٰ افسر تھا اور لدھیانہ کا رہنے والا تھا۔ بمبئی میں مقیم تھا، چنانچہ وہ ہماری زد میں آ گیا۔ جب فاقہ تک نوبت پہنچتی ہم کو لاہر میں اس کے گھر چلے جاتے۔ رات کا کھانا اس کے ہاں کھاتے پھر اس سے بیس تیس روپے قرض مانگتے جو ہمیشہ مل جاتا اور کبھی واپس نہیں ہوتا تھا۔ مگر مشکل یہ تھی کہ دس سنیس روپے تک کی یہ رقم ہمیشہ چیک کی صورت میں ملتی۔ انور نقد پیسے گھر میں رکھتا ہی نہیں تھا۔ ہم اس سے بیس تیس روپے کا چیک لے کر نکلتے اور سارا راستہ اسے گالیاں دیتے رہتے کیونکہ صبح اٹھ کر پیسے لینے کے لیے اس کے بنک جانا پڑتا۔ بہر حال یہ سلسلہ بہت دنوں تک جاری رہا۔“

حمید اختر کے فلمی دور کے یہ چند ماہ بے حد دلچسپ تھے۔ ان کی ممبئی کی یادوں میں کوئی ایسی یاد نہیں ہے جس میں ساحر لدھیانوی شامل نہ ہو۔ حمید اختر کی اُس دور کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے ان واقعات کی بے حد اہمیت ہے۔ ساحر کی

عجیب و غریب حرکتوں کو بیان کرتے ہوئے حمید اختر کسی بیزاری یا تلخی کا اظہار نہ کرتے بلکہ خود بھی ان سے لطف اندوز ہوتے محسوس ہوتے۔ فلم کمپنی کی ملازمت کے دوران ساحر کی وجہ سے اکثر فاقہ کشی کی نوبت آ جاتی لیکن ان واقعات کو یاد کرتے ہوئے ان کے الفاظ میں جو پر لطف مٹھاس اور محبت تھی وہ حمید اختر کی شخصیت کا حقیقی پرتو تھی۔ ساحر کے حوالے سے ایک اور واقعہ کے بیان سے اس کی تصدیق ہو جاتی ہے۔

”ایک دفعہ اندھیری میں ہم کرشن چندر کے گھر سے واپس مقامی ریلوے سٹیشن کی طرف جا رہے تھے کہ راستے میں ایک کوٹھی پر ”کرایہ کے لیے خالی ہے“ کا بورڈ نظر آیا۔ ہمیں مکان کی ضرورت نہیں تھی لیکن اس کوٹھی کے ایک سرے پر ”بل دے ڈیر“ کا بورڈ بھی آویزاں تھا۔ جسے دیکھ کر وہ تڑپ اٹھا اور کہنے لگا۔ ”بس یہ کوٹھی کرایہ پر لے کر اس میں رہیں گے۔“

”کیوں بھئی؟“ ہم نے پوچھا۔

”اس لیے کہ دوستوں کو اپنے نئے ایڈریس سے مطلع کریں گے جو اس طرح ہوگا: ساحر لدھیانوی بل دے ڈیر، ورسواروڈ، اندھیری، بمبئی، تو ان پر بڑا رعب پڑے گا۔“

ہم لوگوں نے بہت سمجھایا کہ ہم مرکزی بمبئی میں مفت رہائش کے مزے لوٹ رہے ہیں۔ کرایہ پر مکان لینے میں کرائے کے علاوہ آمد و رفت کے اخراجات بھی بڑھیں گے۔ مگر وہ نہ مانا۔ خیر دوسرو پے ماہوار کرایہ پر یہ کوٹھی لے لی سو ڈیڑھ سو روپے ماہوار کرائے پر فرنیچر بھی حاصل کیا۔ اتنی ہی رقم شہر آنے جانے پر صرف ہونے لگی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پندرہ بیس روز بعد نوبت فاقہ کشی تک پہنچی اور بمشکل مہینہ بھر گزارنے کے بعد ہمیں وہاں سے بھاگ کر پھر اپنی پرانی جائے رہائش پر آنا پڑا۔“

کمپنی کی طرف سے فراہم کردہ رہائش گاہ میں کچھ عرصہ کے لیے اسرار الحق مجاز بھی ان کے ساتھ رہے۔۔۔ ان دنوں بھی مجاز کی شراب نوشی کے قصے عام تھے۔۔۔ بنے بھائی یعنی سجاد ظہیر نے جو بقول حمید اختر ”سب ترقی پسندوں کے گرو تھے“ نے حمید اختر کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ مجاز کی شراب نوشی کو ختم یا کم کرنے کی کوشش کریں۔ حمید اختر نے کافی جدوجہد کر کے مجاز کو شراب سے دور رکھا۔ کبھی اسے لڑکیوں کا ہاکی میچ دکھانے لے جاتے کبھی سینما اور کبھی کسی تفریحی مقام پر۔ مجاز ایک آدھ مرتبہ انہیں غچہ دے کر کسی دوست کے گھر پہنچنے میں کامیاب بھی ہوا جہاں اس کی مراد پوری ہو گئی۔ بہر حال اس کاوش کے لیے سجاد ظہیر نے حمید اختر کو ”صحیح بالشوئیک“ کے خطاب سے بھی نوازا لیکن مجاز کو شراب نوشی سے روکنا کوئی سادہ اور سہل کام نہیں تھا۔ اس سلسلے میں حمید اختر نے اپنی متعدد کاوشوں کا ذکر کیا ہے جنہیں مجاز نے کئی بار کامیابی سے ناکام

بنایا۔

ایک بار جب اس کی حالت زیادہ خراب ہو گئی تو حمید اختر اور بعض دوسرے دوستوں نے ستر روپے کی رقم جمع کر کے اور لکھنؤ کا سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ خرید کر اسے اس کے بستر بند سمیت گاڑی میں سوار کر دیا۔ تین چار گھنٹوں کے بعد وہ جھومتا جھومتا حمید اختر کی رہائش گاہ پر پہنچ گیا۔ ہوا یہ تھا کہ بمبئی سنٹرل سے چل کر گاڑی جب دادر کے سٹیشن پر رُکی تو وہ گاڑی سے نیچے اتر آیا۔ تھوڑا سا جرمانہ ادا کر کے ٹکٹ کی رقم واپس لی اور سیدھا شراب خانے میں جا کر دم لیا۔ وہاں سے بچے کھچے پیسوں سے شراب پی کر دوستوں کے پاس پہنچ گیا۔

حمید اختر کے کردار کا یہ رُخ انتہائی قابلِ قدر ہے، وہ اپنے ترقی پسند دوست کو موت کی طرف بڑھتا دیکھ رہے تھے اور دل سے چاہتے تھے کہ وہ سنبھل جائے لیکن شاید اس کا کوئی بھی دوست اس پر قابو پانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اس سلسلے میں ایک اور واقعہ کا ذکر ضروری ہے جو حمید اختر نے مجاز کے حوالے سے اپنی یادداشتوں میں بیان کیا ہے:

”ہماری اس کی نگرانی کے دور میں ایک روز وہ ہمیں ایک ہندو دوست کے گھر لے گیا جس کو ہم نہیں جانتے تھے وہ شام کے شغل سے فارغ ہو کر کھانا کھا رہا تھا۔ اس نے مجاز کو بھی کھانے کی دعوت دی۔ مجاز نے انکار کیا۔ جب اس نے دوسری تیسری بار انکار کیا تو ساتھ ہی بولا، سالا! تجھے پتہ ہے کھانا ہماری لائن نہیں ہے اس پر وہ دوست سخت شرمندہ ہوا اور اس نے بوتل سامنے لا کر رکھ دی۔ اس اجنبی ماحول میں ہم بھی اسے اپنے دل کے ارمان پورے کرنے سے نہ روک سکے۔۔۔۔“



حمید اختر چلے گئے

ایاز خان (جستجو) ایڈیٹر روزنامہ "ایکسپریس" 20 اکتوبر 2011ء

منگل گیارہ اکتوبر کی شام حمید اختر صاحب کا فون آیا۔ میرے ہیلو کہتے ہی شکوہ کرنے لگے کہ کافی دن ہو گئے ہیں ملاقات نہیں ہوئی۔ میں نے جواب دیا آپ کا فون نہ بھی آتا تو ہم کل آپ کی خیریت معلوم کرنے آنے والے تھے۔ اور یہ حقیقت بھی تھی کیونکہ ان کے ہاں جانے سے چند دن پہلے سے ہمارے ڈپٹی ایڈیٹر لطیف چودھری اس بات پر اصرار کر رہے تھے کہ ہمیں حمید اختر صاحب کی خیریت دریافت کرنے جانا چاہیے۔ انہیں خدشہ تھا کہ ہمیں بہت دیر نہ ہو جائے۔ حمید اختر پچھلے کچھ عرصے سے کینسر کے موذی مرض میں مبتلا تھے لیکن وہ نہ صرف اپنی روٹین کے مطابق ہفتے میں دو بار دفتر آتے رہے بلکہ کالم بھی باقاعدگی سے لکھتے رہے لیکن اب کافی دنوں سے دفتر آئے نہ کالم بھجوایا اس لئے ہماری تشویش بجا تھی اور اسی لئے مرحوم کا فون آنے سے دو گھنٹے پہلے ہم اگلے دن ان کے گھر جانے کا پروگرام بنا چکے تھے۔ حمید اختر اس سے پہلے بھی کینسر میں مبتلا رہ کر صحت یاب ہو چکے تھے اسی لئے اس بار وہ پھر اسی مرض میں مبتلا ہوئے تو اپنی صحت یابی کے بارے میں کافی پُر امید تھے۔ گروپ ایڈیٹر عباس اطہر صاحب کو ان کی شدید بیماری کا بتایا تو انہوں نے کہا ٹھیک ہے کل اکٹھے چلیں گے۔ فون پر گفتگو کے دوران لگا کہ ان کی اداسی کچھ کم ہو گئی ہے۔ گیارہ اکتوبر کو ہی انہیں صدر آصف زرداری کی طرف سے پھولوں کا گلہ دستہ بھجوایا اور نیک تمناؤں کا اظہار کیا گیا تھا۔ اس سے ایک دن پہلے ایوان صدر کے ترجمان فرحت اللہ بابر نے فون پر ان کی خیریت بھی دریافت کی تھی۔ مرحوم ایوان صدر کے ان اقدامات پر بھی خوش تھے۔ اگلے دن یعنی بدھ بارہ اکتوبر کی شام سات بجے ہم تینوں ان کے گھر پہنچ گئے۔ حمید اختر ایک کمرے میں بیڈ پر لیٹے ہوئے تھے اور بہت کمزور لگ رہے تھے۔ دو ملازم اور ان کی بیٹی بشری ان کے پاس تھی۔ حمید اختر صاحب ہومیوپیتھی کی دوا بھی لے رہے تھے اور ہماری وہاں موجودگی کے دوران بھی انہوں نے پانی میں چند قطرے ڈال کر پیئے۔ ان کا ہومیوپیتھی طریقہ علاج پر بڑا بھروسہ اور اعتماد تھا، وہ اکثر اس طریقہ علاج کی تعریف کرتے تھے۔ حمید اختر صاحب کا موبائل فون ان کی بیٹی کے پاس تھا

اور وہ مسلسل اپنے والد کے چاہنے والوں کو بتا رہی تھیں کہ ان کے والد بات نہیں کر سکتے۔

حمید اختر کو ایک نظر دیکھا اور ہم تینوں اپنی اپنی جگہ پریشان ہو گئے کہ ان کی حالت کافی تشویش ناک ہو چکی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ واپسی پر ہم جیسے ہی وہاں سے روانہ ہوئے شاہ جی نے کہا کہ ان کی جو حالت ہے وہاں سے واپسی مشکل ہے۔ بہر حال ہم انہیں دیکھ کر جتنے دکھی ہوئے تھے اس کے برعکس وہ اپنے دفتر کے تین ساتھیوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ پون گھنٹے کے قریب ہم وہاں رہے اس دوران مرحوم مسلسل گفتگو کرتے رہے۔ انہیں ہماری بات سمجھنے میں دشواری ہو رہی تھی کیونکہ وہ اپنے کانوں میں آلہ سماعت اس لئے نہیں لگا پارہے تھے کہ انہیں انفیکشن ہو چکا تھا۔ ان کے ایک ملازم نے جو انہیں ان کی بیٹی کی طرح پاپا کہہ رہا تھا بتایا کہ آج صبح وہ کافی خوش ہیں۔ بیٹی نے کہا کہ پچھلے دنوں ان کی طبیعت بہت زیادہ خراب تھی اب وہ پہلے سے بہتر ہیں۔ ان سے اجازت لینے سے پہلے ہم نے انہیں تسلی دی کہ وہ پھر سے تندرست ہو کر کالم لکھیں گے اور اپنی جدوجہد جاری رکھیں گے۔

یہ بات سن کر ان کے چہرے پر ایک افسردہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی جس میں مایوسی نمایاں تھی۔ ان سے ملاقات کے بعد صرف چھ دن کے اندر وہ دنیا سے چلے گئے۔ ہم ان سے ملاقات کے لئے ایک بار پھر جانا چاہتے تھے لیکن مجھے اسلام آباد جانا پڑ گیا۔ سولہ اکتوبر کی دوپہر ہمارے اسلام آباد آفس کے کولیک کاشف زید کے والد ممتاز ادیب اور ڈرامہ نگار منشا یاد کے نماز جنازہ میں شریک ہونا پڑا اور رات حمید اختر کے انتقال کی خبر مل گئی۔

ہم وہاں سے نکلے تو یادوں کے کئی جھروکے ایک ساتھ کھل گئے۔ حمید اختر مرحوم سے میری پہلی ملاقات 1980ء کی دہائی کے وسط میں ایک شادی کی تقریب میں ہوئی تھی۔ تب ان سے شناسائی نہیں تھی۔ ان سے جان پہچان روزنامہ ”ایکسپریس“ میں ہوئی جب وہ بطور ایڈیٹوریل رائٹر اور میں نیوز ایڈیٹر کے طور پر اس کی ٹیم میں شامل ہوئے تھے۔ اس دوران وہ امریکہ اور کینیڈا گئے اور کچھ عرصہ کے لئے ”ایکسپریس“ سے ان کا نائٹا ٹوٹ گیا۔ وہ جب واپس آئے تو صرف کالم لکھنے پر آمادہ ہوئے اور پھر یہ رشتہ آخری دم تک قائم رہا۔ جب تک صحت نے ساتھ دیا وہ ہفتے میں دو بار دفتر آتے تھے۔ بدھ اور اتوار ان کے مخصوص دن تھے لیکن بعض اوقات کوئی ارجنٹ کالم چھپوانا ہوتا تو کسی اور دن بھی ضرور آ جاتے۔ ہفتے میں دو دن وہ اپنے کالم کا پروف خود پڑھ کے جاتے اور باقی دنوں کے لئے ان کا اعتماد ہمارے کولیک مظہر منہاس پر ہوتا کہ وہ ان کے کالم میں غلطی نہیں جانے دیتے۔ اس معاملے میں لطیف، سجاد کریم اور مجھے وہ نالائق سمجھتے تھے۔ ہم نے بھی ان کے اس اعتماد کو کبھی ٹھیس پہنچانے کی کوشش نہیں کی، انہیں حقیقت کبھی نہیں بتائی۔ حمید صاحب دوسروں کے دکھ دیکھ یا سن کر پریشان ہو جایا کرتے تھے، انہوں نے کتنے ہی ایسے کالم لکھے جن میں قارئین سے کسی ضرورت مند کی مدد

کی اپیل کی گئی ہوتی تھی۔ ان کے ساتھ جب بھی نشست ہوئی کوئی نہ کوئی دلچسپ واقعہ ضرور سننے کو ملا۔ فیض احمد فیض، سجاد ظہیر، سبط حسن، ابن انشاء اور ساحر لدھیانوی کا ذکر سب سے زیادہ کرتے تھے۔ جوانی کی محفلوں کا احوال بھی بڑے پیار سے سناتے۔ میڈم نور جہاں کے کئی واقعات بھی ان کی زبانی سنے۔ ”پرش احوال“ میں جب یادوں کے جھروکے کا تڑکے لگتا تو کمال ہو جاتا۔ ان کی ایک عادت یہ بھی تھی کہ جب بھی کوئی ماضی کا قصہ لکھتے وہ ہمیں زبانی ضرور سناتے۔ کرکٹ سے بھی خاص لگاؤ تھا پاکستانی ٹیم میچ جیت جاتی یا ہارتی مجھے فون کر کے خوشی یا خفگی کا اظہار ضرور کرتے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار جب میں نے پائپ پینے کی خواہش کا اظہار کیا تو وہ دوسرے روز تین چار سموکنگ پائپ لے کر دفتر آئے اور کہا کہ ان میں سے جو پسند ہو وہ لے لو۔ ان کے دیئے ہوئے دو سموکنگ پائپ اب بھی میرے پاس ان کی یادگار کے طور پر موجود ہیں۔

آخری چند سال انہوں نے دوستوں کی یاد میں گزار دیے۔ کئی بار کہتے کہ جس کے اتنے دوست بچھڑ جائیں وہ زیادہ عرصہ کیسے جی سکتا ہے۔ وہ ہمت والے تھے کہ بہت دیر جی لئے۔ دوستوں کے ساتھ بھی اور دوستوں کے بعد بھی اس معاشرے کو سدھارنے کی جدوجہد کرتے رہے۔ شدت پسند لوگ یا شدت پسند رویے ان کا راستہ نہیں روک سکے۔ وہ جیل میں رہے یا جیل سے باہر دوست ان کی زندگی میں بہت اہمیت رکھتے تھے۔ حمید اختر کی ایک دلچسپ عادت یہ بھی تھی کہ جب آتے بڑے تپاک سے ملتے اس کے بعد گپ شپ ہوتی۔ یوں بھی ہوا کہ وہ دواڑھائی گھنٹے تک ہمارے ساتھ رہے۔ جب تک بیٹھے رہتے بڑی اپنائیت سے بات کرتے۔ جیسے ہی انہیں جانے کا خیال آتا، کرسی سے اٹھتے اور چلے جاتے۔ جانے سے پہلے بات تو دور کی بات کسی کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ کہاں تھوڑی دیر پہلے تک اتنی اپنائیت اور کہاں اتنی بے رخی۔ انہوں نے ستاسی سال کی بھرپور زندگی گزاری۔ پھر اچانک بے رخی سے چلے گئے۔ مرحوم اپنے دوستوں کی یاد میں اکثر دکھی ہو جاتے تھے۔ اپنے دوستوں کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے ہی انہوں نے ”آشنائیاں کیا کیا“ لکھی۔ اس کتاب کے آغاز میں انہوں نے شان الحق حقی کا جو شعر لکھا تھا اس پر آخر کار خود بھی عمل کر گزرے ہیں۔

میں خود ہی جاؤں گا
اب انہیں ڈھونڈتا ہوا



حمید اختر..... یادیں، باتیں

لطیف چودھری (سمت نما) روزنامہ ”ایکسپریس“ 25 اکتوبر 2011ء

حمید اختر دنیا کو الوداع کہہ کر راہی ملک عدم ہو گئے۔ ان کے تمام دوست اور ہجولی پہلے ہی وہاں جا چکے ہیں۔ کشمیر کے صوفی بزرگ میاں محمد بخشؒ نے فرمایا ہے،

”جا او یار حوالے رب دے

میلے چار دناں دے

اس دن عید مبارک ہوسی،

جس دن فیر ملاں گئے“

اب اس جہاں میں ہماری ان سے ملاقات نہیں ہوگی لیکن جس روز دوبارہ ملیں گے، پھر محفلیں جما کریں گی۔ ان کے ساتھ میرا تقریباً 10 برس سے تعلق تھا اور یہ پر تکلف تعلق رفتہ رفتہ بے تکلف دوستی میں تبدیل ہوتا چلا گیا۔ میری ان سے پہلی ملاقات مئی 2002ء میں روزنامہ ”ایکسپریس“ لاہور کے دفتر میں ہوئی۔ جب مجھے بتایا گیا کہ حمید اختر صاحب ”ایکسپریس“ کا ادارہ لکھا کریں گے تو مجھے بہت خوشی ہوئی۔ اگلے روز انہوں نے دفتر تشریف لانا تھا لہذا وہ باقاعدگی سے دفتر آنا شروع ہو گئے اور میرے ساتھ والی نشست پر بیٹھ کر ادارہ لکھا کرتے تھے۔ میں ادارتی سیکشن کا انچارج تھا، لہذا وہ ادارہ اور کالم لکھ کر مجھے دیتے اور پھر دیر تک چائے کی پیالی پر گپ شپ ہوتی رہتی، یہ ہمارا روز کا معمول بن گیا تھا، وہ جیسے ہی کمرے میں داخل ہوتے، میں چائے کا آرڈر جاری کر دیتا، وہ مجھے کالم پکڑاتے اور ادارے کے موضوع پر بحث ہوتی جو بڑھتے بڑھتے سیاست، فلسفہ اور ثقافت تک پھیل جاتی۔ وہ مشرقی پنجاب کے شہر لدھیانہ سے ہجرت کر کے پاکستان آئے تھے جبکہ میرے والدین بھی بھارتی پنجاب کے شہر انبالہ کے ایک گاؤں کے رہنے والے تھے، اس حوالے سے ہمارا باہمی تعلق مزید گہرا ہوتا گیا، اب بحث میں تقسیم برصغیر کا موضوع بھی شامل ہو گیا۔ پنجاب کے لوگوں کی تقسیم کے جو زخم لگے،

اس کا دکھ وہ ہمیشہ محسوس کرتے رہے۔ ہنستے بستے گھر چھوڑنا، عزیزوں، رشتہ داروں اور دوستوں کی لاشیں اٹھانا آسان نہیں ہوتا۔ وفات سے چند ہفتے پہلے جب وہ بیماری سے کچھ سنبھلے تو ایک دن دوبارہ دفتر تشریف لائے، اس وقت وہ خاصے کمزور ہو چکے تھے لیکن ذہن بالکل توانا اور تندرست تھا، میں نے ازارہ مذاق ان سے پوچھا، ”حمید اختر صاحب، اگر ہندوستان میں ہی رہ جاتے تو زیادہ بہتر نہ ہوتا؟“ وہ چند لمحے خاموش رہے، شاید اپنے ذہن میں کوئی مناسب جواب تلاش کر رہے تھے۔ پھر گویا ہوئے، ”اب وہاں بھی سب کچھ تبدیل ہو گیا ہے۔“ اس کے بعد وہ خاموش ہو گئے، شاید ان کے ذہن میں لدھیانہ اور ممبئی کے مناظر گھوم رہے تھے۔ میرے والد چودھری حسن محمد بھی اس سوال پر خاصی دیر خاموش رہتے تھے اور پھر اپنے گاؤں لکھن پور، اپنی تحصیل روپڑ اور پہاڑی شہر بلاس پور کی باتیں کرتے جاتے تھے۔ ان کے دل میں اداسیوں اور دکھوں کا جو الاکھی بھڑکتا صاف محسوس ہوتا تھا۔

حمید اختر آخری ایام میں پاکستان میں انتہا پسندی اور تنگ نظری کے بڑھتے ہوئے طوفان سے پریشان ہو گئے تھے اور ان پر مایوسی کا عنصر غالب آ گیا تھا۔ انہوں نے مجھ سے کئی بار کہا کہ دل چاہتا ہے کہ ان کا بیٹا پاکستان میں رہے لیکن یہاں کے حالات دیکھ کر اسے وہیں رہنے کا کہہ دیتا ہوں۔ آخری ملاقاتوں میں انہوں نے متعدد بار ساحر لدھیانوی کا وہ جملہ دہرایا جس میں انہوں نے پاکستان سے بھارت جاتے ہوئے کہا تھا کہ ”حمید اختر تم بھی ہمارے ساتھ چلو، یاد رکھنا اس ملک پر انتہا پسندوں کا راج ہوگا۔“ ساحر لدھیانوی کی یہ پیش گوئی آج حقیقت بن کر ہمارے سامنے موجود ہے۔ حمید اختر اور ان کے ساتھیوں نے اس معاشرے کو لبرل اور متمدن بنانے کے لیے جو جدوجہد کی، اسے انہوں نے ناکام ہوتے دیکھ لیا تھا۔ اپنے بعض ہم عصر لکھنے والوں کی تحریروں پر کئی بار انہوں نے مجھ سے کہا، ”چودھری صاحب انہیں کیا ہو گیا ہے، عوام کو گمراہ کر کے تباہی کی طرف لے جا رہے ہیں۔“ میرا جواب ہوتا، ”حمید اختر صاحب، گورکن ہمیشہ یہ چاہتا کہ زیادہ سے زیادہ جنازے آئیں تاکہ اس کا روزگار چلتا رہے۔“

حمید اختر صاحب ایک ادیب اور صحافی ہی نہیں ایک سیاسی ورکر بھی تھے، انہیں نظر آ رہا تھا کہ دائیں بازو کا بااثر طبقہ اپنے مفادات کے لیے پورے ملک کو جلانے پر تلا ہوا ہے۔ تہذیب و ثقافت کو دیدہ دانستہ ختم کیا جا رہا ہے۔ کمیونسٹ پارٹی کے ساتھ ان کا گہرا تعلق رہا، اس لئے ان کا سیاسی شعور بہت بلند تھا۔ کمیونسٹ پارٹی کے رہنما سید سجاد ظہیر کے ساتھ قربت کے بارے میں وہ اپنے کالموں اور کتابوں میں کھل کر اظہار کر چکے ہیں۔ کمیونسٹ پارٹی پر پابندی کے بعد انہوں نے جو کچھ کیا، اس کا احوال بھی وہ بیان کر چکے ہیں۔ ساحر لدھیانوی کے ساتھ ان کی دوستی اور محبت کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ سبط حسن، فیض احمد فیض، عبداللہ ملک، احمد بشیر اور صفدر میر سے نظریاتی وابستگی کے بعد ان

کے سیاسی نظریات کے بارے میں کوئی ابہام نہیں ہے۔ انہوں نے اپنے نظریات کو کبھی چھپایا بھی نہیں۔ ان کا طرز زندگی ترقی پسند نظریات کا آئینہ دار تھا اور انہوں نے معاشرے کو لبرل بنانے کی بات کبھی چھپا کر نہیں کی۔ پاکستان میں دائیں بازو کا ایک گروہ مفاد پرستی کی اس معراج پر رہا ہے جہاں اسے سات خون معاف ہوتے ہیں، اس لئے اس گروہ نے ہر اس شخص کی کردار کشی کی جو معاشرے میں رواداری، پیار و محبت اور دولت کی منصفانہ تقسیم کی بات کرتا تھا۔ اس گروہ نے روشن خیالی کو کفر کے مترادف قرار دے کر سرمایہ داروں کا حق نمک ادا کیا۔ یہ شخصیات کی نہیں نظریات کی جنگ ہے اور یہ کبھی ختم نہیں ہوگی۔ عوام کے حق کی بات کرنے والے ماضی میں ختم ہوئے نہ آئندہ ہوں گے۔ میں ادارتی شعبے کا انچارج ہوں۔ وہ اپنا ہر کالم خود آ کر مجھے ہی دیا کرتے یا بھجواتے تھے۔ کتابوں پر تبصرے کے معاملے میں بہت ”فیاض“ تھے۔ لیکن کتاب کا انتخاب کرتے وقت موضوع کے علاوہ لکھنے والے کی اصلیت کو بھی سامنے رکھ کر فیصلہ کیا کرتے تھے، اس معاملے میں وہ اتنے محتاط تھے کہ میری سفارش بھی رد کر دیتے تھے جہاں تک میرا معاملہ ہے، مجھے اطمینان ہے کہ میں نے انہیں اتنا خوش رکھا کہ انتقال سے چار روز پہلے انہوں نے خود فون کر کے جن لوگوں کو ملاقات کے لئے آنے کا کہا، ان میں عباس اطہر صاحب اور ایاز خان صاحب کے علاوہ میں بھی شامل تھا۔ اس ملاقات کے دوران وہ مقررہ وقفے سے ہو میو پپتھک کی ایک دوا کے قطرے پیتے اور ہم سے باتیں کرتے رہے، اس روز بھی انہیں بے وفازندگی سے وفا کی امید تھی لیکن ہم تینوں بہت ہی مایوس لوٹے کیونکہ ہمیں صاف نظر آ گیا تھا کہ انہیں دوا سے زیادہ دعا کی ضرورت ہے۔



بیاد رفتگاں

کشور ناہید، روزنامہ ”جنگ“ 28 اکتوبر 2011ء

ابھی کوئی دو گھنٹے پہلے کی بات ہے، میں نے منشاء یاد سے بات کی، بہت مزے کی بات تھی۔ کسی اخبار نے شائع کیا کہ پاکستان کا سب سے امیر شخص محمد منشاء ہے، منشاء یاد ڈر گیا اور سب کو میل بھیجی کہ بھائی میں وہ منشاء نہیں ہوں، میرے پیچھے ڈاکوؤں کو مت پڑو ادینا کہ میں غریب افسانہ نگار منشاء یاد ہوں۔ میں نے منشاء کو فون کیا۔ بولا تم ہنس رہی ہو۔ مجھے پریشانی لگی ہے کہ کوئی مجھے واقعی امیر ترین شخص منشاء نہ سمجھ لے۔ بات آئی گئی ہو گئی اور چند گھنٹوں بعد خبر ملی کہ منشاء یاد نہیں رہے۔ میں سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ میں نے تو مذاق میں بات کی تھی۔ ابھی تو پندرہ دن پہلے اس کی کتاب ”منشائے“ آئی تھی۔ وہ تو صبح دس بجے سے اسٹڈی میں آ کر بیٹھ جاتا تھا۔ اپنے بارے میں ساری معلومات کمپیوٹر پر رکھتا تھا۔ جو بھی تقریب ہوتی، اس کی تصاویر نہ صرف اتارتا بلکہ وہ تمام تصاویر کمپیوٹر پر ڈال کر سب کے نام بھیجا کرتا تھا۔ حلقہ ارباب ذوق کو اسلام آباد میں قائم رکھنے اور جاری رکھنے کی ذمہ داری اس حد تک منشاء نے اپنے ذمے لی ہوئی تھی کہ کوئی ادیب شہر میں دعوت کرے یا دوسرے شہر سے آنے کی ضیافت کرے اور وہ دن جمعہ کا ہو وہ فوراً معذرت کر لیتا تھا کہ جمعہ کو تو حلقہ ارباب ذوق حسب معمول میرے گھر اوپن ہاؤس تھا۔ میں نے منشاء کو آنے کا کہا۔ بولا ”میں سب سے بڑا ہوں سب لوگ میرے گھر آئیں گے اور اگلے دن میں ان کے گھر جاؤں گا“۔ منشاء ایسا شہری بابو پینڈو تھا کہ وہ شیخوپورہ کے پنجابی لہجے میں اردو بولتا تھا اور بہت پیارا لگتا تھا۔ منٹو پہ اور مفتی صاحب پر اس کے کمال کے مضامین تھے۔ وہ بولتا بہت کم تھا مگر جو کچھ بولتا تھا بڑا نپا تلا ہوتا تھا۔ بڑے مجبور کرنے پر اس نے ٹیلی ویژن کے لئے ڈرامے لکھے وہ جس کے اوپر بھی کوئی تحریر پڑھتا اس کو باقاعدہ لکھتا تھا اور اپنے کسی مجموعے میں شامل کر دیتا تھا۔ بہت ڈسپلن سے وہ اپنی تحریروں کو جمع کرتا تھا۔ کبھی کسی سے لڑائی مول نہیں لیتا تھا۔ کئی دفعہ مظہر السلام نے لڑنے کی کوشش کی مگر وہ تو دوست تھا اس نے مظہر پہ بہت خوبصورت مضمون لکھا تھا۔ ابھی میں اتنا ہی لکھ پائی تھی کہ اصغر ندیم سید کا فون آ گیا مجھے اب اس کے فون سے ڈر لگتا ہے وہ کوئی نہ کوئی سانحہ

مجھے سنا دیتا ہے۔ یہی نہیں اچھی باتیں بھی سنا دیتا ہے جب زاہد ڈار کو ڈینگنی ہوا۔ اصغر نے بتایا، جب وہ ٹھیک ہوا اصغر نے بتایا، اے حمید کا انتقال ہوا۔ اصغر نے بتایا۔ سہیل احمد خان کی بیگم کا ڈینگنی کے باعث انتقال ہوا۔ اصغر نے بتایا اور اب۔ کیا کہوں کہ کیا بتی۔ حمید اختر صاحب دنیا سے چلے گئے۔ ترقی پسند تحریک کا آخری گواہ ہم سے رخصت مانگ رہا تھا۔ اتنے حوصلہ مند تھے کہ کیمو تھراپی کروا کر جلسے میں آجاتے تھے۔ کراچی چلے جاتے تھے، ملتان چلے جاتے ہیں، اسلام آباد کے جلسے میں شامل ہو جاتے تھے۔ کچھ دنوں پہلے لکھا تھا ”مجھ سے اب لکھا نہیں جاتا“ پھر بھی آخری دم تک لکھتے رہے۔ فیض صاحب کی باتیں ہوں کہ سبط حسن کی باتیں، دن، تاریخ اور سال کے حساب سے سب کچھ ہی تو انہیں یاد تھا۔ سنانے کا انداز ایسا شیریں تھا کہ سننے والے بور نہیں ہوتے تھے۔ حس مزاح اتنا شگفتہ تھا کہ فیض صاحب جیسا سنجیدہ آدمی بھی ہنسے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ ”کال کوٹھڑی“ سے لے کر دوستوں کی یادوں اور ترقی پسند تحریک کی پوری داستان حمید اختر صاحب نے لکھ ڈالی۔ جس زمانے میں کالم نہیں لکھتے تھے، سیمنٹ کی ایجنسیاں لی ہوئی تھیں۔ ریگل میں ان کا آفس تھا، سیاست دانوں سے لے کر بائیں بازو کے لوگ ہر وقت بھرے رہتے تھے۔ کبھی کسی حکومت کے سامنے نوکری کے لئے ہاتھ نہیں پھیلا یا۔

عبداللہ ملک کے ساتھ ”آزاد“ اخبار 1970ء میں نکالا، بہت چلا مگر سہ ماہی نہیں تھا۔ اس لئے بند کرنا پڑا۔ بیوی کو بھی کینسر ہوا۔ خود کو بھی کینسر ہوا مگر حوصلہ نہ ہارا۔ قلم سے روزی کمائی۔ بچیوں کی شادیاں کیں۔ نواسے نواسیاں پالیں، خوش و خرم زندگی گزاری۔ حکومتوں کی کمزوریاں بھی گنوائیں تو اس سلیقے سے کہ آگینوں کو ٹھیس نہ لگ جائے۔

مگر منشاء یاد کو تو کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ کچھ دن ہونے کراچی میں ایک کانفرنس تھی منشاء نے مجھ سے پوچھا ”کیا تم جا رہی ہو“ میں نے کہا ”مجھے تو بلایا ہی نہیں“ منشاء نے کہا ”لو پھر میں بھی نہیں جا رہا“ میں نے کہا ”جاؤ ذرا ہوا بدلی ہو جائے گی، ہندوستان سے آئے لوگوں سے ملاقات ہوگی“ کہنے لگا تمہیں معلوم ہے مجھے پیس میکر لگا ہوا ہے میں اکیلا نہیں جاتا“ منشاء جی تم تو گھر پر تھے اکیلے نہیں تھے۔ پھر کس سے ڈر کر چلے گئے ہو۔ اتنی اچھی اردو اور اتنی ہی اچھی پنجابی لکھتے تھے اب تمہارے پڑھنے والے مجھ سے تمہارا حال پوچھیں گے تو میں ان سے کیا کہوں گی، تم محمد منشاء کی طرح رئیس نہیں تھے مگر ادب کے رئیس تھے۔ تم جیسا ڈسپلن میرے اندر بھی نہیں ہے۔ حمید اختر کو تو کینسر لے گیا۔ تم کیوں ہم سے روٹھ گئے۔ میں تو تمہارے گھر ضد کر کے مکئی کی روٹی بنوایا کرتی تھی اب کس سے ضد کروں گی، تمہارے جنازے میں بہت لوگ تھے، آخر کو ساری عمر ادب کی خدمت کی دیکھو تو، لوگ تمہارا حال پوچھنا چاہتے ہیں کہاں چلے گئے ہو!!!



آخری دیدار

عطا الحق قاسمی (روزن دیوار سے) روزنامہ ”جنگ“ 20 اکتوبر 2011ء

خبر ملی ہے کہ محمد منشاء یاد کا انتقال ہو گیا۔ اس سے اگلے دن پتہ چلا کہ حمید اختر بھی اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں اور پھر ”جیو“ پر یہ خبر دیکھی کہ ”جنگ“ کونسل کے ریڈیڈنٹ ایڈیٹر اختر مرزا حرکت قلب بند ہونے سے اپنے خالق حقیقی سے جا ملے، اختر مرزا سے ایک ہفتہ قبل کونسل کی ادبی کانفرنس میں صرف چند لمحوں کی پہلی ملاقات ہوئی تھی ہم دونوں نے ایک دوسرے سے موبائل نمبر ایکسچینج کئے مگر یہ ملاقات آخری ملاقات ثابت ہوئی اور یوں ان کا نمبر میری ڈائری میں لکھا رہ گیا۔ حمید اختر بھرپور زندگی گزارنے کے بعد اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ ترقی پسند مصنفین کی متحرک شخصیت، خوبصورت افسانہ نگار اور بلند پایہ صحافی حمید اختر کی تحریکی ادبی اور صحافتی خدمات کا ایک زمانہ معترف ہے اور میں نے تو انہیں موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوری بہادری سے کینسر جیسے موذی مرض کا مقابلہ کرتے بھی دیکھا، وہ ہار ماننے پر آمادہ نظر نہیں آتے تھے۔ بالآخر اس موذی نے ان پر آخری وار موت کی صورت میں کیا اور وہ 87 سال کی عمر میں اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ متذکرہ مرحومین کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کی لغزشیں معاف فرمائے۔

محمد منشاء یاد اردو اور پنجابی کا صف اول کا افسانہ نگار ہی نہیں بلکہ میرا عزیز ترین دوست بھی تھا۔ وہ اسلام آباد میں تھا اور میں لاہور میں، لیکن فون پر ہمارا رابطہ رہتا تھا۔ موت سے ایک دن پہلے اس کا فون آیا اور وہ ہنستا چلا جا رہا تھا۔ میں نے کہا کیا بات ہے آج بہت خوش نظر آ رہے ہو۔ بولا خوش کیوں نہ ہوں آج ایک اخبار میں خبر شائع ہوئی ہے کہ پاکستان میں چار افراد ایسے ہیں جو اربوں روپوں کی جائیداد کے مالک ہیں اور ان میں سرفہرست میرا نام ہے یعنی میں پاکستان کا امیر ترین شخص ہوں! دراصل متذکرہ اخبار میں میاں محمد منشاء کی جگہ منشاء یاد کا نام شائع ہو گیا تھا، منشاء یاد ہنس رہا تھا اور کہہ رہا تھا ”مجھے صبح سے چندہ مانگنے والی کئی تنظیموں کے فون آ رہے ہیں۔ ابھی رشتہ داروں نے یلغار کرنی ہے، دوستوں نے لاکھوں روپے بطور قرض حسہ مانگنے ہیں ایف بی آر والوں نے بھی پیچھا کرنا ہے اور انعام برائے تاوان والے بھی تیار بیٹھے

ہوں گے۔ یار کیا کروں؟ ”میں نے کہا“ کرنا کیا ہے صرف ایک بہت بڑا بورڈ اپنے گھر کے باہر آویزاں کر دو، جس پر یہ سرخی جلی حروف میں لکھی گئی ہو ”ایک ضروری اعلان“ اور نیچے درج ہو کہ خواتین و حضرات، میں پاکستان کا امیر ترین آدمی نہیں ہوں، اخبار میں میرا نام سہواً لکھا گیا ہے، لہذا تمام ”متعلقہ“ افراد اور اداروں سے گزارش ہے کہ وہ میری طرف قدم رنجاں فرمانے کی زحمت نہ فرمائیں۔ شکر یہ!“ اس پر اس نے ہنستے ہنستے فون بند کر دیا۔

اور اگلے روز جب نوجوان شاعر ناصر بشیر نے مجھے یہ خبر سنائی کہ منشاء یا دفوت ہو گئے ہیں تو مجھے ایسے لگا جیسے بجلی کا کرنٹ لگا ہو۔ وہ تو کل مجھ سے باتیں کر رہا تھا۔ ہنس رہا تھا، وہ کیسے مر سکتا ہے؟ مجھے اس سے ہونے والی بیسیوں ملاقاتیں یاد آرہی تھیں۔ میں اور امجد اسلام جب بھی اسے ملتے تو دوستانہ جملے بازیاں شروع ہو جاتیں۔ یہ منشاء کا میدان نہیں تھا چنانچہ جب وہ ہم دونوں کے تازہ توڑ حملوں سے زچ ہو جاتا تو ہم پر باقاعدہ حملہ آور ہو جاتا اور گھونسوں سے ہماری مدارات کرتا اور پھر ہم تینوں ہنس ہنس کر دوہرے ہو جاتے..... منشاء بے حد محبتی شخص تھا۔ اسلام آباد میں جن چند دوستوں سے میرا قلبی تعلق تھا منشاء ان میں شامل تھا، چنانچہ میں اسلام آباد میں داخل ہوتے ہی اسے اس ”خطرے“ سے آگاہ کرتا کہ آج شام تم سے ملاقات ہونے والی ہے لہذا میں گرم جوش معانقہ، ادب اور ادیبوں کی باتیں اور وہ ڈنریا ہیوی ٹی ہوتی جس کا اہتمام وہ بڑے اہتمام سے کرتا تھا۔ منشاء ادیبوں میں واحد تو نہیں لیکن انٹرنیٹ میں دلچسپی لینے والوں میں سرفہرست ضرور تھا۔ اس نے اپنی ویب سائٹ بنائی ہوئی تھی جس سے وہ اپنے قارئین اور دوستوں کے ساتھ مسلسل رابطے میں رہتا۔ مجھے انٹرنیٹ کی ابجد کا بھی علم نہیں چنانچہ جب وہ کہتا کہ میں تمہیں فلاں تصویر یا فلاں مضمون بھجوا رہا ہوں تم ڈاؤن لوڈ کر لینا تو میں کہتا ”مجھے تو ای میل چیک کرنا ہی نہیں آتی، لہذا تم پوسٹ کر دو“ جس پر وہ جھنجھلا جاتا۔ میرے بیٹے عمر قاسمی نے بتایا کہ انکل منشاء یا اپنی وفات سے آٹھ گھنٹے قبل بھی انٹرنیٹ پر موجود تھے اور انہوں نے ان لمحوں میں اپنی ایک پسندیدہ غزل جو ڈاؤن لوڈ کی تھی اس کا مطلع تھا

جب تصور میں تیری راہ گزر باندھیں گے

چھوڑ کر کنج اماں رخت سفر باندھیں گے

تو میرا یہ دوست رخت سفر باندھ کر کنج اماں کی طرف روانہ ہو گیا اور ادب جو اس کا اوڑھنا بچھونا تھا، اس کے جانے سے بے اماں تو نہیں ہوا، البتہ اس جیسے بے مثال افسانہ نگار سے محروم ضرور ہو گیا ہے۔

میں نے منشاء یا کے افسانوی مجموعے ”ماس اور مٹی“ کے فلیپ میں لکھا تھا، ”افسانہ منشی پریم چند سے ہوتا ہوا انتظار حسین تک اور انتظار حسین سے منشاء یا تک پہنچا ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ ”عہد جدید تر میں منشاء یا سے بڑا

افسانہ نگار کوئی نہیں۔ آج کا اردو افسانہ اگر شہر ہے، تو منشاء اس شہر کا دروازہ ہے، اور میری اس رائے سے میرے بہت سے افسانہ نگار دوست ناراض ہو گئے..... اور شاید انہیں ہونا بھی چاہئے تھا! منشاء کی وفات سے صرف ایک ہفتہ قبل اس کی ایک نئی کتاب ”منشائے“ کے نام سے مجھے ڈاک میں موصول ہوئی، یہ خاکوں کی کتاب ہے اور اس میں منشاء کا شگفتہ انداز بیان جگہ جگہ جھلکتا ہے، اس میں مجھ پر لکھا ہوا خاکہ بھی ”کالم نگاری کا جن“ کے عنوان سے موجود ہے، جو اس کی محبتوں کی آخری نشانی کے طور پر اس کتاب ہی میں نہیں، میرے دل کی بک شیلف میں بھی ہمیشہ موجود رہے گا۔

جس روز منشاء یاد کا جنازہ (جنازہ؟ یہ میں کیا لکھ رہا ہوں؟) تھا۔ اس روز لاہور میں الحمر آ آرٹس کونسل نے فیض صدی کے سلسلے میں سیمینار کا اہتمام کیا ہوا تھا اور یہ تقریبات رات گئے تک جاری رہنا تھیں۔ ان تقریبات میں میری موجودگی بہت ضروری تھی کہ میں میزبان تھا، سواگلے دن علی الصبح میں بذریعہ کار اسلام آباد کے لئے روانہ ہوا تا کہ قلوں میں شرکت کر سکوں۔ منشاء کے گھر ”افسانہ منزل“ میں دیگر بے شمار سوگواروں کے علاوہ آغا ناصر، جلیل عالی، غضنفر مہدی، سرور کامران، وقار بن الہی، حمید شاہد، اقبال آفاقی اور دوسرے ممتاز ادیب موجود تھے جو منشاء کے حوالے سے اپنی یادیں ”شیر“ کر رہے تھے، فاتحہ خوانی سے فراغت کے بعد واپس لاہور جاتے ہوئے میں قبرستان کے سامنے کھڑا سوچ رہا تھا کہ جوش ملیح آبادی، قدرت اللہ شہاب، ممتاز مفتی، احمد فراز، پروین شاکر، منصور قیصر اور بہت سے دوسرے ادیبوں کے علاوہ اب منشاء یاد بھی اپنا گھریا چھوڑ کر اسلام آباد کے اس قبرستان میں آباد ہو گئے ہیں اور منشاء کے گھر میں بیٹھے ہوئے ہیں بھابی فرحت نسیم، اپنے بھتیجیوں ڈاکٹر شکیل، فرخ اور دوسرے عزیز واقرباء سے پوچھنا چاہتا تھا کہ منشاء نے کبھی اشارہ دیا تھا کہ وہ یہ گھر چھوڑ کر جا رہا ہے اور اب کبھی واپس نہیں آئے گا؟ میں نے سنا ہے کہ مرنے والے عموماً یہ اشارہ دیا کرتے ہیں تاہم مجھے یاد آیا کہ منشاء نے بھی تو انٹرنیٹ پر دی ہوئی اپنی غزل کے مطلع میں پیشگی یہ اطلاع دی تھی کہ وہ رخت سفر باندھ کر کج اماں کی طرف روانہ ہونے والا ہے اس کے علامتی افسانے تو سمجھ میں آنے والے ہوتے تھے۔ بس اس کی یہ علامتی اطلاع ہم پر اپنا پورا مفہوم واضح نہ کر سکی..... مجھ سے منشاء یاد کی تعزیت کرنے والے دوستوں میں سے ایک دوست نے کہا ”میں تمہارے اس دکھ میں بھی شریک ہوں کہ تم منشاء کا آخری دیدار نہ کر سکتے“ میں نے کہا ”مجھے کاندھانہ دے سکنے کا تو دکھ ہے لیکن اگر میں جنازے پر پہنچ بھی جاتا تو بھی آخری دیدار نہ کرتا کہ مجھے اپنے پیاروں کے لئے وہ ملبوس پسند ہی نہیں جو وہ اس روز سفید کفن کی صورت میں پہنتے ہیں میں سفید کفن، مشک کا فور اور اگر بتیوں کے دھوئیں میں منشاء سے ہونے والی ملاقات پر اس قبہ قہبے کو ترجیح دوں گا جو اس کی وفات سے ایک روز قبل میرے کانوں میں گونجا تھا۔ میرے لئے یہی ان کا آخری دیدار تھا۔



چھوڑ گئے ساتھ حمید اختر اور منشاء یاد

صہیب مرغوب، روزنامہ ”جنگ“ 19 اکتوبر 2011ء

ہفتہ رفتہ ادبی دنیا کے بالخصوص اور ذوق مطالعہ رکھنے والوں کے لئے بالعموم انتہائی تکلیف دہ رہا۔ صرف دو دنوں میں منشاء یاد اور حمید اختر اہل ادب کا ساتھ چھوڑ گئے۔ انہوں نے نہ صرف ادب بلکہ پورے معاشرے پر اپنی تحریروں کی چھاپ چھوڑی ہے۔ محمد منشاء یاد نے ضلع شیخوپورہ کے گاؤں ٹھنہ نستر میں 5 ستمبر 1937ء کو آنکھ کھولی۔ اس چھوٹے، دور افتادہ گاؤں سے اسلام آباد کی پرفریب فضاؤں کا سفر انہوں نے کسی جاگیردار یا افسر کے کندھوں پر نہیں، اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر طے کیا۔ ان کا گھریلو ماحول نہایت دینی تھا بالخصوص ماموں دینی تربیت پر کافی توجہ دیتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ فلم ”پرچھائیاں“ دیکھنے چلے گئے۔ ان کے کزن نے یہ راز فاش کر دیا۔ منشاء یاد ماموں کے ڈر سے اپنے پڑوسی قوال کے گھر پہنچ گئے۔ ماموں کے آتے ہی انہوں نے قرآن شریف کی تلاوت لگا دی۔ ماموں اسے سن کر بے حد متاثر ہوئے مگر بعد میں بولے ”بے شک اچھی آواز ہے، پڑھا بھی درست ہے مگر یہ جس ذریعے سے ہم تک پہنچا ہے وہ تو شیطانی ہے۔“ منشاء یاد کے والد حاجی نذیر احمد کاشتکاری اور حکمت کے پیشے سے منسلک تھے مگر منشاء یاد نے آبائی کام چھوڑ کر اسلام آباد کو چنا۔ آپ نے ذریعہ معاش کیلئے انجینئرنگ جیسا ٹھوس موضوع پسند کیا اور تسکین روح کے لئے ادب اور شاعری میں پناہ ڈھونڈی۔

انہوں نے اپنا تخلیقی سفر ساتویں جماعت میں شروع کیا۔ زمانہ طالب علمی میں پندرہ روزہ ”ہدایت“ میں بھی تسلسل کے ساتھ کہانیاں اور نظمیں لکھیں۔ اہل جریدہ مصرعہ طرح دیتے جس پر وہ دلچسپ نظم لکھتے۔ ہفت روزہ ”ہمدرد“ کے مالک سید مبین الدین حسن نے اپنے جریدے میں فکاہیہ کالم لکھنے پر مامور کیا، لیکن ادبی صلاحیتوں نے چند ماہ میں اسی جریدے کا مدیر معاون بنا دیا۔ وہ یاسیت اور اداسی کو بھی تخلیق کی روح گردانتے تھے۔ وہ کہتے ”کچھ بھی تخلیق کرنے سے پہلے وہ اپنے اوپر ایک خاص تخلیقی ماحول طاری کرتے ہیں اداسی اور یاسیت میں ڈوب جاتے ہیں۔ وہ بار بار اداس گانے

سن کر اپنے اوپر ایک ایسی کیفیت طاری کر لیتے جس میں سوئی ہوئی حیات بیدار ہونا شروع ہو جاتیں۔ اس کیفیت میں انسان اُن دیکھی چیزوں کے پرنٹ بنانے لگتا ہے۔ اداسی ایسی ہری بھری شاخ ہے جس پر تخلیق کے پھول کھلتے ہیں۔

ان کے افسانوں میں طنز و مزاح بھی ملے گا اور انسانی و معاشی مسائل میں گھرے مجبور لوگ اپنی زندگی بھی اپنی مرضی کے مطابق گزارنے سے قاصر ملیں گے، وہ اپنی زندگی بھر طاقت وروں کے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق گزارنے پر مجبور نظر آئیں گے۔ ”اسلام آباد جیسے شہر میں آرٹ اور کلچر کی کسی کو کوئی پروا نہیں۔“ پھر اسی خود غرض شہر میں انہوں نے کئی تنظیموں کی بنیاد رکھی۔ انہیں حلقہ ارباب ذوق اسلام آباد کے بانی ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ انہوں نے ادا جعفری کے ساتھ مل کر تنظیم ”سلسلہ“ کو بھی چلایا۔ اس کے اجلاسوں کی سب سے بڑی انفرادیت ادیبوں کی ”ون ڈش تواضع“ تھی۔ ”سلسلہ“ کو ”رابطہ“ میں بدلنے میں بھی وہ پیش پیش تھے۔ انہوں نے کتھارسس کے لئے ”لکھنے والوں کی ”انجمن“، ”بزم کتاب“ اور ”فلکشن فورم“ بنائے۔ منشاء یاد کا اعزاز افسانے ہی نہیں، ادبی شخصیات پر خاکے، یاد رفتگان اور کالم وغیرہ بھی ہیں۔ وہ طنز و مزاح کو ایک مشکل فن سمجھتے ہیں ”جس میں پھسلنے کے امکانات بہت زیادہ ہوتے ہیں“ لیکن وہ خود اس فن میں کبھی پھسلے نہیں۔ منشاء یاد اپنی کاوشوں کے باعث ایوارڈ دینے والوں کی ہمیشہ پسندیدہ شخصیت رہے ہیں۔ شاید ہی کوئی بڑا ایوارڈ ہو جو انہیں نہ ملا ہو۔

ان کے انتقال کے دو روز بعد حمید اختر بھی ہم سے نچھڑ گئے۔ حمید اختر کی ترقی پسندانہ زندگی سے سبھی واقف ہیں لیکن ان کا تعلق ایک معروف دینی گھرانے سے ہے، اس سے شاید کم لوگ ہی واقف ہوں گے۔ حمید اختر کا خاندانی نام اختر علی اور والد کا نام رحمت علی تھا۔ چند نسلوں کے بعد ان کے خاندان کا شجرہ نسب خواجہ قطب الدین بختیار کاکی سے ملتا ہے۔ سادات خاندان سے ہونے کے باوجود حمید اختر نے اپنی اس پہچان کو ہمیشہ چھپائے رکھا بلکہ شاید نام بدلنے کی وجہ بھی یہی تھی۔ صرف تین سال کے تھے جب والد کا انتقال ہو گیا ماں نے قرآن پاک حفظ کرنے کے لئے اپنے خاندان کے بنائے ہوئے دینی مدرسے میں داخل کر دیا جہاں سے حمید اختر دس برس کی عمر میں حافظ قرآن بن کر نکلے۔ لدھیانہ کے سکول میں داخل ہوتے ہی انہوں نے خاندانی روایات اور اصولوں سے پہلی بغاوت کی جہاں انہوں نے اپنا نام اختر علی سے بدل کر حمید اختر رکھا اور پھر زندگی بھر اسی نام سے پہچانے گئے۔ لدھیانہ سکول میں ابن انشاء، ساحر لدھیانوی، سید انور جیسے معروف ادیبوں سے تعلقات قائم ہوئے جو زندگی کے آخری سالوں تک قائم رہے بلکہ اپنی کتاب ”لامکاں“ کے پیش لفظ میں حمید اختر اپنے اس دکھ کو بھی بیان کرتے ہیں کہ ان کے تمام دوست ایک ایک کر کے ان کا ساتھ چھوڑ گئے اور اب وہ ان کی کمی اور خلا کو محسوس کرتے ہیں۔ ساحر لدھیانوی اور ابراہیم جلیس کے ساتھ ان کی قربتیں اس قدر زیادہ تھیں کہ تینوں

دوست اپنی آمدنی بھی مل کر خرچ کرتے تھے۔ حمید اختر شاہ خرچ نہیں تھے لیکن ساحر میں یہ عادت پائی جاتی تھی۔ وہ سستی سواری کی بجائے ٹیکسی کرنا پسند کرتے تھے۔

حمید اختر کی پوری زندگی جدوجہد سے عبارت ہے۔ کبھی ذریعہ معاش کیلئے اور کبھی ملک میں امن و چین کیلئے۔ کئی نوکریاں تو انہیں چند ہفتوں کے بعد چھوڑنا پڑیں کافی جدوجہد کے بعد انہیں انگریز فوجیوں کو ”کھانا کھلانے“ کی نوکری مل گئی۔ حمید اختر کی انسان دوستی دیکھئے کہ انہوں نے انگریزوں کے کھانے میں اپنے پرانے دوستوں کو بھی شریک کرنے کی آرزو کی۔ ایک روز یہی حرکت کرتے ہوئے پکڑے گئے اور انہیں برخواستگی کا پروانہ تھما دیا گیا۔ حمید اختر نے کبھی جم کر نوکری نہ کی۔ جب بھی سچ بات کی اپنے ادارے سے نکالے گئے۔ انہوں نے اپنا پہلا افسانہ 1942ء میں لکھا۔

یہ افسانہ کتاب ”لامکاں“ میں شامل ہے۔ وہ اپنی زندگی میں تین مرتبہ جیل گئے اور جیل کی زندگی نے انہیں انسان دوستی بھی سکھائی۔ ان کی کتاب ”کال کوٹھڑی“ 1953ء میں شائع ہوئی جس میں جیل کے واقعات اور قصے کہانیاں شامل ہیں۔ بیورو کریسی کے سائل کو اسی کتاب میں صرف ایک جملے میں انہوں نے یوں بیان کیا ہے ”ہم سب اپنے مسئلے آئی جی پنجاب سے بیان کرنے کے لئے بے چین تھے، سپرنٹنڈنٹ نے آگے بڑھ کر ان سے کہا کہ سیاسی نظر بند ہیں، آئی جی نے پسندیدگی سے سر ہلایا، آنکھ اٹھا کر پپیل کی طرف دیکھا اور بولے بہت خوبصورت درخت ہے، بیوٹی فل ٹری ان ڈیڈ۔ یہ جملہ کہہ کر وہ پچھلے قدموں سے واپس چلے گئے۔ جس پر حمید اختر نے لکھا کہ ”یہ عظیم آئی جی، پنجاب کی تمام جیلوں کے بے تاج بادشاہ ہیں اور درخت کی تعریف کر کے رخصت ہوئے۔“ حمید اختر کے افسانے اور کہانیاں زندگی کے مسائل کے گرد گھومتی ہیں۔ معاشرتی اونچ نیچ، نظریاتی تصادم اور رشتے ناتوں کے مسائل ان کی کہانیوں اور افسانوں میں پڑھنے کو ملتے ہیں۔ زندگی کے آخری ایام میں انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے گھریلو زندگی بھی کہیں رک سی گئی ہے۔ زندگی کا یہ سفر شاید بندگلی پر پہنچ گیا ہے اسی لئے انہوں نے افسانہ لکھا ”آؤ بیوی باتیں کریں“ اس افسانے سے اشارہ ملتا ہے کہ زندگی کے جھمیلوں نے شاید ان کے لئے باتیں ہی ختم کر دی تھیں۔

دورنو جوانی میں حمید اختر نے ممبئی کی فلم انڈسٹری کیلئے مکالمے بھی لکھے۔ 1946-47ء میں حلقہ ارباب ذوق کے سیکرٹری رہے جس کی کارروائیوں کی رپورٹ ہفت روزہ ”نظام“ میں باقاعدگی سے شائع کرواتے رہے۔ قیام پاکستان کے بعد 1953ء میں روزنامہ ”امروز“ جوائن کیا جہاں احمد ندیم قاسمی، سید سبط حسن اور فیض احمد فیض جیسے ترقی پسندوں کی صحبت میسر آئی۔ چراغ حسن حسرت اور صوفی غلام مصطفیٰ تبسم سے بھی اسی اخبار کے توسط سے رابطے قائم رہے۔ دس برس یہ خشک اخباری کام کرتے ہوئے گزر گئے۔ ایوبی آمریت میں ان کے منہ سے یہ نوالہ بھی چھین لیا گیا۔ 1959ء میں اس

نوکری سے برطرفی کے بعد انہوں نے متعدد دوسری جگہوں پر کام کیا۔ اپنی کتاب ”لامکاں“ میں لکھتے ہیں ”عمر عزیز کے 67 برس پورے کر چکا ہوں مڑ کر پیچھے دیکھتا ہوں تو بہت سے ساتھی سگی دوست اور مہربان رخصت ہو چکے ہیں۔ ساحر لدھیانوی، ابن انشاء، ابراہیم جلیس، احمد ریاض اور سید انوران لوگوں سے طویل رفاقت رہی جنہوں نے جینے کا حوصلہ دیا۔ پانچ برس قبل سبب حسن بھی ساتھ چھوڑ گئے اب احساس ہوتا ہے کہ دنیا خالی خالی سی نظر آتی ہے۔“



انجمن ترقی پسند مصنفین اور حمید اختر

تحریر: رانا سلیمان خاور 20 ستمبر 2012ء

انجمن ترقی پسند مصنفین کے ساتھ جڑنا اور اسے جوش و خروش کے ساتھ آگے بڑھانا حمید اختر کا مفرد کارنامہ تھا جس کا اعتراف سید سجاد ظہیر سمیت اور بہت سے لوگوں نے بھی کیا ہے۔ حمید اختر کے اپنے لفظوں میں یہ ترقی پسند تحریک کے عروج کا زمانہ تھا اور اس تحریک سے متعلق تقریباً سبھی بڑے نام اُس وقت ممبئی میں موجود تھے جن کی اکثریت انجمن کے ہفتہ وار ادبی جلسوں میں شریک ہوتی۔ اس وجہ سے ان جلسوں کی اہمیت اور بڑھ جاتی کہ ان کی کارروائی میں حصہ لینے والے بالعموم ترقی پسند ادب تخلیق کرنے والے ادیب، شاعر اور نقاد ہوتے تھے۔ ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کی بحث کے باوجود اس زمانے میں ترقی پسند اور غیر ترقی پسند ادیبوں کی تقسیم اتنی زیادہ نمایاں نہ تھی۔ اس لیے معروف ترقی پسند ادیبوں کے علاوہ دوسرے بیشتر ادیب اور شاعر بھی ان جلسوں میں شریک ہوتے۔ میراجی تو باقاعدہ حصہ لینے والوں میں شامل تھے۔ اور ان کی شاعری سے اختلاف رکھنے والے ترقی پسند ادیب بھی ان کی تنقیدی آراء پوری توجہ سے سنتے اور پوری اہمیت دیتے۔ حفیظ جالندھری، یگانہ یاس، چنگیزی، پطرس بخاری اور دوسرے متعدد شعراء اور ادیب بھی جب کبھی ممبئی آتے، انجمن کے ہفتہ وار جلسوں میں ضرور شرکت کرتے۔ (حمید اختر ”روداد انجمن“ لاہور ص 9)

حمید اختر ان ادبی جلسوں کی ہر ہفتے رپورٹ لکھتے جو باقاعدگی سے ہفت روزہ ”نظام“ ممبئی میں شائع ہوتی رہی۔ اس زمانے میں آزادی کی تحریک بھی اپنے آخری مرحلے میں داخل ہو رہی تھی اور ہندوستان کے آئینی مستقبل کے حوالے سے ادیبوں خصوصاً انجمن سے وابستہ ترقی پسند ادیبوں میں بھی بہت جوش و خروش پایا جاتا تھا۔ انجمن بحیثیت ایک تحریک و تنظیم اور اس سے جڑے ہوئے شاعر ادیب حق خود ارادیت کے اصول کی بنیاد پر پاکستان کی حمایت کر رہے تھے۔ ادبی تخلیقات کے ساتھ ساتھ یہ موضوع بھی ان مباحث کا حصہ بن رہا تھا۔ بقول حمید اختر:

”ان جلسوں میں اٹھائے جانے والے سوالات جن کا تعلق اس دور کی سیاسی تہذیبی ثقافتی اور ادبی زندگی سے

تھا اور ان پر ہونے والی بحثوں سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان لوگوں کی سوچ کیا تھی، وہ انسانی دکھوں پریشانیوں اور طبقاتی سماج کے مظاہر کو کس نظر سے دیکھتے تھے اور کیسی تبدیلی لانا چاہتے تھے۔“ (اقتباس ”روداد انجمن ص۔ 11)

ان سماجی تبدیلیوں کے لیے جدوجہد کا آغاز حمید اختر نے حقیقتاً انجمن کے جلسوں سے ہی کیا تھا جو زندگی بھر جاری رہی اور وہ انتھک مسافر کی طرح اس خواب کی تکمیل کے لیے تاحیات سرگرم عمل رہے۔

یہاں انجمن کے جلسوں میں ہونے والی مباحث کی تفصیل بیان کرنے کا موقع نہیں ہے لیکن اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ وہ تمام مباحث حمید اختر کی اپنی تحریروں میں جا بجا بکھرے ہوئے ہیں وہ ان کے مختصر افسانے ہوں یا اخباری ادارے اور کالم وہ تراجم ہوں یا ترقی پسند تحریک کے ساتھیوں کی یادداشتیں، خودنوشت سوانحی خاکے ہوں یا ان کے فلمی مکالمے اور منظر نامے اس جدوجہد کا پرتو ہر جگہ نظر آتا ہے جس کا آغاز ان کی انجمن کی سرگرمیوں سے ہوا تھا۔

حمید اختر نے اس دور کے جو خاکے اور یادداشتیں لکھیں، اردو ادب میں ان کا جواب شاید ہی کوئی دوسرا خاکہ نگار پیدا کر سکے۔ مایہ ناز فلمی اداکار طالش مرحوم ممبئی کی ترقی پسند کہکشاں کا ایک روشن ستارہ تھے۔ اس دور کے واقعات کے متعلق ایک مرتبہ کہا کہ مجھے کیا آتا ہے، اس دور کو زندہ حالت میں دیکھنا چاہتے ہو تو حمید اختر سے ملو۔ انہوں نے ایک دلچسپ واقعہ سنایا جس میں کرشن چندر نے اپنے بھولپن میں ان پر سردار جعفری کو قتل کرنے کا الزام لگایا تھا لیکن وہ واقعہ ڈھنگ سے نہیں سنا پائے۔ بعد ازاں اس کی تفصیل کرشن چندر کے ایک خاکے میں ملی جو حمید اختر نے لکھا تھا۔ اس کا جو لطف حمید اختر کی تحریر میں آیا، وہ طالش کے بیان میں دور دور تک غائب تھا۔ لکھتے ہیں:

”بیٹے ہوئے دنوں کی گرد میں دبے ہوئے بہت سے واقعات میں سے ایک واقعہ مجھے یاد آتا ہے، جس سے کرشن جی کی شخصیت کا ایک معصومانہ پہلو سامنے آتا ہے۔ ممبئی میں ترقی پسند مصنفین کے ہفتہ وار اجلاس بڑی باقاعدگی سے ہوتے تھے۔ کرشن سمیت سب لوگ ان میں شریک ہوتے تھے۔

ایک دفعہ وہ مہینہ بھر غائب رہے اور پورے چار ہفتے اجلاس میں نہیں آئے۔ ایک دن اجلاس کے بعد ہم تین چار دوست دالکیشو روڈ پر سجاد ظہیر صاحب کے مکان سے نکل کر مٹرگشت کرتے ہوئے جو پائی پہنچے تو کرشن ایک ریڑھی کے پاس گول گپے کھاتے ہوئے پکڑے گئے۔ ہمیں دیکھ کر ان کے چہرے پر جو مجرمانہ شرمندگی ابھری وہ میں زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔ بہت معذرت کی، معافیاں مانگیں، فلمی مصروفیات کے عذر تراشے مگر دوستوں نے انہیں جرمانہ کرنے کا فیصلہ کر دیا اور کہا کہ وہ پندرہ بیس آدمیوں کی پر تکلف دعوت کریں تو معافی مل سکتی ہے ورنہ نہیں، وہ مان گئے، تاریخ اور دن طے ہوا اور ہم سب لوگ مقررہ وقت پر ان کے پاس پہنچ گئے۔ اس دعوت میں ممبئی کے تمام قابل ذکر ادیب موجود تھے، لوگ

انسان دوستی تک کے سبب سے ہیں۔ ایسا نہیں تھا کہ حمید اختر اپنے دوستوں سے متاثر نہ ہوئے ہوں لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ انہوں نے اپنے ان دوستوں کو متاثر نہ کیا ہو۔ کرشن چندر کا ہی ایک واقعہ دیکھیں جو حمید اختر کے بیان کی وجہ سے امر ہو گیا کیونکہ اس واقعہ کا حصہ ہونے کے باوجود وہ خود اس میں کہیں نظر نہیں آتے۔ دراصل کرشن چندر کی جس معصومیت کو وہ دل و جان سے سراہتے ہیں وہ دراصل ان کی اپنی شخصیت کی معصومیت بھی ہے۔ یقین نہ آئے تو خود اپنے بارے میں ان کا خاکہ ”بیوقوف“ پڑھیے اور پھر کرشن چندر کے بارے میں ان کا تحریر کردہ مندرجہ ذیل واقعہ بھی دیکھیے۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ دونوں میں آئینہ کون ہے اور عکس آئینہ کون۔

”میں اس زمانے میں تقریباً ڈیڑھ برس ممبئی کی انجمن ترقی پسند مصنفین کا جنرل سیکرٹری رہا اور مختلف تقاریب جلسوں اور کانفرنسوں کے سلسلے میں کرشن جی کی مدد حاصل کرنے ان کے پاس جاتا رہا۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ انہوں نے کسی ذاتی مصروفیت کی بنا پر کبھی کوئی عذر پیش کیا ہو، ایسے کاموں کے لیے وہ ہر وقت تیار رہتے۔ جلسہ کی صدارت کرنی ہے کانفرنس کے لیے حیدرآباد دیا مالیا گاؤں جانا ہے، کسی تقریب میں مضمون پڑھنا ہے یہ سب ان کو محض بتانے کی ضرورت ہوتی تھی۔ ادیبوں کی تنظیم مشکل ترین کام ہے اس لیے کہ ہر ادیب اور شاعر کی اپنا مسئلہ بن جاتی ہے مگر اس زمانے میں ممبئی کے سبھی ادیب تعاون کرتے تھے اور کرشن جی ان میں پیش پیش تھے۔ گلی محلے شہروں کی سڑکوں بسوں ریل گاڑیوں میں سفر کرتے، کرشن لوگوں سے ملتے تو ان کی خوبیاں تلاش کرنے میں لگے رہتے۔ مجھے یاد ہے کہ قیام پاکستان سے قبل کلکتہ کے بعد ممبئی زبردست قسم کے ہندو مسلم فسادات کی زد میں آ گیا تھا۔ ساحر اور میں ممبئی کے نسبتاً خوش حال علاقے میں واقع ہندوستان کلا مندر کے دفتر کے ایک کمرے میں رہتے تھے۔ وارڈن روڈ کا یہ علاقہ چوپاٹی دالکیشو روڈ اور دوسرے بہترین علاقوں سے ملا ہوا تھا۔ یہاں ممبئی کے امراء رہائش پذیر تھے۔ امراء فساد نہیں کرتے بلکہ کراتے ہیں۔ چنانچہ شہر کے گنجان آباد علاقوں میں جہاں متوسط اور نچلے طبقے کے لوگ رہائش پذیر تھے۔ ہندو اور مسلمان غنڈے ایک دوسرے کو چہرہ اگھو پنپنے میں مصروف تھے، مگر ہمارا علاقہ محفوظ تھا۔ کمیونسٹ پارٹی کے ہیڈ کوارٹر واقع سیندرسٹ روڈ اور اس سے ذرا آگے اسی سے ملے ہوئے علاقے بھنڈی بازار میں وارداتیں زیادہ ہو رہی تھیں۔ اول الذکر علاقہ میں ہندو غالب اکثریت میں تھے اور بھنڈی بازار مسلمانوں کا علاقہ تھا۔ ہمارا ان علاقوں میں روزانہ آنا جانا ہوتا تھا۔ اس لیے کہ پارٹی ہیڈ کوارٹر میں ڈاکٹر اشرف، سید سجاد ظہیر، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، ظانصاری، محمد مہدی اور دوسرے بہت سے دوست تھے، ہم ان سے ملنے تقریباً روزانہ وہاں جاتے۔ بھنڈی بازار اور محمد علی روڈ پر کھانا کھانے جاتے۔ ممبئی کے فسادات نے زور پکڑا تو ہمیں فون پر ہدایت ملی کہ ہم سیندرسٹ روڈ کی طرف ہرگز نہ جائیں۔ چنانچہ تقریباً دو ہفتے ہم وارڈن روڈ پر واقع اپنے دفتر اور رہائشی

علاقے سے باہر نہیں نکلے وہیں ایک ریستوران میں مغربی کھانا کھاتے (جس سے پیٹ نہیں بھرتا تھا) اور وہیں رہتے۔ ہماری طرح کرشن چندر اور دوسرے ہندو دوستوں کو ہدایت کی گئی کہ وہ بھنڈی بازار اور محمد علی روڈ وغیرہ کے مسلم علاقوں میں نہ جائیں۔ کرشن اس پابندی سے سخت پریشان تھے۔ تیسرے ہی دن اندھیری سے چل کر ہمارے ہاں پہنچ گئے اور محمد علی روڈ جانے کے لیے اصرار کرنے لگے۔

ہم نے وہاں جانے کی وجہ پوچھی تو کہنے لگے ”یار ماں کھائے ہفتہ ہو گیا ہے منہ کا ذائقہ بگڑ گیا ہے۔ خدا کے لیے تم دونوں میرے ساتھ چلو تا کہ وہاں گوشت کھا سکیں۔“

”ہم ڈرتے ڈرتے انہیں ساتھ لے گئے۔ دل میں خوف تھا کہ کہیں کوئی مسلمان غنڈہ انہیں ہندو سمجھ کر چھرانہ مار دے۔ ان دنوں ممبئی کے اردو اخبارات اور رسالوں بالخصوص ہفتہ وار نظام میں جو محمد علی روڈ ہی سے شائع ہوتا تھا، ان کی تصویریں باقاعدگی سے چھپ رہی تھیں۔ وہ کوئی گننام آدمی نہیں تھے مذہبی جنون کے اس دور میں عجب نہ تھا کہ کوئی جنونی انہیں مار دیتا۔ مگر کرشن جی اس علاقے میں گھومتے رہے۔ وہیں ہوٹل میں بیٹھ کر کھانا کھایا۔ کسی مسلمان نے ان پر ہاتھ نہیں اٹھایا حالانکہ اس علاقے میں بیشتر لوگوں نے انہیں پہچان لیا تھا۔ واپس آئے تو ان کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ وہ کسی معصوم بچے کی طرح خوش تھے کہنے لگے ”گوشت کھانے کا تو بہانہ تھا دیکھنا یہ تھا کہ عام لوگ اس علاقے میں مجھ پر ہاتھ اٹھاتے ہیں یا نہیں۔ دیکھ لو سب نے مجھے پہچانا مگر کسی نے حملہ کرنے کی کوشش تک نہیں کی۔ فساد نہ غریب ہندو کرتے ہیں نہ غریب مسلمان یہ اور ہی لوگ ہوتے ہیں۔۔۔“ (”آشنائیاں کیا کیا“ ص 124-122)

ان دنوں مزدوروں، کسانوں اور ادیبوں کے درمیان باقاعدہ رابطے کی صورت موجود تھی۔ نازیہ بخاری کو دیئے گئے انٹرویو میں وہ بتاتے ہیں کہ اس دور میں ترقی پسند تحریک سے وابستہ ادیب اور شاعر مزدور بستیوں میں جا کر ان کے ساتھ رہتے تھے اور ان کے مسائل کو زیادہ سے زیادہ ضبط تحریر میں لانے کی کوشش کرتے تھے۔ حمید اختر اس رابطے کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ اگر ادیب ان کی زندگی سے واقف نہیں ہوگا تو ان کی سچی ترجمانی نہیں کر سکے گا۔ اسی لیے آج ادیب جو کچھ لکھ رہے ہیں وہ سطحی محسوس ہوتا ہے۔ جس طرح گورکی، چیخوف یا پریم چند نے مزدوروں اور کسانوں کے بارے میں کہانیاں لکھیں ویسی کہانیاں آج کل پڑھنے کو نہیں ملتیں۔ المیہ یہ ہے کہ دونوں جانب سے رابطہ مفقود ہو کر رہ گیا ہے۔

جاگیردارانہ نظام اس کی بڑی وجہ ہے جو آمریت اور مذہبی انتہا پسندی کے ساتھ مل کر معاشرتی جڑت کے تار و پود بکھیر رہا ہے۔

جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے، حمید اختر انجمن کے جلسوں کی باقاعدگی سے روداد لکھا کرتے تھے جن کا ایک

آزادی سے کھا اور پی رہے تھے۔ کرشن چندر زیادہ تر بئیر پیتے تھے۔

انہوں نے بمشکل ایک بوتل بئیر پی تھی کہ ان کی فلم میں کام کرنے والی ایک اینگلو انڈین خاتون بھی ٹریک محفل ہو گئی۔ یار لوگ اس وقت زمین پر نہیں تھے۔ چنانچہ اس بت طنز کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ کرشن نے سب سے پہلے اس کا تعارف سردار جعفری سے کرایا اور کہا۔ ”یہ میرے بہت عزیز دوست اور بہت بڑے شاعر ہیں۔“

اس لڑکی نے رسماً سردار سے کہا ”آپ مجھ پر نظم لکھیں گے؟“

سردار جعفری نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا کہ ”تم اتنی خوبصورت ہو کہ تم پر نظم نہیں پوری کتاب لکھنی پڑے گی۔“

بات ختم ہو گئی۔ محفل چلتی رہی۔ لوگ پورے جوش و خروش سے ادب، سیاست اور فلم کی باتیں کر رہے تھے۔ سردار جعفری اٹھ کر غسل خانے گئے اور کسی نے خیال نہیں کیا کہ بہت دیر تک واپس نہیں آئے۔ تھوڑی دیر بعد کرشن چندر ہاتھ روم گئے مگر بڑی تیزی سے بھاگتے ہوئے حواس باختہ تڑپتے ہوئے باہر نکلے۔ اپنی موٹی موٹی حیران آنکھوں کو تیزی سے جھپکتے ہوئے وہ ایک ہی بات کہہ رہے تھے ”خون، خون، خون ہو گیا۔“ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور پورا جسم کانپ رہا تھا۔

شرکائے محفل کے استفسار پر انہوں نے بتایا کہ علی سردار جعفری کو کسی نے قتل کر دیا ہے اور لاش غسل خانے میں پڑی ہے۔

پھر اچانک پوچھا ”طالش کہاں ہے۔“

طالش محفل سے اچانک غائب ہو گیا تھا۔ پھر کیا تھا کرشن جی نے شور مچا دیا۔ ”مجھے پہلے ہی شبہ تھا یہ پٹھان باز نہیں آئے گا۔ سردار اس کی معشوقہ سے بات کر رہا تھا۔ جب اس نے خاتون کا ہاتھ پکڑا تو میں نے خود دیکھا کہ طالش سخت غصے میں تھا۔ یہ اسی کا کام ہے اسی نے میرے دوست کو قتل کیا ہے اسے پکڑنا چاہیے۔ ساتھ ہی ان کی آواز بھرا گئی۔

ہم سب نے طالش کی تلاش شروع کر دی۔ آدھی رات کا وقت، بیس آدمی گھر کا، گھر کے باہر لان کا کونہ کونہ چھان رہے ہیں۔ آوازیں دے رہے ہیں۔ کرشن جی سب سے آگے آگے سردار جعفری کی لیاقت اور خوبیاں گنوار ہے ہیں، رور ہے ہیں اور طالش کو جان سے مار دینے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ طالش کا کوئی پتہ نہیں تھا۔ کوور لاج کی چار دیواری سے باہر کا علاقہ نسبتاً اجاڑ تھا۔ باہر خاموشی بلکہ سناٹا تھا۔ مگر یہ قافلہ کوشی سے باہر دو تین فرلانگ تک گیا اور بس شاپ پر بھی اسے نہ پا کر واپس آیا۔

جب یہ ملول اور افسردہ قافلہ دوبارہ گھر میں داخل ہوا تو اچانک اوپر جانے والی سیڑھیاں نظر آئیں۔ دفعتاً کسی نے کہا۔ ”ٹالش کو اس کے کمرے میں بھی دیکھ لینا چاہیے۔“

ہم سب اوپر پہنچے۔ ٹالش اپنے کمرے میں لکڑی کے فرش پر بستر بچھائے اس طرح لیٹا تھا کہ اس کا جسم لباس کی قید سے آزاد تھا۔ کرشن نے اس پر چادر ڈال کر حکم دیا ”اٹھو اور اسی وقت میرے گھر سے نکل جاؤ۔“ وہ بہت غیظ و غضب کی حالت میں تھے ”تم نہیں جانتے تم نے کیا کیا ہے۔ سردار میرا بہترین دوست تھا۔ تم نے اسے قتل کر دیا ہے۔“

ٹالش نیند سے بیدار ہوا تھا۔ اس لیے پہلے تو اس کی سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ بات کیا ہے۔ پھر اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ”کس کو قتل کیا ہے میں نے؟ میں تو سو رہا تھا۔“

اقدام قتل سے اس کے مسلسل انکار پر سب لوگ بمع ٹالش کے نیچے اترے، کرشن اس وقت رو رہے تھے۔ اب تک کسی نے غسل خانے میں جا کر لاش کو نہیں دیکھا تھا۔ غسل خانے کا بلب فیوز ہو چکا تھا اور باہر کے کمرے سے ہلکی روشنی اندر جا رہی تھی۔ جب ہم سب لوگ اندر داخل ہوئے تو دیکھا سردار ایک کونے میں اکڑوں بیٹھے ہوئے ہیں۔ خون کی ایک پتلی سی لیکر ان کی کپٹی سے ہوتی ہوئی نیچے ٹھوڑی تک آگئی تھی۔ مگر یہ لاش اس وقت ہل جل رہی تھی۔ کرشن نے فوراً آگے بڑھ کر سردار کو اٹھایا اور پوچھنا شروع کر دیا ”سردار تمہیں کس نے قتل کیا تھا۔“

ہوا یہ تھا کہ غسل خانے میں اندھیرے کی وجہ سے سردار کا پاؤں پھسلا اور گرتے وقت اس کا سردیوار سے ساتھ لٹکی ہوئی بالٹی کے نوکدار کنڈے سے ٹکرایا۔ جس کی چوٹ سے وہ بے ہوش ہو گیا۔ خون بھی بہتا رہا۔ اندھیرے میں کرشن جی کو گرا ہوا سردار جعفری اور خون کی لیکر نظر آئی تو ان کا ذہن قتل اور خون کے شے میں گرفتار ہو گیا۔

اس بظاہر اتفاقی حادثے کا ذکر میں نے اس لیے کیا ہے کہ اس سے کرشن کے مزاج کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اسے پریشان کرنے کے لیے خون کا ایک قطرہ ہی کافی تھا وہ تو محبت کا انسان تھا، پھولوں، خوشبوؤں اور مسرتوں کا پیامبر وہ دنیا کو دکھوں سے پاک کرنے کے لیے عمر بھر غم سمیٹتا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنی زندگی میں اپنے لیے کچھ نہیں بنایا۔ وہ لوگوں کے لیے جیا، لوگوں ہی کے لیے مرا۔ (”آشنائیاں کیا کیا“ ص 124-122)

کرشن چندر کی دلکش شخصیت کی شہادت بہت لوگوں نے دی ہے لیکن اس کے انسان دوست اور خوبصورت دل و دماغ کی جو تصویر کشی حمید اختر کے ہاں ملتی ہے وہ اور کہیں نظر نہیں آتی۔ اس کا ایک سبب حمید اختر کی اپنی شخصیت کا حسن ہے۔ ان کی تحریروں سے، خصوصاً ممبئی کے روز و شب کے حوالے سے یہی تاثر ملتا ہے کہ حمید اختر خود کچھ نہیں تھے۔ جو کچھ وہ بنے اور آج ہیں، وہ سجاد ظہیر سے کرشن چندر تک، ساحر سے ابراہیم جلیس تک، ادب سے فلم تک اور انفرادی دوستیوں سے

بڑا حصہ انہوں نے مرتب کر کے 'روداد انجمن' کے عنوان سے شائع کر دیا ہے۔ اس کی بے حد اہمیت ہے یہ اس عہد کا انتہائی مستند اور معتبر ریکارڈ ہے جس سے 1946-47ء کے دوران ممبئی میں ہونے والے ان جلسوں اور ترقی پسند تحریک کے اس دور کی تاریخ مرتب کرنے میں مدد مل سکتی ہے تاہم حمید اختر کے اپنے لفظوں میں

”یہ اس ڈیڑھ دو سالہ مدت کا مکمل ریکارڈ نہیں ہے جس میں میں نے انجمن کے ہفتہ وار جلسوں کی رپورٹیں مرتب کیں اور جو ہفتہ وار ”نظام“ میں شائع ہوئیں۔ یہ اس پورے زمانے کے تقریباً نصف عرصے کی کارروائیوں پر محیط ہے۔۔۔ یہ نصف صدی قبل کے ترقی پسند شاعروں ادیبوں کی سوچ اور فکر کا ایسا آئینہ ہے جس میں موجودہ نسل اور آنے والے زمانے کے تخلیق کار بہت کچھ دیکھ سکیں گے اور بہت کچھ سیکھ بھی سکیں گے۔ یہ گزرے ہوئے اچھے زمانوں کی بازگشت ہے جس میں چند لوگوں نے مل کر دنیا کو دکھوں سے نجات دینے اور نئی نوع انسان کی ترقی اور خوشحالی کے خواب دیکھے تھے۔۔۔ یہ پورے ہوئے یا نہیں اس کا فیصلہ تو تاریخ کرے گی مگر اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان نیک نفس لوگوں نے فکر و خیال کی جو چمن آرائی کی تھی اس سے فضا اب بھی مہک رہی ہے۔“ (اقتباس ”روداد انجمن“)

نامکمل ہونے کے باوجود یہ روداد تحریک آزادی کے سب سے نازک اور حساس دور کی ترقی پسند تحریروں پر ہونے والی مباحث کا احاطہ کرتی ہے۔ اس وقت ممبئی میں فیض کو چھوڑ کر ترقی پسند تحریک کی کم و بیش تمام اہم شخصیات موجود اور متحرک تھیں۔ ان میں حلقہ ارباب ذوق کے بعض ارکان بھی شامل تھے۔ اس فہرست میں خود حمید اختر کے علاوہ سید سجاد ظہیر، سردار جعفری، کیفی اعظمی، رضیہ سجاد ظہیر، ساحر لدھیانوی، ابراہیم جلیس، مجروح سلطانپوری، رفعت سروش، صفدر میر، سید انور، ظانصاری، کلیم اللہ، قدوس صہبائی، مدھو سودھن، دانیال لطفی، سلطانہ بیگم، ڈاکٹر ملک راج آنند، عصمت چغتائی، شاہد لطیف، بلراج سہنی، اسرار الحق مجاز، اختر الایمان، شوامتر عادل، اوشاد یوی، نور بانو، غلام عباس، میراجی، کرشن چندر، مہندر ناتھ، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، سلطانہ فیضی، کامل القادری، ممتاز مفتی، زیڈاے بخاری، پطرس بخاری، حبیب تنویر، جوش ملیح آبادی، ساغر نظامی، ڈاکٹر نیاز حیدر، خواجہ احمد عباس، ممتاز حسین اور کئی دوسرے لوگ شامل تھے۔ مباحث میں ابراہیم جلیس سرے سے ہی نظر نہیں آئے جبکہ کرشن چندر کی شرکت بھی نہ ہونے کے برابر تھی۔ مندرجہ بالا شخصیات میں بعض شخصیات ہندوستان کے دوسرے حصوں سے ممبئی آ کر انجمن کے جلسوں میں شریک ہوتی رہیں، اس فہرست سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ بہت سے شاعر اور ادیب جو انجمن سے وابستہ نہیں تھے یا اس کے منشور سے اتفاق نہیں کرتے تھے وہ بھی باقاعدگی سے انجمن کے جلسوں میں شامل ہوتے رہے۔ ان میں میراجی کا نام سب سے نمایاں ہے۔

”روداد انجمن“ ایک دستاویز ہے جس میں ہم 1946-47ء کے دوران ترقی پسند مصنفین اور دیگر ادبی

دھاروں کی فکر کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ یہ بات حیران کن ہے کہ ممبئی کے علاوہ کسی اور شہر میں انجمن کی سرگرمیوں کی روداد اس تسلسل اور ترتیب سے نہیں لکھی گئی۔ لاہور سے نکلنے والے 'سوریا' میں بعض اجلاسوں کی روداد شائع ہوئی ہے۔ شاید دوسرے ادبی مجلوں میں کچھ شائع ہوا ہو لیکن ممبئی کے علاوہ جس کے 'خوش قسمتی سے حمید اختر جنرل سیکرٹری بن گئے تھے اور کہیں سے ایسا ریکارڈ دستیاب نہیں ہوا۔

حمید اختر 1948-50ء کے دوران انجمن کی لاہور شاخ کے سیکرٹری بھی رہے لیکن لاہور میں انہوں نے باقاعدگی سے انجمن کی روداد یا تو قلم بند نہیں کی یا اسے شائع نہ کر سکے۔

ممبئی میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی سرگرمیوں کی فکری رہنمائی سجاد ظہیر نے کی تو حمید اختر کو بلاشبہ ان سرگرمیوں کا تخلیقی اور انتظامی قائد کہا جاسکتا ہے۔



کچھ منشاء یاد اور حمید اختر کے بارے میں

ناصر بشیر (چیک پوسٹ) روزنامہ ”پاکستان“ لاہور، 23 اکتوبر 2011ء

پچھلے ہفتے ادب اور صحافت کی دو بڑی شخصیات وہاں چلی گئیں، جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آتا۔ پہلے منشاء یاد کا انتقال ہوا، اگلے روز حمید اختر رخصت ہو گئے۔ منشاء یاد، افسانوی ادب میں مشہور ہوئے۔ انہوں نے اردو اور پنجابی میں افسانے لکھ کر نام کمایا۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ انہوں نے اردو اور پنجابی لکھنے والوں سے یکساں محبت پائی۔ ان کے ایک ناول کی ٹیلی ویژن کے لئے ڈرامائی تشکیل بھی ہوئی تھی۔ یہ ناول ”راہیں“ کے نام سے پی ٹی وی پر دکھایا گیا تھا۔ یہ ڈراما اسی طرح مقبول ہوا، جس طرح امجد اسلام امجد کا لکھا ہوا ”وارث“ ہوا تھا۔ دونوں میں قدر مشترک یہ تھی کہ ان کا ماحول خالصتاً پنجاب کی دیہی فضا سے تھا۔ ان کے کردار بھی ناظرین کے دیکھے بھالے تھے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ عام آدمی تک منشاء یاد کا نام ”راہیں“ کے ذریعے پہنچا۔ اس سے پہلے وہ اہل ادب میں تو جانے جاتے تھے، لیکن عام آدمی ان کے نام سے قطعاً نا آشنا تھا۔

منشاء یاد صاحب سے میری چند ملاقاتیں رہی ہیں، لیکن زیادہ تفصیلی ملاقات تب ہوئی، جب وہ تقریباً اڑھائی تین برس پہلے اے ٹی وی کے ایک پروگرام ”پریس کانفرنس“ میں شرکت کے لئے لاہور تشریف لائے تھے۔ اس پروگرام میں ادب کی دنیا میں محترم اور مقبول ہونے والی شخصیات کو صحافیوں اور ادیبوں کے روبرو بٹھایا جاتا تھا اور وہ پوچھے جانے والے سوالات کے جواب دیا کرتے تھے۔ منشاء یاد صاحب کے انٹرویو پینل میں میرا نام بھی شامل تھا۔ یہاں کئی نوجوان صحافی بھی موجود تھے، لیکن وہ چونکہ ان کے کام، نام اور مقام سے کچھ کم آشنا تھے، اس لئے زیادہ تر سوالات مجھے ہی کرنا پڑے۔ اس پروگرام میں یاد صاحب نے اپنی زندگی کے اتار چڑھاؤ بیان کئے اور بتایا کہ کس طرح وہ شیخوپورہ کے ایک گاؤں میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اسلام آباد پہنچے اور تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہیں برسر روزگار ہو گئے۔ انہوں

نے یہ انکشاف بھی کیا کہ وہ ابتداء میں شاعری بھی کرتے رہے، لیکن انہیں جلد ہی احساس ہو گیا کہ یہ میدان ان کے لئے موزوں نہیں۔ یاد صاحب کیپٹل ڈیولپمنٹ اتھارٹی میں ایک اچھے عہدے پر فائز تھے۔ یوں انہوں نے اسلام آباد کو اپنے سامنے بننے ہوئے دیکھا۔ اسلام آباد کی ادبی دنیا کو بنانے، سنوارنے اور نکھارنے میں بھی ان کا ہاتھ تھا۔ وہاں انہوں نے حلقہ ارباب ذوق کی بنیاد ڈالی، چنانچہ یہ ادبی تحریک آج تک وہاں کام کر رہی ہے۔ یاد صاحب آخری دم تک اسلام آباد کی ادبی زندگی میں متحرک رہے۔ اسلام آباد کو بعض دوستوں نے شہر افسانہ کا خطاب دیا تھا تو اس کی وجہ صرف اور صرف منشاء یاد تھے جنہوں نے اس تواتر کے ساتھ افسانے لکھے کہ نئی نسل کے متعدد ادیبوں نے افسانہ لکھنا شروع کر دیا۔

اگر میں تھوڑا سا اور پیچھے جاؤں تو منشاء یاد صاحب سے میرا پہلا تعارف 1986ء میں خلیق الرحمن کی وساطت سے ہوا تھا۔ میں ان دنوں ملتان میں تھا۔ خلیق الرحمن ان دنوں میرا ہی ہم عمر تھا، لیکن وہ پاکستان نیشنل سنٹر میں نوکری کر رہا تھا۔ جب مجھے یہ پتا چلا کہ خلیق الرحمن، یاد صاحب کا بھانجا ہے تو اس سے تعلق مزید گہرا ہو گیا۔ بعد میں یہ انکشاف بھی ہوا کہ خلیق الرحمن نظم کا بہت اچھا شاعر ہے، اور وہ اور تکینیل شاعر ہے، اس لئے وہ آج بھی نظم میں نئے نئے تجربے کر رہا ہے۔ ان دنوں ایف بی آر اس کے رزق کا وسیلہ ہے۔ یاد صاحب کے افسانوں کی خاص بات یہ ہے کہ ان میں پاکستانی معاشرے اور دیہاتی زندگی کی تصویریں بہت واضح دکھائی دیتی ہیں۔ انہوں نے چونکانے کے لئے افسانے میں نت نئے تجربے کرنے کی کوشش نہیں کی۔ انہوں نے کہانی کو کہانی رہنے دیا ہے۔ یہی ان کا آج کے افسانوی ادب پر احسان عظیم ہے۔

صحافی اور ادیب حمید اختر چونکہ لاہور ہی میں رہتے تھے، اس لئے ان سے یہاں بہت سی ملاقاتیں رہیں۔ وہ اگرچہ مجھ سے عمر اور ادبی قامت میں بہت بڑے اور بلند تھے، لیکن اس کے باوجود وہ ہمیشہ یوں ملتے، جیسے میں ان کا ہم عصر اور ہم عمر ہوں اور یہی ان کی کامیابی کا راز تھا۔ حمید اختر صاحب سے پہلی ملاقات نوے کی دہائی کے ابتدائی برسوں میں ہوئی تھی۔ تب سینئر صحافی جناب حمید جہلمی روزنامہ ”پاکستان“ کے جوائنٹ ایڈیٹر تھے اور حمید اختر صاحب کبھی کبھار ان سے ملنے کے لئے تشریف لایا کرتے تھے۔ میں ان کی وجاہت سے بہت متاثر تھا۔ ہمیشہ انہیں کوٹ پتلون میں دیکھا۔ ہاتھ میں پائپ ہوتا، انہیں دیکھ کر کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ ایک سفید پوش آدمی ہیں اور کرائے کے مکان میں رہتے ہوں گے۔ ایک بار انہوں نے دوستوں کی ایک محفل میں بتایا تھا کہ وہ ساری عمر یہی کوشش کرتے رہے کہ لوگ انہیں اچھا کہیں اور اچھا سمجھیں، چنانچہ اپنی جیب کا کبھی خیال نہیں رکھا، بلکہ دوسروں کی ضرورتیں پوری کرتا رہا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم جن کی مدد کرتے رہے وہ تو آج صاحب مکان ہیں اور ہم آج بھی کرائے کے مکان میں ہیں۔

انہوں نے زندگی کے تمام ذائقے چکھے، دکھ بھی دیکھے اور سکھ بھی، جیل بھی گئے۔ ان کی جیل کی یادداشتیں ”کال کوٹھڑی“ کے نام سے چھپ چکی ہیں۔ جیل یا ترا میں ان کے ساتھ بڑے بڑے ادبی اور سیاسی لوگ بھی تھے۔ یوں ان کی یہ یادیں مزید قیمتی ہو گئی تھیں۔ حمید اختر صاحب کا حافظہ بلا کا تھا۔ وہ ستر سال پرانا واقعہ بھی بیان کرتے تو اس کی تمام جزئیات کھول کر رکھ دیتے۔ یہاں تک بتا دیتے تھے کہ سجاد ظہیر نے کیا پہنا ہوا تھا یا ساحر لدھیانوی کس برانڈ کا سگریٹ پی رہے تھے۔ لاہور کی ادبی تقریبات میں وہ جب بھی خطاب کرتے تو بمبئی، دہلی، جالندھر، لدھیانہ اور امرتسر کے کسی واقعے سے آغاز کرتے۔ یہ واقعات سنا کر وہ دراصل تب اور اب کی زندگی کا موازنہ کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ اور یہ بھی احساس دلایا کرتے تھے کہ اب ایسے لوگ رہے، نہ ایسی باتیں ہوتی ہیں۔ انتقال سے تقریباً تین سال پہلے ”سیفما“ والوں نے حمید اختر صاحب کی 84 ویں سالگرہ کی تقریب کا اہتمام کیا۔ اس تقریب میں ہر مقرر نے ان کو لمبی عمر کی دعادی تو ان سے رہا نہ گیا۔ بولے ”لمبی عمر کے فائدے بھی ہوں گے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کا سراسر نقصان ہے۔ مجھی کو دیکھ لیجئے، میرے سارے دوست انتقال کر چکے ہیں۔ سجاد ظہیر، فیض احمد فیض، ایم ڈی تاثیر، ساحر لدھیانوی، ابن انشاء، سعادت حسن منٹو، ظہیر کاشمیری، احمد ندیم قاسمی، قتیل شفائی کون باقی رہا ہے؟ لمبی عمر آدمی کو تنہا کر دیتی ہے۔ ان سب کے بغیر مجھے یوں لگتا ہے، جیسے میں آج کسی اور ہی دنیا میں جی رہا ہوں۔“

اپنی اس تنہائی کا علاج حمید اختر صاحب نے یوں کیا کہ انہوں نے نئی صحافت کے ساتھ رشتہ استوار کر لیا اور روزنامہ ”دن“ میں کالم لکھنا شروع کر دیا۔ ان کے کالموں کی خاص بات یہ تھی کہ ان میں آج کی سیاسی جماعتوں کی فلا بازیوں کا ذکر تک نہیں ہوتا تھا، نہ ہی وہ آج کے سیاست دانوں پر قلم اٹھاتے تھے۔ وہ زندگی کے ان چھوٹے چھوٹے مسائل پر لکھا کرتے تھے جو اندر ہی اندر ہمارے معاشرے کو گھن کی طرح کھائے جا رہے تھے۔ وہ دراصل زندگی کا ٹیڑھا پن ٹھیک کرنا چاہتے تھے اور آخر تک اسی کام میں لگے رہے۔ پہلے وہ زندگی کا مشاہدہ کرتے رہے تھے، اب انہوں نے مطالعہ بھی تسلسل اور شدت کے ساتھ شروع کر دیا تھا۔ شاید یہی سبب تھا کہ ان کے ہر کالم میں کسی نہ کسی نئی کتاب کا ذکر ہوتا تھا۔ نئے کام اور نئی بات کی وہ دل کھول کر تعریف کیا کرتے۔ وہ اپنے کالموں میں کتاب کے پبلشر اور مصنف کے پتے کے علاوہ ان کے فون نمبر تک درج کر دیا کرتے تھے۔ یوں وہ مصنف اور قاری کے درمیان رابطے کا باعث بھی بنتے تھے۔

ایک بار میں ان کے ساتھ بھارت کے دورے پر گیا تو ان کی شخصی جہتیں مزید کھل کر سامنے آئیں۔ ان کا اپنے سے جو نیئر اور کم عمر ادیبوں اور صحافیوں سے سلوک نہایت دوستانہ تھا۔ جو بات وہ اپنے ہم عمروں اور ہم عمروں کے درمیان بیٹھا کرتے تھے وہی نوجوان کے درمیان بھی کر ڈالتے تھے۔ حجاب ان میں نام کو نہیں تھا۔ مجھے یاد ہے کہ بھارت کی ایک

تقریب میں جب ایک پرانی پاکستانی اداکارہ نے ان کا ہاتھ تھام کر کہا: ”حمید اختر صاحب! آج میں اعلان کرتی ہوں کہ آپ میرے بوائے فرینڈ ہیں“..... تو حمید اختر صاحب بولے: ”افسوس، تم نے یہ بات بتانے میں بہت دیر کر دی“۔ حمید اختر صاحب کی یہ یادگار تصویر آج بھی میرے پاس محفوظ ہے، جس میں ایک پرانی پاکستانی اداکارہ نے نہایت والہانہ انداز میں ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام رکھا ہے۔

حمید اختر صاحب کی شخصیت اگر آج ہم سب کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ انہوں نے اپنی ستاسی سالہ زندگی میں نظریاتی اور سیاسی سطح پر کبھی کوئی قلابازی نہیں لگائی۔ نقصان برداشت کر لیا، لیکن اپنا راستہ نہیں چھوڑا، ان کے اس وصف کو ان کے مخالفوں نے بھی سراہا ہے۔ اس بات پر اگرچہ میرا ایمان پہلے بھی تھا، لیکن اب زیادہ پختہ ہو گیا ہے، کیونکہ جماعت اسلامی کے امیر جناب منور حسن نے بھی حمید اختر کے بارے میں یہی فرمایا ہے کہ وہ ساری عمر ان ہی نظریات کے ساتھ وابستہ رہے، جو انہوں نے ابتدائی عمر میں اپنے لئے پسند کیے تھے۔



حمید اختر اور منشاء یاد

”چراغ زندگی ہو گا فروزاں ہم نہیں ہوں گے“

رشید مصباح، روزنامہ ”پاکستان“ 23 اکتوبر 2011ء

اکتوبر 2011ء کا تیسرا ہفتہ اہل ادب پر بہت بھاری گزرا۔ دنیائے ادب کے دور روشن ستارے حمید اختر اور منشاء یاد ہم سے چھڑ کر منوں مٹی تلے ابدی نیند سو گئے۔ حمید اختر نے 88 سال کی عمر میں وفات پائی۔ وہ تقریباً ایک صدی کی تاریخ تھے۔ صحافت، ادب، سیاست اور فلم کی دنیا سے وابستہ رہنے والے حمید اختر چار جون 1925ء کو تھارڑا گاؤں ضلع لدھیانہ میں پیدا ہوئے اور 16 اکتوبر 2011ء کو ایک بھر پور زندگی بسر کر کے اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ وہ بیک وقت عمدہ افسانہ نگار، کالم نگار اور کامیاب صحافی تھے۔ ان کی تخلیق کردہ کتب میں ”روداد انجمن“، ”کال کوٹھڑی“، ”پرش احوال“، ”احوال دوستاں“، ”لامکاں“ اور دیگر کئی کتب شامل ہیں۔ ان کی سوانح عمری احمد سلیم نے تحریر کی ہے۔ ان کا خاندان سادات سے تعلق تھا۔ پیروں کا گھرانہ تھا جس کا سلسلہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی سے جا ملتا ہے، لیکن بقول ان کے، ان کے دادا نے اپنی اولاد کو سید لکھنے اور پیری مریدی سے منع کر دیا اور محنت کی کمائی سے زندگی بسر کرنے کی ہدایت کی۔ ان کے والد پی ڈبلیو ڈی کے محکمہ میں ملازم تھے۔ حمید اختر جب تین سال کی عمر کے تھے تو ان کے والد کی وفات ہو گئی۔ حمید اختر کے تین بھائی اور دو بہنیں تھیں۔ وہ اپنے بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ ساحر لدھیانوی ان کے بچپن کے دوست تھے اور ابن انشاء (شیر محمد) بھی عمر کے ابتدائی حصے میں ان کے دوست بن گئے۔ بقول حمید اختر انہیں سیاست کی طرف ساحر لدھیانوی نے مائل کیا اور ادب کے میدان میں ابن انشاء کی جانب سے حوصلہ افزائی کے سبب قدم رکھا۔ انہوں نے 1942ء میں گورنمنٹ کالج لدھیانہ میں داخلہ لیا اور 1944ء میں کالج کے زمانے کے دوستوں میں سید انور، ظہور نظر، احمد ریاض، ساحر لدھیانوی، ابن انشاء اور غلام اسحاق ساقی نمایاں شخصیتیں تھیں جن سے عمر بھر ان کی دوستی رہی 1944ء کے آخر میں وہ لاہور چلے آئے اور یہاں چھ ماہ قیام کرنے کے بعد بمبئی چلے گئے۔ اس وقت ساحر لدھیانوی بھی بمبئی پہنچ چکے تھے۔ بمبئی میں انہوں نے فلم کی دنیا میں قدم رکھا اور مکالمہ نگاری کا سلسلہ شروع کیا۔ ایک فلم

آزادی کی راہ میں“ میں سائیڈ ہیرو کا کردار بھی ادا کیا، لیکن جلد ہی ادب کے میدان کی طرف لوٹ آئے اور انجمن ترقی پسند مصنفین سے منسلک ہو گئے۔ وہ 1947-48ء میں بمبئی شاخ کے جنرل سیکرٹری رہے اور انجمن کی کارروائیاں تحریر کرتے رہے جو اس دور میں ہفت روزہ ”نظام“ میں باقاعدگی سے شائع ہوتی رہیں، انہیں بعد ازاں حمید اختر نے ”روداد انجمن“ کے نام سے کتابی شکل دی۔ حمید اختر کی پہلی ادبی تحریر ”آوازیں“ کے عنوان سے ادبی رسالے ”ہمایوں“ میں شائع ہوئی۔ انہوں نے 26 کے قریب افسانے لکھے۔ دوستوں کے خاکے تحریر کئے۔ فلمی صحافت کا چسکا بھی پورا کیا اور بہت سے فلمی پرچوں میں لکھا۔ بمبئی کے قیام کے دور میں ہی ان کی کرشن چندر، سجاد ظہیر، سبط حسن اور ابراہیم جلیس سے دوستی ہوئی جو آنے والے دور میں پختہ ہوتی چلی گئی۔ قیام پاکستان کے بعد وہ لاہور آ گئے اور 1948-50ء کے عرصے میں انجمن ترقی پسند مصنفین اور لاہور شاخ کے جنرل سیکرٹری کے فرائض انجام دیئے۔ آج سے کچھ سال پہلے انجمن ترقی پسند مصنفین کا دوبارہ احیاء ہوا تو حمید اختر کو انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان کا مرکزی سیکرٹری منتخب کیا گیا اور وفات کے وقت بھی وہ اس کے جنرل سیکرٹری تھے۔

حمید اختر نے کالج میں پہنچ کر ترقی پسند خیالات کو اپنالیا اور پھر ساری عمر اپنے نظریات پر قائم رہے۔ وہ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے کارکن رہے اور بعد ازاں پاکستان کمیونسٹ پارٹی سے وابستگی اختیار کی۔ ان کی تحریروں میں ترقی پسند نظریات کا مکمل اظہار ملتا ہے۔ وہ ”ادب برائے زندگی“ کے نظریے کے پرچارک تھے۔ ترقی پسند نظریات سے وابستگی کے سبب انہیں کئی بار قید و بند کی صعوبتوں سے واسطہ پڑا۔ وہ پہلی بار 1951-52ء میں قید ہوئے۔ اس کے بعد 1954-55ء کے عرصے میں بھی جیل میں بند رہے اور آخری بار ضیاء الحق کے مارشل لاء کے دور میں انہیں 1981ء میں گرفتار کر کے جیل میں رکھا گیا۔ جیل کی زندگی اور یادوں پر مشتمل حمید اختر نے ایک کتاب تحریر کی جس کا عنوان ہے ”کال کوٹھڑی“۔ قید کے زمانے میں فیض احمد فیض کے ساتھ ان کا بہت سا وقت گزرا۔ روزی روٹی کے لئے انہوں نے عمر کا زیادہ حصہ صحافت سے منسلک رہ کر گزارا۔ صحافت کا ابتدائی تجربہ انہیں کمیونسٹ پارٹی کے رسائل و جرائد میں کام کرنے سے حاصل ہوا۔ پاکستان میں کمیونسٹ پارٹی کی لاہور برانچ کے ایک سیل نے پچاس کی دہائی میں ایک ہفت روزہ جاری کرنے کا فیصلہ کیا تو حمید اختر اس کے سرکولیشن مینجر مقرر ہوئے۔ اس پرچے کے مدیر عبداللہ ملک اور ادبی حصہ کے انچارج صفدر میر تھے، بعد ازاں حمید اختر روزنامہ ”امروز“ سے منسلک ہو گئے۔ جب پروگریسو پیپرز کے ملازمین پر ایوب دور میں مارشل لاء کا عذاب نازل ہوا تو بہت سے صحافیوں کو جیل یا تارا کرنا پڑی۔ حمید اختر ان میں شامل تھے۔ پھر انہیں ”امروز“ سے فارغ کر دیا گیا تو انہوں نے فلم سازی کی طرف توجہ دی۔ ایک طویل عرصے تک اس شعبے میں مختلف حیثیتوں سے کام

کرتے رہے۔ 1968-69ء میں انہوں نے آئی اے رحمن اور عبداللہ ملک کے ساتھ مل کر روزنامہ ”آزاد“ نکالا، لیکن حکومت مخالف پرچہ ہونے کے سبب ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں مالی مشکلات کے باعث بند ہو گیا۔ حمید اختر دوبارہ روزنامہ ”امروز“ سے منسلک ہو گئے۔ ضیاء الحق کے دور میں بطور سزا ان کا تبادلہ روزنامہ ”امروز“ ملتان کر دیا گیا جہاں حمید اختر نے دو سال گزارے۔ گزشتہ کئی سالوں سے فری لانس کے طور پر درجہ اول کے اخبارات میں ان کے کالم شائع ہوتے رہے۔

حمید اختر کی شادی 1956ء میں ہوئی۔ ان کی تین بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔ زندگی کے آخری چند سال چھوڑ کر وہ تمام عمر کرائے کے مکانات میں مقیم رہے۔ حمید اختر نے دو کتابوں کے تراجم کئے۔ ان میں ایک ”آغا خان“ اور دوسری ”مستقبل کی جنگیں اور ان کا تدارک“ ہے۔ ان کی تمام تحریریں ہمیشہ امید اور جدوجہد کو بڑھاو دیتی رہی ہیں۔ انہوں نے اگرچہ کم لکھا لیکن جتنا بھی لکھا اسے زبردست پذیرائی ملی۔ آخری عمر تک ان کی یادداشت قابل رشک تھی۔ اردو ادب کی تاریخ میں انہیں ایک باکمال لکھاری کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رکھا جائیگا۔ حمید اختر کی شخصیت اور فن کے حوالے سے اب تک تین مقالے لکھے جا چکے ہیں۔ وجیہ طارق نے ایم اے کا مقالہ جی سی یونیورسٹی کی طالبہ کی حیثیت سے بعنوان ”حمید اختر.....“ ”ترقی پسند تحریک کی آواز“ از نازیہ بخاری لکھا جبکہ ”حمید اختر..... شخصیت اور ادبی خدمات“ کے نام سے راشد علی خاں نے بھی ان پر مقالہ لکھا ہے۔ حمید اختر کے فن اور شخصیت پر دیر تک کام ہوتا رہے گا۔ ان کے کالموں سے پاکستان کی تاریخ پر ایک جامع کتاب تحریر کی جاسکتی ہے۔ حمید اختر بلاشبہ اردو ادب اور صحافت میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے تھے۔

محمد منشاء یاد جدید اردو اور پنجابی افسانے کا انتہائی معتبر نام ہے۔ انہوں نے افسانے کو نیا اسلوب عطا کیا اور ایسی زبان اختیار کی جو عام قاری کو پوری طرح سمجھ آ جائے۔ ان کے افسانوں میں علامت کا کثرت سے استعمال ہوا ہے، ان کی ساری علامتیں دھرتی اور لوکائی سے جڑی ہوئی ہیں اور قاری پر ان کا پورا ابلاغ ہوتا ہے۔ یہ نامور اور بڑا افسانہ نگار، جس نے ناول اور ڈرامے بھی لکھے 14 اکتوبر 2011ء کو دل کے دورے کے سبب اس جہان فانی سے کوچ کر گیا اور پاکستانی ادب میں بڑا خلا پیدا کر گیا۔ اس کی جگہ ہمیشہ خالی رہے گی کہ وہ اپنی طرز کا انوکھا افسانہ نگار تھا۔ محمد منشاء یاد کی تحریروں کے 10 مجموعے شائع ہوئے۔ محمد منشاء یاد 5 دسمبر 1937ء کو شیخوپورہ کے نزدیکی قصبے چوہڑکانہ (جس کا موجودہ نام فاروق آباد ہے)، کے نواحی گاؤں میں پیدا ہوئے۔ اس گاؤں سے چند کوس کے فاصلے پر بابا گورونامک کی جنم بھومی نکانہ صاحب واقع ہے۔ محمد منشاء یاد نے میٹرک تک تعلیم حافظ آباد میں حاصل کی، پھر رسول ٹیکنالوجی کالج سے انجینئرنگ میں تین سالہ ڈپلومہ حاصل کرنے کے بعد راولپنڈی میں پی ڈبلیو ڈی میں 1958ء میں ملازمت اختیار کر لی جہاں سے

1960ء میں ملازمت چھوڑ کر ملک کے نئے دار الخلافہ اسلام آباد کے ادارے سی ڈی اے میں ملازم ہو گئے اور مختلف عہدوں پر کام کرتے ہوئے 1997ء میں ڈپٹی ڈائریکٹر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ ملازمت کے دوران ہی انہوں نے مزید تعلیم بھی حاصل کی۔ 1965ء میں بی اے، 1967ء میں ایم اے اردو اور 1972ء میں ایم اے پنجابی کے امتحانات پنجاب یونیورسٹی سے پاس کئے۔ محمد منشا یاد نے اسلام آباد میں ہی اپنا گھر ”افسانہ منزل“ تعمیر کیا۔ منشا یاد کی شادی 1960ء میں ہوئی، ان کے سسرال لاہور سے تعلق رکھتے ہیں۔ منشا کے تین بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔

محمد منشا نے بہت چھوٹی عمر میں جب وہ ساتویں جماعت کے طالب علم تھے شاعری کرنا شروع کی اور یاد تخلص رکھا۔ یوں محمد منشا کا فلمی نام منشا یاد ٹھہرا۔ بعد ازاں وہ آہستہ آہستہ شاعری سے کہانی کی طرف بڑھتے چلے گئے اور افسانے لکھنے شروع کئے۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ”بند مٹھی میں جگنو“ 1975ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد دوسرا مجموعہ ”ماس اور مٹی“ شائع ہوا۔ ”ماس اور مٹی“ ان کے ایک افسانے کا عنوان بھی ہے، اس کتاب نے انہیں ادب کی دنیا میں اعلیٰ مقام پر پہنچایا۔ انہیں ایک کامیاب افسانہ نگار کی حیثیت سے شہرت ملی۔ ان کے تیسرے مجموعہ کا عنوان تھا ”خلا اندر خلا“ پھر اس کے بعد ”پورے چاند کی رات“، ”تماشا“، ”آواز“ اور ”درخت آدمی“ شائع ہوئے۔ انہوں نے پنجابی افسانے بھی لکھے جو مجموعہ کی شکل میں شائع ہوئے۔ ان کے پنجابی زبان کے ناول ”ٹانواں ٹانواں تارا“ جو 1987ء میں شائع ہوا، نے بہت شہرت حاصل کی۔ بعد ازاں محمد منشا یاد نے خود ہی اس ناول کو ایک ڈرامہ سیریل کی شکل پی ٹی وی کے لئے دی۔ انہوں نے دیگر ڈرامہ سیریل بھی تحریر کئے جس میں ”بندھن“ کو ناظرین میں بہت پذیرائی ملی۔

محمد منشا یاد ایک اچھے مترجم بھی تھے۔ انہوں نے بچوں کی کتابوں کے تراجم کئے، جن میں ”بچے اور کن پوڈر“، ”جیک کی آنکھیں“، ”ناک اور رپلیکا“ شامل ہیں۔ اگرچہ منشا نے شاعری، افسانے، ناول اور مضامین سب میں طبع آزمائی کی، لیکن وہ اپنی شناخت افسانے کو ہی قرار دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے گھر کا نام ”افسانہ منزل“ رکھا۔ ان کا زیادہ کام اردو زبان میں ہے لیکن ان کی اردو تحریروں کے مقابلے میں پنجابی تحریروں کو زیادہ پذیرائی ملی۔ منشا یاد ابتداء میں راولپنڈی کے حلقہ ارباب ذوق کی نشستوں میں شامل ہوتے تھے لیکن بعد میں انہوں نے اسلام آباد میں ادبی ماحول پروان چڑھانے کے لئے 1972ء میں حلقہ ارباب ذوق اسلام آباد کی بنیاد رکھی اور اس کے پہلے سیکرٹری چنے گئے۔ یہ فرائض انہوں نے کئی سال تک انجام دیئے۔ حلقہ

سے ان کی وابستگی اتنی پختہ تھی کہ وہ عمر کے آخری حصہ تک باقاعدگی سے حلقہ ارباب ذوق کی نشستوں میں شامل ہوتے رہے۔ حلقہ کے علاوہ انہوں نے دیگر کئی ادبی تنظیموں کی تشکیل میں حصہ لیا جن میں لکھنے والوں کی انجمن، رابطہ، بزم کتاب اور فلکشن فورم قابل ذکر ہیں۔ محمد منشا یاد نے حلقہ ارباب ذوق کی خصوصی ویب سائٹ قائم کی جس پر انہوں نے حلقہ کا ریکارڈ محفوظ کیا اور دنیا بھر کے اردو ادب پڑھنے والوں کو اسلام آباد کے ادیبوں سے آئی ٹی کے ذریعے متعارف کروانے کی بھرپور کوشش کی۔



سجاد ظہیر اور حمید اختر کا میدانِ عمل

علامہ عبدالستار عاصم، 10 ستمبر 2012ء

حمید اختر کی شخصیت اور نظریاتی پختگی میں سجاد ظہیر کا کردار بے حد اہم ہے۔ خود حمید اختر کے لفظوں میں ”میں نے ہوش سنبھالا تو ساحر لدھیانوی سے تعلق جوڑا۔ پھر سجاد ظہیر مل گئے۔“ (”ممتاز صحافی“ دانشور حمید اختر“ انٹرویو ظہیر احمد بابر ہفت روزہ ”فیملی“ لاہور ص۔ 21)

یہ ملاقات بلکہ ملاقاتیں دو رس اثرات کی حامل ثابت ہوئیں۔ حمید اختر کے لیے سجاد ظہیر ”سرتاپا جمال ہی جمال اور زندگی کی جمالیاتی قدروں کے امین تھے۔“ (”آشنائیاں کیا کیا“ ص۔ 19)

1946-47ء کے دوران انہوں نے سجاد ظہیر کے ہاں ڈیڑھ برس تک قیام کیا۔ جہاں انہیں اپنے ”گرو“ کو قریب سے دیکھنے ان کے ساتھ کام کرنے اور ان سے سیکھنے کا موقع ملا خصوصاً انجمن ترقی پسند مصنفین کے سیکرٹری کے طور پر سجاد ظہیر سے ان کا بہت قریبی تعلق قائم رہا۔ پھر قیام پاکستان کے بعد ابتدائی تین چار برسوں میں کمیونسٹ پارٹی، انجمن ترقی پسند مصنفین، پارٹی کے جرائد کی اشاعت اور دیگر سرگرمیوں میں انہیں سجاد ظہیر کو جاننے اور سمجھنے کے بہت سے مواقع میسر آئے۔ ان کے مطابق ”مجھے اپنی زندگی میں ان سے بہتر اور مکمل کوئی دوسرا آدمی نہیں ملا۔ میں نے ان سے زندہ رہنے، قربانی دینے، اپنی ذات کے حصار سے نکل کر اس دنیا کو دیکھنے اور بنی نوع انسان کی بہتری کے لیے کام کرنے کا سبق سیکھا۔“ ترقی پسندوں کے قافلے میں کسی ایک فرد کے بارے میں یہ بہت بڑا خراج عقیدت ہے لیکن حمید اختر کو اس بارے میں رتی بھر شبہ نہیں ہے۔ ممبئی کے ترقی پسند حلقوں میں یہ بات مشہور تھی کہ وہ جس نوجوان کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیتے ہیں وہ کہیں کا نہیں رہتا۔ گھربار، بہن بھائی، بیوی بچوں کو چھوڑ کر انہی کا ہورہتا ہے یا پھر کمیونسٹ پارٹی کا کل وقتی رکن بن جاتا ہے۔ سجاد ظہیر نے حمید اختر کے کندھوں پر فوراً ہی ہاتھ رکھ دیا۔ ابھی وہ ممبئی شہر کے شبستانوں اور خواہوں سے پوری طرح آشنا بھی نہیں ہوئے تھے کہ انہوں نے حمید اختر کو اپنے سحر میں لے کر کام پر لگا دیا۔ یہ وہ سحر تھا جس کی گرفت سے وہ آج

تک آزاد نہیں ہو سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے کبھی اس سحر سے آزاد ہونا ہی نہیں چاہا۔

’بنے بھائی، سب کے بھائی‘ کے زیر عنوان حمید اختر لکھتے ہیں:

”جس چیز کو کرشن چندر انسان کی فطری کمینگی قرار دیتا ہے اور جو تھوڑی بہت ہر انسان میں ضرور ہوتی ہے، بنے بھائی میں اس کا شائبہ تک نہیں تھا۔ بہت سے لوگوں کے بارے میں میرا ذاتی تجربہ ہے کہ وہ نیکی، شرافت اور بے غرضی کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہوتے ہیں مگر موقع ملتے ہی انسانی کمزوریوں کا شکار ہو جاتے ہیں مگر سجاد ظہیر کیونسٹ پارٹی سے ملنے والے پچاس ساٹھ روپے جیب خرچ اور دو چار مضامین کا معاوضہ جو ساٹھ ستر روپے سے زیادہ نہیں ہوتا تھا، میں ہی گزارا کرتے تھے اور اسی پر قانع تھے۔ ان کے ہاں سال بھر میں، میں نے چاول، دال اور چپاتی ہی کھائی۔ گوشت کبھی کبھار پکتا تھا۔“

محبت اور احترام کا یہ تعلق یک طرفہ نہ تھا اگر حمید اختر، سجاد ظہیر کو ہر طرح کی خامیوں سے مبرا سمجھتے تو دوسری طرف سجاد ظہیر بھی حمید اختر کی خوبیوں کے دل سے معترف تھے۔ خصوصاً انجمن ترقی پسند مصنفین کے سلسلے میں ان کی انتظامی صلاحیتوں کے تو وہ بے حد معترف تھے۔ اپنی معروف کتاب ’روشنائی‘ میں وہ ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

”اب حمید اختر نے غیر معمولی تنظیمی صلاحیت اور ادبی شعور کا اظہار کیا۔ انجمن کے جلسوں کے لیے ہر ہفتہ ایک دلچسپ پروگرام بنانا (جس کے لیے وہ مختلف ادیبوں کو آبادہ کرتے رہتے تھے جو کافی مشکل کام تھا) سب کو جلسے کی اطلاع کرنا، جلسے میں شرکت کے لیے مختلف لوگوں سے تقاضے کرتے رہنا اور ضرورت پڑنے پر زیادہ کابل اور غیر ذمہ دار قسم کے ادیبوں اور شاعروں کو ان کے گھروں سے جا کر اپنے ساتھ لے آنا، یہ سب تو ان کے لیے معمولی کام تھے۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ کسی قسم کے بھی کام سے ہچکچاتے نہیں تھے اور اگر وہ محسوس کرتے تھے کہ دوسروں کے سپرد جو کام کیے گئے ہیں، ان میں ڈھیلا پن ہے تو پھر وہ ان کا بھی اسی طرح ہاتھ بٹاتے تھے جس سے معلوم ہوتا تھا کہ کام دوسرا ہی کر رہا ہے لیکن حقیقت میں وہ حمید اختر کرتے تھے۔“

حمید اختر کی صلاحیتوں کا یہ اعتراف بلا جواز نہیں تھا۔ وہ جتنا عرصہ سجاد ظہیر کے یہاں رہے، اس نے ان کی پوری زندگی کا رخ متعین کر دیا۔ خود اپنے لفظوں میں وہاں ”انہوں نے انسانی محبت، اخوت، رواداری اور بے لوث خدمت کی جو مثالیں دیکھیں، وہ ذہن پر ثبت ہو گئیں۔ بنے بھائی بڑے گھر کے بیٹے تھے مگر ممبئی میں ان کی زندگی ورویشانہ بلکہ قلندرانہ تھی۔ یہ گھر انہ ممبئی جیسے شہر میں سو ڈیڑھ سو روپے ماہوار میں گزارا کرتا تھا۔ ان کے گھر والے بھائی، بہن، عزیز رشتہ دار یوپی میں بڑے ٹھاٹھ سے انتہائی امیرانہ زندگی بسر کرتے تھے مگر بنے بھائی اپنی ہی دھن میں، ملک میں آزادی اور انقلاب کی جنگ

لڑ رہے تھے۔“ حمید اختر اپنی فلمی سرگرمیوں کے باوجود سجاد ظہیر کے رنگ میں رنگے گئے۔ ممبئی میں نوجوان ادیبوں اور شاعروں کی ایک کہکشاں تھی اور اکثر سجاد ظہیر سے متاثر تھے لیکن ان کا جو اثر حمید اختر نے قبول کیا شاید ہی کسی دوسرے نوجوان ادیب یا شاعر نے کیا ہو۔۔۔۔۔ وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے سیکرٹری کی حیثیت سے اس کے رُوح رواں بن گئے۔

یہ جنوری 1997ء کی ایک خوشگوار دوپہر تھی۔ میں ممبئی میں تھا اور اس روز مجھے کیفی اعظمی اور شوکت اعظمی سے ملنا تھا۔ میرے دوست اور معروف فلمساز ساگر سردی مجھے لے کر ان کے گھر پہنچے۔ ادب، شاعری، فلم، پاک و ہند تعلقات، اردو زبان، بنگال میں کمیونسٹ حکومت اور کمیونزم کے مستقبل کے حوالے سے باتیں ہوتی رہیں۔ زیادہ باتیں تقسیم سے قبل کے ممبئی کے بارے میں ہوئیں۔ حمید اختر کا دو تین بار ذکر آیا۔

”ہمارے نکاح خواں کا انتظام انہوں نے ہی تو کیا تھا اور اسے لانے کے لیے کتنے پاڑ بیلینے پڑے تھے۔“ شوکت نے انہیں بڑی محبت سے یاد کرتے ہوئے کہا۔ جب میں نے بتایا کہ میری ان سے اکثر ملاقات ہوتی ہے اور وہ بلا تکان لکھ رہے ہیں تو کیفی ان کے ساتھ ساتھ ان دنوں کے دوسرے ساتھیوں کا بھی ذکر کرتے رہے۔ ”ساحر تو سچ سچ کے ساحر تھے، اسم باسمی“

میں نے کہا ”آپ کی شادی بہت مشہور ہے۔ کافی کچھ حمید اختر صاحب سے سن رکھا ہے لیکن آپ اپنے لفظوں میں بتائیے نا!“

شوکت مسکرائیں، بے پناہ میٹھی مسکراہٹ۔ انہوں نے جو کچھ بتایا، اس کے مطابق، جب ان کی کیفی سے شادی ہوئی تو وہ پینتالیس روپے ماہانہ کے ہول ٹائم تھے اور کمیون میں رہتے تھے۔ وہ بہت اچھے شاعر اور کھلے دل و دماغ کے نظریاتی انسان تھے۔ یہ سب باتیں شوکت کے کچے ذہن کو بے حد اچھی لگیں۔ کیفی سے ان کی پہلی ملاقات حیدرآباد میں اپنی بہن کے گھر ہوئی جہاں وہ آکر ٹھہرے تھے۔

”میں نے انہیں دیکھ کر سوچا کہ میں تو اسی شخص سے شادی کروں گی۔ یہ بات میں نے اپنے والد کو بھی بتادی۔ انہیں کیفی بہت اچھے لگتے تھے۔ کافی لمبا چکر چلا۔ میری ماں، میری بہنیں کہتی تھیں کہ پینتالیس روپوں میں کیسے گزارہ کرے گا۔ اسے تو کپڑوں وغیرہ کا اتنا شوق ہے۔ میرے ابا نے بھی کہا کہ بیٹا! یہ جو شاعر لوگ ہوتے ہیں، وہ بس اسی طرح ہوتے ہیں۔ دراصل کیفی نے مجھے اپنے خون سے ایک خط لکھا تھا۔ ابا کہنے لگے میں تمہیں لے جا کر ان کا گھر دکھا دیتا ہوں۔ ان کا ماحول ان کا رہن سہن دکھا دیتا ہوں۔ اس کے بعد خود فیصلہ کر لینا۔ ابا مجھے ماں سے چوری، ان کے ہاں لے آئے۔ وہاں تو

سب بڑے بڑے لوگ اور دانشور موجود تھے۔ سجاد ظہیر، سردار جعفری، پی سی جوشی، جوش ملیح آبادی۔ مجھے یہ سب لوگ بہت اچھے لگے۔ بچپن سے میں قدامت پسند لوگوں کے خلاف رہی تھی۔ ان لوگوں سے مل کر مجھے لگا کہ میں بالکل ٹھیک جگہ پر آگئی ہوں چنانچہ ابا نے کیفی سے میری شادی کر دی۔“

بس اتنی سی کہانی؟

نہ رومانس نہ ملاقاتیں نہ رقیب کی گھاتیں
کیفی ہنسنے لگے اور بولے

”حمید اختر سے آپ نے پوری کہانی سن توئی ہے“

تو اس اجمال کی تفصیل حمید اختر سے سنیں؟

”کیفی اور شوکت جسے حیدرآباد میں ان کے گھر والے پیار سے ”موتی“ کہہ کر پکارتے تھے کی ملاقات 1947ء کے اوائل میں حیدرآباد کن ہی میں ترقی پسند مصنفین کی دوسری سہ روزہ کانفرنس کے دوران ہوئی۔ شوکت کے بہنوئی اختر حسین جو گلبرگہ کے رہنے والے تھے اور حیدرآباد سے ایک روز نامہ نکالتے تھے اس کانفرنس کے منتظمین ہی میں شامل نہیں تھے بلکہ انہیں اور ان کی بیگم ریاست یعنی شوکت کی بڑی بہن کو اس کانفرنس کے روح رواں سمجھنا چاہیے۔ ان لوگوں سے اور ان کے اہل خاندان سے تین چار روز کی متواتر ملاقاتوں کے دوران کیفی اور شوکت ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے اور کانفرنس کے اختتام پر جب ہم سب لوگ واپس ممبئی پہنچے تو ان دونوں کے درمیان معاشقے کی دھوم تھی۔“

حمید اختر مزید لکھتے ہیں:

”شوکت خانم نے اپنے گھر میں اعلان کر دیا کہ وہ ہر حالت میں کیفی سے شادی کرے گی۔ اس کا گھرانہ خاصا خوش حال تھا جبکہ کیفی اس زمانے میں کیونسٹ پارٹی کے ہول ٹائمر تھے۔ شاید چالیس روپے ماہوار گزارہ الاؤنس ملتا تھا جس میں سے تیس روپے کمیون میں ملنے والے کھانے کے کٹ جاتے تھے اور ان کے پاس مہینہ بھر کے خرچ کے لیے دس روپے بچتے تھے۔ ان کا اپنا کوئی گھر بھی نہیں تھا اور وہ سندھرسٹ روڈ پر واقع پارٹی کے دفتر میں سوتے تھے۔“

”شوکت کے گھر والے چونکہ صحیح معنوں میں ترقی پسند تھے اور بائیں بازو کی سوچ رکھتے تھے اس لیے انہیں اس شادی پر اعتراض نہیں تھا البتہ وہ اسے سمجھاتے تھے کہ کیفی کے پاس نہ گھر ہے اور نہ اس کا کوئی ذریعہ معاش ہے۔ تم شادی کے بعد ممبئی میں رہو گی کہاں اور کھاؤ گی کیا۔ اس کے باوجود جب وہ اس شادی پر مصر رہی تو ریاست اور اختر حسین اسے لے کر ممبئی آگئے تاکہ وہ خود کیفی کے حالات ملاحظہ کر سکے مگر شوکت یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد بھی اپنے ارادے پر قائم

رہی۔ اب سے کوئی سات برس قبل جب دہلی میں کیفی کا جشن منایا گیا تو دہلی میں مقیم ہماری بیٹی نے ہمیں اس لیے وہاں بلا بھیجا کہ ہمارے یہ دوست وہاں آرہے تھے۔ چنانچہ یہ کیفی اور شوکت سے ہماری آخری ملاقات تھی۔ کوئی چھ روز تک ہر شام ہمارا دامادان دونوں میاں بیوی کو ان کی جائے قیام سے اپنی گاڑی میں اٹھلاتا اور ہم اپنی بیٹی کے گھر میں ساری شام اکٹھے گزارتے۔ ایسی ہی ایک محفل میں شوکت نے ہم سے گلہ کیا کہ ہم نے اپنے متذکرہ مضمون میں کیفی کی غربت اور بے گھر بے در ہونے کے باوجود کیفی سے شادی پر اس کے اصرار کا ذکر تو بھر پور طور سے کیا ہے مگر کیفی جو اپنے خون میں قلم ڈبو کر اسے محبت نامے لکھا کرتے تھے ان کا ذکر ہی نہیں کیا۔ ہم نے اس سے کہا یہ بات نہ تم نے ہمیں اس وقت بتائی اور نہ کیفی نے البتہ تمہاری ضد اور ہر حالت میں شادی پر اصرار کی بات اختر حسین صاحب اور ریاست بیگم نے بنے بھائی کو ان کے گھر آ کر بتائی تھی اور چونکہ ہم بھی اس گھر میں رہتے تھے اس لیے یہ بات ہم تک بھی پہنچ گئی تھی۔۔۔“

حمید اختر، شوکت کے وکیل نکاح تھے جبکہ ذوالفقار علی بخاری، جوان دنوں ممبئی ریڈیو سٹیشن کے ڈائریکٹر تھے، کیفی کے وکیل بنے۔ ملک کی تقسیم کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ اواخر جولائی یا اوائل اگست کے ان ہنگامہ خیز دنوں میں حمید اختر اور ساحر ”آزادی کی راہ پر“ آزادی کی منزل کھونے والے تھے۔ نکاح کے ایک ہفتہ بعد 9 اگست 1947ء کو حمید اختر، اگلی فلم کا ایڈوائس لے کر لدھیانے کے ارادے سے ممبئی سے نکل پڑے اور پھر آگ اور خون کا دریا یا فکر تو نسوی کے لفظوں میں چھنا دریا پار کر کے 1947ء کے اواخر میں پاکستان پہنچ گئے۔ لیکن یہ کہانی اگلے باب میں آئے گی۔ ابھی تو شادی کی بات ہو رہی ہے۔

”ان کی رسم نکاح کی داستان بھی خاصی دلچسپ ہے۔ یہ تقریب بنے بھائی کے گھر جیون ہاؤس والکیشور روڈ پر منعقد ہوئی۔ بٹے بھائی نے دلہا کے مربی اور سرپرست کی حیثیت میں شادی کے انتظامات کیے۔ ہم بھی چونکہ تقریباً ایک برس سے ان کے گھر ہی میں مقیم تھے اس لیے اس شادی میں ہمیں بھی خاصی بھاگ دوڑ کرنا پڑی۔ مثلاً نکاح خواں کو لانے کی ذمہ داری ہمارے سپرد ہوئی۔ ممبئی کے بھنڈی بازار میں جہاں ہم اور ساحر اکثر کھانا کھانے کے لیے جایا کرتے تھے۔ دو نکاح خوانوں کے دفاتر آمنے سامنے تھے۔ دونوں کے دفتر اور رہائش بالائی منزلوں میں تھی۔ ہمیں اس وقت دونوں کے نام یاد نہیں آرہے البتہ ان کے گھروں پر آویزاں بورڈوں پر ان کے ناموں کے ساتھ ان کی جو کنتیت درج تھی وہ پوری طرح یاد ہے۔ مثلاً اگر اس میں سے ایک کا نام عبدالکریم مان لیا جائے تو اس کے آگے ”لونڈے“ کا لفظ نمایاں طور پر درج تھا جبکہ دوسرے کی کنتیت ”مرغے“ تھی اور اس کا اعلان بھی بورڈ پر موجود تھا۔ ہم نے مرغے صاحب کو نکاح کے لیے راضی کیا اور فیس طے کر کے بذریعہ ٹیکسی انہیں والکیشور روڈ لے آئے۔ مگر انہوں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی نکاح

پڑھانے سے صاف انکار کر دیا۔ ان کا کہنا تھا وہ کسی کمیونسٹ کا نکاح پڑھانا جائز نہیں سمجھتے۔ سجاد ظہیر صاحب سردار جعفری اور کیفی اعظمی یہ سبھی لوگ پانچ چھ برس سے اس علاقے میں کام کرتے تھے اس لیے لوگ ان سے واقف تھے اور ان کے خیالات سے آگاہ بھی تھے۔ نکاح خواں ”مرغے“ میاں کے انکار کی یہی وجہ تھی۔

بہر حال زیڈ اے بخاری نے اپنی چرب زبانی سے کام لیتے ہوئے بڑی مشکل سے ان مولانا صاحب کو نکاح پڑھانے پر راضی کر لیا اور ان کی فیس بھی ڈیوڑھی کر دی جس کے بعد یہ مرحلہ بخیر و خوبی طے ہو گیا۔ چونکہ لڑکی کے عزیز بھی شادی کے لیے حیدرآباد سے ممبئی آئے ہوئے تھے، اس لیے شادی کے ابتدائی روز نو بیاہتا جوڑے کے لیے رہائش کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔“ (حمید اختر ”احوال واقعی“)

پھر جنوری 1997ء کا ممبئی۔ میرے اصرار پر شوکت اعظمی نے مزید یادیں کھنگالیں اور بتایا کہ شادی کے بعد وہ بھی کمیون میں آگئیں۔ ایک دن پی سی جوشی آئے تو اس وقت وہ ایک ٹی کوزی کاڑھ رہی تھیں جوشی بولے:

”سارا دن کیا کرتی رہتی ہیں؟“

شوکت گھبرا کر بولیں:

”کچھ نہیں“

اس پر وہ کہنے لگے کہ کمیونسٹ بیوی کو گھر میں نہیں بیٹھ رہنا چاہیے بلکہ اپنے شوہر کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہیے۔ روٹی خود کمانی چاہیے اور جب بچے ہو جائیں تو انہیں ایک اچھا شہری بنانا چاہیے۔ شوکت بتا رہی تھیں اور میرے ذہن میں ان کی بیٹی شبانہ اعظمی آگئیں۔ میں نے شاید اپنے آپ سے پوچھا:

”یہ کامریڈ جوشی کے سخن کا اعجاز تھا یا کامریڈ شوکت کے عمل کا جادو؟ غالباً دونوں کا اور یہ اس لمحے کی کرامت تھی۔“

”حمید اختر صاحب نے آپ کو ضرور بتایا ہوگا کہ اس کے بعد میں نکل کھڑی ہوئی۔“

”نہیں“ میں نے دھیرے سے کہا ”کیونکہ جلد ہی وہ وہاں سے لدھیانہ آگئے تھے“

وہ مسکرائیں اور بولیں ”پہلے پوری بات میں آپ کو بتاتی ہوں۔ یہ بات خود مجھے بھی بہت اچھی لگتی تھی کہ وہاں عورت اور مرد کے درمیان تفریق روا نہیں رکھی جاتی تھی۔ مجھے اکیلے نکلتے ہوئے ڈر لگتا تو کیفی میرے ساتھ چل پڑتے۔ اس پر پارٹی کے ساتھیوں نے کہنا شروع کر دیا کہ اس طرح تو میں بالکل مفلوج ہو جاؤں گی چنانچہ دوسرے ہی دن میں نے کیفی سے کہہ دیا کہ میں خود کام کروں گی۔ ان دنوں انڈین پیپلز تھیٹر اتھارٹی (IPTA) کافی فعال تھی۔ اور اس میں بہت سے کمیونسٹ سرگرم تھے لیکن غیر کمیونسٹ ترقی پسند فنکار بھی IPTA سے وابستہ تھے۔ پرتھوی راج کپور اس کے صدر

تھے۔۔۔۔“

اگست 1947ء کے بعد حمید اختر اس خوبصورت جوڑے سے 31 برس بعد 31 دسمبر 1978ء کو ملے۔
 1988ء میں اُن کی اس جوڑے سے دوبارہ ملاقات لاہور میں ہوئی، جب دونوں فیض میلے میں شرکت کے لیے یہاں
 آئے ہوئے تھے۔۔۔۔ پھر 2002ء میں پہلے سردار جعفری رخصت ہوئے اور ان کے بعد کیفی اعظمی بھی چل بسے۔
 ”اب ممبئی ہمارے لیے بھی ایک اجنبی شہر ہے“ اس فقرے میں چھپا ہوا درد حمید اختر ہی جان سکتے ہیں یا پھر وہ
 جس نے ایسے اجنبی شہر دیکھے ہوں۔۔۔۔

☆☆☆

حمید اختر اور تقسیم ہندوستان

تحریر: پروفیسر جلیل نقوی 26 جولائی 2011ء

تقسیم ہندوستان کے دوران حمید اختر کو وہ تمام مشکلات جھیلنا پڑیں جو اس دور میں انڈیا سے آنے والے مہاجرین نے برداشت کی تھیں۔

اگست 1947ء کے آخر میں خاندان کے واحد مرد ہونے کے ناتے جب وہ چالیس پچاس خواتین اور بچوں کے قافلے کو لے کر اپنے گاؤں تہاڑہ سے نکلے تاکہ کسی طرح ستلج پار کر جائیں اور جب دریا کے کنارے پہنچ کر انہوں نے پلٹ کر دیکھا تو پورے گاؤں سے آگ کے شعلے بلند ہوتے نظر آ رہے تھے۔

”ہماری دنیا“ ہماری آنکھوں کے سامنے جل رہی تھی“ (حمید اختر ”جو ہم پہ گزری سو گزری مگر شب ہجران“ روزنامہ ”ایکسپریس“ 12 اگست 2003ء) یہ دنیا ابھی تک جل رہی ہے۔ آگ کے وہ شعلے زندگی بھران کی آنکھوں میں جلتے رہے۔ گزشتہ دو دہائیوں سے تہاڑہ انہیں کچھ زیادہ ہی شدت سے بلا رہا تھا۔ حمید اختر نے اسے نوحہ نہیں بنایا، ایک رجز بنا دیا۔ امن کار جز، انسان دوستی کار جز، پاکستان اور ہندوستان کے درمیان آشتی کا، محبت کار جز۔ میں نے حمید اختر کو پڑھنے سے پہلے لدھیانہ کے حوالے سے کئی کتابیں پڑھ رکھی تھیں۔ خواجہ فیض محمد فیض کی ’لدھیانہ کی ڈائری‘، ماسٹر تاج الدین انصاری کی ’خونی لکیر‘ اور کئی دوسری کتابیں۔ ان کتابوں میں نفرت ہی نفرت تھی، آگ ہی آگ، انتقام کی خونی لکیر، لیکن یہ غصہ یہ آگ، حمید اختر کے یہاں کہیں نہیں ہے۔ اگر وہ خاندان کی خواتین پر مٹی کا تیل چھڑک کر انہیں جلا ڈالنے کا کارنامہ کر گزرتے تو شاید یہ تلخی، یہ غصہ یہ آگ ان کی تحریروں کا حصہ بھی بن جاتی۔ اپنی اس سرگزشت میں 1947ء کا یہ مہاجر سر سے پاؤں تک دل ہی دل نظر آتا ہے۔ یہ ساری روداد جس سے وہ پل پل اور قدم قدم گزرے، اس طرح سناتے ہیں جیسے خود ان کے ساتھ کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ ان کی تحریروں میں کہیں کہیں زہر خند کا احساس ہوتا ہے۔ کہیں کہیں ان کے لفظ بھگتے ہوئے بھی محسوس ہوتے ہیں اور یہ دیکھ کر ان کے حوصلہ مند لیکن انسان دوست دل کی تکریم کرنے کو جی چاہتا ہے وہ کا

مریڈ پر کاش کا ذکر کرتے ہیں جس نے مسلمانوں کی زندگیوں بچاتے ہوئے اپنی جان دے دی۔ اسی طرح گلورد کمپ کے درجنوں واقعات میں ایک ایسا واقعہ بھی ہے جس میں وہ پوری صورت حال کا مضحکہ اڑاتے دکھائی دیتے ہیں۔

کیا یہ سب اس مارکسی تربیت کی دین ہے جو 7-1946ء کے دوران ممبئی میں ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہونے کے دوران ہوئی۔

9 اگست 1947ء کو جب وہ ممبئی سے لدھیانہ آرہے تھے تو ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ آگ اور خون کے دریا سے گزرنے والے ہیں۔ اسی لیے وہ ممبئی سے سیدھے لدھیانہ آنے کی بجائے خراماں خراماں اپنے 'پینڈو' دوست یعنی ابن انشاء کے پاس دہلی پہنچ گئے۔ کھیل شروع ہو چکا تھا۔ پوری بات خود ان کی زبانی سنتے ہیں:

”میں 9 اگست کو ممبئی سے فرٹائر میل سے روانہ ہوا۔ دس کی شام کو دہلی پہنچا۔ یہ فسادات مار دھاڑ، قتل و غارت گری کے عروج کا زمانہ تھا۔ دہلی اسٹیشن سے اتر کرتا نگے میں سامان رکھا اور سیدھا ہارڈنگ لائبریری پہنچا۔ چونکہ اس سے معلوم ہوا ابن انشاء انبالے چلے گئے وہاں سے پاکستان جائیں گے۔ انبالے والا مکان ابن انشاء نے نہ معلوم کس طرح اپنے پاس رکھا تھا بلکہ بہت سا سامان بھی وہیں تھا۔ وہ سامان لینے ہی اسے انبالے جانا پڑا۔ میں نے وہیں سے واپسی اختیار کی اور کسی دوسری گاڑی میں گیارہ بجے کے قریب دہلی اسٹیشن سے انبالے کے لیے روانہ ہوا۔ گیارہ اگست کو صبح چار بجے انبالہ پہنچا۔ دستک دی۔ انشاء وہاں موجود تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا کہنے لگا۔ ”کیسے پہنچے؟ اس خونریزی میں ٹرینوں کی ٹرینیں کٹ رہی ہیں۔ لوگ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔ تم یہاں کیسے آ گئے کیوں آئے ہو؟ اپنی جان بچاؤ تم نے دہلی سے ٹرین میں سفر کیا؟“

میں ممبئی سے آرہا تھا۔ مجھے اس وقت تک پنجاب کے حالات کا اندازہ نہیں تھا۔ مجھے کسی قسم کی پریشانی بھی نہیں تھی۔ لیکن انشاء کو غالباً صورت حال کا صحیح اندازہ تھا۔ وہ مجھے صبح گاڑی میں سوار کر گیا۔ پند و نصائح کے ساتھ احتیاط اور ہوشیار رہنے کی تاکید کرتے ہوئے اس نے مجھے لدھیانہ جانے والی گاڑی میں سوار کر دیا۔“ (حمید اختر ”آشنائیاں کیا کیا“ ص 133)

پھر 11 اگست کو وہ تہاڑہ پہنچے۔ جہاں ہندوؤں کے ساٹھ ستر گھر تھے اور مسلمانوں کی آبادی پندرہ ہزار تھی۔ پورے قصبے میں صرف ایک سکھ گھرانہ آباد تھا۔ البتہ اردگرد کے دیہات میں سکھوں کی اکثریت تھی۔ 11 اگست ایک تاریخ ساز دن ہے۔ اس روز ہندی مسلمانوں کے رہنما اور بانی پاکستان محمد علی جناح نے کراچی میں پاکستان کی دستور اسمبلی میں ایک یادگار تقریر کی تھی۔ اس جنونی کیفیت میں پاگل پن کے اس دور میں جناح کہہ رہے تھے:

”آپ آزاد ہیں۔ آپ آزاد ہیں اپنے مندروں میں جانے کے لیے، آپ آزاد ہیں، اپنی مسجدوں میں یا مملکت پاکستان میں اپنی دوسری عبادت گاہوں میں جانے کے لیے۔ آپ کا کسی مذہب، ذات یا طبقے سے تعلق ہو سکتا ہے۔۔۔ اس کار ریاست کے معاملات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔۔۔“

آپ دیکھیں گے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہندو ہندو نہیں رہیں گے اور مسلمان مسلمان نہیں رہیں گے، مذہبی معنوں میں نہیں کیونکہ عقیدہ ہر فرد کا ذاتی معاملہ ہے، بلکہ ریاست کے شہریوں کے طور پر سیاسی معنوں میں۔۔۔ Constitunt assembly of pakistan debates august 11, 1947

(page 27)

جب حمید اختر 11 اگست کو اپنے گاؤں میں صورت حال کا جائزہ لے رہے تھے تو وہ کراچی میں ہونے والی ان سرگرمیوں سے بالکل بے خبر تھے۔ ان کے سامنے سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ وہ خاندان کی خواتین اور بچوں کو کیسے یہاں سے بحفاظت نکال لے جائیں کیونکہ اس وقت ہندو صرف ہندو تھے اور مسلمان صرف مسلمان، ان کے درمیان کہیں کہیں حمید اختر جیسے انسان بھی تھے جن کا ذکر خال خال ملتا ہے۔

”میں اپنے خاندان کا واحد مرد تھا جو اس وقت وہاں موجود تھا، میرے تینوں بڑے بھائی سرکاری ملازم ہونے کی وجہ سے، میرے گیارہ اگست کو بمبئی سے لدھیانہ پہنچنے سے چار روز قبل ملازمت کے سلسلے میں لاہور جا چکے تھے، خواتین کو گاؤں میں چھوڑ دیا گیا کہ یہ گاؤں ہماری پیری مریدی کی وجہ سے ہمارے خاندان کے لیے ایک قسم کا حفاظتی قلعہ تھا۔ چنانچہ جب آدھے سے زیادہ گاؤں خالی ہو گیا اور باقی کے لوگ بھی رخت سفر باندھتے نظر آئے تو میرے سامنے پندرہ بیس خواتین اور بچوں کو لے کر وہاں سے بھاگنے کا مسئلہ آیا۔ مشکل یہ تھی کہ ہمارے خاندان میں پردے کی سخت پابندی تھی اور میری دو بہنوں اور بھادجوں کے سوا جو اپنے بھائیوں اور شوہروں کی سرکاری ملازمت کی وجہ سے گاؤں سے باہر کا سفر کر چکی تھیں، اکثریت کا تعلق ایسی خواتین سے تھا جنہوں نے گھر کی چار دیواری سے باہر کبھی قدم نہیں رکھا تھا، ہماری عورتوں کو اپنے خاندان کی دوسرے شاخ کے ہاں جن کے آٹھ دس گھر ہم سے ساٹھ ستر گز کے فاصلے پر ایک بڑے احاطے کی چار دیواری میں واقع تھے اگر کبھی شادی یا مرگ کے موقع پر جانا ہوتا تو راستے میں واقع دکانیں بند کر کے چاروں طرف سے بند ڈولی وغیرہ کے ذریعے ہی جایا جاتا۔ ظاہر ہے ایسی خواتین کے قافلے کو گھر سے باہر لے جانے کی اور وہ بھی کسی منزل کے تعین کے بغیر ذمہ داری قبول کرنا آسان نہیں تھا جبکہ ان میں سے اکثریت کے لیے پیدل چلنا بھی ممکن نہ تھا، میں گھر چھوڑنے اور عورتوں اور بچوں کو ساتھ لے کر گھر سے باہر نکلنے کو تیار نہ تھا اور اسی شش و پنج میں مبتلا تھا کہ کیا کروں کیونکہ

پیاری بڑی بہنیں بیٹھی تھیں۔ ایک آٹھ سال کی بیٹی تھی۔ ایک سات برس کا بھانجا تھا۔ میری بڑی بہن کی گود میں دس چدرہ دن کی ایک بچی تھی جس نے ابھی دو ہفتے قبل اس دنیا میں قدم رکھا تھا۔ میرے تایا کی اکلوتی بیٹی فاطمہ اور اس کا آٹھ برس کا اکلوتا بیٹا انور تھا۔ انہیں اپنے ہاتھوں سے میں کیسے ختم کر سکتا تھا؟ لیکن اس فیصلے پر عمل نہ کرنے کی صورت میں جو کچھ ہو سکتا تھا اس کے بارے میں سوچنا اور غور کرنا بھی خاصا روح فرسا تھا۔ صورت یہ تھی کہ خطرہ قریب سے قریب تر آ رہا تھا۔ آس پاس کے گاؤں جل رہے تھے۔ انسان انسانیت کے درجے سے گر چکے تھے جس کا سبق ہم بچپن سے دہراتے آئے تھے۔ میں جب عورتوں اور بچوں کو جلانے کے فیصلے پر عملدرآمد نہ کرنے کا فیصلہ کر کے واپس دیوان خانے میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ گاؤں تقریباً خالی ہو چکا ہے۔ لوگ بڑھتے ہوئے خطرے کو محسوس کرتے ہوئے ڈیڑھ میل کے فاصلے پر بہتے ہوئے دریائے ستلج کا رخ کر رہے ہیں۔ وہاں سے دریا پار کر کے وہ نکو در تحصیل کے علاقے میں داخل ہو سکتے ہیں جو مسلم آبادی کی غالب اکثریت کا علاقہ ہے۔ ویسے بھی تہاڑہ کی زیادہ آبادی آرائیں خاندانوں پر مشتمل تھی جن کی دریا پار رشتہ داریاں بھی تھیں۔ ان کی عورتوں کے لیے جو محنت کرنے اور جفاکشی میں اپنی مثال آپ تھیں دو چار یا چھ آٹھ میل کا سفر معمولی بات تھی۔ وہ گھروں اور کھیتوں میں روز و شب کام کرنے کی عادی تھیں مگر ہماری عورتیں چار دیواری سے باہر نکل کر جانے یا سفر کی صعوبتیں برداشت کرنے کے قابل نہ تھیں۔ ان ساری مشکلات کے باوجود فیصلے کی گھڑی آ پہنچی تھی اور گھر چھوڑنے کے سوا اب کوئی اور راستہ نہ تھا۔ اس لیے کہ اب گاؤں میں ہمارے آٹھ دس گھروں کے سوا اور کوئی نہ تھا سب دریا کی طرف جا چکے تھے۔

میں نے دیوان خانے سے واپس آ کر ایک دفعہ پھر ان بے بس اور مظلوم خواتین اور بچوں پر نظر ڈالی، میری دونوں بہنیں، میری تایا زاد بہن اور اس کا بیٹا اور میری بھتیجی عذرا جو ان دنوں راولپنڈی میں پوتوں پوتیوں اور نواسے نواسیوں والی ہو چکی ہے اور میرا بھانجا افضل جو پاک فوج کے ریٹائرڈ کرنل کی حیثیت میں لاہور میں مقیم ہے اور کچھ دوسری خواتین جن میں میری ماموں زاد بہن شامل تھی میرے سامنے تھیں۔ میں نے اسی وقت اور اسی حالت میں بغیر کوئی ساز و سامان اٹھائے وہاں سے نکلنے کا اعلان کر دیا۔ (حمید اختر ”جو ہم پہ گزری سو گزری“ روزنامہ ”ایکسپریس“ 13 اگست 2003)

حمید اختر نے اگرچہ اپنی متعدد تحریروں میں ان واقعات کو دہرایا ہے لیکن کئی مقامات سے وہ سرسری گزر گئے ہیں۔ ممبئی سے واپس گاؤں پہنچ کر انہوں نے اس سے کہیں زیادہ دیکھا ہوگا جس کا ذکر انہوں نے کیا ہے۔ اس سلسلے میں ان کا سب سے تفصیلی یادنامہ ”مجھے یاد ہے وہ سب ذرا ذرا“ کے عنوان سے موجود ہے اس میں ان تمام المیوں کا ذکر موجود

نہیں ہے جو روزانہ جنم لے رہے تھے۔ ممبئی سے گاؤں پہنچنے تک اور پھر گاؤں چھوڑنے کے فیصلے تک 'تھاڑہ' میں جو کچھ ہو رہا تھا فرقہ وارانہ بنیاد پر رشتوں کی ٹوٹ پھوٹ سے جڑے ہوئے واقعات، نکو درکمپ تک پہنچتے ہوئے گرد و پیش کے حالات، خاندان کے علاوہ دیگر مسلمان گھرانوں کے ساتھ پیش آنے والے حادثات اور سب سے بڑھ کر ساٹھ ستر ہندو گھرانوں کے صدیوں پرانے اپنے مسلمان پڑوسیوں کے بارے میں خصوصی رویے ان سب کی تفصیل اگر حمید اختر بیان کر پاتے تو ان کی اپنی روداد کے ساتھ ساتھ یہ اس دور کی وہ غیر جانبدارانہ تاریخ ہوتی جو ہمیں ماسٹر تاج الدین انصاری یا خواجہ فیض کے بیانات میں مفقود نظر آتی ہے۔ خود حمید اختر اس کا اعتراف کرتے ہیں بلکہ اس کی وجہ بھی بیان کرتے ہیں۔ ان کے بقول ان سب باتوں کا ذکر یہاں ممکن نہیں تھا اور نہ ہی ان کے قلم میں انہیں بیان کرنے کی سکت تھی۔

ہجرت اور ہجرت کرنے والے لوگوں کے ان کہے دکھ اور تکالیف عصری ادب میں ایک نمایاں موضوع رہے

(Salimullah khan (ed) The journey to pakistan national

documentatioin centre islamabad 1993 page 15)

ان موضوعات پر دنیا میں بہت سے مطالعات کیے گئے۔ بہر حال تاریخی مطالعات میں لوگوں اور معاشرے پر تقسیم کے اثرات کی نسبت تقسیم کی وجوہات پر زیادہ توجہ دی گئی۔

ہندوستان کی تقسیم میں جغرافیائی طور پر پنجاب اور بنگال کی تقسیم عمل میں آئی۔ دوسرے صوبوں میں ہجرت کا عمل ان دو صوبوں کی نسبت سست رہا۔ خاص طور پر سندھ میں یہ عمل محدود اور رضا کارانہ رہا اور مہاجرین ایک نسل تک یہاں

آتے رہے) (Mohammad Waseem migration and Assimilation :

Comperative Study of pakistan ,punjab in Ian Talbot , Region and

Partition Oxford University Press Karachi 1990 Page 204)

جبکہ مغربی پنجاب میں یکا یک مذہبی گروہوں کے تعلقات بگڑ گئے اور اچانک بڑی تعداد میں مہاجرین کی آمد ہوئی۔

مغربی پنجاب میں مہاجرین کا مسئلہ ایک بڑے مسئلے کی صورت اختیار کر گیا کیونکہ بڑی تعداد میں بے گھر اور

دہشت زدہ مہاجرین امرتسر، جالندھر، ہوشیار پور اور لدھیانہ سے ہر روز یہاں پہنچ رہے تھے۔ ہندوستان سے ہجرت کر کے

آنے والوں میں 73 فیصد مہاجرین مغربی پنجاب آئے اور اس طرح پنجاب کو 5 ملین مہاجرین کو جگہ دینا پڑی جو نقل مکانی

کا سلسلہ ختم ہونے پر یہاں کی آبادی کا ایک چوتھائی حصہ بنے۔ مثال کے طور پر لاہور کی 43 فیصد آبادی مہاجرین پر مشتمل

تھی ملتان میں یہ تناسب 49 فیصد تھا، گوجرانوالہ میں 50 فیصد، جھنگ میں 65 فیصد اور لائل پور (فیصل آباد) اور سرگودھا

میں 69 فیصد تھا (Ibid Page 217) نسبتاً مختصر مدت میں ایک بہت بڑی تعداد میں مہاجرین مغربی پنجاب میں آئے۔

حمید اختر کی مذکورہ تحریر یادگیر معاصر یادداشتوں سے جن عمومی رجحانات کا اظہار ہوتا ہے وہ مختصراً یہاں درج کیے جاتے ہیں:

☆ لوگوں نے انفرادی طور پر اور گروہوں کی شکل میں مصائب کا سامنا کیا اور اپنی جان بچانے کی خاطر اپنی املاک چھوڑ کر ہجرت کی۔ زیادہ تر لوگوں کے ساتھ جو سامان تھا وہ چند کپڑوں اور کھانے پینے کی اشیاء مثلاً بھنے ہوئے چنوں اور چھوٹی موٹی چیزوں پر مشتمل تھا۔ حتیٰ کہ بعض لوگ تو ننگے پاؤں تھے۔ چونکہ مذہبی فسادات کے پیچھے سب سے بڑا مقصد نسل کشی تھا اس لیے مسلح گروہوں نے مخالف نسلی گروہ کے لوگوں کو مجبور کیا کہ وہ فوری طور پر اپنا گھر بار چھوڑ کر نکل جائیں۔ اس لیے مہاجرین راستے میں پیش آنے والی دشواریوں اور مصائب کا سامنا کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

☆ ایک مسئلہ جو مہاجرین کو پیش آیا وہ یہ تھا کہ مہاجر کیمپوں تک پہنچنے کے لیے ٹرانسپورٹ موجود نہ تھی۔ زیادہ تر لوگ کیمپوں میں پیدل جاتے تھے بہت کم لوگوں کے پاس بیل گاڑی تھی جس پر وہ اپنا سامان لے جاسکتے تھے۔ اس سست رفتار نقل و حرکت کی وجہ سے ان کے لیے حملہ آوروں کا خطرہ اور بھی زیادہ ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ ان کے پاس حملوں کا مقابلہ کرنے کے لیے کوئی ساز و سامان نہیں تھا کیونکہ مقامی پولیس نے یا فوج نے ان سے ہتھیار لے لیے تھے۔ صرف چند لوگ ایسے تھے جو کسی طرح اپنے ساتھ تلوار یا بندوق لے آئے تھے۔

☆ برطانوی فوج میں پنجاب کے لوگوں کی تعداد بہت تھی اور مغربی اور مشرقی پنجاب دونوں میں ہی تقریباً ہر خاندان میں سابق فوجی موجود تھے۔ اس وجہ سے حملے اور بھی زیادہ مہلک ثابت ہوئے۔ ان میں زیادہ تر حملے بڑے منظم تھے اور منصوبہ بندی کے تحت کیے گئے تھے (Ibid Page 208)

☆ نقل و حمل کے ناقص ذرائع اور راستوں میں حائل دریاؤں اور بند پلوں کی وجہ سے لوگوں کے انخلاء میں زیادہ وقت صرف ہو رہا تھا۔ جبکہ مہاجر کیمپوں میں زندگی کئی طرح کے مسائل مثلاً ناکافی اور مضر صحت خوراک، حملوں کے خطرے اور اسہال کی وبا پھیلنے کی وجہ سے ایک تلخ تجربہ تھی۔ عام طور پر مہاجروں کو انتہائی ضرورت کی صورت میں بھی کیمپوں سے باہر جانے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔ اس کی وجہ سے اشیائے صرف کی قلت پیدا ہو گئی اور لوگوں کو سرکاری حکام کی طرف سے دیے جانے والے راشن پر یا پھیری والوں پر انحصار کرنا پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ مسلح حملے اور مہاجر کیمپوں کے گرد گھومتے رہتے اور فوج کے سخت رویے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بے سروسامان مہاجروں پر حملے کرتے۔ یہ

بھی دیکھنے میں آیا کہ مقامی تحصیلدار اور سرکاری اہلکار مسلح گروہوں کو ان کے نسل کشی کے کام میں مدد دیتے تھے۔ جنڈیالہ گورد میں ایک واقعے میں سکھ فوج نے تقریباً 1500 مہاجروں کو گھیرے میں لے لیا اور جو کوئی بھی اس سے بچ نکلنے کی کوشش کرتا اسے مار ڈالا جاتا۔ یہاں تک کہ لوگوں پر دستی بم بھی پھینکے گئے (Salimullah Khan (e.d.

CIT Page 15)

☆ بہت سے لوگوں کے رشتہ دار فسادات اور ہنگاموں میں گم ہو گئے۔ بعض لوگ اس قدر بد دل ہو گئے کہ انہوں نے خود کو بلوائیوں کے حوالے کر دیا۔ جبکہ جو لوگ جان بچا کر یہاں پہنچے ان کے حوصلے پست تھے اور وہ پاکستان میں نئی زندگی شروع کرنے کے قابل نہیں تھے۔

☆ مذہبی فسادات اور قتل عام بڑے پیمانے پر ہوا۔ پورے کے پورے گاؤں جلا دیئے گئے، ٹرکوں میں بھرے ہوئے مہاجروں کو مولی گاجر کی طرح کاٹ ڈالا گیا، بسوں اور قافلوں پر بار بار حملے ہوئے، بچے گم ہو گئے اور لڑکیوں کو اغوا کر لیا گیا۔ تقسیم کے بعد کے چند ماہ میں تقریباً پانچ لاکھ افراد مارے گئے۔

☆ برسوں سے سکھوں نے اپنے آپ کو باقی دو مذہبی گروہوں ہندوؤں اور مسلمانوں سے علیحدہ ایک گروہ منوالیا تھا۔ انہوں نے 1942ء میں ”آزاد پنجاب“ اور 1944ء میں ”سکھستان“ کا خیال پیش کیا۔ بعد میں انہوں نے مطالبہ کیا کہ اگر ہندوستان کی تقسیم نہ کی گئی تو سکھوں کے لیے آئینی ضمانتیں موجود ہونی چاہئیں اور اگر ہندوستان کی تقسیم عمل میں لائی جاتی ہے تو ان کے لیے ایک آزاد ریاست قائم کی جائے۔ ہندوؤں نے سکھوں کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا جس وجہ سے سکھوں نے نسل کشی میں زیادہ حصہ لیا۔ سکھ جتھوں نے مشرقی پنجاب سے نکلنے والے مسلمانوں کو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا (Muhammad Waseem Op. Cit. Page 209)

☆ 1946-47ء میں مسلمان عورتوں کے اغوا اور ان پر حملوں کے واقعات میں اضافے سے بلاشبہ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ’دوسروں‘ کی عزت اور پہچان کے سب سے تحفظ یافتہ پہلو کو نشانہ بنانے کی کوشش تھی۔ (Ian Talbot Literature and the Human Drama Of 1947 in Region an Partition , Oxford University Press 1990) عورتوں نے اپنی عزت بچانے کی خاطر کنوؤں میں چھلانگیں لگا دیں۔ ہزاروں عورتوں اور بچوں کو سرحد کے دونوں اطراف اغوا کر لیا گیا اور ان کے خاندانوں کی طرف سے انہیں واپس قبول کرنے سے انکار نے ان کی تکالیف میں مزید اضافہ کیا۔ عورتوں اور بچوں

کے ساتھ بہیمانہ سلوک اور بے رحمی سے قتل کے مناظر عام تھے۔ ان کی لاشوں میں اکثر تلوار یا کرپان گڑھی ہوتی تھی۔

☆ تقسیم پنجاب کے بارے میں ریڈ کلف ایوارڈ جس کا اعلان تقسیم ہندوستان کے تین دن بعد کیا گیا، میں گورداسپور، لدھیانہ اور امرتسر کے مسلم اکثریت والے علاقوں کو پاکستان میں شامل کرنے سے انکار کر دیا گیا۔ (Muhammad Waseem Op. Cit. Page 204) اس ایوارڈ کے پاکستان کی جغرافیائی صورت اور

اس کے مستقبل پر جو اثرات ہوئے سو ہوئے اس نے ہزار ہا لوگوں کو مذہبی فسادات کے خطے سے بے خبر رہنے دیا۔ وہ اپنے علاقوں کی پاکستان میں شمولیت پر مٹھائی بانٹ رہے تھے مگر انہیں تشدد کی لہر نے آلیا اور ان میں سے ہزاروں مارے گئے۔

☆ بعض لوگوں نے مغربی پنجاب چھوڑ کر جانے سے بچنے کے لیے اسلام قبول کر لیا۔ انہیں مقامی لوگوں نے دیندار کا نام دیا اور ان کی املاک اور جائیدادیں محفوظ رہیں۔

☆ شدید نسلی تناؤ کی فضا میں بعض لوگوں نے اپنی جانوں کو خطرے میں ڈال کر دوسرے گروہوں کے لوگوں کو بحفاظت ہجرت میں مدد کی۔

☆ مہاجرین کی اکثریت کا خیال تھا کہ تقسیم ایک عارضی مرحلہ ہے کیونکہ ہندو رہنما ایسی افواہیں پھیلا رہے تھے اور پشیم گونیاں کر رہے تھے۔ اس لیے لوگوں نے نیم دلی سے ہجرت کی یا اس وقت ہجرت کی جب انہیں دوسرے گروہوں کے لوگوں نے اس پر مجبور کر دیا اور ان کے ذہن میں یہ خیال تھا کہ وہ واپس اپنے علاقوں میں آجائیں گے۔ انہیں اپنے آبائی دیہات سے لگاؤ تھا اور انہیں وہ اپنی شناخت اور فخر کی بنیاد سمجھتے تھے۔ (احمد سلیم، "تقسیم، تشدد اور ہجرت، میانہ گوندل کی کہانی" ایس ٹی پی آئی اسلام آباد ت ن ص 42-140)

مذکورہ بالا رجحانات حمید اختر اور اس دور کے حوالے سے لکھی جانے والی دیگر تحریروں سے صاف عیاں ہیں لیکن ہم یہاں اپنے آپ کو حمید اختر کے بیان تک محدود رکھنا چاہیں گے تاکہ ان کے تجربے کی تفہیم واضح ہو سکے اور اس کے لیے ہم زیادہ سے زیادہ ان کے اپنے لفظوں کا سہارا لیں گے۔ ہجرت اور کیمپ کے تجربے پر دوبارہ واپس آنے سے پہلے ہم لدھیانہ شہر سے جڑے ہوئے ان کے بیان کردہ ایک واقعہ کو دہرائیں گے جس میں ایک ہندو کامریڈ پرکاش نے مسلمانوں کی جانیں بچاتے ہوئے خود اپنی زندگی واردی۔

”پرکاش نے لدھیانہ کے ہزاروں ہوزری ورکروں کے حقوق کے تحفظ کے لیے یہ ایسوسی ایشن بنائی ہوئی تھی اور وہ برسوں ان محنت کشوں کے حقوق کی جنگ لڑتا رہا، اس کے گھر میں ہمیشہ ہی فاقہ رہا، وہ ہمارے دوستوں کے اس گروپ میں شامل تھا، جس میں ساحر مرحوم، چودھری غلام مرتضیٰ مرحوم، فیض الحسن چودھری، احمد ریاض ساقی مرحوم شامل تھے

ہم سب نے برسوں اس کو بلا معاوضہ ہوزری ورکروں کے لیے جدوجہد کرتے دیکھا اس نے آج کے ٹریڈ یونین لیڈروں کی طرح نہ کبھی مزدوروں سے کوئی چندہ لیا اور نہ مالکوں سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اس کی جوان خوبصورت بیوی اور ایک بچہ تھا جب اس کے پاس کھانے کو کچھ باقی نہ بچتا تو وہ ہم لوگوں سے بیوی کو میسج بھیجنے کے لیے چار آنے کی مدد طلب کرتا۔ پرکاش کی بیوی کے گھر والے چھوٹے موٹے مگر غریب زمیندار تھے اور لدھیانہ سے آٹھ میل کے فاصلے پر بدووال کے ریلوے سٹیشن کے قریب آباد تھے۔ پرکاش بیوی کو ٹکٹ خرید کر بدووال جانے والی گاڑی پر بٹھا دیتا۔ وہ دو چار دن وہاں گزار کر واپس آتی تو اس کے پاس تھیلوں میں آٹا، چاول، گڑ، گھی اور دیگر اجناس کا ذخیرہ ہوتا یہ مال دس پندرہ یا بیس روز چلتا۔ گھر کا چولہا گرم رہتا۔ دال روٹی چلتی رہتی اور جب سب کچھ ختم ہو جاتا تو پرکاش پھر چونی کا قرض لینے کے لیے گھر سے نکل پڑتا یہ سلسلہ برسوں جاری رہا ہم سب دوست اس کے گواہ ہیں کہ 1941-42ء سے لے کر 1947 تک پرکاش کا کچن اس انتظام کے تحت آباد رہا۔ ایک آدھ دفعہ اس میں ایسی دلچسپ صورت حال بھی پیدا ہوئی جس کا ذکر برسوں بعد تک ہم دوستوں کے تفسن طبع کا باعث بنا، مثلاً ہم دو تین دوست اسے بلانے کے لیے اس کے گھر پہنچے مجھے اب یاد نہیں کہ کس کام کے سلسلے میں اس کی ضرورت آپڑی تھی۔ ہم نے اس کو ساری بات سنائی تو وہ ہمارے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس کی بیوی حسب معمول میسج گئی ہوئی تھی ابھی وہ گھر کا دروازہ بند ہی کر رہا تھا (اس نے گھر میں کبھی تالا لگایا ہی نہیں تھا بس دروازہ بند کر کے کنڈی چڑھا دیتا۔ گھر بھی ایک کمرے اور ایک کچن اور غسل خانے پر مشتمل تھا) خیر ابھی وہ دروازہ بند ہی کر رہا تھا کہ اس کی بیوی بغل میں بچہ اٹھائے سامنے آتی ہوئی نظر آئی وہ خلاف معمول خالی ہاتھ تھی ہم سب نے اسے حیرت سے دیکھا آخر پرکاش نے پوچھا اور اچانک آنے کی وجہ پوچھی ”بچہ سخت بیمار ہے گاؤں میں کوئی ڈاکٹر نہیں تھا اس لیے میں اسے لے کر فوراً ادھر آگئی ہوں اسے ڈاکٹر کے پاس یا ہسپتال لے چلو“ بیوی نے جواب دیا۔

”وہ تو ٹھیک ہے“ پرکاش نے وہاں کھڑے کھڑے جواب دیا، اسے ابھی ہسپتال لے چلتے ہیں دوائی بھی مل جائے گی مگر یہ بتاؤ کہ تم راشن کیوں لے کر نہیں آئیں؟ بچے کی حالت واقعی خراب تھی اس کی بیوی پرکاش کی بات سن کر زار و قطار رونے لگی اور اس نے کہا اسے بچے کی بگڑتی ہوئی حالت کی وجہ سے اچانک شہر کے لیے بھاگنا پڑا، اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ روایت کے مطابق آٹا، گھی، دال، چاول وغیرہ جمع کر کے اٹھاتی۔ اس لیے اس ذکر کو چھوڑ دو اور بچے کو ہسپتال لے چلو، یہ بات سن کر پرکاش نے بند دروازہ کھولا۔ ہم سب اندر جا کر چار پائیوں پر بیٹھ گئے اس نے بیوی کو بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا خود کھڑا ہوا جب سب بیٹھ گئے تو اس نے بیوی کو مخاطب کرتے ہوئے بالکل تقریر کرنے کے انداز میں کہنا شروع کیا ”دیکھو بی بی تم چونکہ خالی ہاتھ آئی ہو ٹھیک ہے بچہ بیمار ہے اس کو ہسپتال سے ابھی دوائی بھی لے دیتے ہیں مگر میرے لیے اب اس

کے سوا اور کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے کہ آج شام تک بچے کی حالت سنبھلنے کے بعد شام کی گاڑی سے یا کل صبح کی ٹرین میں میں تمہیں واپس بھیج دوں، مجھے افسوس ہے کہ مجھے یہی کرنا پڑے گا لیکن تم خود سوچو اس سے میری Reputation پر کتنا اثر پڑے گا۔“

”اگست 1947ء میں اعلان آزادی کے ساتھ ہی فسادات کا سلسلہ شروع ہو گیا اور فرقہ پرست ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں کو مارنا اور ان کے گھروں کو جلانا شروع کیا تو پرکاش دن رات مسلمان مردوں، عورتوں، بوڑھوں اور بچوں کو اپنی حفاظت میں لے کر چھاؤنی میں قائم کیمپوں میں پہنچاتا رہا۔“

آخر اگست کے چوتھے ہفتے میں جب وہ اس کام سے باز رہنے کے لیے متعصب ہندوؤں، سکھوں کی دھمکیوں کو بھی خاطر میں نہ لایا اور معصوم مسلمانوں کی جانیں بچانے میں لگا رہا تو ان بد بخت ہندو سکھوں نے اس کی زندگی کا چراغ ہی گل کر دیا۔“ (حمید اختر ”پرسش احوال لاہور ستمبر 1999 ص 22-23)

ایسے واقعات سینکڑوں نہیں ہزاروں کی تعداد میں پیش آئے لیکن ان واقعات کی طرف نسبتاً کم توجہ دی گئی ہے۔ اس کے برعکس تشدد، قتل و غارت گری اور عزتیں لوٹنے کے واقعات لاکھوں کی تعداد میں اس انداز میں دہرائے گئے جن میں ایک فرقہ ظالم اور دوسرا مظلوم دکھائی دیتا ہے لیکن جس کی اصل حقیقت کی طرف ساحر لدھیانوی نے اشارہ کیا ہے۔

”حد بندی کمیشن کے فیصلے کے فوراً بعد اور اس سے پہلے پنجاب میں جو کچھ ہوا اور اب تک ہو رہا ہے اس سے ایام جہالت اور دور بربریت کی داستانیں بھی شرمندگی محسوس کرتی ہیں یہ فسادات محض حادثاتی طور پر ظہور میں نہیں آئے یہ ایک جوابی حملہ ہے جو برطانوی سامراج نے ہماری قومی حکومتوں اور قومی تحریکوں پر کیا ہے۔“ (ساحر لدھیانوی ”ہماری آزادی، اس کا پس منظر اور مستقبل“، سویرا، شمارہ 3 نیا ادارہ لاہور۔ 235)

حمید اختر نے اپنے گاؤں تہاڑہ سے نکو در تک کے سفر میں بربادی کے جو مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے وہ انہیں چین نہیں لینے دیتے تھے۔ وہ حد نظر تک پہلے ہوئے ان کھیتوں کو نہیں بھول سکتے جو نکو در کے سفر تک ان کے ساتھ ساتھ چلے۔ گاؤں کے گاؤں ویران پڑے تھے اور انہوں نے اپنی آنکھوں سے ایسی بھینسوں کو تڑپتے ہوئے دیکھا جن کے تھن دودھ کی فراوانی سے اکڑ چکے تھے مگر وہاں دودھ دوہنے والا کوئی نہیں تھا۔ اکثر مویشی بھوکے پیاسے تھان پر بندھے بندھے ہی مر گئے۔۔۔“ (حمید اختر ”جو ہم پہ گزری“ روزنامہ ”ایکسپریس“ 13 اگست 2003)

اب ہم واپس اصل کہانی کی طرف آتے ہیں، جب حمید اختر خاندان کی خواتین اور بچوں کے ساتھ گاؤں سے

نکلے:

”ہماری مدد کے لیے البتہ ہمارے خاندانی ملازم اور ان کے افراد خانہ ضرور ہمارے ساتھ تھے جن کی خدمت اور مدد کے بغیر یہ سفر شاید طے ہی نہ ہو سکتا۔ ان میں تین بھائی تھے جنہیں نوکر کہنے کی ہمیں بزرگوں نے کبھی اجازت نہ دی تھی۔ ویسے بھی وہ مجھے بھائیوں کی طرح عزیز تھے۔ البتہ ہماری خواتین ان سے بھی پردہ کرتی تھیں جو ہجرت کے اس سفر میں ممکن نہ رہا۔ ان بھائیوں کی والدہ اور بیویاں بھی ہمراہ تھیں جن کی موجودگی تقویت کا باعث تھی۔ گھر سے نکلنے وقت ہمارے ساتھ ہمارے خاندان کی دوسری شاخ کی دو درجن کے قریب خواتین اور بچے بھی شامل ہو گئے۔ ان کے مردوں کا کہنا تھا کہ وہ اپنے مویشیوں، بھینسوں اور گھوڑوں کی دیکھ بھال کے فرائض انجام دینے کے بعد رات کو دریا پار ہم سے آملیں گے چنانچہ وہ گھر پر ہی رہے اور ہمارے گاؤں چھوڑنے کے دو گھنٹے بعد حملے میں سبھی مارے گئے۔ قصہ مختصر جب ہم گاؤں سے نکلے تو میرے ہمراہ آٹھ خاندانوں کی پچاس کے قریب خواتین اور بچے تھے۔ میں ہی خاندان کا واحد مرد تھا جو ان کے درمیان بمبئی سے واپس آ کر یوں پھنس گیا تھا کہ مجھے پنجاب کے حالات خصوصاً فسادات کی نوعیت کا اندازہ ہی نہیں تھا۔ میں تو پندرہ روز کی چھٹی لے کر گیارہ اگست کو بمبئی سے لدھیانہ پہنچا تھا اور وہاں یہ معلوم ہونے کے بعد کہ میرے تینوں بھائی پاکستان کے لیے ”آپٹ“ کرنے کی وجہ سے بسلسلہ ملازمت لاہور جا چکے ہیں اسی شام گاؤں پہنچ گیا تھا۔ اگست 1947ء کے چوتھے ہفتے میں جب ہم گھر سے نکلے تو کوئی منزل سامنے نہ تھی۔ کسی ریلوے سٹیشن تک رسائی کا سوال ہی نہ تھا۔ کھانے پینے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ ہمارے گھر والوں کو عام دیہاتی آبادی کی طرح حوائج ضروری کے لیے کھیتوں میں جانے کا کوئی تجربہ نہ تھا مگر اب یہ ساری آسائشیں پیچھے رہ گئی تھیں۔ ابھی ہم دریا پر پہنچے ہی تھے کہ گاؤں سے آگ کے شعلے بلند ہوتے نظر آنے لگے۔ ہماری دنیا ہماری آنکھوں کے سامنے جل رہی تھی۔ ہمارے بعد گاؤں سے آنے والے اکاؤنڈ کا لوگوں نے بتایا کہ ہمارے دو عزیز جو مال مویشی کی دیکھ بھال کے لیے رُک گئے تھے اپنے دیوان خانے کے احاطے میں بیٹھے بیٹھے گولیوں کا نشانہ بن گئے۔ دریا پر پہنچتے ہی البتہ ہمارے گاؤں کے ملاحوں نے کشتی میں سوار ہو کر پار جانے والے بھی مسافروں کو اتار کر ہمیں کشتی میں بٹھا کر فوراً ہی دریا پار کر دیا۔ دوسرے کنارے پر پہنچنے کے بعد کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کریں۔ (حمید اختر ”جوہم پہ گزری“ روزنامہ ”ایکسپریس“ 13 اگست 2003)

اب کیا کریں، کدھر کا رخ کریں؟ یہ سوال ہر قافلے کے مردوزن کے ہونٹوں پر تھا۔ حمید اختر کے کندھوں پر تو پچاس خواتین اور بچوں کا بوجھ تھا۔ نوخیز، ناتجربہ کار، خواب دیکھنے والا نوجوان اب کیا کرے؟ وہ خواتین کو بچوں کو جلد پاکستان پہنچنے کی نوید سنارہا تھا لیکن اس کا اپنا دل ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا۔ ان حالات سے گزرتے ہوئے اس نے کیا کچھ سوچا ہوگا۔ سامنے مکمل بربادی کا سامان تھا لیکن وہ سب کو تسلی دے رہا تھا۔ سب کے آنسو پونچھ رہا تھا حالانکہ اس کے اپنے

آنسو بہ نکلنے کو بے چین تھے۔ وہ ضبط سے کام لیتا رہا لیکن اس ملکی شام کو ستلج کے بہتے پانیوں کے کنارے تنہا بیٹھے ہوئے اس کے ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔

”میں اپنے ان گھر والوں، خواتین اور بچوں کو اور اپنے گاؤں اور اس علاقے کے دوسرے سینکڑوں بے خانماں افراد کو چھوڑ کر بھاگتا ہوا ان سب لوگوں سے کافی فاصلے پر تنہا جا کر بیٹھ گیا اور اس دریا کے کنارے پر بلند آواز سے دھاڑیں مار مار کر رویا۔ دس پندرہ منٹ تک خوب اچھی طرح سے رو لینے کے بعد دل کچھ ہلکا ہوا تو میں پھر اپنے قافلے میں آ کر شامل ہوا اور ان سب لوگوں کو حالات ٹھیک ہونے پر منزل پر پہنچنے کی خبریں دینے لگا۔ انہیں تسلیاں تو میں ضرور دے رہا تھا مگر منزل کا خود مجھے بھی کوئی علم نہیں تھا۔“ (حمید اختر ”احوال واقعی“ لاہور 2005 ص 352)

کافی سوچ بچار کے بعد قافلہ ایک قریبی گاؤں ’سگاں‘ پہنچا جہاں ان کے کچھ مرید خاندان آباد تھے۔ تین دن ان کی خوب تواضع ہوئی لیکن خطرے کے باعث یہاں سے بھی کوچ کرنا پڑا۔ بلکہ پورا گاؤں اٹھ کر ان کے ساتھ ہی نکودر کی طرف چل پڑا۔ مریدوں کا ایک اور گاؤں راستے میں پڑا۔ دو دن بعد یہ گاؤں بھی ان کے ساتھ ہی اٹھ کر چل پڑا۔ یہاں سے سڑک اور ریل کا سفر غیر محفوظ تھا۔ یہیں کھیتوں میں رُک کر انتظار کرنے کا سوچا گیا۔ بقول حمید اختر ”گھلے کھیتوں میں بیٹھنے والے لاکھوں افراد کی اس قیام گاہ کو نکودر کیمپ کا نام دیا گیا۔۔۔۔۔ حمید اختر لکھتے ہیں:

”نکودر کیمپ یا کسی ایسے کیمپ کا جس میں لاکھوں انسان مقیم ہوں، علم طور سے ذکر کیا جائے تو ذہن میں کسی ایسے مقام کی تصویر اُبھرتی ہے جہاں بنیادی انسانی ضرورتوں کا اہتمام ہو یا کم سے کم کسی قسم کے نظم و ضبط کے موجود ہونے کی توقع ہوتی ہو۔ نکودر کیمپ میں ایسی کوئی چیز موجود نہیں تھی، بیس پچیس لاکھ انسانوں کا ایک ہجوم تھا جو مہت پور سے نکودر آنے والی سات میل لمبی سڑک کے دونوں طرف واقع کھیتوں میں مقیم تھا، کسی کے پاس چار پائی یا قاعدے کا بستر موجود نہیں تھا، کیمپ کی حد بندی یا حفاظت کے لیے پولیس فوج یا کسی نوع کا کوئی سرکاری اہل کار بھی موجود نہیں تھا، لوگ اپنے طور پر اور اپنے ہی اہتمام کے ذریعے کھلے آسمان کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے، ان کی ذمہ داری قبول کرنے والا کوئی نہ تھا۔ جو لوگ ہماری طرح جان بچا کر دریا کے ادھر سے بھاگ کر اس علاقے میں داخل ہوئے تھے ان کے پاس تن کے کپڑوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ان میں ہم خود بھی شامل تھے، کیمپ کے تین مہینے ہم نے ایک پتلون اور ایک شرٹ میں گزار دیئے۔ ایک آدھ دفعہ مانگے مانگے کی چادر پہن کر ان کپڑوں کو دھلوانے کی کوشش ضرور کی مگر اس سے کوئی فائدہ نہ ہوا، کیونکہ زمین پر، انہیں مسلسل پہن کر سونے کی وجہ سے آخر میں مٹی ان کپڑوں کا حصہ بن گئی تھی، انہیں بدلنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ (حمید اختر ”احوال واقعی“ لاہور 2005 ص 348)

یہ کیمپ وطن کی آزادی پر ایک بلیغ تبصرہ تھا۔ یہاں تو داغ داغ ہی سہی، اجالا بھی نہیں تھا، اور شب گزیدہ ہی سہی، سحر بھی نہ تھی۔ یہ انسانوں کے اولین ایام جیسی کوئی دنیا تھی۔ تن ڈھاٹنے کے لیے پتوں کی بجائے پھٹے پرانے ملبوسات تھے اور از قسم نان جوئیں۔ کیمپ کے گھر بھی فطرت کے اولین گھروں جیسے تھے۔ انسان آزادی کے جدید تصور سے آشنا ہو کر مادر پدر آزادی کی منزل تک آپہنچا تھا۔ اس پر حمید اختر کی رجائیت قابلِ داد ہے:

’کیمپ کی زندگی کے ابتدائی دن آس امید اور آزاد ملک کے سفر کی تمنا میں گزرے، ہر شخص اس خیال میں تھا کہ اس عارضی قیام گاہ سے جلد ہی روانگی ہوگی۔ آس پاس کے دیہات سے یہاں پہنچنے والے لوگ، کپڑے، کھانے پینے کا سامان اور گھریلو ضرورت کی چیزیں از قسم کونڈی، ڈنڈا، تو، پرات اور چمٹے وغیرہ ساتھ لے کر آئے تھے اس لیے لوگوں کو مل جل کر ضرورتیں پوری کرنے میں کوئی خاص دشواری پیش نہیں آئی میرے پاس بمبئی کی فلم کی کمائی ہوئی خاصی نقد رقم موجود تھی چنانچہ سب سے پہلے میں نے ان لوگوں کی بنیادی ضرورت، آٹا، گیہوں اور ضروری برتن وغیرہ خرید لیے، چادریں بھی خریدنا پڑیں، اس لیے کہ چادروں کے ذریعے ہی لوگ اپنے اپنے رہائشی علاقوں کی حد بندی کرتے تھے، درختوں کی شاخیں کاٹ کر زمین میں گاڑی جاتیں اور پھر ان پر چادریں لٹکا کر اپنی ملکیت کا علاقہ مخصوص کر لیا جاتا اس طرح کھلے آسمان کے نیچے بغیر چھت کے ہزاروں لاکھوں گھر سڑک کے دونوں طرف کھیتوں میں قائم ہو گئے۔ چوہے جل گئے دال تو روزانہ نہیں ملتی تھی، روٹی البتہ ضرور پکتی تھی، دال ہوتی بھی تو مصالحوں اور گھی کے بگھار کے بغیر اور یہی بہت غنیمت معلوم ہوتی کیونکہ اکثر خالی روٹی ہی کھانے کو ملتی جس روز نو جوان لڑکے محنت کر کے دور کھیتوں سے ہری مرچیں توڑ کر لاتے اور ان کی چٹنی بنتی اس روز گویا ہماری عید ہو جاتی ہمارے ساتھ گھریلو ملازم خاندان کی عورتیں بھی تھیں جو روز کسی چکی والے خاندان کو تلاش کر کے گیہوں پیس لائیں اور پھر آٹا گوندھ کر روٹی پکا دیتیں، کسی روز کسی سے قیتا دال مل جاتی تو پک جاتی ورنہ صرف سوکھی روٹی پر گزارہ تھا، حقیقت یہی تھی کہ پندرہ بیس لاکھ افراد کھلے آسمان تلے کھیتوں میں بیٹھے تھے اور پاکستان جانے کے منتظر تھے، کئی روز تک کے انتظار کے باوجود کہیں سے کوئی خبر نہیں مل رہی تھی۔ بیرونی دنیا سے کوئی رابطہ نہیں تھا۔ صرف اس امید اور آس میں یہ اتنا بڑا ہجوم وقت گزار رہا تھا کہ ان لوگوں کو یہاں سے لے جانے کا کچھ نہ کچھ انتظام تو ضرور ہو گا۔۔۔۔۔ حوائج ضروری کے لیے اتنا بڑا ہجوم کیمپ سے باہر دور کھیتوں میں جاتا۔ ہماری خواتین کے لیے اور بھی مشکل تھی۔ وہ دن میں باہر نہ جاسکتی تھیں، رات ہو تو وہ ڈرتے ڈرتے باہر کھیتوں تک جاتیں۔ ویسے بھی ہم سب لوگ زمین پر سوتے تھے، بھادوں کا مہینہ تھا۔ بارش ہو جاتی تو زمین پر لیٹ ہی نہ سکتے، رات رات بھرا کڑوں بیٹھے رہتے۔ ایک دفعہ

36 گھنٹے مسلسل بارش ہوتی رہی۔ ہم لوگ کھانے پینے کا سامان بالخصوص آٹے گیہوں کو بچانے کے لیے برتنوں میں بند کر

کے ان برتنوں کو سروں پر رکھے بیٹھے رہے۔“ (حمید اختر ”احوال واقعی“ لاہور 2005 ص 353)

نکو درکیمپ اور اس کی زندگی کے حوالے سے حمید اختر کا لکھا ہوا ایک ایک لفظ قابل توجہ ہے لیکن ان کے انداز بیان پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے۔ مندرجہ بالا عبارت کو پڑھتے ہوئے یہ چنداں احساس نہیں ہوتا کہ زندگی اور موت کے درمیان پل بھر کے فاصلے کو اس جیلے پن سے بھی طے کیا جاسکتا ہے بلکہ کہیں کہیں تو یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ اس تمام صورت حال کو مضحکہ خیز سمجھ کر اس کا تمسخر اڑا رہے ہیں۔ ایک اور مقام پر وہ اپنے ایک خالو کا ذکر کرتے ہیں۔ بہت نیک پارسا، عبادت گزار اور پانچ کی بجائے سات نمازیں پڑھنے والے بزرگ، لیکن ساتھ ہی اہل خاندان کے لیے ایک سخت گیر دہشت گرد۔ موصوف مسجد کے حجرے میں قیام کرتے تھے، صرف کھانا کھانے گھر آتے تھے۔ ان کی موجودگی میں ان کی بیوی اور بچے اونچی آواز میں بات تو کیا سانس بھی نہیں لے سکتے تھے۔ سردیوں میں وہ اپنے لیے جو ”بخیریاں“ اور ”دابڑے“ وغیرہ تیار کراتے انہیں تالے میں بند کر کے رکھتے اور کھانا کھانے کے بعد خود ہی تالہ کھول کر اس میں سے نکال کر نوش جان کرتے جس کے تالے کی چابی ان کی جیب میں رہتی۔ اس خزانے میں سے بیوی بچوں کو کبھی کچھ نہیں ملا۔

ہم نے اپنی زندگی میں اپنے اس خالو کے علاوہ اور بھی بہت سے تہجد اور اشراق پڑھنے والے عبادت گزار دیکھے ہیں اور ہمارا خیال ہے کہ ایسے لوگ یا تو بہت منکسر المزاج اور عاجز بندوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں یا پھر انتہائی سنگدل اور خونخوار قسم کے لوگ بن جاتے ہیں۔ ہمارا تجربہ تو یہی ہے کہ ایسے لوگوں کا زیادہ تر تعلق مؤخر الذکر قسم کے افراد سے ہوتا ہے خیر ذکران خالو صاحب کا یوں آیا کہ قیام پاکستان کے وقت 1947ء میں جب ہم تین ماہ کے لیے نکو درکیمپ میں نئے ملک پاکستان آنے کے انتظار میں مجبوراً مقیم تھے وہاں ہر چیز کی کمی تھی۔ ہم لوگ چونکہ گھروں سے بھاگ کر آئے تھے اس لیے تن کے کپڑوں کے سوا کپڑے، بستر اور کوئی دوسرا سامان ہمارے پاس نہیں تھا۔ زمین پر سوتے تھے اور کسی نہ کسی طرح روکھی سوکھی کھا کر گزارہ کر رہے تھے جس دن ہری مرچیں مل جاتیں اور ان کی چٹنی میسر آتی تو ہماری عید ہو جاتی مگر ایسا کبھی کبھار ہوتا۔ وہاں تو روٹی کے لالے پڑے رہتے تھے اس لیے آٹا اور روٹی بڑے حساب اور راشن کے طریقے سے تقسیم ہوتی ہمارے یہ خالو دوپہر کے وقت کئی دن تک بڑے تو اتر سے ایسے وقت میں ہمارے ہاں پہنچتے جب ہم لوگ کھانا کھا رہے ہوتے، اس میلوں میں پھیلے ہوئے کیمپ میں ان کا قیام ہم سے کوئی دو میل کے فاصلے پر تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ ہم لوگوں کی خیر خیریت معلوم کرنے آتے ہیں مگر ان کے فلک شگاف السلام علیکم کے جواب میں جب ہم انہیں کھانے کی رسمی طور پر دعوت دیتے تو وہ بلا تامل شریک طعام ہو جاتے، کھانے کے بعد دعائے مانگتے اور ہم سب کو مخاطب کر کے کہتے ”دیکھو اللہ تعالیٰ نے دانے دانے پر مہر لگائی ہوئی ہے میں ادھر سے گزر رہا تھا آپ لوگوں کو دیکھنے کا خیال آیا تو آ گیا اس کھانے پر میری مہر

گئی ہوئی تھی اس لیے ادھر آنا ہو گیا۔“ جب یہ سلسلہ چھ سات روز پر پھیل گیا تو ایک روز ان کے روانہ ہونے کے بعد ہمارے خاندانی نوکر عنایت نے جو ہمیں بھائیوں کی طرح عزیز تھا، بڑے غصے سے کہا ”یہ خالو سردار علی شاہ مہر لگانے کے لیے خود روزانہ دو میل چل کر آتے ہیں اور کھانا کھا کر اس کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ پر ڈال دیتے ہیں یہ تو بڑی زیادتی کی بات ہے۔“ (حمید اختر ”پرسش احوال“ ص۔ 98)

نکو در کیمپ میں تین ہفتوں کے قیام کے بعد پاکستان جانے کی سبیل پیدا ہو گئی۔ اسی اثناء میں کیمپ کی گندی فضاء اور ناقص خوراک کے باعث پچیش کی بیماری پھیل گئی۔ اکثر لوگ اس موذی مرض کا شکار ہونے لگے جن میں ان کی تایازاد بہن فاطمہ بھی تھی۔ ماں باپ کی اکلوتی بیٹی ناز و نعم میں پلی ہوئی، نماز روزے کی پابند، نیک دل اور صاف ستھری خاتون بیوہ ہونے کے بعد اپنے بیٹے انور کا واحد سہارا۔ حمید اختر سے اپنی بہن کی حالت دیکھی نہ جاتی تھی۔ جان لیوا بیماری نے فاطمہ کو اس پریشانی میں مبتلا کر دیا تھا کہ اگر اس کا انتقال ہو گیا تو کیمپ میں غسل کا انتظام کیسے ہوگا اور کہیں وہ ناپاک حالت میں ہی دفن نہ کر دی جائے۔ وہ حمید اختر سے بار بار اپنی اس پریشانی کا ذکر کرتی اور ان سے وعدہ لیتی کہ جو بھی حالات ہوں اس کے انتقال کی صورت میں وہ اسے باقاعدہ غسل دلا کر دفن کریں گے۔ اس کی تسلی کے لیے حمید اختر وعدہ کر لیتے حالانکہ انہیں یقین نہیں تھا کہ ایسی صورت میں وہ وعدہ پورا بھی کر سکیں گے یا نہیں۔ حمید اختر سوچتے تھے کہ شاید وہ یہ نہ کر پائیں۔ اس لیے سب یہی دعا کرتے رہے کہ خدا سے صحت اور تندرستی دے تاکہ وہ پاکستان پہنچ کر نئے سرے سے اپنی زندگی کا آغاز کر سکے۔ اس کی بیماری پریشان کن ضرور تھی لیکن یہ توقع بھی نہیں تھی کہ وہ اسی وقت اپنی آخری سانس لے گی جب کیمپ سے قافلے کی پاکستان روانگی کا آغاز ہوگا۔

کیمپ میں آئے ہوئے حمید اختر اور ان کے خاندان کو بیس بائیس روز گزرے ہوں گے جب پاکستان سے بسوں اور ٹرکوں کا ایک کانوائے فوجی جوانوں کی حفاظت میں یہاں پہنچا تا کہ جتنے لوگوں کو یہاں سے نکال کر پاکستان پہنچایا جا سکتا ہے پہنچایا جائے۔ اس کانوائے کیساتھ حمید اختر کے بھائی اصغر علی مرحوم بھی تھے۔ انہوں نے حمید اختر اور خاندان کے دوسرے لوگوں کو ڈھونڈ نکالا۔ وہ پاکستان میں یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ تمام خواتین ماری جا چکی ہیں۔ وہ چونکہ پہلے ہی پاکستان جا چکے تھے اس لیے انہیں حمید اختر کے گاؤں پہنچنے کی اطلاع بھی نہیں تھی۔ بہر حال وہ ایک موہوم امید کے ساتھ کانوائے کے ساتھ یہاں پہنچے تھے۔ خاندان کی عورتیں بچے، حمید اختر اور ان کے بھائی کسی طرح بس میں سوار ہو گئے۔

جن لوگوں کے پاس سامان تھا وہ وہیں پھینک دیا کیونکہ کانوائے ”انسانوں کو لے جانے کے لیے آئے تھے“ سامان لے جانے کے لیے نہیں، ”ایسا لگتا تھا کہ حمید اختر تمام بچے اور خواتین ان کی تایازاد بہن سمیت اب پاکستان پہنچ ہی

جائیں گے۔ فاطمہ کو بھی سب کے ساتھ بس میں بٹھایا جا چکا تھا کہ وہ المیہ رونما ہو گیا جس کے بارے میں حمید اختر سوچ رہے ہوں گے کہ ٹل گیا۔ شاید انہوں نے سوچا ہو کہ اب ان کی بہن پاکستان جا کر اپنی نئی زندگی کا آغاز کر سکے گی۔ لیکن۔۔۔۔

”یہ قافلہ روانہ ہونے ہی والا تھا۔ بس سٹارٹ بھی ہو چکی تھی کہ اچانک آواز آئی یہ تو مر گئی ہے۔ اسے اتارو ہم مردے پاکستان نہیں لیجا سکتے یہ بس زندہ لوگوں کو وہاں سے لانے کے لیے بھیجی گئی ہے، مردوں کے لیے نہیں۔ میں نے جلدی سے اٹھ کر دیکھا، میری بیمار بہن فاطمہ کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی تھی، نئے وطن کی طرف ہجرت کے ارادے سے بس میں سوار ہونے تک اس کی سانس کسی نہ کسی طرح چلتی رہی لیکن سفر شروع ہونے سے پہلے ہی اس نے اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کردی اور یوں اس کے جسم نے اپنے پرانے وطن سے علیحدگی اختیار کرنے سے انکار کر دیا۔ اسے پاکستان جانا نصیب نہ ہو سکا۔ ڈرائیور اور کنڈیکٹر نے اس کے خاکی اور بے جان جسم کو اٹھا کر بس کے دروازے کے سامنے زمین پر لٹا دیا اور ہم نے ایک چادر سے اس کا جسم ڈھانپ دیا۔ نازوں سے پٹی ہوئی ایک نامور اور بڑے خاندان کی یہ اکلوتی اولاد فرشِ خاک پر پڑی ہوئی تھی اور اس کے اپنے اہل خاندان کے ارکان کے سوا کسی کو اس کی طرف نگاہ ڈالنے کی بھی فرصت نہ تھی۔ لوگ اسی طرح بسوں اور ٹرکوں میں چڑھنے کے لیے دھکم پیل کر رہے تھے، ڈرائیور اسی طرح ان کا سامان اٹھا اٹھا کر باہر پھینک رہے تھے، میں سر جھکائے اس لاش کے پاس بیٹھا تھا کہ میرے بھائی نے مجھ سے کہا۔ بہتر ہے ہم اسے اللہ کے حوالے کر کے یہاں سے روانہ ہوں، اب ہم اور کر ہی کیا سکتے ہیں۔ جب میں نے ان سے اپنا وعدہ پورا کرنے کے لیے وہاں رکنے کی بات کی تو انہوں نے کہا تم بہت مصیبتیں اٹھا چکے ہو، فاطمہ سے جو وعدہ تم نے کیا تھا وہ میں پورا کرنے کے لیے رک جاتا ہوں تم اپنی بہنوں اور بچوں کے ساتھ لاہور جانے کے لیے بس میں بیٹھ جاؤ مگر میں نے ان کی سرکاری ملازمت کی وجہ سے ان کی یہ پیشکش قبول نہ کی اور زبردستی انہیں بس میں بٹھا کر خود وہیں جمارہا۔ بسیں اب حرکت کر رہی تھیں اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ پورا قافلہ کھیٹوں سے نکل کر مہیت پور ٹکوردور کی پختہ سٹرک پر لاہور روانگی کے لیے تیار کھڑا نظر آیا۔

تھوڑی ہی دیر میں بسیں اور ٹرک فوجی جوانوں کی حفاظت میں وہاں سے روانہ ہو کر عازم پاکستان ہو گئے۔ کھلے کھیت میں جہاں کچھ دیر پہلے بسیں اور ٹرک کھڑے تھے اور انسانوں کا ایک جھوم ان پر سوار ہونے کے لیے سردھڑکی بازی لگائے ہوئے تھا، اب بے شمار ٹرک، پیپے پوٹلیاں اور کچھ دوسرا سامان بکھرا ہوا پڑا تھا جس کے درمیان ایک بے بس خاتون کی لاش اور ایک بدنصیب بھائی بیٹھا تھا۔ جس کے لیے یہ گویا دنیا کی آخری حد آگئی تھی اور جس کی نگاہ میں زندگی بے معنی

رہ چکی تھی، خلا میں گھورتے ہوئے میں سڑک پر جاتی بسیں اور ان کے پیچھے پیچھے بھاگتے ہوئے انسانوں کا ہجوم دیکھتا رہا، ایک اطمینان البتہ ضرور تھا کہ اب مجھ پر اس بہن کی لاش کو کفنہانے دفنانے کے سوا اور کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ میں جن خواتین اور بچوں کی زندگی اور حفاظت پر مامور تھا اب ان کی ذمہ داری سے فارغ ہوں، صرف اپنی جان ہے جس کی حفاظت کی مجھے چنداں پروا نہیں تھی یہ سوچتے سوچتے اور آخری بس نظروں سے اوجھل ہونے کے بعد جب میں نے اپنے آس پاس نظر دوڑائی تو مکئی گنے اور مرچوں کے کھیتوں میں جا بجا نیلی پگڑیاں نظر آئیں، غور سے دیکھا تو بے شمار ٹہنگ سکھ ہاتھوں میں تلواریں اور نیزے بھالے لیے ہوئے ان کھیتوں میں چھپے ہوئے دکھائی دیئے، وہ غالباً کانوائے کے ساتھ فوجی جوانوں کے نظروں سے اوجھل ہونے کا انتظار کر رہے تھے، جس کے بعد اس میدان میں پڑی ہوئی سامان کی ہزاروں پوٹلیاں اور ٹریک اور کنستروں وغیرہ پر ان کی نظر تھی، میرا فوری رد عمل یہی تھا کہ اس لوٹ مار میں ازراہ تفنن ہی ان میں سے کوئی ایک میرے پیٹ میں خنجر گھونپنے سے گریز نہیں کرے گا۔ ایک لمحے کے لیے میں نے یہ ضرور سوچا کہ مجھے یہاں نہیں رکنا چاہیے تھا اور کانوائے کے ساتھ ہی چلا جانا چاہیے تھا مگر دوسرے ہی لمحے میں نے اس خیال کو دل سے نکال دیا اور فیصلہ کر لیا کہ میری موت شاید اسی طرح لکھی تھی، چنانچہ جب کھیتوں میں چھپے ہوئے سکھ صاحبان آہستہ آہستہ چاروں طرف سے اس میدان کی طرف بڑھے۔ آنکھیں بند کر کے میں نے کلمہ پڑھا۔ اپنے گناہوں کی معافی مانگی اور اپنے اوپر ہونے والے حملے کا انتظار کرنے لگا۔ (حمید اختر ”احوال واقعی“ صفحات 356-357)

”میں کچھ دیر شاید دس پندرہ منٹ ایسے ہی آنکھیں بند کیے تلوار کی کاٹ یا بھالے کی نوک کے انتظار میں لاش کے سامنے بیٹھا رہا مگر یہ عرصہ صدیوں پر محیط محسوس ہوا، گھر سے اجڑا ہوا ایک انسان جب موت کے سامنے تنہا بیٹھا ہو اور جب ایک عزیز کی لاش کو سنبھالنا اس کا مقصد حیات ہو، اس وقت وہ کیا کچھ محسوس کرتا، یہ وہی جانتا ہے جو ایسے حالات میں پھنسا ہو، میرے سامنے بھی ان چند لمحات میں گزری ہوئی زندگی کی ہزاروں جھلکیاں آنکھوں کے سامنے گھوم گئیں، کتنے ہی حسین اور پیارے چہرے بجلی کی چمک کی طرح تصور میں لہرائے، کتنی ہی بیتی رتوں اور کتنے ہی جسموں کے کجخت دل آویز خطوط نظروں میں سامنے ہوئے محسوس ہوئے۔“ (حمید اختر ”احوال واقعی“ صفحات 357-358)

کڑی آزمائش کے لمحے گزرے۔ اب سرخرو ہونے کا وقت تھا۔ اپنی مرحومہ بہن سے کیا ہوا وعدہ اس طرح وفا ہوا کہ وہ سوچ بھی نہ سکتے تھے۔

”کچھ دیر تک میرے ارد گرد سامان سمیٹنے کا عمل جاری تھا، مجھے اس کام میں مصروف سکھوں کے جتھوں کی آوازیں بھی آرہی تھیں، پھر خاموشی چھا گئی، میں اپنے جسم پر جس حملے کا انتظار کر رہا تھا وہ نہ ہوا تو میں نے آہستہ آہستہ

آنکھیں کھول دیں۔ دیکھا تو میدان صاف تھا یعنی میرے اور فاطمہ کی لاش کے سوا وہاں کچھ نہیں تھا۔ سائیکل پر گزرتے ہوئے ایک نیک دل انسان کے ذریعے میں نے اپنے گاؤں کے لوگوں تک یہ پیغام پہنچایا کہ حیدر علی شاہ کی بیٹی فاطمہ فوت ہو گئی ہے۔ اس کے کفن دفن کے انتظام کے لیے لوگوں کی مدد کی ضرورت ہے۔ حیرت کی بات تھی مگر یہ حقیقت ہے کہ ایک گھنٹے کے اندر اندر ہمارے گاؤں کے چار پانچ سو مردوزن کیمپ سے وہاں پہنچ گئے۔ ان میں گاؤں کے مولوی صاحب بھی تھے اور ان کے گھر کی خواتین بھی جو مستورات کے غسل کا اہتمام کرتی تھیں۔ گاؤں کے نوجوان لڑکوں نے سارا انتظام سنبھال لیا۔ معلوم نہیں کہاں سے وہ بالٹیاں اور تختے بھی ڈھونڈ کر اٹھالائے۔ تین لوگوں نے کھدر کے کفن پیش کر دیئے کہ یہ انہوں نے اپنے لیے سنبھال کر رکھے تھے۔ قبر کھودی جا چکی تھی مولوی صاحب کے گھر کی خواتین نے فاطمہ کو غسل دیا اور نماز جنازہ کے بعد ہم نے اس لاش کو نکودر کی خاک کا رزق بنانے کے لیے لحد میں اتار دیا۔ میرے دل پر نامساعد حالات اور غیر یقینی مستقبل کا بوجھ ضرور موجود تھا مگر اپنا وعدہ پورا کرنے پر میں خوش بھی بہت تھا۔ مجھے اپنے اس فیصلے پر نہ اس وقت افسوس ہوا اور نہ بعد کے دو مہینوں کی کیمپ میں گزرنے والی اذیت ناک تکلیفوں کا سامنا کرتے ہوئے کبھی مجھے پچھتاوا ہوا۔ خطرناک اور گھمبیر صورتحال کا مقابلہ کرتے ہوئے میں نے اس کے بعد اپنے آپ کو آزاد اور ہلکا پھلکا محسوس کیا کہ اب مجھ پر اپنی جان ناتواں کے بوجھ کے سوا کوئی اور بوجھ نہ تھا۔ (حمید اختر ”احوال واقعی“ ص 358)

کھلے آسمان تلے موسم اور بیماریاں اپنا کھیل کھیل رہے تھے۔

”مختلف قسم کی بیماریوں بلکہ وباؤں نے لوگوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا، پچیس اور بخار کے بڑھتے ہوئے زور کے باوجود ان بیماریوں کے تدارک کی کوئی صورت نہ تھی۔ کسی کے پاس نہ کوئی دوا تھی اور نہ دوا کے حصول کا کوئی ذریعہ موجود تھا۔ علاج معالجے کی کوئی سہولت نہ ہونے کی وجہ سے لوگ روزانہ خاصی بڑی تعداد میں مرنے لگے ہفتوں سے اپنے انخلاء کا انتظار کرنے کے باوجود اس مدت میں نہ تو کوئی کانوائے آیا اور نہ نکودر سٹیشن تک کوئی ریل گاڑی نکودر کیمپ کے پناہ گزینوں کو لینے آئی۔ معلوم یہی ہو رہا تھا کہ باہر کی دنیا ہمیں بھول چکی ہے اور اب ہم سب کو یہیں ختم ہونا ہے اس پاس اب زندہ لوگوں سے زیادہ بھری ہوئی قبریں نظر آرہی تھیں اس لیے کہ وہاں کوئی باقاعدہ قبرستان تو تھا نہیں۔ مرنے والوں کو وہیں اپنے پاس ہی قبر کھود کر دفنایا جاتا۔ چار پانچ ہفتوں کے بعد قبروں کی بڑھتی ہوئی تعداد خاصا دہشت ناک منظر پیش کر رہی تھی۔“ (حمید اختر ”احوال واقعی“ ص 359)

نومبر ختم ہو رہا تھا جب بسوں اور ٹرکوں کا ایک بھولا بھٹکا کانوائے نکودر پہنچا۔ حمید اختر راستے میں لاشیں عبور کرتے اگلے روز دوپہر تک لاہور پہنچ گئے جہاں ان کی موت کی اطلاع ان سے پہلے پہنچی ہوئی تھی۔ وہ سیدھے مکتبہ واردو

ہیں۔ چوہدری نذیر احمد کے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ ان کے پاس حمید اختر کی جوانمرگی پر رضیہ سجاد ظہیر اور کرشن چندر کے تعزیتی خط پہنچ چکے تھے۔ ہندوستان کے کسی اخبار میں ان کے انتقال کی خبر شائع ہونے کے بعد ”اُردو کے جواں سال ابھرتے ہوئے ترقی پسند افسانہ نگار کے فسادات“ میں مارے جانے پر دونوں ملکوں کی ترقی پسند تحریک میں صفِ ماتم بچھی ہوئی تھی۔ ایسے میں حمید اختر اچانک لاہور کے افق پر نمودار ہوئے۔ جوانمرگی اور جوان مردی میں بس اتنا ہی فاصلہ ہوتا ہے کہ مرنے والے نے اپنے بارے میں تعزیتی خطوط بہ نفسِ نفیس پڑھے۔ اگلے ماہ دسمبر 1947ء میں نکلور کمپ کی کہانی بھی تمام ہوئی جب خود اپنے پیاروں کی قبروں کے درمیان پھنسے ہوئے لوگوں کو پیشکش ٹرینوں کے ذریعے نکال لیا گیا۔۔۔ لیکن کیا کہانی سچ سچ تمام ہوگئی؟ نکلور کمپ حمید اختر کی روح کے نہاں خانے میں ہی نہیں بلکہ ان کی تحریروں میں بھی امر ہو چکا ہے۔



لاہور: حمید اختر اور دیگر مہاجرین احباب

تحریر: کاظم خان 15 جولائی 2011ء

لاہور میں اپنی آمد اور یہاں کے حالات کے متعلق حمید اختر کہتے ہیں۔

”آزادی کی صبح ایسی خونچکاں داستانون کے جلو میں طلوع ہوئی تھی کہ پنجاب خون کے دریا میں ڈوبا ہوا تھا۔ لاکھوں افراد اپنے گھروں سے محروم ہو چکے تھے اور خلق خدا خوار و زبون دھکے کھا رہی تھی۔ میں دو تین ماہ ادھر ادھر گھومنے پھرنے اور خاصی دیر تک بیمار رہنے کے بعد منگلگری میں اپنی بہن کے ہاں جا کر بیٹھ گیا۔ گھر حاصل کرنے یا الاٹمنٹ کی لوٹ مار میں شامل ہونے کو دل نہیں مانتا تھا۔ خیال تھا کہ منگلگری جیسے خاموش پرسکون اور چھوٹے سے شہر میں زندگی کے باقی دن گزار دیں گے۔ منگلگری میں ان دنوں آج کے معروف شاعر منیر نیازی آٹا پینے کی چکی لگائے ہوئے تھے۔ اس سے دوستی ہو گئی، محمود اختر کیانی اور استاد قمر کے ساتھ ہمارا ایک حلقہ احباب بھی بن گیا جہاں شعر و شاعری اور ادب پر باتیں ہوتی رہتیں۔“ (حمید اختر ”آشنائیاں کیا کیا“ ص 21۔)

اس دوران ترقی پسند شاعر اور ادیب آہستہ آہستہ لاہور میں جمع ہو رہے تھے۔ بہت سے ساتھی پہلے سے لاہور میں موجود تھے لیکن امرتسر سے دہلی تک اور ممبئی سے کافی تعداد میں ترقی پسند قلم کار لاہور پہنچ چکے تھے۔ ساحر حمید اختر سے دو ماہ پہلے ستمبر میں لاہور پہنچ چکے تھے۔ وہ دہلی سے بذریعہ ہوائی جہاز لاہور آئے تھے

یہ ایک مختلف ساحر تھا۔ انقلابی گھن گرج سے خالی لگا ہوا، فریادی، نوحہ گناں۔ یقیناً وہ اس کرب سے بھی گزر رہا

ہوگا کہ اس نے اپنے بچپن کے ساتھی اور دوست حمید اختر کو کھو دیا ہے۔ کرشن چندر اور سجاد ظہیر کے تعزیتی خط نذیر احمد چودھری کی میز پر پڑے تھے اور وہ وہیں بیٹھا سویرا کی ادارت کر رہا تھا۔

حمید اختر اس سارے عرصے میں ساحر اور اس کی سرگرمیوں سے آگاہ نہیں رہے تھے۔ پھر جب ملاقات ہوئی تو حمید اختر نکوڈر کمپ کے خوفناک تجربے کی گرفت میں تھے۔ اور مختلف شہروں میں بھٹکنے کے بعد لاہور پہنچے تھے۔ ساحر بھی اس دوران اکھڑے اکھڑے سے رہے تھے۔ فسادات کے اثرات مالی عدم استحکام ایسے میں حمید اختر کی واپسی ساحر کے لیے کسی حد تک تقویت کا باعث تھی۔ چالیس پچاس روپے ماہوار 'سویرا' کی ادارت سے مل جاتے تھے۔ حمید اختر اور ساحر نے ایبٹ روڈ پر ایک مکان الاٹ کر لیا تھا جہاں ساحر اس کی امی اور حمید اختر اکٹھے رہتے تھے۔

ابراہیم جلیس بھی حیدرآباد دکن سے ممبئی اور کراچی ہوتے ہوئے لاہور وارد ہو چکے تھے اور حمید اختر کی تلاش میں تھے۔ وہ کسی طرح احمد ندیم قاسمی اور ہاجرہ مسرور تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے اور۔۔۔۔۔ باقی کہانی 'خود ابراہیم جلیس کی زبانی سنتے ہیں:

ہاجرہ بہن اور قاسمی صاحب نے کہا:

”آپ ہوٹل میں کیوں ٹھہرے ہیں؟ آپ کو سیدھا ہمارے پاس آنا چاہیے تھا۔ آپ نے ہمیں شرمندہ کیا

ہے۔“

میں نے جواب دیا

”آپ دونوں میرے مقابلہ میں بہت معمولی فن کار ہیں اس لیے میں اپنی حیثیت اور مرتبے کے فن کاروں کا

مہمان رہنا چاہتا ہوں۔ اس لیے مجھے حمید اختر یا 'ابن انشاء' کی کوٹھیوں کا پتہ بتا دیجیے۔“

قاسمی صاحب نے اپنی مخصوص اور دل نشیں مسکراہٹ میں جواب دیا:

”مجھے ان دونوں عظیم المرتبت فن کاروں کی کوٹھیوں کا پتہ تو نہیں معلوم لیکن پتہ تو بہر حال پتہ ہوتا ہے یعنی کسی نہ

کسی طرح کہیں نہ کہیں کبھی مل ہی جاتا ہے اس لیے آئیے چلیں!“

پتہ چل گیا تھا۔ چائے پی کر ہم 'اوڈین سینما' کے سامنے ایک چینی گڈا کے سامنے کھڑے تھے۔ قاسمی صاحب

نے دستک دی۔ اندر سے ایک دبلا پتلا عینک پوش 'کنفیوشس' باہر نکلا۔

وہ کنفیوشس نہیں تھا۔ 'ابن انشاء' تھا۔ وہ گڈا نہیں تھا۔ 'ابن انشاء' کا گھر تھا جو بقول قاسمی صاحب اتنا پور ٹیبل تھا

کہ اسے چور چور اسکتا ہے یا وہ با آسانی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جاسکتا ہے۔

وہ مکان بہت چھوٹا سہی لیکن میرے لیے لاہور اتنا بڑا تھا یعنی اس میں میرے لیے سر چھپانے اور زندہ رہنے کے لیے جگہ تھی۔ چنانچہ میں ہوٹل سے اپنا سامان وہاں لے آیا۔ اس کے بعد ہم حمید اختر کی تلاش میں نکلے۔ سارے لاہور میں حمید اختر ہی ایک لاپتہ آدمی ہے یعنی لاہور کے ہر ترقی پسند دوست کو یہی شکایت ہے کہ حمید اختر کا پتہ جتنی آسانی سے مل سکتا ہے حمید اختر اتنی آسانی سے نہیں مل سکتا۔

چھ بجے کے قریب ہم حمید اختر سے نہیں بلکہ حمید اختر کے پتے سے مل کر لوٹ آئے۔“ (ابراہیم جلیس ”ایک ملک دو کہانی“ نیا ادارہ لاہور ص 144-146)

ابراہیم جلیس لاہور میں

غالباً حمید اختر ان دنوں یا بیمار تھے یا پھر منگمری میں تھے وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے ہفتہ وار اجلاسوں میں بھی دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ وہ 5 دسمبر 1947 کی وائی ایم سی اے لاہور میں منعقد ہونے والی مقامی ترقی پسند کانفرنس میں بھی شریک نہیں تھے جس کی صدارت عبدالمجید سالک نے کی تھی اور ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر سے منسوب معرکے کی گونج دیر تک سنائی دیتی رہی تھی۔

ابراہیم جلیس پہلے ہی روز انجمن کی گرفت میں آگئے تھے۔ گرفت میں یوں کہ حیدرآباد دکن میں وہ اپنے ترقی پسند قافلے سے بھٹک کر حیدرآباد کی آزاد مملکت اسلامپہ کے لیے جہاد کرتے رہے تھے لیکن پھر ممبئی پہنچ کر اپنے قافلے میں واپس آگئے تھے۔ لیکن ہنسوڑ اور خوش مزاج ابراہیم جلیس کے دل و دماغ پر اپنے شرمناک ماضی کا خاصہ بوجھ تھا اور وہ حمید اختر اور ابن انشاء کے علاوہ اپنے ترقی پسند ساتھیوں کا سامنا کرتے ہوئے گھبراتے تھے۔

”لوجی! آج ہی میں لاہور آیا اور آج ہی ترقی پسند مصنفین کا اجلاس بھی ہے۔۔۔ میں اپنا غیر ترقی پسند وجود وہاں لے جانا نہیں چاہتا تھا لیکن قاسمی صاحب نے وعدہ کیا کہ وہاں وہ کسی سے میرا تعارف نہیں کرائیں گے۔

وائی ایم سی اے ہال میں پہنچتے ہی میرے قدم رک گئے کیونکہ سامنے میرا بھئی کا دوست محمد صفدر صدر بنا بیٹھا تھا۔ صفدر کے نام سے صرف۔۔۔ ف۔۔۔ کے گر جانے سے اس کی شخصیت کتنی بلند ہوگئی تھی! صفدر سے بچنے کے لیے میں قاسمی صاحب کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گیا۔

زہیر صدیقی صاحب نے اقبال کی شاعری کے رجعت پسندانہ پہلوؤں پر مقالہ پڑھا تھا اور آغا شورش کاشمیری بڑے برہم ہو کر جوابی تقریر کر رہے تھے۔۔۔ اور میں صفدر کی بڑی بڑی خوف ناک آنکھوں سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن بچ نہ سکا۔ اجلاس کے بعد سارے یاران ترقی پسند اس رجعت پسندی اور اس فرقہ پرستی کو دیکھنے ابن انشاء

کے چھوٹے سے دیوان خانے میں جمع ہو گئے تھے جو مملکت اسلامیہ حیدرآباد سے جان بچا کر مملکتِ خداداد پاکستان میں اپنی سانسوں طویل کرنے آئی تھی۔ محمد صفر مجھے دیکھتے ہی پکارا:

”ہیلو فاسٹ تم یہاں بھی آ گئے؟“

اس کے بعد دوسرے ترقی پسند ادیبوں سے تعارف شروع ہو گیا۔

آپ احمد راہی

یہ نذیر چوہدری

آپ عارف عبدالتین

مجھے سب سے مل کر بڑی ندامت ہو رہی تھی مگر میں نے سب سے یہی کہا:

”مجھے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی!“

اور میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ان میں عبد اللہ ملک کوئی نہیں ہے۔۔۔

لیکن ابھی خدا نے میرا شکر یہ قبول نہیں کیا تھا کہ ایک پچیس چھبیس سالہ خوش شکل نوجوان چاکلیٹ رنگ کے

سوٹ میں ملبوس اندر داخل ہوا اور بغیر کسی تعارف کے میری طرف ہاتھ بڑھا کر بولا:

”قبلہ جلیس صاحب مجھے عبد اللہ ملک کہتے ہیں!“

میرا آگے بڑھا ہوا ہاتھ ایک دم رک گیا۔ میں پریشان ہو گیا اور بولا:

”اوہ۔۔۔ آپ۔۔۔ یعنی۔۔۔۔۔“

عبد اللہ ملک نے فوراً کہا:

”یعنی میں عبد اللہ ملک۔۔۔۔۔“

میں اور زیادہ پریشان ہو گیا اور سب ہنس پڑے۔ میری خوش قسمتی کہ بہت جلد سارے پنجابڑوں نے ”اسی تسی“ شروع کر دی اور میں ایک سگریٹ جلا کر اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا۔ (ابراہیم جلیس ”ایک ملک دو کہانی“)

ابراہیم جلیس نے جلد ہی حمید اختر کو ڈھونڈ لیا، بالکل ڈرامائی انداز میں:

”میں لاہور کی سڑکوں پر گھومتا رہا۔ لاہور وسیع ہونے لگا۔ لاہور میرے لیے اجنبی نہیں رہا۔ لاہور پھیلنے لگا اور

پھیلتے ہوئے لاہور ایک الجھی ہوئی گلی میں ایک خوانچے والے کے پاس حمید اختر کھڑا کیلا کھا رہا تھا۔ احمد راہی جو انجمن ترقی

پسند مصنفین کالاؤڈ سپیکر ہے اپنی مخصوص گونجیلی آواز میں کہا:

لو بھی ابراہیم جلیس۔۔۔ یہ حمید اختر کھڑا ہے۔

میں حمید اختر سے لپٹ گیا۔ ممبئی میں ایک سال تک اکٹھے رہنے کے بعد ہم جیسے ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے پھڑ گئے تھے دوبارہ ملنے کی کوئی امید نہیں تھی کیونکہ پنجاب کے ٹکڑے ہو گئے تھے اور حیدرآباد اجڑ گیا تھا۔ مگر ہم پھر ملے۔ رات حمید اختر نے اپنے ایک لارڈ فرینڈ عبدالرحیم کے گھر میرا انتظام کر دیا۔ میں رات عبدالرحیم کے گھر شفٹ ہو گیا۔ رحیم کا گھر گویا مہاجرین کمپ ہے۔ رحیم کا گھر گویا پاکستان ہے جس میں سب مہاجر رہتے ہیں ایک حمید اختر جو مشرقی پنجاب سے آیا ہے دوسرا راشد حسن جو لکھنؤ سے ہجرت کر کے آیا ہے تیسرا میں جو حیدرآباد دکن سے بھاگ آیا ہوں۔۔۔۔۔ چوتھا ہمارا ملازم شیر علی جو نوشہرہ کشمیر کا خانماں برباد ہے۔

ہم چاروں میں ایک ہی چیز مشترک ہے۔۔۔۔۔ زندگی کا درد۔۔۔ ہم چاروں مشرقی پنجاب، یوپی، حیدرآباد دکن اور کشمیر سے اپنے ساتھ کچھ نہیں لائے۔ صرف بڑے بڑے بھیانک ماضی ساتھ لائے ہیں جو قدم قدم پر ہمیں زندگی سے اور دنیا کے مستقبل سے مایوس کر دیتے ہیں۔ اس مایوسی میں صرف حمید اختر چٹان کی طرح کھڑا ہے۔ لدھیانے سے لاہور تک انسانی خون کی کئی ندیاں عبور کرنے کے باوجود اس نے اپنا ذہنی توازن نہیں کھویا۔ وہ ہماری طرح اب پلٹ کر ماضی کی طرف کبھی دیکھتا بھی نہیں بلکہ اس کی آنکھیں ہمیشہ مستقبل کی طرف گھورتی رہتی ہیں۔۔۔۔۔ وہ آنے والی دنیا اور آنے والے آدم کو دیکھ رہا ہے وہ کہتا ہے ”بورژوائی نظام صرف کہہ رہا ہے صرف دھند ہے جو نئی دنیا کو نظروں سے اوجھل کیے ہوئے ہے۔ ہم اپنی نظروں کی گرمی سے اس دھند کو اس کہہ رہے کو ہٹا دیں گے۔۔۔ اور ہمیں ماسکو کی عمارتوں کی چھتیں، گنبد، مینار اور کنگرے نظر آئیں گے۔۔۔ ماسکو صرف روس کا دارالخلافہ نہیں بلکہ انسانوں کی بستی کا نام ہے، ماسکو ایک سہل ہے!“ (“ایک ملک دو کہانی“، ابراہیم جلیس ص 55-154)

سنت نگر کے اس گھر میں حمید اختر اور ابراہیم جلیس سال ڈیڑھ سال اکٹھے رہے۔ ممبئی میں بھی وہ اکٹھے رہے تھے اور وہاں دوستی اور تعلق کی جو بنیاد پڑی تھی وہ ملاقات دوسرے دور یعنی لاہور میں اور گہری ہو گئی۔ ابتداء میں جب حمید اختر، کمیونسٹ پارٹی سے (ممبئی کے بعد) دوبارہ وابستہ ہوئے تو ہول ٹائمر کے طور پر انہیں تیس روپے ماہانہ ملتے تھے ابراہیم جلیس بیروزگار تھے۔ غیر سیاسی ہونے کے ناتے وہ پارٹی سے بھی باہر تھے اس لیے ایک طرح سے دونوں کو تیس روپوں میں گزارا کرنا پڑا۔ مکان کا کوئی کرایہ نہیں تھا۔ ان دنوں کو یاد کرتے ہوئے حمید اختر بتاتے ہیں:

جلیس کو باقاعدہ اور بھرپور ناشتہ کرنے کی عادت تھی، میں ان دنوں ایسی عیاشیوں کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا، ناشتہ تو دور کی بات ہے دو دو وقت بغیر کھانا کھائے گزر جاتے تھے، جلیس کے آنے تک میں صبح ایک پیالی چائے پی کر جو سامنے

کے گھر میں مقیم ایک مہربان بڑھاتیار کر دیتا تھا، صبح سویرے گھر سے نکل جاتا تھا مگر اس کے اصرار پر میں نے ناشتہ کے لیے دو باقر خائیاں منگوانا شروع کر دیں، اس نے اسی کو غنیمت سمجھا مگر دو ایک روز بعد وہ ناشتے سے ایک گھنٹہ بعد پکارنے لگتا۔ ”حمید اختر یہ باقر خاں کب تک ساتھ دے گا، اب کچھ کھانے پینے کا بندوبست بھی کرو۔“

سنت مگر سے ہم دوپہر کو نکلتے تو کھانے کی تلاش میں ابن انشاء کے گھر ایبٹ روڈ پر پہنچ جاتے۔ وہاں انشاء کا پورا گھر انہماک سے ہمارا استقبال کرتا گویا ہم ان پر کوئی احسان کر رہے ہیں۔ یہ سلسلہ مہینوں تک چلتا رہا۔ اگر ہم کسی روز لیٹ پہنچتے تو گھر کے بزرگ اس وقت تک بھوکے بیٹھے ہوئے نظر آتے، رات کا کھانا ہم لوگ بالعموم رتن چند روڈ پر واقع فیض الحسن چودھری کے گھر کھاتے، فیض الحسن اور جلیس کے درمیان بحث و تکرار بلکہ جھگڑے اس طرح ہوتے جس طرح بمبئی میں ساحر اور جلیس جھگڑتے تھے، مطلب محض جملہ بازی سے ہوتا، فیض الحسن جلیس کو ریاستی باشندہ قرار دیتا، جلیس فیض الحسن کو جسمانی کمزوریوں کو نشانہ بناتا تو فیض الحسن غصے میں آ کر اسے کول دراوڑ، بھیل اور منگول نسل سے متعلق قرار دیتا۔ یہ بحثیں روز چلتیں۔ ایک دوسرے کی کمزوریوں کو نشانہ بنایا جاتا مگر مقصد محض وقت گزاری اور دل لگی ہوتا۔ کسی کو تنگ کرنا یا زک پہنچانا نہ تو بات کرنے والے کے ذہن میں ہوتا اور نہ سننے والا اسے ان معنوں میں لیتا۔ ہم لڑ جھگڑ کر دوسرے روز پھر کھانا کھانے کے لیے فیض کے گھر پہنچ جاتے، کسی روز پیسے ہوتے اور ہم بازار سے کھانا کھا لیتے تو فیض الحسن آدھی رات تک ہمارا انتظار کرتا، چھوٹے بھائی کو ہمارے اڈوں پر ہماری تلاش میں بھیجتا۔ کیسے اچھے دن تھے اور کیا سنہری زمانہ تھا جب ہم سب ایک دوسرے کے درد آشنا اور مزاج شناس تھے۔ ہم نے اس زمانے میں کبھی الاٹمنٹ کرانے یا کوئی کاروبار کرنے کے متعلق غور تک نہیں کیا، نہ میں نے نہ جلیس نے بس ہم اپنی ہی دھن میں لگے ہوئے تھے، دنیا کو بنانے سنوارنے اور خلق خدا کو عذابوں سے نجات دلانے کی دھن۔ رات کو دس گیارہ بجے تک فیض الحسن کے گھر گیس لگاتے اور پھر ہم دونوں سائیکل پر ڈبلنگ کرتے ہوئے سنت نگر اپنے گھر پہنچ جاتے۔ گرمیوں میں ہم اس دو منزلہ مکان کی چھت پر سوتے اور رات رات بھر ہنستے کھیلتے رہتے۔ ہمارے پاس کوئی اثاثہ نہیں تھا، میں بھی اور جلیس بھی اپنے آبائی گھروں اور پرانی شناختوں سے محروم ہو چکے تھے۔ بظاہر ہمارا کوئی ذاتی دنیاوی مستقبل بھی سامنے نہیں تھا لیکن اس کی فکر کس کو تھی، ہمیں تو ایک جہان نو تعمیر کرنا تھا اپنے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی۔ (حمید اختر ”آشنائیاں کیا کیا“ ص-21)

اپنے پہلے قیام کراچی (7-1962ء) کے دوران میں ابراہیم جلیس کے مداح کے طور پر بزنس روڈ کراچی پر واقع روزنامہ ”جنگ“ کے دفتر انہیں ملنے جایا کرتا تھا۔ مجھے یاد ہے، پہلی بار 1963ء میں انہیں ملنے گیا۔ میں اس وقت بمشکل اٹھارہ سال کا تھا۔ ساحر اور فیض کا عاشق، ابراہیم جلیس اور ابن انشاء کا مداح۔ ”جنگ“ میں ابراہیم جلیس ”وغیرہ

وغیرہ“ کے عنوان سے روزانہ ایک کالم لکھا کرتے تھے لیکن میں ایک دوسرے چکر میں ان کے پاس جایا کرتا تھا۔ اپنے سکول کے دنوں میں اپنے محلے کی آنہ لاجبیری سے میں نے دو کتابیں لے کر پڑھیں۔ ابراہیم جلیس کی ”ایک ملک دو کہانی“ اور فکر تو نسوی کی ’چھٹا دریا‘۔ تیسری کتاب جو مجھے سکول کے شعری مقابلے میں انعام کے طور پر ملی تھی وہ ساحر کی ”تلخیاں“ تھیں۔۔۔۔۔ یہ تینوں کتابیں مجھے اس طرح لڑیں کہ اب جب زندگی کی شام ہونے کو ہے یہ کتابیں ہر وقت میرے ارد گرد رہتی ہیں۔ دوسری بار جب میں انہیں ملا تو تب بھی ان کتابوں کا ذکر کرنے کی مجھے ہمت نہ ہوئی۔ شاید یہ میری عمر سے بڑی بات ہوتی۔ انہوں نے کسی بات پر قہقہہ لگایا اور بولے:

”بھئی! ہم بھی آپ کے پنجاب میں بہت دن رہے ہیں“

میں نے جھجکتے شرماتے ہوئے کہا:

”جی ہاں، آپ کے 48-1947ء کے لاہور کے شب و روز مجھے بھی یاد ہیں“

”یاد ہیں؟“ اس بار سچ سچ انہوں نے فلک شگاف قہقہہ لگایا اور میری طرف غور سے دیکھا۔

میں نے گھبرا کر کہا ”میرا مطلب ہے آپ کی کتاب ’ایک ملک دو کہانی‘ میں نے کئی بار پڑھی ہے۔“

”ارے ارے وہ کتاب تو میرے پاس بھی نہیں ہے۔ وہ تو بین ہو گئی تھی“

میں نے کہا ”جی ہاں، آپ کی کتاب اور فکر تو نسوی کی ’چھٹا دریا‘ دونوں ضبط ہو گئی تھیں۔“

اس ملاقات کے بعد ان کا رویہ بے حد شفیقانہ اور دوستانہ ہو گیا۔ پھر تو میں جب بھی جاتا وہ مہینے اور لاہور کی

باتیں چھیڑ دیتے۔ حمید اختر کی باتیں ابن انشاء کی باتیں ساحر لدھیانوی کی باتیں۔ ایک دن میں نے کہا:

”میرے پاس ”کال کوٹھڑی“ بھی ہے“

اور کل آپ کہیں گے میرے پاس جیولس فیوچک کی ”پھانسی کے سائے میں“ بھی ہے۔“

”جی، آپ نے ٹھیک جانا۔ دونوں کتابیں زندگی میں کچھ کرنے کی خواہش پیدا کرتی ہیں۔ حمید اختر جب پہلی بار

گرفتار ہوتے ہیں تو بالکل ایک ہیرو لگتے ہیں“

کراچی کی ان ملاقاتوں میں وہ لاہور کا بہت ذکر کرتے۔ حمید اختر کو میں نے ”کال کوٹھڑی“ سے اتنا نہیں جانا تھا

جتنا ابراہیم جلیس کی زبانی ان کے بارے میں باتیں سن کر جانا۔ ایک دن انہوں نے اچانک پوچھ لیا ”ابن انشاء سے ملے

ہو؟“

میں نے نفی میں سر ہلایا تو بولے

”وہ سامنے بند روڈ پر تھیو سو فیکل ہال میں ان کا دفتر ہے۔ وہ تمہیں بتائیں گے حمید اختر اور ساحر کی باتیں۔“

اور سچ سچ میں نے اس انشاء سے ملنا شروع کیا تو دل میں حمید اختر کے نقش اور بھی گہرے ہو گئے۔

ابراہیم جلیس احمد راہی کا ذکر بھی بہت محبت سے کرتے تھے۔ جنہوں نے دسمبر 1947ء میں اپنا سوئٹا تار کر انہیں پہنا

دیا تھا حالانکہ وہ خود سردی سے ٹھہر رہے تھے اسی طرح وہ حمید اختر کی قربانیوں کے بھی بہت قائل تھے جن کی اپنی حالت بہت پتلی تھی

”حمید اختر کی پتلون بالکل کھسک گئی ہے۔ دوسری کوئی پتلون نہیں۔۔۔۔ پیسہ بھی نہیں۔۔۔۔ صبح صرف دو کپ چائے

ہی پی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر بھوک سے پڑیاں جمی ہوئی ہیں لیکن وہ زندگی کے ترقی پسند نظریہ حیات کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں

۔۔۔۔ چیتھڑوں میں لپٹا ہوا ہے خالی پیٹ ہے۔۔۔۔ لیکن قدم بڑے ثابت پڑ رہے ہیں۔ پیر ذرا بھی نہیں ڈگمگاتے۔“ (ابراہیم جلیس

”ایک ملک دو کہانی“)

نکور سے لاہور پہنچنے کے بعد حمید اختر کی احمد راہی سے بھی ملاقات ہوئی۔ غالباً وہ پہلی بار ملے۔ دونوں کی پر خلوص

طبیعتوں اور نظریاتی یگانگت نے انہیں ایک دوسرے کے انتہائی قریب کر دیا۔ حمید اختر ساحر اور راہی کی دلچسپ جھڑپوں کے بھی

یعنی شاہد ہیں۔ یہ سارے ہنگامے ایبٹ روڈ کے اسی گھر میں ہوئے جو حمید اختر نے ساحر اور ان کی والدہ کے لیے الاٹ کروایا تھا۔

حمید اختر لکھتے ہیں:

”یہیں ہم پر احمد راہی کے جوہر پہلی بار کھلے۔ اس ملک کی نوجوان نسل بلکہ ادھیڑ عمر کے لوگوں کو بھی ہمارے اس انکشاف

پر تعجب ہو گا کہ برصغیر پاک و ہند کا نامور شاعر اور بے مثال فلمی گانوں کا خالق ساحر لدھیانوی 1948ء سکے مئی جون کے مہینوں

میں ایبٹ روڈ پر نشاط سینما کے سامنے اور کیپٹل سینما کے متصل واقع اپنے الاٹ شدہ مکان کے باہر برب سڑک چارپائی بچھا کر

رات کو کھلے آسمان کے نیچے سویا کرتا تھا۔ اس کی اس عادت سے ہم بخوبی آگاہ تھے کہ وہ اپنی چارپائی پر کسی دوسرے کالیٹنا برداشت

نہیں کرتا تھا بلکہ بہت سے لوگ اس کی شادی نہ کرنے کی وجہ بھی اس کی اس عادت کو قرار دیتے ہیں۔ لیکن احمد راہی برابر ساحر کی

اس چارپائی کا شریک رہا۔ یہ سلسلہ یوں شروع ہوا کہ ایک روز ساحر ڈیڑھ دو بجے آکر لیٹا اور سو گیا۔ احمد راہی جس کے پاس غالباً

سونے کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا تین بجے آکر اس کے برابر اس کی چارپائی پر دراز ہو گیا۔ اس کے بعد ساحر نے ٹہلتے ٹہلتے رات گزاری اور

صبح کو راہی سے سخت جھگڑا بھی کیا۔ لیکن احمد راہی نے یہ مشق نازکئی ہفتے جاری رکھی۔ وہ کبھی تین بجے کبھی چار بجے صبح آکر خاموشی

سے ساحر کے پلنگ پر دراز ہو جاتا۔ اس کے نصف گھنٹے یا گھنٹے کے بعد ساحر لدھیانوی ایبٹ روڈ کی پرل کلوریم آئی ڈراپ والی

کوٹھی کے بیرونی پلاٹ پر چہل قدمی کرتا ہوا پایا جاتا۔

پندرہ بیس روز کے بعد شاید راہی کو کوئی دوسرا ٹھکانہ مل گیا اور جون 1948ء کے آخر میں تو مرحوم شورش کاشمیری کی ”کوششوں“ سے ساحر پاکستان سے واپس ہی چلا گیا تھا۔ احمد راہی سے ہمارا رابطہ اس کے بعد بھی بدستور رہا بلکہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی تنظیمی سرگرمیوں اور کمیونسٹ پارٹی کے ہفتہ وار اخبار کی اشاعت کے سلسلے میں یہ تعلق روز بروز بڑھتا گیا۔ یہ محض دوستی کا تعلق نہیں تھا بلکہ یہ اس قسم کی رفاقت اور کامریڈشپ کا آغاز تھا جو زندگی کی آخری سانسوں تک چلتی ہے۔ (حمید اختر ”احوال واقعی ص-312)

لاہور آنے کے کچھ ہی عرصہ بعد حمید اختر کی دلچسپی کامرکز لکشمی چوک تھا۔ میکلوڈ روڈ، بیڈن روڈ، نسبت روڈ اور ایبٹ روڈ یہاں آکر ملتی تھیں۔ میکلوڈ روڈ پر کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کا دفتر تھا جہاں پارٹی کے متعدد کامریڈز یا تو مستقل رہائش پذیر تھے یا باقاعدگی سے آیا جایا کرتے تھے۔ ان میں کامریڈ فضل، مرزا ابراہیم، سی آرا سلم، سردار شوکت علی، کامریڈ لال خان، فضل الہی، قربان، فیروز الدین منصور اور کئی ترقی پسند مصنفین بھی شامل تھے۔ اسی چوک میں پارٹی کا اشاعت گھر دارالاشاعت کے نام سے قائم تھا۔ ساتھ ہی پیراڈائیز ریسٹوران، ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کا مرکز تھا۔ بقول حمید اختر:

”پیراڈائیز ریسٹوران ہمارے جیسے ناراض نوجوانوں، ادیبوں، شاعروں اور سیاسی کارکنوں کے گڑھ کے طور پر موجود تھا جہاں درجنوں بے فکرے نوجوان دن بھر بحث و مباحثے کرتے، قہقہے لگاتے اور نئی اور اچھی دنیا کے خواب دیکھتے ہوئے ہنسنے مچھلے آتے، بیڈن روڈ سے ظہیر کاشمیری اپنی زلفیں لہراتا ہوا نظر آتا اور احمد راہی اور اے حمید کے فقروں کو نظر انداز کرتا ہوا اپنے ہی فلسفہ انقلاب پر تقریر کرنے کے بعد ہی خاموشی اختیار کرنے کا فیصلہ کرتا، دنیا کو سنوارنے اور اقلیدگان خاک کو مسند اقتدار پر متمکن کرنے کے پروگرام بننے، (حمید اختر ”احوال واقعی“ ص-300) کامریڈ فضل، جو دوستوں میں لارڈ فضل کے نام سے مشہور تھے، پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن کے جنرل سیکرٹری کے طور پر پاکستان کی مزدور تحریک کو منظم کرنے میں بے حد فعال تھے۔ قیام پاکستان کے بعد بی بی سی کو چھوڑ کر سیاسی کام کے لیے وہ پاکستان آ گیا اور پاکستان ٹائمز میں ریڈیو پروگراموں پر تبصرہ لکھ کر اپنی گزر بسر کرنے لگا۔ بعد میں وہ اور حمید اختر جیل میں اکٹھے بھی رہے۔

انجمن ترقی پسند مصنفین کے روح رواں سید سبط حسن نے لاہور میں جب اپنی تحریک کا آغاز کیا تو پاکستان کے سیاسی مرکز کی حیثیت رکھنے والے شہر سے یہ تحریک ایک ملک گیر تحریک بن گئی۔

میں نے کہا ”حضرت یہ تو راجوں مہاراجوں کے ٹھہرنے کی جگہ ہے۔ شہر میں اس سے بہتر تو کوئی جگہ موجود ہی نہیں ہے۔“ حقیقتاً 1948ء میں لاہور میں فلیڈیز سے بہتر کوئی ہوٹل موجود نہیں تھا۔ مگر سید سبط حسن کی نفاست پسند طبیعت پر یہ بھی پورا نہیں اترتا تھا۔ بہر حال اگلے روز کسی دوسری جگہ منتقل ہو گئے۔ (حمید اختر ”آشنائیاں کیا کیا“ ص-71-72)



سجاد ظہیر، حمید اختر اور دیگر ترقی پسند

تحریر: چوہدری ہدایت اللہ سراء 10 جون 2011ء

1942ء میں پارٹی پر سے پابندی اٹھنے اور پارٹی کے ترجمان ہفتہ وار ”قومی جنگ“ کے ایڈیٹر مقرر ہونے کے بعد بے بھائی اکثر لاہور آتے۔

بے بھائی جب لاہور آتے تو پنجاب پارٹی یا لاہور ڈسٹرکٹ کمیٹی کی طرف سے بلائی گئی جنرل باڈی میٹنگ میں حالات حاضرہ، قومی اور بین الاقوامی صورتحال اور پارٹی کی پالیسیوں کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کرتے۔ پارٹی کے اُردو ہفت روزہ اخبار ”قومی جنگ“ جس کا نام جنگ کے بعد ”نیا زمانہ“ ہو گیا تھا کے ایڈیٹر کی حیثیت سے یہاں کے صحافیوں، ادیبوں، دانشوروں اور شعراء و ادب سے دلچسپی رکھنے والے پارٹی ہمدردوں اور کارکنوں سے خصوصی ملاقاتیں کرتے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے جنرل سیکرٹری کی حیثیت سے وہ دانشوروں ادباء، شعراء وغیرہ سے لازماً ملتے اور انجمن کی سرگرمیوں کا جائزہ لیتے۔

سجاد ظہیر ان تین چار (1943ء تا 1947ء) سالوں میں متعدد بار لاہور آئے۔ ان کی آمد پر لاہور کے ادبی، ثقافتی اور سیاسی حلقوں میں اچھی خاصی گہما گہمی اور ہلچل پیدا ہو جاتی اور مجھ جیسے شائقین ادب و سیاست، کمیونسٹ پارٹی کے رکن اور ہمدردان کی محفل میں لازماً شریک ہوتے۔ ایسی محفلوں اور مجلسوں کا ذکر خود انہوں نے بعض تحریروں میں کیا ہے۔ مثلاً ”روشنائی“ میں رقم طراز ہیں۔

”عبداللہ ملک لاہور میں انجمن کے آرگنائزر مقرر ہوئے۔ اس کے بعد حالات کسی قدر سدھرے اور گو

باقاعدگی اب بھی پیدا نہیں ہوئی لیکن وقتاً فوقتاً انجمن کی طرف سے جلسے ہونے لگے۔ انہی دنوں جب میں لاہور میں تھا، وائی۔ ایم۔ سی۔ اے کے ایک چھوٹے کمرے (بورڈ روم) میں انجمن کا ایک جلسہ مجھے یاد ہے۔ ایک بڑی میز کے ارد گرد پچاس، ساٹھ آدمیوں کا مجمع تھا۔ جگہ کم تھی، لوگ زیادہ تھے اور سگریٹ کے دھوئیں سے سانس لینا مشکل ہو رہا تھا۔ پروگرام بھی کافی لمبا چوڑا تھا۔ ایک افسانہ پڑھا گیا جس کے مصنف کا نام مجھے اب یاد نہیں۔ پھر عبدالمجید بھٹی کی نظم تھی۔ اس کے بعد ”لوئی آراگون“ پر میں نے مقالہ پڑھا اور اخیر میں حلقہ ارباب ذوق کے شاعر یوسف ظفر نے اپنی نظم سنائی۔

بھٹی صاحب نے اس جلسے میں اپنی نظم ”برہن سنائی جس میں محض ایک لفظ ’چھن‘ کی تکرار اور کئی سطروں میں (کسی میں ایک، کسی میں دو اور کسی میں اس سے زیادہ) اسے ہی دہرا کر معنی آفرینی کی کوشش کی گئی ہے۔ ’کم فہم‘ اور ’کند ذہن‘ حاضرین کی اکثریت (جن میں اس وقت میں بھی شامل تھا) اس نظم کو سن کر خاموش ہی رہی۔ لیکن لاہور کے نچلے نہ بیٹھے والے نوجوان بھلا چپ رہنے والے کہاں تھے اور وہ چاروں طرف سے بھڑوں کی طرح بھٹی صاحب سے چمٹ گئے۔ طعنوں اور سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ آخر کو بھٹی صاحب نظم کے معنی سمجھانے پر مجبور ہوئے۔ پہلی ’چھن‘ انہوں نے شاید سمجھایا، گھر کی کنڈی کی آواز ہے۔ پھر برہن کے دروازے تک جانے کی۔ بعد کے چھن، چھن، چھن اس کے آہستہ آہستہ مایوس ہو کر واپس آنے کی ہے۔ اس لیے کہ پہلی آواز اس کے بالم کے دروازہ کھٹکھٹانے کی نہ تھی۔ معنی فی نطن الشاعر اور شعر میں دور کی کوڑی لانے کو استادوں نے شعر کا سقم بتایا تھا۔ بھٹی صاحب کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے کوڑی کو اتنا دور پھینکا کہ وہ گم سی ہو گئی۔ بھٹی صاحب کے مطلب سمجھانے کے بعد بھی معترضین کو اطمینان نہیں ہوا اور اب مجھ سے سوال کیا گیا کہ آیا میں اس نظم کو ترقی پسند سمجھتا ہوں؟ میں نے یہ جواب دیا کہ ”پہلے آپ یہ فیصلہ کیجئے کہ آیا یہ نظم بھی ہے یا نہیں۔ اس کے ترقی پسند ہونے یا نہ ہونے کا سوال تو اس کے بعد پیدا ہوگا۔“

”لاہور میں تقسیم سے پہلے کے دو ادبی جلسوں کی آج بھی مجھے یاد آرہی ہے۔ غالباً 1946ء یا 1947ء کے شروع کا زمانہ تھا اور اب پنجاب میں ہماری تحریک تنظیم و وسعت، ادبی تخلیق اور ترقی پسند رسالوں اور کتابوں کی طباعت و اشاعت کے لحاظ سے دن بدن ترقی پذیر تھی۔ اب وہاں پیپلز تھیٹر کی تحریک چل پڑی تھی اور اس کا بہت اچھا گروپ تیار ہو گیا تھا۔“

پہلے جلسے کی روداد مجھے یاد نہیں سوائے اس کے کہ میں نے اس میں ترقی پسند ادب کے مسائل پر ایک تقریر کی تھی۔ اس تقریر میں کیا کہا تھا یہ بھی یاد نہیں لیکن اس جلسے کا ماحول اور اس کی فضا ذہن پر نقش ہے۔ ایک لاہوری، بنگالی آرٹسٹ (سانیاں) کے اسٹوڈیو میں یہ جلسہ ہوا تھا۔ یہ اسٹوڈیو مال روڈ کے بالائی کمرے میں تھا۔ ایک وسیع کمرہ جس میں

دیواروں پر چھوٹی بڑی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ بعض مکمل اور بعض نامکمل، ادھر ادھر پتھر اور سفید مٹی کے مجسمے رکھے تھے، کسی کا سر غائب اور خالی دھڑ اور کسی کا صرف بڑا ساسر، بیٹھنے کیلئے عجیب و غریب اسٹول اور کرسیاں تھیں۔ شام ہو چکی تھی اور اسٹوڈیو میں جگہ جگہ پر چھپے ہوئے لیمپوں سے ہلکی ہلکی روشنی آرہی تھی۔ اس حسین دھندلکے میں چالیس پچاس ادیب اور ادب کا ذوق رکھنے والے بیٹھے ہوئے تھے۔ زیادہ تر فرش اور چند ان کرسیوں پر جو وہاں موجود تھیں۔

بعض ان میں سنجیدہ تھے اور بعض ایسے جو صرف فنون لطیفہ کے شوقین ہی کہے جاسکتے تھے۔ پنجاب کی عوامی زندگی سے فضا کسی طرح میل نہیں کھاتی، گو اس میں اپنا ایک حسن تھا۔“ (روشنائی)

”روشنائی“ سے مندرجہ بالا اقتباسات میں بتے بھائی نے جن میٹنگوں کا ذکر کیا ہے خوش قسمتی سے میں نے بھی ان میں شرکت کی تھی۔ خاص طور پر مجھے وائی ایم سی اے کے بورڈ روم والی میٹنگ اچھی طرح یاد ہے۔ جس میں عبدالمجید بھٹی (مرحوم) نے نظم ”برہن“ سنائی تھی۔ میٹنگ کے بعد کچھ نوجوان سامعین نے بھٹی صاحب پر خوب فقرے چست کیے۔ بعد ازاں انڈیائی ہاؤس (جو 1948ء کے وسط میں پاک ٹی ہاؤس ہو گیا) میں چائے پیتے مذاقاً بھٹی صاحب سے پوچھا گیا ”کنڈی کھلنے کے بعد کیا ہوا۔“

اس طرح آرٹس سانیال کے اسٹوڈیو میں ہونے والی میٹنگ اور وہاں کی جس مسحور کن فضا کا ذکر بتے بھائی نے اوپر دیئے اقتباس میں کیا ہے وہ واقعی ویسے ہی تھی ان کا اسٹوڈیو ریگل سینما کی بالائی منزل کے ایک وسیع و عریض کمرے میں واقع تھا۔ سانیال کا اسٹوڈیو لاہور کے بڑے بڑے آرٹسٹوں اور دانشوروں کے لئے دانش کدہ کی حیثیت رکھتا تھا اور یہاں منعقد ہونے والی کسی نمائش یا فنکشن میں شریک ہونا مجھ جیسے نوجوان طالب علم کے لئے بڑے اعزاز کی بات ہوتی تھی۔

سب سے دلچسپ بلکہ پراسرار واقعہ حمید اختر کی سجاد ظہیر سے ملاقات کا ہے۔ ان دنوں وہ منگمری میں اپنی بہن کے ہاں مقیم تھے اور منیر نیازی کی آٹا پینے کی چکی پر شعر و ادب کی محفلوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے جب ایک دن رؤف ملک جو انہیں ڈھونڈتے ہوئے منگمری پہنچے اور بتایا کہ حمید اختر کے کوئی دوست ممبئی سے آئے ہوئے ہیں اور ان سے فوراً ملنا چاہتے ہیں۔ وہ رؤف ملک کے ساتھ لاہور پہنچے جو انہیں انارکلی اور دھنی رام روڈ کے عقب میں واقع ان تارک اور پریچ گلیوں میں سے گھماتے ہوئے ایک مکان کے سامنے رک گئے۔ دستک دینے پر دروازہ کھلا تو سامنے سید سجاد ظہیر کھڑے تھے۔ اس خلیے میں حمید اختر نے انہیں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ گھر میں اور گھر سے باہر بھی ہمیشہ کھلا کرتے پاجامہ پہنتے تھے، کلین شیور ہتے تھے مگر اس وقت وہ دھوئی اور بنیان پہنے بڑی رعب دار مونچھیں چہرے پر سجائے ان کے سامنے کھڑے تھے۔

کمرہ تاریک اور خستہ حال تھا۔ سخت گرمی میں ایک چھوٹا سا ٹیبل فین آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ حمید اختر کو انہیں لاہور میں دیکھ کر خوشی تو بہت ہوئی۔ تاہم انہیں نہ تو ان کے پاکستان کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سیکرٹری منتخب ہونے کا علم تھا اور نہ ہی ان کی آمد کے مقاصد کا۔ یہ باتیں انہوں نے خود ہی بتائیں اور کہا کہ ”میں پنجاب میں کسی کو جانتا نہیں ہوں۔ پارٹی کی تنظیم کے لیے زیر زمین رہ کر کام کرنا ہے اور اس کے لیے تمہیں میرے ساتھ رہنا ہوگا۔ مجھے معلوم ہے کہ گھر بار لٹنے اور نئی جگہ آنے کی وجہ سے تمہارے گھر والوں کے لیے پریشانی کے دن ہیں۔ ایسے حالات میں تمہارا گھر والوں سے علیحدہ ہونا بھی مشکل ہے۔ تاہم پارٹی کا کام زیادہ اہم ہے اور یہ تمہاری مدد کے بغیر نہیں ہو سکتا۔“ حمید اختر کے لیے انکار ممکن نہیں تھا۔

”ایک وجہ یہ تھی کہ 1946 کے اواخر میں ہم تین آدمی یعنی ساحر رضیہ سجاد ظہیر اور میں کمیونسٹ پارٹی کی رکنیت اختیار کر چکے تھے دوسری وجہ بنے بھائی کی شخصیت اور محبت تھی جس کا تقاضا تھا کہ وہ جو کہتے ہیں کیا جائے۔ (حمید اختر ”آشنائیاں کیا کیا“ ص 21-22)۔ اب حمید اختر سجاد ظہیر کے ساتھ پارٹی کی زیر زمین سرگرمیوں میں مصروف ہو گئے۔

حمید اختر جن دنوں لاہور آئے، فیض ان دنوں پاکستان ٹائمز کے چیف ایڈیٹر تھے۔ ابھی روزنامہ ’امروز‘ کا اجراء نہیں ہوا تھا۔ یہ ادارہ (پروگریسو پیپرز لمیٹڈ) ترقی پسند ادیبوں اور دانشوروں کے لیے ایک طرح کی جائے پناہ تھا خصوصاً روزنامہ ’امروز‘ کے اجراء کے بعد تو یہ ادارہ کسی حد تک ادیبوں کی مالی آسودگی کا بھی ذریعہ بننے لگا۔ ”پاکستان ٹائمز“ اور ”امروز“ میں چھپنے والی ہر تحریر کا معاوضہ ادا کیا جاتا تھا۔ اس سے قبل اخبارات میں ایسی کوئی روایت نہ تھی۔ ابراہیم جلیس جو حمید اختر کے ساتھ ہی قیام پذیر تھے اور کوئی مستقل ذریعہ معاش نہ ہونے کے سبب مالی طور پر پریشان رہتے تھے اب زیادہ تر ’امروز‘ کے لیے ہی لکھتے۔ حمید اختر اس حوالے سے ابراہیم جلیس کا ایک دلچسپ واقعہ بیان کرتے ہیں جو ایک مضمون کا معاوضہ بڑھانے کے حوالے سے تھا۔ ”امروز سے نثر نگاروں کو سات روپے کالم کے حساب سے معاوضہ ملتا تھا۔ جلیس مضمون دینے کے بعد نیوز اور کتابت سیکشن میں آکر بیٹھ جاتا کالم کی طوالت اور اس حساب سے معاوضہ کی رقم کا اندازہ لگاتا۔ کھلی طبیعت اور باغ و بہار شخصیت کی وجہ سے ”امروز“ کا سارا عملہ اس کا دوست بن گیا تھا ایک روز اس کا مضمون کتابت کے لیے خوش نویس کے پاس آیا تو جلیس کے استفسار پر اس نے بتایا کہ یہ مضمون دو سو روپے کالم کا ہوگا۔ ”یہ تو گڑبڑ ہوگئی۔ ذرا جلی قلم سے کھلا کھلا لکھ کر اسے کم از کم تین کالم ضرور کر دیجئے ورنہ میں مارا جاؤں گا۔“ جلیس نے کہا۔ ”ایسی کیا افتاد آ پڑی ہے کہ مضمون تین کالم کا نہ ہو تو آپ تباہ ہو جائیں گے؟“ خوش نویس نے پوچھا۔

جلیس نے اپنا جوتا اتار کر خوش نویس کے سامنے ڈیسک پر رکھ دیا ”دیکھو بھائی یہ اب جگہ جگہ سے بالکل ٹوٹ چکا ہے مجھے نیا جوتا خریدنا ہے۔ چودہ روپے میں جوتا نہیں ملتا، بیس بائیس روپے چاہئیں اس لیے بھائی کالم بڑھاؤ۔“ کاتب

نے واقعی دو کالم کے مضمون کو سواتین کالم کا کر دیا۔ (حمید اختر ”آشنائیاں کیا کیا“ ص 66-165)

خود ابراہیم جلیس نے اس دور میں ترقی پسند ادیبوں کی معاشی بد حالی کا ذکر کیا ہے لیکن ان بدتر حالات میں وہ نہ جھکے نہ بکے۔ یہی نہیں وہ اپنے دکھ بھول کر اپنے ساتھیوں کے لیے کوئی بھی قربانی دینے سے دریغ نہ کرتے۔ حمید اختر، احمد راہی، احمد ندیم قاسمی، عبداللہ ملک، ظہیر کاشمیری، محمد صفدر (میر) اور عارف عبدالمبین سمیت بہت سے ترقی پسند ادیب و شاعران تاریک ایام کے سب سے سنہرے لوگ تھے۔ ابراہیم جلیس بتاتے ہیں:

”کبھی کبھی میں بہت اداس ہوتا ہوں تو نذیر چودھری میرے کندھے پر ہاتھ مار کر کہتا ہے:

”کیا اداس بیٹھے ہو یا زندگی گزارنی ہو تو احمد راہی کی طرح گزارو عیشاں (عیش کی پنجابی جمع) کرتا ہے پٹھا!“

اور میں سنجیدگی سے اس کے بارے میں سوچتا ہوں۔ احمد راہی شاعر ہے۔ دن بھر لاہور کی سڑکوں پر ہونٹوں میں سویرا کے دفتر میں اور ترقی پسند ادیبوں کی محفلوں میں کھوکھلے قہقہے لگا تا رہتا ہے جیسے جمہوریہ پاکستان میں شاعروں، ادیبوں اور فن کاروں کے لیے کھوکھلے قہقہے لگانے کے سوا کوئی کام نہیں، کوئی مشغلہ نہیں، کوئی مصروفیت نہیں یا جیسے پاکستان جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے لیے بنائے، فن کاروں، محنت کشوں اور عام انسانوں پر پاکستان کے سارے دروازے بند ہیں!

احمد ندیم قاسمی نے ریڈیو پاکستان کی نوکری چھوڑ دی، ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور نے ریڈیائی فیچر لکھنے بند کر دیئے۔ قتیل شفائی نے ریڈیو کنٹرولڈ واپس کر دیا۔۔۔۔۔ اس لیے کہ ریڈیو پاکستان سے پاکستان کے نوابوں اور جاگیرداروں کا پروپیگنڈا ہوتا تھا۔۔۔۔۔ عبداللہ ملک نے اخبار مہاجرین، اور طفیل احمد خاں نے ہفت روزہ استقلال اور اخبار ’نوائے وقت‘ سے علیحدگی اختیار کر لی کیونکہ ان اخباروں کے صفحات کی اوٹ میں بھی جاگیردار اور سرمایہ دار چھپے ہوئے تھے۔ پھر ترقی پسند ادیب کیا کریں، ان کے اہل و عیال، ان کے متعلقین کے معاشی مسائل کس طرح حل ہوں، وہ کس طرح زندہ رہیں؟

سنا ہے ظہیر کاشمیری کو حکومت نے بڑی بڑی کرسیاں آفر کیں مگر ظہیر کاشمیری کی نظریں کھیتوں اور کارخانوں سے ہٹ نہ سکیں جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی حکومت ترقی پسند ادیب کی نظریں نہ خرید سکی، ترقی پسند ادیب کا ضمیر نہ خرید سکی، ترقی پسند ادیب کا دل نہ خرید سکی، اس کا دماغ نہ خرید سکی، اس کا قلم نہ خرید سکی!

احمد راہی کے والد نے کہا کہ گھر روپیہ نہ لاؤ گے تو پھر کیوں گھر آتے ہو۔؟“ احمد راہی دن اور راتیں گزارنے کے لیے نذیر چودھری سے ’سویرا‘ کے دفتر کی چابی مانگ رہا ہے۔

احمد ندیم قاسمی جو خوش پوشی میں ضرب المثل تھا۔ پھر مزے ہوئے کاروں کی نمیض پہنے ایک سگریٹ کے لیے بڑی دیر سے ترس رہا ہے۔

محمد صفر کالے خاں ایم حنیف کی تارا مار کہ بیڑی سلگا کر اپنی بھاری آواز میں گارہا ہے۔

ساڈا ڈکھ سن سن کے روندے پتھر پہاڑاں دے

احمد راہی فوراً اپنے دوست کے ڈکھ میں شریک ہو جاتا ہے۔ احمد راہی جس نے کٹڑہ سنت سنگھ امرتسر اور قرول باغ دہلی میں چار چار سو ڈنٹر پیل کر جسم کو ایک پتھر میں ڈھال لیا ہے ایک بڑا نرم اور گداز دل رکھتا ہے وہ جیسے دوستوں کے لیے پیدا ہوا ہے اور دوستوں کے لیے جی رہا ہے اور غالباً دوستوں کے لیے مرے گا بھی۔۔۔۔۔ دوسرے کے ڈکھ درد کے سامنے اس کا اڑا دکھ درد کوئی اہمیت نہیں رکھتا چنانچہ اس نے جب جنوبی ہندوستان کے باشندے ابراہیم جلیس کو پنجاب کے جاڑوں میں کپکپاتے دیکھا تو اپنا سویٹر اتار کر اسے دے دیا اور بولا:

”دوست۔۔۔۔۔ اسے تم پہن لو“

میں ہچکچانے لگا۔ مگر اس نے کہا:

”شرمانے کی کوئی بات نہیں۔ ہم پاکستان کے فن کار ہیں۔ ہم ایک بورڈ وادیس کے ادیب ہیں۔ کل ہمارا بھی زمانہ آئے گا اور یہاں کے بڑے بڑے جاگیرداروں اور سرمایہ داروں سے ہم انتقام لیں گے آج جس جاڑے میں ہم ٹھٹھر رہے ہیں کل اسی جاڑے میں سرمایہ داری جاگیرداری اور شہنشاہیت ٹھٹھر کر مرے گی۔“

میں نے وہ سویٹر پہن لیا۔ حمید اختر نے کہا:

”شرمانے کی بات نہیں۔ میں آج ہی طفیل احمد خان سے کہوں گا کہ وہ ایک مقالہ لکھیں جس کا عنوان ہو ”بورڈ وادیس ڈیموکریسی میں ترقی پسند ادیبوں کی معاشی حالت“

سب ہنس پڑے۔ اسی اثناء میں ریاض جاوید آ گیا اور اس نے کہا:

”خوش خبری!۔۔۔۔۔ خوش خبری!!“

سب متوجہ ہو گئے۔ اس نے کہا:

”مبارک ہو۔ اب لاہور میں روسی گیہوں روسی کپڑا روسی صابن روسی تیل اور روسی سگریٹ آ گیا ہے۔“

حمید اختر نے بے اختیار ہو کر خوشی کا اظہار کیا:

”گڈ۔۔۔۔۔ ویری گڈ نیوز!“

عارف عبدالتین یا عبدالتین عارف یا عارف عبدالتین اینڈ وائس ورسا نے کہا:

”مگر تمہیں معلوم ہے کہ پاکستان کے بڑے بڑے تاجروں نے پر زور احتجاج کیا ہے کہ روسی گیسوں اور روسی کپڑے کے آجانے کے باعث پاکستان میں کمیونزم پھیلنے کا شدید خطرہ لاحق ہو گیا ہے!“ سب قہقہے لگانے لگے مگر خبر سچی تھی اور سارے اخباروں میں چھپ چکی تھی۔ (ابراہیم جلیس ”ایک ملک دو کہانی“ ص 155-158)

لیکن اس غربت، بھوک، ننگ اور بیکاری میں وہ خوش تھے اور اپنی جدوجہد میں مصروف۔۔۔ وہ سب روزانہ پارٹی ہیڈ کوارٹر کا چکر لگاتے جسے پی ایچ کیو کہا جاتا تھا۔ ”پاکستان ٹائمز“ اور ”امروز“ کا دفتر بی پی ایل کہلاتا۔ پاک ٹی ہاؤس (مرحوم) میں ان کی محفلیں جمتیں۔ ابراہیم جلیس اور حمید اختر ٹی ہاؤس پہنچتے تو پیدل چل چل کر ان کی حالت خراب ہوتی۔ جلیس انتظار حسین، اے حمید اور انجم رومانی کی میز پر بیٹھے ہی کہتے ”یار چائے پلاؤ“ تھک گئے ہیں۔ پی ایچ کیو سے جی پی او گئے وہاں سے پی پی ایل جانا پڑا۔ بڑی مشکل سے یہاں پی ٹی ایچ پہنچے ہیں۔ پھر وہ ابن انشایا اے حمید کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہتے ”واہ بھئی واہ! کیا زبان ہے پنجابی، اکو نجا، بونجا، ترونجا۔۔۔ (حمید اختر ”آشنائیاں کیا کیا“) مجھے یاد ہے جب کراچی میں میری ان سے ملاقاتیں ہو رہی تھیں تو وہ ان دنوں کا ذکر کرتے ہوئے نہیں تھکتے تھے۔

یہ وہی ابتدائی دن تھے جب ترقی پسند ادیبوں، ان کی سرگرمیوں پر حملے شروع ہو گئے تھے۔ ایک طرف حکومت وقت ان کے درپے تھی تو دوسری طرف وہ ادیب اور شاعر جو ترقی پسند تحریک کے پھلنے پھولنے کو اپنے لیے خطرہ سمجھتے تھے۔ ان کے براہ راست نشانے پر ساحتھے پھر فکر تو نسوی کو یہاں سے ہندوستان بھگانے کے لیے کافی کوششیں کی جا رہی تھیں۔ ہندو پس منظر کے باوجود فکر کسی طرح پاکستان چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھے تاہم جب حمید اختر تباہ حالت میں پاکستان پہنچے ہیں تو فکر تو نسوی ان کے لاہور پہنچنے سے قبل 7 نومبر 1947ء کو لاہور چھوڑ کر جا چکے تھے۔ انہوں نے بعد ازاں 9 اگست سے 8 نومبر 1947ء تک لاہور کی ڈائری ’چھٹادریا‘ کے نام سے لکھی جس میں حمید اختر کے علاوہ تمام ترقی پسند ادیب متحرک نظر آتے ہیں۔ ابراہیم جلیس بھی فکر تو نسوی کے جانے کے بعد لاہور پہنچے تھے اس لیے ’ایک ملک دو کہانی‘ میں فکر تو نسوی کا ذکر نہیں ملتا۔ ان دنوں کتابوں کو ترتیب سے پڑھیں تو قیام پاکستان کے بعد کے پہلے چھ آٹھ ماہ کی ترقی پسند سرگرمیوں کا احاطہ کیا جاسکتا ہے۔ فکر کی کتاب سے حمید اختر غائب ہیں اور حمید اختر کی تحریروں میں فکر کا سراغ نہیں ملتا۔ اس پر آشوب دور میں ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کے لیے زندگی کافی کٹھن بنا دی گئی۔ حتیٰ کہ 1948ء کے اوائل میں اپنے ایک ادارے کی پاداش میں فیض بھی چند روز کے لیے گرفتار ہو چکے تھے۔

حمید اختر کے لاہور آنے کے چند روز بعد پاکستان کے ترقی پسند ادیبوں نے اپنے آپ کو اچھا خاصا منظم کر لیا تھا اور دسمبر کے پہلے ہفتے میں ایک عدد مقامی کانفرنس بھی منعقد کر ڈالی تھی۔

☆☆☆

کمیونسٹ پارٹی کے ترجمان اخبارات اور حمید اختر

تحریر: پروفیسر اکرام اللہ عادل 16 فروری 2011ء

کمیونسٹ پارٹی نے پاکستان کے عوام کی ترقی اور ہوش مندی کے لئے صرف اپنے اجتماعات پر ہی اکتفا نہیں کیا تھا بلکہ اپنی آوز کولوگوں کے گھروں تک پہنچانے کے لئے انہوں نے مختلف ادوار میں مختلف اخبارات بھی شائع کئے۔ حمید اختر کہتے تھے کہ:

”پارٹی کے اخبار ”نیازمانہ“ کی اشاعت کے متعلق میاں انور علی نے بے شمار غیر ضروری تفصیلات درج کر دی ہیں مگر اشاعت رکنے کی اصل وجہ نہیں بتائی۔ حکومت نے ایک موقع پر پرچے کے ناشر سے ضمانت طلب کی۔ ضمانت دے دی گئی مگر پرچہ نہ چھپ سکا۔ میاں صاحب اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ کوئی پریس اسے چھاپنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ہم چونکہ اس اخبار کے ایڈیٹر چڑا سی وغیرہ سب کچھ تھے اس لیے ہمیں معلوم ہے کہ خفیہ پولیس والے ہر پریس میں جہاں سے یہ اخبار چھاپا جاسکتا ہے پہنچ جاتے تھے اور مالکان سے کہا جاتا کہ اگر انہوں نے یہ اخبار چھاپا تو ان کے پریس کا ڈیکلیریشن منسوخ کر دیا جائے گا۔ رپورٹ میں ”نیازمانہ“ کی جبری بندش کے بعد ”سحر“ اور ”اپنا وطن“ کے بارے میں بھی یہ حقائق تو بیان کر دیے گئے ہیں کہ ان کا ڈیکلیریشن کن کے نام تھا اور کن شرائط پر اس ڈیکلیریشن کی مدد سے چند ہفتے یہ پرچے پارٹی پیپر کے طور پر شائع ہوتے رہے مگر بندش کی وجہ یہ یہی بتائی گئی کہ کوئی پریس ان کو چھاپنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ یہ نہیں بتایا جا رہا کہ پریس والوں کو خفیہ پولیس کس طرح ڈراتی دھمکاتی رہی۔ (حمید اختر ”لوٹ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو“ روزنامہ ”ایکسپریس“ لاہور 3 جون 2005ء)

خفیہ پولیس اور پارٹی کی آنکھ پھولی مسلسل چلتی رہتی۔ کئی بار ایسا بھی ہوا کہ پابندی یا پولیس کے انکار کے باعث نئے نام کا ڈیکریٹیشن حاصل کیا جاتا۔ اس پر کسی دوسرے کا پتہ دیا جاتا تا کہ پارٹی کا تعلق ظاہر نہ ہو سکے۔ لیکن پارٹی کا چہرہ متن سے ظاہر ہو جاتا اور پولیس اس نئی جگہ پر بھی پہنچ جاتی۔ ایسا ہی ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے حمید اختر کہتے ہیں:

”سحر“ یا ”اپنا وطن“ شائع ہونا شروع ہوا تو ہم نے اس پر کمیونسٹ پارٹی کا پتہ دینے کی بجائے ریاض شاہد مرحوم کے گھر کا پتہ دیا۔ وہ اس زمانے میں ہماری شاگردی میں تھا اس لیے اس نے ہماری فرمائش پر فوراً منظوری دیدی اور ڈاک کے لیے ایک لیٹر بکس بھی گھر کے ایک کونے پر لگا دیا، جہاں سے ہم ہر دوسرے تیسرے روز اپنی ڈاک لے جاتے۔ ہماری اس کاری گری کی وجہ سے یہ پرچہ کچھ زیادہ دنوں تک شائع ہوتا رہا، مگر بالآخر خفیہ والے وہاں بھی پہنچ گئے اور یہ بھی بند ہو گیا۔ اس کی بندش کے کچھ عرصہ بعد ہم اس کے گھر گئے تو اس نے ہمیں اپنے والد سے ملواتے ہوئے ان سے کہا ”یہی وہ حمید اختر ہے جس کی وجہ سے پولیس آپ کے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔“ اس طرح پارٹی نے ایک نظریاتی ماہنامہ ’ارتقا‘ کے نام سے شروع کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور اس کے دو شمارے شائع بھی ہوئے۔ اس رسالے کے متعلق بھی میاں انور علی اپنی رپورٹ میں یہی انکشاف کرتے ہیں کہ دو شماروں کے بعد کوئی پولیس اسے چھاپنے کو تیار نہیں تھا، یہ بتانا وہ بھول گئے کہ پولیس والوں کو خفیہ پولیس والے پولیس کی ضبطی کی دھمکی دے کر ہفتہ وار اخبار اور ماہوار رسالوں کی اشاعت سے روکتے تھے۔

’نیاز مانہ‘ یا اس کے متبادل پرچوں کے مدیر اصل سبط حسن تھے اور ریز مین رہتے ہوئے پرچے کو ترتیب دیتے تھے۔ اعلانیہ طور پر حمید اختر اس کے مدیر تھے جبکہ احمد راہی اور بشیر ظفر ان کے ساتھ رضا کارانہ طور پر وابستہ تھے۔ وہ اسے ’نیاز مانہ‘ کے نام سے نکالتے رہے۔ جب اس سے ضمانت طلب کی گئی تو انجمن ترقی پسند مصنفین نے احتجاجی بیان جاری کیا۔ بیان میں کہا گیا تھا کہ:

”لاہور کا ہفت روزہ ’نیاز مانہ‘ پاکستان میں محنت کش اور غریب طبقے کا واحد ترجمان تھا، یہ پرچہ دہقانوں، مزدوروں اور غریب مہاجرین کی آواز تھا اس کے علاوہ غالباً یہ پاکستان کا ایک ہی اخبار تھا جس میں بین الاقوامی سیاست پر نہایت غیر جانبداری سے تبصرہ کیا جاتا تھا اور سامراجی ملکوں کی سازشوں کے پول کھولے جاتے تھے۔ ہمارے خیال میں ہمارے ملک کو اس قسم کی صحافت کی اشد ضرورت ہے، لیکن ہماری حکومت اس ایک ہفتہ وار پرچے کے وجود کو بھی برداشت نہیں کر سکی اور اس سے تین ہزار روپے کی ضمانت طلب کی ہے، اس پرچے میں ضمانت ادا کرنے کی طاقت نہیں ہے، اس لیے اگر ہمارے روشن خیال اور با استطاعت طبقے نے اس سلسلہ میں اس کی امداد نہ کی تو دہقانوں اور مزدوروں کی یہ آواز

خاموش ہو جائے گی۔

بعد میں 'نیا زمانہ' کا ڈیکلریشن ہی منسوخ کر دیا گیا اس کے بعد یہ ہفت روزہ 'اپنا وطن'، 'سحر' اور بعض دوسرے ناموں سے شائع ہوتا رہا۔ بقول حمید اختر

"یہ ایک مکمل اخبار تھا اس زمانے میں اس کی خوبیوں کی داد احمد راہی، بشیر ظفر اور میں سمیٹتے رہے۔ اس لیے کہ بظاہر ہم ہی یہ اخبار نکالتے تھے بہت کم لوگوں کو اس بات کا علم تھا کہ اس معیاری ہفت روزہ اخبار کی تدوین ترتیب اصل میں کس کی ذمہ داری ہے۔

لیکن اس بیان میں کافی حد تک حمید اختر کے انکسار کو بھی دخل ہے۔ یہ درست ہے کہ حمید اختر اس وقت عملی صحافت کا تجربہ نہیں رکھتے تھے۔ پھر بھی انہوں نے بڑی محنت اور لگن سے یہ سارا کام کیا اور بالآخر ایک منجھے ہوئے صحافی بن گئے لیکن اس کا تفصیلی ذکر ہم اگلے کسی باب میں کریں گے۔

حمید اختر 1948ء کا پورا سال سجاد ظہیر کے ساتھ براہ راست رابطے میں رہے۔ وہ پارٹی کے مختلف امور کے سلسلے میں انہیں ملتے پیغام رسانی کرتے ہدایات لیتے اور انہیں عملی جامہ پہناتے۔ اپریل اور مئی 1948ء میں ان کی سرگرمیاں لاہور تک ہی محدود رہیں لیکن جون سے وہ کراچی، حیدرآباد، راولپنڈی اور پشاور وغیرہ کے سفر میں ان کے ساتھ رہے۔۔۔ سب سے طویل قیام کراچی میں رہا جہاں پارٹی کے پریس سمیت پارٹی کو منظم کرنے کے سلسلے میں وہ کافی مصروف رہے۔ یہ سفر ان حالات میں ہوئے کہ خفیہ پولیس قدم قدم پر ان کا پیچھا کر رہی تھی لیکن وہ پولیس کو کئی موقعوں پر چکمہ دینے میں کامیاب رہے۔ میاں انور علی کی رپورٹ میں کراچی کے سفر کا کافی تفصیل سے ذکر ہے لیکن سجاد ظہیر اور حمید اختر کئی موقعوں پر پولیس کی آنکھوں میں دھول جھونکنے میں کامیاب رہے۔ اپنی کئی تحریروں میں حمید صاحب نے کراچی، حیدرآباد، راولپنڈی اور پشاور میں اپنی سرگرمیوں کا تذکرہ کیا ہے۔ یہی نہیں انہوں نے سی آئی ڈی کے جھوٹ سچ کا بھی پول کھولا ہے۔ بہتر ہوگا اگر ہم ان کی روداد کے زیادہ حصے خود انہی کی زبانی سنیں:

"جون 1948ء میں ایک روز میں بنے بھائی کے پاس روزمرہ کے کاموں کے سلسلے میں پہنچا تو کہنے لگے کراچی چلنا ہے۔ کراچی میں پارٹی کا اپنا پریس تھا فنڈز بھی تھے اور بہت سا سامان بھی۔ وہاں جو ہندو کامریڈ تھے ان میں سے اکثر ہندوستان چلے گئے، معلوم نہیں کہ یہ سامان وغیرہ کہاں اور کس کے پاس ہے۔ یہ سب معلوم کرنے اور پارٹی کو کراچی میں منظم کرنے کے لیے ہمیں کراچی جانا ہے۔ پروگرام یہ بنا کہ میں صبح کو خیبر میل میں فرسٹ کلاس کا ایک ڈبہ بک کرا لوں اور یہاں سے اکیلا روانہ ہوں۔ لاہور ریلوے سٹیشن اس زمانے میں پولیس کی کڑی نگرانی میں رہتا تھا اس لیے

ان کا وہاں جانا درست نہیں تھا، طے ہوا کہ وہ اپنے سفر کا آغاز رائے ونڈ سٹیشن سے کریں گے۔ ایک ہمدرد خاتون نے انہیں اپنی کار کے ذریعے رائے ونڈ پہنچا دیا جہاں سے وہ میرے ہم سفر ہوئے۔

یہ تو مجھے یاد نہیں اس زمانے میں ایئر کنڈیشنڈ بوگیاں ہوتی تھیں یا نہیں۔ بہر حال ہمارا ڈبہ ایئر کنڈیشنڈ نہیں تھا اور جون کی گرمی میں جہنم کا نمونہ بنا ہوا تھا۔ باہر سے خاک اڑ کر اندر آتی، ہم دونوں ایک دوسرے کے حلیے دیکھ کر ہنستے رہے۔ اس کے سوا اور کر بھی کیا سکتے تھے، پہلے پسینہ سے کپڑے جسم کے ساتھ چپک جاتے پھر ان پر مٹی کی تہ جم جاتی۔ ملتان پہنچتے پہنچتے ہم بے حال ہو چکے تھے اور گرمی کی وجہ سے سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔ ملتان سٹیشن سے میں نے برف کے دو بلاک خرید کر ڈبے میں رکھوا دیے۔ اس سے ٹمپرچر تو ضرور کچھ کم ہوا مگر پچاس میل جانے تک یہ بلاک بھی برف کی بجائے ریت کے ٹیلوں کی شکل اختیار کر چکے تھے اور صبح تک ڈبہ ریت اور پانی کے ملغوبہ یعنی گارے سے بھرا ہوا تھا۔ کراچی صدر کے سٹیشن پر ہم کوئی جناتی مخلوق نظر آرہے تھے۔ خیر کسی طرح منہ ہاتھ دھو کر ٹرین سے اترے۔ پروگرام کے مطابق ہمیں مرحوم ملک نورانی کے گھر جانا تھا جو کہیں شکار پور کالونی میں رہتے تھے۔ طے یہ ہوا کہ بنے بھائی ریلوے ریٹائرنگ روم میں آرام کریں۔ میں ملک نورانی کا گھر ڈھونڈنے کے بعد انہیں دوبارہ آکر لے جاؤں گا۔

گھر ڈھونڈتے ڈھونڈتے جب میں نے مطلوبہ پتے پر پہنچ کر دروازہ کھٹکھٹایا تو اندر سے ایک خوبصورت طرح دار لڑکی برآمد ہوئی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا ”مجھے ملک نورانی یا بیگم نورانی سے ملنا ہے۔۔۔۔؟“

”میں ہی بیگم نورانی ہوں“ اس خاتون نے جواب دیا۔

مجھے ان کی بات کا بالکل یقین نہیں آرہا تھا۔ بیگم نورانی کے بھاری بھر کم نام سے جس خاتون کی شکل ذہن میں آتی تھی یہ اس کے بالکل برعکس تھی، چنانچہ میں نے ایک دفعہ پھر اپنا سوال دہرایا کہ مجھے ملک نورانی کی بیگم سے ملنا ہے۔

”میں ہی بیگم نورانی ہوں، آپ یقین کیوں نہیں کرتے“ اس کا جواب تھا۔

بالآخر مجھے یقین کرنا پڑا۔ ہم کمرے میں آکر بیٹھ گئے میں نے اپنا تعارف کرایا اور ان کے مہمان کی آمد سے انہیں مطلع کیا۔ انہیں غالباً پہلے سے اس کا علم تھا اور وہ ہماری منتظر تھیں۔ (حمید اختر ”آشنائیاں کیا کیا“ ص 24-25)

کراچی اور حیدرآباد میں حمید اختر کی متعدد لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں لیکن بیگم و ملک نورانی، ڈاکٹر اشرف، حسن ناصر، افسانہ نگار کمانڈر انور، شاننا اور جلال الدین بخاری کے علاوہ انہوں نے کسی اور کا ذکر نہیں کیا۔ حسن ناصر کے بارے میں بھی انہیں اچھی طرح یاد نہیں ہے کہ پہلی بار وہ ان سے اسی سفر میں ملے یا بعد کے کسی سفر میں۔ البتہ باقی لوگوں سے اپنی ملاقات کا انہوں نے تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ مثلاً جلال الدین بخاری سے ان کی ملاقات بے حد دلچسپ اور کسی حد تک

پراسرار تھی۔ بخاری ان دنوں حیدرآباد جیل میں تھے جن سے پارٹی کے حوالے سے بعض اہم معلومات حاصل کرنا تھیں۔ اس کے لیے حمید اختر نے کیا ترکیب لڑائی، اس کا ذکر اپنی جگہ دلچسپ ہے:

”کراچی میں کمیونسٹ پارٹی کے تنظیمی ڈھانچے کو نئے سرے سے قائم کرنے کی کوششوں کے دوران میں پتہ چلا کہ پریس کے کاغذات، فنڈز اور دیگر معلومات کا مرید جلال الدین بخاری کے پاس ہیں۔ وہ ان دنوں حیدرآباد جیل میں تھے۔ مجھے یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ میں حیدرآباد جا کر ان سے ملاقات کروں اور یہ ساری معلومات حاصل کروں۔ ان کی بیگم شاننا گجرات کا ٹھہراواڑ کی رہنے والی تھیں۔ ان کے ساتھ طے ہوا کہ وہ ملاقات کے لیے جائیں تو میں ان کے ہمراہ جاؤں، سیاسی قیدیوں سے نزدیکی رشتے داروں کے سوا کوئی دوسرا ملاقات نہیں کر سکتا اور ملاقات کے وقت خفیہ پولیس کا ایک فسر پاس بیٹھا رہتا ہے۔ حیدرآباد جیل کے دروازے پر میں نے شاننا سے کہا تم گجراتی زبان میں بخاری صاحب سے کہہ دینا کہ یہ تمہارا بھتیجا ہے۔ ملاقات کے فارم پر میں نے اپنا نام کمال الدین بخاری لکھا اور چچا بھتیجے کے رشتے کی خانہ پری کی۔ (حمید اختر ”آشنائیاں کیا کیا ص۔ 28) سی آئی ڈی افسر کی موجودگی میں شاننا نے گجراتی زبان میں ہمارا تعارف کرایا اور یہ بھی بتایا کہ ہم ان کے بھتیجے بن کر آئے ہیں کہیں وہ اس سے انکار نہ کر دیں۔ (حمید اختر ”پرسش احوال روزنامہ ”ایکسپریس“ 2 جون 2005) انہیں شاننا کے اشارے پر میری آمد کا مقصد سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی اور باتوں باتوں میں انہوں نے مجھے ساری معلومات فراہم کر دیں جس کے بعد پریس کے کاغذات، فنڈز، کتابیں اور دوسرا تمام سامان ہمارے قبضے میں آ گیا۔ (حمید اختر ”آشنائیاں کیا کیا“ ص۔ 28)

یوں خفیہ اہلکار کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اشاروں اشاروں میں حمید اختر نے مطلب کی تمام باتیں معلوم کر لیں اور مزے کی بات یہ ہے کہ اس ملاقات کی تفصیل سے لاہور کی سی آئی ڈی اور میاں انور علی بے خبر رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ کراچی میں ان کی جائے قیام سے بھی واقف نہ ہو سکے۔ سجاد ظہیر اور حمید اختر نے ملک نورانی کے یہاں ایک ماہ سے زیادہ قیام کیا لیکن انور علی کی کتاب میں بتایا گیا ہے کہ انہوں نے فلان فلاں کے گھر میں وقت گزارا۔ میاں انور علی نے البتہ ان شکایات کا درست ذکر کیا ہے جو پارٹی کے بعض کامریڈوں کو کامریڈ بخاری سے تھیں۔ ان کے بارے میں یہ تاثر عام تھا کہ وہ اسلامی سوشلزم کی باتیں کرتے ہیں اور پارٹی لائن سے منحرف ہو رہے ہیں۔ غالباً انہی شکایات کی بنیاد پر چند ماہ بعد 1949ء میں انہیں پارٹی کی سنٹرل کمیٹی سے نکال دیا گیا اور ان کی جگہ شہید حسن ناصر کو مرکزی کمیٹی کا رکن بنا دیا گیا تھا۔

کراچی کے قیام میں وہ اور سجاد ظہیر ڈاکٹر اشرف سے بھی ملے۔ کامریڈ اشرف علالت کے باعث کراچی میں

صاحب فراش تھے۔ وہ قیام پاکستان سے بھی قبل پارٹی کی پاکستان پالیسی کے ناقد رہے تھے اور سمجھتے تھے کہ مسلم لیگ کی حمایت کر کے پارٹی فرقہ پرستی کی حمایت کر رہی ہے۔ ان کا اختلافی تھیس قیام پاکستان کے بعد پارٹی نے برسوں تک دبائے رکھا اور محض چند سال پیشتر اسے کتابی صورت میں دن کی روشنی دیکھنا نصیب ہوئی ہے۔ ڈاکٹر اشرف کلکتہ کانگریس کے فیصلوں سے بھی متفق نہیں تھے اور کل ہند پارٹی کے نئے سیکرٹری جنرل رندیوے کی انتہا پسندانہ اور مہم جویانہ پالیسیوں سے کھل کر اختلاف کرتے تھے۔ غالباً اسی پس منظر میں سجاد ظہیر نے ڈاکٹر اشرف سے ملاقات کرنا ضروری سمجھا۔ ملاقات میں حمید اختر بھی ساتھ تھے۔ اس ملاقات کی تفصیل انہی کی زبانی سنتے ہیں:

”ہمیں اطلاع ملی کہ ڈاکٹر کنور محمد اشرف کراچی میں ہیں اور بیمار ہیں ڈاکٹر اشرف سے بمبئی میں بہت ملاقاتیں رہی تھیں وہ اپنی بیگم کے ہمراہ پارٹی کے دفتر میں ہی رہتے تھے۔ ان جیسا پڑھا لکھا، حوصلہ مند، نڈر اور دبنگ آدمی کم ہی دیکھنے میں آیا ہے۔ پارٹی کے ہیڈ کوارٹرز میں نیاز مانہ، کیفی اعظمی سبھی کا تعلق شیعہ خاندانوں سے تھا۔ ان پر فقرہ بازی ڈاکٹر اشرف کا محبوب مشغلہ تھا۔ ہر شیعہ دوست کو وہ رافضی کہتے اور ان کا مذاق اُراتے رہتے۔ افسوس کہ ان کا آٹھ دس برس کا بیٹا وہیں سید ہرسٹ روڈ پر ہمارے سامنے ٹرام کے نیچے آ کر ہلاک ہو گیا جس کے بعد وہ مجھ سے گئے۔ وہ تحریر و تقریر دونوں کے دہنی تھے اور تحقیق ان کا میدان تھا۔ 1948ء کے اوائل میں پارٹی کانگریس نے جس انتہا پسندانہ پالیسی کو اپنایا وہ اس سے متفق نہیں تھے۔ اس لیے پارٹی سے وابستگی رکھنے کے باوجود عملی سیاست سے علیحدگی اختیار کر کے تحقیق کے لیے برلن جا رہے تھے۔ اب مجھے بالکل یاد نہیں کہ وہ کراچی کے کون سے علاقے میں رہائش پذیر تھے اور یہ کہ ہم لوگ کیسے اور کس کے ساتھ وہاں پہنچے تھے۔ ہاں اتنا یاد ہے کہ وہ ایک بڑے سے گھر کے ایک کمرے میں بیماری کے عالم میں پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے۔ ان کی میزبان ایک غیر ملکی خاتون تھیں۔ بنے بھائی اور میں ان سے ملنے پہنچے تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئے مگر ان کی میزبان نے انہیں بیٹھنے سے منع کیا اور بتایا کہ ڈاکٹر نے آرام کرنے کی ہدایت کی ہے۔

”وہ پورا دن ہم نے ڈاکٹر اشرف کے ساتھ گزارا اور دن بھر ان سے بحث ہوتی رہی۔ وہ پارٹی کی انتہا پسندانہ پالیسی کے خلاف دلائل دے رہے تھے۔ بنے بھائی شائستہ زبان اور شستہ لہجے میں ان کی دلیلیں رد کرتے رہے۔ مجھے اس بات کا دکھ ہے کہ میں نے ان سے بہت گستاخانہ لہجے میں بلکہ شاید بدتمیزی سے بات چیت کی۔ عقل سے تو ہم شاید اب بھی پیدل ہیں مگر اس وقت جوانی کا جوش غالب تھا اس لیے دن بھر ڈاکٹر اشرف سے پارٹی لائن کے متعلق بحث بلکہ کج بحثی کرتا رہا۔ میرے جیسے نوجوان کا ڈاکٹر اشرف سے بحث کرنا ہی احمقانہ جسارت تھی۔ بعد میں مجھے اپنے رویے پر بہت افسوس رہا مگر افسوس کہ یہ ان سے آخری ملاقات تھی اس لیے خواہش کے باوجود ان سے اپنے رویے کی معافی نہ مانگ

سکا۔“ (حمید اختر ”آشنائیاں کیا کیا“ ص-27)

کراچی میں حمید اختر کی ملاقات ترقی پسند افسانہ نگار اور ان کے لدھیانہ کے دوست اور ممبئی کے ساتھی کمانڈر انور سے بھی ہوئی۔ سید انور پاکستان نیوی میں کمانڈر کے عہدے پر فائز تھے۔ حمید اختر، سجاد ظہیر کو لے کر ایک شام ان کے پاس پہنچ گئے:

”ایک روز میں نے فون کیا کہ ایک دوست کے ہمراہ تمہارے پاس آ رہا ہوں چنانچہ بنے بھائی اور میں شام کو بحریہ کے ہیڈ کوارٹر میں پہنچ گئے۔ انور کے لیے بنے بھائی کی موجودگی باعث حیرت تھی۔ وہ ایک حد تک غیر سیاسی آدمی تھا مگر ترقی پسند مصنفین، ممبئی کے ہفتہ وار جلسوں میں شرکت کرتا رہا تھا اور ادبی حوالے سے بنے بھائی کا معترف تھا۔ ہم نے یہ خاصا خطرناک کام کیا تھا، ساری شام ہم بحریہ کے جوانوں کے کلب میں بیٹھے گیس مارتے رہے باتیں وہی تھیں، ملک کو بنانے سنوارنے کے عزائم، مسلم لیگی قیادت کا قیام، پاکستان کے مقاصد سے انحراف وغیرہ بہر حال یہ اچھے دن تھے، تابندہ روشن اور کچھ کرنے کی خواہش کے اسیر نو جوانوں کے لیے عزائم سے معمور بنے بھائی وہاں پکڑے جاتے تو انور بھی نیوی کا بڑا افسر ہونے کی بجائے جیل میں ہوتا مگر وہ سارا وقت ان کی آمد کے لیے ممنونیت کا اظہار ہی کرتا رہا۔ (حمید اختر ”آشنائیاں کیا کیا“ ص-29)

کراچی سے واپسی کا سفر بھی خاصا پر اسرار اور ڈرامائی رہا۔ اس سفر میں بھی خفیہ پولیس کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کی گئی جس میں وہ خاصے کامیاب رہے۔ اس سلسلے میں میاں انور علی کی رپورٹ میں درج معلومات ناقص اور نامکمل ہیں۔ کراچی سے لاہور واپسی خطرات سے خالی نہیں تھی۔ لاہور سٹیشن پر خفیہ پولیس یقیناً ان کی منتظر ہوگی کیونکہ کراچی سے لاہور واپسی کی بنگ سے وہ آگاہ تھی۔ اور لاہور ریلوے سٹیشن پر انہیں گرفتار کر سکتی تھی یا کم از کم لاہور میں جائے قیام تک ان کا پیچھا کر سکتی تھی۔ حمید اختر نے اس مسئلے کا بھی حل نکال لیا۔ وہ اس طرح لاہور واپس آئے کہ پولیس کو کانوں کان خبر تک نہ ہو سکی اور اُس نے اپنے اندراجات میں جولائی کی بجائے اگست میں ان کی لاہور واپسی کا اندراج کیا۔

”رپورٹ میں یہ کہا گیا ہے کہ سجاد ظہیر، حمید اختر کے ہمراہ اگست 1948ء میں لاہور لوٹے حالانکہ ہماری واپسی جولائی میں ہوئی تھی اور کس طرح ہوئی تھی اس کا خفیہ پولیس والوں کے فرشتوں کو بھی علم نہیں ہوا۔ رپورٹ میں یہ تو بتا دیا گیا ہے کہ کراچی سے لاہور آنے کے لیے ریلوے کے بنگ آفس سے سجاد ظہیر صاحب کی نشست کس نام سے ریزرو کرائی گئی تھی مگر یہ نہیں بتایا کہ نام کون سا تھا۔ کراچی سے بذریعہ ریل چلنے کے پانچ روز بعد لاہور پہنچ سکے تھے۔ ریلوے سٹیشنوں پر ان

دونوں خفیہ پولیس کے اہلکاروں کی بھرمار ہوتی تھی چنانچہ جاتے وقت بھی لاہور سے صرف ہم اس ڈبے میں سوار ہوئے جس میں ہماری نشستیں تھیں۔ سجاد ظہیر صاحب ریونڈ سے سوار ہوئے واپسی پر ہم لوگ ریٹالہ خورد اتر گئے جہاں ہمارے دو بھائی سرکاری ملازم تھے۔ اصغر علی مرحوم ریلوے میں اور صفدر علی مرحوم بجلی کے محکمے میں تھے۔ انہیں ایک سرکاری کوارٹر ملا ہوا تھا۔ بے بھائی کا تعارف میں نے پروفیسر مسعود کے نام سے کرایا کوارٹر بہت معمولی اور نا کافی تھا۔ کموڈو وغیرہ بھی نہیں تھا بلکہ پرانا کھڑی نمابیت الخلا تھا جسے سرور یحسین کے صاحبزادے چار روز استعمال کرتے رہے۔ ان کے بھاری بھر کم جسم کی وجہ سے اس میں مشکل تو بہت پیش آتی تھی مگر اس کے سوا کوئی اور صورت نہیں تھی۔ چار روز بعد کار کا انتظام کرنے کے بعد ہم ریٹالہ خورد سے لاہور پہنچے۔ ہم نے اپنے بھائیوں کو چار پانچ برس تک نہیں بتایا کہ ان کا مہمان اصل میں کون تھا۔ وہ ان کی گفتگو اور ان کے علم و فضل سے خاصے مرعوب رہے اور متعدد بار ان کے متعلق پوچھتے رہے۔ راولپنڈی سازش کیس میں چار ساڑھے چار برس کی قید کاٹنے کے بعد جب مجھ جیل بلوچستان سے رہا ہو کر وہ لاہور آئے تو انہوں نے ہمارے ان دونوں بھائیوں سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ اتفاق سے وہ دونوں اس وقت لاہور میں موجود تھے چنانچہ میاں افتخار الدین کی کرائسٹر میں جب ہم اپنے پیچھے لگی ہوئی خفیہ پولیس کی تین گاڑیوں کے ہمراہ سنگر میں واقع اپنے گھر پہنچے تو ہمارے بھائیوں کو اپنے مہمان کی اصلیت سے آگاہی ہوئی۔“

لاہور اور کراچی میں پارٹی کو منظم کرنے کی کوششوں کے بعد انہوں نے جلد ہی راولپنڈی اور پشاور کا دورہ بھی کیا۔ پشاور کا سفر سجاد ظہیر کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا اس لیے وہاں حمید اختر اکیلے ہی گئے۔ لاہور اور کراچی کے بعد انجمن ترقی پسند مصنفین پشاور میں انتہائی فعال تھی لیکن پارٹی کی تنظیم خاصی کمزور تھی۔ حمید اختر کے اس سفر کے بارے میں میاں انور علی کی رپورٹ خاموش ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حمید اختر نے پشاور کے سفر میں بھی خاصی احتیاط سے کام لیا۔

حمید اختر سجاد ظہیر کا خط لے کر پشاور گئے تھے۔ (حمید اختر انٹرویو احمد سلیم) وہاں پارٹی کی مالی حالت اچھی نہیں تھی۔ پارٹی کے ایک اہم رہنما خوشحال خان مرکز سے مالی مدد کی اپیل کر رہے تھے۔ محمد حسین عطا شاکی تھے کہ سجاد ظہیر صوبائی پارٹی کو نظر انداز کرتے ہیں۔ نئے صوبائی سیکرٹری کا مرید زیارت گل کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ بنوں کو ہاٹ ڈیرہ اسماعیل خان اور ہزارہ کے اضلاع پر توجہ دیں۔ ان حالات میں حمید اختر پارٹی ترجمان کے طور پر پشاور پہنچے۔ انہوں نے پارٹی کی صوبائی قیادت سے ملاقاتیں کیں اور پارٹی کا پیغام پہنچایا تا کہ اصلاح احوال کی جاسکے۔

پشاور میں انجمن ترقی پسند مصنفین مقابلتا زیادہ فعال تھی۔ کراچی اور لاہور کے بعد پشاور تحریک کا بڑا مرکز تھا۔

فارغ بخاری اور رضا ہمدانی اس کے رُوح رواں تھے۔ پارٹی کے معاملات سے فرصت پانے کے بعد حمید اختر انجمن کے ساتھیوں سے بھی ملے۔ فارغ بخاری انجمن کی مرکزی مجلس عاملہ کے بھی رکن تھے اور پشاور شاخ کے بھی، دیگر ارکان میں رضا ہمدانی، احمد فراز اور قمر تاتاری کے نام نمایاں تھے۔

فارغ بخاری اور رضا ہمدانی کی ادارت میں ادبی جریدہ 'سنگِ میل' نکلتا تھا۔ جو 'سوریا'، 'نقوش' اور ادب لطیف' کی طرح انجمن کا ترجمان تھا۔ یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ 'سنگِ میل' میں حمید اختر کے اس سفر کا کہیں ذکر نہیں ہے جس سے ان کی احتیاط کا اندازہ ہوتا ہے۔ خیر پشاور کا دورہ مکمل کر کے وہ سجاد ظہیر کے پاس واپس راولپنڈی پہنچ گئے۔ راولپنڈی میں وہ پروفیسر خواجہ مسعود کے گھر ٹھہرے تھے جہاں انجمن ترقی پسند مصنفین ٹریڈ یونینوں کے روابط اور سیاسی سرگرمیوں سے متعلق ان کی اہم لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ حمید اختر نے لاہور سے راولپنڈی آنے کی جو روداد قلم بند کی ہے وہ خاصی دلچسپ ہے:

”یہ سفر بذریعہ بس کیا، ہم ڈرائیور کے عقب میں بیٹھے تھے۔ برابر میں ایک باتونی مسافر بار بار سوالات کیے جا رہا تھا۔ ہمیں یہ ڈرتھا کہ بٹے بھائی کو جاننے پہنچانے والا کوئی آدمی نہ مل جائے، یا پولیس کا کوئی کارکن انہیں شناخت نہ کر لے۔ اس آدمی نے بٹے بھائی کو ادھر ادھر کی باتوں سے خاصا زچ کیا۔ ایک موقع پر اچانک اس نے پوچھا ”آپ کیا کاروبار کرتے ہیں۔۔۔؟“

”چمڑے کے سوداگر ہیں“ میں نے برجستہ جواب دیا۔ اس پر اُس نے چمڑے کی اقسام ملک میں موجودہ ٹیزیوں کی کارکردگی وغیرہ کے بارے میں اتنے ضمنی سوالات کیے کہ ہم دونوں چکرا کر رہ گئے۔ چمڑے کا سوداگر تو انہیں کرشن چندر نے قرار دیا تھا اور مجھے اور کوئی بات سمجھ میں نہ آئی تو میں نے گھبرا کر اسے دہرایا مگر متعلقہ امور کے بارے میں ہماری معلومات صفر تھیں اس لیے بڑی مشکل سے ان صاحب کو ٹالا۔“ (حمید اختر ”آشنائیاں کیا کیا“ ص 30)



حمید اختر کی دوسری قید

تحریر: مفتی محمد وحید قادری 10 دسمبر 2011ء

مئی 1952ء میں رہائی کے بعد باہر کی دنیا میں مکمل سناٹا تھا۔ ملک بھر میں ہونے والی گرفتاریوں کے باعث تمام سیاسی اور سماجی سرگرمیاں دم توڑ چکی تھیں۔ سجاد ظہیر، سبط حسن اور پارٹی کے بعض دیگر رہنما جیلوں میں تھے۔ پارٹی کے جرائد کی اشاعت اور ترسیل بڑی طرح متاثر ہو چکی تھی۔ رہائی کے کچھ عرصہ بعد ان کے دوست امتیاز علی خان نے 'جولاہور میں نواب توپ کے نام سے معروف تھے اور اُس وقت ریگل سینما کے الاٹی تھے' انہیں اس دفتر میں زبردستی بٹھا دیا جو آہستہ آہستہ ان کا مستقل ٹھکانہ بن گیا۔ (حمید اختر "پرسش احوال" لاہور ص 24) پارٹی کا سارا سلسلہ منتشر تھا لیکن حمید اختر اس سے بالکل لاتعلق نہیں ہونا چاہتے تھے۔ ہول ٹائمر کے طور پر گزارہ الاؤنس کا سلسلہ بھی بند تھا۔ کچھ تو کرنا تھا۔ پارٹی جرائد میں کام کرنے کے باعث اور سبط حسن کی تربیت کے نتیجے میں انہیں صحافت کا کچھ تجربہ ہو چکا تھا چنانچہ وہ میاں افتخار الدین کے قائم کردہ پروگریسو پیپرز لمیٹڈ (پی پی ایل) کے روزنامہ 'امروز' میں سب ایڈیٹر ہو کر آ گئے۔ کچھ ہی عرصے بعد وہ اسٹنٹ ایڈیٹر ہو گئے۔ امروز کے ایڈیٹر چراغ حسن حسرت تھے جو انجمن ترقی پسند مصنفین کی سرگرمیوں میں بھی شامل رہے تھے۔

ملک کے سیاسی حالات تیزی سے بگڑ رہے تھے۔ بائیں بازو کی قیادت کا بڑا حصہ جیلوں میں تھا پھر بھی حکومت کے اینگلو امریکی بلاک کے ساتھ بڑھتے ہوئے تعلقات تھوڑی بہت تنقید کا نشانہ بن رہے تھے۔ لیاقت علی خان جو پاکستان میں ان پالیسیوں کے بانی تھے، قتل کے بعد غلام محمد، اسکندر مرزا اور ایوب خان کا ٹولہ ان تعلقات کو مستحکم بنانے کے لیے

سرگرم عمل تھا۔ کمیونسٹ پارٹی اور بائیں بازو کے عناصر ان کے راستے کی واحد رکاوٹ تھے۔ 1951ء میں راولپنڈی سازش کے نام پر ترقی پسند قوتوں پر جو بڑا حملہ ہوا تھا اس سے پارٹی کو مکمل طور پر کچلا نہیں جاسکا تھا۔ بعض عناصر نے پی پی ایل میں پناہ لے رکھی تھی اور اینگلو امریکی بلاک کے لیے تھوڑا بہت چیلنج بن رہے تھے۔

امریکہ سے ہونے والے دفاعی معاہدے پاکستان کی آزادی اور خود مختاری کے لیے بڑا خطرہ تھے جن کی مخالفت ضروری تھی۔ 1954ء میں مشرقی پاکستان کے انتخابات نے مسلم لیگ کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی تھی۔ وزیر اعلیٰ نور الامین کو جگتو فرنٹ (متحدہ محاذ) سے انتخاب لڑنے والے ایک طالب علم نے عبرت ناک شکست دی تھی۔ 210 کے ایوان میں مسلم لیگ صرف نشستیں جیت سکی تھی۔ چند ہفتوں میں جگتو فرنٹ کی حکومت کو ہندوستان سے ساز باز کے الزام میں چلتا کر دیا گیا۔ اگلا حملہ کمیونسٹ پارٹی پر ہوا۔ پارٹی اور اس کے تمام فرنٹ خلاف قانون قرار دے کر بند کر دیئے گئے۔ پورے ملک میں بڑے پیمانے پر گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین، جو جولائی 1952ء کی کراچی کانفرنس میں 1949ء کے انتہا پسندانہ منشور کو منسوخ کر کے نیا منشور جاری کر چکی تھی، کے بیشتر ارکان کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ حمید اختر 'امروز' میں کام کر رہے تھے اور براہ راست پارٹی کی سرگرمیوں میں فعال نہیں تھے۔ وہ بھی گرفتاری کی زد میں آئے۔ ان کے ساتھ گرفتار ہونے والوں میں مرزا ابراہیم، ٹوبہ ٹیک سنگھ والے ڈاکٹر عبداللہ، کامریڈ لال خان، کامریڈ غلام محمد، سبط حسن، دادا فیروز الدین منصور، محمد افضل، عبدالرؤف ملک، شمیم اشرف بلک اور سی آر اسلم وغیرہ شامل تھے۔

اس بار حمید اختر سمیت بیشتر قیدی اے کلاس کے حقدار قرار پائے اور انہیں لاہور سنٹرل جیل کے بم وارڈ میں رکھا گیا۔ حمید اختر کی کتاب 'کال کوٹھڑی' 1953ء میں شائع ہو چکی تھی اور اس کی دھوم مچی ہوئی تھی حتیٰ کہ جیل حکام بھی اس کے مندرجات سے آگاہ تھے۔ اس بار حملہ اگرچہ بڑے پیمانے پر کیا گیا تھا لیکن گرفتار ہونے والوں کے حوصلے بھی کافی بلند تھے۔ اس بار بھی انہوں نے اسے ایک 'تفریح' کے انداز میں لیا۔ اپنی کتاب کے باعث حمید اختر جیل حکام کی توجہ کا خصوصی مرکز تھے۔ افسوس اس عہد امیری کی داستان انہوں نے یا کسی دوسرے کامریڈ نے قلم بند نہیں کی ورنہ اس 'تفریح' کے کئی ہولناک پہلو بھی سامنے آتے۔ خود حمید اختر نے اپنے چند مضامین میں اپنی 1954ء کی اسیری کے بعض واقعات بیان کیے ہیں لیکن ان میں وہ تسلسل نہیں ہے جو 'کال کوٹھڑی' پڑھ کر ملتا ہے۔

ان لوگوں نے اسیری کے پہلے دواڑھائی مہینے لاہور سنٹرل جیل کے بم وارڈ میں گزارے۔ بعد میں ان کی خوش و خرم زندگی میں بھنگ ڈالنے کے لیے انہیں مختلف جیلوں میں منتقل کر دیا گیا۔ اس بارے میں حمید اختر لکھتے ہیں:

"1954ء میں لاہور سنٹرل جیل کے بم وارڈ میں گزرے ہوئے دن بھی ہمیں کبھی نہیں بھولتے۔ ہم نے یہاں

دواڑھائی ماہ ہنتے کھیلتے گزار دیئے۔ کچھ دنوں کے لیے دادا امیر حیدر کو بھی راولپنڈی سے یہاں بھیج دیا گیا۔ جیل کے نمبردار جب سید سبط حسن کو ڈیوڑھی سے بلانے یا کوئی پیغام دینے آتے تو ان کو 'سیفٹی حسن' کے نام سے پکارتے۔ ایک نمبردار تو انہیں ہمیشہ سفل حسن کہہ کر بلاتا۔ جس پر یار لوگ بھی انہیں ایسے ہی ناموں سے یاد کرتے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سید سجاد ظہیر جنہوں نے اس ملک میں تین سال انڈر گراؤنڈ رہ کر اور پانچ سال بلوچستان کی ایک دور افتادہ جیل میں گزارے اور انہیں آزادی سے اس ملک میں رہنے کو صرف آٹھ روز ملے۔ فیض بھی جیل میں تھے راولپنڈی سازش کیس کے سرغنہ (جنرل اکبر) ان دنوں اس سنٹرل جیل ہی کے شاہی وارڈ میں تھے ہماری ان سے آشنائی یہیں ہوئی جس نے زندگی بھر ان سے دوستی کی شکل اختیار کیے رکھی۔

1954ء میں ہونے والی یہ گرفتاریاں ملک گیر پیمانے پر ہوئی تھیں اور ان سے پہلے ایک سرکاری حکم نامے کے ذریعے کمیونسٹ پارٹی کو خلاف قانون اور انجمن ترقی پسند مصنفین کو سیاسی جماعت قرار دیا جا چکا تھا، بے شمار سیاسی کارکن قلعے میں لے جائے گئے۔ ان میں سے ایک دو کو کچھ عرصہ بعد قلعے سے جیل بھجوایا گیا اور وہ ہمارے ساتھ رہے۔ قلعے میں ان پر اتنا تشدد کیا گیا کہ انہیں جیل میں نارٹل ہونے میں ہفتوں لگ گئے۔ اس دفعہ بھی سیاسی مخالفوں کی جیل میں خوش و خرم رہنے کی خبروں نے حکمرانوں کو پریشان کر دیا اور ہم درجن بھر اسیروں کو ٹولیوں کی شکل میں پنجاب کی مختلف جیلوں میں بھجوادیا گیا۔ ہمارے حصے میں میانوالی جیل آئی۔ (حمید اختر "یہ آشنا چہرے کہاں کھو گئے" آخری حصہ روزنامہ "ایکسپریس" لاہور 4 مئی 2005ء)

لاہور سنٹرل جیل جسے مسمار کر کے اب وہاں شادمان کالونی بنادی گئی ہے، ایک طویل تاریخ کی حامل تھی۔ اسی جیل میں جہاں اب شادمان چوک ہے، شہید بھگت سنگھ اور اس کے دو ساتھیوں سکھ دیو اور راجکو رد کو پھانسی دی گئی تھی۔ جس وارڈ میں حمید اختر اور ان کے دوسرے ساتھی رکھے گئے وہ انہی شہیدان آزادی کے نام پر 'بم وارڈ' کے نام سے مشہور تھا۔ 1954ء کے اسیر یہاں خاصے اچھے دن گزار کر میانوالی جیل منتقل ہوئے۔ یہ لوگ دن بھر گپ شپ کرتے، تاش کھیلتے، دھو میں مچاتے۔ بقول حمید اختر تاش میں کامریڈ لال خان کی مہات خاصی حیرت انگیز تھی۔ تاش کی بازی کے بعد شام کو یہ لوگ والی بال کھیلتے۔ انہوں نے والی بال کی باقاعدہ ٹیم بنالی تھی۔ روزانہ وہ تین گھنٹے اس میں گزارتے حمید اختر کے لفظوں میں:

"سبط حسن یہاں بھی بے قاعدگی برداشت نہ کرتے۔ ساتھیوں سے ہمیشہ اس بات پر جھگڑا ہوتا کہ جو بال ان کی طرف آ رہا تھا اسے دوسرے بھاگ کر کیوں اٹھاتے ہیں۔ آخر میں انہوں نے اپنے ارد گرد ایک دائرہ کھینچنا شروع کر دیا۔"

روزانہ اعلان ہوتا یہ میرا علاقہ ہے اگر یہاں کوئی آیا تو ہم سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ لاہور سنٹرل جیل کے یہ تین مہینے بہت اچھے گزرے۔ سبط حسن، سی آر اسلم اور افضل مرحوم دن بھر شطرنج کھیلتے۔ ہم لوگ تاش کی بازی لگاتے۔ اس کے لیے ہم وارڈ میں ہم سب کی علیحدہ علیحدہ کونٹریاں تھیں۔ وہاں ایک بڑا ہال بھی تھا جہاں کھیل بھی ہوتا، سیاسی بحثیں بھی جاری رہتیں اور لطیفے بازی کے دورے بھی ہوتے۔ جیل پہنچتے ہی میری تجویز پر ہم سب لوگوں نے احتجاج کے طور پر سر کے بال منڈوا دیے تھے۔ پورے کے پورے چودہ آدمیوں نے حجام کو بلا کر استرے سے صاف کرائے تھے۔ تیسرے دن اس زمانے کے آئی جی جیل خانہ کرنل بشیر سید آئے تو اتنے سارے سیاسی قیدیوں کے چٹیل سر دیکھ کر ہکا بکارہ گئے اور کافی دیر تک پوچھتے رہے کہ ہم نے ایسا کیوں کیا؟“ (حمید اختر ”آشنائیاں کیا کیا“ ص۔ 76-76)

سنٹرل جیل لاہور میں ہر پندرہ روز کے بعد نظر بندوں کی ملاقات آتی تھی، سگریٹ، مٹھائی، پھل اور کھانے پینے کا دوسرا سامان کافی وافر مقدار میں جمع ہو جاتا لیکن 1951-52ء کی طرح 1954ء میں بھی سبط حسن کی کوئی ملاقات نہ آتی کیونکہ لاہور میں ان کا کوئی قریبی رشتہ دار نہیں تھا۔ وہ پاپ پینے کے عادی تھے انہوں نے حقے کے دیسی تمباکو جسے وہ کھڑکتے تھے پاپ میں بھر کر پینا شروع کر دیا۔ ان کے نام کے حوالے سے حمید اختر کئی دلچسپ واقعات بیان کرتے ہیں:

”جیل کے نمبرداروں اور مشقتیوں کے لیے سبط حسن کا نام کچھ مشکل تھا۔ چنانچہ اس تمام عرصہ میں سید صاحب کو سیفٹی حسن کے نام سے پکارا جاتا۔ یہاں تک تو خیریت تھی۔ ایک روز سبط حسن کے لیے ڈیوڑھی سے بلاوا آیا۔ نمبردار نے آتے ہی اعلان کیا ”صاحب سپرنٹنڈنٹ بہادر سید سفیل حسن کو یاد کر رہے ہیں“ یاروں نے اس پر قہقہہ لگایا تو سبط حسن نے بڑی لجاجت سے کہا ’بھائیو! اس کو یہیں تک رکھنا، باہر جا کر کسی سے نہ کہنا ورنہ بھائی لوگ اسی نام سے پکارنے لگیں گے۔“ (حمید اختر ”آشنائیاں کیا کیا“ ص۔ 77)

مرزا ابراہیم کا ذکر کرتے ہوئے وہ بتاتے ہیں:

”مرزا ابراہیم کی یہ پانچویں اور دادا منصور کی چھٹی جیل یا تراتھی۔ ان دنوں ہم سب کو معلوم تھا کہ دادا کے کمرے (واقع 114 میکلوڈ روڈ جو کمیونسٹ پارٹی کا دفتر تھا) میں ایک بستر تو ان کی چار پائی پر بچھا رہتا تھا، دوسرا ہولڈال میں بند کمرے کے ایک کونے میں رکھا رہتا جو گرفتاری کے وقت وہ آسانی سے اپنے ساتھ لے جاتے۔ مرزا ابراہیم کو جیل میں زندگی بسر کرنے کی اتنی مشق تھی کہ جب رؤف ملک نے جس کی یہ پہلی جیل یا تراتھی، جیل کے قواعد کے بارے میں کچھ کہنے کی کوشش کی تو مرزا صاحب نے اسے فوراً ٹوکتے ہوئے کہا ”چپ کرو تم تو اپریٹنس ہو تمہیں جیل کے قاعدے قانون کا کیا

پتہ؟“ یاد رہے مرزا صاحب نے اپنی عملی زندگی کا آغاز محکمہ ریلوے کی ایک ورکشاپ میں اپریٹنس کی حیثیت سے کیا تھا۔ اس حوالے سے پہلی بار جیل آنے والے کو اپریٹنس کا خطاب وہی دے سکتے تھے۔“

یہ تھے لاہور سنٹرل جیل کے شب و روز۔ حکمرانوں کو ان کی یہ خوش فعلیاں پسند نہ آئیں اور انہیں میانوالی اور بعض دوسری جیلوں میں منتقل کر دیا۔ میانوالی جیل قیدیوں کے ساتھ اپنی بدسلوکی کے لیے بہت مشہور تھی۔ اس رسوائے زمانہ جیل کا سن کر حمید اختر بھی خاصے پریشان تھے۔ لاہور جیل میں جس طرح کے تین ماہ گزرے تھے اس کے بعد عادی مجرموں کی اس جیل میں جاتے ہوئے ان کا خوف محسوس کرنا بالکل فطری تھا۔ اس بارے میں وہ کہتے ہیں

”اس دفعہ ہم تنہا نہیں تھے۔ ہمارے رفقاء میں مرزا ابراہیم، کامریڈ لال خان، کامریڈ غلام محمد اور لائل پور ضلع کے کسان رہنما ڈاکٹر عبداللہ شامل تھے۔ میانوالی جیل صوبے کی سخت ترین جیلوں میں شمار ہوتی ہے اور عام طور سے یہاں عادی مجرموں کو ہی رکھا جاتا ہے خیر ہم میں سے بھی اکثر ایک طرح سے عادی مجرم ہی تھے۔ جس وارڈ میں ہمیں رکھا گیا، اس میں چند ماہ قبل تک علامہ مشرقی اور لطیف افغانی مقیم تھے۔ ہم نے اس سخت جیل میں بھی دوستوں کی رفاقت میں بڑے شاندار دن گزارے۔ البتہ ہر پندرہ روز بعد اپنے گھر والوں کی ملاقات سے محروم ہو گئے۔

”لاہور میں ہماری مرحومہ بہن ہر پندرہ روز بعد ہماری ایک چھوٹی سی بھتیجی کے ہمراہ ہم سے ملنے آ جاتی تھی۔ یہیں جو ز بھی افضل سے ملنے آتی اور ہر پندرہ روز بعد ڈیوڑھی میں ہماری بھی اس سے ملاقات ہو جاتی۔ اس کے لیے میانوالی کا سفر کرنا ممکن نہیں تھا اس لیے میانوالی میں تین چار ماہ کا عرصہ ملاقات کے بغیر ہی گزرا۔ (حمید اختر) ”یہ آشنا چہرے کہاں کھو گئے“ آخری حصہ روزنامہ ”ایکسپریس“ لاہور 04 مئی 2005ء)

میانوالی جیل پہنچ کر انہیں اپنے اہل خانہ کو اطلاع دینا تھی کہ وہ لاہور سے میانوالی جیل بھیج دیئے گئے ہیں:

”ہم سب نے جیل والوں سے خطوں کے مقررہ فارم منگوائے تاکہ اپنے اپنے اہل خاندان کو اس نقل مکانی سے مطلع کر سکیں، ہم سب نے خط مکمل کر لیے مگر لال خان خالی فارم لیے بیٹھا تھا، جب اس سے اس کی وجہ پوچھی گئی تو اس نے بتایا کہ اس کی شادی کو پانچ سال ہو گئے ہیں، شادی کے تین چار ماہ بعد وہ گاؤں سے آ گیا تھا، پھر وہ یا جیل میں رہا یا پارٹی کے دفتر میں، اس نے گھر کبھی خط ہی نہیں لکھا، اب اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بیوی کو خط لکھتے وقت اسے کس القاب سے مخاطب کرے، ہم نے چند ہی ماہ قبل شائع ہونے والے سجاد ظہیر صاحب کو بیوی کے نام چھپے ہوئے خطوں کی روشنی میں اسے بیوی کو ”میری پیاری بیوی“ کے القاب سے خطاب کرنے کا مشورہ دیا اور وہ قلم سنبھال کر یہ الفاظ تحریر کرنے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ ڈاکٹر عبداللہ تیزی سے اس کی طرف بڑھے اور قلم اس کے ہاتھ سے چھینتے ہوئے بولے ”تم پانچ برس سے

گھر نہیں گئے اب بیوی کو کس حساب میں ”میری پیاری بیوی“ لکھ رہے ہو۔ تم تو لکھو ”میری پیاری بیوی“ (حمید اختر ”احوال واقعی“ ص۔ 241)

لاہور سے میانوالی جانے کا واقعہ بھی خاص دلچسپ ہے جسے حمید اختر برسوں پہلے فراموش کر چکے تھے لیکن جسے ہمارے دوست اور ماہنامہ وارث شاہ کے مدیر مشکور صابری نے کم وبیش پچاس سال بعد انہیں یاد دلایا۔ اگست 1954ء میں جب انہیں لاہور سنٹرل جیل سے میانوالی جیل لے جایا جا رہا تھا تو مشکور صابری بھی اسی ٹرین کے اسی ڈبے سے سفر کر رہے تھے۔ ان کے بیان کے مطابق:

”ماڑی انڈس نامی جس ریل گاڑی میں ہمیں ہتھکڑی لگا کر لاہور سے میانوالی لے جایا جا رہا تھا اس ٹرین بلکہ انٹرکلاس کے اسی ڈبے میں وہ بھی سوار تھے جس میں دو کانشیلوں اور ایک تھانیدار کی معیت میں ہم سفر کر رہے تھے وہ کہتے ہیں ”میں نے دیکھا لاہور ریلوے سٹیشن کے دو نمبر پلیٹ فارم پر خاصے لوگ جمع تھے آپ کو پولیس والے انٹرکلاس کے ڈبے میں لے جا رہے تھے آپ نے کھدر کا کرتہ پاجامہ پہنا ہوا تھا۔ انٹر کے جس ڈبے میں آپ کو لایا گیا اس میں صرف میں اکیلا ہی مسافر تھا۔ تھانیدار اور دونوں سپاہیوں کے ساتھ ہتھکڑی سمیت جب آپ ڈبے میں داخل ہوئے تو بہت سے لوگ جن میں زیادہ تر مرزا ابراہیم مرحوم کی ریلوے یونین کے مزدور تھے آپ لوگوں کی طرف بڑھے جس پر تھانیدار نے پھلور پولیس کے ٹریننگ سنٹر میں سیکھی ہوئی گالیوں سے ان کی تواضع کرنا شروع کر دی جب میں نے اسے روکا اس نے پھر گالیوں کی بوچھاڑ برسائی حتیٰ کہ نعروں کی گونج میں ٹرین روانہ ہو گئی۔“ (حمید اختر ”احوال واقعی“ ص۔ 336)

لیکن میانوالی جیل میں ان کا جو غیر متوقع استقبال ہوا وہ بھی ان کی کتاب ’کال کوٹھڑی‘ کے سبب سے تھا جو ایک ہی سال قبل لاہور سے شائع ہوئی تھی۔ ساتھیوں نے انہیں ڈرا رکھا تھا کہ اس کتاب کے باعث ان کے ساتھ تو ہرگز اچھا سلوک نہیں ہوگا۔ خود انہوں نے سن رکھا تھا کہ میانوالی جیل عادی مجرموں کے لیے مخصوص ہے جہاں قیدیوں کے ساتھ وحشیانہ سلوک ہوتا ہے:

”ساری رات کے سفر کے بعد جب صبح سویرے ہم لوگ میانوالی جیل پہنچے تو وہاں یہ خوف اور بڑھ گیا۔ ہم تین چار قیدی تھے۔ ڈیوڑھی میں جو نہی داخل ہوئے تو تین جیل افسر ہمارے استقبال کے لیے وہاں پہلے سے کھڑے تھے رسی ملاقات کے بعد ان میں سے جیل کے ڈاکٹر صاحب نے جو ضلع کے سول سرجن بھی تھے اچانک سوال کیا ”آپ لوگوں میں سے حمید اختر کون ہے؟“ یہ سن کر ہمارے پاؤں تلے سے تو زمین نکل گئی اس لیے کہ چند ماہ قبل ہماری پہلی اسیری کی داستان سے متعلق کتاب ’کال کوٹھڑی‘ شائع ہو کر مارکیٹ میں آچکی تھی جس میں جیل حکام کے مظالم اور غیر انسانی سلوک

کی بہت سی کہانیاں درج تھیں، خصوصی طور سے ہمارے بارے میں جب جیل کے ایک افسر نے استفسار کیا تو ہم نے سوچا اب خیریت نہیں یہ لوگ ہمیں الٹا لگانے سے بھی گریز نہیں کریں گے لیکن سول سرجن صاحب نے فوراً حکم صادر کیا ”حمید اختر کو ہسپتال میں داخل کر دیا جائے اس کی خوراک میں روزانہ ایک ڈبل روٹی، ایک مرغی، ایک سیر دودھ، چار انڈے۔ ابھی ان کی یہ گردان جاری تھی کہ ہم نے احتجاج کیا ہم بیمار نہیں ہیں اور ہسپتال میں رہنے کی بجائے اپنے دوستوں کے ساتھ وارڈ میں رہنا چاہتے ہیں۔“ اس پر ڈاکٹر صاحب نے فرمایا آپ وارڈ ہی میں رہیں گے، صرف ٹیکنیکل طور پر آپ کو ہسپتال میں داخل کیا جا رہا ہے۔ پھر ہم نے ان سے گزارش کی کہ ہم اے کلاس کے قیدی ہیں، ہمارے لیے جیل کی مقررہ خوراک ہی بہت کافی ہے یہ اتنا کچھ جو آپ ہمیں دے رہے ہیں اتنا تو ہم کھا ہی نہیں سکتے، ہمیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔

”ہماری اس گزارش کے جواب میں جیل ڈاکٹر نے جو کچھ فرمایا۔۔۔ اندازہ ہو جاتا ہے اور پتہ چلتا ہے کہ جیلوں کے اہل کاروں کی ذہنیت کیا ہوتی ہے، انہوں نے کہا ”یہ خوراک آپ سب لوگ مل جل کر کھائیں اور عیش کریں البتہ (ہاتھ باندھ کر) کال کوٹھڑی کی قسم کی کوئی دوسری کتاب نہ لکھیں، ہم نے ان سے کہا آپ بھی ہم سے وہ سلوک نہ کریں جو 1951-52ء میں لاہور سنٹرل جیل اور ملتان ڈسٹرکٹ جیل کے افسروں نے ہمارے ساتھ روا رکھا اور جس کے نتیجے میں یہ کتاب معرض وجود میں آئی۔ اس کا انہوں نے وعدہ کیا اور اس کا پاس بھی رکھا، چنانچہ اگست ستمبر 1954ء سے لے کر جنوری 1955ء تک ہم لوگوں نے عادی مجرموں کی اس جیل میں بڑا اچھا وقت گزارا۔“ (حمید اختر ”آپ نے یاد دلایا تو مجھے یاد آیا“ ص۔ 336)

حمید اختر اور ان کے ساتھیوں نے اپنی نظر بندی کے خلاف رٹ دائر کر رکھی تھی چنانچہ جنوری 1955ء میں اس کی سماعت کے لیے نظر بندوں کو کیسبل پور اور میانوالی جیلوں سے لاہور لایا گیا اور ہائی کورٹ کے حکم سے وہیں سے رہا کر دیا گیا۔ جس روز رہائی عمل میں آئی، اس سے ایک روز قبل سعادت حسن منٹولا لاہور میں انتقال کر گئے۔ رہائی کے بعد حمید اختر دوبارہ روزنامہ ’امروز‘ سے وابستہ ہو گئے۔



حمید اختر جیل میں (تیسری بار)

تحریر: حافظ محمد قاسم جہاں اعوان 26 مارچ 2011ء

جنوری 1955ء میں رہائی کے بعد حمید اختر نے دیکھا کہ تحریک تتر بتر ہو چکی تھی۔ اسی سال فیض، سجاد ظہیر اور راولپنڈی سازش کیس کے دوسرے ”مجرم“ بھی رہا کر دیئے گئے۔ سجاد ظہیر مجھ جیل سے رہا ہو کر دو ہفتے تک ٹوا بزا دہ امتیاز علی کے گھر میں مقیم رہے۔ اس دوران انہوں نے پاکستانی شہری کے طور پر پاسپورٹ کے لیے درخواست دی تاکہ ہندوستان جا کر اپنی بیمار والدہ کو دیکھ سکیں، جو ان کے لیے تڑپ رہی تھیں۔ لیکن راولپنڈی سازش کیس کے بانی اسکندر مرزا نے جو اس وقت پاکستان کے وزیر داخلہ بن چکے تھے، پاکستانی پاسپورٹ جاری کرنے کی بجائے انہیں بغیر دستاویزات کے سرحد پار بھجوانے کی ہدایات جاری کیں تاکہ وہ پاکستان واپس نہ آسکیں۔ ادھر ہندوستان میں وزیر اعظم جواہر لعل نہرو کی ذاتی مداخلت کے باعث انہیں ہندوستان میں داخل ہونے کی اجازت ملی۔

انگلی دودھائیوں میں پاکستان تین مارشل لاؤن اور ملک کے دو لخت ہونے کے صدے سے گزرا۔ 1956ء میں حمید اختر کی شادی ہوئی۔ پہلے وہ 1959ء میں ’امروز‘ سے نکالے اور پھر 71-1970ء میں وہ پھر ادارے سے باہر کر دیئے گئے۔ 1977ء کے مارشل لاء کے بعد سیاسی ابتری اور شہری آزادیوں کی پامالی اپنے عروج کو پہنچ گئی۔ پیپلز پارٹی، بھٹو خاندان اور پارٹی کارکنوں کے خلاف تشدد انتہا کو پہنچ گیا۔ 1981ء میں حمید اختر کو ایک بار پھر گرفتار کر لیا گیا۔

”مارچ 1981ء میں جب پی آئی اے کا ایک جہاز اغوا ہوا تھا اس وقت جنرل ضیاء کی مارشل لاء کی حکومت نے ملک کے تقریباً ہر قابل ذکر شخص کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا تھا۔ جمہوریت پسند سیاسی کارکنوں کی عام گرفتاریوں کے

بعد جنرل ضیاء کے لیے آئین میں تبدیلیاں کر کے عارضی آئین نافذ کرنا ممکن ہو سکا اس لیے بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ طیارے کے اغوا میں خود اس وقت کی حکومت کا ہاتھ تھا جس نے اس کو بہانہ بنا کر ملک کے تمام ترقی پسند اور روشن خیال افراد کو پابند سلاسل کر دیا۔ کوٹ لکھپت جیل لاہور میں ہم بہتر کلاس کے قیدیوں کی تعداد اسی کے قریب تھی۔ سی کلاس قیدیوں کی تعداد جن کا تعلق مختلف سیاسی جماعتوں سے تھا، سینکڑوں تک بنتی تھی پھر یہ معاملہ لاہور تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ ملک کی تمام جیلیں سیاسی قیدیوں سے بھری ہوئی تھیں۔ لاہور کے بہتر کلاس کے قیدیوں میں میاں محمد علی قصوری مرحوم، راؤ رشید، ڈاکٹر مبشر، فلم سٹار محمد علی، نواب زادہ مظہر علی خان، جسٹس (ر) سعید حسن ملک، شعیب ہاشمی، رضا کاظم، سی آر اسلم، حبیب جالب، آئی اے رحمان، عبد اللہ ملک، رؤف ملک، احسان وائیں، انور مہدی اور سی آر اسلم شامل تھے۔“ (حمید اختر ”پرسش احوال“ ص 34-133)

حمید اختر نے ساری زندگی ترقی پسندی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ وہ بڑی استقامت سے اپنی نظریاتی پوزیشن کے ساتھ عمر بھر لکھنے پڑھنے کا کام کرتے رہے لیکن 1950ء کی دہائی کے بعد وہ کمیونسٹ پارٹی سمیت عملی سیاست سے دور ہی رہے۔ ان کے اپنے لفظوں میں:

”1981ء میں جب ہمیں گرفتار کیا گیا تو ہم کوئی سیاسی کام نہیں کرتے تھے۔ گرفتاری کے بعد وفاقی خفیہ پولیس کے نمائندے جو ایک ریٹائرڈ کرنل تھے اپنی بیگم کے ہمراہ ہمارے گھر پہنچے اور قسمیں کھا کھا کر ہماری بیوی بچوں کو یقین دلاتے رہے کہ اگرچہ اس قسم کی گرفتاریوں کی سفارش کرنا ان کے فرائض میں شامل ہے مگر انہوں نے ہماری گرفتاری کے لیے نہ کسی سے کہا اور نہ کسی نے ان سے پوچھا، چند روز بعد جیل میں صوبائی سپیشل برانچ کے ایک ڈی ایس پی ہم سے ملنے کے لیے آئے اور جمائل شریف پر ہاتھ رکھ کر قسمیں کھانے لگے کہ ہماری گرفتاری میں ان کا کوئی دخل نہیں ہے بہر حال پانچ چھ ماہ جیل میں رگڑے کھانے کے بعد رہائی پر پتہ چلا کہ ہماری پرانی فائل کسی طرح مارشل لاء کی کسی خفیہ ایجنسی کے ہاتھ میں آگئی تو انہوں نے اس میں ہمارا کوئی ایسا جرم دیکھ لیا جو ہم سے 1952ء میں سرزد ہوا تھا اس لیے انہوں نے 1981ء میں ہمیں گرفتار کرنے کا حکم دیدیا۔ (حمید اختر ”پرسش احوال“ (ان خفیہ اداروں سے خبردار رہئے) ص 38-39)

سیاسی کارکنوں خصوصاً بائیں بازو سے متعلق افراد کی خفیہ فائلیں کبھی بند نہیں ہوتیں۔ یہ ہمیشہ کھلی رہتی ہیں اور جب ملک میں کوئی سیاسی طوفان برپا ہوتا ہے (خصوصاً مارشل لاء کا نفاذ) تو یہ لوگ انہی فائلوں کی بنیاد پر فوراً گرفت میں آجاتے ہیں۔

خفیہ ایجنسیوں کی رپورٹیں ایک سیاسی کارکن کی فرد جرم میں مسلسل اضافہ کرتی رہتی ہیں۔ ہم گزشتہ صفحات میں میاں انور علی کی خفیہ رپورٹ کا ذکر کر چکے ہیں جن میں حمید اختر سمیت کیونسٹ پارٹی کے اکثر کارکنوں کے بارے میں فرضی کہانیاں درج ہیں۔ بہر حال یہ حمید اختر کا اعزاز ہے کہ وہ پاکستان کی تاریخ کے سب سے ہولناک دور میں بھی جب وہ اپنی عمر کی چھٹی دہائی مکمل کرنے والے تھے اپنے نوجوان ساتھیوں سے کسی طرح پیچھے نہیں رہے لیکن اس دور میں یہ اعزاز کچھ ایسے لوگوں کو بھی ملا جو اس کے زوادر نہیں تھے۔ ایسی ہی ایک شخصیت کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے:

”1981ء میں جب صدر ضیاء کے دور میں ہمیں صبح چار بجے گرفتار کر کے ریس کورس روڈ کی پولیس چوکی لے جایا گیا تو ہم سے پہلے وہاں اداکار حبیب ایک چار پائی پر دراز تھا۔ ہم نے سمجھا وہ یہاں شاید پولیس والے اپنے کسی رشتے دار سے ملنے آیا ہوا ہے لیکن جب اس نے بتایا کہ اسے بھی پولیس گرفتار کر کے یہاں لائی ہے اور وارنٹ پر چھ مہینے کی نظر بندی کا اندراج ہے تو ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی اس لیے کہ یہ گرفتاریاں عام طور سے پیپلز پارٹی کے ہمدردوں یا بائیس بازو سے تعلق رکھنے والوں کی ہوتی تھیں اور اداکار حبیب ہمارا دوست ہونے کے باوجود نہ تو بائیس بازو سے تعلق خاطر کا ملزم تھا اور نہ پی پی پی کا ہمدرد تصور کیا جاتا تھا۔ بلکہ گزشتہ انتخابات میں اس نے پیپلز پارٹی کے امیدوار کا مقابلہ کیا تھا اور اس یدھ میں اسے چودھری ظہور الہی کی حمایت حاصل تھی اسی لیے اس کی گرفتاری کی وجہ ہماری سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ بہر حال اسے بھی ہمارے ساتھ کوٹ لکھپت جیل میں بھجوا دیا گیا جہاں ہم اے اور بی کلاس والوں کی تعداد 80 کے قریب تھی۔ سی کلاس والے سیاسی کارکنوں کی تعداد جو سینکڑوں میں تھی، اس کے علاوہ تھی۔ حبیب نے اس ہجوم میں بیس بائیس دن گزارے۔ اس کے بعد اسے مارشل لاء کے دفتر میں طلب کر کے بتایا گیا کہ سعادت حسن منٹو کی زبان میں اس کی گرفتاری میں مسٹیک ہو گئی ہے اور اسے گوجرانوالہ میں پیپلز پارٹی کا ایک کارکن حبیب سمجھتے ہوئے گرفتار کرایا گیا تھا۔ اتفاق سے دونوں کے والد بھی ہم نام تھے۔ (حمید اختر ”پرسش احوال“ (خفیہ ایجنسیوں سے خبردار رہئے) ص 174-173)

”ایک خفیہ ایجنسی سے دوسری متعلقہ ایجنسی نے استفسار کیا کہ حمید اختر کے تعلقات سوویت روس، ہندوستان اور مشرقی یورپی سوشلسٹ ممالک کے سفارتکاروں سے بہت زیادہ ہیں، حکومت پاکستان چونکہ ان سب کو پاکستان دشمن تصور کرتی ہے اس لیے معلوم کیا جائے کہ روسی یا ہندوستانی سفیر سے حمید اختر کے تعلقات کی نوعیت کیا ہے اور ان سرگرمیوں کے اصل مقاصد کیا ہیں۔ اس کے متعلق نوٹ اور جوابی نوٹ لکھے جاتے رہے۔ چھ ماہ تک کوئی ساٹھ صفحے کی فائل بن گئی آخر میں جب یہ ساری رپورٹیں اعلیٰ افسر تک پہنچیں تو اس نے آخری اور فیصلہ کن نوٹ لکھا۔

”حمید اختر کی سرگرمیاں مشکوک ہیں اس لیے اس کی دونوں بیٹیوں صبا پرویز اور ہما حمید کے ٹیلی ویژن ڈراموں

میں حصہ لینے پر پابندی عائد کر دی جائے۔“ (حمید اختر ”پرسش احوال“ (ان خفیہ ایجنسیوں سے خبردار رہئے) ص۔ 39)

یہ جیل یا ترا اس پہلو سے نہایت دلچسپ تھی کہ کم و بیش 27 برس بعد وہ جیل میں ایک بار پھر بہت سے نئے اور پرانے ساتھیوں، سیاسی مدبروں، شاعروں، صحافیوں اور شو بزنس کے لوگوں کی سنگت میں نئی طرح کی خوش فعلیوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے:

”کوٹ لکھپت جیل کے سیاسی وارڈ کے جس کمرہ میں میاں محمد علی قصوری، راؤ رشید رضا کاظم اور آئی اے رحمان تھے اس کا نام ہم نے پریزیڈنسی رکھا ہوا تھا۔ ساتھ والے کمرے میں مظہر علی خان، ملک سعید حسن، محمد علی اور شعیب ہاشمی تھے جو فائیو سٹار ہوٹل کہلاتا تھا۔ اس کے برابر والے کمرے میں سی آر اسلم، احسان وائیں اور انور مہدی تھے اس کا نام ہم نے لاہور ہوٹل رکھا ہوا تھا۔ اب ہوتا یہ تھا کہ صبح شام احباب کسی ایک کمرے میں جمع ہو کر بحث مباحثہ میں مصروف رہتے، کبھی قصوری صاحب کے کمرے میں، کبھی مظہر صاحب کے دربار میں اور کبھی ہمارے غریب خانے پر ایک روز ہم سب لوگ مظہر صاحب کے کمرے میں جمع تھے اور بڑے زوروں سے سیاسی بحث جاری تھی۔ ایسے موقع پر عام طور پر جسٹس (ر) سعید حسن کسی دوسرے کو کم ہی بولنے دیتے تھے، سعید حسن بڑے دلچسپ، خوش طبع اور خوبصورت آدمی ہیں اس لیے لوگ ان کو بولنے کا پورا پورا موقع دیتے تھے۔ اس روز بھی وہ کسی سیاسی گتھی کو سلجھانے کی کوشش میں مصروف تھے۔ جب بات ان کی سمجھ میں نہ آئی تو انہوں نے بلند آواز سے کہا ”اس بارے میں مظہر صاحب کو یقیناً زیادہ پتہ ہو گا وہی بتائیں“ ”مجھے اس موضوع کے بارے میں قطعاً کوئی علم نہیں“ مظہر علی خان نے جواب دیا۔ سعید حسن بولے ”خیر مظہر صاحب! یہ تو آپ کم ظرفی سے کام لے رہے ہیں ورنہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ کو پتہ نہ ہو“

کم ظرفی سے کام لینے کی بات پر ہم سب لوگ حیرت بلکہ دہشت زدہ ہو گئے۔ ہمارے خیال میں یہ سن کر مظہر علی خان اگر سعید حسن کو گھونسنہ نہیں مار دیں گے تو گالی ضرور دیں گے مگر ہم نے یہ دیکھا کہ سب لوگ سخت پریشان ہیں سوائے سعید حسن اور مظہر علی خان کے، مظہر صاحب نے بھی دوبارہ ہنستے ہوئے اپنی لاعلمی پر ہی اصرار کیا۔

بعد میں معلوم ہوا کہ مظہر علی خان اور سعید حسن دونوں اُردو سے نابلد ہونے کی وجہ سے بے خبر رہے۔ سعید حسن کسر نفسی کی بجائے کم ظرفی کی ترکیب استعمال کرتے رہے اور مظہر علی اس کو اُردو کا کوئی تعریفی جملہ سمجھتے رہے۔ (حمید اختر ”پرسش احوال“ (بوڑھے لوگوں کی مجبوریاں) ص۔ 134)

حمید اختر اگر ضیاء دور کی جیل یا ترا کا بھی تفصیلی یادداشت نامہ رقم کر سکیں تو اس دور کا ایک ایسا مستند ریکارڈ محفوظ ہو جائے گا جسے شاید ہی کوئی اور اس انداز میں لکھ پائے۔

حمید اختر بے مثال صحافی

تحریر خالد یزدانی 28 ستمبر 2012ء

کیونسٹ پارٹی اپنے ابتدائی دور سے ہی انگریزی، اردو، پنجابی اور دیگر زبانوں میں ہفت روزہ اخبارات کا اجراء کر چکی تھی۔ 1930ء کی دہائی میں پارٹی پر پابندی لگ گئی اور ان پر چوں کا جاری رکھنا مشکل تر ہوتا گیا۔ 1939ء میں جب دوسری عالمی جنگ کا آغاز ہوا تو پارٹی نے مشکل حالات کے باوجود اسے سامراجی جنگ قرار دیا۔ 1942ء میں حالات نے پلٹا کھایا۔ جرمنی نے سوویت یونین پر بھی حملہ کر دیا جس کے نتیجے میں مغربی اتحادیوں کے ساتھ اس کا معاہدہ طے پایا تاکہ فاشٹ محوری قوتوں کو مل کر شکست دی جاسکے۔ 1942ء کے بعد سوویت یونین نے اسے 'عوامی جنگ' قرار دیا۔ ہندوستان میں بھی پارٹی نے اس نئی پالیسی کے تحت برطانوی حکومت کے ساتھ اشتراک عمل کا آغاز کیا۔ ہندوستان کی کیونسٹ پارٹی پر سے پابندی اٹھالی گئی اور فیض سمیت متعدد کمیونسٹوں نے جنگ میں اپنی خدمات پیش کر دیں۔ پارٹی نے انگریزی میں 'پیپلز وار' اور اردو میں 'قومی جنگ' کے نام سے دو ہفت روزوں کا اجراء کیا۔

اسی دوران 'کیونسٹ پارٹی' نے ایک طرف ہندو مسلم اتحاد کی بات کی تو دوسری طرف 'حق خود ارادیت' کی بنیاد پر مسلمانوں کے لیے ایک الگ وطن کے مطالبے کی حمایت کی۔ اس پالیسی کے نتیجے میں پارٹی کانگریس سے دور اور مسلم لیگ کے قریب آتی گئی۔ 'قومی جنگ' میں سید سجاد ظہیر، سید سبط حسن اور ڈاکٹر اشرف وغیرہ مستقل لکھنے والے تھے۔ جنگ ختم ہوئی تو یہ دونوں ہفت روزے 'نیو ایج' اور 'نیاز مانہ' کے نام سے شائع ہونے لگے۔ راقم الحروف کے آرکائیوز میں 1946ء کی 'نیاز مانہ' کی فائلیں محفوظ ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد ابتدائی چند مہینے غیر یقینی کیفیت رہی۔ 1948ء کی کلکتہ کانگریس میں جب ہندوستان کی پارٹی سے علیحدہ ہو کر کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان وجود میں آئی تو صورت حال واضح ہوئی۔ سید سجاد ظہیر پارٹی کے سیکرٹری جنرل مقرر ہو کر خفیہ طور پر پاکستان آگئے اور پنہاں رہ کر کام کرنے لگے۔ سبط حسن بھی پاکستان کے حصے میں آئے اور نیاز مانہ کی ترتیب و اشاعت کی ذمہ داری نبھانے لگے۔

پنجاب سی آئی ڈی کی ایک رپورٹ میں جو مارچ 1952ء میں شائع ہوئی، سبط حسن کی ایک تحریر کا ذکر ہے جسے 'نیاز مانہ' کے بارے میں ہدایت کا عنوان دیا گیا ہے:

”پارٹی کی باضابطہ تنظیم کے لیے ایک باقاعدہ جریدے کی اشاعت انتہائی ضروری ہے۔ چنانچہ ہمارے سیل نے ہفت روزہ 'نیاز مانہ' کے اجراء کا فیصلہ کیا ہے۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل فیصلے کیے گئے ہیں۔

(1) 'نیاز مانہ' کا اپنا ایک دفتر ہوگا جہاں سیل کے ارکان اخبارات کی خریداری سمیت اپنے کام سرانجام دیں

گے۔

(2) سیل کے ارکان درج ذیل ہوں گے۔

- | | |
|-----|-----------------|
| (۱) | عبداللہ ملک |
| (۲) | محمد صفدر (میر) |
| (۳) | حمید اختر |
| (۴) | مراد (سبط حسن) |

تقسیم کار:

عبداللہ ملک: مدیر ہوں گے۔ وہ دفتر کی طرف سے تفویض کردہ تمام ذمہ داریاں پوری کریں گے۔ وہ سیل کے سیکرٹری ہوں گے اور ہر ہفتے کام کی رپورٹ دیا کریں گے۔

صفدر (میر): ادبی صفحات کے انچارج ہوں گے۔ وہ لائبریرین کا کام بھی سرانجام دیں گے۔ وہ اخبارات، کتابیں اور کتابچے وغیرہ خریدیں گے اور کتابوں کے نگران ہوں گے۔

حمید اختر: اخبار کے منبج ہوں گے۔ اور حساب کتاب رکھیں گے۔ وہ اخبار چھپوانے اور ڈاک یا ریل کے ذریعے اس کی ترسیل کا انتظام کریں گے۔ ادائیگیوں کی وصولی کریں گے وہ سیل کو اپنی ہفتہ وار رپورٹ دیں گے جو مرکز کو بھیجی جائے گی۔

مراد (سبط حسن) : 'نیا زمانہ' کے نگران ہوں گے۔ چھپنے والے مضامین کی تدوین کریں گے۔ مرکز کی جانب سے وہ سیل کے ساتھیوں کی مدد کریں گے۔ وہ سیل کی طرف سے مرکز کو جوابدہ بھی ہوں گے۔

سیاسی تعلیم: صفدر اپنے دیگر ساتھیوں کی مشاورت سے سیاسی تعلیم اور مباحث کا پروگرام مرتب کریں گے اور اس کا ریکارڈ رکھیں گے۔ (D.I.G C.I.D Punjab. The Communist Party of West Pakistan in action , Sector , Lahore 1952 . Volume 1 Page 216-217)

1949ء کے اوائل میں حکومت نے 'نیا زمانہ' سے تین ہزار روپے کی ضمانت طلب کی جس کے خلاف سبط حسن نے لاہور ہائی کورٹ میں رٹ دائر کر دی۔ اعلیٰ عدالت نے حکومتی فیصلے کے خلاف حکم امتناعی جاری کر دیا، لیکن حکومتی دباؤ کے باعث کوئی پریس 'نیا زمانہ' چھاپنے کے لیے تیار نہ ہوا۔ پارٹی جس پریس میں جاتی، پرچے کی چھپائی سے انکار کر دیا جاتا۔ اس صورت حال کے باعث مرزا اشفاق بیگ نے سبط حسن کو سائیکلو سٹائل خبر نامے چھاپنے کی ہدایت کی۔ 'سیاست نامہ' کے عنوان سے دس شمارے شائع کیے گئے۔ سائیکلو سٹائل کا کام حمید اختر اور مرزا اشفاق بیگ نے کیا۔ بعد ازاں یہ کام شبیر انصاری، محمود قزلباش، حمید ہاشمی اور عبدالرؤف ملک کرتے رہے۔ (D.I.G C.I.D Punjab. The Communist Party of West Pakistan in action , Sector , Lahore 1952 .

Volume 2 Page 379)

یہ سلسلہ بھی زیادہ دنوں تک نہ چل سکا۔ اب پارٹی سیل نے نیا ڈیکلریشن حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ فیروز الدین منصور کے ایک واقف کار الطاف پرواز 'سحر' کے طابع اور ناشر تھے۔ جنہوں نے پارٹی کو اپنے جریدے کا نام استعمال کرنے کی اجازت دے دی۔ حکومت نے اس کے لیے بھی پارٹی سے 300/- روپے زر ضمانت طلب کیا جو ادا کر دیا گیا۔ الطاف پرواز نے جب اخبار کے سلسلے میں پارٹی کی مجبوریاں دیکھیں تو نئے مطالبے شروع کر دیئے۔ انہوں نے تقاضہ کیا کہ وہ ہر ماہ ڈیکلریشن کا 50/- روپے معاوضہ لیں گے۔ پارٹی نے پہلے دو ماہ کے لیے 100/- روپے ادا کر دیئے۔ تیسرے مہینے الطاف پرواز نے پھر 100/- روپوں کا مطالبہ کر دیا۔ یہ رقم بھی ادا کر دی گئی لیکن الطاف پرواز نے اپنے تقاضے جاری رکھے۔ پارٹی ان روز روز کے تقاضوں اور بلیک میلنگ سے تنگ آ گئی اور 'سحر' کی اشاعت کا سلسلہ ختم کر دیا (D.I.G

C.I.D Punjab. The Communist Party of West Pakistan in action , Sector , Lahore 1952 . Volume 2 Page 380-381)

بعد ازاں 'ارتقاء' کے نام سے ایک ماہانہ جریدہ شروع کر دیا گیا جس کے کل دو شمارے شائع ہوئے۔ 'ارتقاء' کا

ڈیکلریشن حمید اختر کے دوست اکرام لدھیانوی کے نام پر تھا۔ سجاد ظہیر خود اس کے مدیر تھے۔ اس کی اشاعت کی ذمہ داری بھی 'نیا زمانہ' کے سیل پر تھی لیکن دو ہی شماروں کے بعد کوئی بھی پریس اسے چھاپنے کے لیے راضی نہ ہوا۔ 'سحر' کے بعد نومبر 1950ء میں 'اپنا وطن' کے نام سے ایک اور اجازت نامہ حاصل کیا گیا جو عبدالرؤف ملک کے دوست شیخ محمود کے نام تھا۔ سی آئی ڈی کی رپورٹ کے مطابق 'اپنا وطن' کا پہلا شمارہ 7 جنوری 1951ء کو شائع ہوا۔ اس وقت سیل کے ارکان میں بشیر ظفر اور احمد راہی کا اضافہ ہو چکا تھا۔ فروری یا مارچ 1950ء سے فیروز الدین منصور بھی اس سیل کا حصہ بن چکے تھے۔ شیخ محمود کی طرف سے پارٹی نے -/500 روپے کا زر ضمانت جمع کروایا۔ اپریل 1951ء میں اپنے "باغیانہ مواد" کی وجہ سے اسے بھی چھ ماہ کے لیے بند کر دیا گیا۔ (D.I.G C.I.D Punjab. The Communist Party of West Pakistan in action , Sector , Lahore 1952 . Volume 2 Page 380-381)

حکومت نے پرچے کے لیے -/500 روپے کا زر ضمانت طلب کیا جو شیخ محمود کی طرف سے جمع کروا دیا گیا۔ جب ہر پریس نے پرچہ چھاپنے سے انکار کر دیا تو سیل نے نیو ایگل پریس کے الائی محمد اسحاق جو احمد راہی کا دوست تھا، کے ساتھ پرچے کی اشاعت کے انتظامات طے کیے بشرطیکہ پارٹی خود اپنا ٹائپ فراہم کرے۔ نیا ٹائپ خریدا گیا اور اپنا وطن دوبارہ چھپنا شروع ہوا۔ اس مرحلے پر پارٹی نے محسوس کیا کہ اس کا اپنا پریس ہونا چاہیے۔ اس کے لیے فنڈز اکٹھے کیے گئے۔ شیخ محمود کے پاس محمود پرنٹنگ پریس کا ڈیکلریشن موجود تھا جس کی طرف سے -/1000 روپے جمع کروا دیے گئے۔ پریس کے لیے عبداللہ ملک نے نسبت روڈ پر -/40 روپے ماہانہ کرایہ پر جگہ حاصل کی جہاں ایک دستی پریس نصب کیا گیا۔ بعد میں 'اپنا وطن' کو پھر بند کر دیا گیا، اپریل 1951ء میں سبط حسن کی گرفتاری کے بعد پریس کافی عرصے کے لیے بند رہا۔ کچھ عرصہ بعد عبدالرؤف ملک نے پرچے کا زر ضمانت مبلغ -/300 روپے اور پریس کا زر ضمانت مبلغ -/1000 روپے واپس لے لیے۔ سی آئی ڈی کی رپورٹ کے مطابق پارٹی نے پرچے کی اشاعت ختم کر دی۔ سبط حسن 'نیا زمانہ' کی ماہانہ رپورٹیں اشفاق مرزا یا سجاد ظہیر کو بھیجا کرتے تھے۔ سیل کے ہول ٹائم ارکان میں حمید اختر کو -/60 روپے ماہانہ اور فیروز الدین منصور، بشیر ظفر اور احمد راہی کو -/50 روپے ماہانہ الاؤنس ملتا تھا۔ (D.I.G C.I.D Punjab. The Communist Party of West Pakistan in. action , Sector , Lahore 1952 . Volume 2 Page 381-382)

یہ واقعات پنجاب سی آئی ڈی کی رپورٹوں سے لیے گئے ہیں جن میں مبالغہ آرائی کے باوجود اس بات کا اندازہ

کیا جاسکتا ہے کہ پارٹی کی 'صحافت' کتنے جان جوکھوں کا کام تھا اور حمید اختر کو اس سلسلے میں کیسی کیسی مشکلات سے نہیں گزرنا پڑتا ہوگا۔

'نیازمانہ' سحر اور اپنا وطن' کا صحافتی معیار اچھا تھا۔ اس سلسلے میں حمید اختر سبب حسن کو اپنا استاد قرار دیتے ہیں۔

"سبب حسن میرے دوست ہی نہیں استاد بھی تھے۔ لاہور آنے کے بعد وہ کمیونسٹ پارٹی کے ہفت روزہ 'نیازمانہ' کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ مگر چونکہ ان کی گرفتاری کے وارنٹ تھے اس لیے وہ 'زیر زمین' رہ کر چہ مرتب کرتے تھے۔ بظاہر میں اس اخبار کا ایڈیٹر تھا۔ احمد راہی اور بشیر ظفر ایڈووکیٹ بھی اس اخبار میں رضا کارانہ طور پر کام کرتے تھے۔ حکومت نے 'نیازمانہ' کا ڈیکلیریشن منسوخ کر دیا تو اپنا وطن' سحر اور دوسرے ناموں سے ہم ہی لوگ یہ پرچہ شائع کرتے رہے۔ میں صحافتی دنیا میں نو وارد تھا۔ چند ادبی کہانیاں ضرور لکھ چکا تھا۔ اخبار نویس سبب حسن سے سیکھی۔ ہر ہفتے موضوعات پر لکھنے کے لیے مختلف دوستوں کی ڈیوٹی لگتی۔ میرا کام ان تمام مسودات کو جمع کر کے سبب کو پہنچانا اور پھر ان کی قطع و برید کے بعد کتابت کر کے شائع کرانا تھا۔ ابتداء ہی میں مجھے کسی خاص موضوع پر لکھنے کی ذمہ داری سونپی گئی مجھے یاد ہے سبب نے میرا آدھے سے زیادہ مضمون کاٹ کر پھینک دیا۔ میں چونکہ ادب کا طالب علم تھا اس لیے لفاظی اور زبان کی چاشنی پر زیادہ توجہ دیتا۔ سبب ایک بھی فالتو لفظ برداشت کرنے کو تیار نہیں ہوتے تھے۔ بغیر دلیل کے کسی دعوے کو چھاپنے پر رضامند نہ ہوتے' اعداد و شمار کے بغیر کسی فیصلے کا اعلان کرنے کے حق میں نہ ہوتے۔ یہ سلوک میرے مضامین ہی کے ساتھ نہیں تھا بلکہ سبھی لکھنے والوں کے صفحے کے صفحے قلمزد ہو جاتے۔ ہمارے ایک دوست زور بیان میں کہیں کے کہیں نکل جانے کے عادی تھے۔ ان کا مضمون ہاتھ میں آتے ہی سبب حسن ہمیشہ کہتے۔ "معاذ اللہ آپ لوگوں نے کیسے کیسے "سلطان القلم" پال رکھے ہیں جو لکھنے پر آتے ہیں تو پلٹ کر دیکھتے ہی نہیں۔ اکثر اوقات اس کے دس صفحے کے مضمون کو سبب حسن تین چار پیرا گراف میں بدل دیتے اور اس طرح الجھی ہوئی تحریر کی وجہ سے جو بات قاری کی سمجھ میں شاید نہ آسکتی واضح اور دو ٹوک شکل میں آتی۔ اس کانٹ چھانٹ کے نتیجے میں یہ اخبار مؤثر اور بامعنی ہوتا۔" (حمید اختر "آشنائیاں کیا کیا" لاہور ص۔ 73)

ایک اور جگہ پر حمید اختر لکھتے ہیں کہ سبب حسن لفظوں کی طوطا مینا بنانے کے سخت خلاف تھے۔ وہ خبروں، اداروں اور سیاسی تجزیوں میں الفاظ کے مینار سجانے کے بجائے سیدھے سادھے عام لفظوں میں حقائق بیان کرنے پر زور دیتے رہتے تھے چنانچہ ہم ان کی اس نصیحت پر آج تک عمل پیرا ہیں۔ کالم نویسی میں بھی اگر چہ جی چاہتا ہے کہ ہم بھی کچھ معروف کالم نویسوں کی طرح کبھی کبھار میلوڈرامیک قسم کے کالم لکھیں لیکن پھر خیال آتا ہے کہ اخبار کے قارئین میں عالم فاضل لوگوں کی تعداد تو آٹے میں نمک کے برابر ہوتی ہے عام قارئین میں تھوڑا پڑھا لکھا دکاندار گھریلو خواتین اور کم پڑھے

لکھوں کی اکثریت ہوتی ہے اس لئے اپنی بات ان تک ایسی زبان میں پہنچائی جائے جو ان کی سمجھ میں فوراً آجائے۔ اب یہی ہمارا اسلوب ہے، (حمید اختر ”ادب اور صحافت“ روزنامہ ”ایکسپریس“ 30 اکتوبر 2009ء)

روزنامہ ’امروز‘

پارٹی کے جرائد میں کام کرنا حمید اختر کا پہلا صحافتی تجربہ تھا۔ اس مکتب میں نہ صرف ان کی صحافتی تربیت کا آغاز ہوا بلکہ صحافت میں نظریاتی کمنٹس کا درس بھی انہیں یہیں سے ملا۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر وہ ’نیا زمانہ‘ کی تربیت گاہ سے گزرے بغیر براہ راست ’امروز‘ میں گئے ہوتے تو شاید انہیں وہاں اتنی جلدی کامیابی نصیب نہ ہو پاتی۔ اور امروز میں بھی انہوں نے ابتدائی کاموں سے ابتدا کی جس نے ان کے صحافتی کیریئر میں ایک مضبوط بنیاد فراہم کی۔

پہلی جیل یا ترا سے رہائی کے بعد حالات بہت خراب تھے۔ ایک طرف خفیہ پولیس ہر وقت پیچھے رہتی تھی، دوسرے ترقی پسندوں پر تنگدستی کا جادو سرچڑھ کر بول رہا تھا۔ ایسے میں ان کے لیے روزنامہ ’امروز‘ کے دروازے کھلے اور حمید اختر وہیں کے ہو رہے جب تک انہیں آخری مرتبہ باہر کا راستہ نہ دکھا دیا گیا۔ تاہم 1952ء کا سال ان کی زندگی کا اہم موڑ ثابت ہوا۔ اس بارے میں وہ لکھتے ہیں:

”1952ء میں ایک برس قید تنہائی میں گزارنے کے بعد جب میں رہا ہوا تو میرے گھریلو حالات بہت ہی خراب تھے۔ ہمارا سب کچھ ٹٹ گیا تھا۔ میرے ایک بڑے بھائی سرکاری ملازم تھے جن پر میرے جیل کے ایک برس میں زبردست مالی بوجھ پڑا چنانچہ میں نے نوکری کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس زمانے میں ”امروز“ کا اجراء ہو چکا تھا۔ ہم لوگ وہاں روزانہ چکر لگاتے تھے۔ ایک روز میاں افتخار الدین مرحوم مجھے سیڑھیوں میں ملے اور پوچھنے لگے کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ جب میں نے انہیں بتایا کہ نوکری کی تلاش میں ہوں تو وہ مجھے اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھا کر گھر لے گئے اور ”امروز“ کے عملہ ادارت میں شامل ہونے کو کہا۔ انہوں نے نہایت ہی معذرت خواہانہ لہجے میں کہا کہ ابھی آپ کے شایان شان کام ہمارے ہاں نہیں ہے یعنی ادارہ نویسی کا کام ابھی نہیں ہے اس لیے فی الحال سب ایڈیٹر ہو جاؤں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایک طرح سے یہ بہت اچھا ہوا۔ میں نے کوئی ڈیڑھ برس نیوز روم میں نائٹ شفٹ انچارج کے طور پر کام کیا۔ اگر میں شیدھا عملہ ادارت میں چلا آتا تو شاید میرا یہ خانہ خالی رہتا۔ اس تجربے سے مجھے آئندہ زندگی میں بہت فائدہ پہنچا۔ سب ایڈیٹر سے میں اسٹنٹ ایڈیٹر پھر ڈپٹی ایڈیٹر اور آخر میں ایڈیٹر بنا جہاں سے نومبر 1979ء میں مجھے جبری طور سے (ریٹائرڈ) کیا گیا۔“ (خالد یزدانی، حمید اختر انٹرویو ”صحافت اور صحافی“ ہفت روزہ ”صحافت“ 09 جولائی 1993ء)

یہاں کام کرنے کا خوشگوار تجربہ انہیں کبھی نہیں بھولے گا۔ ترقی پسند ساتھیوں کی رفاقت میں اور مکمل آزادی کے

ساتھ کام کرنے کے باعث انہیں سیکھنے کا بہت موقع ملا جس کے نتیجے میں وہ تھوڑے ہی عرصے میں سب ایڈیٹر سے اسٹنٹ ایڈیٹر ہو گئے۔ اپنی ملازمت کے پہلے ہی سال انہوں نے 'امروز' میں قسط وار اپنی اسیری کی داستان شائع کرنا شروع کر دی جو 1953ء میں کتابی صورت میں بھی شائع ہو گئی۔ جلد ہی 1954ء میں دوسری جیل یا ترائان کی منتظر تھی۔ اس بار وہ لاہور اور میانوالی کی جیلوں میں رہے جہاں ان کی کتاب 'کال کوٹھڑی' انہیں جیل میں سہولتیں دلانے کا باعث بنی۔ چھ ماہ بعد رہائی نصیب ہوئی تو واپس 'امروز' میں آ گئے۔ ملک کی سیاسی فضا بہت مخدوش تھی۔ پاکستان امریکی دفاعی معاہدوں میں جکڑا جا چکا تھا۔ کمیونسٹ پارٹی اور اس کے تمام ذیلی فرنٹ بند ہو چکے تھے۔ راولپنڈی سازش مقدمے کے اسیر ابھی تک جیلوں میں تھے ابھی مزید ابتلاء اور آزمائشوں کا دور آگے آ رہا تھا۔ پھر بھی یہ زمانہ ان کی بھرپور صحافتی کامیابیوں کا زمانہ تھا۔ اپنی اس دور کی صحافتی زندگی کا ذکر کرتے ہوئے حمید اختر ایک انٹرویو میں لکھتے ہیں:

”میری ابتدائی صحافتی زندگی کے پانچ چھ برس بہت شاندار گزرے۔ اس وقت یعنی 1952ء سے 1958ء تک ہم جوان بھی تھے اور کچھ کرنے کا عزم بھی رکھتے تھے۔ پھر جس ادارے یعنی پروگریسو پیپرزم لیڈنگ سے وابستہ تھا وہ اس ملک کا ایک مثالی ادارہ تھا۔ تنخواہوں اور دیگر مراعات میں یہ ادارہ ملک بھر کے صحافتی اداروں کے مقابلے میں بہتر تھا۔ پھر یہاں کا ماحول سیاسی ترقی پسندانہ اور باہمی رفاقت کے احساس سے معمور تھا میاں افتخار الدین نے اپنے اسٹاف سے کبھی نوکر اور مالک کے تعلقات قائم نہیں رکھے بلکہ ان کی سب سے دوستی تھی اور یہاں پر سبھی لوگ ہم خیال تھے۔ ملک کو بہتر بنانے اور عوام کے لیے کام کرنے کا جذبہ سب میں یکساں تھا۔ ادارتی کام میں عملہ کو مکمل آزادی حاصل تھی اس لیے یہ میری صحافتی زندگی کا سنہرا دور تھا۔“ (خالد یزدانی، حمید اختر انٹرویو ”صحافت اور صحافی“ ہفت روزہ ”صحافت“ 09 جولائی 1993ء)

اکتوبر 1958ء میں ایوب خان نے اسکندر مرزا کی مدد سے ملک پر مارشل لاء مسلط کر دیا۔ گزشتہ ایک دہائی سے جس طرح ملک کو چلایا جا رہا تھا یہ مارشل لاء اس کا منطقی نتیجہ تھا۔ سیاستدانوں کی کمزوریوں کے باوجود ملک میں سیاسی پختگی کا فقدان نہیں تھا۔ مسلم لیگ کے بعد ملک کی دو بڑی سیاسی جماعتیں عوامی لیگ اور نیشنل عوامی پارٹی مسلم لیگ کے جاہ پسند ٹولے کے لیے خطرہ بن رہی تھیں۔ میاں افتخار الدین، مولانا بھاشانی، عبدالصمد اچکزئی، عبدالغفار خان، حیدر بخش جتوئی، جی ایم سید، سہروردی اور اس سطح کے قد آور رہنماؤں کی موجودگی میں مسلم لیگ کی قیادت نہ صرف یونوں کا ایک منتشر گروہ لگتی تھی بلکہ ترقی پسند رہنماؤں، خصوصاً نیشنل عوامی پارٹی کی سیاست اینگلو امریکی مفادات کے لیے خطرہ بنتی جا رہی تھی۔ 1956ء میں مغربی پاکستان کی چاروں صوبوں کی ترقی پسند سیاسی جماعتیں۔۔ آزاد پاکستان پارٹی، خدائی خدمت

گار سندھ متحدہ محاذ اور بلوچستان کی مقامی سیاسی جماعتیں مل کر پاکستان نیشنل پارٹی کی صورت میں سامنے آچکی تھیں۔ 1957ء میں عوامی لیگ کا ایک بڑا حصہ مولانا ہاشمی کی قیادت میں پاکستان نیشنل پارٹی کے ساتھ آ ملا اور اسی سال نیشنل عوامی پارٹی (نیپ) وجود میں آگئی جس نے دن یونٹ کے خاتمے جاگیرداروں کو قومیا نے خارجہ پالیسی میں ترقی پسند تہذیبوں اور سماجی و معاشی اصلاحات کے مطالبات سے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز کیا۔ 1956ء میں پہلا آئین تشکیل پانے کے بعد خدشہ تھا کہ نیشنل عوامی پارٹی اور عوامی لیگ مسلم لیگ کو ہمیشہ کے لیے اقتدار سے باہر نہ کر دیں۔ پروگریسو پیپر زلمینڈ کے اخبارات پاکستان ٹائمز، امروز، اس ضمن میں ایک فعال کردار ادا کر رہے تھے۔ حمید اختر نے اس دور کی اپنی صحافتی زندگی کے بارے میں زیادہ تفصیل سے کبھی بات نہیں کی لیکن وہ یقیناً ایک اہم صحافتی کردار ادا کرنے میں پیش پیش تھے۔ 1957ء میں اسی ادارے سے اردو ہفت روزہ 'لیل و نہار' کا بھی اجراء ہو چکا تھا جس کے پہلے مدیر سبط حسن تھے۔ اس سلسلے میں بنیادی کردار حمید اختر نے ادا کیا تھا۔ وہ یوں کہ رہائی کے بعد:

”سبط حسن کچھ دنوں بیکار رہے۔ مگر ان کے مشغل، رہن سہن، معیار زندگی، صفائی ستھرائی، نفاست اور نزاکت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ اس زمانے میں امروز اور پاکستان ٹائمز کے بانی مرحوم میاں افتخار الدین کو ایک ہفت روزہ نکالنے کا خیال آیا اور لیل و نہار کے نام سے ڈیکوریشن لے لیا گیا۔ تیاریاں شروع ہو گئیں اور ایڈیٹر کی تلاش ہونے لگی۔ ایک روز میاں صاحب امروز کے دفتر آئے اور ہمارے ساتھ بیٹھ کر اس ہفت روزہ کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ کافی دیر بعد اٹھ کر جانے لگے تو اچانک مجھ سے پوچھا۔ ”لیل و نہار کا ایڈیٹر کسے بنائیں؟“

”میں نے فوراً کہا ”سبط حسن کو۔“

”اس لیے کہ وہ تمہارا دوست ہے۔“ میاں صاحب نے کہا۔

میں نے انہیں بتایا کہ سبط حسن میرے دوست ضرور ہیں مگر اس پیشے میں انہیں میں اپنا استاد مانتا ہوں اور یہ دعویٰ کر سکتا ہوں کہ اس وقت پاکستان میں اردو، انگریزی صحافت میں ان سے بڑا شاید ہی کوئی دوسرا نام موجود ہو۔

”میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ میاں صاحب نے سبط حسن کو میرے کہنے پر لیل و نہار کا ایڈیٹر مقرر کیا۔ ان کی عادت تھی کہ وہ خود کوئی فیصلہ کرنے کے بعد بھی کبھی متعلقہ لوگوں سے بحث مباحثہ کرتے رہتے دوسروں کی سنتے اپنی رائے دیتے اور بالآخر اپنے فیصلے کو اجتماعی فیصلہ بنا کر لاگو کرتے، میری رائے اب بھی یہی ہے کہ انہوں نے سبط حسن کو ایڈیٹر مقرر کرنے کا فیصلہ پہلے ہی کر لیا تھا۔ محض ہماری رائے معلوم کرنے اور اپنے فیصلے کو مزید پختہ کرنے کے لیے ہم سے مشورہ کر رہے تھے۔“

”بہر حال لیل و نہار سبٹ حسن کی ادارت میں شائع ہونا شروع ہوا۔ اس کے معیار اور محاسن کے بارے میں یہاں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے اس لیے کہ یہ رسالہ اب تاریخ کا حصہ بن چکا ہے۔ اور اس ملک کا کوئی ہفت روزہ اس کے معیار کو چھو تک نہیں سکا۔ (اس کی نگر کا دوسرا ہفت روزہ خود لیل و نہار ہی تھا جو 71-1970ء میں کراچی سے فیض احمد فیض، سبٹ حسن اور حسن عابدی کی ادارت میں نکلا۔ یہ وہی دور تھا جب حمید اختر اور ان کے ساتھی لاہور سے روزنامہ ’آزاد نکال رہے تھے)۔ میں یہاں اس زمانے میں سبٹ حسن کی ذاتی زندگی کا ذکر کروں گا۔ لیل و نہار کی اشاعت کے دو تین برس میں سبٹ حسن کو پہلی بار سکون سے کام کرنے کا موقع ملا۔ اور ان کے ذاتی اور قریبی دوستوں کے علاوہ دوسروں کو بھی پہلی بار ان کی صلاحیتوں کا پتہ چلا۔

”یہ دو تین برس ہم نے ایک ہی دفتر میں گزارے دوپہر کا کھانا احمد ندیم قاسمی، سبٹ حسن، ظہیر بابر اور میں قاسمی صاحب کے کمرے میں کھاتے اور کھانے کا یہ سیشن تبادلہ خیالات اور لطیفہ بازی کے لیے مخصوص ہوتا، فیض صاحب بھی انہی دنوں جیل سے رہا ہو کر آگئے اور ”پاکستان ٹائمز“، ”امروز“ اور ”لیل و نہار“ کے چیف ایڈیٹر کے طور پر ان کا نام آنے لگا۔ مگر کچھ عرصے بعد وہ بوجہ پروگریسو پریز لمیٹڈ سے علیحدہ ہو گئے۔“ (حمید اختر ”آشنائیاں کیا کیا لاہور اگست

1994ء ص 77-78)



حمید اختر کی شادی

عبدالوحید چیف لائبریرین جی سی یونیورسٹی لاہور، یکم اگست 2012ء

1956ء میں حمید اختر نے اپنی زندگی کا ایک اہم اور بڑا فیصلہ کیا۔ شادی کرنے کا فیصلہ۔ 1956ء آتے آتے وہ زندگی کے کم وبیش سارے نشیب و فراز سے گزر چکے تھے۔ بچپن، لڑکپن، نوجوانی اور اب جوانی۔۔۔ اور ان تمام ادوار میں لدھیانہ، لاہور اور ممبئی کے ہنگامے۔۔۔ نکو درکمپ اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

پھر کمیونسٹ پارٹی اور اس کے شب و روز، 1951ء اور 1954ء میں دوبار جیل کا سفر اور پیشہ ورانہ اخباری زندگی۔۔۔ زندگی کے ان بتیس برسوں میں حمید اختر نے اتنا کچھ کر لیا تھا جتنا لوگ اپنی ساری زندگی میں بھی نہیں کر پاتے۔ ایسا نہیں تھا کہ انہوں نے اس سے پہلے شادی کے بارے میں نہ سوچا ہو بلکہ شادی سے تھوڑا ہی عرصہ پہلے وہ شدید جذباتی تناؤ سے بھی گزرے تھے۔۔۔ لیکن ہم بات کو اور بھی پیچھے سے شروع کریں گے۔۔۔ یہ 1948ء کے دن تھے جب وہ پارٹی کے کاموں کے سلسلے میں سجاد ظہیر کے ساتھ براہ راست رابطے میں تھے۔ ان کے اپنے لفظوں میں:

”انہی دنوں ایک اور دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ میں اس زمانے میں سنت نگر کے ایک مکان کے نصف حصے میں مقیم تھا جو پاک کوریا یا انجمن والے رحیم نے میری لامکانی پر رحم کھا کر میری تحویل میں دے دیا تھا۔ وہاں میں تنہا رہتا تھا، بے سرو سامانی کا یہ عالم تھا کہ ایک پتنگ، ایک دری، ایک تکیہ، ایک میز دو کرسیوں اور چائے کے دو برتنوں کے سوا یہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ اس مکان پر تالا بھی کم ہی لگتا تھا بلکہ بالعموم دروازے کھلے رہتے تھے۔ محلے کی ایک نوجوان خاتون مجھ پر بہت مہربان

تھی۔ اس میں کوئی خاص بات تو نہیں تھی، جوانی میں ایسے حادثات سبھی کو پیش آتے ہیں مگر پارٹی کے تعلق کی وجہ سے میں ایسے معاملات کے بارے میں محتاط اور خوف زدہ رہتا تھا۔ اس خاتون کا اصرار تھا کہ میں گھر آؤں تو چاروں دروازے کھلے رہیں تاکہ جس دروازے سے بھی اسے داخل ہونے کا موقع ملے وہ اسے استعمال میں لائے۔ ایک روز عبداللہ ملک بھی اسی طرح اس گھر کے کھلے دروازوں سے اندر داخل ہو گیا جس طرح یہ بت طناز داخل ہوتی تھی۔ وہ پہلے سے موجود تھی اور عبداللہ ملک کو دیکھتے ہی بھاگ گئی۔ عبداللہ ملک نے فوراً مجھے ڈرانا دھمکانا شروع کر دیا کہ تم کمیونسٹ پارٹی کے رکن ہو کر ایسا غلط کام کر رہے ہو۔ یہ بہت نامناسب بات ہے مجھے تمہاری رپورٹ کرنی پڑے گی وغیرہ۔

”عبداللہ کے بارے میں مشکل یہ ہے کہ یہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ وہ کب سنجیدہ ہے اور کب مذاق کر رہا ہے وہ غالباً مذاق ہی کر رہا تھا۔ مقصد اس کا یہ تھا کہ ڈرا دھمکا کر مجھ سے دعوت وغیرہ کا وعدہ لے لے۔ اس نے غالباً مجھ سے بعد میں اقرار بھی کیا کہ وہ محض مذاق کر رہا تھا مگر میں اس کی باتوں سے اتنا گھبرایا کہ رات کو سو نہ سکا۔ رات بھر یہی سوچتا رہا کہ رپورٹ ہو گئی تو پارٹی سے نکال دیا جاؤں گا اور پارٹی سے نکال دیے جانے کا مطلب ان دنوں میرے نزدیک سانس ختم ہونے کے برابر تھا۔ رات بھر سوچنے اور کروٹیں بدلنے کے بعد اگلی صبح سائیکل پکڑ کر صبح سویرے خود ہی بتے بھائی کے پاس پہنچ کر اپنی رپورٹ درج کرادی کہ شاید اعتراف جرم کے بعد آسانی سے معافی مل جائے۔

میں نے کہا ”بتے بھائی مجھ سے بہت بڑی غلطی ہو گئی۔۔۔ مگر قصور میرا ہرگز نہیں ہے، میں قسم کھا سکتا ہوں کہ وہ لڑکی ہی میرے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ وہ خود ہی آتی ہے۔ میں اس غلطی پر عادم ہوں۔ وعدہ کرتا ہوں آئندہ ایسا کوئی کام نہیں کروں گا بلکہ وہ گھر ہی چھوڑ دوں گا۔“

میں نے عبداللہ ملک کی بات بھی کی اور کہا کہ وہ آپ سے میری شکایت کرے گا ازراہ کرم آپ اس کی بات پر دھیان نہ دیجئے گا۔۔۔“

ساری گزارشات سر جھکائے ہوئے احساس ندامت سے پُر لہجے میں پیش کی گئیں۔ میری بات ختم ہونے کے بعد کچھ دیر خاموشی رہی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو بتے بھائی مسکراتے ہوئے نظر آئے، بڑے ٹھہرے اور پرسکون لہجے میں گویا ہوئے ”عبداللہ ملک کو بکنے دو، کمیونسٹ پارٹی عشق کرنے پر کوئی پابندی تھوڑے ہی لگاتی ہے۔ یہ تو انسانی فطرت کے عین مطابق ہے۔ نوجوان عشق نہ کریں تو ان کی زندگی میں کیا باقی رہے گا۔ عشق کے بغیر انسان ادھورا اور ناقص ہے۔ البتہ تم سیاسی رکن ہو اس لیے احتیاط سے کام لو اور کوشش کرو، پکڑے نہ جاؤ۔۔۔“

یہ فیصلہ سن کر ہم تو شیر ہو گئے۔ شام کو عبداللہ ملک ملا تو اس سے کہا ”بتے بھائی ہمیں تو عشق کرنا کمینڈیٹ مل گیا

ہے۔ اب تم کرتے پھر در پور نہیں۔۔۔“

اسکو کیا پتہ تھا کہ اس کے مذاق سے گھبرا کر ہم خود ہی اعتراف جرم کرنے پہنچ گئے تھے۔ (حمید اختر ”آشنائیاں

کیا کیا“ ص 31-30)

حمید اختر کی زندگی ایک کھلی کتاب رہی ہے۔ انہوں نے زندگی میں کوئی ایسا کام نہیں کیا جسے چھپانے کی ضرورت پڑی ہو۔ عشق بھی کیا تو اسے چھپانے کی کوشش نہیں کی حتیٰ کہ جب بعد میں ان کی شادی ہوئی تو ان کی بیگم بھی ان باتوں سے بے خبر نہیں رہیں۔ شادی سے ایک برس قبل 1955ء میں وہ جس جذباتی تجربے سے گزرے اس کا انہوں نے خود اپنی تحریروں میں کئی بار ذکر کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

”میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ میں اور میرے دوست کتنے خوش نصیب ہیں جنہیں فیض کے ساتھ بہت سا وقت گزارنے کا موقع ملا۔ دفتر میں وہ ”پاکستان ٹائمز“ ”امروز“ اور ”لیل و نہار“ کے چیف ایڈیٹر تھے۔ سبط حسن لیل و نہار کے مدیر تھے۔ میں امروز کا اسٹنٹ ایڈیٹر تھا مگر ہماری رفاقت ادب و شعر اور ٹریڈ یونین تحریک کے واسطے سے تھی۔ اسی زمانے میں ایک دو رجنون سے گزرا۔ اس قسم کے ہیجانی اور جذباتی حالات کا غالباً ہر نوجوان کو سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ڈیڑھ دو برس میری حالت بہت خراب رہی۔ دن رات کی خبر نہ تھی نہ کسی چیز کا ہوش تھا۔ فیض کو پتہ چلا تو ایک دن ”ریگل سینما“ میں میرے دفتر آگئے۔ سگریٹ کے دو تین لمبے لمبے کش لیے اور بولے ”ہوں“ (ان کی ہوں بہت مشہور تھی) کون ہے وہ؟ شادی کیوں نہیں ہو سکتی؟ چلو! ہمیں اس کے گھر لے چلو۔ میں نے کہا فیض صاحب یہ بہت ہی نازک سی بات ہے اور پھر میری انا کا بھی مسئلہ ہے۔ اس لیے آپ کا وہاں جانا مناسب نہیں ہے۔ بہت اصرار کیا۔ مہینہ بھر میں کئی چکر میرے دفتر کے لگائے جب میں کسی طرح نہ مانا تو بہت پریشان ہوئے۔ آخر ایک روز محفل شب میں سب دوستوں کے سامنے میرے بارے میں باقاعدہ اعلان کر دیا کہ یہ شخص نہایت نالائق ہے اس نے ہمارے قبیلے کا نام بدنام کر دیا ہے نہ خود کچھ کرتا ہے نہ کسی دوسرے کی مدد لینے کو تیار ہے۔“ (محمد راشد علی خان ”حمید اختر شخصیت اور ادبی خدمات“ تحقیقی مقالہ شعبہ اردو جامعہ کراچی 2007ء ص 10-09)

فیض صاحب، حمید اختر کو قائل کرنے کے لیے ریگل سینما کے اس مشہور و معروف کمرے کے چکر لگاتے رہے جہاں انہوں نے 1952ء سے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔

”مجھے یاد ہے 1955ء میں میری شادی سے ایک برس قبل جب میں ایک جذباتی صدمے سے دوچار ہوا تو فیض صاحب برابر کئی دن تک میرے پاس آ کر بیٹھے رہتے اور پوچھتے رہتے ”وہ کون ہے بتاؤ ہم جا کر تمہاری شادی کی

بات کرتے ہیں“ اور جب ہم نے کہا جناب یہ ایسا معاملہ ہے جس میں سفارش کام نہیں آتی تو انہوں نے کہا ”یا تو اس خاتون سے شادی کر لو یا پھر رونا دھونا بند کرو۔“ (حمید اختر پُرسش احوال ص۔ 25)

”یہ کیفیات مجھ پر چھ آٹھ مہینے یا زیادہ سے زیادہ ایک سال رہیں۔ کیونکہ اُس (محبوبہ) نے مجھ سے کہا کہ میں آپ سے شادی نہیں کر سکتی، میری کچھ مجبوری ہے۔ میری ایک سہیلی ہے وہ تمہارے لیے بہت اچھی رہے گی۔ اس واقعے کے بعد میری منگنی ہو گئی۔ میری بیوی ان تمام باتوں سے آگاہ ہے۔“ (محمد راشد علی خان تحقیقی مقالہ ص۔ 10)

یہ جھٹ منگنی پٹ بیاہ والی صورت رہی ہوگی۔ محمد راشد علی خان نے اپنے تھیسز کے لیے انکی بیگم سے جو انٹرویو لیا اس میں انہوں نے اپنی شادی کے بارے میں بھی اظہار خیال کیا۔
سعد یہ حمید کے لفظ ہیں:

”مجھ سے میری مرضی کسی نے نہیں پوچھی کیونکہ اس زمانے میں رائے نہیں پوچھی جاتی تھی۔ میں نے شادی سے پہلے انہیں دیکھا بھی نہیں تھا کہ اس زمانے میں یہ رواج بھی نہیں تھا اور مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ میری شادی کسی ادیب اور صحافی سے ہو رہی ہے۔“ (محمد راشد علی خان تحقیقی مقالہ ص۔ 10-11)

حمید اختر نے اپنی کئی تحریروں میں ایس کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے کہ اگر ایس نہ ہوتیں تو فیض کا حشر بھی منٹو اور مجاز جیسا ہوتا۔ ایک اجنبی کے لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ اگر سعد یہ نہ ہوتیں تو حمید اختر کیسے ہوتے یا کیا ہوتے؟
اپنے انٹرویو میں وہ مزید کہتی ہیں:

”جوانی میں شوہر کی ہر تفریح میں شامل رہی۔ ہماری شامیں ان کے دوستوں خاص طور پر فیض کے گھر پر گزرتی تھیں۔ بلکہ وہ میرے بغیر کبھی کسی دوست کے گھر نہیں جاتے تھے۔“

”جب بھی اختلاف رائے ہوتا تو معاملہ جلد ہی سلجھ جاتا تھا کیونکہ میں انہیں منالیتی تھی انہوں نے کسی بات پر نہیں ٹوکا۔ ساری زندگی مکمل آزادی دی۔ وہ جمہوریت والی بات کہتے ہیں تو ٹھیک ہی ہے۔ ہمارے گھر میں مکمل جمہوریت ہے۔“ (محمد راشد علی خان تحقیقی مقالہ ص۔ 11)



ترقی پسند صحافت، مارشل لاء اور حمید اختر

تحریر: محمد سعید احمد بدر، 16 جون 2012ء

1956ء میں اپنی شادی کے بعد حمید اختر کی زندگی میں ایک توازن آ گیا تھا جس کے وجہ سے وہ اور بھی توجہ اور دلجمعی سے اپنا صحافتی کام کرنے لگے۔ ان کی افسانہ نگاری تو بہت سست روی سے چل رہی تھی۔ پارٹی اور اس کے تمام اداروں پر پابندیاں عائد تھیں۔ حمید اختر پارٹی کی زیر زمین سرگرمیوں میں حصہ نہیں لے رہے تھے جس ادارے کے اخبار میں وہ کام کر رہے تھے وہ مارشل لاء حکومت کے لیے کسی طرح پسندیدہ نہ تھا۔ جلد ہی اس پر حملہ کر دیا گیا۔ ”پاکستان ٹائمز“ ”امروز“ اور ہفت روزہ ”لیل و نہار“ کو سرکاری تحویل میں لے لیا گیا۔ سبٹ حسن ”لیل و نہار“ کے ایڈیٹر تھے انہیں برطرف کر دیا گیا۔ امروز کے مدیر احمد ندیم قاسمی اور ”پاکستان ٹائمز“ کے ایڈیٹر مظہر علی خان تھے ان دونوں نے اپنے اپنے اخبار کی ادارت سے استعفیٰ دے دیا۔ حمید اختر لکھتے ہیں:

”چوتھا استعفیٰ میرا تھا جو بعد میں میاں افتخار الدین مرحوم نے زور دے کر واپس کرایا۔ ان کا کہنا تھا کہ ہم عدالت میں جا رہے ہیں۔ اگر مقدمہ جیت گئے تو پھر ان لوگوں کو کہاں ڈھونڈتے پھریں گے اس لیے یہاں سے کسی کو جانا نہیں چاہیے۔ میرا استعفیٰ مظہر علی مرحوم نے سرفراز صاحب سے بات کر کے واپس کر دیا مگر سرکاری انتظام میں آنے کے بعد یہاں کام کرنے کے مواقع بہت کم رہ گئے تھے۔“ (خالد یزدانی، حمید اختر انٹرویو ”صحافت اور صحافی“ ہفت روزہ ”صحافت“ 09 جولائی 1993ء)

سبٹ حسن کی برطرفی کا ذکر کرتے ہوئے حمید اختر لکھتے ہیں:

”جس حکم نامے کی زد سے ان اخبارات کو چلانے والے ادارے کو سرکاری تحویل میں لیا گیا تھا اس میں یہ یقین دہانی کرائی گئی تھی کہ سٹاف میں کوئی رد و بدل نہیں ہوگا اور یہ کہ اس ادارے میں کام کرنے والے سبھی صحافی بدستور کام کرتے رہیں گے۔ سبط حسن کو البتہ اسی روز فارغ کر دیا گیا۔ پروگریسو پیپرزمیٹڈ میں سینکڑوں صحافی کام کر رہے تھے۔ حکومت کی کوشش اور خواہش یہی تھی کہ سب لوگ کام کرتے رہیں حتیٰ کہ جب مظہر علی اور احمد ندیم قاسمی نے پاکستان ٹائمز اور امروز کی ادارت سے مستعفی ہونے کا اعلان کیا تو کئی روز تک ان کو واپس لانے کی کوششیں ہوتی رہیں۔ البتہ سبط حسن کی برطرفی غالباً نئے مقرر ہونے والے ایڈیٹریٹر مرحوم سرفراز کا پہلا تحریری حکم نامہ تھا جو انہوں نے چارج لینے کے بعد جاری کیا۔

مرحوم سرفراز احمد پرانے صحافی اور منجھے ہوئے بیورو کریٹ تھے۔ انہوں نے برطرفی کا حکم نامہ دینے کے لیے سبط حسن کو اپنے کمرے میں بلایا اور یہ پیشکش کی کہ حکومت انہیں زمین مکان اور کارخانہ تک الاٹ کرنے کو تیار ہے۔ کوئی دوسرا کام بھی جو ان کی معاش کے لیے موزوں ہو دیا جاسکتا ہے۔ البتہ انہیں لکھنے پڑھنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ ملک کے اخبارات اور رسائل کے دروازے ان پر بند ہیں اس کے سوا وہ جو مانگیں انہیں مل جائے گا۔ لیل و نہار کے دو تین برس کے شماروں کے علاوہ غالباً حکومت کے پاس ان کی زوردار تحریروں کے کچھ اور ثبوت موجود تھے۔ مثلاً ”انقلاب چین زندہ باد“ انہوں نے لکھا تھا جس پر کسی کا نام نہ تھا اور جسے حکومت پنجاب نے ضبط کر لیا تھا اور اسی ضبطی کے خلاف لاہور ہائی کورٹ میں مہینوں مقدمہ چلتا رہا تھا۔ 1951ء میں گرفتاری سے قبل وہ ٹین چار برس ”زیر زمین“ رہے تھے۔ اس لیے ان کی تحریروں پر کسی کا نام نہیں ہوتا تھا۔ راولپنڈی سازش کیس کے بعد سینکڑوں افراد کو گرفتار کیا گیا تھا۔ ان میں سے اکثر پر لاہور کے شاہی قلعہ میں تشدد کیا گیا اور اس طرح دیگر معلومات کے علاوہ تلوار کی طرح کاٹ کرتی ہوئی ان تحریروں کے لکھنے والے کی بھی نشاندہی ہو گئی تھی چنانچہ حکومت کا فیصلہ تھا کہ اس آدمی کو لکھنے اور اپنی بات لوگوں تک پہنچانے کے حق سے محروم کر دیا جائے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کو کوئی اور کام کرنے اور حکومت کی طرف سے ہر سہولت مہیا کرنے کی پیشکش کی گئی اور کہا گیا کہ جس دشت کی سیاحی میں انہوں نے اپنی عمر گزاری ہے اس سے کنارہ کش ہو جائیں۔ سبط حسن سرفراز صاحب کا شکریہ ادا کر کے پی پی ایل کی سیڑھیوں سے اتر گئے۔ اس پیشکش کا تذکرہ انہوں نے میرے سوا غالباً کسی سے نہیں کیا۔ کیونکہ ان کی وفات کے بعد جب میں نے یہ بات کی تو ان کے گھر والوں نے بھی حیرت کا اظہار کیا اور بتایا کہ سبط حسن نے اس سارے زمانے میں اس کا ذکر تک نہیں کیا۔

”سبط حسن کے لکھنے پڑھنے پر پابندی کے بارے میں سب سے اچھا تجربہ مادام نور جہاں کا تھا۔ انہوں نے اسی

زمانے میں ایک روز مجھ سے سبط حسن کی خیریت پوچھی تو میں نے بتایا کہ سرکار انہیں مال و دولت، زمین، مکان، کارخانہ سبھی کچھ دینے کو تیار ہے مگر انہیں لکھنے پڑھنے کا کام کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ مادام نے پہلے تو کوئی جواب نہیں دیا۔ مگر دو منٹ بعد بڑی بلند آواز سے بولیں۔ ”ہائے! یہ تو ایسی بات ہے جیسے کوئی مجھ سے کہے تم گانہیں سکتیں۔“ (حمید اختر ”آشنائیاں کیا کیا“ ص۔ 81-80)

مارشل لاء حکومت نے بعد میں نیشنل پریس ٹرسٹ بنا کر ان اخبارات کے پرکاٹ دیئے۔ حمید اختر اور عملے کے کئی دوسرے ارکان جیسے تیسے اپنے آپ کو گھسیٹتے رہے۔ 1962ء میں ہی اپنا شخصی آئین جاری کیا۔ اس نے ”بنیادی جمہوریت“ کا لبادہ اوڑھا۔ جنوری 1965ء میں یہ جمہوریت بری طرح ناکام ہو گئی جب ایوب خان نے صدارتی انتخاب میں مادر ملت فاطمہ جناح کو دھاندلی سے شکست دے دی۔ 1965ء میں کشمیر میں کی جانے والی مہم جوئی پاک بھارت جنگ میں بدل گئی۔ تاشقند معاہدہ ہمیں بچانے کو آیا لیکن ایوب خان کی طاقت کا پول کھل گیا۔ عوام بالخصوص مشرقی پاکستان کے عوام اپنے استحصال اور تکالیف کا ازالہ چاہتے تھے۔ 1966ء میں لاہور میں شیخ مجیب نے چھ نکات کی صورت میں بنگالی عوام کے مطالبات کو زباندی۔ 1968ء میں ایوب خان نے اپنی اصلاحات کا عشرہ منایا تو عوام غصے میں پھٹ پڑے۔ عوام سے انتقام لیتے ہوئے ایک فوجی آمر نے اقتدار دوسرے فوجی آمر کے حوالے کر دیا۔ 1970ء تک حمید اختر اور دوسرے ترقی پسند صحافیوں نے اپنا وقت انہی اخبارات میں گزارا۔ بہر حال ان کی ہمدردیاں پیپلز پارٹی اور عوامی لیگ کے ساتھ تھیں۔ فوجی آمر کو یہ منظور نہیں تھا۔ حمید اختر سمیت درجن بھر صحافیوں کو امر روز اور پاکستان ٹائمز سے نکال دیا گیا۔

روزنامہ آزاد

حمید اختر آئی اے رحمان اور عبداللہ ملک کی برطرفی کے بعد تینوں کو گریجویٹی اور پراویڈنٹ فنڈ کی صورت میں 75 ہزار روپے ملے تھے۔ ایک دوست نے 25 ہزار کا عطیہ دیا۔ عبداللہ ملک کے بیان کے مطابق رقم فراہم کرنے والوں میں مولانا کوثر نیازی، چوہدی خالد محمود، عمر محمود قصوری، فلمسٹار اعجاز اور فیض بھی شامل تھے۔ فیض صاحب نے اپنے پراویڈنٹ فنڈ میں سے 10 ہزار روپے دیئے۔ حمید اختر اس دور کی تفصیلی کہانی بیان کرتے ہیں:

”1969ء میں یا شاید 1970ء کے آغاز میں جب یحییٰ کی حکومت تھی، ملک میں مارشل لاء نافذ تھا اور پیپلز پارٹی کے ذریعے بھٹو صاحب نے ملک کے غریب طبقات میں سیاسی شعور اور سیاسی سوچ کی لہر پیدا کر دی تھی۔ پاکستان ٹائمز اور امر روز شائع کرنے والے اخباری ادارے پی پی ایل سے جو سرکاری قبضے میں تھا، تقریباً ڈیڑھ درجن صحافیوں کو ملازمت سے سبکدوش کر دیا گیا تھا، یہ سبھی لوگ خاصے معروف اور سینئر تھے ان میں مرحوم اے ٹی چودھری، عبداللہ ملک،

ظہیر بابر، آئی اے رحمان اور خود رقم الحروف بھی شامل تھے۔ میں اس وقت پنجاب یونین آف جرنلسٹس کا صدر تھا اور عبداللہ ملک اور آئی اے رحمان پی ایف یو جے کی مجلس عاملہ کے سرگرم رکن تھے لیکن ہم سب کو ایک نوٹس کے ذریعے چند ہزار کی رقم گریجویٹی اور پراویڈنٹ فنڈ کی ہمارے ہاتھ میں تھا کروہاں سے فارغ کر دیا گیا۔ اس طرح نکالے جانے والے ہم چند لوگوں نے مل کر ایک 'آزاد اخبار نکالنے کا فیصلہ کیا' یہ اخبار جس کے عملہ ادارت میں ہم تینوں یعنی میں، عبداللہ ملک اور آئی اے رحمان شامل تھے، آزاد کے نام سے 1970ء کے انتخابات سے ایک ماہ قبل شائع ہونا شروع ہوا۔ چونکہ ہم کو پیپلز پارٹی، بالخصوص ذوالفقار علی بھٹو کی حمایت کرنے کے الزام میں نوکریوں سے نکالا گیا تھا، اس لیے ہم نے بھی اپنے اخبار میں بھٹو کی حمایت میں پورا زور قلم صرف کیا، مشرقی پاکستان میں ہماری ہمدردیاں مجیب الرحمن کے ساتھ تھیں اور یہاں مغربی پاکستان میں ہم نے دلی خان کی نیشنل عوامی پارٹی اور کسی حد تک جمعیت العلمائے اسلام کی ان کے سامراج دشمن رویے کی تاریخ کے پیش نظر حمایت کی، انتخابات کے نتائج کے بارے میں ہمارے اندازے بہت درست ثابت ہوئے، عزیزم عباس اطہر نے جو اس اخبار کے نیوز ایڈیٹر تھے۔ چیختی چنگھاڑتی اور قارئین کی توجہ مبذول کرتی ہوئی سرخیوں کی طرح ڈالی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ اخبار جس میں ہم تینوں کا سرمایہ حصوں کی شکل میں ساٹھ ستر ہزار روپیہ تھا اور یہ وہ رقم تھی جو ہمیں پی پی ایل سے برخواستگی پر ملی تھی اور جس کے بارے میں ہمارا اندازہ تھا کہ اس سے پچیس تیس ہزار تک اخبار کی اشاعت پہنچ سکتی ہے، ایک مہینے کے اندر اندر اس کی اشاعت تقریباً ایک لاکھ تک پہنچ گئی۔ ہمارے اپنے پریس میں جو بہت معمولی سینڈ بلکہ تھرڈ ہینڈ ایک عام سی مشین پر مشتمل تھا، اتنی تعداد میں اخبار چھپنا ممکن نہیں تھا، دوسرے پریس سے چھاپنے کو تیار نہیں تھے۔ ایک لاکھ یا نوے ہزار اخبار کے لیے درکار ضروری ساز و سامان اور سرمایہ ہمارے پاس موجود نہیں تھا، ادھر مشرقی پاکستان میں فوجی کارروائی شروع ہو چکی تھی۔ ہم اس کے خلاف تھے اور بھٹو صاحب سے بھی کہہ رہے تھے کہ وہ مجیب سے بات کر کے فوج سے چھٹکارا حاصل کریں۔ سرمایہ کی شدید کمی اور روزمرہ کی مشکلات کے اس دور میں بھٹو صاحب نے ڈاکٹر مبشر حسن کے ہاتھ اڑھائی لاکھ روپے کا ایک چیک ہمیں بھیجا اور آزاد کے جو ایک پرائیویٹ لمیٹڈ کمپنی کے زیر انتظام چل رہا تھا، کے حصے خریدنے کی خواہش ظاہر کی۔ ہم نے یہ چیک اس لیے قبول نہیں کیا کہ ہم حصوں کی غالب ملکیت پیپلز پارٹی کے ہاتھ آنے کے بعد اپنی آزادی برقرار نہیں رکھ سکتے تھے۔ ہم نے ڈاکٹر صاحب سے کہا پرچہ ہم نے شروع کیا۔ اب یہ کامیاب ہو گیا ہے۔ ہمارے پاس اسے چلانے کے وسائل نہیں ہیں، آپ اڑھائی لاکھ کے حصے خرید کر اس کے مالک بن جائیں گے۔ ہمیں یہ منظور ہے آپ اس کو سنبھال لیجئے، ہم گھر جانے کے لیے تیار ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا کہنا تھا کہ بھٹو صاحب کی خواہش ہے کہ اس کی ادارتی ذمہ داریاں ہم تینوں ہی سنبھال لیں۔ چونکہ یہ صورت

حال قابل عمل نہیں تھی اس لیے ہم نے ان سے کہا کہ ہم یہ رقم صرف اس شرط پر قبول کر سکتے ہیں کہ ہم پارٹی ڈسپلن کے تحت حکومت کے ہر اقدام کی حمایت نہیں کریں گے۔ کل آپ کی حکومت بن جائے گی اور ہر حکومت کی طرح آپ بھی زیادتیاں کریں گے۔ اس وقت ہم حکومت کی دھنائی کریں گے۔ ہاں اچھے کام کریں گے تو تعریف بھی ضرور کریں گے۔ آپ اپنے چیئر مین سے پوچھ کر اگر یہ شرائط منظور ہوں تو چیک لے آئیے اور حصے خرید لیجئے۔

”یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ پھر نہیں آئے۔ بھٹو صاحب کو اس کے آٹھ دس ماہ بعد تک حکومت نہیں ملی، ہمارے حالات خراب ہوتے گئے۔ ہم بغیر سرمائے کے اتنا بڑا اخبار سنبھال نہیں سکتے تھے۔ ہندوستان، پاکستان کی متوقع جنگ کی وجہ سے کوئی شخص سرمایہ کاری کے لیے تیار نہیں تھا۔ مجھے یاد ہے اس زمانے میں لاہور ایئر پورٹ پر اپنے دوست اجمل خٹک سے میری ملاقات ہوئی اور انہوں نے اخبار کی بہت تعریف کی تو میں نے کہا ”بھائی ہم مر رہے ہیں اگر ہو سکے تو اس کے لیے سرمایہ مہیا کرنے میں بھی کچھ مدد دو۔“ اس پر اجمل خٹک نے کہا ”آپ کو پتہ ہے پٹھان پیسہ لیتا ضرور ہے کسی کو دیتا نہیں ہے۔ خیر اس طرح دسمبر 1971ء میں یہ اخبار تیرہ ماہ کی اشاعت کے بعد بند ہو گیا۔۔۔“ (حمید اختر ”پرسش احوال“ ص۔ 70)

اس مرحلے پر یہ بتانا ضروری ہے کہ روزنامہ ’آزاد‘ نے پہلے ہی روز قارئین میں کس طرح اپنی جگہ بنالی۔ پہلے روز کے اخبار پر کام ہو رہا تھا کہ خبر آئی کراچی ایئر پورٹ پر پولینڈ کے نائب وزیر خارجہ اور بعض دوسرے حادثے کا شکار ہو کر ہلاک ہو گئے ہیں۔ دوسرے روز تمام اخبارات میں یہی چھپا لیکن ’آزاد‘ کی سرخی تھی۔

”پولینڈ کے نائب وزیر خارجہ قتل کر دیئے گئے۔“

حمید اختر نے اپنے ایک انٹرویو میں بتایا تھا کہ:

”جب حادثے کی خبر آئی تو ہم نے اپنے کراچی کے نمائندے کو ایئر پورٹ جا کر صحیح خبر حاصل کرنے کی ہدایت کی، جو ہمیں رات 11 بجے مل گئی۔ ہم نے اسے حادثے کی بجائے قتل قرار دے کر خبر شائع کر دی۔ اخبار کے پہلے پورے صفحے پر اسی سلسلے کی اور خبریں بھی نمایاں انداز میں شائع کیں۔ اس پر شہر میں آزاد اخبار کا شہرہ ہوا۔ اگلے روز ’نوائے وقت‘ نے ہمارے خلاف شذرہ لکھا جس میں ہم پر الزام لگایا گیا کہ یہ شہر پسند لوگ دونوں ملکوں کے تعلقات خراب کر رہے ہیں۔ اس طرح جن لوگوں کو اس کی خبر نہیں تھی ”نوائے وقت“ کے ذریعے ان کو بھی مل گئی۔ مجھے یاد ہے اس روز ہمارے دفتر میں ایک روز پرانا اخبار خریدنے والوں کا تانتا لگا رہا اور لوگ پچیس پیسے کا اخبار دو روپے تک میں خرید کر لے کر جاتے رہے۔ تیسرے ہی روز اخبار کی اشاعت میں ہزاروں سے بڑھ گئی جو انتخابی نتائج کی خبریں آنے تک ایک لاکھ تک پہنچ گئے۔“ (حمید

اختر، انٹرویو احمد سلیم)

انتخابات کے بعد کی کہانی، اب اس ملک کی بد قسمتی کی تاریخ ہے جس کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا اور لکھا جا رہا ہے۔ بہر حال پاکستان ٹوٹنے کے بعد مغربی پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو نے سویلین چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے طور پر اقتدار سنبھال لیا۔ یحییٰ خان کو ذلت و رسوائی کے ساتھ نکلنا پڑا۔ امروز اور پاکستان ٹائمز سے نکالے جانے والے تمام صحافی بحال کر دیے گئے۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور واقعہ بھی رونما ہوا۔ اس اجمال کی تفصیل بھی حمید اختر کی زبانی سنتے ہیں:

”مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش بننے کے چند ماہ بعد بھٹو آدھے پاکستان کے حکمران بن چکے تھے اس زمانے میں سکاچ کارنر پر مال پر واقع اپنے گھر سے ریگل میں اپنے دفتر جاتے ہوئے ہم نے فیصل چوک میں اچانک ایک بینر لہراتے ہوئے دیکھا جس پر موٹے موٹے الفاظ میں درج تھا‘

”صحافت کے تین شیطان حمید اختر، عبداللہ ملک اور رحمان“ اس بینر کے نیچے ملکہ کے بت کی چھاؤں میں کچھ لوگ خاموشی کے ساتھ بیٹھے تھے، انہیں دیکھنے ان کے سروں کے اوپر لہرانے والے بینر سے لطف اندوز ہونے اور دیگر نعروں کو پڑھنے والے چند لوگ ادھر ادھر پھر رہے تھے، دوسرے نعرے جو دیگر چھوٹے بینروں کی شکل میں لہرا رہے تھے کچھ اس قسم کے تھے ”آزاد کی انتظامیہ سے واجبات دلائے جائیں“ بھوک ہڑتالیوں کا مطالبہ اور یہ بھوک ہڑتال بھی عجیب و غریب قسم کی تھی، جس میں تین چار کارکن نو دس بجے گھر سے خوب کھا پی کر ناشتہ وغیرہ کرنے کے بعد وہاں آ کر بیٹھ جاتے دن بھر بظاہر بھوک ہڑتال پر رہتے رات گھر چلے جاتے، صبح دوسرا گروپ آجاتا۔ اس طرح بظاہر یہ بھوک ہڑتال روایتی بھوک ہڑتال سے قطعاً مختلف تھی اور صرف دن کے سات آٹھ گھنٹوں پر محیط تھی مگر اس کی وجہ سے صحافت کے یہ تین شیطان جن کی ساری پیشہ ورانہ زندگی صحافیوں ہی کے حقوق کے لیے نہیں عام شہریوں کے حقوق کے لیے جدوجہد کرتے ہوئے گزری تھی، سخت پریشانی اور شرمندگی محسوس کر رہے تھے اور یہ بینر لہرانے والوں اور اس قسم کی نمائش بھوک ہڑتال کے ذریعے مجمع لگانے والوں کا مقصد بھی غالباً ان کو شرمندہ بلکہ ذلیل کرنا تھا۔ واقعہ یہ تھا کہ اس اخبار کے نام نہاد مالکان یعنی تینوں شیطان اخبار کے تمام اثاثے کارکنوں کے حوالے کر چکے تھے۔۔۔۔۔ روزنامہ آزاد کے کارکن جنہیں چار ماہ قبل پرچہ بند ہونے سے پہلے دو تین ماہ کی تنخواہ واقعی نہیں ملی تھی، اپنے واجبات کی وصولی کے لیے مظاہرے کرنے میں تو یقیناً آزاد تھے۔ لیکن ان کی سرگرمیوں سے یہ اندازہ با آسانی کیا جاسکتا تھا کہ ان کا مقصد واجبات کی وصولی سے زیادہ تین سینئر صحافیوں کو جو کارکنوں کا اخبار نکالنے کا تجربہ کر کے کامیاب بھی ہوئے مگر سرمایہ کی کمی کی وجہ سے بعد میں اخبار بند

کرنے پر مجبور بھی بدنام کرنا ہے، چنانچہ بھوک ہڑتالیوں کے بیانات میں بار بار یہ تاثر دیا جاتا رہا کہ صحافت کے یہ تین شیطان کارکنوں کا حق مار کر بھاگ گئے ہیں، حالانکہ یہ الزام حقائق کے خلاف تھا، اس لیے ہم نے کوشش کی کہ اس ساری کارروائی کے صحیح پس منظر کا پتہ چلائیں۔۔۔۔۔

بھٹو صاحب کی حکومت بنی تو انہوں نے فوراً ہی درخواست ہونے والے ہم سبھی صحافیوں کو بحال کرنے کا حکم تو جاری کر دیا، مگر ساتھ ہی گورنر کھر سے کہا، یہ آزاد والے لوگ بڑے پھنے خان بنے پھرتے ہیں، ذرا ان کی کھچائی کرو تو معلوم ہوا صحافت کے تین شیطان والا بینر اسی ہدایت کا نتیجہ تھا، اور بھوک ہڑتال کرنے والوں کی سرپرستی بھی گورنر ہاؤس سے ہوئی تھی۔“ (حمید اختر ”پرسش احوال“ ص۔ 69-71)

بہر حال حمید اختر نے ’امروز‘ میں واپس جا کر اپنی صحافتی سرگرمیاں شروع کر دیں جو تیسرا مارشل لاء لگنے تک جاری رہیں۔ ضیاء الحق منتخب وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کا تختہ الٹ کر اقتدار پر قابض ہوا تھا لہذا حمید اختر سمیت امروز اور پاکستان ٹائمز میں کام کرنے والے چند کارکنوں کی ہمدردیاں پیپلز پارٹی اور بھٹو صاحب کے ساتھ تھیں۔ اس سے کچھ عرصہ قبل اور ضیاء مارشل لاء کے چند ماہ بعد حمید اختر کو ’امروز‘ ملتان کا ایڈیٹر بنا کر بھیج دیا گیا۔ نومبر 1978ء میں انہیں لاہور واپس بلا لیا گیا اور نومبر 1979ء میں جبراً ریٹائر کر دیا گیا۔“ (نازیہ بخاری تحقیقی مقالہ ص۔ 21) اس ریٹائر منٹ کی کہانی بھی خاصی دلچسپ ہے۔

”برطانیہ کے آرڈر میں لکھا گیا تھا ’مسٹر حمید اختر‘ ایڈیٹر روزنامہ ’امروز‘ آپ نے اپنی سروس کے پچیس برس مکمل کر لیے ہیں لہذا آپ کو برطرف کیا جاتا ہے، میں نے لیبر کورٹ سے رجوع کیا۔ سال میں دو یا تین پیشیاں ہوئیں۔ تنخواہ بند ہوگئی اور واجبات بھی عدالتی فیصلہ آنے تک مؤخر ہو گئے۔ فاقوں تک نوبت پہنچی۔ انہی دنوں زیڈ اے سلہری نے جو اس وقت پاکستان ٹائمز اور ’امروز‘ شائع کرنے والے ادارے ’پی پی ایل کے سربراہ تھے‘ کمپنی کا وکیل میرے پاس بھیجا۔ اس کا پیغام یہ تھا کہ ہم مقدمہ جیت جائیں گے لیکن لیبر کورٹ فیصلے تک پہنچنے میں کم از کم تین برس لگائے گی۔ اس کے بعد کمپنی ٹریبونل میں اپیل کرے گی۔ دو تین برس وہاں لگیں گے۔ فیصلہ یقینی طور پر وہاں بھی میرے حق میں ہوگا۔ کمپنی ہائی کورٹ میں اپیل کرے گی۔ جہاں مزید تین چار سال لگ جائیں گے۔ سو اگر میں آٹھ نو برس مقدمہ لڑنے کی ہمت رکھتا ہوں تو ٹھیک ہے ورنہ مقدمہ واپس لے کر اپنے واجبات وصول کر لوں تو پنشن کا حقدار قرار پاؤں گا۔ مجھ میں آٹھ نو سال مقدمہ لڑنے کی ہمت نہیں تھی۔ میری بڑی بیٹی صبا کی شادی سرپرستی۔ چنانچہ میں نے مقدمہ واپس لے لیا۔ تقریباً ایک لاکھ روپے کے واجبات وصول کیے جو بیٹی کی شادی پر خرچ ہوئے۔ پنشن جاری ہوگئی اور میں صبر کرنے کے بیٹھ گیا۔۔۔۔۔“ (نازیہ بخاری

تحقیقی مقالہ انٹرویو حمید اختر ص 227-226)

دیگر اخبارات

لیکن وہ اس طرح گھر نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ ان دنوں مظہر علی خان کا ”دیو پوائنٹ“ ابھی زندہ تھا۔ اس سے وابستہ ہو گئے لیکن چند ماہ بعد ہی تیسری بار جیل کا بلاوا آ گیا۔ رہا ہونے کے بعد انگریزی روزنامہ ’دی مسلم‘ اسلام آباد کے ساتھ لاہور کے بیورو چیف مقرر ہو گئے، لیکن ’مسلم‘ کے ایڈیٹر مشاہد حسین کی طرف سے گستاخی بھرا خط ملنے پر استعفیٰ دے دیا۔ استعفیٰ کی دوسری وجہ ان کی بیگم کی علالت تھی۔ لیکن ’مسلم‘ کے ساتھ ان کا وقت بہت اچھا گزرا کیونکہ اخبار آزادانہ پالیسی کا حامل تھا۔ 1987-88ء کے دوران انہوں نے لاہور سے ایک سوسائٹی میگزین ’جلوہ جاری کیا‘ ان کی صاحبزادی صبا جو خود بھی ایک ممتاز ٹی وی آرٹسٹ ہیں، اس کی مدیر تھیں۔ یہ میگزین انہوں نے ریگل سینما میں اپنے پرانے دفتر سے جاری کیا تھا جہاں حمید اختر باقاعدگی سے بیٹھتے تھے۔

حمید اختر 1991-92ء کے دوران روزنامہ ’مساوات‘ کے ایڈیٹر رہے۔ یہ تجربہ ان کیلئے خوشگوار ثابت نہ ہوا۔ 1995ء میں انہوں نے روزنامہ ’صداقت‘ کے ساتھ بطور ادارہ نویس و وابستگی اختیار کی لیکن 1996ء میں پتہ چلا کہ انہیں گلے کا کینسر ہے جس کے بعد وہ شوکت خانم ہسپتال میں داخل ہو گئے اور صحافتی سرگرمیوں سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ اس وقت ان کی عمر 72-73 سال تھی۔ جس بہادری سے انہوں نے اپنی بیماری کا مقابلہ کیا، اس کی کم ہی مثالیں موجود ہوں گی۔ صحت کی بحالی کے بعد 1997ء میں وہ روزنامہ ’دن‘ میں بطور ادارہ نویس اور کالم نگار کے طور پر کام کرنے لگے اور اکیسویں صدی کے آغاز تک کام کرتے رہے۔۔۔ 2001ء میں وہ روزنامہ ’ایکسپریس‘ سے بطور کالم نگار وابستہ ہوئے اور تادم حیات اسی سے وابستہ رہے۔



حمید اختر

کے

اپنے لکھے ہوئے کالم

حفیظ جالندھری

حمید اختر (پرش احوال) روزنامہ ”ایکسپریس“، 16 جولائی 2011ء

کالم نویسی سے دس دن کی چھٹی کے دوران ہم گزرے ہوئے دنوں اور ساتھ چھوڑ کر جانے والے سنگی ساتھیوں کو یاد کرتے رہے، دوستوں غم خواروں کی کیسی لمبی فہرست ہے فیض صاحب، سبط حسن، جلیس، انشاء جی، ساحر، سردار جعفری، کیفی اعظمی، مجروح سلطانی پوری اور صفدر میر، احمد راہی، قاسمی صاحب، قتیل شفائی، اے حمید اور ایسے بہت سے دوست، نور جہاں اور اقبال بانو سمیت۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ ان دنوں حفیظ جالندھری بہت یاد آئے۔ حفیظ بہت بڑے شاعر تھے، خوبصورت گیتوں کے خالق، ”رقاصہ“ اور ”ابھی تو میں جوان ہوں“ جیسی معرکہ الآرا نظمیں لکھنے والے جو ہمارے جیسے ادب کے طالب علموں کو طالب علمی کے زمانے میں حفظ تھیں۔

ہوا بھی خوش گوار ہے

گلوں پہ بھی نکھار ہے

بہار پہ بہار ہے

وہ کالی کالی بدلیاں

افتق پہ ہو گئیں عیاں

وہ اک ہجوم مے کشاں

ہے سوئے میکدہ رواں

کہاں چلا ہے ساقیا

ادھر تو آ ادھر تو آ

سبواٹھا پیالہ بھر

پیالہ بھر کے دے ادھر

یہ کیا گماں ہے بدگماں

خیال زہدا بھی کہاں

ابھی تو میں جوان ہوں

ممکن ہے مصرعوں کی ترتیب ادھر ادھر ہو گئی ہو مگر ہم یہ سطور اپنی یادداشت کی بنیاد پر لکھ رہے ہیں۔ حفیظ صاحب شاعر تو بڑے تھے مگر بسیار نویسی میں تک بندی بھی ہو جاتی ہے۔ یوں وہ اپنی نجی زندگی میں تماشے بھی بہت کرتے تھے جس کا جواب منٹو جیسے ستم ظریف اس طرح دیتے تھے کہ ایک بھری ادبی محفل میں سعادت نے کہا، حفیظ صاحب آج آپ کا ایک شعر پڑھا اس وقت سے اسے دہرا رہا ہوں واہ کیا بات کہہ دی ہے آپ نے!

”کونسا شعر؟“ حفیظ صاحب نے پوچھا

”یہ لڑکا جو کہ بیٹھا ہے

وہ لڑکی جو کہ بیٹھی ہے“

منٹو کا جواب سن کر محفل تو کشت زعفران بن گئی، حفیظ البتہ خاموش رہے۔ اسی زمانے میں یہ لطیفہ بھی مشہور ہوا تھا کہ حفیظ صاحب بیمار ہو گئے۔ ڈاکٹر نے دماغی کام سے منع کیا تو حفیظ صاحب نے کہا کہ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے مجھے تو جلد سے جلد شاہنامہ اسلام مکمل کرنا ہے“۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا ”شاہنامہ بے شک لکھتے رہئے، دماغی کام نہ کیجئے“۔ ایوب خان کے زمانے میں حفیظ صاحب محکمہ ویلج ایڈ کے سربراہ بن گئے تو انہوں نے احمد بشیر مرحوم اور ابن انشاء مرحوم کو ان کے محکموں سے اپنے محکمے میں بلا لیا مگر ان کو کام نہیں کرنے دیتے تھے کہتے تھے میں نے تمہیں کام کرنے کے لئے نہیں لایا۔ اپنے پاس بیٹھ کر باتیں کرنے کے لئے لایا ہوں۔ جس زمانے کی ہم بات کر رہے ہیں ہمیں بھی سال میں دو تین مرتبہ کراچی جانا پڑتا تھا، ہر ایسے دورے پر ہم احمد بشیر انشاء جی اور خود حفیظ صاحب کے دفتر کا چکر ضرور لگاتے تھے، حفیظ صاحب کی میز پر ہتھیلی کی ضرب لگانے والی گھنٹی تھی جو وہ بجاتے، چہرہ اسی حاضر ہو جاتا تو ہمارے لئے چائے کا آرڈر دیتے۔ ایک دفعہ وہ گھنٹی بجاتے رہے چہرہ اسی نہیں آیا تو گھنٹی لے کر اس کی تلاش میں نکلے، وہ کہیں دفتر کے آخری کونے میں دوسرے عملے کے ساتھ مصروف گفتگو تھا۔ حفیظ صاحب نے اس کی طرف گھنٹی کا رخ کر کے زور سے بجائی اور کہا میرے ساتھ میرے کمرے میں تشریف لائیے، وہ آ گیا تو اسے چائے بنانے کا حکم دیا۔

”پاکستان ٹائمز“ کے ایڈیٹر اے ٹی چودھری صاحب کا حفیظ صاحب کا کرایہ دار بننے کا واقعہ بڑا دلچسپ ہے، چودھری صاحب ماڈل ٹاؤن کے بلاک سی میں کرائے کے مکان میں رہتے تھے۔ مالک مکان نے اپنی کسی ضرورت کے تحت انہیں مکان خالی کرنے کا نوٹس دیدیا تو انہیں کسی بڑے مکان کی تلاش کی ضرورت پڑی۔ ایک دن انہیں معلوم ہوا کہ جی بلاک میں حفیظ جالندھری صاحب کے مکان کا نچلا حصہ کرائے کے لئے خالی ہے وہ خود اوپر کے حصے میں رہتے ہیں، اے ٹی صاحب کو کافی کوشش کے بعد حفیظ صاحب سے ملاقات کا وقت ملا، کرایہ وغیرہ طے ہو گیا، اے ٹی صاحب کے مکان پر قبضہ کرنے کی تاریخ بھی مقرر ہو گئی تو حفیظ صاحب نے کہا کہ مکان کرایہ پر لینے کے لئے چودھری صاحب کو ان کی سات شرائط پر عمل کرنا پڑے گا جو اس نوعیت کی تھیں کہ مکان میں کوئی جلسہ یا صحافیوں کا اجتماع نہیں ہوگا۔ رات نو بجے کے بعد کوئی گھر میں آئے گا، جائے گا نہیں یا کم از کم شور نہیں کرے گا وغیرہ وغیرہ۔ معمولی نوعیت کی شرائط تھیں جو چودھری صاحب نے تسلیم کر لیں مگر یہ بھی کہا کہ وہ ان پر سب پر عمل کریں گے بشرطیکہ حفیظ صاحب ان کی صرف ایک شرط تسلیم کریں۔

”وہ کون سی شرط ہے؟“ حفیظ صاحب نے پوچھا

”آپ اپنا کلام مجھے نہیں سنائیں گے“ چودھری صاحب کا جواب تھا۔



سچائی کی تلاش

حمید اختر (پرش احوال) روزنامہ ”ایکسپریس“، 12 ستمبر 2011ء

گزشتہ چند روز میں وطن عزیز میں بہت کچھ ہو گیا مگر بیماری اور لکھنے میں دقت پیش آنے کی وجہ سے ہمیں خاموش رہنا پڑا، ورنہ کون سا اخباری کالم ہے جس میں ذوالفقار مرزا کے ڈرامائی انکشافات کے بارے میں رائے زنی نہیں کی گئی۔

ذوالفقار مرزا نے ایم کیو ایم پر جو الزامات عائد کئے تھے ان کا جواب تاخیر ہی سے سہی ملا تو ہے وہ ایسے کہ حال ہی میں ایم کیو ایم کے قائد جناب الطاف حسین نے ایک دو روز قبل بیان دیا ہے، ہم سمجھتے ہیں کہ دونوں کے بیانات میں کچھ نہ کچھ سچائی بھی موجود ہے اور مبالغہ آمیزی بھی لیکن ہمارے خیال میں الطاف حسین نے جو کچھ کہا ہے وہ کم از کم اس ملک کی تاریخ میں حقائق سے قریب تر ہے۔ اس کے قیام کے فوراً بعد سے ہی اس نئے ملک کے وجود میں لانے کے اصل مقاصد کو نظر انداز کرنے کی کوششیں شروع ہو گئی تھیں۔ 1949ء میں ہی قرارداد مقاصد کے ذریعے مذہبی حلقوں نے عوام کے حق حاکمیت کو ختم کرنے کے اقدامات شروع کر دیئے۔ ملک کی جن سیاسی طاقتوں اور طاقتور حلقوں کو یہ صورت حال اپنے مفادات کے حق میں نظر آئی، ان کے اور مذہب کے نام پر سیاست کرنے والوں کے درمیان گٹھ جوڑ بھی ہو گیا جس کا نتیجہ ہم آج خود کش حملوں اور بم دھماکوں کی صورت میں معصوم اور بے گناہ شہریوں کی ہلاکت کے روزمرہ کے واقعات میں دیکھ رہے ہیں۔ ایسی تمام تر کوششوں کا اصل مقصد 1977ء میں ظاہر ہو گیا جب بھٹو شہید کو اقتدار سے ہٹانے کے لئے پی این اے نے انتخابات میں مبینہ دھاندلی کی بنیاد پر تحریک چلائی جس میں مذہبی افراد کو استعمال کیا گیا اور نفاذ اسلام کو اس کا نصب العین قرار دیا گیا، اس کے نتیجے میں بھٹو حکومت کا خاتمہ اور مارشل لاء کا نفاذ عمل میں آیا۔ مذہبی جماعتوں کو سرکاری سرپرستی میں خوب پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔

ہر مذہبی جماعت کا اپنا اپنا نفاذ اسلام تھا۔ ضیاء الحق کا اپنی آمریت کو طول دینے کے لئے اپنا نفاذ اسلام تھا۔ اس

کا کایہ ہوا کہ معاشرہ میں موجود سینکڑوں برس سے قائم فرقہ وارانہ ہم آہنگی ختم ہو گئی اور خود رو مسیح مذہبی تنظیمیں وجود میں آ گئیں جو مذہبی جماعتیں ان دنوں امریکہ کو تباہ کرنے کے منصوبے بنا رہی تھیں، ہمیں ذاتی طور پر علم ہے کہ وہ اس تحریک کے دوران لاہور کے امریکی سفارتی دفاتر میں بیٹھ کر ان کے اہل کاروں کے مشوروں سے تحریک کو فعال شکل دینے کے پروگرام بناتی تھیں۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ گزشتہ دو تین سو برس میں انقلاب کے ذریعے دنیا میں جو تبدیلی آئی ہے، ہم اسے تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہیں، ہمارے کچھ دوست کالم نویس اور لکھاری جن کی ذمہ داری عام لوگوں کی ذہنی تربیت کرنا ہے اس امر کے خواہش مند بھی ہیں اور اس پر یقین بھی رکھتے ہیں کہ اگر ہم سب سولہ کروڑ کے سولہ کروڑ پاکستانی ہزار بارہ سو سال قبل کے بھائیوں کی طرح اچھے اور نیک بن جائیں، صوم و صلوات کی پابندی کرنے لگیں اور ہر وقت توبہ و استغفار کرنے لگیں تو ہمارے تمام مسائل حل ہو جائیں گے مگر عملاً ایسا ہوتا نہیں، ہر معاشرے اور مذہب میں نیک و بد دونوں قسم کے لوگ ہوتے ہیں، ہمارے لئے اتنا ہی کافی ہونا چاہیے کہ ہم جبراً لوگوں پر اپنے عقائد مسلط کرنے کی بجائے برے لوگوں کے سامنے اچھے لوگوں کی مثال پیش کر کے انہیں نیکی کا راستہ اختیار کرنے کی ترغیب دیں امید اچھی چیز ہے، ہم نے اس کا دامن کبھی نہیں چھوڑا۔ نکو درکمپ ہو یا سی کلاس میں قید تہائی، ہم ہمیشہ پر امید ہی رہے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اب جو صورت حال پیدا کر دی گئی ہے اس میں تباہی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ سوال یہ ہے کہ اچھے اسلام کے نام پر سادہ لوح مسلمان پر تشدد تحریکوں کا ایندھن بننے کے لئے تیار کیوں ہوتے ہیں؟ کیوں کہ عام مسلمان بھی ان تصورات یا نظریات کے اثر میں ہیں اور بعض تو اس ذہنی انتشار کا شکار ہیں کہ وہ ان نظریات کی حمایت کریں یا نہیں۔ اگر ہم یہ خیال رکھیں کہ مذہب بالخصوص اسلام ایک الوہی معاملہ ہے اور لافانی ہے جبکہ سیاست، سیاسی نظام اور کشمکش ہر دور، ہر علاقے اور سماجی ترقی کے ہر مرحلے کے ساتھ تبدیل ہوتی رہتی ہے، اس لئے یہ ضروری ہے کہ مذہب کو سیاست سے الگ رکھا جائے جس کی تلقین قائد اعظمؒ کے گیارہ اگست کے اسمبلی سے خطاب میں کی گئی ہے جس پر الطاف حسین صاحب نے اپنی پریس کانفرنس میں زبردست زور بھی دیا ہے۔ جیسا کہ ہم نے کہا ہے ذوالفقار مرزا اور الطاف بھائی دونوں کے موقف میں بعض سچائیاں اور حقائق چھپے ہوئے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ قوم اجتماعی طور پر ان دونوں کے بیانات میں سے سچائی ڈھونڈنے کی کوشش کرے۔ خدشہ ہے کہ ایسا نہ کیا گیا تو ملک بچانا مشکل ہو جائے گا۔ یہ امر اطمینان بخش ہے کہ یہ بات اب ہم ہی نہیں کہہ رہے بلکہ میاں نواز شریف سمیت ملک کے متعدد سیاسی رہنما قوم کو یہ سیدھا راستہ اختیار کرنے کا برابر مشورہ دے رہے ہیں۔



اولاد نرینہ کے لئے

حمید اختر (پرسش احوال) روزنامہ ”ایکسپریس“، 13 ستمبر 2011ء

برصغیر پاک و ہند میں لڑکیوں کو والدین پر بوجھ سمجھنے کی روایت خاصی پرانی ہے۔ یہ روایت اس زمانے سے چلی آرہی ہے جب اولاد نرینہ خاندان کے وسائل میں اضافے کا ذریعہ تصور ہوتی تھی اور لڑکیوں کو پالنے پوسنے کے بعد جہیز کی شکل میں اچھی خاصی رقم کی ادائیگی کے بعد رخصت کرنے کی فکر والدین کے دامن گیر رہتی تھی۔

جن خاندانوں میں ابتدائی اولاد دو تین لڑکیوں کی صورت میں اس دنیا میں قدم رکھتی وہ اولاد نرینہ کے لئے ترستے رہتے، علاج معالجے کے علاوہ اس سلسلے میں ٹونکوں سے بھی کام لیا جاتا، ہمیں اس بارے میں پنڈت مالک رام نامی ایک عالم فاضل کے اس ٹونکے کے بارے میں پتہ چلا جب ہمارے مرحوم دوست احمد بشیر کے ہاں یکے بعد دیگرے دو لڑکیوں نے جنم لیا۔ پنڈت مالک رام کے اس ٹونکے کا انکشاف ہم پر ابن انشاء نے کیا۔ اس نے بتایا کہ پنڈت موصوف نے قرآن شریف اور احادیث کا گہرائی میں مطالعہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اگر دو یا تین بیٹیوں کے بعد جنم لینے والی بیٹی کا نام بشری رکھ دیا جائے تو اس کے بعد والدین کے ہاں آنے والا بچہ یقیناً لڑکا ہوگا۔ بشری نام رکھنے کا مطلب لڑکے کی پیدائش کی بشارت ہے۔ چنانچہ احمد بشیر اور اس کی بیگم نے دو بچیوں کی پیدائش کے بعد تیسری بچی کا نام بشری رکھ دیا۔ یہ وہی بشری ہے جو بعد میں بشری انصاری کے نام سے ٹیلی ویژن کی مقبول اداکارہ اور گلوکارہ کی روپ میں سامنے آئی اور اب تک چھوٹی سکرین پر کامیابی کے جھنڈے گاڑ رہی ہے۔

ہماری حیرت کی بات یہ تھی کہ بشری کے بعد بیگم احمد بشیر نے جس چوتھے بچے کو جنم دیا وہ واقعی لڑکا تھا۔ ہمیں اس وقت اس کا نام یاد نہیں آ رہا لیکن یہ بات ہمارے علم میں ہے کہ اس جوڑے کا چوتھا بچہ واقعی لڑکا تھا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ 1956ء میں ہماری شادی ہوئی تو ہماری پہلی اولاد بھی دو لڑکیاں تھیں، صباء اور ہما کے بعد جب ہماری بیگم نے تیسری بچی کو جنم دیا تو ہم نے بھی اس کا نام بشری ہی رکھا۔ انشاء جی کو کسی طرح معلوم ہوا تو انہوں نے کراچی سے بذریعہ فون تاکید

کی کہ ہم پنڈت مالک رام کے دریافت کردہ ٹوکے سے کام لیں۔ ہم نے بہر حال ان کا مشورہ قبول کرتے ہوئے ایسا ہی کیا۔

ہمارے ساتھ البتہ یہ حادثہ ہوا کہ تیسری بیٹی کا نام بشری رکھنے کے باوجود ہماری بیگم نے ہماری سب سے چھوٹی بیٹی لالہ رخ کو جنم دیا۔ ہم میاں بیوی کو تھوڑا بہت صدمہ بھی ہوا، لیکن اس وقت تک زمانہ بدل چکا تھا، کم از کم ذاتی طور پر لڑکے اور لڑکی میں زیادہ فرق محسوس نہیں کرتے تھے۔ اس لئے جب ہماری بڑی بہن منگمری (اب ساہیوال) سے لاہور آئیں اور ان کے افسوس کرنے پر ہم نے ان سے کہا کہ ہمارے نزدیک بچے کی جنس کا فرق کوئی معنی نہیں رکھتا۔ بچہ آخر بچہ ہوتا ہے وہ لڑکا ہو یا لڑکی گھر والے سبھی اس سے پیار کرتے ہیں۔ ہماری بہن نے اس پر صاف تو کیا مگر ان کا کہنا تھا کہ گیہوں کی روٹی مسلسل کھانے کے بعد اکثر مسمی (بیسنی) روٹی کی طلب ہوتی ہے اولاد کے ملا جلا ہونے کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ اس کے بعد جب ہماری بیگم پانچویں بچے کو جنم دینے کے قریب آئی تو ہماری بہن نے اس ضمن میں ایک اور ٹوکے کا اضافہ کر دیا۔ اس نے اعلان کیا کہ ہمارا اگلا بچہ امام حسینؑ کا فقیر ہوگا اور لازماً لڑکا ہوگا۔ مگر منت یہ مانتی پڑے گی کہ اسے پانچ برس تک گھر والے کوئی نیا کپڑا سلوا کر یا خرید کر نہیں پہنائیں گے وہ اس پانچ سال کی مدت میں مانگے تا نگے کے کپڑے ہی پہنے گا۔ اس شرط پر اس نے بھی اور ہم نے بھی سختی سے عمل کیا۔ پانچ برس کی عمر تک ہمارے بیٹے عمر گئے کپڑے ہماری بہن زیادہ تر منگمری سے ہی بھیجتی رہی۔ ہم نے مانگنے کا یہ سلسلہ لاہور میں بھی جاری رکھا۔ حالانکہ چار لڑکیوں کے بعد پیدا ہونے والے لڑکے کو اچھے اور قیمتی کپڑے پہنانے کے ارمان ہمارے دل میں تھے یہ سارا عرصہ شدید خواہش کی صورت میں موجود ہے مگر بہن نے اتنی سختی سے منع کر رکھا تھا کہ ہمارے لئے ہاتھ روکنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ البتہ ہم پانچ سال کی اس مدت کے خاتمے کے سخت منتظر رہے۔ بالآخر جب پابندی کے یہ پانچ برس گزر گئے تو ہم نے ہی نہیں ہمارے پورے خاندان نے اس بچے کو نئے جوڑوں سے لا دیا۔ ہمیں نہیں معلوم ان ٹوکوں کی شرعی حیثیت کیا ہے۔ تاہم یہ حقیقت بھی ہمارے پیش نظر رہی کہ انسانی معاشروں میں توہمات اور تعصبات کسی نہ کسی صورت میں ہمیشہ موجود رہے ہیں۔



یادوں کے جھروکے سے

حمید اختر (پرسش احوال) روزنامہ ”ایکسپریس“، 17 ستمبر 2011ء

ابھی پچھلے دنوں قائد اعظمؒ کی 62 ویں برسی منائی گئی۔ اخبارات نے ایڈیشن شائع کئے۔ ریڈیو ٹی وی پر 11 ستمبر کو دن بھر بانی پاکستانؒ کی شخصیت اور نئے ملک کو وجود میں لانے کے لئے ان کی سیاسی بصیرت اور فہم و فراست کو زبردست خراج عقیدت بھی پیش کیا جاتا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ گزشتہ صدی کے چوتھے عشرے میں جو حالات تھے اور ان میں برصغیر میں اس خطے کے مسلمان جن خدشات کے شکار تھے ان میں شاید ہماری نجات کا یہی واحد ذریعہ تھا، یہ دوسری بات ہے کہ نئے ملک کے وجود میں آنے کے بعد ہم نے خود کو اس طرح تباہی کے دہانے پر لاٹھایا جو شاید انگریز اور ہندو مل کو بھی نہ کر سکتے۔ خیر یہ بات تو برسبیل تذکرہ بیچ میں آگئی، ہم قائد کی عظمت کے بارے میں اپنی کچھ ایسی ذاتی معروضات پیش کرنا چاہتے ہیں جن کا اس ملک کے عوام و خواص کو بہت بعد میں پتہ چلا، اس وقت لوگوں کو سوائے اس حقیقت کے کچھ اور معلوم نہ تھا ان کی صحت خاصی خراب ہے مگر یہ کسی کے گمان میں بھی نہ تھا کہ اتنا بڑا کارنامہ انجام دینے کے بعد وہ اتنی جلدی اپنے چاہنے والوں کو چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ ان کے اتنی جلدی یہ دنیا چھوڑ کر جانے کی وجوہ و اسباب کیا تھے یہ تو بعد میں آہستہ آہستہ معلوم ہوا لیکن اگر ہم یہ کہیں کہ ہمیں ان کی رحلت کے متعلق کچھ اندازہ تھا تو اسے ہماری لاف زنی نہ سمجھا جائے، مگر اس کا پس منظر جاننے کے لئے ہمیں 63 سال پیچھے جانا پڑے گا۔ جو یہ ہے:

جون 1948ء میں ہمیں بنے بھائی (سجاد ظہیر صاحب) کے ہمراہ کمیونسٹ پارٹی کی تنظیم کے لئے لاہور سے کراچی جانا پڑا۔ کراچی میں پارٹی میں غیر مسلموں کی تعداد زیادہ تھی ان کے وہاں نقل مکانی کرنے یا نکالے جانے کے بعد وہاں کے حالات خاصے خراب تھے، بڑے رہنما جیل میں تھے، پارٹی کے فنڈز کس کے پاس تھے، پریس کا ڈیکلریشن کس

کے نام تھا اور ان دنوں کس کے قبضے میں تھا یہ جاننے کے لئے کراچی جانا پڑا، جہاں ہمارا قیام پانچ ہفتوں سے زیادہ رہا، کراچی اس وقت صاف ستھرا اور خاموش شہر تھا تین ساڑھے تین لاکھ کی آبادی تھی، ہم نے بیگم ملک نورانی اور ملک نورانی کے گھر قیام کیا جو غالباً بہار آباد میں تھا۔ شہر میں ٹریفک برائے نام تھا۔ لاہور کے تانگے کی جگہ وہاں وکٹوریہ چلتی تھیں، وہ تانگے کی طرح گھوڑے سے چلتی مگر وکٹوریہ تانگے کے مقابلے میں البتہ زیادہ آرام دہ تھی۔ ہم تقریباً روزانہ اس میں بیٹھ کر کسی پارک کے بیچ پر جا بیٹھتے۔ بیگم ملک نورانی ہم سب سے زیادہ پر جوش نظر آتیں اور آنے والے اچھے دنوں کو قریب لانے کی تجاویز پیش کرتی رہیں ان دنوں کراچی نیوی میں ہمارے لدھیانہ کے دوست لیفٹیننٹ کمانڈر سید انور بحریہ کے اعلیٰ عہدے پر تعینات تھے، ایک دن ان کا فون آیا کہ کل قائد اعظم سٹیٹ بینک کا افتتاح کرنے والے ہیں، تم اگر اس تقریب میں شرکت کرو تو تمہارے لئے اعزاز ہو گا چنانچہ ہم نے اس تقریب میں شرکت بھی کی اور قائد اعظم کی تقریر بھی سنی، قائد اعظم سٹیج پر آئے تو ہڈیوں کا ڈھانچہ تھے، سید انور اور ہم سامنے کی صفوں میں بیٹھے تقریر سنتے رہے مگر ہماری پریشانی ان کی انتہائی خراب صحت تھی، تقریب کے بعد ہم اس موضوع پر خاصی دیر گفتگو بھی کرتے رہے۔ افسانہ نگار انور کا خیال تھا ان کی صحت جتنی خراب ہے وہ مہینہ سوا مہینے سے زیادہ زندہ رہتے نظر نہیں آتے۔ ہمارے لئے اس رائے کو تسلیم کرنے کے سوا چارہ نہ تھا، کچھ روز بعد ہم کراچی سے لاہور آ گئے، ایبٹ روڈ پر کیمپل سینما کے برابر اور نشاط سینما کے سامنے ساحر نے اپنے لئے ایک بڑے مکان کا چھوٹا سا حصہ الاٹ کر رکھا تھا، کراچی جانے سے قبل ساحر کی والدہ، ساحر اور ہم اسی مکان میں رہے تھے، ابن انشاء بھی اس کے دوسرے کونے کے ایک پنگھوڑا نما چھوٹے سے گھر میں قیام پذیر تھا۔ ہماری غیر حاضری میں ساحر واپس ہندوستان چلا گیا تھا اگرچہ وہ مکان بند کر کے تالے کی چابیاں انشاء کے گھر چھوڑ گیا تھا مگر ہماری طویل غیر حاضری میں تالہ توڑ کر کوئی صاحب ہمارا تھوڑا بہت سامان بھی لے گئے چنانچہ اس کے بعد ہمارا اڈہ انشاء جی کا گھر بن گیا، یہاں صبح و شام دوست جمع ہوتے، چائے کا دور چلتا، ملکی حالات پر تبصرے ہوتے، اس محفل میں ہم کراچی کا احوال بیان کرتے ہوئے قائد اعظم کی حالت کا ذکر بھی اکثر کرتے، کچھ لوگوں نے تو اسے اندیشہ ہائے دور دراز قرار دیا مگر چند ایک تشویش اور پریشانی میں مبتلا نظر آتے، ہماری اس محفل میں حفیظ قندھاری نامی ایک فوٹو گرافر بھی شامل ہوتا جو اگرچہ اخباری تصویر بنانے میں کافی مہارت دکھاتا مگر اس کی زیادہ تصویریں نیکیو تک ہی محدود رہیں۔ دوست اسے عام طور پر نیکیو فوٹو گرافر کے نام سے پکارتے تھے۔ قائد اعظم کی بیماری کا حال سن کر وہ سب سے زیادہ نہ صرف غصے میں آیا بلکہ ہمیں بہت برا بھلا کہتا رہا، چند ہی دنوں میں 11 ستمبر 1948ء کو قائد اعظم واقعی رحلت پا گئے۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ ہم اس روز اپنی رہائشی عمارت کے باہر بھی سو ہی رہے تھے کہ حفیظ قندھاری غصے اور صدمے سے گھبرایا ہوا وہاں آ کر

اور اس نے زور زور سے بولنا شروع کر دیا۔ وہ تقریباً گالیاں دے رہا تھا اور ہماری کالی زبان پر لعنت بھیج رہا تھا، جیسے کہ قائد اعظمؒ کی وفات کے ہم ذاتی طور پر ذمہ دار ہوں ایبٹ روڈ کی اس سینما والی سڑک پر صبح صبح ہی ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ لوگوں نے بڑی مشکل سے حفیظ قندھاری کو وہاں سے چلتا کر کے ہمیں رہائی دلائی، اس بے چارے کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ ہمیں قائدؒ کی رحلت کا شاید اس سے زیادہ صدمہ تھا، البتہ ہم اس کی طرح آپے سے باہر ہونے سے گریز کرتے رہے۔



جنم بھومی کی طرف

حمید اختر (پرش احوال) روزنامہ ”ایکسپریس“، 20 ستمبر 2011ء

ہماری تیسری نسل ہماری جنم بھومی کی طرف دو روز بعد رواں ہونے والی ہے، ہم اگرچہ لدھیانہ ضلع کے گاؤں تہاڑہ کے رہنے والے ہیں مگر ہم سب بہن بھائیوں کی پیدائش فیروز پور شہر کے نزدیک واقع ریاست فرید کوٹ کی ہے کیونکہ 1914ء کی جنگ عظیم کے دوران انگریزوں نے زیادہ سے زیادہ ہندوستانیوں کو ملازمت دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب برصغیر میں انگریزی زبان کی تعلیم حاصل کرنے والے برائے نام تھے، اردو فارسی اور عربی زبان کے عالم البتہ عام تھے ہمارے تایا اور والد بھی ان ہی میں شامل تھے۔ غیر ملکی حکومت نے یہ بھی فیصلہ کیا تھا کہ اچھی شہرت اور علم پرور خاندانوں کے افراد کو اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا جائے۔ چنانچہ طے پایا کہ ہمارے تایا صاحب کو پولیس کے محکمے میں تھانیدار بھرتی کر لیا جائے اور والد کو فرید کوٹ ریاست میں پی ٹی بلیوڈی کے محکمے میں ملازمت دیدی جائے۔ اس عہدے پر وہ برسوں فائز رہے اور ہم چھ یا ان میں سے پانچ بہن بھائیوں کی پیدائش وہاں کی ہے۔ اس لحاظ سے فرید کوٹ ہی ہماری جنم بھومی ہے۔ 1927ء میں والد صاحب کا انتقال ہو گیا تو بھی ہمارا تعلق فرید کوٹ سے قائم رہا۔ والد صاحب کی جگہ ہمارے ماموں کو یہ ملازمت دے دی گئی، اگرچہ ہم اس کے بعد اپنے گاؤں آگئے تھے مگر فرید کوٹ کو یاد ضرور کرتے رہے۔

دو روز بعد ہماری نواسی صبا کی بیٹی اور اس کے میاں محمود، جن دونوں کا تعلق ایک میوزک گروپ سے ہے، وہاں کے کسی گروپ کی دعوت پر فرید کوٹ جا رہے ہیں (میشا شفیع تو مقامی چینلوں پر جگنی گا کر پاکستان ہی نہیں دوسرے ہمسایہ ملکوں میں بھی مقبولیت حاصل کر چکی ہے)۔ اگر ہم تندرست ہوتے تو ان کا ساتھ ضرور دیتے، ہمیں اپنے گھر کے پیچھے بلوچوں کا محلہ بھی یاد ہے اور اپنے بڑے گیٹ کے سامنے مولوی شفیع کا گھر بھی، یہی وہ مولوی شفیع ہیں جو قیام پاکستان کے بعد لاہور کے ڈپٹی کمشنر بھی بنے، فرید کوٹ کا بازار بھی ہماری نظروں کے سامنے ہے۔ ان دونوں کے ساتھ ہماری چوتھی

نسل یعنی پیشا شفیق کی سات آٹھ ماہ کی بچی بھی غالباً جا رہی ہے۔

ہماری دس ماہ کی بیماری میں بچوں نے جس طرح ہماری خدمت کی ہے وہ مثالی ہے۔ بیٹا امریکہ سے آیا اور تین ہفتے یہاں رہ کر گیا۔ اس عرصے میں اس نے دن رات ہماری دیکھ بھال کی، دو بیٹیوں کے علاوہ جولاہور میں ہیں ان دنوں ہماری دینی والی بیٹی آئی ہوئی ہے اور ہماری دیکھ بھال کر رہی ہے۔ ہماری دعا ہے اللہ تعالیٰ سبھی کو ایسی اولاد دے۔ اگرچہ دنیا سے اٹھائے جانے کا طریقہ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ جتنی عمر کسی انسان کی اس نے مقرر کی ہے اس کے بعد آرام سے بھی اسے عالم بالا لے جایا جاسکتا ہے۔ بیماریوں میں مبتلا کرنے سے کیا حاصل؟ مگر اس کی مصلحتیں وہی جانتا ہے۔

نوٹ: ہم ان دنوں احساس جرم میں مبتلا ہیں یعنی ہم کام معمول سے بہت کم کر رہے ہیں اور معاوضہ پورا وصول کرتے ہیں اس لئے بہت سوچ بچار اور غور کرنے کے بعد ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ اب ہم اس ماہ کے آخر تک کالم نہیں لکھیں گے۔ اس کے بعد فیصلہ کریں گے کہ لکھ سکتے ہیں یا نہیں۔ اپنی صحت کی طرف سے ہم خاصے مایوس ہو چکے ہیں اس لئے شاید اب کالم نویسی ترک کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ یہ درست ہے کہ ہم نے آٹھ سال اس اخبار کی خدمت کی ہے اور کراچی سے باہر آنے کے بعد اس کی اشاعت بڑھانے میں پوری پوری مدد بھی کی مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اب بغیر کام کئے معاوضہ وصول کرتے رہیں، اب تک ہم نے قارئین کے اصرار اور کچھ اپنے علاج کی مجبوری کی وجہ سے یہ سلسلہ جاری رکھا مگر بیماری اتنی لمبی ہو گئی کہ اب اسے جاری رکھنا شاید ممکن ہی نہ ہو، بہر حال اس کا فیصلہ یہ مہینہ گزرنے کے بعد ہوگا۔



فیض شناسی

حمید اختر (پرسش احوال) روزنامہ ”ایکسپریس“، 13 ستمبر 2011ء

فیض صاحب کے سو سالہ ولادت کے جشن کے سلسلے میں یوں تو درجنوں کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں، ان میں اگرچہ فیض کی شخصیت کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں مگر زیادہ تر ان کی شعری خوبیوں کو نمایاں کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ فیض شناسی کے عنوان سے البتہ رؤف ملک کی جو تصنیف حال ہی میں سامنے آئی ہے اس میں فیض صاحب کی شخصیت کے ایسے بہت سے پہلو سامنے آئے ہیں جو اب تک اکثر لوگوں کے علم میں نہیں تھے۔

اس کی وجہ رؤف ملک کا فیض صاحب سے مسلسل رابطہ ہے حتیٰ کہ جب وہ راولپنڈی سازش کیس کے تحت حیدرآباد اور منگمیری کی جیلوں میں تھے اس وقت بھی رؤف ان سے ملاقاتیں کرتا رہا اور خط و کتابت بھی، جس کے نتیجے میں اس نے فیض صاحب کے ”نقش فریادی“ کی اشاعت کے آٹھ دس برس بعد، نیا مجموعہ ”دست صبا“ شائع بھی کیا اور اس کی تقریب رونمائی بھی اس وقت کی جب فیض ابھی جیل میں تھے، چنانچہ فیض شناسی کے دیباچہ نگار ڈاکٹر سید جعفر احمد نے اس بارے میں بالکل درست لکھا ہے کہ ”خود فیض صاحب کے کہنے پر ان کا شعر

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا

وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

”دست صبا“ کی پہلی اشاعت میں شامل نہیں کیا گیا کیوں کہ اس وقت فیض صاحب پر مقدمہ چل رہا تھا اور اس شعر کو توہین عدالت کے زمرے میں لانے کی کوشش کی جاسکتی تھی۔ البتہ جب انہیں سزا سنائی گئی تو اس کے بعد چھپنے والے ”دست صبا“ کے ایڈیشن میں یہ شعر بھی شامل کر لیا گیا۔ اس طرح کے اور بہت سے رموز اور انکشافات عبدالرؤف ملک نے فیض سے اپنی قربت اور ان کے ساتھ سیاسی و کاروباری روابط کی نسبت سے درج کر دیئے ہیں۔ ”حقیقتاً اس کتاب کی یہی سب سے اہم خوبی ہے کہ رؤف ملک نے ان کی شخصیت سے متعلق ایسے بہت سے واقعات کی نشاندہی کی ہے جن کا اب تک کہیں اور ذکر سننے میں نہیں آیا۔ اس کتاب کا دوسرا اہم پہلو بقول سید جعفر احمد، اس میں پائے جانے والے موضوعات کا تنوع ہے۔ جہاں اس میں فیض کی شاعری پر تبصرے ہیں وہیں اس میں ٹریڈ یونین سے فیض کا تعلق، ان کی جیل کی زندگی، ٹوبہ ٹیک سنگو کا نفرنس میں ان کی شرکت،

تحقیق سے ان کے شغف اور ان کے نظری اور فطری میلانات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ رؤف ملک کو شاید اس کا علم نہیں تھا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کانفرنس میں ہم فیض صاحب کو اپنی گاڑی میں لے گئے تھے۔ ہمارے ساتھ عبداللہ ملک اور احمد راہی بھی تھے، رات ہم نے لائل پور میں اپنے دوست ساقی مرحوم کے گھر گزاری اور اگلی صبح وہاں سے روانہ ہو کر ٹوبہ کسان کانفرنس میں پہنچے، ہمارا ارادہ اس پر تفصیل سے لکھنے کا تھا مگر بیماری کی وجہ سے یہ پورا نہ کر سکے، خیر یہ بات تو یونہی برسمیل تذکرہ آگئی اصل بات رؤف ملک کی کتاب سے متعلق ہے رؤف ملک نے اگرچہ فیض کے ٹریڈ یونین سے تعلق اور فیض کے لاہور کے شاہی قلعہ کے عقوبت خانے میں قیام کا الگ الگ ابواب میں ذکر کیا ہے مگر سیالکوٹ کے بارے میں جو باب رؤف نے رقم کیا ہے وہ انتہائی وقیع اور تفصیلی ہے اور شہر اقبال فیض..... سیالکوٹ کا احاطہ انتہائی خوبصورتی سے کیا ہے، اس کے ابتدائی میں وہ لکھتا ہے کہ ”اپنی فیض شناسی کو مدلل کرنے کے لئے جب میں نے سیالکوٹ کی تاریخی اہمیت سمجھنے کی جستجو میں کچھ تحقیق کی تو کئی تاریخی حقائق کا علم ہوا۔ مثلاً یہ کہ سیالکوٹ نہ صرف برصغیر بلکہ جنوبی ایشیا کا ایک قدیم ترین شہر ہے بلکہ پوری دنیا کے قدیم ترین شہروں میں شمار ہوتا ہے۔ اس کی تاریخ ہزاروں سال پرانی ہے۔ ہندوؤں کی متبرک کتاب مہا بھارت میں بھی اس کا ذکر یوں ملتا ہے کہ ”رجبہ شل، جس نے اس شہر کی بنیاد رکھی پانڈوؤں کا رشتہ دار تھا وغیرہ“۔

عبدالرؤف ملک کا تعلق چونکہ بائیں بازو کی سیاست سے عمر بھر کا ہے اور وہ کمیونسٹ پارٹی کا رکن بھی ہے اس لئے اس کتاب میں فیض صاحب کے ذکر کے ساتھ ساتھ اس ملک میں بائیں بازو کی سیاست کے اہم واقعات کا تذکرہ بھی اس نے کر دیا، مثلاً میرٹھ سازش کیس وغیرہ سے نئی نسل کو آگاہ کرنے کی مستحسن کوشش نمایاں ہے۔ بیگم ایلیس فیض کے بارے میں اردو ادب و شعر کے قاری بہت کم جانتے ہیں۔ رؤف ملک نے ایلیس فیض ”عجوبہ روزگار خاتون“ کے عنوان سے ایلیس کی زندگی اور کردار کی خوبصورت عکاسی کی ہے۔ فیض کے بطور استاد کارناموں کا ایک الگ باب میں ذکر ہے۔ غرضیکہ رؤف ملک کی یہ کتاب کئی لحاظ سے اہم اور تاریخی دستاویز کی شکل میں ہمارے سامنے آئی ہے جس کے مطالعہ سے نہ صرف فیض اس کے اہل خانہ اور اقرباء کے بارے میں معلومات یکجا کر دی گئی ہیں بلکہ اس دور کی عمومی بالخصوص بائیں بازو کی سیاست کا خاصا تفصیلی ذکر بھی موجود ہے۔ مضبوط اور خوبصورت جلد کے ساتھ 160 سے زائد صفحات پر مشتمل اس کتاب کی قیمت دو سو روپے ہے جو انتہائی مناسب ہے ملنے کا پتہ ہے ”ایڈمنسٹریٹو آفیسر پاکستان اسٹڈی جامعہ کراچی۔“

پوسٹ بکس نمبر 8450 کراچی 75270، ای میل۔ pscuok@yahoo.com ہے۔



میری زندگی

حمید اختر (پرسش احوال) روزنامہ ”ایکسپریس“، 18 اکتوبر 2011ء

(یہ خاکہ حمید اختر (مرحوم) کی کتاب ”آشنائیاں کیا کیا“ میں ”بے وقوف“ کے نام سے شامل کیا گیا تھا۔ خاکہ کے اختتام پر حمید اختر نے ازراہ تفنن لکھا، ”یہ خاکہ رحلت کے بعد اشاعت کے لئے لکھا گیا مگر دیر ہونے کی وجہ سے قبل از وقت شائع کیا جا رہا ہے۔“

حمید اختر کی ایک نادر تحریر، جس میں انہوں نے اپنی شخصیت اور بیتی زندگی کی تلخ حقیقتوں کو شگفتہ انداز میں بیان کیا خوش پوش، خوش گفتار، نیک مگر کم عقل بلکہ بے وقوف، یہ تھے حمید اختر، عمر بھر تو ہمت اور مذہبی جنون پرستوں کے خلاف سینہ سپر رہے۔ مگر آخری عمر میں اس پر خاصے متاسف نظر آتے تھے، افسوس یہ تھا کہ ان کے بزرگوں نے تین پشت پہلے نہ معلوم کیوں اس فیصلے کا اعلان کر دیا کہ ان کی اولاد اپنے خاندانی نسب کو ظاہر نہیں کرے گی۔ روایت یہ تھی کہ ان کے دادا مرحوم کی روحانی قوت کسی چیلنج میں ظاہر ہوئی تھی۔ اس کے فوراً بعد آپ انتقال کر گئے مگر وصیت بھی کر گئے کہ ان کی آنے والی نسلیں پیری مریدی کا خاندانی پیشہ ترک کر کے خود محنت کر کے کمائیں اور کھائیں۔ چنانچہ ان کے والد اور تایا اور پھر ان کی اولاد کام پر لگ گئی۔ یہ بھی فیصلہ تھا کہ نام کے ساتھ سید نہیں لکھیں گے۔ حمید اختر جب پیروں فقیروں کو مفت کی کھاتے دیکھتے تو ”افسوس“ سے کہتے ”ہمارے بزرگوں نے ہم پر بڑا ظلم کیا اگر وہ ہم پر یہ پابندی عائد نہ کرتے تو اس ملک میں ہمارا رتبہ کتنا بلند ہوتا۔ ہمارے لئے عیش و عشرت کے دروازے کھلے ہوتے مگر افسوس کہ بزرگ ہمیں کام پر لگا گئے نتیجہ یہ ہے کہ عمر بھر چکی پیٹتے رہے، محنت کرتے رہے، ہمیشہ مقروض رہے، اپنا گھر تک نہ بنا سکے۔“

مشرقی پنجاب کے ضلع لدھیانہ کے ایک دور افتادہ گاؤں میں پیدا ہوئے جب ہوش سنبھالا تو گھر والوں نے حفظ قرآن کے لئے مدرسے میں داخل کرادیا۔ انہیں کسی نے بتایا تھا کہ حافظ قرآن کی سات پشتیں بخشی جاتی ہیں۔ دس سال سے کم عمر ہی میں قرآن حفظ کر لیا مگر اس دینی مدرسے میں طلباء سے جو سلوک ہوتا تھا۔ اس کے رد عمل کے نتیجے میں بلوغت

تک پہنچتے پہنچتے تمام دینی رشتوں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ افسوس صرف سات پشتوں کی محرومی کا تھا۔ اپنی عاقبت کی کبھی فکر نہ کی۔ آخری عمر میں بھی نہیں کہ اس کو وضع داری کے خلاف سمجھتے تھے اور ایسے لوگوں سے سخت نفرت کرتے تھے جو زندگی بھر لوٹ مار، چوری، دھوکا، بے ایمانی اور ہر قسم کے لہو و لعب میں مصروف رہتے ہیں اور آخری عمر میں داڑھی بڑھا کر تسبیح ہاتھ میں لے لیتے ہیں۔

حمید اختر کی ابتدائی زندگی غربت میں گزری، تین برس کے تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ اس زمانے میں خاندانی زرعی اراضی کا بہت بڑا حصہ دریا برد ہو گیا۔ ویسے بھی 1924ء کی پیدائش تھی اور اس کے بعد کے دس بارہ برس برصغیر میں کساد بازاری اور بحران کے تھے۔ حمید اختر کا بچپن کھیتوں کھلیانوں میں گزرا۔ پانچ برس کی عمر سے نماز باجماعت ادا کرنے کی پابندی تھی۔ نماز قضا ہونے کی صورت میں حافظ صاحب مرغانا کر کمر پر ڈبل اینٹیں رکھ دیتے۔ اس ڈر کی وجہ سے فجر کی اذان کے ساتھ ہی صبح اٹھ بیٹھتے اور مسجد کا رخ کرتے۔ برس ہا برس تک کوئی نماز قضا نہیں کی۔ آٹھ دس برس کی عمر تک پہنچتے پہنچتے عادت پختہ ہو چکی تھی مگر چودہ پندرہ برس کی عمر کے بعد کبھی ادھر کا رخ نہیں کیا۔ کہا کرتے تھے میں بچپن ہی میں اپنا کوٹہ پورا کر چکا ہوں۔ دس برس کی عمر میں قرآن شریف حفظ کر لیا تھا۔ اسی سال رمضان میں تراویح پڑھائی اور پورا قرآن سنایا۔ شبینہ بھی پڑھا۔ یہ سارے کام بڑی شتابی سے کئے۔ اس کے بعد گھر والوں کو دنیاوی علوم کی فکر ہوئی تو گاؤں سے بڑے بھائی کے پاس لدھیانہ بھجوا دیا۔ جہاں تیسری جماعت میں داخلہ لیا اور وہیں سے بغاوت کا آغاز ہوا۔

خاندان میں علی ہر نام کے ساتھ ضروری تھا۔ ان کا اپنا خاندانی نام بھی اختر علی تھا۔ سکول میں داخلے کے وقت اڑ گئے کہ میرا نام اختر علی نہیں حمید اختر ہے، بھائیوں، بزرگوں، سکول والوں سبھی نے لاکھ سارا مگر یہ اڑے رہے بالآخر سب لوگوں کو نام میں یہ معصوم سی ترمیم ماننا پڑی۔ چنانچہ سکول میں اپنے تجویز کردہ نام ہی سے داخل ہوئے۔ بچپن اگرچہ غربت میں گزرا تھا مگر اس خاندان کی اپنے گاؤں ہی میں نہیں پورے علاقے میں بہت عزت تھی۔ خاندانی برتری کے قصے بھی مشہور تھے مثلاً پورے علاقے میں یہ بات تسلیم کر لی گئی تھی کہ کوئی چوران کے گھر گیا تو اندھا ہو گیا، چوران کے خاندان کے گھروں سے دو دو میل دور رہتے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد البتہ چوروں نے یہ کمی پوری کی اور متعدد بار ان کے مال پر ہاتھ صاف کئے۔ کسی کی بینائی کو ضعف نہیں پہنچا بلکہ کنیوں کی نظر اس کے بعد سے زیادہ تیز ہو گئی۔

لدھیانہ میں نوجوانوں کا ایک گروہ تھا۔ جس کے سرخیل ساحر لدھیانوی تھے۔ اس میں اکرم یوسفی، اعجاز اکرم مرحوم، احمد ریاض مرحوم، ظہیر نظر مرحوم کے علاوہ فیض الحسن چودھری، غلام مرتضیٰ اسحاق (ساقی) اور افسانہ نگار سید انور وغیرہ شامل تھے۔ یہ سبھی لوگ حمید اختر سے سینئر تھے مگر یہ ”بے وقوف“ ان کے گروپ میں شامل ہو گیا اور سیاسی ہنگامہ آرائی

میں سب سے آگے نکل گیا۔ یہ لوگ بہت اچھی اچھی باتیں کرتے۔ سیاسی اور سماجی کام بھی کرتے۔ لکھنے پڑھنے میں کم دلچسپی لیتے مگر ساتھ ہی اپنی ذاتی زندگی بنانے کی ضرورت سے غافل نہ ہوتے۔ ان میں سے کسی نے تعلیم ادھوری نہیں چھوڑی۔ سوائے ساحر کے مگر اس میں بھی دیگر عوامل کا دخل زیادہ تھا۔ جب حمید اختر لدھیانہ گورنمنٹ ہائی سکول سے فرسٹ ڈویژن میں میٹرک پاس کرنے کے بعد کالج میں داخل ہوئے تو ساحر نے بڑی جامع دلیلوں سے یہ واضح کر دیا کہ ہمیں انگریزی تعلیم حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم نے انگریزی کی نوکری کرنی ہی نہیں بلکہ اس ملک کو آزاد کرانا اور عام لوگوں کی حالت بہتر بنانی ہے۔ حمید اختر نے تعلیم ادھوری چھوڑ دی اور سیاسی تحریکوں اور ادبی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے۔ کبھی لاہور، کبھی لدھیانہ، کبھی شملہ اور کبھی انبالہ میں نظر آتے۔ بیچ بیچ میں مہنگائی اور گھر کی حالت دیکھ کر نوکریاں بھی کیں۔ سات ماہ میں چار پانچ سرکاری محکموں کو اپنا مقروض بنا کر گھر آتے رہے۔ کہیں سے زمانہء جنگ کے باوجود ہڑتال کرا کے فرار ہوئے۔ کہیں بیس دن کام کرنے کے بعد افسر سے جھگڑا ہوا اور اپنے واجبات چھوڑ کر گھر آ گئے۔ کہیں سے نکالے گئے۔

اسی زمانے میں ساحر اور حمید اختر بمبئی پہنچ گئے۔ بمبئی میں تقریباً دو سال گزارے۔ رہائش وال کیشور روڈ پر سید سجاد ظہیر کے گھر تھی۔ یہ گھر جس میں بنے بھائی (سجاد ظہیر) رضیہ سجاد ظہیر، ان کی دو چھوٹی بچیاں، نجمہ اور نسیم ظہیر رہتی تھیں۔ ایک مثالی گھر تھا۔ اسی گھر میں سال ڈیڑھ سال قیام کرنے کا نتیجہ حمید اختر عمر بھر بھگتتے رہے۔ اس لئے کہ یہاں انہوں نے انسانی محبت، اخوت، رواداری اور بے لوث خدمت کی جو مثالیں دیکھیں وہ ذہن پر مثبت ہو گئیں۔ بنے بھائی بڑے گھر کے بیٹے تھے مگر بمبئی میں ان کی زندگی درویشانہ بلکہ قلندرانہ تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ حمید اختر نے عمر بھر بنے بھائی اور فیض احمد فیض کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی، انسانی سماج اور معاشرے کی اصلاح کے لئے اپنی زندگی کو فراموش کئے رکھا۔ بمبئی کے قیام کا زمانہ ایک یادگار زمانہ تھا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی شاخ بمبئی کے جنرل سیکرٹری کی حیثیت میں انہوں نے نہ صرف بمبئی میں ادیبوں کو منظم کیا بلکہ احمد آباد، سورت، مالینگاؤں، حیدرآباد وغیرہ میں شاندار ادبی کانفرنسوں کے انعقاد کا اہتمام بھی کیا۔ 1947ء میں اپنے گاؤں چلے گئے۔ وہاں سے ہنگاموں کے درمیان دریائے ستلج پار کر کے نکودرکمپ میں پہنچ گئے جہاں بدترین حالات میں تین مہینے گزارنے کے بعد لاہور آ گئے۔

نکودرکمپ میں تین مہینوں کے قیام نے حمید اختر کو بہت حد تک سنبھلایا۔ یہ حیرت انگیز تجربہ تھا جس میں پندرہ سولہ لاکھ انسان، مرد، عورتیں، بوڑھے، بچے، بیمار، ضعیف حتیٰ کہ حاملہ عورتیں بھی کھلے آسمان کے نیچے پڑے تھے۔ یہ کوئی باقاعدہ کمپ نہیں تھا بلکہ انسانی ہجوم کھیتوں میں پڑا ہوا تھا۔ تین چارہ ماہ تک یہ لوگ کمپرسی کی حالت میں پاکستان جانے

کے منتظر بیٹھے رہے۔ حمید اختر کے لئے یہ دن بہت اذیت ناک تھے۔ پہروں کھلے آسمان کے نیچے بیکار بیٹھے بیٹھے یہی سوچ دامن گیر ہوتی کہ آزادی کی جس منزل کے لئے برسوں سے جدوجہد کر رہے تھے۔ کیا یہی ہے وہ منزل؟ انہوں نے یہیں اس کیمپ میں اسی آسمان کے نیچے یہ عہد کیا کہ زندہ پاکستان پہنچ گئے تو اپنی زندگی ملک اور عوام کے لئے وقف کر دیں گے۔ پاکستان میں چالیس برس سے زیادہ مدت اسی جدوجہد میں گزار دی۔ ابتدائی چند برس میں بھرپور سیاسی کام کیا۔ ادیبوں کی تنظیم، ٹریڈ یونین کی سرگرمیاں، اخبار نویسوں کی غرضیکہ ہر کام کا محور یہی جذبہ تھا۔ جب یار لوگ الاٹ منٹوں میں لگے ہوئے تھے یہ حضرت سیاسی کام کرتے رہے۔ جیل جاتے رہے۔ اس ملک سے بھوک، بیماری اور احتیاج کو ختم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی، جیسے تیسے آخروں تک اس عہد کو نبھایا۔

عمر بھر کام کیا، محنت کی، روز کنواں کھود کر پانی نکالتے رہے۔ کبھی بینک میں پیسہ رکھنے کی نوبت نہ آئی، کوئی جائیداد نہ بنائی۔ جو کچھ کمایا اس سے زیادہ خرچ کیا۔ مال دولت جمع کرنے کے بارے میں کبھی سوچا ہی نہیں۔ ساری عمر بنجاروں کی طرح زندگی گزار دی۔ لمحہ لمحہ کر کے زندگی کے دن پورے کئے مگر شان کے ساتھ، جب بچے ہوئے تو فیصلہ کیا انہیں زندگی کی تمام آسائشیں میسر ہونی چاہئیں۔ ان کی تعلیم اور تربیت کے لئے ہر ممکن کوشش کرنا ضروری ہے۔ اچھے ماحول، اچھی تعلیم اور زندگی کی آسائشوں پر سب کا حق ہے۔ یہ فیصلے خود ہی کئے اور پھر عمر بھر ان پر عمل کیا۔ بچوں کی اتنی ناز برداری کی کہ اصولاً انہیں بگڑ جانا چاہئے تھا مگر موصوف کی خوش قسمتی تھی کہ ان کی تمام کوششوں کے باوجود اولاد بگڑی نہیں بلکہ بچے بڑے ذمے دار اور انتہائی حقیقت پسند رہے۔

جوانی میں بچپن اور بڑھاپے میں جوانی کو یاد کرتے رہے۔ اس لئے کہ مقررہ اوقات میں کوئی کام نہیں کیا۔ بچپن میں جب کھیلنے، کھانے کے دن تھے۔ مدرسے میں وقت گزر گیا۔ بعد میں گاؤں کے درخت، دریا اور مناظر یاد کرتے تھے۔ پرندوں کی اڑان اور مناظر فطرت کے بارے میں پہروں سوچتے اور افسوس کرتے کہ انہوں نے دوسرے بچوں کی طرح اپنی عمر کے اس دور کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ ادھیڑ عمر کو پہنچے تو ناکام معاشقوں کے ضمن میں اپنی حماقتوں پر کف افسوس ملتے رہے۔ ان حسیناؤں کو یاد کرتے جنہیں مایوس کیا۔ یہ عجیب بات ہے کہ عنفوان شباب میں ان پر عشق کا بھوت اس وقت تک سوار رہتا جب تک فریق ثانی متوجہ نہ ہوتا۔ آہیں بھرتے، روتے بلکتے، کھانے پینے کا ہوش نہ رہتا مگر جونہی اس طرف سے باریابی کی نوید ملتی یہ دور ہٹتے چلے جاتے۔ چالیس برس کی عمر کو پہنچے تو ذرا عقل آئی، لیکن اس وقت تک یہ خود ”کھڑک“ چکے تھے اور وہ تمام حسینان خوش خصال جو رومالوں پر ”آئی لو یو“ وغیرہ کاڑھ کر پیش کیا کرتی تھیں اپنے گھر بار کی ہو چکی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ بڑھاپے میں جوانی کے گم گشتہ اور گریز پا ایام کو یاد کرتے رہے۔

پیسہ حمید اختر کو کاٹتا تھا۔ اس سے نفرت اسے ضائع کر کے کرتے رہے، عمر بھر ان کے پاس پھوٹی کوڑی تک جمع نہ ہو سکی۔

کسی بیند میں پیسہ جمع کرانے کی نوبت نہ آئی لیکن خرچ اس ٹھاٹھ سے کرتے کہ دوست دشمن ان کی آمدنی کے خفیہ ذرائع تلاش کرتے رہے۔ ادھر ان کی زندگی کا کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرا جب کسی نہ کسی کے مقروض نہ رہے ہوں۔ کوئی دن ایسا نہ تھا جب پیسے کا پانی مہیا کرنے کے لئے کنواں نہ کھودنا پڑا ہو مگر دیکھنے والے انہیں امیر کبیر سمجھتے رہے۔ آخری عمر میں یہ ٹھاٹھ باٹھ قائم رکھنے کے لئے مشقت کے قابل نہ رہے تھے مگر خود کردہ راعلابے نیست، اس لئے یہ بھاگ دوڑ، محنت مشقت زندگی کی آخری سانس تک جاری رہی۔ حمید اختر کی ایک کمزوری کا بہت کم لوگوں کو علم ہے۔ وہ یہ تھی کہ ہمیشہ اس فکر میں رہے کہ لوگ، عزیز اقرباء، ملنے جلنے اور جان پہچان والے سبھی انہیں اچھا آدمی سمجھیں یا کم از کم ان کے روزمرہ کے معمولات اور میل جول میں گھٹیا پن کا اظہار نہ ہو۔ عمر بھر اسی پر خوش ہوتے رہے کہ ملنے جلنے والے سبھی لوگ ان کی تعریف کرتے رہیں۔ اس کوشش میں بہت سے سنہری مواقع ضائع کر دیئے۔ اکثر نقصان بھی اٹھایا۔

قیام پاکستان کے بعد انجمن ترقی پسند مصنفین کی لاہور شاخ کو منظم کیا۔ 1951-52ء میں سال بھر قید تنہائی میں رکھے گئے۔ نظر بندی کے دوران میں گھریلو حالات بگڑ گئے۔ اس لئے رہائی کے بعد روزنامہ ”امروز“ میں ملازم ہو گئے۔ یہاں روزانہ ادارتی نوٹ لکھتے لکھتے زبان غیر ادبی ہو گئی اور جب کہانی لکھتے وقت صوابدید اور مطلوبہ جیسی ترکیبیں تحریر میں نظر آنے لگیں تو ادب کے میدان کو خیر باد کہہ کر صرف صحافتی سرگرمیوں پر توجہ دینے کا فیصلہ کیا پھر بھی ان کے اخبار نویس دوست ان کو ادیب اور ادیب لوگ اخبار نویس قرار دیتے رہے۔ چنانچہ 25 برس کی ملازمت کے بعد جبری طور پر ریٹائر کئے گئے تو محسوس ہوا نہ ادھر کے رہے ہیں نہ ادھر کے، سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اب کیا کریں۔ کچھ غور فکر کرنے کے بعد فیصلہ کیا کہ اخبار نویسی ترک کر کے اپنا اصل میدان اپنایا جائے لیکن جب ادب کی طرف آئے تو معلوم ہوا کہ اس برادری کے بہت سے گروپ قلعے بنا کر اونچی دیواریں کھینچ کر بیٹھے ہیں۔ کسی کو اندر آنے کی اجازت نہیں ہے۔ اس لئے آخر عمر میں تقریباً گوشہ نشین ہو گئے۔ دل میں یہ اطمینان ضرور تھا کہ زندگی بھر کسی کو نقصان نہیں پہنچایا۔ ضمیر کے خلاف کوئی کام نہیں کیا۔

حمید اختر کہتے تھے لوگ یہ بات نہیں سمجھتے کہ انسان کی خوشی اور خاندان کی مسرت کا راز روپے پیسے کی فراوانی نہیں ہے۔ اچھے دوست اور اہل خاندان کی سوچ اور فکر کی یکسانیت ہی انسان کو مطمئن اور آسودہ کر سکتی ہے اور یہ کہ وہ خود اس دولت سے عمر بھر مالا مال رہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان کے نزدیک دوست اس بات پر خوش ہونے کے سلسلے میں انہیں مطعون کرتے رہے۔ ان کا کہنا تھا کہ چونکہ ان کے پاس اور کچھ نہیں ہے اس لئے محض اپنی بے وقوفیوں پر پردہ ڈالنے کے لئے عذر تراش رہے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔



خوش آمدید

حمید اختر (پرسش احوال) روزنامہ ”ایکسپریس“، 03 جنوری 2011ء

اپنی بیماری اور کالم نویسی سے عارضی غیر حاضری کی وجہ سے ہم انتظار حسین کو ”ایکسپریس“ کے لکھنے والوں کے کلب میں شمولیت پر بروقت خوش آمدید نہیں کہہ سکے جس کا ہمیں افسوس ہے۔ اگرچہ اپنے اخبار کے لکھنے والوں کے انتخاب میں ہمارا کوئی عمل دخل کبھی نہیں رہا، تاہم انتظار حسین کے اپنے اخبار سے منسلک ہونے پر ہم بے حد خوش ہیں۔ وہ اردو ادب و صحافت کا بڑا نام ہیں اور جس اخبار سے بھی وابستہ ہوں اس کے لئے یقیناً فخر کی بات ہے۔ بد قسمتی سے اردو ادب و صحافت کا بڑا نام ہونے کے باوجود وہ ایک عرصے سے انگریزی اخبار میں کالم نویسی کر رہے ہیں۔ روزنامہ ”ایکسپریس“ سے ان کا تعلق گویا ان کی گھر واپسی کے مترادف ہے۔

انتظار حسین سے ہماری دوستی اور لڑائی کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی خود اس ملک کی تاریخ۔ دوستی ذاتی سطح پر رہی تو جنگ نظریاتی میدان میں۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد ہم انجمن ترقی پسند مصنفین شاخ لاہور کے سیکرٹری کی حیثیت سے فوراً ہی ادب کے ترقی پسند محاذ پر سرگرم عمل ہو گئے۔ انتظار حسین اپنے استاد حسن عسکری صاحب کی قیادت میں روز اول ہی سے مقابلہ پر تھے، کبھی پاکستانی ادب کے نعرے کے زور پر کبھی اسلامی ادب کی ضرورت پر۔ یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے، اگرچہ اب حالات یکسر بدل چکے ہیں، انتظار حسین اس کی تعبیر یوں کرتے ہیں کہ ان کے خیال میں ترقی پسند ادیب اب مقابلے پر رہے ہی نہیں۔ ان کا یہ دعویٰ ہے جس کا اظہار انہوں نے کراچی کی حالیہ اردو کانفرنس میں بھی کیا کہ جناب احمد ندیم قاسمی کی رحلت کے بعد ادبی محفلوں کی صدارت، دیباچہ نگاری اور فلیپ نویسی کا زیادہ بوجھ ان پر آن پڑا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ حمید اختر یعنی ہم اس کام میں ان کا ہاتھ بٹائیں گے مگر وہ کہتے ہیں چونکہ ان دنوں زیادہ ادبی اجتماعات رجعت پسندوں کے ہوتے ہیں اس لئے اس کام کا زیادہ بوجھ انہی پر ہے۔ حالانکہ ہمارا موقف اس کے بالکل الٹ ہے۔ ادب میں رجعت پرستی کی بات کرنے والا اب کوئی کم ہی نظر آتا ہے۔ ویسے بھی رجعت پرستی نہیں بلکہ ترقی

پسندوں کا مقابلہ ادب برائے ادب والوں سے تھا جس کے نقیب حلقہ ارباب ذوق والے تھے مگر انہوں نے قیام پاکستان کے فوراً ہی بعد کشمیر کے جہاد پر نظمیں لکھ کر اپنے اس موقف سے پسپائی اختیار کر لی اور اب تو ان کے ہفتہ وار جلسوں اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسوں میں فرق کم ہی نظر آتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ پسپائی کس نے اختیار کی۔

ہمارے خیال میں انتظار حسین نے رجعت پرستی کا لبادہ مزہ لینے اور ہمارے جیسے لوگوں کو چڑانے کے لئے اوڑھ رکھا ہے ورنہ ہماری رائے میں تو وہ خود ترقی پسند لکھنے والے ہیں۔ اس کا اظہار ہم اپنے ایک گزشتہ کالم میں بھی کر چکے ہیں اور اردو کانفرنس کراچی میں اس کا اعلان بھی ہم نے کانفرنس کی سیلج پر کھڑے ہو کر خود کیا تھا۔ اس دعوے کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے خیال میں کسی لکھنے والے کی اولیں صفت اس کی ادبی دیانت ہے اور انتظار حسین کی ادبی دیانت داری میں کسی کو شبہ نہیں ہونا چاہئے۔ ویسے بھی بقول شاعر ظفر اقبال کے کوئی سچا ادیب رجعت پسند نہیں ہوتا۔ انسان دوستی کا مادہ، جوہر شاعر اور ادیب میں ہوتا ہے، انتظار حسین کی تحریروں میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ یوں بھی اس عزیز کی پوری ادبی زندگی ہمارے سامنے ہے۔ اپنی اور انتظار حسین کی عمر میں نقادت کا تو ہمیں پتہ نہیں مگر ادب کے میدان میں ہم اس سے کچھ سینئر ہیں، یہ بات دوسری ہے کہ بعد میں آنے کے باوجود انتظار حسین نے جم کر ادب کی تخلیق کا کام کیا جب کہ ہم نے یہ میدان چھوڑ کر وہ کام شروع کر دیا جو ان دنوں الطاف بھائی کر رہے ہیں یعنی انقلاب لانے نکل کھڑے ہوئے۔ اُطاف بھائی چاہیں تو ہم سے عبرت پکڑ سکتے ہیں کہ جب انتظار حسین کہانیاں اور ناول لکھ رہا تھا ہمارا نام ملک بھر کے تھانوں میں بستہ ب کے بد معاشوں کی تصویروں کے ساتھ نمایاں نظر آ رہا تھا۔ خیر ہمیں اس پر بھی کوئی پچھتاوا نہیں اور انتظار حسین کے ادب کے میدان میں کامیابی کے جھنڈے گاڑنے پر ہم ذاتی طور پر بھی فخر محسوس کرتے ہیں۔ اس عزیز کی ادبی زندگی کی ابتداء محاوروں کے استعمال کی فراوانی سے ہوئی۔ ابتدائی تحریروں کے اس کے ایک ایک فقرے میں کئی کئی محاورے نظر آتے ہیں۔ 1950ء میں جب انتظار ”امروز“ کا فلمی صفحہ مرتب کرتے تھے شاہ نور سٹوڈیو کے فلموں کے نیگیٹوز کے سنور میں آگ لگ گئی جس میں کئی فلموں کے نیگیٹو جل کر راکھ ہو گئے۔ انتظار حسین نے اس واقعہ کی خبر کا آغاز اس طرح کیا۔ ”اس ہفتے دیکھتے دکھاتے یوں ہوا کہ شاہ نور سٹوڈیو میں فلموں کے نیگیٹو چشم زدن میں جل کر راکھ ہو گئے۔“ جس روز یہ خبر چھپی ہم اپنے دوست فیض الحسن کے گھر پہنچے تو اسے سخت غصے کی حالت میں پایا، اس کا کہنا تھا کہ لوگوں کی عمر بھر کی کمائی راکھ ہو گئی اور انتظار حسین محاوروں سے خبر کی عبارت آراستہ کرنے میں لگا ہے۔ ہم نے ”امروز“ آ کر انتظار حسین کو فیض الحسن کے خلاف اشتعال دلانے اور ان دونوں دوستوں کے درمیان لڑائی کا مزہ لینے کی بہت کوشش کی مگر انتظار حسین نے اطمینان سے ہم سے کہا ”فیض الحسن مجھے ماریں گے تو میں ان کو ماروں گا اور لوگ کہیں گے ان دونوں میں جوتیوں میں دال بٹ

رہی ہے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب افسانہ نگار اے حمید روزنامہ ”آفاق“ میں ہلکے پھلکے طنزیہ اور مزاحیہ مضامین لکھا کرتا تھا۔ اس زمانے میں اس نے ادیبوں اور شاعروں کے لئے کتبے تحریر کئے تو انتظار حسین کے لئے یہ کتبہ تجویز کیا تھا ”آج وہ محاوروں کی تلاش میں بہت دور نکل گیا ہے“ ناصر کاظمی کا تکیہ کلام تھا ”مارے گئے“ چنانچہ اس کے لئے اے حمید نے مارے گئے کا کتبہ تجویز کیا۔ اخبار کے ایڈیٹر کے لئے کتبہ ”سٹاپ پریس“ تھا اور شاعر کا کتبہ تھا ”مقطع عرض ہے“۔ بہر حال یہ گزرے ہوئے زمانے کی باتیں ہیں، اصل بات یہ ہے کہ محاوروں کی تلاش میں اپنی ابتدائی ادبی زندگی میں سرگرداں انتظار حسین نے اپنی محنت اور دیانت داری سے ادب اور صحافت میں انتہائی امتیازی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ ہمیں یہ خوشی بھی ہے کہ جہاں بے شمار نابغہ روزگار کالم نویس ملک و قوم کی رہنمائی کرنے اور حکمرانوں کو مشورے قبول نہ کرنے پر ان کی سرزنش کرنے میں لگے رہتے ہیں وہاں انتظار حسین بھی ہماری طرح عام لوگوں، ادب کے طالب علموں اور علم و ادب کے شائقین کے لئے کالم نویسی کرتا ہے۔ ہم بھی روز اول سے کم پڑھے لکھے قارئین، دکانداروں اور گھریلو خواتین کے روزمرہ مسائل کے بارے میں ہی لکھتے ہیں، ہماری صحت ایسی ہے کہ ممکن ہے ہم یہ خدمت زیادہ دیر تک جاری نہ رکھ سکیں، ایسا ہوا تو انتظار حسین ہماری کمی بخوبی پوری کر سکے گا۔ اس لئے ہم اسے ایک بار پھر خوش آمدید کہہ رہے ہیں۔



شاعرہ، ادیبہ، سفرنامہ نگار، تسنیم کوثر کے سفرنامہ ”کہانی ان دنوں کی“ پر حمید اختر کا فلیپ

حمید اختر، لاہور 20 ستمبر 2006ء

تسنیم کوثر اردو زبان کی جانی پہچانی شاعرہ ہیں لیکن اس وقت ان کے اشعار نہیں بلکہ ان کی خوبصورت نثر نگاری کا ایک نمونہ ”کہانی ان دنوں کی“ کے عنوان سے میرے سامنے ہے، اگر وہ شعر گوئی کے ساتھ ساتھ اس سے قبل نثر نویسی کرتی بھی رہی ہیں تو ان کی نثری تخلیقات میری نظر سے نہیں گزریں۔ اس لئے مجھے ان کے بھارتی پنجاب کے تین چار شہروں کے سفروں کی یہ روداد پڑھ کر حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی کیونکہ اس داستان کے بیان میں وہ ایک بہت منجھی ہوئی قلم کارہ کے طور پر سامنے آئی ہیں۔

”کہانی ان دنوں کی“ سفرنامہ بھی ہے اور رپورتاژ بھی، یا یوں کہیے کہ یہ ان دنوں اصناف ادب کا خوبصورت گلدستہ ہے۔ سفرنامہ اور رپورتاژ کی خصوصیات سے مزین ہونے کے علاوہ اس کو لکھنے والی کے دلی جذبات اور محسوسات کی عکاسی بھی قرار دیا جاسکتا ہے اور اس تحریر کی سب سے بڑی خوبی یقیناً یہی ہے۔ وہ جو کسی نے کہا ہے کہ دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھی ہے

تسنیم کوثر کی اس تحریر پر پوری طرح صادق آتی ہے۔ بظاہر تو یہ داستان مشرقی پنجاب کے چند شہروں میں منعقد ہونے والے مشاعروں کے ایک سلسلے میں شعراء کے ایک چھوٹے سے وفد کے ہمراہ مصنفہ کی شمولیت کی روداد پر مشتمل ہے۔ انبالہ، لدھیانہ، شملہ اور چنڈی گڑھ کے مشاعروں میں شرکت کرنے کے علاوہ شاعروں اور شاعرات کے اس چھوٹے سے وفد نے دو تین روز دہلی میں بھی گزارے، یوں یہ پورا سفر تقریباً دس روز پر محیط ہے، مگر ان دس دنوں میں مصنفہ کو جس جذباتی ہیجان میں سے گزرنا پڑا اس نے ان چند دنوں کو اس لئے یادگار بنا دیا جس کی جھلک اس کے عنوان ”کہانی ان دنوں کی“ میں واضح طور سے نظر آتی ہے۔ پاکستان سے مشاعروں میں شرکت کے لئے بھارت جانے والے

شعراء ایسا سفر اکثر کرتے رہتے ہیں اور بظاہر یہ روزمرہ کے معمول کی حیثیت رکھتا ہے۔ تسنیم کوثر نے اپنے قلم سے اس سفر کو واقعی یادگار بنا دیا ہے۔ جن شہروں یعنی انبالہ، لدھیانہ، شملہ، چنڈی گڑھ اور دہلی میں وہ اس سفر کے دوران گئی ہیں ان کی سرسری تاریخ رقم کرنا بھی وہ نہیں بھولیں، حتیٰ کہ پانی پت اور امرتسر کا جہاں ان کا قیام مختصر تھا تفصیلی ذکر بھی اس تحریر میں موجود ہے، جن بزرگوں کے مزارات کی زیارت کا مصنفہ کو موقع ملا ان کی زندگی اور نیک اعمال کے ذکر میں بھی انہوں نے بڑی خوبصورتی سے عقیدت کے پھول پھول پھول پھول اور پڑھنے والوں کو ان بزرگوں کی زندگی کے حالات اور گزرے ہوئے روز و شب سے آگاہ کرنا ضروری سمجھا۔ سرہند شریف کے مجدد الف ثانی ہوں، نظام الدین اولیاء کا ذکر ہو، بوعلی قلندر کے مجاہدوں اور ریاضتوں کا بیان ہو یا ہمارے جد امجد خواجہ قطب الدین بخیار کاکی کے مزار پر حاضری کی داستان ہو مصنفہ نے ان بزرگوں کی زندگی کی جھلکیاں بڑی خوبصورتی اور اپنے قلم کی پوری شدت سے دکھائی ہیں۔ واپسی کے سفر میں امرتسر کے گولڈن ٹیمپل کا ذکر بھی اس نے اسی عقیدت اور احترام سے کیا ہے جس کے نمونے مسلمان صوفیاء اور بزرگان دین کے ذکر میں دیکھے جاسکتے ہیں، احترام آدمیت کی جو مثالیں ان بزرگوں نے قائم کی ہیں اور انسان دوستی کے جو رویے انہوں نے پروان چڑھائے ہیں ان پر عمل کر کے ہی موجودہ زمانے کی نفرتوں اور فتنوں پر قابو پایا جاسکتا ہے جس کی خواہش اور ضرورت کا احساس مصنفہ کی اس تحریر میں جگہ جگہ نظر آتا ہے۔

میرے لئے یہ سفر نامہ یار پور تاثر کچھ زیادہ دلچسپی کا باعث اس لئے بھی ہے کہ لدھیانہ، انبالہ، پانی پت، دہلی اور شملہ وہ شہر ہیں جہاں میں نے نوجوانی کا زمانہ گزارا ان کے راستوں کے چپے سے میری شناسائی ہے 1942-43ء میں ابن انشاء انبالے میں مقیم تھا، میں سال بھر تک ہر اتوار کو لدھیانہ سے انبالے اس کے پاس جاتا۔ دونوں شہروں کا درمیانی فاصلہ ساٹھ میل ہے جو مجھے اب تک یاد ہے، تیز رفتار ریل گاڑیاں راستے میں کہیں نہیں رکتی تھیں اور لدھیانہ سے چل کر انبالے میں ٹھہرتی تھیں۔ کالکا سے شملہ جانے والی جس چھوٹے ہل سٹیشن سباتھو میں میں نے امریکی فوجیوں کے ریست کیمپ میں بطور سپروائزر چھ ماہ گزارے تھے، شملہ میں میں مہینہ بھر مہاراجہ ناٹھ کے محل میں مقیم رہا۔ دہلی میں بھی کوئی چار ماہ جوانی کے شب و روز گزارے۔ اس لئے تسنیم کوثر کے سفر کی اس روئداد کا مطالعہ کرتے ہوئے مجھے اکثر محسوس ہوا جیسے میں ایک دفعہ پھر ان جانے پہچانے مقامات پر پہنچ گیا ہوں۔ ”کہانی ان دنوں کی“ کے بیان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ لکھنے والی اپنے انسان دوستی پر مبنی نیک جذبات اور محسوسات کو کاغذ پر منتقل کرنے کے سلسلے میں پوری طرح کامیاب ہے لیکن جذبات اور محسوسات کی اس رو میں وہ تاریخی اور جغرافیائی حقائق سامنے لانا بھی نہیں بھولی اس تحریر میں اس نے حیرت انگیز قوت مشاہدہ کا مظاہرہ کیا ہے۔ ہم دو برس میں تین بار چنڈی گڑھ جا چکے ہیں مگر تسنیم کوثر نے ایک دن کے قیام

میں اس شہر میں اتنا کچھ دریافت کیا اور اس کے بارے میں لکھا بھی جس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اگر میں یہ کہوں کہ تسنیم کوثر کی یہ کتاب آئندہ ان تین چار شہروں میں جانے والوں کے لئے مستند گائیڈ ثابت ہو سکتی ہے تو یہ کچھ غلط نہ ہوگا۔

مصنفہ نے جن شہروں میں مشاعرے پڑھے وہاں کے مقامی شعراء اور ادیبوں سے ملنے کا بھی اسے موقع ملا۔ ان میں بھارتی پنجاب کے بہت سے معروف ادیب اور شاعر شامل ہیں جن کا تفصیلی تعارف پڑھنے والوں کے لئے دلچسپی کا باعث ہوگا۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ مصنفہ خود ایک نیک دل، امن پسند اور انسانی رشتوں کی توقیر کی حامل گھریلو خاتون ہیں اور اپنے اس سفر میں اس نے ایسے ہی لوگوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان کی خوبیاں بیان کرنے پر سب سے زیادہ توجہ دی ہے۔ اس تحریر کے مطالعے کے بعد ایک دفعہ پھر یہ حقیقت واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ سرحد کے دونوں طرف بسنے والے عام لوگ ایک دوسرے سے ملنے اور دوستانہ روابط بڑھانے کے خواہش مند ہیں جن کے راستے میں نصف صدی سے مٹھی بھر مگر باوسائل مفاد پرست لوگوں کا ایک ٹولہ حائل رہا ہے۔ مصنفہ نے دو برس قبل جب یہ سفر کیا اس وقت دونوں ملکوں کی حکومتوں میں عوامی دباؤ کی وجہ سے تعلقات بہتر بنانے کی کوششوں کو آغاز ہو چکا تھا، بعد میں نفرت کے سوداگروں نے جو سرحد کے دونوں طرف موجود ہیں اس عمل میں رخنہ اندازی کی اور یہ تعطل کا شکار ہو گیا، اب جبکہ دوستی، محبت اور انسانی رشتوں کی توقیر کے بیان پر مشتمل یہ کتاب چھپنے کے لئے پریس جا رہی ہے ایک دفعہ پھر دونوں حکومتوں کے درمیان مذاکرات کے آغاز کی نوید مل چکی ہے۔ خدا کرے اب اس عمل میں کوئی رکاوٹ نہ آئے۔ کم از کم دونوں طرف آنے جانے والوں کو سہولتیں دینے اور سفر میں آسانیاں پیدا کرنے کی فوری ضرورت پورا کرنے میں دو دونوں حکومتوں کو تامل سے ہرگز کام نہیں لینا چاہیے۔



عزیزی وقار احمد!

اپریل 24 نومبر 2006ء

آپ کا خط مجھے آج ہی ملا ہے۔ آپ کے والد حاجی عبدالصمد صاحب کے انتقال کے بارے میں پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور آپ کو اور دیگر اہل خانہ کو صبر کرنے کی توفیق سے نوازے، مرحوم یقیناً نیک آدمی تھے اور دل درد مند رکھتے تھے، بہر حال اس دنیائے فانی میں جو ذی روح ابھی آتا ہے اسے ایک نہ ایک دن اس دنیا کے رنگ و بو کو خیر باد بھی کہنا پڑتا ہے۔ پسماندگان کے لئے صبر کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے، ہمارا مذہب بھی یہی تلقین کرتا ہے۔

میرے کالم کی پسندیدگی کے لئے آپ کا اور اہل خانہ کا شکریہ، میں اپنے پڑھنے والوں کی بہت قدر کرتا ہوں اور ان کو بہت عزیز رکھتا ہوں، میری ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ اپنے پڑھنے والوں سے میرا قریبی اور ذاتی قسم کا تعلق قائم رہے۔ میرے لئے یہ خوشی کی بات ہے کہ میرے سبھی چاہنے والے مجھے اپنا ہمدرد تصور کرتے ہیں۔ کسی بھی لکھنے والے کے لئے یہی سب سے بڑا اعزاز ہوتا ہے۔

امید ہے آپ سب لوگ خیریت سے ہوں گے۔

والسلام

مخلص

حمید اختر

حمید اختر کی پہلی قید

مئی 1951ء میں حمید اختر کو پہلی بار ان کی بہن کے گھر سے گرفتار کیا گیا اپنی اس گرفتاری اور ایک سال کے عرصہ پر محیط قید سے متعلق انہوں نے کیا کہا آئیے پڑھتے ہیں۔
یہ اقتباسات ان کی کتاب ”کال کوٹھڑی“ سے لئے گئے ہیں۔

ایک رات

9 مئی 1951ء کی رات کو میں نے اپنے مکان کی تیسری چھت پر ٹیبل لیپ فٹ کر کے اطمینان کھ سانس لی۔ پچھلے چند روز سے نیچے کے کمرے میں بیٹھ کر پڑھتا تھا اور پھر سونے کے لیے چھت پر جاتے جاتے نیند غائب ہو جاتی تھی۔ میں ہمیشہ سے رات کو پڑھتے پڑھتے سونے کا عادی ہوں۔ ٹیبل لیپ کو میں نے ساڑھے نو بجے کے قریب فٹ کیا اور اپنے بستر پر لیٹ کر پڑھنے کی تیاری کر رہا تھا کہ میری بیمار بہن نے حسب معمول مجھے دیر سے آنے پر ڈانٹا۔ ہمیشہ کی طرح اس نے کہا کہ مجھے اس کا کوئی خیال نہیں ہے۔ وہ چاہے جسے یا مرے مجھے اس سے کیا۔ لیکن یہ باتیں کہتے وقت اسے یقین تھا کہ وہ صحیح نہیں کہہ رہی ہے، میرا ضمیر بہر حال ملامت کر رہا تھا کہ میں اپنی مصروفیتوں کی وجہ سے اس کی بیماری اور علاج کے بارے میں کچھ بھی توجہ نہیں دے سکا۔

اصل میں پچھلے پندرہ سال سے بیمار رہنے کی وجہ سے میں نے اس کی بیماری کو روزانہ کی چیز سمجھ لیا تھا۔ وہ خود بھی اس بیماری کی اس حد تک عادی ہو چکی تھی کہ جب تک تکلیف ناقابل برداشت نہ ہو جائے وہ نام نہ لیتی۔ اسے بھی یہ معلوم ہو گیا تھا کہ اس ملک میں ہمارے جیسے متوسط طبقہ کے گھرانے میں علاج اسی وقت ہو سکتا ہے جب مریض اٹھنے بیٹھنے تک سے معذور ہو جائے ورنہ عام حالات میں گھر کی ضروریات اچھا اور باقاعدہ علاج کرانے میں رکاوٹ ثابت ہوتی ہیں۔

میں چھت پر لیٹ کر پڑھنے کے نئے انتظام کے شوق میں ڈیڑھ بجے تک پڑھتا رہا۔ ڈیڑھ بجے کے بعد میں نے کتاب بند کر کے رکھ دی اور ٹیبل لیپ بچھا کر سونے کے لیے کروٹ بدلی مگر نیند آج بھی غائب تھی۔ آسمان کی طرف

نظر اٹھائی تو نیچے آسمان میں ستاروں کی شمعیں روشن تھیں اور رات چپ چاپ سناٹے کے عالم میں ستاروں کی ننھی قندیلوں کی روشنی میں گزری جا رہی تھی۔

یکا یک میری بہن نے چھاتی کے درد کی شدت سے مجبور ہو کر ٹھنڈی سانس بھری اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ میں نے اس طرح ظاہر کیا جیسے گہری نیند سو رہا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں ہمیشہ سے مرض کا سامنا کرنے سے ہچکچاتا ہوں۔ اپنے عزیزوں اور دوستوں کے سلسلے میں یہ کمزوری بالخصوص مجھ میں بہت زیادہ پیدا ہو جاتی ہے۔

چارپائی پر لیٹا ہوا مریض خاص طور پر ایسا مریض جس کے لیے میرے دل میں محبت کا طوفان ہو مجھے اپنی بے بسی اور کم مائیگی پر سوچنے کے لیے مجبور کر دیتا ہے اور میں وہاں سے بھاگ کھڑا ہوتا ہوں۔ چنانچہ اسی لیے میں نے آنکھیں بند کر لیں اور بالکل انجان بن گیا۔

نیند پھر بھی نہیں آئی۔ پچھلی شام ندیم قاسمی، ایوب کرمانی اور میں لارنس میں سیر کرنے کے لیے گئے تھے۔ بہت دیر تک لارنس میں گھوم کر ہم نے پھولوں کے تختوں اور گھاس کی کیاریوں کی تعریف کی تھی۔ لارنس مسی کے اوائل میں پھولوں سے بھر رہا تھا۔ ان پھولوں میں گھومتے ہوئے ہم نے ادب، آرٹ، فن، حسن اور زندگی، شعر و نغمہ اور موسیقی اور پاکستان میں ادب و فن کے مستقبل پر گفتگو کی۔ ندیم پریشان تھے۔ وہ کہہ رہے تھے پاکستان میں ادبی جمود طاری ہے، لکھنے والے خاموش ہو گئے ہیں گویا ان کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں رہا۔ زندگی کے حسن اور بد صورتی کے بارے میں ابھی بہت کچھ کہا جانا چاہیے۔ لیکن یہ غضب ہے کہ آج چاروں طرف خاموشی اور سناٹا ہے۔ ہم بہت دیر تک یہ باتیں کرتے رہے اور اس وقت اپنی چارپائی پر لیٹے ہوئے مجھے ندیم کا اداس اور فکر مند چہرہ سامنے نظر آ رہا تھا اور پچھلی شام کا موضوع مجھے پریشان کر رہا تھا۔

سونے سے پہلے میں نے دو فیصلے کیے۔ اول یہ کہ اگلے روز سے کم از کم 4 گھنٹہ روزانہ پڑھنے اور تین گھنٹے روزانہ لکھنے میں صرف کروں گا۔ یہ فیصلہ کر کے مجھے ایک گونہ اطمینان ہوا اور ذہن میں کئی کہانیاں ابھرنے لگیں جن کے لکھنے کے لیے میں ایک سال سے کوشش کر رہا تھا مگر اپنی مجبوریوں اور غیر ادبی مصروفیتوں کی وجہ سے کامیاب نہ ہوا تھا۔

اب میں نے جب یہ سوچا کہ پچھے ایک سال میں میں نے صرف دو کہانیاں لکھی ہیں تو مجھے بڑی شرم محسوس ہوئی اور میں نے اپنے دل میں فیصلہ کیا کہ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ دوسرا فیصلہ میں نے یہ کیا کہ اگلے روز سے میں گھر کے کام اور بہن کے علاج میں دلچسپی لوں گا۔

جب سے میرے بڑے بھائی لاہور سے تبدیل ہو کر گئے تھے بہن بہت پریشان رہتی تھی۔ میں نے گھر کے

کاموں میں کبھی دلچسپی نہیں لی تھی۔ اپنی یہ عادت بھی مجھے بہت شرمناک معلوم ہوئی اور میں نے عہد کیا کہ آئندہ ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ یہ سب سوچتے سوچتے میں جانے کب سو گیا۔

بلاوا

کھٹ! کھٹ!!

کھٹ! کھٹ!! کھٹ!!!

صبح ساڑھے چار بجے دروازہ تھپتھپانے کی آواز مجھے سنائی دی لیکن مجھ پر نیند کا اس قدر غلبہ تھا کہ میں کروٹ بدل کر پھر سو گیا مگر ایک ہی منٹ بعد میری بہن نے شانہ جھنجھوڑ کر مجھے جگا دیا۔ اس نے مجھے اٹھاتے ہوئے لرزتی ہوئی آواز میں کہا ”نیچے پولیس والے دروازہ کھٹ کھٹا رہے ہیں اور تمہیں پوچھ رہے ہیں، ذرا اٹھ کر دیکھو..... جب میں نیچے اترنے لگا تو اس نے کہا ”کیا آج پھر تلاشی ہوگی؟“ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔

نیچے اتر کر میں نے دروازہ کھولا تو ایک سی آئی ڈی انسپکٹر، ایک تھانے دار، ایک سی آئی ڈی کانسٹیبل اور سات سپاہی موجود تھے۔ میں نے ان سب کو نیچے کے کمرے میں بٹھا کر کہا ”فرمائیے!“

سی آئی ڈی انسپکٹر نے ایک ٹائپ شدہ فل سکیپ کاغذ میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا ”یہ آپ کا وارنٹ گرفتاری ہے۔ ہم آپ کو دس منٹ کپڑے تبدیل کرنے کے لیے دیتے ہیں، آپ کپڑے تبدیل کر لیجئے، وارنٹ پر دستخط بھی کر دیجئے اور پھر ہمارے ساتھ چلئے!“

میں نے ایک نظر اس کاغذ پر ڈالی۔ میرے اعصاب ایک لمحہ کے لیے تنے اور پھر اصلی حالت پر آ گئے۔ سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ میں یہ منحوس خبر اپنی بہن کو کس طرح سناؤں گا جو میری گرفتاری کے بعد اس اجنبی شہر میں بالکل تنہا رہ جائے گی۔

اس پریشانی میں میں نے وارنٹ بھی پورا نہیں پڑھا، صرف اس قدر پڑھا ”گورنر پنجاب کو اطمینان ہے کہ حمید اختر کی حرکات اس قسم کی ہیں کہ وہ کچھ گڑبڑ کرنے والا ہے اس لیے سیفٹی ایکٹ کی دفعہ 3 کے تحت اسے 6 ماہ کے لیے احتیاطی نظر بندی میں رکھا جاتا ہے۔“

وارنٹ پر دستخط کر کے کپڑے تبدیل کرنے کے لیے سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے میں یہ سوچ کر ہنسا کہ آخر آج وہ سیفٹی ایکٹ اس گھر میں بھی آ گیا جس کے خلاف ہر ہفتے تم پچھلے اڑھائی سال سے اخباری مضامین لکھتے رہے ہو۔ پہلے تو لوگوں کی گرفتاری پر لکھتے تھے اب کیا کرو گے؟

جب میں اوپر پہنچا تو میری بہن بہت پریشان تھی۔ اس کا رنگ سفید ہو رہا تھا۔ پندرہ سال کی پلوسی، جگر اور انتڑیوں کی خرابی نے اس میں کچھ بھی نہیں چھوڑا تھا۔ اب اس کے سامنے ایک اور جان گداز منزل، ایک نئی مصیبت اور نئی طرح کی اذیت تھی۔

یہ سوچ کر مجھے ایک لمحہ کے لیے اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی مگر میں نے کوشش کر کے اپنے حواس جمع کیے اور کپڑے تبدیل کر کے اس سے کہا ”مجھے ذرا کچھ پوچھ گچھ کرنے کے لیے تھانے میں بلایا ہے، دو تین گھنٹے تک لوٹ آؤں گا۔“

یہ سن کر اس کی حالت کچھ بہتر ہو گئی مگر مجھے اپنے جھوٹ بولنے پر سخت اذیت ہوئی لیکن میں اسے اس لمبی جدائی کے بارے میں بتا کر اپنے سامنے روتے ہوئے چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا تھا۔ مجھ میں اتنی ہمت ابھی پیدا نہیں ہوئی تھی اس لیے میں اپنے جھوٹ میں کامیاب ہو گیا۔

مکان کے باہر تانگہ کھڑا تھا۔ سی آئی ڈی انسپکٹر نے کہا ”تانگہ میں ہم آپ کو پرانی انارکلی تھانے میں لے چلیں گے کیونکہ آپ کا محلہ سنت نگر اسی تھانے میں ہے۔ وہاں سے بذریعہ موٹر آپ کو سنٹرل جیل پہنچا دیا جائے گا۔“

تانگہ جب مکان کے سامنے سے چلا تو میری نظر اپنے مکان کی کھڑکی پر پڑ گئی، وہاں پر بہن کو کھڑے دیکھ کر میں نے پولیس والوں سے زبردستی بات چیت کرنے اور ہنسنے کی کوشش کی تاکہ وہ سمجھ لے کہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ چنانچہ جب تک تانگہ مکان کے سامنے رہا میں بے وقوفی کے جملے بولتا اور خواجواہ قہقہے لگاتا رہا۔

تانگہ جو نئی موٹر پر سے مڑا تو میں نے انسپکٹر صاحب سے پوچھا ”کیا میں اکیلا ہی گرفتار ہوا ہوں یا اور لوگ بھی ہیں؟“

اس نے کہا ”اور لوگ بھی ہیں۔ آپ نام لیجئے تو میں بتلاؤں کون لوگ ہیں۔“

پہلے تو مجھے اور لوگوں کی گرفتاری پر بے حد خوشی ہوئی پھر میں نے سب سے پہلے ندیم کے بارے میں پوچھا۔

”میرا خیال ہے ندیم صاحب اب تک گرفتار ہو گئے ہوں گے“ انسپکٹر نے کہا۔

”اور محمد افضل؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ بھی آپ کے ساتھ ہی ہے“ انسپکٹر نے کہا ”زیادہ پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ گرفتاریاں پورے ملک میں

ہوئی ہیں، آپ کے بہت سے دوست اندر ملیں گے۔“

بہت سے دوستوں کی گرفتاری اور ساتھ ہونے کی خبر سن کر میری باچھیں کھل گئیں۔ مگر تھوڑی دیر بعد مجھے اپنی

کمینگی کا احساس ہوا۔ بالخصوص ندیم تو تین سال کی بیکاری اور زبوں حالی کے بعد ابھی دو ماہ پیشتر ہی کسی فلم کمپنی میں ملازم ہوئے تھے ورنہ اس سے پہلے تو ہندو پاکستان کے اس رومانی شاعر اور افسانہ نگار کی حالت مجھ سے بھی بدتر تھی۔ ان کو دیکھ کر اکثر مجھے یہ خیال ہوتا تھا کہ ایسے حالات میں ندیم کا دماغ کیسے صحیح رہتا ہے، ادب اور فن کے سلسلے میں جتنی محنت اور مشقت انہوں نے کی ہے اس دور کے لکھنے والوں میں بہت کم ہوں گے جو ان کا مقابلہ کر سکیں۔

اب بھی لوگ ان کی کتابوں کو خریدتے ہیں، پڑھتے ہیں اور تعریف کرتے ہیں اور مصنف پریشان حال بیکار ہے۔ پھر جب دو ماہ پیشتر اس نے تنگ آ کر فلم والوں کی نوکری قبول کر لی اور باقاعدہ آمدنی کا سلسلہ ہو گیا تو ہم سب کس قدر خوش تھے۔

ابھی یہ خوشی پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ آج یہ سلسلہ منقطع ہو گیا لیکن پھر بھی دل کے کسی گوشے میں یہ خوشی ضرور تھی کہ جیل میں ان کا ساتھ رہے گا۔

نئی منزل

پرانی انارکلی کے ٹیلیفون والے کمرے میں ہم سب جا کر بیٹھ گئے۔ انسپکٹر صاحب نے کار کے لیے دو دفعہ ٹیلیفون کیا مگر اس دن بہت سی گرفتاریاں ہونے کی وجہ سے پولیس کی گاڑیاں بے حد مصروف تھیں اس لیے ہر دفعہ یہی جواب ملا کہ گاڑی ابھی تھوڑی دیر تک نہیں مل سکے گی۔ گاڑی کی طرف سے مایوس ہو کر انسپکٹر صاحب نے مجھ سے کہا ”ابھی کچھ دیر رکن پڑے گا، آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتلائیے، چائے وغیرہ منگواؤں؟“

مزرے کی بات یہ ہے کہ میں خود جلد سے جلد جیل میں پہنچ کر دوستوں سے ملنا چاہتا تھا۔ میں نے کہا ”چائے وہیں چل کر پیئیں گے۔ اگر کار نہیں مل سکتی تو تانگہ ہی میں چلے چلیے۔“ چنانچہ تانگہ میں بیٹھ کر ہم لوگ سنٹرل جیل کی طرف روانہ ہو گئے۔

10 مئی کی یہ صبح بڑی سہانی اور بڑی اجلی صبح تھی۔ مگر مجھے وہ بہت ہی ویران اور اداس نظر آئی۔ ابھی پو پھٹی ہی تھی اور مشرق کی طرف سے روشنی کا سیلاب بڑھا آ رہا تھا۔ سڑکوں پر اکاڈ کا مسافر نظر آنے لگے تھے۔ کارخانوں میں جانے والے مزدور ٹوٹے ہوئے سائیکلوں پر سواری تیزی سے بھاگے جا رہے تھے۔ شہر کی سڑکوں پر کارپوریشن کے بھنگی جھاڑو دے رہے تھے اور فضا میں گرد و غبار چھایا ہوا تھا۔ تانگہ بہت آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ میں نے اس سارے منظر کی طرف سے آنکھیں پھیر لیں اور اپنے خیالات میں گم ہو گیا۔ ایک دنیا، زندہ حرکت کرتی ہوئی خوبصورت حسین دنیا میرے پیچھے چھوٹی جا رہی تھی اور ایک اجنبی مردہ لاش کی طرح بے حرکت زندگی سامنے پھیلی ہوئی تھی، آئندہ کیا ہو گا میرے بعد میری بہن

کیسے رہے گی؟ سگریٹ کے کش لیتے ہوئے میں بہت دیر تک یہی سوچتا رہا۔ تانگہ جیل روڈ پر چل رہا تھا۔

سی آئی ڈی انسپکٹر نے مجھ سے کہا ”آپ پر کمیونسٹ پارٹی کے مرکز کو بہت اعتماد ہے ناں؟“

میں نے کہا ”قبلہ اگر میری گرفتاری کی یہ وجہ ہے تو یہ بہت ہی عجیب بات ہے۔ کیونکہ اگر کوئی دوسرا مجھ پر اعتماد

کرتا ہے تو اس میں مجھے گرفتار کرنے کی تو ضرورت نہیں ہے۔ البتہ اگر آپ اس بات کو الٹ کر کہیں اور مجھے کمیونسٹ پارٹی پر اعتماد رکھنے کے جرم میں پکڑ لیں تو کوئی بات بنتی ہے.....“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

تانگہ جب جیل روڈ پر پہنچا تو ساڑھے پانچ بج چکے تھے۔ مگر جیل کے گھنٹے سے چھ بجنے کی آواز آئی۔ انسپکٹر

صاحب نے اپنی بھویں پھیلاتے ہوئے مجھ سے کہا ”یہ گھنٹہ جیل کا ہے؟“

”جی ہاں!“ میں نے جواب دیا۔

”آپ مدت تک اس شیریں گھنٹے کی آواز سنتے رہیں گے۔ یہی سنانے کے لیے آپ لوگ یہاں لائے گئے

ہیں۔“ اس نے کہا ”مجھے آپ لوگوں کی جوانی اور آپ کے کیریئر کا خیال آتا ہے۔ آپ لوگ ملک کے ساتھ ساتھ اپنے

آپ کو بھی تباہ کر رہے ہیں۔“

میں نے اس کی بات کا جواب اپنے دل میں دیا کہ ”ملک کو کون تباہ کر رہا ہے۔ اس کا فیصلہ وقت کرے گا اور اپنی

جوانی کی تباہی پر تو مدت ہوئی ہم نے سوچنا ہی چھوڑ دیا ہے۔“

جیل کے نزدیک پہنچ کر اس نے پھر کہا ”ذرا یہ تو بتلائیے کہ محمد افضل کی جو شادی پچھلے دنوں ایک انگریز عورت

سے ہوئی ہے اس میں جسمانی محبت کا دخل ہے، یا ذہنی ہم خیالی اس شادی کا باعث ہوئی ہے؟“

جیل کے پھانک کے پاس پہنچتے پہنچتے میں نے کہا ”محمد افضل ٹریڈ یونین لیڈر ہے اور میں ایک اخبار نویس ہوں

، اس لیے افضل کے حالات کے بارے میں آپ کو کچھ بتانے کے قابل نہیں ہوں اور پھر لوگوں کی بیویوں کے بارے میں

میں بہت کم سوچتا ہوں۔ اس لیے اس معاملہ میں بالکل کورا ہوں۔“

اس فقرے سے وہ کچھ محظوظ ہوا اور اس کے پتلے سنجیدہ اور کرخت چہرے پر ایک ہلکی سے مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔

زنجیریں اورتالے

جیل کا آہنی پھانک کھلا۔

پھانک بند ہو گیا۔ اب زندگی نظروں سے اوجھل تھی اور زنجیروں اور تالوں کے کھلنے اور بند ہونے کی صدا آرہی

تھی۔

شعر، نغمہ اور موسیقی سب کچھ اپنی پھانک کے باہر تھا اور لوہے کے بڑے بڑے وزنی تالے، لمبی مضبوط زنجیریں اور سلاخیں نظر کے سامنے تھیں۔ ڈیوڑھی میں دائیں ہاتھ کی طرف بغلی کمرے کے باہر ”ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ“ کا بورڈ لٹک رہا تھا۔ انسپکٹر صاحب اس کمرے میں داخل ہوئے اور ان کے پیچھے پیچھے میں بھی داخل ہوا۔

سب سے پہلے ایک آرام دہ کرسی پر بیٹھا ہوا محمد افضل مجھے دکھائی دیا۔ محمد افضل بڑے اطمینان سے سگریٹ کے کش لے رہا تھا اور اس کی عینک کے موٹے شیشے میں سے اس کی ذہین آنکھیں مجھے تجسس سے پر نظر آئیں۔ ہم دونوں نے فوراً ہاتھ ملایا، افضل نے اپنے پرانے بے تکلف انداز میں بڑی بے فکری سے کہا ”تسی وی آگئے او جناب..... بیٹھو.....“ جب میں بیٹھنے کے لیے پیچھے مڑا تو ایک کرسی پر ظہیر کا شمیری اپنے لمبے سنہری بالوں سمیت بیٹھا نظر آیا۔ میرا خیال ہے ظہیر کا شمیری زندگی میں تیسری بار آج صبح پانچ بجے اٹھا تھا۔ اس سے پہلے وہ صرف دو دفعہ پانچ بجے اٹھا ہوگا اور دونوں بار پولیس نے جیل لے جانے کے لیے ہی اسے صبح اٹھایا ہوگا۔ ورنہ عام طور پر اتنے سویرے وہ کبھی نہ اٹھتا ہوگا۔ چنانچہ آج بھی اس کے چہرے پر نیند کی کمی کے آثار نظر آ رہے تھے۔ اس نے غالباً بالوں میں کنگھی بھی نہیں کی تھی اور اس کے لمبے بال اس گھریلو اور دیہاتی عورت کی طرح پھولے ہوئے تھے جو دن بھر کام کاج میں مصروف رہنے کی وجہ سے سر کے بالوں کی طرف سے غافل رہی ہو۔ ویسے ظہیر کا شمیری اپنی ذاتی زندگی کے تقریباً سبھی مسائل سے غافل رہتا ہے۔ لیکن اس صبح کو تو وہ عجیب چیز معلوم ہو رہا تھا۔ بیڈن روڈ اور مینکلوڈ روڈ پر نکلنے سے پہلے وہ ہمیشہ اپنے سر اور داڑھی کے بالوں کو ترتیب دیکر باہر نکلتا ہے۔ لیکن آج یار لوگوں نے اسے اصلی صورت میں موقع پر پکڑ لیا تھا اور وہ گڑ بڑایا ہوا تھا۔

میں نے کہا ”ظہیر کا شمیری! تم تو تین مہینے سے بیمار تھے؟“

”پولیس کو شاید اس کی اطلاع ابھی تک نہیں ہوئی“ اس نے فوراً جواب دیا۔

”اوچھوڑ یار“ افضل نے ہنستے ہوئے کہا ”تم سمجھتے ہو کہ بیماری کی اطلاع مل جاتی تو تمہیں گرفتار نہ کیا جاتا؟“

اس پر کمرے کے آخری سرے سے قہقہوں کی آواز سنائی دی۔ میں نظر اٹھا کر دیکھا تو سامنے شوکت منٹو بیٹھا ہوا

نظر آیا۔

کافی دیر تک ہم چاروں اپنی اپنی گرفتاری اور جیل تک کے سفر کی بات چیت کرتے رہے۔ بار بار وہی بات ہوتی

تھی اور ایک ہی قسم کے فقرے بولے جاتے تھے۔ مگر سب کے سب اپنے پیچھے رہ جانے والی دنیا کے بارے میں سوچتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔

پکا ایک دروازہ کھلا اور ایک درمیانے قد اور پکے رنگ کا آدمی شلوار قمیض پہنے اندر داخل ہوا اور دفتر کی کرسی پر بیٹھ

گیا۔

یہ سنٹرل جیل کے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ چودھری احمد خاں تھے۔ انہوں نے گھور گھور کر ہم چاروں کی طرف دیکھا اور سی آئی ڈی کے آفیسروں سے جو وہاں موجود تھے، ہمارے وارنٹوں کی کاپیاں طلب کیں۔

ایک اسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ نے جو وہاں پہلے ہی سے موجود تھا، کہا ”ایک اور آدمی بھی ہے۔ وہ صبح چار بجے لایا گیا اور اسٹور میں بند کر کے بٹھایا ہوا ہے“ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ نے چھوٹی چھوٹی آنکھوں کو گھماتے ہوئے کہا ”اس کو بھی یہاں لے آئیے۔“

پانچواں آدمی

ہم چاروں ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ یہ پانچواں آدمی کون ہے۔ یہ پانچواں آدمی چونکہ سب سے پہلے آگیا تھا اور اسٹور میں جمع کر دیا گیا تھا اس لیے اس کے بارے میں کسی کو بھی معلوم نہ تھا۔ یہ احمد ندیم قاسمی تھے۔ مگر اس وقت تک اس حقیقت سے کوئی بھی واقف نہ تھا۔

دروازہ کھلا اور پانچواں آدمی اندر داخل ہوا۔ ندیم قاسمی اس وقت ایک اور ہی شخصیت معلوم ہو رہے تھے۔ ان کی شلوار، نیلی قمیض، بکھرے ہوئے بال اور ٹوٹا ہوا چپل دیکھ کر ہم لوگ حیرت زدہ رہ گئے۔ ندیم نے ہم چاروں کو باری باری دیکھا اور بیچ پر بیٹھتے ہوئے کہا ”آپ لوگ تو بڑے بنے بنائے بیٹھے ہیں۔ کپڑے بھی تبدیل کئے ہوئے ہیں۔ مجھے تو بستر سے اٹھالائے ہیں یار۔“

تھوڑی دیر تک کر انہوں نے کہا ”یار میرے ساتھ یہ ایسی بدسلوکی کیوں ہوئی واہ بھئی واہ! میں تو سمجھتا تھا کہ سب لوگ آج اسی طرح پکڑے جائیں گے مگر آپ تو بالکل تیار ہو کر آئے ہیں۔“ ندیم نے افضل کی کلف لگی اور دھوبی کے ہاں سے دھلی ہوئی قمیض کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک بار پھر اپنا فقرہ دہرایا۔ ہم سب نے اپنی اپنی گرفتاری کا قصہ دہرایا۔ ندیم نے کہا ”دیکھو جی میں نے کئی بار ان سے کہا، کپڑے تبدیل کر لینے دو مگر انہوں نے تو اتنے زور سے مجھے پکڑا کہ کپڑے تبدیل کرنا اور گھر میں کسی سے ملنا بھی ممکن نہ ہوا۔“

اتنے میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ نے پکارنا شروع کیا۔

”محمد افضل کون ہے؟“

محمد افضل کھڑا ہو گیا۔

”آپ کی بی کلاس ہے“ اس نے کہا ”آپ ادھر آجائیے۔“

”پروفیسر شوکت منٹو کون ہے؟“

شوکت منٹو کھڑا ہو گیا۔

”آپ کی بی کلاس ہے۔ آپ ادھر آجائیے۔“

”احمد ندیم قاسمی کون ہے؟“

”آپ کی سی کلاس ہے۔ آپ ادھر آجائیے۔“

مارے حیرت کے ہماری چیخ نکل گئی۔ ارے یہ ہندوپاک کا عظیم المرتبت شاعر، افسانہ نگار، بارہ کتابوں کا مصنف، شہید ادب، جس نے 35 سال کی عمر میں اتنا لکھا ہے کہ اس کے سر کے بال سفید ہو گئے ہیں اور چہرے کی ہڈیاں ابھرائی ہیں۔ یہ فن کا متوالا، پاکستان کے لوگوں کا محبوب فنکار کیا سی کلاس میں رہے گا؟

میں نے کہا ”ندیم صاحب یہی کس باقی رہ گئی تھی!“

افضل نے چلا کر ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سے کہا ”اوجی جناب ذرا چنگی طراں نال ویکھو کوئی غلطی تاں نہیں؟“

مگر غلطی یہاں نہیں تھی۔ غلطی تو بہت پیچھے تھے۔ یہاں تو ندیم کا وارنٹ تھا جس میں سی کلاس نظر بند لکھا تھا۔

میری اور ظہیر کاشمیری کی بھی سی کلاس تھی۔ ظہیر کاشمیری نے احتجاج کر کے ہوائے کہا ”یارو ذرا غور تو کرو، انگریز

کے زمانے میں دو دفعہ جیل میں گیا تو مجھے بی کلاس ملی۔ اب اپنا وطن مجھے سی کلاس میں رکھ رہے ہیں۔ میں تو

اختلاج قلب کا مریض ہوں میں تو مر جاؤں گا۔“

میں نے کہا ”فکر نہ کرو ظہیر کاشمیری! ہم اتنی آسانی سے مرنے والے نہیں ہیں۔“ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ ہمیں اپنے

کمرے سے اٹھا کر سپرنٹنڈنٹ کے کمرے میں لے گیا۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب نے ناموں کی فہرست سے ہمارے نام اس

طرح پکارے جیسے سکول میں بچوں کی حاضری لگتی ہے۔ حاضری لگا کر انہوں نے ہمیں رخصت کر دیا۔

جب ہم اس کے کمرے سے واپس ڈیوڑھی میں پہنچے تو چودھری احمد خاں نے گرجتے ہوئے شوکت منٹو سے کہا ”

پروفیسر صاحب پیچھے ہٹ کر کھڑے ہو جاؤ۔ آفیسر کے سامنے پیش ہوتے وقت بھی سگریٹ منہ میں رکھتے ہو۔ جانتے نہیں

ہو یہ جیل خانہ ہے۔“

شوکت منٹو چپ رہا۔ وہ ہمیشہ ہی چپ رہتا ہے۔

افضل نے آگے بڑھتے ہوئے کہا ”چودھری صاحب ہمیں کیا معلوم تھا کہ سپرنٹنڈنٹ صاحب کے سامنے

سگریٹ نہیں پینا چاہیے۔ یہ بتلانا تو آپ کا فرض ہے ہمیں تو اتنا معلوم تھا کہ جیل میں سگریٹ پینے کی اجازت ہے۔“

”اجازت ہے تو کیا آفیسروں کے سامنے بھی سگریٹ پینے کی اجازت ہو سکتی ہے۔“ چودھری صاحب نے غصے میں یہ فقرہ ادا کیا اور پاس کھڑے ہوئے ایک اسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ سے کہا ”جاؤ ان سب لوگوں کو سیاست خانے میں لے جاؤ۔“

ہم یہ سوچتے ہوئے ڈیوڑھی کے اندرونی اہنی پھانک کے سامنے آکھڑے ہوئے کہ یہ ”سیاست خانہ“ کیا چیز

ہے۔

سیاست خانہ

ہم سب ایک ایک کر کے ڈیوڑھی کے اندرونی اہنی پھانک کی چھوٹی سی کھڑکی میں سے گزر کر جیل میں داخل ہوئے۔ کھڑکی بند ہو گئی۔ قیدی پھانک کے آس پاس باغیچہ میں کام کر رہے تھے۔ قیدیوں کے جسم پر چار خانہ والے وہ کپڑے تھے جو اس سے پہلے ہندوستانی فلموں میں ہی دیکھے تھے۔ ہماری نظروں کے سامنے ایک اجنبی اور انجانی دنیا تھی۔ جس کے بارے میں ایک آدھ کو چھوڑ کر ہم میں سے کسی کو بھی کچھ معلوم نہ تھا۔ جس دنیا کے بارے میں ہم سب کچھ جانتے تھے وہ نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ غائب ہو چکی تھی۔

پھانک کے بائیں ہاتھ جیل کی اونچی دیوار کے ساتھ ساتھ ہم اسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ کے پیچھے پیچھے سیاست خانہ کی طرف چلے جا رہے تھے۔ یہ راستہ جیل روڈ کے بالکل متوازی تھا۔ جیل روڈ اور ہمارے درمیان یہ اونچی اور بھوری دیوار حائل تھی مگر باہر کی آوازیں اس دیوار کو عبور کر کے اندر آرہی تھیں۔ سڑک پر چلنے والے تانگوں، موٹروں اور بسوں کے ہارن اور چھاڑی بیچنے والوں کی آوازوں نے ہم سب کو اداس کر دیا۔ سب لوگ تھوڑی دیر تک خاموش چلتے رہے اور باہر سے آنے والی قسم قسم کی آوازوں کو سنتے رہے۔

محمد افضل اسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ کے ساتھ ساتھ سب سے آگے چل رہا تھا اس کے پیچھے ندیم، ظہیر، شوکت منٹو اور میں قدم ملائے جا رہے تھے۔ یکا یک باغیچہ میں کام کرنے والے ایک قیدی نے نظر اٹھا کر افضل کے چھٹ لہجے، قد، اس کی عینک کے شیشوں اور کلف لگی قمیض کو غور سے دیکھ کر ہاتھ اوپر اٹھایا اور سلام کیا۔ افضل نے آنکھ بچا کر دائیں بائیں دیکھا اور جب اسے یقین ہو گیا کہ قیدی کے سلام کرتے وقت اس کی طرف کسی نے نہیں دیکھا تو اس نے گردن کو ذرا سا جھکا کر اپنے ہاتھ کو چھاتی تک لے جاتے ہوئے قیدی کے سلام کا جواب دیا۔ مگر جب ہم سب کو مسکراتے ہوئے دیکھا تو خفیف ہو کر خود بھی مسکرانے لگا۔ ابھی ہم سب اس واقعے سے پوری طرح محظوظ بھی نہ ہوئے تھے کہ ایک اور قیدی نے

افضل کو سلام کیا اور پھر تو سیاست خانہ تک کوئی درجن بھر سلام ہوئے، افضل بھی سر کو ذرا سا جھٹکا دے کر سلام کا جواب دیتا اور پھر گھبرا کر سگریٹ کے لمبے لمبے کش لینے لگتا۔

ڈیوڑھی سے کوئی تین فرلانگ کے فاصلے پر جا کر نصف دائرے کی شکل میں ایک دیوار نظر آئی جس میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کوئی دس دروازے تھے، ہر دروازے پر ایک ایک تالہ پڑا ہوا تھا۔ ایک وارڈر چابیوں کا گچھا لیے ان دروازوں کے سامنے گھوم رہا تھا۔

ہم درمیان کے ایک دروازے کے سامنے جا کر رک گئے۔ اسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ کے اشارے پر وارڈر نے دروازے کا تالا کھولا اور ہم سب سیاست خانہ کے سات نمبر بلاک میں داخل ہو گئے۔

اس بلاک میں پچیس کوٹھڑیاں تھیں۔ ان میں سے صرف سات آٹھ سلامت تھیں، باقی گر چکی تھیں۔ ابھی ہم ان کوٹھڑیوں اور اپنی اس نئی اقامت گاہ کا جائزہ ہی لے رہے تھے کہ ایک کوٹھڑی سے نیکر پہنے سینک لگائے ساڑھے چارنٹ کا ایک لڑکا بھاگتا ہوا باہر نکلا۔ یہ حسن عابدی تھا۔

حسن عابدی سے ہم سب شاید ایک ایک دو دو بار مل چکے تھے مگر ہم میں سے کسی نے بھی اسے فوراً نہیں پہچانا۔ اس کے چہرے پر زردی چھائی ہوئی تھی اور اس کے خشک ہونٹ اس طرح نظر آ رہے تھے گویا ابھی کسی نے ان پر لکڑی کے برادہ کا چھڑکاؤ کیا ہو۔ حسن عابدی کو ہم سب حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ لیکن اس نے جب یہ بتلایا کہ وہ 21 اپریل کو گرفتار ہوا اور دو مئی تک شاہی قلعہ میں رہنے کے بعد یہاں لایا گیا تو ہم میں سے کسی نے بھی اس کے ہونٹوں پر جھے ہوئے برادے کے متعلق کوئی استفسار نہیں کیا۔ چند ہی منٹ میں عابدی کے چہرے پر تازگی آگئی۔ اس نے کہا ”میں دو مئی سے ان پچیس کوٹھڑیوں میں اکیلا ہوں۔ آج اس دنیا میں غالباً سب سے زیادہ خوش نصیب آدمی ہوں کہ میرے اتنے سارے ساتھی یہاں آگئے ہیں۔“ ہم سب نے اسے گھور کر دیکھا۔

حسن عابدی نے پیشہ ور راستہ دکھلانے والوں کی طرح ہمیں کوٹھڑیوں کی سیر کرائی اور بتایا کہ ”جیل کی اصطلاح میں کوٹھڑی کو کوٹھی کہا جاتا ہے۔ بعض لوگ کوٹھی کی بجائے اس کو چکی بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ چند سال پہلے ہر کوٹھی میں ایک ایک چکی ہوتی تھی اور جیل کے مجرموں کو پندرہ سیر دانے پینے کی سزا دے کر چکی بند کیا جاتا تھا۔ اب چکی کی مشقت بند ہو چکی ہے مگر جیل میں قصور کرنے والوں کو ان کوٹھیوں میں بند کیا جاتا ہے، یہ جیل میں سخت ترین جگہ ہے.....“

”جیل میں قصور کرنے والوں کو یہاں پر بند کیا جاتا ہے..... مگر جیل میں قصور کرنے سے تمہاری مراد کیا ہے.....؟“ محمد افضل نے حسن عابدی سے پوچھا۔

”مثلاً اگر کوئی قیدی مشقت نہ کرے یا دنگا فساد کرے یا کسی آفیسر کی بے عزتی کرے تو اسے ان چکیوں میں بند کیا جاتا ہے۔“ ظہیر کا شمیری نے آگے بڑھتے ہوئے کہا ”آپ لوگ سب نئے ہیں۔ میں ان چکیوں میں بہت بند رہ چکا ہوں۔“

ندیم نے چلا کر کہا ”یارو ہم نے تو جیل سے باہر بھی کوئی قصور نہیں کیا۔ ہمارے وارنٹوں تک پر ”احتیاطی نظر بندی“ لکھا ہوا ہے۔ پھر ہمیں ایسی جگہ پر کیوں رکھا جا رہا ہے جہاں جیل کے قصوریوں کو رکھا جاتا ہے....“

”سب ٹھیک ہو جائے گا“ ظہیر کا شمیری نے شہادت کی انگلی اٹھاتے ہوئے بڑے پر اسرار اور گہم لہجہ میں کہا ”مگر آہستہ آہستہ تیزی مت کرو۔ ذرا حالات کا مطالعہ کر لیں، پھر غور کریں گے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔“

محمد افضل حیرت بھری نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا گویا کہیں کھو گیا ہو۔ شوکت منٹو چپ چاپ اس طرح چل پھر رہا تھا جیسے اس پر کم از کم دو من بوجھ لدا ہوا ہے۔ مجھے بار بار اپنی بیمار بہن کا خیال آتا تھا۔

نمبردار اور بستر

ابھی ہم اس جگہ کے بارے میں سوچ بچار کر ہی رہے تھے کہ ایک نمبردار دو تین قیدیوں کے سر پر تپڑیوں، دریوں اور کبلوں کا بوجھ اٹھوائے ہوئے باہر کے دروازے سے اندر داخل ہوا۔ حسن عابدی نے فوراً اس کا تعارف کرایا اور بتایا کہ اس نمبردار کا نام مکھن ہے اسے عمر قید کی سزا ہے۔ موصوف ایک قتل میں سات سال کی سزا حاصل کر کے رہا ہوئے تھے۔ رہا ہونے کے بعد واپس گھر جاتے ہوئے ایک جگہ رات بھر کے لیے قیام کیا اور دوسرا قتل کر کے پھر یہاں آ گئے۔

مکھن نمبردار نے سب کو ایک ایک تپڑی، ایک ایک دری، جوڈیٹھنٹ چوڑی اور چارنٹ لمبی تھی، اور دو کبل دے دیئے اور انکشاف کیا کہ یہ ہمارے بستر ہیں۔

ندیم نے کہا ”مگر بستر میں تکیہ نہیں ہے۔“

نمبردار نے ہنستے ہوئے کہا ”سی کلاس میں تکیہ نہیں ملتا لیکن شاید آپ کے گھر سے بستر آ جائیں تو آپ کو تکیہ رکھنے کی اجازت مل جائے۔“

میرے سر میں سخت درد ہو رہا تھا۔ میں نے ادھر ادھر گھوم کر دیکھتے ہوئے کہا ”یار چائے کا بندوبست کب ہوگا؟“

”جب آپ رہا ہو جائیں گے“ حسن عابدی نے جواب دیا۔

اس جواب کے بعد ہمارے چہروں پر سیاہی چھا گئی۔ سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

”تو کیا چائے جیل میں نہیں ملے گی؟ ندیم نے حیرت سے منہ کھول کر چیختے ہوئے کہا۔“

”جی نہیں!“ حسن عابدی نے کہا ”میں نے آٹھ دن سے چائے نہیں پی۔ چائے کے لیے ترس گیا ہوں۔“

ندیم نے پریشانی کے عالم میں ٹہلتے ہوئے کہا ”یارو ہم لوگ دن میں پانچ سات بار چائے پیتے تھے، کوٹ پتلون پہنتے تھے، گھر میں سلیقے کا فرنیچر بھی رکھتے تھے مگر حکومت نے ہمیں سی کلاس میں رکھ کر بتلا دیا کہ ہماری حیثیت کچھ نہیں ہے، ہم سب پڑھے لکھے لوگ ہیں یہ کیا ہو رہا ہے؟“

”ڈرامہ“ میں نے ندیم کے کان میں آہستہ سے کہا۔

ظہیر کا شمیری نے کہا ”فکر نہ کرو ہم عرضیاں لکھیں گے کہ ہمیں بی کلاس ملنی چاہیے۔ میں عرضی لکھوں گا کہ انصاف اور جمہوریت کے نام پر میں حکومت سے اپیل کرتا ہوں کہ مجھے میری حیثیت کے مطابق کلاس دی جائے۔ میں اپیل کروں گا کہ میں گریجویٹ ہوں، معروف شاعر ہوں، مختلف رسالوں کا ایڈیٹر ہوں، مجھے بی کلاس دو۔ میں اپیل کروں گا.....“

”ارے چھوڑو یار..... یہ سب اسپیلیں کس کے سامنے کرو گے؟“ افضل نے کہا

اس سوال کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد ہم نے پیپل کے درخت کے گھنے سائے میں کبیل بچھالیا اور اس پر بیٹھ گئے۔ پھر گرفتاری کے متعلق باتیں ہونے لگیں۔ ہم سب نے اپنی اپنی جیب سے سگریٹ نکال کر سامنے رکھ دیئے اور بے تحاشا سگریٹ پینے لگے۔

احاطہ کا دروازہ باہر سے بند تھا اور باہر تالا لگا ہوا تھا۔ یکا یک تالا کھلا، ایک منشی رجسٹر ہاتھ میں لیے داخل ہوا اور قلم دوات سنبھالتے ہوئے بولا ”سب لوگ اپنا اپنا نام لکھو او بھئی!“

”محمد افضل!“ افضل بلند آواز سے بولا۔

”محمد افضل ولد؟ منشی نے کہا۔

”اچھا تو یہ بھی ہوگا۔“ شوکت منٹو نے کہا۔

اس کے بعد منشی نے سب کے نام اور ولدیت رجسٹر میں درج کئے اور باہر چلا گیا۔ باہر کا تالا پھر بند ہو گیا۔

دیواریں ہی دیواریں

ہم سب کبیل پر ایک دوسرے سے جڑے بیٹھے تھے۔ زندگی کی اس نئی اور اجنبی منزل پر رفاقت کا مضبوط احساس اب بیدار ہو رہا تھا گویا ہم سب ایک ہی ہیں۔ اس سنگلاخ منزل پر پہنچ کر سارے دوست، جو اپنی خواہشیں، محبتیں اور حسرتیں اس اونچی بھوری دیوار کے باہر چھوڑ آئے تھے، ایک دوسرے سے بہت قریب ہو گئے تھے گویا ہم صدیوں سے

اکٹھے ہیں، ہمیں دنیا کی کوئی طاقت جدا نہیں کر سکتی۔ جیل میں آ کر آج پہلی بار مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ باہر سے جیل کا جو تصور ذہن میں تھا وہ صحیح نہیں تھا۔ اس ایک جیل میں کئی جیلیں ہیں۔ ایک اونچی دیوار ہمیں باہر کی عظیم، حسین، حرکت کرتی ہوئی زندگی سے جدا کر رہی ہے تو ایک دوسری دیوار ہمیں جیل کے اندر کی زندگی سے بھی جدا کر رہی ہے۔ اس احاطے کی دیوار نے ہمیں جیل کے قیدیوں سے بھی علیحدہ کر دیا تھا۔ زندگی دیواروں میں تبدیل ہو گئی تھی۔

جیل یاسرال

کچھ دیر ہم سب اسی طرح کچھ سوچتے، کچھ پریشان بیٹھے اپنی نئی زندگی، پرانی دنیا اور نئی پابندیوں کے بارے میں سوچتے رہے۔ ہر آدمی کے چہرے سے اس کے اندرونی جذبات کا پتہ چلتا تھا مگر صاف صاف کچھ کہنے کے لیے کوئی بھی تیار نہ تھا..... اسی اثناء میں باہر کا پھانک کھلا اور دادا فیروز الدین منصور سگریٹ کے لمبے لمبے کش لگاتے اور مسکراتے ہوئے احاطے میں داخل ہوئے۔ دادا اس شان بے نیازی سے جیل میں داخل ہو رہے تھے کہ ہم سب کو سخت حیرت ہو رہی تھی دادا کی شیو تازہ بنی ہوئی تھی، ہاتھ میں ان کا محبوب قینچی کا سگریٹ اور چہرے پر ان کی معصوم مسکراہٹ ہمیشہ کی طرح بکھری ہوئی تھی۔ پیچھے دو قیدی ان کا ٹرنک اور بستر بند اٹھائے چلے آ رہے تھے۔ ہم سب بھاگ کر دروازہ کی طرف لپکے، مگر دادا کی چال میں کوئی تیزی نہیں آئی۔ وہ اسی طرح چہل قدمی کرتے ہوئے بڑھ رہے تھے۔

”دادا معلوم ہوتا ہے آپ جیل میں نہیں بلکہ سسرال آئے ہیں“ ندیم نے سب سے پہلے دادا سے گلے ملتے

ہوئے کہا۔

”دادا یہ جیل خانہ ہے“ افضل نے آگے بڑھ کر کہا، مگر آپ کو دیکھ کر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ابھی ابھی گاڑی

سے اتر کر پلیٹ فارم پر ٹہل رہے ہیں۔“

”ہاں ہاں یہ جیل خانہ ہے، مجھے ابھی احمد خاں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ نے بتایا تھا۔“

شوکت منٹو نے ایسی آواز میں کہا جس کو سننا اور سمجھنا کافی مشکل کام تھا۔

دادا نے ٹرنک کھولتے ہوئے اپنا جملہ سامان، کپڑے، تیل، صابن، سگریٹ، ماچس اور ضروریات کی تمام

چیزیں میدان میں رکھ دیں اور کہا ”تم لوگ نا تجربہ کار ہو۔ میں نے اپنی سات مرتبہ جیل یا ترا کے تجربوں سے فائدہ اٹھایا

ہے“ پھر بستر کھولتے ہوئے کہا ”دیکھ لو کہ بستر بھی مکمل ہے۔“

اس مکمل بستر میں تکیہ، درمی، کھیس اور چادر کے ساتھ ساتھ لحاف بھی رکھا ہوا تھا۔ مئی کی اس خوفناک گرمی میں

لحاف دیکھ کر پبلک حیران ہوئی بلکہ کسی نے یہاں تک بھی کہہ دیا کہ ”دادا ستمبر اکتوبر کے آنے والے سرد موسم کے پیش نظر

لحاف بھی لے آئے ہیں۔“

دادا منصور نے مجھے ہوئے فنکارانہ انداز میں کہا ”بھائیو سردیاں بھی یہاں گزارنا پڑ سکتی ہیں، ہمیں کسی سرد مقام پر بھی تبدیل کیا جاسکتا ہے، ایسی صورت میں انسان کو اپنا تمام سامان مکمل رکھنا چاہیے۔ کون جانے کس وقت کس چیز کی ضرورت پڑ جائے۔“

یہ مفصل جواب سن کر کسی کو اور کچھ پوچھنے کی جرات نہ ہوئی۔

دادا منصور کے آنے کے بعد ایک بار پھر ہر ایک نے اپنے اپنے گرفتار ہونے کی تفصیل سنائی۔ یہ قصے بیسیوں بار دہرائے جا چکے تھے مگر چار دیواری میں مبھوس ہونے کے بعد موضوع ہی کتنے رہ جاتے ہیں جن کا ذکر ہو سکتا ہے چنانچہ ہر ایک اپنے صبح سویرے کے واقعات دہرا رہا تھا۔ دادا نے کمیونسٹ پارٹی کے ہیڈ کوارٹرز سے لے کر گوالمنڈی تھانے تک جانے، وہاں پر بیٹھنے، چائے پینے اور شیو بنانے تک کے تمام قصے سنائے تو ندیم قاسمی نے ایک بار پھر رقت بھری آواز میں کہا ”یارو یہ مجھے گرفتار کرنے پر کون کم بخت مامور ہوا تھا، اس نے مجھے کپڑے تبدیل کرنے دینا تو ایک طرف رہا، گھر میں کسی سے ملنے تک بھی نہ دیا۔ میں نے بہت کہا مگر اس نے مجھے بازو سے اس طرح پکڑ لیا تھا جیسے چھوڑ دے گا تو بھاگ جاؤں گا۔“

دادا نے بتایا کہ کمیونسٹ ہیڈ کوارٹرز سے ان کے علاوہ غلام محمد کو بھی گرفتار کیا گیا تھا۔ شمیم اشرف ملک اور لالہ خاں کی تلاش جاری ہے اور یہ بھی اطلاع دی کہ پولیس والے غلام محمد کو شاہی قلعہ میں لے گئے ہیں۔ شاہی قلعہ کا ذکر سن کر حسن عابدی نے کہا ”ارے باپ رے باپ وہاں تو بڑی مار پڑتی ہے۔ غلام محمد بے چارے پھنس گیا۔“

ایک اور

کوئی آدھ گھنٹہ کے بعد احاطہ کا پھانک کھلا اور چیف وارڈرانڈر آ کر شکستہ اور سالم کو ٹھڑیوں کا جائزہ لینے لگا۔ میں نے اس پھانک سے باہر جھانک کر جیل ہی میں پھرنے والے ان انسانوں کو دیکھنے کی کوشش کی جنہیں ہم سے الگ کر کے لیے جیل میں اس احاطہ کی صورت میں ایک اور جیل تعمیر کر دی گئی تھی۔ سامنے قیدی مشقت کر رہے تھے اور ہنس کر رہے تھے، بعض کان پر ہاتھ رکھ کر تانیں لگاتے ہوئے نظر آئے۔ مجھے یہ سارا مجمع یہ سارا منظر بڑا عجیب لگا۔ چار خانے گاڑھے کے کرتے پا جامے پہنے یہ قیدی اتنی تعداد میں تھے اور یہ سب اپنے ارد گرد کی دنیا سے اس قدر بے خبر، اس قدر مصروف، مطمئن اور خوش نظر آتے تھے کہ میرا جی چاہا بھاگ کر ان میں مل جاؤں۔ جنہیں سلاج مجرم کہہ کر اس چار خانے

میں بند کر دیتا ہے ان کے بارے میں کچھ جاننے کی خواہش پیدا ہوئی، کون جانے ان میں کتنے بڑے بڑے دماغ ہوں جنہیں غلط سماجی تربیت، غلط ماحول، تعلیم کی کمی اور جہالت نے یہاں لا ڈالا۔ وہ کیا سوچتے ہیں، کیسے دن گزارتے ہیں، یہ سب کچھ جاننے کے لیے میں اس وقت بے قرار ہوا تھا۔ لیکن اپنے ہی جیسے ان قیدیوں سے ملنے کی بھی ہمیں اجازت نہیں تھی۔ ہمارے لیے اس احاطے کی چار دیواری سے باہر قدم رکھنا بہت بڑا جرم تھا۔ اس لیے میں خاموشی سے پلٹنے لگا۔

پلٹتے ہوئے میں نے ذرا سے فاصلہ پر غلام محمد کو کھڑے دیکھا۔ غلام محمد جو خاموش مگر محنتی کارکن ہے جس کی محنت نے پچھلے تین سال میں بہت سے مرحلوں پر اس سے بڑے بڑے کام لیے تھے، جو دوسروں کا کام کرنے سے بھی کبھی ہچکچاتا نہیں تھا، لٹھے کی شلوار اور گبرون کی قمیض میں ملبوس کھڑا غور سے احاطے میں کھل بچھا کر زمین پر بیٹھے ہوئے ان درویشوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے سخت اور سنجیدہ چہرے کو ایک ہی بار دیکھنے کے بعد میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ سخت کرب میں مبتلا ہے اور اس پریشانی سے دوچار ہے کہ اگر اسے یہاں اپنے ساتھیوں میں جگہ نہ ملی تو وہ جیل کے کسی دوسرے حصے میں اکیلا بند کر دیا جائے گا۔

خوش قسمتی سے ہماری کوٹھڑیوں میں ایک اور سالم کوٹھڑی نکل آئی اور چیف وارڈرنے غلام محمد کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔

غلام محمد نے بھی دادا کی معیت میں اپنا بستر بمع لحاف کے ساتھ لے لیا تھا۔

انسانوں کی خوراک

دس بجتے بجتے کھانے کا شور ہوا۔ ہم میں سے سوائے دادا اور غلام محمد کے کسی نے بھی صبح چائے نہیں پی تھی اور پھر صبح دس بجے کھانے کا خیال تک بھی نہ آسکتا تھا۔ اس لیے کھانے کو کسی کا بھی جی نہیں چاہتا تھا مگر جب نمبردار اور حسن عابدی نے اپنے تجربات کی روشنی میں یہ فیصلہ کر دیا کہ کھانا کھانا ہے تو ابھی کھایا جاسکتا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد کھانا نہ تول سکے گا اور نہ اس قابل ہوگا کہ کھایا جاسکے، تو سب تیار ہو کر بیٹھ گئے۔ نمبردار نے ڈنر سیٹ یعنی ایلو مونیوم کا ایک ایک پیالہ ہمارے ہاتھ میں تھما دیا اور ہماری گنتی کر کے دو روٹی فی کس کے حساب سے ہر ایک آدمی کو اس کا حصہ دے دیا۔ روٹیاں میدان میں کھیل پر اوپر نیچے رکھ دی گئیں۔ ابھی ہم ان روٹیوں کے بارے میں کوئی فیصلہ بھی نہیں کر پائے تھے کہ ایک عجیب و غریب سیاہ مائع ہمارے سامنے لایا گیا۔ اس سیاہ اور خوفناک سیال شے میں سے جلے ہوئے تیل کی بونے اتنی تیزی سے ہمیں اپنی لپیٹ میں لے لیا کہ ہمیں اپنی ناکیں غائب ہوتی معلوم ہوئیں۔ یہ بدبودار سیاہ چیز ماش کی دال تھی۔ یہ انکشاف حسن عابدی نے اپنے ہفتہ بھر کے تجربے کی روشنی میں کیا اور یہ بھی اعلان کیا کہ دال کی رنگت لوہے کی دیگ استعمال کرنے

سے بدل گئی ہے ورنہ کوئی خاص بات نہیں۔ حسن عابدی ہفتہ بھر میں اس دال کا عادی ہو چکا تھا مگر اس کے اسی انکشاف پر ہم سب نے متفقہ طور پر ایک چیخ..... ماری۔ دال کا پیالہ ندیم کے ہاتھ میں تھا، پیالہ میری طرف بڑھاتے ہوئے انہوں نے کہا۔ ع ”ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں“ پیالہ ان کے ہاتھ سے لے کر میں نے کہا ”چلیے میں بھی آپ کے پیچھے پیچھے آتا ہوں“ دادا نے ایک بار پھر ڈھارس بندھائی ”کسی نہ کسی طرح گزارہ کرو چند دن بعد کھانا پکانے کی اجازت مل جائے گی۔“

ظہیر کا شمیری نے شہادت کی انگلی اوپر اٹھائی اور کہا ”آہستہ آہستہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے بڑے اطمینان سے لقمہ توڑا اور دال میں ڈبو کر کھانے لگا۔

”کھا گیا؟“ میں نے حیرت سے کہا۔

”ہاں کھا گیا!“ ظہیر نے اسی خشوع و خضوع کے ساتھ لقمہ توڑتے ہوئے جواب دیا۔

ہم سب ابھی تک اپنی اپنی روٹی ہاتھ میں لیے بے بسی کی تصویر بنے سیاہ دال پر نظریں جمائے بیٹھے تھے۔ اس چیز کو جو ہمارے سامنے رکھی تھی کھانے کا حوصلہ کسی میں بھی نہ تھا۔ اگرچہ سب کے سب ہنس ہنس کر باتیں بنا رہے تھے لیکن دل ہی دل میں یہ کھانا مستقل طور پر کھانے کے تصور ہی سے لرزہ طاری تھا۔ میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ ہم پڑھے لکھے لوگوں، ادیبوں، شاعروں اور سیاسی قیدیوں کو اس قسم کا کھانا دیا جائے گا۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے رہنماؤں کی جیل کی زندگی کے تذکرے پڑھنے کے بعد کچھ اس قسم کا احساس دل میں موجود تھا کہ جیل میں سیاسی قیدیوں کے ساتھ عام مجرموں سے بہتر سلوک کیا جاتا ہے لیکن میں یہ بھول رہا تھا کہ ہم نے اس طبقے کے ساتھ اپنا تعلق قائم کیا ہے جو کانگریس اور مسلم لیگ کے طبقوں سے الگ ہے، وہ محنت کشوں، مزدوروں، کسانوں اور دانشوروں کا طبقہ ہے جو محنت کرتے ہیں اور بھوکے مرتے ہیں..... اس لیے ہمیں بھی ہماری پیاری اور قومی جماعت نے ان تمام مراعات سے محروم کر دیا تھا جو اونچے طبقے کے لوگوں اور ان کے نمائندوں کو ملتی ہیں۔ پھر بھی حیرت اس بات میں تھی کہ بڑے بڑے چور، ڈاکو اور مجرم گریجویٹ ہونے کی صورت میں اخلاقی جرم میں ماخوذ ہو کر آنے کے بعد بی کلاس میں رکھے جاتے تھے، ہم میں سے ندیم، ظہیر اور منصور نہ صرف گریجویٹ تھے بلکہ اپنے اپنے حلقہ میں بہت بڑی پوزیشن کے مالک تھے۔ ندیم درجن بھر کتابوں کا مصنف، منصور ماسکو یونیورسٹی کا گریجویٹ اور مشہور کسان لیڈر، ظہیر مشہور شاعر، مگر یہاں سب ایک ہی صف میں بیٹھے تھے، صف بھی کیا تھی کبل پر بیٹھے تنور کی ادھ پکی روٹیاں اور ماش کی سیاہ دال سامنے رکھے اپنی اپنی تقدیر پر غور کر رہے تھے۔

ندیم نے یکا یک گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے، بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ایک لقمہ دال سے چھو کر برق رفتاری

سے منہ میں ڈال لیا اور بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے ناک کو پکڑتے ہوئے کہا ”ناک کو پکڑ لیا جائے تو کھانا برا نہیں۔“
 سب نے دو دو چار چار لقمے کھا کر چھوڑ دیئے، روٹیاں اور دال اسی طرح پڑی تھی۔ مکھن نمبردار محض مسکراتا رہا،
 اس نے اپنی گھنی مونچھوں سے سیاہ ہونٹ پھیلاتے ہوئے کہا ”شروع میں سب ایسا ہی کرتے ہیں مگر کچھ دن گزر جانے پر
 عادت ہو جاتی ہے۔ دو چار روز میں تم لوگ دو دو روٹیاں کھا کر اور بھی مانگو گے۔“

اتنے میں بی کلاس والے دونوں آدمیوں، افضل اور شوکت منٹو کے لیے لوہے کی چار پائیاں اور ایک تھال میں لگا
 ہوا کھانا آ گیا۔ توے کی پکی ہوئی روٹیاں اور گوشت دیکھ کر پوری قوم نے اجتماعی حملہ کر دیا اور دو منٹ کے اندر اندران کا
 کھانا صاف کر دیا گیا۔

پابندیاں ہی پابندیاں

کوئی گیارہ بجے نمبردار چابیوں کا گچھالے کر آ گیا اور آتے ہی اس نے اعلان بھی کر دیا کہ ”سب لوگ اپنی اپنی
 کوٹھڑیوں میں چلو گنتی بند ہوگی۔“

تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ جیل کے قاعدے کے مطابق قیدی صبح گنتی کرنے کے بعد کھولے جاتے ہیں،
 دوپہر کو انہیں گننے کے لیے پھر بیرکوں اور کوٹھڑیوں میں اپنی اپنی جگہ پر بند کیا جاتا ہے، دو بجے کے بعد انہیں کھول کر پھر کام
 کاج پر لگایا جاتا ہے اور سر شام پھر ان کی تعداد معلوم کی جاتی ہے یعنی انہیں رات بھر کے لیے بند کر دیا جاتا ہے۔ جیل میں
 قاعدے کے مطابق کسی قیدی کی کوئی شخصیت نہیں ہے۔ ہر قیدی ایک عدد ہے، ایک اکائی ہے۔ صبح، شام، دوپہر ان کو ان
 کے اپنے حصے میں گن کر ڈیوڑھی میں قیدیوں کی جو تعداد درج ہے اس کے ساتھ ملا لیا جاتا ہے۔ اگر کم ہو جائے تو معلوم کیا
 جاتا ہے کہ کمی کہاں پر ہے، اور کون بھاگ گیا۔

ہم نے لاکھ سہارا کہ ہم جتنے بھی ہیں سامنے بیٹھے ہیں، دوسرے قیدیوں کی طرح ہم مشقت کے لیے جیل کے
 ایک حصے سے دوسرے حصے تک بھی نہیں جاتے کیونکہ ہمیں تو احاطے سے باہر نکلنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ علیحدہ علیحدہ
 کوٹھڑیوں میں بند کر کے گننے کی بجائے ہمیں اسی طرح احاطہ ہی میں گن لیا جائے کیونکہ ہم تو احاطہ میں بند ہی ہیں تو پھر
 الگ الگ کوٹھڑیوں میں بند کرنے سے کیا حاصل ہوگا مگر بقول چودھری احمد خاں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ یہ ”جیل خانہ“ تھا، اس
 لیے ہماری کوئی بات نہ سنی گئی اور ہماری گنتی بند ہو گئی یعنی ہم سب الگ الگ کوٹھڑیوں میں بند تھے۔

کوٹھڑیوں کا جنگلا دار دروازہ بند تھا۔ باہر بڑا موٹا سا تالا تھا، مجبوری کے اس پہلے احساس نے ساتھیوں سے علیحدہ ہونے پر مجھے اور بھی پریشان کرنا شروع کر دیا۔ صبح سے ہم آپس میں بات چیت کرتے، قہقہے لگاتے اور لطیفہ بازی کرتے رہے تھے۔ اس مصروفیت میں کسی کو اپنے متعلق کچھ سوچنے کی فرصت ہی نہ ملی تھی۔ ذہن کے کسی گوشے میں اس آفت کا احساس ضرور تھا مگر واضح طور پر کچھ سوچنے اور غور کرنے کا موقع نہ ملا تھا۔ کوٹھڑی میں تنہا اور سب سے علیحدہ ہونے کے بعد جیسے صبح سے اب تک زندگی میں جو انقلاب آیا۔ وہ واضح اور صاف شکل میں سامنے آ گیا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ تین بجے کھولا جائے گا۔ یہ تین گھنٹے تین صدی سے بھی زیادہ لمبے نظر آرہے تھے۔ کوئی کتاب نہ تھی، کوئی مصروفیت نہ تھی اور وقت گزارنے کا کوئی طریقہ نہ تھا۔ کوٹھڑی میں لیٹتے ہی لمحہ بھر میں اپنا چھوٹا گھر، اپنی بیمار بہن اور پیچھے رہ جانے والے دوستوں کے چہرے نظروں کے سامنے آ گئے اور یوں محسوس ہونے لگا جیسے میں پگھلا جا رہا ہوں۔ پاس کچھ بھی نہ تھا۔ زندگی کی ساری ضروریات ختم ہو چکی تھیں۔ وہ ہنگامے، وہ مصروفیتیں، جن سے انسانی زندگی عبارت تھی، جن سے صبح شام فرصت نہ ملتی تھی، سب ختم ہو چکے تھے، اب ایک نئی منزل، ایک نیا سفر سامنے تھا جس کے آغاز و انجام کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہ تھا۔

بوریا بستر

میں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی تو مونج کی ایک چٹائی، ڈیڑھ فٹ چوڑی ایک دری اور دو کبل نظر کے سامنے تھے، یہی اس کوٹھڑی کی کل کائنات تھی۔ ایک کونے میں قبر کی طرح ایک کھڈی تھی اور دوسرے کونے میں مٹی کا ایک برتن رفع حاجت وغیرہ کرنے کے لیے رکھا ہوا تھا۔ ان چیزوں کو دیکھ کر مجھے معایہ احساس ہوا کہ باہر کی دنیا کی تبدیلیوں کا اس چار دیواری کے اندر تک کوئی اثر نہیں پہنچتا یہ وہی کوٹھڑی، وہی کھڈی اور وہی برتن ہے جس کا ہر جیل جانے والے سیاسی کارکن نے ذکر کیا ہے۔ مجھے مولانا عبدالجید سالک کی سرگزشت کے وہ حصے یاد آئے جو چند دن پہلے چھپے تھے اور جن میں انہوں نے پچیس سال پہلے کی جیل یا ترا کے سلسلے میں کھڈی اور اس لازوال برتن کا ذکر کیا تھا۔ سب کچھ اسی طرح تھا۔ وہی نقشہ، وہی کوٹھڑیاں، وہی مونج کی چٹائی اور دری..... اتنے برس گزرنے پر، اتنی تبدیلیاں، انقلاب اور تغیر رونما ہونے کے باوجود یہاں کوئی تبدیلی نہ آئی تھی۔

چٹائی پھیلا کر اس پر دری بچھاتے ہوئے میں لیٹ گیا مگر اس نام نہاد بستر میں گلے نہیں تھا۔ کسی کے پاس بھی گلے نہیں تھا مگر مجھے بار بار ندیم کا خیال آتا تھا جو میرے ساتھ کی کوٹھڑی میں بغیر گلے کے لیٹا ہوا تھا۔ جس نے اپنی جوانی، اپنی عمر کا بہترین حصہ، اپنا گھر اور سب کچھ فن کی نذر کر دیا تھا۔ اس حقیقت سے کسے انکار ہو سکتا ہے کہ اس لسل کے ادیبوں میں

بہت کم ندیم کا مقابلہ کر سکتے ہیں، اس لیے کہ جتنی محنت اس نے کی ہے اتنی محنت وہی ادیب کر سکتے ہیں جن کے اندر تخلیق کی صلاحیت، قوت اور جذبہ ہوتا ہے، جو اپنے فن اور مقصد میں مخلص ہوتے ہیں۔ ندیم اس پوزیشن میں تھا کہ وہ اپنی قیمت کا اعلان کر دیتا لیکن ایک سچے اور عظیم فنکار کی طرح اس نے آرام اور اطمینان کی زندگی کو چھوڑ کر مصیبتوں کا خاردار راستہ منتخب کیا۔ اسی راستے پر قدم بڑھائے جس کی طرف جانے کے لیے اس کے ضمیر نے کہا۔ اس کا دل بھی ایک خوبصورت گھر، ذاتی آرام اور آسائش کے حصول کے لیے لپچاتا ہوگا مگر اس نے اپنی ذات کو کائنات پر قربان کر دیا۔ یہی چھوٹے اور بڑے، جھوٹے اور سچے فنکار کا فرق ہے اور اسی سچائی اور صداقت کے لیے آج وہ زمین پر لیٹا تھا اور وہ جو قلم کی ایک جنبش سے اچھے خاصے انسانوں کو بغیر ان کا جرم بتائے کال کوٹھڑی میں بند کر دیتے ہیں اپنے گھروں میں آرام سے لیٹے ہیں۔ انہیں یہ احساس بھی نہیں ہے کہ آج فن پابہ زنجیر ہو گیا ہے، شاعر حسن و عشق کے نغمے گاتا اور انسانی بلندیوں اور عظمتوں کا راگ الاپتا ہوا لوہے کے منحوس کٹھرے میں بند ہو گیا ہے اور انسانی روح کے معمار زمین پر ایڑیاں رگڑ رہے ہیں۔ بار بار میں سوچتا کہ ندیم اگر پندرہ سال تک پکوڑے بیچنے اور بنانے کا کام اختیار کر لیتا تو اس وقت کم از کم بغیر تکیہ کے یوں زمین پر نہ لیٹا ہوتا۔ ندیم کے بعد دادا منصور تھا جس نے انگریز کے زمانے میں درجنوں بار جیل کاٹی اور شاہی قیدی کی حیثیت سے رہا۔ اس وقت جب وہ اپنی عمر اور زندگی کی آخری منزلوں میں ہے، جب بڑھا پا اس کے رگ و پے میں سرایت کر رہا ہے، وہ پاکستان کی اس آزاد مملکت؟ میں سی کلاس میں زمین پر لیٹا ہوا دمہ اور کھانسی سے ہانپ رہا ہے۔ یہ کیسی تبدیلی ہے؟ یہ کیسی آزادی ہے؟ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے؟

میں انہی خیالوں میں گم تھا کہ تیسری کوٹھڑی میں سے ظہیر کاشمیری نے چلا کر ڈرامائی انداز میں کہا ”توفیق کس حال میں ہے؟“

”شیر لوہے کے جال میں ہے!“ میں نے چلا کر جواب دیا۔

یہ فقرے صبح سے ہماری زبان پر تھے۔ کسی تھیٹر یکل ڈرامہ کے یہ ڈائیلاگ ہمارے اس قدر حسب حال تھے کہ ہم نے انہیں اپنے منشور کے طور پر اپنا لیا تھا اور تھوڑی ہی دیر میں ہر کوٹھڑی سے ”توفیق کس حال میں ہے“ اور ”شیر لوہے کے جال میں ہے“ کی صدائیں سنائی دینے لگیں مگر یہ ایک بخار تھا جو اندر سے اٹھا اور چند ہی لمحوں میں سرد ہو گیا اور پھر سناٹا چھا گیا۔ مہیب، خوفناک خاموشی طاری ہو گئی جس نے روح کو کچل کر رکھ دیا۔ میری اور غالباً سب کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ ہمیں ایک دوسرے سے جلد ملا دیا جائے، ہم سب ایک ہی کوٹھڑی کے بلیک ہول میں بند ہونے کو تیار تھے مگر یہ تین گھنٹہ کی علیحدگی مارے دے رہی تھی۔ اب ہمیں باہر رہ جانے والے دوستوں سے جدائی کا اتنا غم نہیں تھا جتنا آپس

میں بٹ جانے کا تھا..... تھوڑے سے وقفے کی خاموشی کے بعد ہم سب زمین پر لیٹے لیٹے ایک دوسرے کو آوازیں دینے لگے۔ چیخنے چلانے اور گانے لگے، اور تو اور دادا منصور بھی گانا گارہا تھا۔ جب گاتے گاتے تھک گئے تو گالیاں بکنے لگے۔ اس ماحول اور اس پابندی میں آکر جیسے سارے بند ٹوٹ گئے تھے۔

آملے سینہ چا کاں.....

تین بجے ایک ایک کر کے سب کو ٹھڑیوں کے تالے کھول دیئے گئے۔ ہم سب اپنی اپنی کوٹھڑیوں سے نکل کر ایک دوسرے سے گلے ملے۔ اس طرح ملاقات ہوئی گویا برسوں کے پھڑے ہوئے مل رہے ہیں۔ احاطہ میں ایک بہت بڑا پتیل کا درخت تھا اس کے نیچے کبل بچھا کر ہم پھر اسی طرح ایک دوسرے کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئے۔

تھوڑی سی دیر کے بعد احاطہ کا تالا کھلا پھر دروازہ کھولا گیا۔ ڈیوڑھی کا ایک نمبر دار دو مشینوں کے سر پر کچھ سامان اٹھوائے اندر داخل ہوا۔ معلوم ہوا گھر والے ہمیں سامان ضروریات کی چیزیں اور بستر وغیرہ بھیج سکتے ہیں۔ چنانچہ میرے اور ندیم کے گھر والوں نے پہل کی تھی اور ہمارا سامان ڈیوڑھی سے ہو کر پہنچ گیا تھا۔ سامان میں ہمارے بستر، کچھ کپڑے، صابن، ٹوتھ پیسٹ، سگریٹ وغیرہ وصول کر کے ہم سب نے باقاعدہ ناچ کیا مگر حیرت انگیز بات یہ تھی کہ ہم دونوں کے بستروں میں تکیے نہیں تھے۔ میرے بستر میں رات کو باندھنے کی دھوتی بھی نہ تھی۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ تکیہ سی کلاس میں رکھنے کی اجازت نہیں اور میرے گھر سے جو دھوتی آئی تھی وہ ریشمی تھی لیکن سی کلاس میں بند ہونے کی وجہ سے ہم ریشمی دھوتی بھی نہیں رکھ سکتے اس لیے تکیے اور دھوتی واپس کر دیئے گئے۔

”میں تو ہمیشہ دو تکیے رکھتا تھا“ ندیم نے روکھی آواز میں کہا۔

”چار پائی پر لیٹتے وقت تو میں بھی دو تکیے رکھتا۔ لیکن زمین پر تو تین چار تکیوں کی ضرورت ہے۔“ میں نے اسی دردناک لہجے میں کہا۔ لیکن اس سے کیا ہو سکتا تھا۔

ندیم نے تھوڑی دیر کے بعد چلا کر کہا ”تکیے کے بغیر میں تو سو ہی نہیں سکتا“۔

”کبل کے تکیے بنا لو یار“ حسن عابدی نے تجربہ کارانہ انداز سے کہا۔

سب لوگوں نے اس رائے سے اتفاق کا اظہار کیا۔

شام تک ہم لوگ اس طرح کبلوں پر بیٹھے جملہ بازی اور لطیفہ گوئی کرتے رہے جتنی بھی داستاںیں اور قصے یاد تھے ہم نے ایک دوسرے کو سنا ڈالے، اسی طرح چائے کا وقت آ گیا۔ صبح سے کسی نے چائے نہ پی تھی۔ چار بجے کے قریب افضل اور شوکت منٹو کے لیے چائے ایک گڑوی میں بھر کر لائی گئی تو ہماری ہاتھیں کھل گئیں۔ سب کے سب اپنے اپنے

کے پیالے لے کر میدان میں اتر آئے۔ مگر دو آدمیوں کی چائے سے آٹھ آدمیوں کا کیا بنتا؟ دو دو گھونٹ پی کر ہونٹ چاٹتے رہ گئے۔

ساڑھے چار بجے پھر کھانے کا شور ہوا۔ تنور کی ادھ پکی دو دو روٹیاں اور ماش کی سیاہ دال اور سیاہ سبزی پھر ہمارے سامنے تھی۔ سرسوں کے تیل کی بدبو سے دماغ پھٹا جاتا تھا مگر قوم نے کچھ نہ کچھ کھالینے کا فیصلہ کیا کیونکہ پیٹ کا دوزخ بھرے بغیر تو گزارہ نہیں ہو سکتا۔ ابھی ہم نے ایک ایک نوالہ ہی منہ میں ڈالا تھا کہ مکھن نمبردار نے اپنے کرتے کے نیچے سے دس بارہ تازہ پیاز نکال کر میدان میں رکھ دیئے۔ وہ کہیں باغیچے سے چرا لایا تھا۔ پیاز کو دیکھ کر اتنی خوشی ہوئی کہ زندگی میں کبھی اتنی خوشی نہیں ہوئی تھی۔ معشوق سے مل کر بھی اس قدر فرحت اور سکون محسوس نہیں ہوتا جس قدر جیل میں ایک پیاز حاصل کر کے ہوتا ہے۔ چنانچہ ہم نے ایک ایک پیاز ہاتھ میں لے لیا۔ ایک لقمہ منہ میں ڈال کر تیل کی سڑاند کم کرنے کے لیے تھوڑ سا پیاز کاٹ کھاتے۔ پیاز کی بوتیل کی بو پر غالب آ جاتی۔ ابھی ہم کھانا کھا ہی رہے تھے کہ احاطہ کے باہر کا تالا کھلنے کی آواز آئی۔ اس آواز سے مکھن نمبردار کا چہرہ فق ہو گیا۔ اس نے جلدی سے تمام پیاز اپنے کرتے کے نیچے چھپا لیے اور سرگوشی کے انداز میں کہا ”ڈپٹی صاحب آرہے ہیں۔“

آنے والے ہمارے انچارج اسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پال صاحب تھے۔ پال صاحب کا چہرہ سیاہ مگر دانت سفید تھے جو ہر وقت کھلے رہتے تھے۔ وہ ہنس ہنس کر باتیں کرتے جاتے اور ہمارے کھانے کو بڑی دلچسپی سے دیکھتے جاتے تھے۔ آتے ہی انہوں نے کہا ”کسی چیز کی ضرورت، کوئی تکلیف؟“

ہم نے ان کی اس بیہودہ کھانے کی طرف توجہ دلائی۔

جواب ملا ”آپ لوگوں کو حکومت نے سی کلاس میں رکھا ہے اور سی کلاس میں تو یہی کھانا ملتا ہے۔“

ہم نے بستروں میں تکیوں کا مطالبہ کیا۔

جواب ملا ”سی کلاس میں تکیہ رکھنے کی اجازت نہیں ہے.....“

ہم نے دوپہر کو الگ الگ بند کئے جانے پر احتجاج کیا۔

جواب ملا ”کیا کریں جیل کا قاعدہ ہی یہ ہے۔ ہم تو صرف اس بات پر نوکر ہیں کہ آپ یہاں سے بھاگ نہ سکیں

ورنہ آپ کی کلاس، آپ کو رکھے جانے کے طریقہ کا فیصلہ اور دوسری تمام چیزوں کے بارے میں پولیس ہی فیصلہ کر سکتی ہے۔ آپ ہمارے نہیں پولیس کے قیدی ہیں۔“

پال صاحب یہ ثرہ جانفزا سنانے کے بعد ہنستے اور قینچی کے سگریٹ پیتے ہوئے باہر چلے گئے۔ مکھن نمبردار نے

بعد میں ہمیں بتایا کہ اگر ڈپٹی صاحب کو یہ معلوم ہو جاتا کہ اس نے ہمیں پیاز لا کر دیا ہے تو اس کی نمبرداری ختم ہو جاتی اور سزا کے طور پر اسے مشقت دے کر چکی میں بند کر دیا جاتا۔

پھر وہی کج قفس

کھانے کے فوراً بعد ساڑھے چار بجے نمبردار پھر چابیوں کا گچھالے کر آیا تو ہمارے چہروں پر مردنی طاری ہو گئی۔ یہ شام چمکیلی اور زندہ شام، گرم آگ برساتی ہوئی شام اور ہمیں لوہے کے جنگلوں اور مٹی کی بے درود یواروں میں رات بھر کے لیے بند کیا جا رہا ہے؟ شام تو آتی ہے مجلس منعقد کرنے کے لیے، دوستوں سے گپ شپ لگانے، گھومنے اور آوارہ پھرنے کے لیے، شام آتی ہے کہ ہم دن بھر کے کام کے بعد اپنے پیاروں، اپنے محبوبوں اور چاہنے والوں سے ملیں۔ کچھ اپنی کچھ دنیا کی باتیں کریں۔ دل کے فسانے دہرائیں، کسی باغ میں ایک روش کے قریب پھولوں کے تختوں پر سے ہوتے ہوئے سرگوشیوں میں اپنے محبوبوں سے دل کے راز کہیں اور دنیا میں بہار کا دور دورہ ہو جائے اور کلیاں چنگ جائیں اور پھول کھلنے لگیں۔ لیکن یہ کیسی شام ہے۔ یہ کیسا بھیانک مقام ہے کہ ہم آپس میں بھی ایک دوسرے کے پاس بیٹھے نہیں رہ سکتے۔ یہ کیسے بے رحم لوگ ہیں، یہ کیسے ظالم قانون ہیں جن کی تشنگی ہمیں اپنے پیاروں، اپنے محبوبوں، اپنے عزیزوں اور اپنے دوستوں سے علیحدہ کر کے بھی ختم نہیں ہوئی.....

ہمیں ایک ایک کر کے اپنی اپنی کوٹھڑی میں داخل ہونے کے لیے کہا گیا۔ پہلے افضل بند ہوا اور اپنی بی کلاس کے لوہے کی چار پائی پردراز ہوا۔ کھٹ کھٹ! جنگلا بند ہو گیا۔ تالہ لگ گیا۔ پھر شوکت منٹوا اپنی بی کلاس کی لوہے کی چار پائی پردراز ہوا۔ پھر ندیم اپنی بی کلاس کی زمین پر لیٹ گیا۔ کھٹ کھٹ ہوئی، تالہ بند ہو گیا میرا دل ڈوب گیا۔ اس کے بعد ظہیر، منصور، غلام محمد، حسن عابدی اور میں سب کے سب تالہ بند کر دیئے گئے۔ ہم سب زمین پر چٹائیاں بچھا کر لیٹ گئے۔ دادا منصور نے کوٹھڑی میں داخل ہونے کے بعد زمین پر لیٹتے ہوئے کہا جس انجینئر نے یہ کوٹھڑیاں تعمیر کی تھیں اسے اس کی اس محنت پر انعام دیا گیا کہ اس کی کوششوں سے ان کوٹھڑیوں میں ہوا کا داخلہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔

”تاریخی طور پر یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ یہ کوٹھڑیاں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی فوج کے گھوڑوں کے لیے تعمیر ہوئی تھیں“ محمد افضل نے آخری کوٹھڑی میں چیخ کر کہا۔

ندیم نے اپنی کوٹھڑی میں سے با آواز بلند بڑھاوا دیا ”اور تاریخی طور پر آپ یہ دیکھ لیں گے کہ چھ مہینے ان کوٹھڑیوں میں بند رہنے کے بعد ہم سب لوگ گھوڑے بن جائیں گے۔“

”یاد رکھئے صبح سویرے ناشتے کے لیے چنے بھی ملتے ہیں“ حسن عابدی نے آواز بلند کی۔

غلام محمد نے کہا ”تو بھی پھر گھوڑے بننے میں کیا شک باقی رہ گیا ہے۔“

اس تھوڑی سی گفتگو کے بعد پھر خاموشی ہو گئی، سناٹا چھا گیا۔ سب چپ تھے اور اپنے اپنے خیالوں میں گم تھے۔ پوری جیل میں لوہے کی منحوس آواز گونج رہی تھی۔ کوٹھڑیاں اور بیرکیں بند ہو رہی تھیں۔ تالے لگ رہے تھے۔ سنگ و آہن کی دیواریں ایک انسان کو دوسرے انسان سے، ایک قیدی کو دوسرے قیدی سے، ایک دوست کو دوسرے دوست سے الگ کر رہی تھیں اور انسان اور قیدی شور کر رہے تھے، گالیاں بک رہے تھے۔ ان کی آوازیں ہمارے احاطے کی پندرہ فٹ اونچی بلند دیواروں کو پھاند کر ہمارے کانوں تک بھی پہنچ رہی تھیں۔ چنانچہ ہم نے بھی چیخنا چلانا اور گالیاں بکنا شروع کر دیا۔ کیونکہ سب کے سب اس گہرے سناٹے سے ڈر رہے تھے جو اس شور و غل کے باوجود ہر طرف حکمران تھا۔ وہ سناٹا، وہ پراسرار خوفناک سناٹا جو ہر کوٹھڑی کے آگے منہ پھاڑے کھڑا تھا۔ اس سناٹے اور دہشت اور کھابانے والی خاموشی اور تنہائی سے بچنے کے لیے سب چیخ رہے تھے۔

تھوڑی ہی دیر میں مکمل اندھیرا چھا گیا۔ کوٹھڑیوں میں روشنی کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ اندھیرا ہوتے ہی میری کوٹھڑی کے چاروں کونوں سے عجیب سی بھنبھناہٹ کی آواز آنے لگی۔ آہستہ آہستہ یہ مدھم آواز ایک گونج میں تبدیل ہو گئی۔ یہ چھروں کی آواز تھی جو لاکھوں کی تعداد میں ہر کوٹھڑی میں موجود تھے۔ کوٹھڑی میں لوہے کے دروازہ کے علاوہ کوئی کھڑکی یا روشندان نہیں تھا اور مٹی کی اس تپتی ہوئی سیاہ اور سنگین رات میں ہم سب کے سب چھروں کے رحم و کرم پر تھے۔ کسی نے کوئی مدافعت نہیں کی۔ کیونکہ یہ منزل ایسی تھی جہاں مدافعت کسی کام نہیں آتی۔

بہیں تفاوت راہ

باہر احاطے میں آسمان کی کھلی چھت کے نیچے چار نمبر دار تین تین گھنٹے کے لیے رات بھر پہرہ دینے کے لیے آگئے تھے۔ انہوں نے اپنے بستر جمادیئے۔ یہ چاروں نمبر دار عمر قید کاٹ رہے تھے۔ چاروں قاتل یا ڈاکو تھے مگر یہ قاتل اور ڈاکو ہماری نگرانی کر رہے تھے اور کھلے آسمان کے نیچے تازہ ہوا میں لیٹے ہوئے تھے اور ادیب اور شاعر اور فنکار، انسانی روح کے معمار کال کوٹھڑیوں میں مقید تھے۔ کوٹھڑیاں جن میں ہوا اور روشنی کا گزر ہی نہیں ہو سکتا تھا، جہاں سناٹا اور خاموشی اور بھیاں تار کی تھی۔

میں رات گئے تک جاگتا رہا۔ چھروں کی کثرت اور گرمی کی شدت نے نیند کو پاس بھی پھٹکنے نہیں دیا۔ ساتھ کی کوٹھڑی سے منصور کے کھانسنے اور بلغم تھوکنے کی آواز مسلسل آتی رہی۔ دادا منصور کھانستے کھانستے جب بیدم ہو جاتا تو اس کی

سانس چھاتی میں دھونکنی کی طرح چلنے لگتی۔ اس کی اور میری کوٹھڑی میں یہ آواز صاف طور پر سنائی دے رہی تھی۔ پھر رات گزر گئی مگر نیند نہ آئی، سخت کھر دری اور بے رحم زمین تھی اور اندھیرا تھا۔ خاموشی اور سناٹا اور پہریداروں کی کبھی کبھی آنے والی پراسرار خوفناک چیخیں سنتے سنتے دس، گیارہ اور بھر بارہ بجے مگر میری آنکھ نہ لگی، روشنی نہیں تھی، کوئی کتاب بھی نہیں تھی کہ پڑھ سکوں اس لیے چپ چاپ لیٹنے اور اپنی نئی انوکھی اور پراسرار زندگی پر غور کرنے کے علاوہ اور کوئی کام نہ تھا۔

یہ ایک بہت دور سے ایک تیز اور ہیبت ناک چیخ سنائی دی۔ یہ آواز کافی فاصلے سے آرہی تھی۔ یہ کسی عورت کی آواز تھی مگر یہ معلوم نہ ہو سکتا تھا کہ وہ رورہی ہے یا ہنس رہی ہے۔ بس ایک درد بھری لے تھی۔ اگر وہ ہنس رہی تھی تب بھی اس میں درد و کرب کی جھلک نمایاں تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا گویا یہ آوازیں رات کے سناٹے کو چیرتی ہوئی گزر رہی ہے۔ میں نے اس سے بچنے، اس کا دھیان نہ کرنے کی لاکھ کوشش کی مگر آواز مسلسل آرہی تھی۔ آخر تنگ آکر میں نے پہرے والے نمبردار کو آواز دے کر پوچھا تو اس نے جواب دیا کہ عورتوں کے پاگل خانہ سے کسی پاگل عورت کی آواز آرہی ہے..... اور یہ آواز ہمیشہ آتی رہے گی۔

بارہ بجے تک یہ کیفیت رہی کہ ذرا سی دیر کے لیے آنکھ لگتی اور پھر گھنٹہ بچنے کی آواز سے آنکھ کھل جاتی۔ دل میں یہ امید پیدا ہوتی کہ صبح ہونے والی ہے شاید چارج گئے ہیں۔ ممکن ہے پانچ بجے ہی جگھوں، مگر گھنٹہ بجاتا رہتا۔ چار تک گنتی اس امید پر ہوتی کہ صبح ہونے والی ہے مگر پھر پانچ چھ سات حتیٰ کہ گیارہ اور بارہ بجنے کی آواز سے مایوسی ہوتی کیونکہ معلوم ہوتا کہ بارہ بجے ہیں۔

امیدوں کے چراغ

صبح تین بجے تک سب لوگ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ نیند جو گرمی اور چھروں کے حملوں پر غلبہ پا چکی تھی اپنا تھوڑا سا حق وصول کر کے پھر غائب ہو گئی تھی تین بجے ہی سے ہمارے ذہنوں میں امیدوں کے چراغ روشن ہو گئے۔ تھوڑی دیر میں صبح ہو گئی۔ ہم اپنی اپنی کوٹھڑیوں سے نکل کر ایک دوسرے سے ملیں گے، ہنسیں گے، بات چیت کریں گے اور یہ بے رحم تنہائی اور سناٹا ہمارا پیچھا چھوڑ دے گا۔ مگر صبح ہونے اور ملنے میں ابھی بہت دیر تھی، ابھی رات بڑی احتیاط سے قدم بڑھا رہی تھی، ابھی تو صبح کاذب کا وقت بھی نہ ہوا تھا۔ دور کہیں سے کوئی آواز آتی تو یوں معلوم ہوتا گویا فرشتے صبح کے آنے کا اعلان کر رہے ہیں مگر یہ صبح پھولوں اور نغموں کی صبح نہ ہوگی۔ مٹی کی اس چمکیلی صبح کو آسمان نظر کے سامنے نہ ہوگا لیکن پھر بھی ہم سب کو ایک ہی انتظار تھا کہ کب صبح ہو اور کب ہم لوگ باہر نکالے جائیں۔

صبح چھ بجے کے بعد جب ہماری کوٹھڑیوں کے تالے کھلے تو ہم ایک دوسرے سے یوں ملے گویا صدیوں کے پھڑے ہوئے مل رہے ہیں۔ تیرہ گھنٹے کال کوٹھڑیوں میں گزارنے کے بعد صبح کو باہر نکلتے وقت چہل قدمی کرنے کا خیال سب سے پہلے ظہیر کا شمیری کے دل میں پیدا ہوا۔ چنانچہ وہ احاطے کی چار دیواری کے ساتھ ساتھ اپنے جسم کے اوپر کے حصے کو آگے کی طرف جھکا کر تیز تیز قدموں سے چلنے لگا۔ اس کے جسم کا اوپر کا حصہ چھجے کی طرح سامنے کی طرف جھکا ہوا تھا۔ دیوار کے آخری سرے پر پہنچ کر وہ اس طرح تیزی سے واپس مڑتا گویا کوئی چیز بھول آیا ہو۔ ہم سب لوگ تھوڑی دیر تک ٹہلتے رہے، اس کے بعد کبل بچھا کر بیٹھ گئے۔ اتنے میں نمبردار نے کوئی آدھ سیر بھنے ہوئے چنے ہمارے سامنے لا کر رکھ دیئے اور ہم نے ناشتہ شروع کر دیا۔ ”چھ مہینے تک یہ ناشتہ کرتے رہنے کے بعد ہم لوگ رہا ہونے سے پہلے ہی ہنہانا شروع کر دیں گے۔“ ندیم نے کہا۔

ظہیر کا شمیری رات بھر جاگنے، پیٹ میں درد رہنے اور گیس اور بد ہضمی کی شکایت کرنے میں مصروف تھا۔ چنے آنے سے پہلے وہ کہہ رہا تھا کہ آدھی رات کے وقت اسے یوں محسوس ہونے لگا تھا گویا کوئی اس کا سر علیحدہ کر کے لیے جا رہا ہے اور آدھی رات کے بعد اس کا دل ڈوبنا شروع ہو گیا تھا۔ مگر چنے ملنے پر اس نے کوئی بات کئے بغیر ہاتھ اور منہ چلانا شروع کر دیا۔ اس دوران اس نے صرف اتنا کہا ”چنے تو بڑے لذیذ ہیں۔“

”مگر دوستو چائے کے بغیر انتقال ہو جائے گا“ یہ ندیم قاسمی کی آواز تھی۔

چائے کی یاد سے اس سہانی صبح کو سب کے چہروں پر اداسی چھا گئی۔ سگریٹ ابھی تک موجود تھے مگر سگریٹ کے ساتھ صبح کو حاضری پر چائے کی غیر حاضری سب کو کھل رہی تھی۔ ہم نے جیل کے آفیسروں کو کئی دفعہ کہلا بھیجا کہ چائے کے بغیر ہمارا گزارہ نہیں ہو سکتا۔ چائے آج کی زندگی میں ضرورت بن چکی ہے مگر 1857ء کے بنے ہوئے قوانین کے مطابق سی کلاس کے قیدیوں کو چائے کی ضرورت نہیں ہوتی اور ہم سب سی کلاس کے نظر بند تھے اس لیے پوری قوم سگریٹ کے کش لگا کر حسرت بھری نظروں سے بیت الخلاء کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اتنی دیر میں ایک نمبردار چائے کی گڑوی لے کر دروازے میں نمودار ہوا اور پورے زور سے بولا ”چلو بھئی بی کلاسیو چائے لو اپنی چائے۔“

چائے افضل اور شوکت منٹو کی تھی مگر ہم سب اپنے اپنے پیالے لے کر گڑوی کے گرد بیٹھ گئے اور لپچائی ہوئی نظروں سے گڑوی کی طرف دیکھتے رہے۔ افضل نے سب کے پیالوں میں دو دو گھونٹ چائے کے ڈال دیئے..... ابھی پیالہ میرے ہونٹوں تک پہنچا ہی تھا کہ ندیم نے اپنے پیالے کو دادا منصور کے پیالے میں الٹتے ہوئے کہا ”دادا کو اس ضعیفی میں چائے کی ہم سے زیادہ ضرورت ہے..... اور پھر وہ عادی بھی تو بہت تھے۔“

چائے کے دو گھونٹوں کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی مگر بے کسی اور بیچارگی کے اس وقت میں اس چھوٹی سی قربانی نے منصور کے چہرے پر ایسا رنگ بھر دیا کہ خوشی اس کی آنکھوں سے چھلکنے لگی۔ اس نے کوئی بات نہیں کی مگر اس کی نگاہیں کہہ رہی تھیں کہ ندیم نے اس کو چائے کے نہیں آب حیات کے گھونٹ پلا دیئے ہیں۔ کتنی معمولی بات تھی۔ عام زندگی میں شاید ہم ایسی حرکت کبھی نہ کر سکیں لیکن اس لمحہ میں منصور کے بیمار مردہ چہرے پر خون کی جھلک نمایاں ہو گئی۔ سب نے اپنے اپنے پیالوں سے تھوڑی تھوڑی چائے منصور کے پیالے میں الٹ دی اور سب اس چھوٹی سی قربانی پر مسرور اور مطمئن نظر آتے تھے۔ ایسے موقعے زندگی میں اکثر آتے ہیں جب ہم دوستوں کی خوشیوں پر اپنی خوشی قربان کر کے مغموم نہیں بلکہ مسرور ہوتے ہیں۔ یہ بھی ایسی ہی خوشی تھی۔

قانون ہی قانون

شام تک ہمیں جیل کے بے شمار قوانین معلوم ہوتے رہے مگر قوانین کے بارے میں مختلف بلکہ متضاد آراء تھیں۔ پھر یہ بھی معلوم ہو گیا کہ کوئی قانون خواہ کتاب میں موجود ہی ہے اس کے لیے سپرنٹنڈنٹ صاحب بہادر کی منظوری ضروری ہے اور یہ منظوری اور اس کی درخواست اس وقت ہو سکتی ہے جب وہ خود ہفتہ وار راولڈ پر آئیں گے۔ اس پراؤنڈ کو جیل کی اصطلاح میں پریڈ کہا جاتا ہے۔ بہر حال ہمیں یہ معلوم ہو گیا تھا کہ ایک قانون کے مطابق ہم اپنا کھانا خود پکا سکتے ہیں۔ جیل والے ہمیں آٹا، نمک، مرچ، تیل، ایندھن وغیرہ دے دیں گے۔ گھی ہم گھر سے منگوا سکتے ہیں۔ چائے کا سامان بھی گھر سے منگوا سکتے ہیں اور اجازت ملنے پر اپنا کچن شروع کر سکتے ہیں لیکن اجازت منگل کے روز سپرنٹنڈنٹ صاحب کی پریڈ پران سے درخواست کرنے پر مل سکے گی۔ اس کے بعد ملاقات ہونے پر ضرورت کی چیزیں گھر سے منگوا سکتے ہیں اس کے علاوہ باہر کی دنیا سے ہمارا کوئی رشتہ، کوئی تعلق نہیں ہے۔ ملاقات سی آئی ڈی کے آفیسروں کی موجودگی میں ہوگی۔ خط لکھیں تو وہ خط پہلے جیل والے پڑھ کر پاس کریں گے پھر ان کو سی آئی ڈی کے دفتر میں سنسر ہونے کے لیے بھیجا جائے گا۔ وہاں سے سنسر کر کے ان کو پھر جیل میں بھیجیں گے، پھر کہیں یہ خطوط پوسٹ کئے جائیں گے اور اس طرح کم از کم دس بارہ روز لگیں گے۔

یہ جمعہ کا دن تھا۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب منگل کو اس علاقے کا دورہ کرتے تھے جس میں ہم سب مقید تھے، جمعرات کے روز ملاقاتیں ہوں گی تب جا کر شاید کھانے اور چائے کے مسائل حل ہوں۔ مگر سوال یہ تھا کہ ہم یہ چھ دن بغیر چائے اور بغیر اچھے کھانے کے کیسے گزاریں گے۔ اس امید پر کہ شاید کوئی اور صورت بھی ہو سکتی ہو ہم نے کئی بار جیل رولز کی کتاب منگوانے کی کوشش کی مگر جیل کے آفیسر ہمیں روز دینے کے لیے تیار نہ تھے بلکہ رولز مانگنے پر یہ جواب ملتا کہ سی کلاس

کے قیدی کھانا خود پکا ہی نہیں سکتے۔ پرانے نمبردار جو نوکری یا پہرہ دینے آتے ہمیں بتاتے کہ کھانا پکانے کی اجازت مل جائے گی اور یہ بھی کہ سیاسی قیدی عام طور پر کھانا خود پکاتے ہیں یا کلاس ملنے کی صورت میں مشقتی سے پکواتے ہیں۔

ہم نے ایک میٹنگ منعقد کر کے یہاں تک طے کر لیا کہ افضل اور منٹو کو مشقتی مل جائیں گے وہ ان کا کھانا تو پکائیں گے ہی، ہمارا کھانا بھی ساتھ ساتھ پک جایا کرے گا۔ یہ بڑے اطمینان کی بات تھی مگر ہمیں دانائے راز یہ بھی بتا دیتے تھے کہ ہفتہ دس دن ہمیں تنگ کیا جائے گا تا کہ ہم پر جیل والوں کا رعب پڑ جائے اور ہماری طبیعت صاف ہو جائے۔ اس کے بعد ہمیں اس طرح اجازت دی جائے گی گویا ہم پر خاص طور پر کرم کیا جا رہا ہے۔

حیرت انگیز بات یہ تھی کہ جیل کے آفیسر ہر بات کے بارے میں قانون کا حوالہ دے دیتے مگر تھوڑی دیر کے بعد قانون کو چھوڑ کر بات مان لیتے..... دراصل جیل میں کوئی قانون ہی معلوم نہیں ہوتا تھا جو جس آفیسر کی مرضی ہوتی وہ قانون بن جاتا اور ان سب آفیسروں کے اوپر جو سپرنٹنڈنٹ کی مرضی ہوتی وہ بڑا قانون تھا۔

محرومی

دو پہر تک ہمارے پاس سگریٹ بالکل ختم ہو گئے۔ اصل میں ہم پریشانی اور گھبراہٹ میں بے تحاشا سگریٹ پیتے رہے تھے۔ اس محرومی اور بے چارگی کے اندھیارے میں صرف سگریٹ ہی تو ایک رفیق تھا جس کی مشعل جلا کر ہم اپنے غم بھول جاتے تھے مگر فلک کج رفتار کو یہ بھی منظور نہ تھا۔ تین بجے بعد دو پہر جب ہمیں تین تین گھنٹے کی قید تنہائی سے نجات ملی اور ہم سب باہر نکلے تو سب کے چہرے اترے ہوئے تھے۔

محمد افضل نے بڑے اداس لہجے میں کہا ”نکوٹین کی کمی کی وجہ سے جسم ٹوٹ رہا ہے دوستو!“

اس کی بات کا کسی نے کوئی جواب نہیں دیا کیونکہ یہ اٹل حقیقت تھی۔ یہ آخری اور واحد خوشی بھی چھن گئی تھی اور دنیا تاریک نظر آرہی تھی۔ مگر آدھ گھنٹے کے بعد افضل اور شوکت منٹو کے گھر سے سامان آ گیا۔ اس سامان میں سگریٹ بھی خاصی تعداد میں موجود تھے۔ پھر مجلس منعقد ہو گئی، کبیل بچھ گیا۔ یار لوگ پھر سگریٹ پھونکنے اور جس قدر لطیفے یاد تھے، ایک دوسرے کو سنانے میں منہمک ہو گئے۔ مگر سب ایک مبہم خطرے کے احساس سے پریشان تھے۔ ایک نمبردار نے بتا دیا تھا کہ افضل اور شوکت منٹو شاید ہمارے ساتھ نہ رہنے پائیں گے کیونکہ بی کلاس کے قیدیوں کے لیے الگ جگہ بنی ہوئی ہے۔ ہم سب ایک دوسرے سے اس طرح بندھے ہوئے تھے کہ ہم میں سے کسی ایک کا الگ ہو جانا قیامت سے کم نہ تھا اور اگر یہ بلا نازل ہو جائے تو ہم کچھ کر بھی نہ سکتے تھے۔

دن اسی طرح گزرنے لگے۔ ڈاکٹر صاحب صبح شام آتے۔ ایک مشقتی سر پر سوڈا واٹر کی بوتلیں رکھنے والے

ڈبے کی قسم کا ایک بڑا سا ڈبہ اٹھائے پیچھے پیچھے ہوتا۔ اس چوکھٹے میں چھ کے قریب بوتلیں ہوتی تھیں۔ ان بوتلوں پر نمبر انیس، نمبر پچیس اور نمبر اٹھائیس وغیرہ لکھا ہوتا۔ قیدی کہتے ”ڈاکٹر صاحب پیٹ میں گڑ بڑ رہتی ہے۔“

ڈاکٹر صاحب پکارتے ”نمبر اٹھائیس پلاؤ۔“

مشقتی اٹھائیس نمبر کی خوراک دے دیتا۔

قیدی کہتے ”ڈاکٹر صاحب کمر میں درو ہے۔“

ڈاکٹر صاحب پکارتے ”نمبر انیس پی لو۔“

یہاں ہر مرض کا علاج نمبر پچیس، نمبر اٹھائیس اور نمبر بیس سے ہوتا تھا۔

دن گزرنے لگے۔ دادا منصور کے دمہ میں اضافہ ہو گیا۔ ظہیر کا شمیری راتوں کو چلاتا رہتا اور چیخا ”میرا سرا ڈ گیا۔“

ارے کوئی میرا سر لیے جا رہا ہے، میرا دل ڈوب رہا ہے۔“

ظہیر نیور سیٹھیا کا پرانا مریض تھا۔

جی ہاں! چھھر تو بہت ہیں

تیسرے یا چوتھے روز ہمیں پانچ بجے کے قریب حسب معمول کوٹھڑیوں میں بند کر دیا گیا۔ ہم سب خاموش لیٹے آنے والی زندگی کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ اتنے میں نمبر دار نے پکار کر سب کو ہوشیار کر دیا ”ڈپٹی صاحب آرہے ہیں۔“

ڈپٹی صاحب ایک ایک کمرے میں جھانک کر دیکھنے لگے۔ معلوم ہوتا تھا ہمارے رہن سہن کے طریقوں سے وہ کافی مطمئن اور مسرور ہوئے ہیں۔ چودھری احمد خاں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ ڈیوڑھی کی پہلی ملاقات کے بعد آج ہی نظر آئے تھے۔

میری کوٹھڑی کے سامنے رک کر انہوں نے پوچھا ”ٹھیک ہو؟“

”جی ضرورت سے زیادہ!“ میں نے جواب دیا۔

وہ بغیر مسکرائے پلٹ کر جانے لگے تو میں نے کہا ”ایک گزارش کر سکتا ہوں؟“

ان کے سیاہ اور سخت چہرے پر کھٹکی اور نا پسندیدگی کے آثار نظر آنے لگے مگر میں نے حوصلہ کر کے کہہ ہی دیا

کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ ہمیں رات کو باہر احاطے میں سونے کی اجازت مل جائے۔ ہم ان اونچی دیواروں اور پھرے دار

نمبر داروں کی موجودگی میں بھاگ تو سکتے نہیں۔ پھر احاطہ سے باہر نکل بھی جائیں تو جیل میں اور بہت بڑی بڑی دیواریں

ہیں.....

”سی کلاس کے قیدیوں کو باہر سونے کی اجازت نہیں ہے“ یہ مختصر جواب دے کر وہ رخصت ہو گئے۔
 ندیم کی کوٹھڑی کے سامنے رک کر انہوں نے کہا ”آپ مولانا غلام مرشد کے بھائی ہیں؟“
 ”جی ہاں!“ ندیم کی آواز آئی۔

”آپ کے ایک بھائی جیل کے محکمہ میں ہیں۔ وہ میرے ساتھ کام کر چکے ہیں۔“
 ندیم نے ذرا حوصلہ سے جواب دیا ”جی ہاں میرے بھائی جیل کے محکمہ میں بھی ہیں۔“
 ”اوہو آپ تو ہمارے اپنے آدمی ہیں، کوئی تکلیف ہو تو بتائیے۔“
 ندیم نے کچھ دیر سوچ کر جواب دیا ”اور تو سب ٹھیک ہے مگر چھبر بہت ہیں۔ رات کو سونا تقریباً ناممکن ہے۔“
 ”جی ہاں چھبر تو بہت ہیں“ یہ کہہ کر ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ احاطہ سے باہر نکل گئے۔
 آخر کار پریڈ کا دن آ گیا۔

پریڈ کے روز سپرنٹنڈنٹ صاحب کے دورے سے پہلے میڈیکل آفیسر آیا۔
 میڈیکل آفیسر شکل و صورت سے ہیڈ کلرک معلوم ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک مشقتی دوائیوں کا چوکھٹہ اور
 دوسرا کرسی اٹھائے چل رہا تھا۔

جونہی وہ کرسی پر بیٹھا ظہیر کا شمیری نے آگے بڑھ کر کہا ”ڈاکٹر صاحب میں نیور سیٹھنیا کا مریض ہوں، رات کو
 کبھی میرا سر غائب ہو جاتا ہے تو کبھی میرا دل ڈوبتا ہے۔ اس کا کچھ علاج ہونا چاہیے ورنہ میں.....“
 میڈیکل آفیسر نے بڑی بے نیازی سے کہا ”تمہارا علاج تو ہو رہا ہے نمبر پچیس کی ایک خوراک پی لو۔“
 ظہیر کا شمیری ایک قدم آگے بڑھ کر بولا ”ڈاکٹر صاحب! میں پانچ سال تک مریض رہنے کے بعد خود ڈاکٹر بن
 چکا ہوں۔ مجھے آپ نمبر پچیس کے چکر میں نہیں ڈال سکتے۔ نہ ہی آپ میرا علاج ایکو اپورا سے کر سکتے ہیں۔ کیونکہ بد قسمتی
 سے میں میڈیکل فارما کو پیا سے واقف ہوں۔ یہ مت سمجھئے کہ ہم لوگ یو پی میں رہتے آئے ہیں۔“
 تھوڑی دیر کے لیے تو ڈاکٹر بھی چکرا گیا۔ اس نے گھبرا کر پیچھا چھڑانے کے انداز میں کہا ”اچھا اچھا میں آپ کی
 بیماری کے بارے میں غور کروں گا۔“

مگر ظہیر کا شمیری پیچھا چھوڑنے والا نہیں تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر کہا ”مگر مکمل تشخیص کے بارے میں آپ کو مجھ
 سے اس بیماری کی مکمل تاریخ جانی پڑے گی.....“

”آدھ پاؤنڈ دودھ ظہیر کاشمیری کو آج سے دینا شروع کر دیجئے“ ڈاکٹر نے بھاگتے ہوئے اپنے منشی کو کہا اور احاطے سے باہر نکل گیا۔

ظہیر کاشمیری نے فاتحانہ انداز سے کہا ”تم لوگ سب نئے ہو، میں جیل میں رہنا جانتا ہوں۔ اب ہم اس دودھ کا وہی جمایا کریں گے۔ ارے اونمبر دار کوئی مٹی کا پیالہ، کوئی ٹوٹا ہوا لوٹایا کوئی اور برتن کہیں سے لا دو جس میں وہی جمایا جا سکے۔“

با ادب با ملاحظہ ہوشیار

میڈیکل آفیسر کے جانے اور سپرنٹنڈنٹ صاحب کے دورہ پر آنے کا درمیانی وقفہ جیل کے اس حصے میں قیامت سے کم نہ تھا۔ نمبردار، سپاہی، جمعدار، اسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ اور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ چکر چکر گارہے تھے اور ہوشیار رہنے کی تاکید کر رہے تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ اسٹنٹ کو، اسٹنٹ جمعدار کو، جمعدار سپاہی کو سپاہی نمبردار کو اور نمبردار قیدیوں کو با ادب اور با ملاحظہ رہنے کی تاکید کرتا تھا۔ چنانچہ ہمارا نمبردار چابیوں کا گچھالے کر آ گیا اور ہمیں اپنی اپنی کوٹھڑی میں بند ہونے کو کہنے لگا۔

ہم صبح سویرے بغیر پروگرام کے بند ہونے کو تیار نہ تھے مگر نمبردار نے بتایا کہ ”صاحب کے دورہ کے وقت سب کو بند کر دیا جاتا ہے۔“

”کیوں؟“ ہم نے چیخ کر پوچھا۔

نمبردار نے سمجھایا ”اس لیے کہ کوئی قیدی صاحب کی بے عزتی نہ کر دے، اس کے منہ پر جو تانہ مار دے یا کوئی اور شرارت نہ کر دے۔“

ہم نے لاکھ سراما کہ ہم پڑھے لکھے آدمی ہیں، ہم ادیب، شاعر اور برنگلین نوافکار ہیں مگر وہاں تو ایک ہی جواب تھا..... قانون اور سی کلاس!

ہمیں یہ بھی سمجھا دیا گیا کہ کوٹھڑی میں بند ہو کر اپنے اپنے بستر زمین پر بچھا دو، اپنے اپنے پیالے بستر پر سلیقہ سے رکھ دو کیونکہ پریڈ کا مطلب ہے صفائی دیکھنا، بستر اور برتن دیکھنا اور قیدیوں کو اگر کوئی سوال (درخواست) کرنا ہو تو وہ کہنا.....

ہمیں کوئی پونے آٹھ بجے اپنی اپنی کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا۔ باہر تالے لگ گئے۔ کوٹھڑی میں تھا بند ہونے کے بعد میں پھر شدید ذہنی کوفت، اذیت اور اداسی کا شکار ہو رہا تھا۔ میں ہی نہیں سبھی اداس، پریشان اور خاموش تھے۔ سب اس

بے عزتی کو محسوس کر رہے تھے مگر کچھ نہ کر سکتے تھے۔ کیونکہ بقول ڈپٹی احمد خاں یہ جیل خانہ تھا اور بقول نمبردار مکھن کے یہاں سب برابر ہو جاتے ہیں۔ اس نے مسکرا کر کہا تھا ”یہاں بڑے بڑے آکر ٹھیک ہو جاتے ہیں، اس لیے ضد کرنے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔“

ساڑھے نو بجے تک ہم لوگ اسی طرح بند رہے۔ ساڑھے نو بجے نمبردار میری کوٹھڑی کے سامنے آ کر بولا ”صاحب آنے ہی والا ہے۔ اپنے جوتے اتار کر میرے حوالے کر دو۔ صاحب کے سامنے ننگے پاؤں کھڑے ہونا پڑتا ہے۔“

یہ بات میرے لیے ناقابل برداشت تھی۔ میں نے جھنجھلا کر کہا ”تم نے ہمیں سمجھ کیا رکھا ہے؟“

”قیدی“ اس کا جواب مختصر مگر جامع تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے کہا ”اگر آپ ضد کریں گے تو میری پیشی ہو جائے گی اور میں نمبرداری سے توڑ کر مشقت پر لگا دیا جاؤں گا۔“

میں نے کہا ”کچھ بھی ہو میں جوتے اتارنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔“

دس بجے معلوم ہوا کہ صاحب بہادر نے دورہ کرنے کا پروگرام ملتوی کر دیا ہے۔ ہمیں سوادو گھنٹے بند رکھ کر کھول دیا گیا۔ باہر آنے پر یہ معلوم کر کے مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ جوتے نہ اتارنے کے سلسلے میں ہم سب میں حیرت انگیز یکجہتی پیدا ہو گئی تھی اور سب نے جوتے اتارنے سے فردا فردا انکار کر دیا تھا۔

باہر آنے پر ہم نے نمبردار سے پوچھا کہ ہمیں تو صاحب سے بہت سی باتوں کی اجازت لینا تھی۔ کھانا پکانے، چائے کا سامان منگوانے اور دوسری بہت سی باتوں کے بارے میں پوچھنے کے لیے ہم تو منگل کی پریڈ کا انتظار کرتے رہے تھے۔ اب کیا ہوگا؟

”اب اگلے منگل کو سہی“ نمبردار نے بڑی بے نیازی سے جواب دیا..... ”جیل میں تو کام اسی طرح ہوتا ہے۔“

ایک ہفتہ مزید جیل کا کھانا کھانے اور چائے نہ ملنے کا خیال ہی سوہان روح تھا مگر یہ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرنا چاہیے۔

یہ منگل کا دن بڑی مصیبت سے گزرا۔ صبح پریڈ نہ ہونے اور کھانے کے پروگرام کے سلسلے میں مایوسی ہونے کی وجہ سے کچھ کم کوفت نہ ہوئی تھی کہ دوپہر کے بعد ہمارا سگریٹوں کا ذخیرہ بھی ختم ہو گیا۔ سب کے چہروں پر بیزاری کے آثار نظر آ رہے تھے۔ شروع میں تو ہم نے اپنے پھینکے ہوئے سگریٹوں کے ٹکڑے جمع کر کے پی ڈالے۔ لیکن یہ ٹکڑے بھی ختم ہو

گئے۔ سگریٹ کی شمع کے بجھتے ہی جیسے زندگی کی جوت بھی باقی نہ رہی تھی۔ اس دن نہ تو جملے ہوئے، نہ ہی کسی نے کوئی لطیفہ سنایا۔ سب کے سب چپ چاپ منہ لٹکائے بیٹھے تھے اور ہر ایک کے چہرے پر ”دنیا فانی ہے“ لکھا ہوا نظر آتا تھا۔ مصروفیت اور کام کوئی نہ تھا، کتاب بھی کوئی نہ تھی جس سے دل بہلاوا کیا جاسکتا ہو۔

تھوڑی دیر کے بعد حسن عابدی نے بتایا کہ اسے جیل کی لائبریری سے سپرنٹنڈنٹ صاحب نے ایک کتاب بطور خاص حاصل کر کے دی تھی تاکہ اس کی اصلاح ہو سکے۔ ہم نے وہ کتاب فوراً منگوائی۔ یہ امام غزالی کے فلسفہ اور اقوال کا مجموعہ تھا۔ چنانچہ ہم سب نے اس کتاب کو بار بار پڑھنا اور اپنی اصلاح کرنا شروع کر دی۔ ندیم سرخیاں پڑھ رہے تھے۔ ایک سرخی تھی ”دوشیزہ کسے کہتے ہیں؟“

”آہا کیا کہا؟ دوشیزہ پھر کہنا“ ظہیر کاشمیری نے کہا۔

”اس لفظ کو دس بارہ بار دہرائیے“ یہ افضل کی آواز تھی۔

کافی دیر تک ہم سب اس کتاب کا مطالعہ کرتے رہے۔ اس کتاب میں جگہ جگہ کہا گیا تھا کہ زمین پر سونا بڑے ثواب کا کام ہے۔ کیونکہ اس طرح انسان کو قبر کا عذاب یاد رہتا ہے۔ دن بھر ہم قبر کا عذاب یاد کرتے اور اس سے ڈرتے رہے..... لیکن سگریٹ کی طلب پوری نہ ہوئی۔

امام صاحب نے لونڈیاں رکھنے اور ”امرد پرستی“ کس حد تک جائز ہے کے عنوان کے تحت کافی تفصیلی بحث کی تھی۔ ہم نے یہ بحث بھی ختم کر ڈالی اور اس کے بعد پھر سناٹا ہو گیا۔

”یار نکوٹین کی کمی کی وجہ سے میرا جسم ٹوٹ رہا ہے“ محمد افضل نے اپنا مشہور جملہ دہرایا۔

اس عظیم صداقت کے اظہار پر سب نے محمد افضل کو جی بھر کے داد دی۔ مگر سوال یہ تھا کہ سگریٹ کس طرح فراہم کئے جائیں۔ یہ تو ہمیں معلوم ہو چکا تھا کہ ہمارے جیسے نظر بندوں کی ملاقات ایک سی آئی ڈی آفیسر کی موجودگی میں ہر تیسری جمعرات کو ہو سکتی ہے لیکن جمعرات میں ابھی دو دن باقی تھے۔ یہ دو دن کیسے گزریں گے؟

بدھ پھانسی کا دن

یہ رات اسی طرح تڑپتے ہوئے گزری۔ صبح کا انتظار کرتے کرتے آنکھیں پتھرائیں مگر آج صبح ہونے پر بھی کوئی نمبردار ہمیں باہر نکالنے نہ آیا۔ چھ بج گئے، سات بج گئے، ساڑھے سات بجے جب سورج نکلے ڈیڑھ گھنٹہ گزر چکا تھا، مگر نمبردار نمودار ہوا تو میں نے چیخ کر کہا ”یہ کیا ظلم ہے، یہ کیسی زیادتی ہے کہ ہمیں دو گھنٹہ لیٹ کھولا جا رہا ہے؟“

نمبردار نے جابی گھماتے ہوئے کہا ”کوئی زیادتی نہیں، بدھ کے روز جیل کے پھانسی والے حصے میں پھانسی کی

سزا پانے والوں کو پھانسی دی جاتی ہے۔ جب تک لاش تختے سے اتار کر ڈیوڑھی سے باہر نہ نکال دی جائے اس وقت تک کسی قیدی کو کھولنے کا آرڈر نہیں ہے۔“

اس آرڈر پر ظاہر ہے ہمیں اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ ہم سب باہر نکل کر کھیل بچھا کر بیٹھ گئے۔ میں نے نمبردار سے کہا ”یار ہم لوگ احاطے میں بند ہیں پھر ہمیں کوٹھڑیوں میں بند رکھنے سے کیا فائدہ؟ جب ہم احاطے سے باہر نکل ہی نہیں سکتے، نہ ہی ہمیں عام قیدیوں سے ملنے کی اجازت ہے، تو پھر یہ پابندیاں اور زیادتیاں کرنے سے کیا حاصل؟“

مگر بے چارہ نمبردار اس کا کیا جواب دے سکتا تھا، اسے صرف ایک ہی جواب یاد تھا ”یہاں کا قانون ہی یہی ہے۔ بدھ پھانسی کا دن ہوتا ہے۔ اس دن قیدیوں کی گنتی بہت دیر سے کھلتی ہے۔“

پھانسی کے وقوعہ کے اعلان کے بعد فطری طور پر سب لوگ اس نظر آنے لگے تھے۔ ایک زندگی اور ختم ہو گئی تھی۔ ایک قتل کرنے پر ایک اور آدمی قتل کر دیا گیا تھا۔ یہ کیسے قانون اور کیسے علاج ہیں؟

تھوڑی دیر تک پھانسی کے مسئلہ اور فلسفہ پر بحث ہوتی رہی..... مکھن نمبردار اپنے بیس سالہ تجربہ کی روشنی میں جلا دوں کی قسمیں اور مختلف کڑیل جوانوں کے پھانسی کے تختے پر لٹکنے کے واقعات سناتا رہا۔ بڑے معلوماتی انداز سے اس نے بتایا کہ جیل کا جلا دتین پشتوں سے لوگوں کو مارنے پر مامور ہے، یہ اس کا خاندانی پیشہ ہے۔ ایک آدمی کو مارنے پر اسے دس روپے دیئے جاتے ہیں۔ پہلے وقتوں میں تو شراب بھی ملتی تھی مگر اب صرف دس روپے ملتے ہیں۔

”ایک آدمی مارنے پر دس روپے؟“ غلام محمد نے پوچھا۔

”ہاں اور اس کا دودھ بھی لگا ہوا ہے“ نمبردار نے حسرت سے کہا

”پھر وہ تو یہ دعا کرتا ہوگا کہ دن میں دس دس آدمی پھانسی کی سزا پائیں“ دادا منصور نے کہا۔ ”ہاں اور کیا؟“

نمبردار نے جواب دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد نمبردار نے بڑے مدبرانہ لہجے میں کہا ”اس کا کام ہی یہی ہے۔ ایک بار اسے اس کام سے ہٹا کر دوسرا آدمی رکھ لیا گیا تھا ضعیف العمر ہونے کی وجہ سے اسے صرف پھانسی گھر کی نگرانی پر مامور کر دیا گیا تھا۔ لیکن ایک روز جب ایک جوان کو تختے پر کھڑا کیا گیا اور نیا جلا دتسی کھینچنے لگا تو اس سے نہ رہا گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر نئے جلا د کو پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا ”جاؤ تم سے یہ کام نہیں ہو سکتا۔ تمہاری رسی سے جوان گھنٹوں تڑپتے رہتے ہیں۔ یہ مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتا۔ میں نے تو بڑے بڑے کڑیل جوانوں کو ایک جھٹکے سے زیادہ تکلیف نہیں ہونے دی.....“ اور اس نے واقعی ایک

ہی جھٹکے سے جوان کو ختم کر دیا.....“

بہت خوبصورت درخت ہے

باتیں کرتے کرتے ہمارے کبل پر دھوپ آگئی تو ہم نے کبل اٹھا کر پیپل کے درخت کے نیچے بچھالیا اور سایہ میں پھر جم کر بیٹھ گئے۔ یہ درخت اس ریگ راز میں نخلستان کی طرح تھا۔ جیل کی اس زندگی میں جب ہر طرف نفرت اور حقارت کے علاوہ کچھ بھی نظر نہ آتا تھا اور جب مئی کی دھوپ اور کال کوٹھڑیوں کی سیاہیوں میں جہنم کی آگ دکھتی تھی اس وقت صرف یہ درخت تھا جو ہم سب کو اپنی آغوش میں لے لیتا تھا ہم اس روز بھی اسی درخت کے نیچے بیٹھے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد نمبردار بھاگتا ہوا آیا اور پھولی ہوئی سانس سے بولا ”آئی جی صاحب جیل کے اندر آؤ یا ہے، وہ ادھر ہی آرہا ہے“ نمبردار یہ کہہ کر بھاگ گیا۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی کبھی وہ پگڑی کے پیچ ٹھیک کرتا، کبھی جوتی جھاڑتا، پھر بھاگ جاتا، پھر دوبارہ آتا اور ہمیں ہوشیار رہنے کی تاکید کرتا۔ بیچ بیچ میں یہ بھی کہتا جاتا ”یہ آئی جی صاحب ہمیشہ بغیر اطلاع دیئے آجاتا ہے۔ معلوم نہیں یہ آج کل کے آفیسر کیسے ہیں؟“

جس احاطے میں ہم لوگ بیٹھے تھے وہ لمبا بہت زیادہ تھا۔ چوڑائی دروازے کے پاس تو کچھ زیادہ تھی لیکن آخر میں بالکل ایک لکیری بن کر رہ گیا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ لمبائی کی طرف کی دونوں دیواریں اس طرح ترچھی تعمیر کی گئی تھیں جس طرح مثلث کی دو لکیریں ہوتی ہیں۔ ان دونوں دیواروں کے سامنے کوٹھڑیاں تھیں۔ دیواروں کو ترچھا تعمیر کرنے کا مقصد تھا کہ ایک دیوار کی کوٹھڑیوں میں بند ہونے والے قیدی سامنے کی کوٹھڑیوں کی قطار میں بند ہونے والے قیدیوں کو نہ دیکھ سکیں اور نہ کوئی اشارہ وغیرہ ہی کر سکیں۔ دیواریں ترچھی ہونے کی وجہ سے احاطہ کا صحن دروازے کے پاس ذرا کھلا تھا مگر آخری سرے پر جہاں پیپل کا درخت تھا اور جہاں ہم سب دن کے وقت بیٹھتے تھے یہ صحن بہت ہی کم چوڑا تھا۔

نمبردار بھاگتا ہوا اس پورے احاطے کا جائزہ بار بار لے رہا تھا۔ صفائی تو صبح ہی صبح ہو چکی تھی اس طرف سے نمبردار مطمئن تھا۔ جیل میں صفائی کا عجیب طریقہ ہے۔ صبح صبح ہر نمبردار پانچ دس مشینوں کو گھیر گھار کر اپنے علاقے میں لے جاتا ہے۔ یہ مشق جو عام طور پر حوالاتی ہوتے ہیں، بالٹیاں لے کر پانی بھرتے ہیں۔ پھر پانی فرش پر گرا دیتے ہیں، دوسرا مشق کسی پھٹی ہوئی دری سے رسی باندھ کر پانی کے اوپر سے دو چار بار پھیر دیتا ہے۔ اس عمل کو جیل کی اصطلاح میں پوچا کرنا کہا جاتا ہے۔ چنانچہ روز کی طرح آج بھی ہمارے احاطے کے فرش پر پوچا ہو چکا تھا۔ مکھن نمبردار اپنے احاطے کی صفائی کے بارے میں اپنے اطمینان کا پورے طور پر اعلان بھی نہ کرنے پایا تھا کہ باہر سے احاطہ کا دروازہ کھلا اور دس بارہ جمعدار، پانچ سات اسٹنٹ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ اور سپرنٹنڈنٹ صاحب کی معیت میں آئی جی صاحب بمعہ جیل سٹاف کے

دروازے میں سے نمودار ہوئے۔ دروازہ احاطہ کے ایک سرے پر تھا اور ہم لوگ دوسرے سرے پر تھے۔ چنانچہ ہم کافی دیر تک اس فوج کو اپنی طرف بڑھتے دیکھتے رہے۔ جب یہ سب لوگ ہمارے پاس پہنچے تو ہم اپنے کبل پر اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ایک لمحہ کے لیے مجھے یہ خیال ہوا کہ ہم لوگوں کو آئی جی سے کہنا چاہیے کہ ہمارے ساتھ یہاں پر بالکل غیر انسانی سلوک ہو رہا ہے۔ ہم گرمیوں کی جنمی راتوں میں ایسی کوٹھڑیوں میں بند کئے جاتے ہیں جن میں کوئی روشندان یا کوئی کھڑکی نہیں ہے وغیرہ۔ میں نے چپکے سے سب سے کہہ دیا۔ سب لوگ اس کے لیے تیار ہو گئے کیونکہ ہمیں اب تک یہ ہرگز یقین نہیں تھا کہ قانون جس کا حوالہ بار بار دیا جاتا ہے، ایسا سنگین ہو سکتا ہے، اور انسان کو ایسی پابندیوں میں بھی رکھا جاسکتا ہے، جس طرح ہمیں رکھا جا رہا ہے۔

آئی جی صاحب نے بڑی پسندیدگی سے سر ہلایا۔ ایک چھلکتی ہوئی نگاہ ہم سب پر ڈالتے ہوئے انہوں نے آنکھ اوپر اٹھا کر پپیل کے اس گھنے درخت کو دیکھا اور بولے ”بہت خوبصورت درخت ہے۔ بیوٹی فل ٹری انڈیڈ“ یہ فاضلانہ جملہ کہہ کر وہ پچھلے قدموں واپس چلے گئے۔

احاطہ کا دروازہ بند ہو گیا۔ ہم سب مبہوت کھڑے دروازے کو دیکھتے رہے۔ یہ عظیم آئی جی صاحب جو سارے پنجاب کے جیلوں کے بے تاج بادشاہ ہیں، درخت کی تعریف کر کے رخصت ہو گئے انہوں نے خاک میں ملتے موتیوں کی طرف توجہ نہ کی۔ انہوں نے فن اور آرٹ کے دیوانوں سے ایک بات کرنا بھی مناسب نہ سمجھا۔ انہوں نے کسی سے یہ بھی نہ پوچھا کہ ”تمہارے منہ میں کتنے دانت ہیں؟“ واہ واہ سبحان اللہ کیا آئی جی ہیں، کیا جیل ہے اور کیسی حکومت ہے جس کے یہ نمائندے ہیں اور یہ کیسا الٹا نظام ہے جس نے ہمیں اور آئی جی صاحب کو پیدا کیا اور بنایا..... یہ سوال دیر تک ہمارے ذہنوں میں گھومتے رہے۔

اسی منحوس بدھ کی شام کو، جس کی صبح دو آدمیوں کے پھانسی کے تختے پر چڑھنے سے ہوئی تھی، ہمارے انچارج اسٹنٹ پال صاحب تشریف لائے اور بولے ”شوکت منٹو اور محمد افضل دونوں بی کلاس کے نظر بند تیار ہو جائیں۔“

”کہاں جانے کے لیے؟“ ہم سب نے بیک وقت چیخ کر پوچھا۔

”یہ رموز مملکت ہیں، آپ کو نہیں بتلائے جاسکتے“ واقعی رموز مملکت ہمیں کیسے بتلائے جاسکتے تھے۔ رموز مملکت بتانے کا رواج ہوتا تو ہمیں سب سے پہلے یہ بتایا جاتا کہ ہمیں نظر بند کرنے کی وجوہات کیا ہیں اور اس کے بعد کتنی ہزاروں ایسی باتیں ہیں جنہیں پوچھنے اور معلوم کرنے کے ہم مجاز ہوتے۔ اس لیے مملکت والوں نے یہی چیزیں نہ بتانے کا بہتر طریقہ دریافت کر لیا۔

افضل اور شوکت منٹو ہمارے پاس سے چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد ہمیں یوں محسوس ہوتا تھا گویا کسی نے ہمارے جسم کے بعض حصے ہمارے جسم سے علیحدہ کر دیئے ہیں مگر بے چارگی اور بے کسی کا کچھ ایسا احساس تھا کہ ہم ایک دوسرے سے بھی کوئی بات نہ کر سکے۔ بہر حال تھوڑی دیر کے بعد ہمیں نمبر دار نے بڑے پراسرار لہجے میں بتایا کہ وہ جیل کے ایک دوسرے حصے اور نسبتاً بہتر جگہ پر چلے گئے ہیں۔ ان کی کلاس بی تھی اس لیے وہ بہتر جگہ پر رہیں گے اور ہم اسی ہی کلاس والی جگہ پر رہیں گے اور ایک بار پھر اپنی منحوس زندگی پر غور کریں گے۔ ایک اور دیوار ہمارے اور ہمارے دوستوں کے درمیان کھڑی کر دی گئی تھی۔ زندگی کتنی دیواروں میں بٹے گی؟ ابھی اور کون سا وقت باقی ہے؟ اندھیرے کی ایک اور خلیج حائل ہو گئی جس میں ہم سب موجود تھے مگر ایک دوسرے کے دل کی گہرائیوں سے ناواقف، دل کی گہرائیاں ہی نہیں ان کے وجودوں تک سے بے خبر تھے۔

بدھ کا یہ دن بڑا تاریخی دن تھا۔ اس لیے کہ شام ہی کو ہمیں یہ اطلاع بھی مل گئی کہ سپرنٹنڈنٹ صاحب نے ہمارے بار بار درخواست کرنے پر ہمیں کھانا خود پکانے کی اجازت دے دی ہے مگر شرط یہ ہے کہ ہم تمام برتن، گھی اور دیگر سامان گھروں سے منگوائیں۔ جیل والے ہمیں روزانہ مونگ کی کچی دال، نمک مرچ، سرسوں کا تیل اور اپنڈھن دے دیا کریں گے۔

اس رحمت خسروانہ سے ہم اس قدر خوش تھے گویا دونوں جہان کی دولت مل گئی ہے۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اب ہم چائے کا سامان، ڈبے کا دودھ، پتی اور شکر وغیرہ اپنے گھر سے منگوا کر چائے بھی بنا سکتے تھے مگر گھر والوں کو کیسے اطلاع دیں۔ باہر کی دنیا سے ہمارے تمام رشتے ٹوٹ چکے تھے۔ اس لیے ہم جمعرات کی ملاقات کے لیے ایک ایک لمحہ گن رہے تھے۔

ملاقات

جیل میں ملاقات کا دن عید سے کہیں بڑھ کر پیارا دن ہوتا ہے۔ اس لفظ کی شیرینی اور حلاوت سے قیدی مسحور ہو جاتے ہیں۔ جب کوئی نمبر دار یا سپاہی آ کر کسی قیدی کا نام پکارتا ہے اور ملاقات کا اعلان کرتا ہے تو قیدی دیوانہ ہو جاتا ہے۔ یہ دن کتنی امیدیں، کتنے سہارے اور کتنی یادیں لے کر آتا ہے۔ یہ سب کچھ قیدیوں کے چہروں پر صاف لکھا نظر آتا ہے۔ جن کا کوئی ملنے والا نہیں آتا وہ دوسروں کو حسرت بھری نظروں سے ڈیوڑھی کی طرف جاتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ ملاقات کی خوشی ایسی خوشی ہے جسے الفاظ میں بیان ہی نہیں کیا جاسکتا۔

میں بھی جمعرات کی صبح کو سویرے اٹھ بیٹھا۔ کوٹھڑی کا دروازہ کھلنے پر میں نے سب سے پہلے شیو کی۔ پھر نہا کر

اور کپڑے بدل کر ملاقات کے انتظار میں بیٹھ گیا۔

میرے اور ظہیر کا شمیری کے علاوہ اور کسی کو بھی ملاقات کا انتظار نہ تھا۔ کیونکہ پچھلی شام ہم نے معلوم کر لیا تھا کہ نظر بندوں سے ان کے بہن بھائی، ماں باپ اور بیوی کے علاوہ اور کوئی ملاقات نہیں کر سکتا۔ دوست احباب کا تو ذکر ہی نہیں دور کے رشتہ دار بھی ملاقات نہیں کر سکتے۔ ہم میں سے اکثر ایسے تھے جن کا کوئی قریبی رشتہ دار لاہور میں موجود نہیں تھا۔ دادا منصور کا کوئی رشتہ دار شاید اس کرہ ارض پر موجود ہی نہیں تھا یا کم از کم ہمیں معلوم نہیں تھا۔ ندیم کے بہن بھائی، بیوی اور والدہ ضلع سرگودھا کے ایک دور افتادہ گاؤں میں تھے، ان کا لاہور پہنچانی الحال تقریباً ناممکن تھا۔ خیال تھا کہ شاید ان کا بھانجا ظہیر باہر ملاقات کے لیے آئے مگر جب یہ معلوم ہوا کہ حکومت اور پولیس کا قانون بھانجے کو بھی قریبی رشتہ دار نہیں سمجھتے تو ظہیر باہر کی طرف سے بھی مایوسی ہو گئی اور ندیم چپ چاپ ایک کونے میں بیٹھ گئے۔ ان کے بہت سے عزیز لاہور میں موجود تھے مگر حکومت کا اندھا قانون ان کو عزیز ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ غلام محمد کے ماں باپ لائل پور کے کسی گاؤں میں رہتے تھے۔ انہوں نے تو آج تک لاہور شہر کی شکل تک بھی نہ دیکھی تھی۔ چنانچہ غلام محمد کو بھی ملاقات کی کوئی امید نہ تھی۔

آخر وہ ساعت بھی آ پہنچی جب احاطہ کا دروازہ کھلا اور ایک نمبر دار نے میرا نام لے کر پکارا۔ میں دیوانوں کی طرح اٹھ کر اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ اس احاطہ سے ڈیوڑھی تک کا فاصلہ کوئی آدھ میل کے قریب ہو گا مگر مجھے یہ راستہ کئی ہزار میل کا معلوم ہو رہا تھا جو کسی صورت کٹنے ہی میں نہیں آتا تھا۔

جیل کی طرف ڈیوڑھی کا جو پھانک تھا وہ کھلا اور میں ڈیوڑھی میں سے گزر کر ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کے کمرے میں داخل ہوا۔ ایک کونے میں بیچ پر میری بہن بیٹھی ہوئی تھی۔ اس ملاقات کی تکلیف ہم دونوں کو تھی مگر ہم میں سے کسی نے کوئی گلہ نہیں کیا بلکہ میں نے خوب ہنس ہنس کر باتیں کرنے اور اسے خوش کرنے کی بھی کوشش کی مگر جو کرب اور بے چینی اس کے چہرے پر نمایاں تھی وہ کیسے چھپ سکتی تھی۔

ہم ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ ملاقات کے لیے ایک گھنٹہ مقرر ہوتا ہے پہلے میں یہ سوچتا تھا کہ ملاقات کے لیے اتنا وقت بہت کم ہے مگر ملاقات کے دوران میں مجھے بار بار محسوس ہوتا تھا کہ اس اذیت کے لیے یہ وقت بہت زیادہ ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں یہ معلوم ہونے لگا جیسے ہمارے پاس کوئی بات کرنے کو باقی نہیں رہی۔ اپنی تکلیفوں کا حال میں اس کو سنانا نہیں چاہتا تھا اور اپنی پریشانیوں کا حال وہ مجھے بتانا نہیں چاہتی تھی..... پھر کیا بات کی جاتی، دھواں، تہینوں اور پریشانیوں کے علاوہ ہماری زندگیوں میں اور ہے بھی کیا۔ اگر ہم ان کا ذکر نہ کرنا چاہیں تو پھر گفتگو کے تمام دروازے بند

ہوجاتے ہیں۔

ملاقات بالآخر ختم ہوگئی اور میں جب سگریٹ، شکر، گھر کا پکا ہوا گوشت، حلو اور پرائے اٹھائے اپنے احاطہ میں داخل ہوا تو سیاست خانہ ہمارے خوشی کے نعروں سے گونج اٹھا۔ اس لیے کہ میرے گھر میں اندھیرا تھا۔ اس عظیم شہر لاہور میں، کاروں، ہوٹلوں اور بنگلوں سے بھرے ہوئے بارونق شہر میں، میری بہن ایک چھوٹے سے محلہ سنت گھر کے ایک چھوٹے سے مکان میں ہالکل اکیلی پڑی رہ گئی ہے۔ وہ بہن جو پچھلے پندرہ سال سے بیمار تھی۔ اس نے ملاقات پر مجھ سے کوئی گلہ نہیں کیا مگر اس کی پریشانی اور کرب ایسی چیزیں نہ تھیں جو اس کے چہرے سے پڑھی نہ جاسکیں اور ان کو پڑھ کر اپنی طبیعت پر قابو رکھنا مشکل کام تھا۔

ملاقات کے دوران میں نے ضرورت کی جن چیزوں کا ذکر کیا تھا وہ اگلے ہی دن گھر والوں نے بھیج دیں۔ چنانچہ جمعہ کے روز میرا اپنا سوٹ کیس احاطہ کے دروازہ میں سے نمودار ہوا۔ نمودار نے جو سوٹ کیس اٹھائے تھا، بڑے زور سے پکارا ”حمید اختر کا سامان گھر سے آیا ہے۔“ ٹرنک کھولا تو اس میں سے گھی، چائے، آلو، مرچ، مصالحہ اور برتن غرضیکہ ضرورت کی تمام چیزیں برآمد ہو گئیں۔ اس روز غالباً جیل کے آفسروں کا موڈ بھی اچھا تھا۔ اس لیے کانٹ چھانٹ بھی کم ہوئی۔ ٹرنک سر پر اٹھا کر میں دوستوں کے پاس پہنچا کیونکہ سب لوگ احاطہ کے دروازہ والے سرنے کے مقابلے میں دوسری طرف دوسرے کونے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ دروازہ سے لے کر پاران طریقت تک پہنچنے کے وقفہ کے دوران میں ان تمام چیزوں کے نام پکارتا جاتا تھا جو ٹرنک میں موجود تھیں۔ جونہی میں ان کے پاس پہنچا، ندیم نے فوراً اٹھ کر میری کمر میں ہاتھ ڈالا اور ہم نے اسی طرح سوٹ کیس سر پر اٹھائے ہوئے ناچنا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد سب کے سب اس ناچ میں شامل ہو گئے کیونکہ آج ہمیں چائے کا سامان بھی مل گیا تھا۔ چنانچہ سب سے پہلے چائے کا سامان نکالا گیا۔ چائے پکائی گئی اور ہم نے دس دن کے بعد چائے کا مزہ چکھا۔ اس دن ہم نے جی بھر کے چائے پی۔ چائے ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ ایک طرف سے کسی رفیق کی آواز آئی ”حمید اختر کے گھر والے؟“

”زندہ باد.....“ سب لوگوں نے مل کر نعرہ لگایا۔

دن گزرتے گئے۔ سیاست خانہ کی ان تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں بھی وقت کسی نہ کسی طرح کٹتا رہا جن کے متعلق مشہور تھا کہ ان کے بنانے والے انجینئر کو اس لیے انعام دیا گیا تھا کہ اس نے ان میں ہوا کا داخلہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا ہے۔ وقت ان پابندیوں کے باوجود گزر رہا تھا جن کے بارے میں کچھ نہ کہنا ہی بہتر ہے۔ جن کی وجہ جواز سمجھ میں نہ آسکتی تھی، ایسی ایسی پابندیاں جن کا کوئی مطلب یا مقصد سمجھ میں آ ہی نہیں سکتا۔ مثال کے طور پر ہمیں آگ جلانے

اور کھانا پکانے کی اجازت دے دی گئی تھی لیکن ماچس رکھنے کی اجازت نہ تھی۔ سبزی ہمیں جیل کے باغچے سے ہاتھ دہلتی تھی مگر اسے کاٹنے کے لیے چاقو یا ہلیڈ رکھنے سے منع کر دیا گیا تھا۔ شیو کا سامان رکھ سکتے تھے مگر ہلیڈ باہر چکر میں جمع کرنے پڑتے تھے جو حجامت کے وقت ہی مل سکتے تھے اس کے بعد پھر وہیں جمع کر دیئے جاتے، نتیجہ کے طور پر ہمارے ہلیڈ دن بھر منشیوں، جمعداروں اور وارڈروں کی حجامت بنانے کے کام آتے۔ جب ہم ان بے ہودہ پابندیوں کے متعلق شکایت کرتے تو ایک ہی جواب ملتا۔ وہ یہ کہ رولز یہی ہیں، اور یہ کہ یہ جیل خانہ ہے۔

بہر حال بر عظیم پاک و ہند کے اس عظیم فنکار کا سبزی کاٹنے کا منظر دیکھنے کے قابل ہوتا، لوہے کے ٹکڑے سے سبزی ٹھیک سے نہیں کٹتی تھی مگر ندیم مسکراتا ہوا روزانہ سبزی لے کر فوراً ہی کاٹنا شروع کر دیتا۔

سبزی اور وال خود پکانے اور چائے کا انتظام ہو جانے کی وجہ سے حالات کچھ بہتر ہو گئے تھے۔ مگر سب سے زیادہ تکلیف وہ امر یہ تھا کہ ہم پر ایسی پابندیاں عائد تھیں جن کی وجہ سے ہم جیل ہی کے دوسرے قیدیوں سے بھی نہیں مل سکتے تھے۔

مکھن نمبر دار ہی واحد آدمی تھا جس کا تعلق ہم سے اور جیل کی باقی دنیا سے بیک وقت تھا۔ وہ ہمیں باہر کی باتیں تو سناتا تھا مگر اس کا انداز گفتگو سخت تکلیف دہ تھا۔ وہ دن بھر ہمیں جی بھر کے بور کرتا۔ گفتگو کے دوران میں اس کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی تھی کہ ایک ہی سانس میں جملہ پورا نہ ہو۔ ایک دو لفظ بولنے کے بعد وہ رک کر سانس لیتا۔ پھر بولتا، پھر سانس لیتا۔ اتنی دیر میں ہم لوگوں کا کام تمام ہو چکا ہوتا مگر اسے اس کی پروا نہیں تھی۔

پاگل وارڈ

ہماری بیرک کیساتھ ہی آٹھ نمبر احاطہ تھا جسے عرف عام میں پاگل وارڈ کہا جاتا تھا۔ ایک روز جمعدار نے ہمارے احاطے کا دروازہ کھولا تو ایک نیم پاگل اچھلتا کودتا ہمارے احاطے میں آ پہنچا۔ سب سے پہلے اس کی نظر ندیم پر پڑی، فوراً بولا ”اھاہ آپ ہیں جناب! دیکھئے حضور میرے بتیس بچے ہیں..... میرے نہیں میری بیوی کے..... اور ان لوگوں نے مجھے جیل میں ڈال دیا ہے۔ اب میری بیوی غیر حاضری میں کسی کے ساتھ بھاگ جائے گی تو میں کیا کروں گا.....؟“

باتیں کرتے کرتے اچانک اس کی نظر ظہیر کا شمیری پر پڑ گئی۔ فوراً بولا ”اوہو حضور آپ کیا چیز ہیں؟ آپ انگریز ہیں یا فرانسیسی، روسی ہیں؟ ہندوستانی ہیں؟ پاکستانی ہیں؟ یا امریکی ہیں؟“ پھر کچھ سوچ کر بولا ”آپ کے بارے میں تو کچھ وہی بتا سکتا ہے جو ولی اللہ ہو.....“

وہ ابھی اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ جمعدار اسے پکڑ کر لے گیا۔

چند دنوں کے بعد ندیم کا سامان گھر سے آیا تو اس میں سے تاش کا ایک پیکٹ بھی برآمد ہوا۔ مجھے تاش کھیلنا نہیں آتا تھا۔ چنانچہ مجھے اس کی باقاعدہ ٹریننگ دی گئی۔ تاش آنے کے بعد سے دن بھر تاش کا بازار گرم رہنے لگا۔ ویسے تو وقت گزارنے کے لیے تاش سے بہتر کوئی مشغلہ نہیں ہے مگر جیل میں تاش کا بازار گرم رہنے لگا۔ ویسے تو وقت گزارنے کے لیے تاش سے بہتر کوئی مشغلہ نہیں ہے مگر جیل میں تاش کے کچھ اور ہی مزے ہیں۔ ہم اس خشوع و خضوع کے ساتھ تاش کھیلتے، چائے پیتے اور اس بے فکری سے لطیفے اور چٹکے بیان کرتے گویا کسی شادی بیاہ میں آئے ہوئے ہیں۔ ان مجلسوں میں صرف مکھن نمبردار کی مداخلت تکلیف کا باعث تھی۔ وہ ہر وقت اپنی گفتگو سنا تا رہتا اور سب کو بور کر دیتا۔ مجھے وہ حمید اختر کی بجائے میج اختر اور ظہیر کو بھیر کہتا۔ ایک روز سگریٹ نوشی کی کوئی بات ہو ہی رہی تھی کہ بولا ”اپنے بھیر کشمیری تو بھنگی چرسی معلوم ہوتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے باہر بھی نشہ پانی کرتے رہے ہیں۔“

ایسے ہی وقت گزرتا رہا۔ اب ہم لوگ اس زندگی کے عادی ہو رہے تھے۔ آہستہ آہستہ ہم نے جیل میں رہ کر کھانا پکانے، کپڑے دھونے اور تاش کھیلنے کے فنون میں مہارت حاصل کر لی۔ کپڑے دھونے میں سب سے پھسڈی تھا۔ مجھے یہ معلوم کر کے سخت حیرت ہوئی کہ ندیم کپڑے دھونے میں کافی مہارت رکھتے ہیں۔ دادا منصور تو خیر جیل میں سالہا سال رہ کر کپڑے دھونا سیکھ گئے ہوں گے۔ غلام محمد اور ظہیر بھی پہلے جیل کاٹ چکے تھے مگر ندیم میں یہ صلاحیت خدا داد معلوم ہوتی تھی۔ کپڑے دھونے کے بعد جب مقابلہ ہوتا تو ندیم کو اول نمبر کے انعام کا مستحق قرار دیا جاتا۔

اسی دوران میں ہم پر چند خوفناک مصیبتیں پڑیں۔ ایک روز ایک جمعدار احاطہ میں آ کر بولا ”حسن عابدی تیار ہو جائے، اس کی رہائی آئی ہے۔“

حسن عابدی کو ہم نے خوشی خوشی رخصت کیا۔ بعض لوگوں نے تو اپنے گھر والوں کو اس کی معرفت پیغام بھی بھیجے۔ مگر تھوڑی ہی دیر کے بعد ہمیں معلوم ہو گیا کہ حسن عابدی رہا وہاں نہیں ہوا بلکہ اسے جیل سے تبدیل کر کے شاہی قلعہ میں بھیج دیا گیا ہے جہاں پر پولیس والے اس سے پوچھ گچھ کریں گے۔ ہمارے پاس سے اسے اس بہانے اس لیے نکالا گیا ہے تاکہ وہ جانے سے انکار نہ کر دے اور ہم لوگ کوئی فساد برپا نہ کر دیں۔ پھر یہ بھی معلوم ہوا کہ جیل میں چونکہ نظر بندوں کو دنیا سے الگ تھلگ رکھنے کا حکم ہے اس لیے ایسے موقعوں پر ان کو اصل بات کبھی نہیں بتائی جاتی۔ ایک نمبردار نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ ”یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی کو یہ کہہ کر لے جائیں کہ اس کی رہائی آئی ہے اور جا کر پھانسی کے تختہ پر لٹکا دیں۔“

گرمی کی شدت میں اندر سونے کی وجہ سے ہم سب کی صحت خراب ہو رہی تھی۔ دادا منصور اور ظہیر کی حالت تو

کافی خراب ہو گئی تھی مگر ہم مل جل کر وقت گزار رہے تھے۔ یہ ڈر ہر وقت ساتھ لگا رہتا تھا کہ کہیں الگ الگ نہ کر دیئے جائیں۔ حسن عابدی کی جدائی بہت تکلیف دہ تھی۔ ہم سب اسے یاد کرتے اور سوچتے رہتے کہ شاہی قلعہ کی سنگین دیواروں کے درمیان اس منحنی اور مختصر لڑکے کے ساتھ معلوم نہیں کیا گزری ہے؟ قلعہ کی روایات ہی اس قسم کی ہیں کہ ان کے تصور سے انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پھر ہمارے سامنے تو ایک زندہ مثال بھی موجود تھی۔ حسن عابدی جس روز گیا تھا اسی روز ایک لڑکا رشید ہمارے احاطہ میں قلعہ سے آیا تھا۔ وہ کوئی مہینہ بھر قلعہ میں رکھا گیا تھا۔ اس کے بعد اسے سنٹرل جیل بھیج دیا گیا۔ بے چارہ دکاندار قسم کا آدمی تھا اور کسی زیر زمین رفیق کا رشتہ دار تھا۔ اس کا پتہ پوچھنے کے لیے اسے بھی سیفٹی ایکٹ میں گرفتار کر لیا گیا تھا۔ اسے سیاست سے کوئی واسطہ تھا نہ ادب سے، مگر اسے پکڑ کر انڈر ڈال دیا گیا..... قلعہ سے آنے کے کوئی چار روز بعد تک اس کی حالت یہ تھی کہ وہ بیٹھا بیٹھا روئے لگتا۔ کبھی چیختا، کبھی اپنے دکھتے ہوئے جسم کو دباتا۔ رات کو سوتے میں زور زور سے چلاتا ”مجھے مت مارو، مجھے کچھ معلوم نہیں“ یا پھر چیختا کہ ”میں نے کچھ نہیں کیا..... ہائے مار ڈالا وغیرہ“ اس نے قلعہ کی ایک مہینے کی جو سرگزشت بیان کی اسے لکھنے کی قانون اجازت نہیں دیتا۔ نہ ہی میں ابھی قلعہ میں جانے کے لیے تیار ہوں۔ مگر بہر حال اس کی حالت سے ہم حسن عابدی کے متعلق اندازہ ضرور لگا لیتے تھے اور اسی وجہ سے اس کے پھٹنے کا غم کچھ اور بھی زیادہ معلوم ہوتا تھا۔

پھانسی کی کوٹھڑیاں

چودہ نمبر بیرک، جہاں سیاست خانے سے تبدیل کر کے ہمیں بھیجا گیا تھا دراصل ان لوگوں کے لیے مخصوص تھی جنہیں سیشن کی عدالت سے سزائے موت مل چکی ہوتی ہے۔ جیل میں ملزم اس وقت تک حوالاتی کہلاتے ہیں جب تک کسی عدالت سے انہیں باقاعدہ سزا نہ مل جائے۔ عام قیدی بھی چار چار چھ ماہ کی سزا بھگتتے کے بعد جب عدالت سے سزا کا پروانہ حاصل کرتے ہیں تو اس کے بعد سے ان کی سزا شروع ہوتی ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بعض ملزم حوالات میں دس دس ماہ کاٹتے ہیں، اس کے بعد انہیں عدالت دو ماہ کی سزا سنائی جاتی ہے۔ ایسی صورت میں قیدی دراصل بارہ مہینے جیل میں کاٹتا ہے لیکن سزا اس کی دو ہی ماہ ہوتی ہے۔ پہلا عرصہ کسی گنتی میں شمار نہیں ہوتا۔

قتل کے ملزموں کے ساتھ تو اور بھی سخت برتاؤ ہوتا ہے۔ وہ جتنی دیر سیشن سپرد رہیں، اتنی دیر جیل میں آزادی سے گھوم پھر سکتے ہیں۔ مگر جو نہی عدالت انہیں سزائے موت کا حکم سناتی ہے، ان کو سیمنٹ کی پختہ کوٹھڑیوں میں بند کر دیا جاتا ہے جہاں وہ دن رات بند رہتے ہیں۔ یہ کوٹھڑیاں جیل کی اصطلاح میں کوٹھیاں کہلاتی ہیں ان کا رقبہ زیادہ سے زیادہ پچیس مربع فٹ ہوتا ہے، جہاں پھانسی کی سزا پانے والے دن رات بند رہتے ہیں۔ ان کے ورثاء کی طرف سے ہائیکورٹ میں

اہل ہوتی ہے۔ وہاں سے موت کی سزا کی توثیق ہونے کی صورت میں فیڈرل کورٹ میں اور پھر گورنر جنرل کے پاس رحم کی اپیل کی جاتی ہے۔ اس طرح یہ سلسلہ برسوں چلتا ہے۔ جب سرکاری مشینری اچھی طرح کام کرتی تھی، تب اس سارے عمل کے لیے دو چار مہینے لگتے تھے مگر آج کل اپیلیں اور فیصلے ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن دس بارہ ماہ یا اس سے زیادہ عرصہ لگنا بہت معمولی بات ہے۔ اس سارے عرصے میں یہ محرم دن رات کوٹھڑیوں میں بند رہتے ہیں۔ ان کے جسم، ان کی شکل اور ان کی عادتیں تہدیل ہو جاتی ہیں۔ ان کے چہروں پر ہلکی کی سی زردی چھائی رہتی ہے مگر وہ موت کے انتظار میں زندہ رہنے کی موہوم امیدوں میں اپنی کوٹھڑیوں میں مہینوں بند رہتے ہیں۔ چودہ نمبر بیرک بھی ایسی ہی تھی جس میں پھانسی کی سزا پانے والے رکھے گئے تھے اور جہاں ہمیں اب منتقل کیا جا رہا تھا۔

اس بیرک کا دروازہ چھوٹا سا تھا۔ سیاست خانے کے لکڑی کے دروازے کے مقابلے میں یہ دروازہ مضبوط لوہے کا بنا ہوا تھا۔ سیاست خانہ اور دوسری بیرکوں پر تالے بھی عام طور پر باہر لگتے تھے لیکن یہ بیرک اندر کی طرف سے مقفل تھی۔

ہمارا قافلہ ایک جمعدار کی رہنمائی میں اس دروازے پر پہنچا۔ جمعدار نے اس آہنی دروازے کے سوراخ میں منہ ڈال کر اندر سے کسی دوسرے جمعدار کو پکارا۔ پانچ منٹ تک تحقیق تفتیش ہوتی رہی۔ اس کے بعد دروازہ کھلا تو ہمارے اپنے جمعدار نے ہمیں اس نئے آدمی کے حوالے کر دیا۔ لیکن دروازے میں سے گزر کر اندر پہنچنے پر جو منظر ہماری آنکھوں نے دیکھا وہ اس قدر خوفناک اور غیر انسانی تھا کہ بہت دیر تک طبیعت خراب رہی۔

یہ بھی انسان ہیں

دروازے میں سے گزر کر اندر داخل ہوتے ہی ہم نے دائیں بائیں دیکھا تو ہمیں آمنے سامنے کوٹھڑیوں کی دو لمبی قطاریں دکھائی دیں جن کی تعداد اسی کے لگ بھگ تھی۔ ان کوٹھڑیوں کے سامنے لوہے کے سلاخ دار جنگلے تھے جن کے باہر بڑے بڑے قفل لٹک رہے تھے۔ کوٹھڑیوں کے دروازوں کے باہر کے چھجوں کو برآمدے کے طور پر بنایا گیا تھا اور ان برآمدوں میں جیل کے باوردی سپاہی پہرہ دے رہے تھے۔ ہر چار کوٹھڑیوں پر ایک سپاہی مقرر تھا جو ان کوٹھڑیوں کے سامنے برابر گشت کرتا رہتا تھا اس طرح یہ موت کے منتظر لوگ سیمنٹ کی بنی ہوئی پختہ اور مقفل کوٹھڑیوں میں سپاہیوں کی نگرانی میں چوبیس گھنٹے بند پڑے رہتے ہیں۔

ہم لوگ دن کے کوئی ڈھائی بجے کے قریب اس بیرک میں لائے گئے تھے۔ جون کی اس تپتی دوپہر میں ان پختہ کوٹھڑیوں میں اسی ایسے آدمی جلتے ہوئے فرش پر لیٹے ہوئے تھے جن کی زندگی کا کوئی پتہ نہیں تھا کہ کب ختم ہوتی ہے۔ ان

میں سے بہت سے ایسے تھے جنہوں نے کرتے اتارے ہوئے تھے اور صرف پاجامے پہنے ننگے فرش پر لیٹے ہوئے تھے۔ ان قیدیوں کو پاجامہ میں آزار بند رکھنے کی بھی اجازت نہیں ہوتی مہادادہ خودکشی کر لیں۔ یہ بھی بھی آنکھوں والے بے آسرا خاموش لوگ پاجاموں کو دھوتی کی طرح باندھے خلا میں گھور رہے تھے۔

ان لوگوں کی ان دورویہ کوٹھڑیوں کے بچوں ہمارا راستہ تھا۔ ہمارے دونوں طرف انسان جنگلوں میں مقید تھے۔ انسان اتنی مجبوری کی حالت میں اس سے پہلے ہم میں سے غالباً کسی نے بھی نہ دیکھا ہوگا چنانچہ ہم سب کے رنگ اڑے ہوئے تھے۔ ایک نظر ان کو دیکھنے کے بعد ہمیں دوبارہ ان کی طرف دیکھنے کی جرأت نہ ہو رہی تھی۔ ہم سب سر جھکائے موت کی اس وادی سے گزر گئے اور ہمیں ان کوٹھڑیوں کے عین پیچھے اسی طرح کی چند اور کوٹھڑیوں میں پہنچایا گیا۔ پھالسی کی کوٹھڑیوں کے روشن دان ہماری کوٹھڑیوں کے دروازوں کے بالکل سامنے تھے۔

اس نئی جگہ پہنچنے پر ہمیں جو آدمی سب سے پہلے ملا وہ شمیم اشرف ملک تھا۔ اس کی گرفتاری کی اطلاع اخبارات کے ذریعہ ہم تک نہ پہنچی تھی۔ اس نے بتایا کہ گرفتاری کے بعد وہ تین روز شاہی قلعہ میں رکھا گیا۔ اسے اسی دن وہاں سے جیل بھیجا گیا تھا۔ اس کے اس طرح ملنے سے ہم سب کو صدمہ بھی ہوا اور خوشی بھی، اس لیے کہ کسی بھی ساتھی کے گرفتار ہونے سے صدمہ ہوتا ہے مگر جیل میں پرانے دوستوں کی رفاقت کے خیال سے خوشی بھی حاصل ہوتی ہے۔

جیل رولز یا قید تنہائی

اسی شام اس بیرک کے انچارج اسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ چودھری نصر اللہ صاحب تشریف لائے تو شمیم اشرف نے ان سے شکایت کی کہ صبح سے کئی بار مانگنے کے باوجود اسے اب تک جیل رولز نہیں دیئے گئے۔ اس نے اسٹنٹ صاحب سے ایک بار پھر نظر بندوں کے رولز طلب کئے۔

اگلی صبح ایک آدمی نے جو ڈیوڑھی سے آیا تھا کہا ”شمیم اشرف کو ڈیوڑھی بلایا جا رہا ہے“ شمیم اشرف ڈیوڑھی چلا گیا۔ ایک گھنٹہ کے بعد ایک اور نمبر دار نے آکر علان کیا کہ ”شمیم اشرف کا سامان بھی ڈیوڑھی جائے گا۔“ چنانچہ اس کا ٹرنک اور بستر بھی ڈیوڑھی پہنچ گیا مگر ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ معاملہ کیا ہے۔ شمیم کہاں چلا گیا، اس کے ساتھ کیا سلوک ہوا؟ کبھی سوچتے کہ وہ دوبارہ پوچھ گچھ کے لیے قلعہ لے جایا گیا ہے کبھی خیال آتا کہ اسے لاہور جیل سے تہدیل کر کے کسی اور جیل میں بھیج دیا گیا ہوگا۔ صحیح بات کسی طور معلوم ہی نہ ہوتی تھی۔

شام کو ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ صاحب تشریف لائے تو ہم نے ان سے پوچھا ”جناب وہ شمیم اشرف صاحب کہاں

چلے گئے ہیں؟“

انہوں نے مختصر سا جواب دیا ”وہ سیاست خانہ کے پاگل وارڈ میں بیٹھا جیل روٹز پڑھ رہا ہے۔“

اگلے روز ہمیں معلوم ہوا کہ نظر بندوں کے قوانین مانگنے کے جرم میں ٹیم اشرف کو سیاست خانہ کے ایک وارڈ میں تنہا بند کر دیا گیا ہے۔ اس وارڈ میں پاگل اور جنونی قیدیوں کو رکھا جاتا تھا۔ ان کے ساتھ ٹیم اشرف کو اس لیے رکھا گیا تھا کہ اس نے قوانین مانگنے کی جرات کی تھی۔ ان قوانین میں سب سے پہلا قانون یہ تھا کہ ہر نظر بند کو اس کے مانگنے پر یہ قوانین مطالعہ کرنے کے لیے دیئے جائیں۔ اس سے اچھی طرح اندازہ ہو سکتا ہے کہ جیل کے آفیسر قوانین کی مٹی کس طرح پلید کرتے ہیں۔

اس نئی جگہ پہنچ کر ہم سب دو تین روز تک اجنبیت کے احساس تلے دبے رہے۔ یہ بات عجیب تو معلوم ہوتی ہے جیل ایک ہی تھی مگر جگہ بدلنے سے ایسا معلوم ہو رہا تھا گویا ہم کسی دوسری دنیا میں آگئے ہیں۔ ایک زندگی وہ تھی، جسے ہم جیل کی چار دیواری سے باہر چھوڑ آئے تھے، دوسری دنیا وہ تھی جو سیاست خانہ کی چار دیواری میں رہ گئی تھی اور اب یہ تیسری جگہ تھی۔ نہ معلوم اس کو چھوڑ کر کس کس کو کہاں جانا پڑے۔ اس خیال سے سب پریشان رہتے تھے۔ سیاست خانہ میں ایک مہینہ گزارنے کے بعد ہم لوگ اس کی سیاسیات سے واقف ہو چلے تھے مگر نئی جگہ کے بارے میں تو خالص اجنبیت کا احساس تھا۔ نئی جگہ پر بجلی کی روشنی نے سارے گلے شکوے دور کر دیئے ایک مہینہ تک روشنی سے مکمل طور پر محروم رہنے کے بعد پہلی بار رات کو بجلی کی روشنی نصیب ہوئی تو ہم لوگ جون کے مہینہ میں کوٹھڑی کے اندر سونے کی تکلیف تک کو بھول گئے۔ کچھ کتابیں بھی گھر سے آگئی تھیں اس لیے ہم لوگ رات کو دیر تک پڑھتے لیکن مصیبت یہ تھی کہ کتابیں بہت ہی کم تھیں۔ کتابوں کو گھر سے ہم تک پہنچنے میں بڑی منزلیں طے کرنا پڑتی تھیں۔ قاعدہ کے مطابق کتابیں ڈیوڑھی میں جمع ہوتیں، پھر سی آئی ڈی کے دفتر میں سنسر کرانے کے لیے بھیج دی جاتیں، پھر واپس جیل کی ڈیوڑھی میں آتیں تب کہیں جا کر ہمیں ان کا منہ دیکھنا نصیب ہوتا اس سلسلے میں قانون جو کچھ بھی تھا اس میں وقت کی کوئی حد مقرر نہیں کی گئی تھی۔ یعنی ڈیوڑھی میں جمع ہو جانے کے بعد جیل والوں پر کوئی ایسی پابندی نہیں ہے کہ وہ کتنے روز میں ان کو سنسر کرانے کے لیے بھجوائیں ایسا بھی ہوا کہ ہفتہ ہفتہ بھر کتابوں کے پلندے جیل ہی میں پڑے رہے۔ پھر سی آئی ڈی کے پاس پہنچنے کے بعد ان پر بھی کوئی پابندی نہیں ہے۔ وہ چاہے جب تک رکھ چھوڑیں بہر حال کتابیں کم تھیں مگر ہم نے انہیں بانٹ کر باری باری پڑھنا شروع کر دیا۔ دو چار روز کے بعد ڈاکٹری رپورٹ کی وجہ سے ہمیں رات کو باہر سونے کی اجازت بھی مل گئی۔ لیکن پھانسی والوں کے قرب کی وجہ سے ذہنی اذیت کس طرح بھی کم نہ ہوتی تھی۔

شام ہوتے ہی پھانسی والے چلا چلا کر ایک دوسرے کو پکارتے جو نئی شام کے سائے گہرے ہوتے اور شام کا

جادو چاروں طرف پھیل جاتا، پھانسی والوں کی بے چینی بڑھتی ہوئی نظر آتی۔ ان کی روح کی بے چینی اور ان کا اضطراب ان کی آوازوں سے صاف جھلکتا تھا۔ ان کی گفتگو عام طور پر ایک ہی قسم کی ہوتی تھی، ان میں سے کوئی ایک اپنی کوٹھڑی میں بیٹھے بیٹھے چلا کر پکارتا ”اوائے خیر اوائے“ ”اوائے جی اوائے“ جواب ملتا

”السلام علیکم! کیا حال ہے؟“

”شکر ہے، اللہ رحم کرے گا، اللہ کوٹھی توڑے گا۔“

”آمین! آمین۔“

ان جملوں میں زندہ رہنے اور موت کی اس تاریک وادی سے بچ نکلنے کی ایک لرزتی ہوئی امید اور آس کے ساتھ ہی موت کا خوف اور مایوسی کا تسلط بھی ہوتا۔ یوں معلوم ہوتا تھا گویا یہ لوگ ان باتوں کے علاوہ کوئی دوسری بات کہہ ہی نہیں سکتے۔ وہ لیٹے لیٹے جب ناامیدی کے خوف سے گھبراتے ہیں تو اپنے ہی وسوسوں کو دبانے اور ان سے نجات پانے کے لیے زور زور سے چلا کر خدا کے رحم کا اعلان کرتے ہیں اور اپنے آپ کو دھوکہ دیتے ہیں۔

شروع میں ہم لوگوں کی گفتگو کا موضوع یہی لوگ تھے۔ ہم سوچتے تھے کہ ان میں اکثر ایسے ہوں گے جنہوں نے واقعی قتل کئے ہوں گے، ایسے بھی ہوں گے جو بے گناہ پکڑے گئے۔ کیونکہ قانون اور انصاف کا جو معیار ہمارے ہاں موجود ہے اس میں ہر قسم کے امکانات ہیں لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت ہر آدمی محسوس کرتا تھا کہ انسان کا یہ حشر بڑا ہی ذلت آمیز، بڑا ہی دردناک اور ناقابل برداشت ہے۔

معمولات

دو چار روز کے بعد ہم نے اپنے آپ کو نئے حالات کے مطابق ڈھال لیا۔ زندگی پھر ایک معمول پر آگئی پھر یہ معلوم ہونے لگا گویا ہم ہمیشہ سے اسی جگہ پر اسی طرح رہ رہے ہیں۔ ندیم کی کوٹھڑی میں ہم لوگ صبح سویرے کبل بچھا کر تاش کھینے بیٹھتے تو پھر شام ہی کو اٹھتے۔ تاش کے نمبر کونلہ سے دیوار پر لکھتے لکھتے دیوار کی حالت اس قسم کی کر دی گئی کہ اصل دیوار نظر ہی نہ آتی تھی۔ دن بھر تاش بازی، لطیفہ بازی، اور چٹکلہ بازی ہوتی رہتی۔ اس بظاہر مطمئن زندگی میں ہم لوگوں کو باہر چھوڑے ہوئے لوگوں کے مقابلہ میں ان لوگوں کی یاد زیادہ ستاتی جو اسی جیل میں موجود تھے مگر ہم سے علیحدہ تھے۔ ایک جیل میں اتنی جیلیں ہوتی ہیں، اس کا تجربہ ہم میں سے کسی کو نہ تھا۔ افضل، شوکت منٹو اور بعض دوسرے رفیق ہماری بیرک سے زیادہ سے زیادہ پچاس گز کے فاصلے پر تھے مگر راستے میں دیواروں کے جال بچھے ہوئے تھے۔ ہم اپنے احاطہ سے قدم باہر نہیں رکھ سکتے تھے۔ اسی طرح وہ بھی ہمارے پاس نہیں آسکتے تھے۔ دادا منصور اور ظہیر ہسپتال میں تھے۔ ہسپتال بھی ہم

سے چند قدم کے فاصلہ پر تھا مگر راستے میں مٹی، آئین اور قانون کی دیواریں حائل تھیں، ایک ہی پابندی کے ساتھ ہزار پابندیاں اور ایسی تھیں جن کا احساس ہی تکلیف دہ تھا۔ ہنتے ہنتے جب گفتگو کے دوران ان دوستوں کا ذکر آ جاتا تو ہم سب کے چہروں پر مردنی سی طاری ہو جاتی۔

اس زمانہ میں سب سے زیادہ انتظار ملاقات کا رہتا تھا۔ پندرہ روز کے بعد جمعرات کو ملاقات کا دن آتا تو ہمارے ادا اس احاطے اور ویران زندگی کے آنگن میں بہار آ جاتی۔ باہر کی پیاری اور خوبصورت دنیا سے آنے والے عزیز قیدیوں کے لیے کیسی بہاریں، کیسی خوشبوئیں اور خوشیاں لاتے ہیں۔ اس کا اندازہ کچھ قیدیوں ہی کو ہوتا ہے۔

ملاقات کے دن ملاقات کے منتظر لوگ صبح اٹھ کر شیو کرتے، نہاتے اور پھر بلاوے کا انتظار کرنے بیٹھے رہتے، یہاں پر ہمارے ساتھ میلارام کاشن ملز یونین کے صدر اور سیکرٹری نسیم اور صدیق بھی رکھے گئے تھے۔ وہ ہم لوگوں کے گرفتار ہونے سے مہینہ بھر پہلے گرفتار ہو کر آ گئے تھے۔ ان میں سے صرف صدیق کی ملاقات ہوتی تھی۔ ہم میں سے رشید اور میں ملاقات کرنے جاتے کیونکہ ندیم اور غلام محمد کے عزیز لاہور میں نہیں تھے۔

چودہ نمبر بیرک میں آنے کے چند روز بعد رمضان کا مہینہ شروع ہو گیا۔ صدیق اور نسیم دونوں باقاعدہ روزہ رکھتے تھے لیکن روٹیاں سب کو رات کے دو بجے ہی مل جاتی تھیں۔ جس کا جی چاہے رات کو کھالے، جس کا جی چاہے صبح یا اگلے روز دوپہر کو کھائے۔ دوپہر تک رکھے رہنے کے بعد اگرچہ یہ روٹیاں اس قدر شوکھ جاتیں کہ کھانے کے قابل نہ رہتیں مگر ہم لوگ مجبوراً اپنے حصے کی دو دو روٹیاں رات کو دو بجے لے لیتے اور اگلے دن دوپہر کو کھاتے۔

کھانے اور چائے کا انچارج یہاں پر بھی غلام محمد تھا غلام محمد کسان ہے اور کسان والی وسیع القلمی اس میں بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ وہ کھانا بنانے میں سارا کام خود کرتا۔ پھر سب کو حصے کے مطابق دیتا۔ سب کی ضروریات اور عادات تک کا خیال رکھتا۔ اس کو معلوم ہوا کہ مجھے صبح سویرے اٹھتے ہی چائے نہ ملے تو میری طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ چنانچہ وہ صبح کو سب سے پہلے اٹھتا، چائے بناتا، پھر چائے کی کیتلی لے کر میرے بستر پر آ کر بیٹھتا اور آواز دیتا ”اٹھو بھی حمید اختر! چائے تیار ہے“ جب تک وہ ساتھ رہا اس کا یہی معمول رہا۔ کھانا ہم لوگ ہمیشہ ندیم کی کوٹھڑی میں کھاتے تھے۔ شام کی چائے بھی وہیں پیتے لیکن صبح کی چائے کے لیے غلام محمد ہمیشہ میرے کبل پر پہنچ جاتا اور سب کو اپنی اپنی جگہ سے اٹھ کر وہیں آنا پڑتا۔ سگریٹ ہم لوگ ندیم کے پاس جمع کر دیتے اور راشن کے مطابق ان سے وصول کر کے پیتے تھے۔ سب سے بڑی مصیبت کپڑے دھونے کی تھی۔ مجھے کپڑے دھونے کے فن سے ذرا سی بھی واقفیت نہ تھی بہت دفعہ کوشش کی مگر کپڑے کی میل کسی طرح کپڑے کا پیچھا ہی نہ چھوڑتی۔ اس معاملہ میں بھی ندیم نے حیرت انگیز قابلیت کا ثبوت دیا۔ وہ کپڑوں کا

ڈھیر لگا کر باقاعدہ چھو اچھو کرتے اور پلک جھپکنے میں دھلے ہوئے کپڑے دیواروں پر لٹکتے نظر آتے۔ اس سلسلہ میں میں نے ان کی باقاعدہ شاگردی بھی کی مگر کچھ حاصل نہ ہوا۔ بلکہ بعض اوقات جب شاگرد کپڑوں میں الجھا ہوتا تو استاد آ کر اس کو اس مصیبت سے بچاتا۔

ایک آواز

چند دن گزر گئے۔ ایک روز پھانسی کی کوٹھڑیوں سے ایک عجیب درد بھری آواز سنائی دی۔ اس آواز کا کوئی نام نہیں رکھا جاسکتا تھا۔ گانے والا کیا کہہ رہا ہے، یہ بھی سمجھ میں نہ آتا تھا بس ایک درد تھا جو آواز کے ساتھ ہی چاروں طرف جیسے بکھر سا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد یہ آواز پھر سنائی دی۔ اس کے بعد تو صبح شام دوپہر، ہر وقت یہ نغمہ گونجتا، یہ آواز اتنی بلند، اتنی پر اسرار اور درد بھری ہوتی تھی کہ اسے سنتے ہی ہم لوگ اپنی گفتگو بند کر دیتے۔ کھانا کھانے کے دوران آواز سنائی دیتی تو ہمارے چلتے ہوئے ہاتھ رک جاتے۔ اس کا جادو اتنا عجیب، اس قدر غمگین اور پر اسرار تھا کہ یہ بلند آواز جہاں تک پہنچتی سناٹا طاری ہو جاتا۔ خاموشی چھا جاتی۔

چند روز کے بعد پوچھ گچھ کرنے پر ہمیں معلوم ہوا کہ گانے والا جھنگ کے ضلع کا ایک نوجوان ہے جس کی تمام اپیلیں مسترد ہو چکی ہیں اور جو موت کے دروازہ پر کھڑا صرف مقررہ تاریخ کا انتظار کر رہا ہے۔ اس پس منظر میں اس کی آواز اور بھی ڈراؤنی اور دردناک معلوم ہونے لگی۔ وہ ایک ہی ٹپ گاتا تھا۔

عیلی عیلی نام سوہنا سوہنے پیر دا ای

باہو بوہڑ سخیا ویلا بھیڑ دا ای

موت کے دروازہ پر پہنچ کر انسان میں کتنا غنا، کتنا سوز اور کتنا درد پیدا ہو جاتا ہے یہ اندازہ شیرے کی آواز سن کر کیا جاسکتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا درد کا ایک ابلتا ہوا چشمہ ہے جو اس کے اندر سے اپنے آپ نکل رہا ہے۔ کھانا ہم اب بھی شام کے پانچ بجے ہی کھا لیتے کیونکہ ہمیں لنگر سے جو روٹیاں ملتی تھیں وہ تھوڑی دیر بھی رکھے رہنے کے قابل نہ تھیں۔ پھر اگرچہ ہم لوگ باہر سوتے تھے لیکن غروب آفتاب کے بعد ہمیں اپنی اپنی جگہ سے ہلنے یا گھومنے پھرنے کی اجازت نہ تھی۔ کھانا کھانے کے بعد ہم لوگ اسے ہضم کرنے کے لیے تھوڑی دیر ٹہلتے ضرور تھے۔ ندیم ٹہلنے کے معاملہ میں ہمیشہ اعتراض کرتے تھے۔ ایک روز میں نے ان کو پورا لیکچر دے کر ٹہلنے اور کھانا ہضم کرنے کے فلسفہ کا قائل کیا اور شام کو کھانے کے بعد انہیں گھسیٹ کر اپنے ساتھ ٹہلنے پر مجبور کر دیا مگر احاطہ کا ایک ہی چکر لگانے کے بعد کیا دیکھتا ہوں کہ ندیم صاحب کمر پر بیٹھے ہوئے کچھ پڑھ رہے ہیں۔ میں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگے ”مونگ کی دال ہضم کرنے کے

لیے بس ایک ہی چکر کافی ہے۔“

ایک شام ہم دونوں تیز تیز قدموں سے احاطہ کا چکر لگا رہے تھے۔ ادھر ادھر کی باتیں بھی کرتے جاتے تھے۔ میں نے اس سے کہا ”میرے والد کا انتقال میرے بچپن ہی میں ہو گیا تھا اور میری پرورش میرے تاؤ کی نگرانی میں ہوئی تھی۔“

”اچھا!“ ندیم نے کہا ”میرا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے میرے چچا جو میرے نگران تھے، انگریز کی طرز کے بال نہیں رکھنے دیتے تھے اور ہم اگر کبھی بال بڑھا کر کڑوا لیتے تو ان کے سامنے بالوں کو تولیہ میں چھپا کر جایا کرتے تھے۔“

”ارے!“ میں نے تقریباً چیخ کر کہا ”میرے تاؤ بھی بالکل یہی کرتے تھے۔ بلکہ انہیں اگر یہ معلوم ہو جاتا کہ خاندان میں سے کسی نوجوان نے انگریزی طرز کے بال رکھ لیے ہیں تو وہ حجام کو بلا کر زبردستی بال کٹوا دیتے۔ زبردستی نہ ہو سکتی تو سوتے میں کٹوا دیتے۔“

تھوڑی دیر تک ٹہلنے کے بعد میں نے کہا ”میرے تاؤ بڑے نیک آدمی تھے۔ دن بھر تسبیح ہاتھ میں لیے دیوان خانہ کے باغیچے میں ٹہلتے رہتے تھے اور رات رات بھر نفل پڑھتے تھے۔“

ندیم نے حیرت سے چیختے ہوئے کہا ”ارے بھئی میرے چچا بھی بالکل اسی قسم کے نیک بزرگ تھے۔“

”حیرت ہے“ میں نے کہا ”میرے تاؤ نے شیرازی کبوتر پال رکھے تھے اور بندریا بھی رکھی ہوئی تھی جس کا نام ”بدھاں“ تھا۔“

”بھئی حد ہو گئی“ ندیم نے کہا ”میرے چچا نے بھی ایک بندریا پال رکھی تھی اس کا نام بھی کچھ اسی قسم کا تھا۔“

ان انکشافات کے بعد ہم لوگ دل کھول کر ہنسے۔ ہم نے بڑی گرمجوشی سے مصافحہ کیا اور گلے بھی ملے اور دیر تک ہنستے رہے۔

جولائی کے پہلے ہفتے میں اسی چودہ نمبر بیرک میں عید کی آمد کا پتہ بھی چلا۔ ہم نے جیل کے آفسروں سے بار بار درخواست کی کہ عید کے روز ہم نظر بندوں کو ایک ساتھ نماز پڑھنے کی اجازت دی جائے ہم دوسرے قیدیوں سے نہیں مل سکتے تو کم از کم عید کے دن ہمیں افضل اور شوکت منٹو وغیرہ کے ساتھ عید تو پڑھ لینے دیجئے۔

جب یہ درخواست نامنظور ہوئی تو ہم نے یہ بھی کہا کہ ہمیں دوسرے عام قیدیوں کے ساتھ مل کر عید کی نماز پڑھنے کی اجازت دی جائے لیکن اس کی منظوری بھی نہیں ملی اور عید کے دن جب ہماری اسلامی مملکت کی اس جیل کے تمام اخلاقی مجرم ایک مولوی صاحب کے پیچھے ایک جگہ جمع ہو کر نماز پڑھ رہے تھے، گلے مل رہے تھے، ہم ادیب اور شاعر جو کسی جرم میں نہیں آئے تھے، پھانسی والوں کی کوٹھڑیوں کے پیچھے کبل بچائے چپ چاپ سر جھکائے بیٹھے تھے۔ اس کسمپرسی میں

اپنے علاوہ ہر آدمی اپنے ان عزیزوں کے بارے میں سوچ رہا تھا جو جیل سے باہر گھروں کی چار دیواریوں میں اسی طرح بیٹھے ہمیں یاد کر رہے ہوں گے۔

بیس بائیس جون کی شام کو جیل کے دفتر سے ایک نمبر دار ایک چٹ لے کر آیا۔ یہ چٹ خاص جیل کی زبان میں لکھی ہوئی تھی۔ لکھا تھا ”احمد ندیم قاسمی کو اے کلاس میں شمار کریں اور اسے بی کلاس کا کھانا اور چارپائی وغیرہ دی جائے۔“ یہ تو آج تک معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ اے کلاس دے کر بی کلاس کا کھانا دینے کی ہدایات کیا معنی رکھتی تھیں، بہر حال ندیم کو اے کلاس ملنے کی ہم سب کو خوشی تھی مگر ساتھ ہی ساتھ یہ خطرہ بھی تھا کہ ان کو ہم سے الگ کر کے افضل اور منشا اور دوسرے بی کلاس والوں کے ساتھ نہ بھیج دیا جائے۔

اگلی صبح ندیم کے لیے بی کلاس والوں کے لنگر سے چائے آئی، دوپہر کو پکا ہوا گوشت اور توڑے کی چپاتیاں بھی آ گئیں۔ گوشت چکھے ہوئے ایک مدت گزر چکی تھی اس لیے سب نے تھوڑا تھوڑا گوشت چکھا اور خدا کا شکر ادا کیا۔ شام کو چارپائی بھی آگئی جو چارپائی کم اور جھولا زیادہ تھی۔ بستر بچھا کر جب ندیم اس پر لیٹنے کی ٹرائی کرنے لگے تو ان کی کمر زمین تک پہنچ گئی مگر وہ اس قدر خوش تھے کہ پہلی رات خوشی کے مارے ان کو نیند نہیں آئی۔ رات بھر پکارتے رہے کہ ”دیکھ رہے ہیں آپ لوگ میں آج چارپائی پر لیٹ رہا ہوں۔“

دو دن کے بعد وہی ہوا جس کا خطرہ تھا۔ شام کو چیف ہیڈ وارڈرنے آ کر کہا ”چلو بھئی بی کلاس کون ہے، اپنا سامان باندھ کر بی کلاس والوں کے ساتھ چل کر رہنے کی تیاری کرو۔“

جیل کی اس ڈیڑھ دو ماہ کی زندگی میں میرے لیے غالباً یہ سب سے بڑا صدمہ تھا۔ ندیم اگرچہ بہتر جگہ پر جا رہے تھے۔ لیکن کمپنی چھوٹ جانے کی وجہ سے وہ مجھ سے بھی زیادہ پریشان تھے۔ اس سارے عرصے میں ندیم، غلام محمد اور میں ہر وقت ساتھ رہے تھے۔ ہماری طبیعتیں بھی بہت ملتی تھیں اس لیے ہم نے یہ عرصہ بہت اچھی طرح سے گزارا تھا مگر اس مجبوری میں کوئی بھی کچھ نہ کر سکتا تھا اس لیے ہم نے ندیم کو رخصت کیا۔ اگلے روز کسی نہ کسی طرح معلوم ہو گیا کہ شمیم اشرف ملک کو بھی بی کلاس مل گئی ہے اور وہ ندیم وغیرہ کے ساتھ وہاں پہنچ گیا ہے۔

اسی شام دادا منصور اور ظہیر کا شمیری ہسپتال سے منتقل ہو کر ہمارے ساتھ آ گئے جس سے ندیم کے جانے کا غم کچھ کم ہوا لیکن ان کے جانے کے بعد تاش کھیلنے کا مزہ تو بالکل جاتا رہا۔ ظہیر اور دادا ہسپتال میں ایک مہینہ سے زیادہ عرصہ رہ کر واپس آئے تھے مگر انہیں دیکھ کر یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ لوگ علاج کرانے کے لیے نہیں بلکہ مزید بیماری مول لینے کے لیے ہسپتال بھیجے گئے تھے ان کے چہرے اڑے ہوئے تھے اور دونوں ہی بہت کمزور دکھائی دیتے تھے۔

رخصت اے ہم سفر و

جولائی کا مہینہ سخت گرمی کا تھا مگر ہم نے گرمی برداشت کرنے کی عادت ڈال لی تھی اور کسی نہ کسی طرح وقت پورا کر رہے تھے، کبھی کبھی ہم ”پسماندگان“ بیٹھ کر ندیم، افضل اور شمیم کی باتیں کرتے۔ وہ لوگ ہم سے اتنے قریب ہوتے ہوئے بھی کتنے دور تھے فاصلہ تو کچھ بھی نہ تھا، چالیس یا پچاس گز مگر ان کے اور ہمارے درمیان دیواروں، لوہے کے جنگلوں اور تالوں کا جال بچھا ہوا تھا۔

پابندیوں کی ایسی بھی بہت سی دیواریں تھی جو دکھائی نہ دیتی تھیں مگر محسوس کی جاسکتی تھیں۔ ہم صرف حسرت بھری نظروں سے اس طرف دیکھتے اور شام کو ٹھلنے کے دوران ادھر اشارے کرتے اور ان کا نام لے لے کر پکارتے۔

یہ صدمہ اور یہ اذیت ہی کچھ کم نہ تھی کہ ایک شام چیف وارڈر ڈیوڑھی سے ایک پرچی لے کر آ گیا جس پر لکھا تھا کہ دادا منصور اپنا سامان لے کر ڈیوڑھی پہنچ جائیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ معاملہ کیا ہے۔ نظر بندوں کو ان باتوں کے بارے میں کچھ بتایا ہی نہیں جاتا۔ انہیں اس طرح دنیا سے الگ کر کے رکھا جاتا ہے جیسے ان کا کبھی دنیا سے کوئی تعلق ہی نہیں تھا۔ دادا کی تشویشناک بیماری کی وجہ سے ان کی رہائی کا خیال بھی ہو سکتا تھا مگر یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ اس لیے ہم نے بڑے تذبذب، پریشانی اور بھرے ہوئے دل کے ساتھ دادا کو رخصت کیا۔ ہمیں کچھ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں اور کیوں جا رہے ہیں؟

اگلی شام ہم لوگ بیٹھے دادا کی جدائی اور ان کی قسمت کے بارے میں سوچ بچار کر رہے تھے کہ وہی منحوس چیف وارڈر پھر نمودار ہوا۔ پرچی اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس بار وہ غلام محمد و بمعہ اس کے ٹرنک اور بستر کے ڈیوڑھی لے گیا۔ غلام محمد کے جانے کے بعد تو ہماری طبیعت صاف ہو گئی کیونکہ چائے اور کھانا پکانے میں اسی کو مہارت حاصل تھی۔ اس کے جانے کے بعد مجھے آگ سلگانی پڑتی۔ کیونکہ ظہیر کا شمیری کو ان چھوٹے چھوٹے دنیاوی معاملات سے کوئی واسطہ نہ تھا وہ دن بھر اپنی بیماری اور اس کے ذکر میں مست رہتا۔ میں چولہا جھونکتا اور چلا چلا کر کہتا ”اوائے غلام محمد توں کتھے گیاں ایں اوائے۔ میں مر گیا۔“

یہ تو اندازہ ہو گیا تھا کہ ہم سب کو الگ الگ جیلوں میں تبدیل کیا جا رہا ہے، اس لیے غلام محمد اور منصور کے جانے کے بعد ظہیر اور میں اپنی باری کا انتظار کرنے لگے۔ ادھر ملاقات کا انتظار بھی تھا۔ غلام محمد چودہ جولائی کو گیا تھا، ملاقات کی جمعرات 19 جولائی کو پڑتی تھی۔ خدشہ یہ تھا کہ اگر ملاقات سے پہلے لاہور سے کسی اور ضلع کی جیل میں تبادلہ ہو گیا تو سگریٹ، گھی، چینی، دودھ اور دوسری ضروریات کا کیا ہوگا کیونکہ یہ تمام ایسی چیزیں تھیں جن کے بغیر گزارہ ہونا بالکل ناممکن

تھا اور یہ چیزیں اب بالکل ختم ہو رہی تھیں۔ ملاقات پر ہی ان کے ملنے کی امید ہو سکتی تھی۔ تبادلہ ملاقات سے پہلے ہونے کی صورت میں میری حالت تو بہت بری ہو سکتی تھی اس لیے کہ کچھ پتہ نہیں تھا لاہور سے کوئی عزیز کتنے دنوں میں میرے پاس پہنچ سکے گا۔ یہ خیال بھی تھا کہ ملاقات لاہور ہی میں ہو جائے تاکہ اپنی بہن کو بھی اس امکانی خطرے سے آگاہ کر دوں ورنہ اسے سخت صدمہ ہوگا۔ اسی کشمکش میں پندرہ تاریخ گزر گئی۔ اس شام کسی کو لینے کے لیے ڈیوڑھی سے کوئی آدمی نہ آیا۔ سولہ اور سترہ تاریخ بھی گزر گئی۔ میں نے سوچا مجھے لاہور ہی میں رہنے دیا جائے۔

18 کی شام کو میں اگلے روز ہونے والی ملاقات کے تصور میں خوش بیٹھا تھا کہ موٹا چیف وارڈر پھر نمودار ہوا۔ اسے دیکھتے ہی ہم سمجھ گئے کہ آج کسی اور کی باری ہے۔ وہ بھی سمجھ گیا تھا اور مسکرا رہا تھا۔ پاس آ کر کہا اس نے کہا ”چلو بھئی حمید اختر کون ہے؟ سامان باندھو اور چلنے کی تیاری کرو۔“

ملاقات سے صرف ایک رات پہلے تبادلہ ہونے کی وجہ سے دل پر قیامت گزر گئی۔ کہاں یہ خیال تھا کہ صبح اپنی بہن اور عزیزوں سے ملوں گا کچھ دنیا جہان کی باتیں معلوم ہوں گی، کچھ کھانے پینے کا سامان ملے گا اور کہاں یہ نوبت پہنچی کہ اپنا سامان مشقتی کے سر پر اٹھوا کر ڈیوڑھی کی طرف چلنا پڑا۔ ایسی صورت میں کہ یہ بھی معلوم نہ تھا کہ منزل کونسی ہے اور کدھر جانا ہے۔

ڈیوڑھی پہنچا تو ایک تھانے دار اور دو سپاہی بمعہ اپنی رانفلوں کے پیشوائی کے لیے موجود تھے۔ تھانے دار نے میرے پوچھنے پر جب یہ بتایا کہ مجھے ملتان جیل میں بھیجا جا رہا ہے تو الف لیلہ کے شہزادے کی طرح میرے دل میں خوشی سے ہنسنے اور پھر دھاڑیں مار کر رونے کی خواہش پیدا ہوئی۔ ہنسنے کی خواہش اس وجہ سے ہوئی کہ میرے بچپن کا عزیز ترین اور مخلص دوست حبیب پاسلوی اور لدھیانہ کے دوسرے بہت سے دوست ملتان میں تھے، اور رونا اس لیے چاہتا تھا کہ وہ سب لوگ اپنے گھروں میں ہوں گے اور میں اپنی جیل میں اور ہم ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے نمل سکیں گے۔

ایک تصویر

18 جولائی کی یہ شام کیسی عجیب، کتنی سہانی اور کس قدر پر اسرار تھی۔ سنٹرل جیل لاہور کے پھاٹک سے نکل کر سٹیشن وگین میں بیٹھتے ہوئے میں نے اس شام کے سحر کو چاروں طرف بکھرا ہوا پایا۔ تھانے دار ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا اور دونوں سپاہی رانفلیں تھام کر میرے بالکل سامنے بیٹھے گئے۔

تھانے دار نے کہا ”آپ کو جھکڑی پہنائی جائے گی۔ آپ برا تو نہیں مانیں گے؟“

”جی نہیں۔“ میں نے جواب دیا ”مجھے بڑی خوشی ہوگی۔ عمر بھر آپ کا احسان مندر ہوں گا۔“

میں نے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

لوہے کی ایک زنجیر میرے ہاتھ کے گرد حلقہ بنانے لگی۔ مگر میں نہ تو اس زنجیر کو دیکھ رہا تھا اور نہ اس کی گرفت کو محسوس کر رہا تھا۔ میں تو اس سرسبز، حسین اور خوبصورت دنیا کو دیکھ رہا تھا جسے دو مہینہ سے بھوری دیواروں نے میری نظروں سے اوجھل کیا ہوا تھا اور اب یہ وسیع شاداب دنیا..... رائفلوں کے سائے ہی میں سہی، میری نظروں کے سامنے تھی۔

موٹر چلنے لگی تو تھانے دار نے سپاہی کو اشارہ کیا۔ سپاہی نے میری ہتھکڑی کھول دی میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا تو تھانے دار نے کہا ”کوئی بات نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں ہے۔“

موٹر چلی تو ایک سپاہی نے مجھ سے کہا ”آپ قتل کے مقدمہ میں آئے ہیں۔“

”جی ہاں!“ میں نے کہا۔

”کس کو قتل کر کے آئے ہو؟“ دوسرے سپاہی نے کہا۔

”کسی کو نہیں، خود قتل ہو کر آیا ہوں۔“

سپاہی نے پہلے تو بڑا سامنے کھولا اور پھر کہنے لگا ”اوہو میں سمجھا تھا برادری میں کسی سے جھگڑا وگڑا ہوا ہوگا مگر یہاں

تو معاملہ ہی کچھ اور نظر آتا ہے۔“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

ہماری موٹر لارنس روڈ پر جا رہی تھی۔ داہنے ہاتھ لارنس باغ تھا۔ پھول تھے، شادابی تھی، بانیں ہاتھ پر بڑی بڑی

کوٹھیاں اور ان میں رہنے والی مطمئن مخلوق تھی، ان راستوں سے میری کتنی حسین یادیں وابستہ تھیں۔ ان راستوں کی

خاک میں نے کتنی مرتبہ چھانی تھی۔ لیکن اس شان سے کبھی نہ آیا تھا جس شان سے اس وقت جا رہا تھا۔ میں بار بار لارنس

باغ کو دیکھتا۔ دو مہینہ سے کوئی پھول، کوئی شگوفہ، کوئی اچھی صورت نہ دیکھی تھی، صرف بھوری اور مکروہ دیواریں دیکھی تھیں

اور اس وقت جولائی کی اس چمکیلی شام میں ہزاروں پھول میری نظروں سے سامنے کھلے ہوئے تھے۔ پھولوں کی بہار اپنے

جو بن پر تھی اور میں مجبوس تھا مگر خوش قسمتی سے ابھی آنکھوں پر سیفیٹ ایکٹ چلانے کا طریقہ دریافت نہیں ہوا تھا جس کی وجہ

سے میری نظریں آزاد تھیں۔

لارنس روڈ ختم ہو گئی اور کونز روڈ کا چوک آ گیا۔ پھر موٹر آگے بڑھنے لگی۔ دل کا عجب حال تھا۔ بے چارگی کا

احساس بھی تھا اور گھلاوٹ کا بھی۔ غم کی کسک بھی تھی اور خوشی کی لہر بھی۔

چلتے چلتے جب موٹر ریگل چوک میں پہنچی تو ایک دم سے جیسے میری ساری حسیں بیدار ہو گئیں۔ میری نظر کے سامنے مال کا چوک تھا۔ زندگی تھی، حرکت تھی، چہل پہل تھی۔ لوگ فرحان و شاداں گزر رہے تھے۔ چیئرنگ کر اس کی طرف سے ایک بس آئی اور جی پی او کی طرف چلی گئی۔ بیڈن روڈ سے ایک مہوش سائیکل سوار چوک عبور کر کے ٹمپل روڈ کی طرف بڑھ گئی۔ تین چار برقعہ پوش لڑکیاں مال کا چوک عبور کر کے چیئرنگ کر اس کی طرف بڑھ گئیں۔ ان کے قدم نفاست اور نزاکت سے اٹھ رہے تھے اور ان کے سیاہ برقعے ہوا میں لرز رہے تھے۔ ان کی دراز جھکی ہوئی پلکیں اور ان کے قدم اٹھانے کا انداز مجھے کبھی نہیں بھولے گا۔ محرومی اور زندگی کی مسرتوں سے بیگانگی کے دو مہینے گزارنے کے بعد مجھے یہ سارا نقشہ بہت ہی زندہ اور جاندار معلوم ہوا۔ جیسے میری ساری حسیں بیدار ہو گئی تھیں اور میں ان ساری لطافتوں سے ہمکنار ہو رہا تھا جو عورت اپنے ساتھ لے کر آتی ہے اور جن سے میں محروم رہا تھا۔

دفعاً مجھے یوں محسوس ہوا گویا ریگل کا یہ چوک موت کے راستے پر زندگی کا آخری چوک ہے۔ اگر یہ سفر ایک بھوری دیوار سے نکل کر دوسری بھوری دیوار کے پیچھے جانے کے لیے نہ ہوتا۔ اگر مسرت اور لطافت کا یہ لمحہ ریگ زار میں نخلستان کی طرح اچانک میرے سامنے نہ آجاتا تو میں اسے فوراً فراموش کر دیتا۔ لیکن یہ منظر، یہ تصویر تو میرے ذہن پر ثبت ہو گئی تھی۔ موت کی تاریک وادیوں میں سے نکل کر ایک لمحہ کے لیے اس چوک میں زندگی، حسن، حرکت اور لطافتوں کو دیکھ کر میں جیسے بوکھلا رہا تھا۔ مگر موٹرا گلے ہی لمحہ اس چوک سے نکل کر ہال روڈ پر سے گزرنے لگی۔

ہال روڈ، پھر رتن چند روڈ، پاکستان ٹائمنز کا دفتر، سرکلر روڈ سب کچھ گزر گیا اور روشنی سے پرے لاہور ریلوے سٹیشن کی عمارت نظر آئی۔ چاروں طرف روشنی تھی، نور تھا، شور تھا اور حرکت کرتی ہوئی زندگی کی اس لہر میں پابجولاں اپنے محافظوں کے ساتھ سٹیشن کی عمارت میں داخل ہو گیا۔ دنیا کے کام اسی طرح چل رہے تھے، لوگ اسی طرح گھوم پھر رہے تھے مگر میں ایک قدم بھی اپنی مرضی سے نہ اٹھا سکتا تھا میرے محافظ مجھے جدھر چلنے کا اشارہ کرتے میں ادھر ہی چل پڑتا۔

ملتان جانے والی گاڑی تیار تھی میں دو ماہ سے زمین پر سونے کی مصیبت میں مبتلا تھا اس لیے گاڑی کی ایک سیٹ پر بستر بچھا کر جب میں اس پر لیٹا تو مجھے عجیب لذت کا احساس ہوا اور میں فوراً ہی سو گیا۔

اگلی صبح..... چھ بجے میں سپاہیوں کی حفاظت میں ڈسٹرکٹ جیل ملتان کے آہنی پھانک کے سامنے کھڑا

تھا۔

ڈسٹرکٹ جیل ملتان

کچھ قفس کی تیلیوں سے چھن رہا ہے لورسا
کچھ فضا کچھ حسرت پرواز کی باتیں کرو

ڈسٹرکٹ جیل ملتان کے آہنی پھانک کے سامنے میری سواری ایک تھانیدار اور دو مسلح سپاہیوں کے ہمراہ صبح چھ بجے سے بھی پہلے پہنچ گئی تھی۔ ملتان چھاؤنی کے اسٹیشن سے لے کر اس آہنی پھانک تک راستہ بھر فضا کچھ سوئی سوئی سی نظر آتی تھی۔ راستے خاموش تھے، سڑکیں جیسے اجنبی مسافروں کے انتظار میں چپ چاپ لیٹی ہوئی تھیں۔ ہر طرف خاموشی اور سکوت کا راج تھا اور جولائی کی یہ صبح بڑی روشن، بڑی اجلی اور خوبصورت دکھائی دیتی تھی۔

مجھے خاص طور پر اس لیے بھی کہ دو ڈھائی ماہ کی مکمل قفس نشینی کے بعد اس وقت میں اپنے آپ کو تھوڑا سا آزاد محسوس کر رہا تھا۔ اگرچہ پہرے دار اور رائفلوں کی موجودگی اور ان کے حکم کے بالکل مطابق حرکت کرتے رہنے سے آزادی کا یہ تھوڑا سا احساس بھی مجروح ہوئے بغیر تو نہیں رہا تھا لیکن پھر بھی کچھ اطمینان اور سکون سا تھا۔ مگر ساتھ ساتھ اس نئی، موہوم اور ان دیکھی دنیا کے خطرے بھی دل میں پیدا ہو رہے تھے۔ دوستوں کی جدائی، عزیزوں اور گھر والوں سے دوری اور نئے لوگوں کے متعلق لاعلمی کی وجہ سے میری حالت بالکل ویسی ہو رہی تھی جیسے کوئی اجنبی بالکل نئی جگہ پہ پہنچ کر پہلے ہی دن محسوس کرتا ہے۔

اس جیل کا پھانک لاہور سنٹرل جیل کے پھانک کے مقابلہ میں بالکل حقیر سا لگ رہا تھا۔ یہ جیل شہر ملتان سے باہر تقریباً جنگل میں بنائی گئی تھی۔ ڈسٹرکٹ جیل ہونے کی وجہ سے اس کی دیواروں اور اس کی عمارت میں وہ شان و شوکت نظر نہیں آرہی تھی جو لاہور کی جیل میں تھی۔ مگر جنگل میں ہونے کی وجہ سے یہ زیادہ پراسرار اور ڈراؤنی معلوم ہو رہی تھی۔ نیشنل میڈیکل کالج کی تعمیر شروع ہونے کی وجہ سے جیل کے آس پاس کچھ رونق ہو رہی تھی۔ اگر یہ نہ ہوتی تو مجھے یقین ہے کہ میں اس سناٹے اور ڈراؤنے پن سے گھبرا گیا ہوتا۔

پھانک کے سامنے ایک سنتری رائفل کندھے پر اٹھائے اونگھتا ہوا گھوم رہا تھا۔ ہمارے تھانے دار نے اس کے پاس جا کر اس سے پوچھا ”جیل کا دفتر کتنے بجے کھلتا ہے۔“

سپاہی نے پہلے تو اپنا منہ کھولا پھر قدم آگے بڑھا کر جواب دیا۔ ”دفتر اس وقت کھل جاتا ہے مگر آج ڈپٹی صاحب نئے سپرنٹنڈنٹ صاحب کا سامان ان کے بنگلے میں رکھوانے گئے ہیں اس لیے اب تک نہیں آئے۔ وہ آتے ہی ہوں گے۔ ان کے آنے پر دفتر کا کام باقاعدہ شروع ہوگا۔“ ایک لمحہ رکنے کے بعد اس نے جیسے اپنے فقرے کی وضاحت کرتے

ہوئے کہا ”ملازم وغیرہ تو ان کے آنے پر ہی لیے جاتے ہیں۔“

اپنی بات ختم کرنے کے بعد سنتری نے مجھے سر سے پاؤں تک غور سے دیکھا۔ میرے ہتھکڑی نہیں لگی ہوئی تھی۔ اس وجہ سے وہ اور بھی گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ جب اس سے نہیں رہا گیا تو اس نے بالآخر تھانیدار سے پوچھ ہی لیا ”آپ کس کام سے آئے ہیں؟“

”یہ سیاسی نظر بند ہیں، ان کو چھوڑنے کے لیے آیا ہوں“ تھانیدار نے کہا۔

”سیاسی نظر بند؟“ سنتری کی آنکھیں کھلی کی کھلی روہ گئیں۔ اس نے بڑی گھبراہٹ اور چستی کے عالم میں رائفل کندھے پر رکھ کر تیزی سے گھومنا شروع کر دیا۔ مجھے یہ حقیقت بعد میں معلوم ہوئی کہ چھوٹی جیلوں میں سیاسی نظر بند کو بہت بڑی ہستی سمجھا جاتا ہے۔

تھانیدار نے موقع پا کر اس سے کہا ”اگر دروازہ کھلوادو تو ہم لوگ کم از کم اندر جا کر دفتر میں بیٹھ جائیں۔“ اتنے میں ایک نومند شخص (جو شخص کم اور نومند زیادہ نظر آتا تھا) پتلون کے ساتھ ململ کا کرتہ اور سر پر گز بھر طرہ والی پگڑی رکھے ہاتھ میں ہنٹر لیے جیل کے دروازے کی طرف آتا دکھائی دیا۔ اسے دیکھ کر جو پہلا خیال میرے دل میں آیا وہ یہ تھا کہ اگر یہ خونخوار شخص ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ ہے تو یہاں پر خیریت نہیں ہے۔ اس کا جسم، اس کا طرہ، اس کا تن و توش، اس کی تلے دار جوتی سب اس قسم کی چیزیں تھیں جن سے جبر کی بو آتی تھی اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ کوئی رئیس زادہ ہے جس نے شکار اور عیاشی کے سوا کچھ نہیں دیکھا۔ وہ ایسا جاگیردار معلوم ہوتا تھا جو اپنے مزارعوں کے خون کا پیاسا اور ان پر ظلم کرنے میں ماہر ہوگا۔ اس کے سارے جسم، وجود اور چہرے پر صرف ایک چیز ایسے تھی جس سے نفاست اور پاکیزگی جھلک رہی تھی اور وہ تھی اس کی سنہری فریم کی خوبصورت عینک، لیکن یہ عینک اس چہرے پر آ کر جیسے اپنی حیثیت کھو بیٹی تھی۔

اس کے آنے پر سنتری نے اسے سیلوٹ کیا۔ جیل کا پھانک کھل گیا اور وہ اندر داخل ہو گیا۔ اس نے نظر بھر کر ہمیں دیکھا مگر کچھ کہے سے بغیر اندر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے گھبراہٹ میں سنتری سے پوچھا ”کیا یہی ہیں ڈپٹی صاحب؟“ ”نہیں یہ تو فیکٹری انچاری ہیں، راجہ صاحب۔“

سنتری کے منہ سے یہ فقرہ سن کر میں نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے سوچا کہ چلو یہ شخص کوئی بھی ہو کم از کم ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ تو نہیں ہے۔ جیل میں اگرچہ ساری طاقت سپرنٹنڈنٹ ہی کے ہاتھ میں ہوتی ہے لیکن بظاہر ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ ہی سیاہ و سفید کا مالک ہوتا ہے۔ پھر لاہور میں چودھری احمد خان ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کے ہاتھ دیکھ کر تو میں زیادہ ہی ڈرا ہوا تھا۔

تھانیدار کے کہنے پر سنتری نے پھاٹک کے اندر والے سنتری سے کچھ کہا اور تھوڑی دیر کے بعد جیل کا پھاٹک ہمارے لیے کھل گیا۔ سب سے پہلے تھانے دار صاحب اندر داخل ہوئے، پھر میں اور اس کے بعد دونوں سپاہی بھی ڈیوڑھی میں داخل ہو گئے۔ بالکل ویسی ہی ڈیوڑھی تھی جیسے لاہور سنٹرل جیل کی، اسی طرح کا بغلی کمرہ تھا جس پر ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کا بالکل ویسا ہی بورڈ لٹک رہا تھا۔ وہی نحوست اور تسع کی فضا تھی اور وہی تالے اور وہی چابیوں کے گچھے لٹک رہے تھے۔ لاہور سنٹرل جیل کی ڈیوڑھی اور ملتان ڈسٹرکٹ جیل کی ڈیوڑھی میں صرف سائز کا فرق تھا اور نہ اتنی یگانگت تھی کہ مجھے لمحہ بھر کے لیے ایسا محسوس ہوا گویا میں سفر سے گھر واپس آ کر بیٹھا ہوں۔

ڈپٹی صاحب کے کمرے میں صرف ان کی کرنسی سلامت تھی باقی سب ٹوٹی ہوئی تھیں چنانچہ ہم لوگ اپنی ٹوٹی ہوئی کرنسیوں پر بیٹھ کر ان کا انتظار کرنے لگے۔ سب سے پہلے وہی فیکٹری انچارج نمودار ہوئے اب کی بار انہوں نے خاموشی سے کام نہیں لیا۔ بلکہ اندر آتے ہی تھانیدار سے پوچھا، ”کس سلسلے میں تشریف لائے ہیں آپ لوگ؟“

ان حضرت کے منہ سے یہ مہذبانہ الفاظ سن کر میں پہلے تو چونکا ویسے تو ان کی شکل میں خونخواری کی کوئی بات نہیں تھی۔ یوں بھی ان کے نقش برے نہیں تھے۔ دیکھنے میں ان کو وجیہہ کہا جاسکتا مگر جانے کیا چیز تھی جو مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر رہی تھی کہ یہ آدمی بہت ظالم ہے۔ اس میں ان جابر جاگیرداروں کی خصوصیات ہیں جو اپنے غلاموں کو کتوں سے پھڑوا دیا کرتے ہیں۔ پھر ان کی چال ڈھال، ان کی وہ خوبصورت جوتی، ان کا ڈنڈا اور طرہ جن چیزوں کا مطالبہ کرتا تھا وہ نہ تو ان کی آواز میں تھا اور نہ ان کے لہجے میں، چنانچہ مجھے بڑی حیرت ہوئی اور میں دیر تک یہی سوچتا رہا کہ یہ آواز اسی آدمی کی ہے یا کسی اور کی؟

تھانیدار نے مختصر الفاظ میں اسے میرے سیاسی نظر بند ہونے کے متعلق بتلایا اور یہ بھی کہہ دیا کہ ”آپ لوگ جلدی سے ان کو اپنی تحویل میں لے کر ان کو چھٹی دیں تو بڑی عنایت ہوگی.....“

”GOOD“ فیکٹری انچارج صاحب نے کہا ”تو آپ سیاسی نظر بند ہیں، بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر“ پھر انہوں نے تھانیدار صاحب کی طرف گھومتے ہوئے کہا ”ہمارے ڈپٹی صاحب آج نئے سپرنٹنڈنٹ صاحب کا سامان رکھوانے میں مصروف ہیں۔ بس ان کو تو وہی اپنی تحویل میں لے سکتے ہیں۔ وہی آپ کو چھٹی دیں گے۔ کیونکہ سیاسی نظر بندوں کو ”وصول“ کرنا ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔ وہ آتے ہی ہوں گے، بس کچھ دیر اور ٹھہریں“ یہ کہتے اور مسکراتے ہوئے وہ حضرت رخصت ہو گئے اور میں ان کے سنگین جسم اور ان کی نازک عینک، ان کی پرشکوہ طرہ دار پگڑی اور بے نام معصومانہ مسکراہٹ پر غور ہی کرتا رہ گیا۔ تاہم ان سے خوف کرنے کی کچھ نہ کچھ بات دل میں محسوس ضرور کر رہا تھا۔

سات بج گئے، ساڑھے سات اور پھر آٹھ بج گئے ہم لوگ جمائیاں لیتے اور ادھر ادھر کی باتیں کرتے ڈپٹی صاحب کے انتظار میں گھڑیاں گنتے رہے۔ ڈیوڑھی کی ایک سلاخ دار کھڑکی میں سے جیل کا اندرونی حصہ نظر آ رہا تھا۔ وہی چار خانہ لباس پہنے بہت سے قیدی ادھر ادھر اپنی اپنی مشقت میں مصروف نظر آتے تھے۔ کبھی کبھی بیڑیوں کی جھنکار بھی سنائی دیتی پھر کبھی لوہے کی سلاخوں اور تالوں اور چابیوں کی منحوس آواز بھی سنائی دیتی۔ کبھی اس کھڑکی کے سامنے کوئی سپاہی یا کوئی حوالدار خاکی وردی میں ملبوس گزر جاتا۔ یکا یک مجھے یہ سارا منظر ایک کھیل، ایک تماشہ اور ایک عجیب مضحکہ خیز چیز معلوم ہونے لگا۔

جولائی کی اس اجلی صبح کو ڈیوڑھی میں کرسی پر بیٹھے بیٹھے میں نے کئی بار سوچا کہ میں یہاں کیوں لایا گیا ہوں؟ یہ سب لوگ کیا کر رہے ہیں؟ یہ کونسی جگہ ہے؟ کیسی عجیب بات ہے کہ اسی دنیا میں جہاں ہم سب رہتے آئے ہیں اور رہ رہے ہیں ہم ایک چار دیواری کھڑی کر لیتے ہیں۔ پھر اس کے باہر ایک ڈیوڑھی بنا کر ایک اہنی پھانک تعمیر کرتے ہیں اور پھر چند انسانوں کو اس چار دیواری میں بند کر کے ان پر سپاہی، حوالدار اور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ مقرر کر دیتے ہیں۔ یہ سارا سلسلہ مجھے بہت ہی عجیب و غریب معلوم ہوا اور میں دیر تک یہ سوچتا رہا کہ وہ کون سا پہلا انسان تھا جس نے یہ سوچا ہوگا کہ انسانوں کو اس طرح بند بھی کیا جاسکتا ہے۔ سزا اور جزا کا آخرت کا جو تصور تھا اس کو اس دنیا داری کے طریقہ میں ڈھالنے کا خیال سب سے پہلے کس کے دل میں پیدا ہوا تھا؟ بار بار مجھے یہ سب کچھ ایک کھیل، ایک تصنع اور جھوٹی چیز معلوم ہوتا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی محرومی کی ایک خلش اور اجنبیت کا احساس بھی شامل تھا۔ اپنی شعر و نغمہ اور حسن کی دنیا چھوڑ کر اس سنگدل اور بے مہر دنیا میں آنے سے جو روحانی تشنگی محسوس ہو رہی تھی وہ اس سارے پس منظر میں اور بھی زیادہ تکلیف دہ ہو گئی۔

کوئی سوا آٹھ بجے کے بعد پھانک کھلا اور کھٹ کھٹ کرتا ہوا ایک شخص خاکی وردی میں ملبوس سامنے سے آتا دکھائی دیا۔ اس وردی کی وجہ سے ہمیں یہ فوراً معلوم ہو گیا کہ یہ شخص ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔ میں تو خیر کرسی پر آرام سے بیٹھا تھا اور جانتا تھا کہ سی کلاس میں ہونے کی وجہ سے اندر جا کر زمین پر ہی ڈیرا جمانا پڑے گا مگر تھانے دار اور سپاہیوں کی حالت بہت خراب تھی۔ وہ اس بوجھ کو اپنے کندھوں سے اتار کر فوراً بھاگنا چاہتے تھے۔

ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ صاحب نے پھانک سے لے کر ہم تک پہنچنے کے دوران میں کوئی تین آدمیوں کو ٹوکا۔ چلنے کا انداز بھی آفیسرانہ تھا اور چہرے پر خشونت کے آثار بھی تھے مگر میں نے دیکھتے ہی اندازہ کر لیا تھا کہ یہ سب تصنع ہے۔ دراصل یہ آدمی وہ نہیں ہے جو یہ نظر آ رہا ہے یا جس طرح نظر آنے کی کوشش کر رہا ہے۔

کرسی پر بیٹھ کر ڈپٹی صاحب نے بالکل کاروباری انداز میں تھانیدار سے پوچھا ”کاغذات لائیے۔“

کاغذات کا مطالعہ کرنے کے دوران ان کے سخت سرخ چہرے اور ماتھے پر کچھ ناپسندیدگی کے آثار بھی نمودار ہوئے۔ ان کا جسم گتھا ہوا تھا۔ قد چھوٹا اور سر گنجا تھا۔ وہ کرسی پر بار بار پہلو بدل رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کرسی پر بیٹھ کر ان کو اطمینان نہیں ہے۔ بس چلے تو ابھی بھاگ جائیں گے۔

”آپ کا نام؟“

”حمید اختر!“

”لاہور میں ڈھائی مہینے رہے؟“

”جی!“ میں نے کہا۔

”ہمارے پاس سیاسی نظر بندوں کے رکھنے کی کوئی جگہ نہیں ہے لیکن تم سی کلاس میں ہو اس لیے کچھ نہ کچھ بندوبست کر لیں گے..... مگر تم لاہور سے آئے ہو، لاہور کا جیل تو ایک سمندر ہے۔ وہاں بہت سے قیدی ہیں۔ سیاسی قیدی بھی بہت ہیں مگر تم کو معلوم ہوگا کہ یہ جیل اس سے مختلف ہے۔“

ایک منٹ کے لیے اپنی تقریر روک کر انہوں نے پھر کہنا شروع کیا ”پہلے تم سمندر میں تھے۔ اب صرف ایک قطرہ ہو اور وہ بھی گرم تو ہے پر..... اس لیے تم خود..... سوچ سمجھ لو۔“

میری سمجھ میں ان کی یہ بے ربط تقریر بالکل نہیں آئی۔ تاہم بعض بزرگ قیدیوں سے یہ سن رکھا تھا کہ جیل میں جانے پر سب سے پہلے جیل کے آفیسر رعب ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ ان کا دبدبہ قائم رہے اس لیے میں یہ فوراً سمجھ گیا کہ ڈپٹی صاحب رعب ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں مگر مجھے اپنی سی کلاس کی اوقات اور اس کے حوالہ پر سخت غصہ بھی آرہا تھا۔ میں نے ان سے صرف اتنا کہا ”میں آپ کو شکایت کا موقعہ نہیں دوں گا لیکن میں نہ تو اپنے آپ کو ایک قطرہ سمجھنے کے لیے تیار ہیں اور نہ آپ کو گرم تو تسلیم کرنے کے لیے تیار ہوں۔ بہر حال مجھے تو وقت پورا کرنا ہے۔“

یہ فقرہ تو میں نے کہہ دیا مگر دل میں سوچ رہا تھا کہ لاہور جیل میں چودھری احمد خاں دو مہینے رعب ڈالتے رہے اور ہم یہ سمجھتے رہے کہ رعب ڈال کر آخر سیدھے راستے پر آ ہی جائیں گے اس لیے خاموش رہے یہاں رعب ڈالنے کا سلسلہ نئے سے شروع ہو گیا۔ نہ معلوم یہ اور کتنا عرصہ رہے ؟

چینی کی تلاشی

ڈپٹی صاحب کاغذات کے مطالعہ سے فارغ ہو کر اپنے رجسٹروں میں کچھ اندراج کرنے لگے۔ ایک فٹنی کو اندر بھیج کر انہوں نے ایک ہیڈ وارڈ اور جیل کے چیف ہیڈ وارڈر کو طلب کیا اور انہیں میرے سامان کی تلاشی لینے کے لیے

تلاشی کا سلسلہ اتنا ظالمانہ اور اس قدر ہتک آمیز تھا کہ میں تملتا کر رہ گیا۔ اتفاق سے میں گرفتار ہونے سے لے کر اب تک اس بے عزتی سے بچا ہوا تھا۔ گھر سے مجھے اطمینان میں پکڑا گیا۔ لاہور جیل کی ڈیوڑھی میں اسٹنٹ مرنڈنٹ نے صرف اتنا کہا تھا کہ ہماری جیبوں میں جو کچھ ہو وہ ہم جمع کرادیں اندر صرف سگریٹ لے جاسکتے ہیں اور کچھ نہیں۔ چنانچہ ہم سب لوگوں نے اپنی اپنی جیبیں خالی کر دیں۔ وہیں سے تبدیل ہو کر ملتان آتے وقت ڈیوڑھی میں ہرے سامان کو ایک نظر دیکھا گیا تھا اور بس..... لیکن یہاں پر تو ایک ایک چیز کو اس بری طرح دیکھا جا رہا تھا کہ خود مجھے حرم آنے لگی۔

ڈپٹی صاحب نے پہلے میرا بستر کھلوا دیا اور ایک ایک چادر کو اپنے سامنے کھلوا کر دیکھا۔ پھر انہوں نے ٹرنک کھلوا دیا۔ سب سے پہلے چینی کا ایک تھیلا برآمد ہوا۔ انہوں نے فوراً حکم دیا ”اوہو اتنی چینی! اسی کلاس کا نظر بند اتنی چینی اپنے پاس نہیں رکھ سکتا“ پھر انہوں نے جمعدار سے کہا ”چینی کی تلاشی لو!“

جمعدار نے ایک اخبار اپنے سامنے فرش پر پھیلا دیا۔ پھر اس پر ساری شکر انڈیل کر اس میں اپنے ہاتھوں کی انگلیاں پھیرنے لگا تھوڑی دیر میں اس نے اعلان کیا ”چینی میں چینی کے سوا کچھ نہیں ہے۔“

پھر گھی کا ڈبہ نکلا۔ اسے بھی الٹ پلٹ کر دیکھا گیا مگر اس میں سے ایک چیچ کے علاوہ اور کچھ نہ نکلا۔ ایک بڑے ڈبے میں سگریٹ کے کوئی بیس پیکٹ دیکھ کر ڈپٹی صاحب چیخ اٹھے ”اتنے سگریٹ؟ نہیں نہیں اتنے سگریٹ تم ہرگز اپنے پاس نہیں رکھ سکتے۔“

میں جلا بیٹھا تھا مگر اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے میں نے کہا ”حضرت لاہور سنٹرل جیل میں ہر ملاقات پر مجھے تیس پینتیس پیکٹ سگریٹ ملتے تھے اور کبھی کسی نے اعتراض نہیں کیا تھا۔ میرے خیال میں آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔“

”لیکن ہم اجازت نہیں دے سکتے، رولز اس کی اجازت نہیں دیتے“ ڈپٹی صاحب نے کہا۔

تھوڑی دیر اور تلاشی جاری رہی۔ اس کے بعد ٹرنک میں سے چائے پکانے کی کیتلی، لپٹن چائے کے دو پیکٹ، دودھ کے دو ڈبے اور دہی، پیاز اور چیچ وغیرہ برآمد ہوئے۔ ڈپٹی صاحب نے چیخ کر کہا ”یہ چائے کا سامان؟ چائے اور سی کلاس میں؟ ہرگز نہیں!!؟“

میں نے انہیں لاکھ سمجھایا کہ سی کلاس میں ہونے کے باوجود ہم لوگ لاہور جیل میں دو ماہ سے اپنی چائے پکاتے تھے۔ انہیں یہ بھی کہا کہ چائے میری ضرورت ہے مگر انہوں نے ہر بات تسلیم کرنے سے انکار کیا۔ ان کی گفتگو اور رویہ سے

مجھے یہ سمجھنے میں بڑی آسانی ہوئی کہ ہمیں کیوں لاہور جیل سے ایک ایک کر کے مختلف جیلوں میں بھیجا گیا ہے۔

ٹرنک اور بستر کی تلاشی سے فارغ ہو کر جمعداروں نے ڈپٹی صاحب کو سیلوٹ کیا۔

”نہیں ابھی ٹھہرو“ انہوں نے کہا ”جو کپڑے اس نے پہنے ہوئے ہیں ان کی تلاشی بھی تو لو۔“

جمعداروں نے میری پتلون اور قمیض کی جیبوں، پتلون کے پانچوں اور قمیض کے کفوں تک کو تلاش کر لیا۔ ان کا

بس چلتا تو میرے اندر گھس کر بھی تلاشی لیتے یہی نہیں بلکہ پتلون قمیض کی تلاشی سے فارغ ہو کر انہوں نے مجھے جوتی

اتارے کے لیے کہا۔ ایسی تلاشی کی توقع مجھے ہرگز نہ تھی۔ چنانچہ میں نے اس امید پر ڈپٹی صاحب کی طرف دیکھا کہ وہ ان

جمعداروں کو اس سے باز رکھیں گے لیکن ان کا چہرہ دھلی ہوئی سلیٹ کی طرح صاف تھا۔ اس پر کوئی تاثر کوئی جذبہ نظر نہیں آتا

تھا سوائے حقارت کے اس جذبہ کے جو شروع میں ہر جیل آفیسر کے چہرے پر نظر آتا ہے۔

میں نے جوتی اتار ڈالی۔ جمعداروں نے اسے الٹ پلٹ کر اس کے تلووں کو ٹھونک بجا کر اچھی طرح دیکھ لیا۔

ظاہر ہے اس میں کچھ نہیں تھا میرے پاس بھی اپنی محرومی اور حرماں نصیبی کے علاوہ کچھ نہیں تھا مگر گھنٹے بھر تک میری تلاشی

جاری رہی۔ اگر یہ سلوک عام قیدیوں کا سا بھی تھا تب بھی انسانوں کے ساتھ یہ بڑا ہی شرمناک سلوک ہے۔ جب انسان،

خواہ وہ کتنا ہی ظالم، لٹیر اور بد معاش کیوں نہ ہو، پابہ زنجیر ہو کر آتا ہے تو اس کا دل ایک معصوم بچے کی طرح نازک اور

شفاف ہوتا ہے۔ وہ آگینہ کی طرح ٹھیس لگنے سے ٹوٹ سکتا ہے۔ اس وقت اگر جیل کے آفیسر اپنی خونخواری چھوڑ کر ان

سے انسانیت کا برتاؤ کریں تو مجھے یقین ہے کہ جرائم کی تعداد میں کافی کمی ہو سکتی ہے۔ کیونکہ وہ دل موم کی طرح قابو میں کیا

جاسکتا ہے۔ اس نازک موقع پر بڑے سے بڑے مجرم کو نفسیاتی طریقوں سے، انسانی ہمدردی کے اصولوں سے اور محبت اور

انسانیت کی مدد سے قابو میں کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ اس کا دل اس وقت موم کی طرح نرم ہوتا ہے۔ یہ انسانی فطرت کا نہایت

معمولی اصول ہے لیکن ہماری سرکاری مشینری کے یہ پرزے ایک ہی اصول پر چلتے ہیں۔ ان کے قدم اسی راستے پر اٹھتے

ہیں جہاں انسانوں کو انسان نہیں بلکہ چور، ڈاکو اور مجرم سمجھا جاتا ہے اور یہ نہیں سوچا جاتا کہ وہ چور، ڈاکو اور مجرم کیوں بنے۔

انہوں نے میرے بارے میں بھی وہی طریقہ اختیار کیا جو عام مجرموں کے ساتھ روارکھا جاتا ہے۔ یہ بھی نہیں

سوچا کہ مجھ پر کوئی فرد جرم عائد نہیں ہوئی۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا بلکہ مجھے سیاسی طور پر خطرناک سمجھ کر بند کیا جا رہا ہے۔

یہ بھی نہیں سوچا کہ میں ادیب ہوں، ڈاکو نہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ انہیں گنتی کے اصول یاد ہیں جو اس قسم کے ہیں کہ

ہرنئے آنے والے قیدی سے ایسا سلوک کرو کہ اس پر تمہاری دہشت غالب آجائے۔ اسے ڈراؤ، دھمکاؤ اور رعب ڈالو۔

جس کا نتیجہ صرف یہ ہوتا ہے کہ ایک بار آنے والا قیدی اس جگہ پہنچ کر اور بھی ڈھیٹ، اور بھی بے شرم اور بے ایمان ہو کر نکلتا ہے۔

ہے اس طرح یہ جیل مجرموں کو زیادہ ہنستہ مجرم بنانے میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ بات کتنی مضحکہ خیز ہے کہ ہماری سرکار پبلک ٹرسے اتنی بڑی رقم خرچ کرتی ہے، تنخواہیں دیتی ہے، دیواریں کھڑی کرتی ہے اور لوہے کے جال بنتی ہے صرف اس لیے کہ معمولی انسانوں کو خوفناک مجرموں میں تبدیل کیا جائے۔

تلاشی وغیرہ سے فارغ ہو کر ڈپٹی صاحب نے جمعداروں سے کہا ”اس کی چائے کی کیتلی، چائے کی پتی، چینی، سگریٹ، ماچس اور غیر ضروری سامان ایک بکس میں بند کر دو۔ ایک پاؤ چینی، ایک ماچس اور سگریٹ کا ایک پیکٹ اس کو دے دو۔“

میں نے ذرا سختی سے کہا ”جناب عالی میرے لیے ایک پیکٹ سگریٹ کافی نہیں ہے۔ میں دن میں ایک پیکٹ سے زیادہ سگریٹ پیتا ہوں۔“

”اتنے سگریٹ مت پیا کرو۔“

”کیوں روز اجازت نہیں دیتے؟“ میں نے کہا۔

ڈپٹی صاحب مسکرائے۔ مسکراتے وقت وہ ڈپٹی صاحب نہیں بلکہ پہلی بار انسان نظر آئے۔ میں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا ”چائے کے بغیر مر جاؤں گا اور سگریٹ کے بغیر تو.....“

”دیکھو بھئی!“ ان کا لہجہ بدلا ہوا تھا ”جب ختم ہو جائیں تو آدمی بھیج کر یہاں سے منگوا لینا۔ زیادہ سگریٹ قیدیوں کے پاس رہیں تو وہ جیل میں Corruption پھیلا دیتے ہیں اور خرید و فرخت شروع کر دیتے ہیں مگر تم دو تین سگریٹ روز پیا کرو۔“

میں نے ان سے لاکھ کہا کہ سگریٹ میرے گھر سے آئے ہیں، میرے بہن بھائیوں نے پیٹ پر پتھر باندھ کر میری ضرورت سمجھتے ہوئے یہ سگریٹ مجھے بھیجے ہیں کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ میرے نزدیک اس سیاہ تاریک دنیا میں سگریٹ کی روشن چنگاری زندگی کی جوت کے برابر ہے اور میرے لیے یہ رفیق ایسا رفیق ہے جو کبھی ساتھ نہیں چھوڑے گا۔ یہ ایسا معشوق ہے جو کبھی بے وفائی نہیں کرتا بلکہ سینے کو جلا کر ہمیشہ ایک جلتی ہوئی ٹھنڈک پہنچاتا ہے..... مگر ڈپٹی صاحب کی سمجھ میں یہ فلسفہ نہیں آیا اور چائے کے بارے میں تو انہوں نے صاف کہہ دیا کہ روز اجازت ہی نہیں دیتے۔

میں نے کہا ”وہاں لاہور میں ہمیں آٹا، لکڑی، مصالحہ، دال، سبزی وغیرہ مل جاتی تھی۔ ہم خود کھانا پکا لیا کرتے تھے کیا اس کی اجازت یہاں ہوگی یا نہیں؟“

”سی کلاس میں کھانا پکانے کی اجازت نہیں ہے“ انہوں نے کہا ”اور پھر لاہور جیل تو سمندر ہے اور.....“

”کہاں میں گرم توے پر ہوں“ میں نے ان کا فقرہ مکمل کر دیا۔

انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد انہوں نے فیصلہ کن انداز میں کہا ”گھی اپنے ساتھ لے جاؤ، چینی لے جاؤ، ختم ہو جائے گی تو اور منگوا لینا۔ دودھ کے دونوں ڈبے لے جاؤ خوب کھاؤ، باقی چیزیں رہا کر جاؤ گے تو مل جائیں گی۔ یہاں محفوظ پڑی رہیں گی فکر نہ کرو۔“

ستم ظریفی کی انتہا یہ تھی کہ کھانا پکانے کی اجازت نہیں ہے اور گھی دے رہے ہیں جیل کی دال اور سبزی تیل میں پکی ہوئی ملے گی اور گھی کھانے کی اجازت دے کر مجھ پر کرم کیا جا رہا تھا۔ چینی اور دودھ کے ڈبے لے جانے کی اجازت بخش دی گئی مگر چائے کی پتی رکھ لی گئی۔ سگریٹ کا پیٹ دے دیا گیا مگر ماچس کی اجازت دینے سے روکنے انکار کر دیا۔ اللہ اکبر! کیا دنیا تھی، کیا روز تھے، میں تو چکرا گیا سگریٹ کیسے سلگاؤں گا، یہ پوچھنے تک کی جرات بھی مجھ میں نہیں تھی۔ آخر میں نے کہا ”جناب! تیل میں پکی ہوئی دال اور سبزی تو میں ہرگز نہیں کھا سکوں گا۔ میری صحت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ میں آپ کو پہلے ہی کہہ دیتا ہوں آپ جیل کے ڈاکٹر صاحب سے مشورہ کر لیجئے..... بہر حال یہ مجبوری ہے کہ میں تیل میں پکی ہوئی چیزیں نہیں کھا سکتا۔“

”تو ٹھیک ہے۔“ انہوں نے بڑے اطمینان سے کہا۔ ”ہم گھر والوں سے کہہ دیں گے وہ سبزی اور دال تیل ڈالنے سے پہلے تمہارے لیے نکال لیا کریں گے تم گھی خود ڈال لیا کرنا۔ معمولی بات ہے، اتنا تو ہم کر ہی سکتے ہیں“ ڈپٹی صاحب نے بکمال شان بے نیازی یہ فقرہ اس طرح کہا گویا مجھے دونوں جہاں کی دولت بخش رہے ہوں۔ میں نے پوچھا ”گھی گرم کرنے کے لیے مجھے لکڑی ملے گی؟“

”ہرگز نہیں، ہرگز نہیں! سی کلاس میں آگ جلانے کی اجازت تو قیدیوں کو دی ہی نہیں جاسکتی۔“

پھر انہوں نے گھبرا کر چیختے ہوئے جمعداروں سے کہا ”جاؤ بھئی اس کو جلدی سے دوم تنہائی میں لے جاؤ۔ پانی کا ایک مٹکہ، ایک پیالہ، ایک چٹائی اور دری دے دینا اور ہاں درمیانی احاطہ میں بند کر کے باہر سے تالا لگا دینا اور اچھی طرح سے سن لو کہ اس کے آس پاس کوئی قیدی، کوئی ملازم، کوئی آدمی پھٹکنا تک نہیں چاہیے۔ یہ سیاسی نظر بند ہے، جاؤ لے جائے اس کو دوم تنہائی میں۔“

دوم تنہائی

دوم تنہائی کا نام دوم تنہائی کیوں رکھا گیا تھا، یہ مجھے آج تک معلوم نہیں ہو سکا۔ دوم تنہائی کس طرح دوم تنہائی ہو سکتی ہے یہ بھی میں اس وقت نہ سمجھ سکا کیونکہ جس احاطہ میں میں پہنچا وہاں تو اول و آخر تنہائی تھی، ویرانی تھی اور موت ہی

موت نظر آتی تھی۔

جمعہ دارڈیوڑھی سے چل کر سیدھے مجھے جیل کے درمیانی چکر میں لے آئے۔ ہر جیل کے عین درمیان میں ایک چکر ہوتا ہے جو زندگی کے چکر سے بھی چکر سے بھی زیادہ پرہول اور پراسرار ہوتا ہے۔ جیل کے تمام راستے، تمام قوانین، تمام کام اس چکر کے گرد گھومتے رہتے ہیں۔ سارے قیدی، سارے جمعہ دار، سپاہی اور آفیسر اس چکر میں گھومتے رہتے ہیں چنانچہ سب سے پہلے مجھے بھی اسی چکر میں لایا گیا جہاں میرا نام پتہ نوٹ کرنے کے بعد ایک او اہنی پھانک میں سے گزار دیا گیا۔

چکر کے ارد گرد اس قسم کے کوئی سات آٹھ پھانک گول دائرے کی شکل میں تھے۔ ہر پھانک سے گزر کر جیل کے ایک مخصوص حصہ کو اس سے علیحدہ کر دیا گیا تھا۔ ان حصوں کو دیواریں ایک دوسرے سے جدا کرتی تھیں۔ مختلف پھانکوں میں سے گزر کر آنے والی بیرک کے قیدی دوسرے پھانک کے اندر کی دوسری بیرک یا کوٹھڑی کے قیدیوں سے نہیں مل سکتے تھے۔ جیل ایک ہی تھا مگر اس کے اندر سات اور جیل تعمیر کئے ہوئے تھے اور ان پر بھی سینکڑوں ایسی پابندیاں تھیں جو ایک جیل میں ہزاروں جیل بنا رہی تھیں۔ میرے حصے میں آنے والی دوم تنہائی ان مجرموں کے لیے تھی جو جیل میں سب سے زیادہ خطرناک اور بد معاش سمجھے جاتے تھے، جن کو جیل کے سفیروں کی بے عزتی کرنے، مشقت کرنے سے انکار کرنے یا جیل کا ڈسپلن توڑنے کے جرم میں یہ سزا دی جاتی ہے کہ انہیں دن رات بند رکھا جاتا ہے۔ ان پر سخت پہرہ ہوتا ہے اور انہیں نہایت خطرناک بد معاش تسلیم کر لیا جاتا ہے، تب کہیں جا کر وہ ان ”تنہائیوں“ میں پہنچتے ہیں۔ دوم تنہائی میں دورویہ کوٹھڑیاں تھیں جن میں بڑے بڑے ڈاکو اور مجرم بند پڑے تھے۔ ان کوٹھڑیوں کے بیچوں بیچ میں جمعہ داروں کے ساتھ گزرتا آ رہا تھا کہ آواز میرے کان میں آئی۔

”اوائے سلیم! بابوتوں دیکھیں کوئی نواں نواں بھسیا ای۔“

دوسری آواز آئی۔ ”یار کپڑے تو اچھے پہنے ہوئے ہیں کس کیس میں آیا ہے۔“

”چار سو بیس میں معلوم ہوتا ہے۔“

”نہیں دفتر میں غبن کیا ہوگا؟“ ایک اور نے کہا۔

مگر میں پہلے آدمی کی آواز سن کر حیران رہ گیا۔ وہ کہہ رہا تھا ”نہیں یار یہ سیفٹی معلوم ہوتا ہے۔“

معلوم نہیں غور سے دیکھنے پر اس نے یہ کس طرح معلوم کر لیا کہ میں سیفٹی ایکٹ کا قیدی ہوں، بہر حال اس کی پہچان پر مجھے قدرے سکون ہوا تاہم میں ان کوٹھڑیوں کے درمیان سے گزرتا ہوا اپنے آپ سے یہ ضرور کہتا رہا کہ ”بھائی

بغیر محنت کے اس جگہ پہنچنے کی سعادت ملی ہے اس کو نباہنا پڑے گا، مگر اندر ہی اندر میں لرز رہا تھا۔

موت کے مسافر

ان دورویہ کوٹھڑیوں کے آخری سرے پر ایک چھوٹا سا میدان نظر آیا جس کے تین طرف چار چار کوٹھڑیوں کے تین بلاک تھے۔ یہ تینوں بلاک پھانسی کی سزا پانے والوں کے لیے مخصوص تھے۔ وہی نقشہ سامنے تھا جو میں لاہور جیل کی چودہ نمبر بیرک میں دیکھ چکا تھا۔ اسی طرح کے جنگلے اور تالے، اسی طرح سپاہیوں کے پہرے اور ان کوٹھڑیوں میں بالکل اسی طرح بیٹھے یا لیٹے ہوئے زرد زرد انسان۔ یہ موت کے مسافر چھ چھ فٹ لمبی چوڑی پختہ سیمنٹ کی بنی ہوئی کوٹھڑیوں میں بھوتوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ اس ساری فضا اور اس سارے نقشہ میں موت کا سناٹا اور نزع کا کرب تھا جب میں ان کے سامنے پہنچا تو مجھے جولائی کی صبح کو ہوا اتنی تیز سنسناتی اور چلاتی ہوئی معلوم ہوئی کہ میں گھبرا اٹھا۔ ایسا معام ہوتا تھا گویا ساری فضاء ساری زمین اور سارا آسمان رو رہا ہو۔ گویا موت کے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی ہو۔ اس علاقے میں شیشم اور پپیل کے درخت کافی تھے۔ ہوا کے تھپڑوں سے ان درختوں کے پتوں کے ٹکرانے سے عجیب گھناؤنی اور ہولناک آوازیں سنائی دینے لگتی تھیں۔ پھانسی والوں کی کوٹھڑیوں کے تین بلاکوں کے عین درمیان میں ایک چھوٹے سے احاطہ کی چار دیواری کے لکڑی کے دروازہ پہ پہنچ کر جمعدار رک گیا اور جیب سے چابی نکال کر مجھ سے کہنے لگا یہ لیجئے آپ کے لیے ڈپٹی صاحب نے یہ جگہ مقرر کی ہے۔“

یہ فقرہ سن کر اور یہ سارا منظر دیکھ کر میں سناٹے میں آ گیا۔ بدترین مجرموں کی کوٹھڑیوں سے گزر کر، ان سے بھی آگے موت کے مسافروں کے عین درمیان میں اس احاطہ میں بالکل تنہا رہ کر میں کتنے دن زندہ رہ سکتا ہوں، یہ سوال پہلی بار میرے دل میں پیدا ہوا مگر دل ہی میں رہ گیا۔ اس لیے کہ جمعدار نے تالہ کھولا میں دروازہ سے گزرتا ہوا احاطہ میں داخل ہوا۔ ایک مٹکا پانی، ایک مٹی کا لوٹا، ایک پیالہ اور کھجور کی ایک چٹائی میرے حوالے کر کے جمعدار نے دروازہ بند کر دیا اور باہر سے تالہ لگا دیا۔ احاطہ میں ایک چھوٹا کمرہ تھا۔ لطف یہ ہے کہ اس کمرے میں سلاخوں والے جنگلہ کا دروازہ تھا مگر احاطہ کا دروازہ لکڑی کے دوپٹ کا دروازہ تھا جس میں سے کچھ دکھائی بھی نہیں دے سکتا تھا۔

اس چار دیواری میں چٹائی بچھا کر مٹی کے لوٹے کو سامنے رکھ کر جب میں لیٹا تو پہلی بار اس تنہائی کے احساس نے مجھے ڈس لیا اور میری آنکھوں میں آنسو آگئے لیکن انہیں پیتے ہوئے میں نے جیسے اپنے آپ سے مذاق کرتے ہوئے دل ہی دل میں کہا ”حمید اختر! اگر کھجوریں بھی ہوتیں تو شاید تم پیغمبر ہو جاتے۔“

پہلا دن

ڈسٹرکٹ جیل ملتان کی دو تہائی کے اس احاطہ میں میں نے پہلا دن جس طرح گزارا ہے وہ عمر بھر یاد رہے گا۔ احاطہ میں جو کمرہ تھا وہ لاہور کے سیاست خانہ کی کوٹھڑیوں سے قدرے بہتر تھا کیونکہ اس کی لمبائی چوڑائی ذرا زیادہ تھی۔ کمرے میں ایک سلاح دار دروازہ اور دو کھڑکیوں کے علاوہ دو روشن دان بھی تھے۔ پھر اس کا کچا فرش بھی احاطہ کے صحن کی سطح سے کوئی آدھ فٹ اونچا تھا، لیکن تہائی نے مجھے جس طرح گھیرا ہوا تھا اس سے میری روح لرز رہی تھی۔ احاطہ کا دروازہ باہر سے بند تھا۔ اس پر تالہ پڑا ہوا تھا۔ احاطہ کے اندر کمرے میں کھجور کی ایک چٹائی پر مٹی کا پیالہ، مٹکا اور لوٹا سامنے رکھے میں بالکل یکہ وتہا پڑا تھا۔ یہ دو پہر اتنی سنگین، اتنی شدید اور گراں بار تھی کہ میں اس کے نیچے پسا جا رہا تھا۔ اس پر ہوا کے جھکڑ فرائے بھرتے ہوئے چل رہے تھے۔ احاطہ کی دیواروں کے ساتھ ساتھ باہر پیپل اور شیشم کے درخت تھے جن کے پتے بڑے زور سے ہلتے اور سرسراتے ہوئے نظر آتے پھر ہوا ان میں سے گویا چیختی اور روتی ہوئی گزرتی تھی۔

اس پر اس فضا اور ماحول کے ساتھ ساتھ اس احاطہ کا محل وقوع جو قاتلوں اور پھانسی کے امیدواروں کے درمیان تھا وہ اور بھی پریشان کن تھا لیکن سب سے زیادہ تکلیف دہ چیز یہ تہائی تھی۔ اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر تو انسان بڑے سے بڑے فرعون سے ٹکر سکتا ہے۔ بڑی بڑی مصیبتیں اور صدمے سہہ سکتا ہے لیکن ان کے بغیر اس کی حیثیت اور اس کی وقعت کچھ بھی نہیں رہتی۔

اس چٹائی پر لیٹے لیٹے پوری دو پہر میرے سامنے اپنے نچھڑے ہوئے دوستوں کے چہرے آتے رہے اور لاہور جیل کے سیاست خانہ کی وہ تنگ و تاریک کوٹھڑیاں مجھے فردوسِ گم گشتہ بن کر یاد آ رہی تھیں جن کی تپتی ہوئی اور آگ برساتی ہوئی گرمی میں نے دو مہینے سے زیادہ عرصہ دوستوں کی معیت میں گزارا۔ کبھی مجھے ندیم قاسمی کی پیاری بچوں کی سی معصوم صورت نظر آتی۔ ان کی ہمدردی، شفقت اور محبت یاد آتی۔ وہ لطفی، چٹکے اور تاش کی بازیاں یاد آ جاتیں جنہوں نے مجھے دو مہینے کے اس پورے جائزہ عرصے میں ہر تکلیف کو خندہ پیشانی سے بسر کرنے کے قابل بنایا۔ کبھی غلام محمد چائے کی کیتلی اٹھائے دوستوں کی خدمت میں مصروف نظر آتا تھا۔ وہ محبت اور خدمت کا پتلا جو صرف کام کرنا جانتا ہے۔ جو باتیں نہیں کرتا، صرف کام کرتا ہے اور دوستوں پر قربان ہوتا آیا ہے۔ پھر فیروز الدین منصور کی بوڑھی کھانسی اور اس کا کھلا ہوا منہ اور بچوں کی سی حرکتیں یاد آتیں۔ کبھی ظہیر کاشمیری کی بقول شخصے لوہ چون داڑھی اور اس کی کشمیری گیتوں کی تانیں یاد آ جاتیں۔ پھر افضل اور شوکت منٹو اور تمام دوست جو جیل میں ہمارے ساتھ رہے سب یاد آنے لگے۔ اب جانے یہ سب کہاں ہیں۔ ظالموں نے دنیا اور اس کے حسن اور اس کی گہما گہمی سے الگ کیا۔ عزیزوں اور محبوبوں سے جدا کیا۔ اس پر

بھی ہم خوش رہے تو پھر سب کو ایک ایک کر کے جانے کہاں ڈال دیا۔ حسن عابدی کے بارے میں مجھے صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ اسے ہم سے جدا کر کے لاہور کے شاہی قلعہ میں لے گئے تھے۔ مجھے بار بار اس کا خیال آ رہا تھا کیونکہ لاہور کے قلعہ سے جو داستانیں منسوب ہوتی آئی ہیں ان سے ہر محبت وطن شہری واقف ہے اور اس دہشت اور جبر کو وہی جانتا ہے جو وہاں پر ہوتا ہے۔ نہ معلوم اس پر کیا گزر رہی ہو۔ کیا معلوم کتنے لوگوں کو ہم سے علیحدہ کر کے قلعہ میں ڈالا گیا اور ان کے ساتھ کیا کیا سلوک روا رکھا جا رہا ہو۔ پھر جن کو ایک ایک کر کے مختلف جیلوں میں ڈال دیا گیا ہے ان کی کیا حالت ہوگی؟ میں بہت دیر تک یہ سب باتیں سوچتا رہا اور پریشان ہوتا رہا۔ اس تنہائی میں میں بچوں کی طرح پنجاب کی ہر جیل کے بارے میں سوچتا رہا اور پنجاب کے پورے نقشے کو ذہن میں لا کر بچوں کی طرح یہ غور کرتا رہا کہ شاید فلاں آدمی فلاں جیل میں ہو۔ پھر اپنے آپ سے کہتا نہیں وہ اس جیل میں نہیں ہوگا بلکہ فلاں جیل میں ہوگا۔

اسی طرح خیالات کے تانے بانے میں غرق میں وقت گزارنے کی کوشش میں لگا رہا لیکن وقت کسی طرح گزرنے ہی میں نہیں آتا تھا۔ دوپہر پہاڑ کی طرح میرے سینے پر سوار تھی۔ ملتان کی دوپہر اور جولائی کا مہینہ! ایسا سناٹا اور ایسی دہشت تھی، اور میرے دل کی حالت اتنی نازک تھی کہ مجھے کئی بار اپنے آپ سے خوف آنے لگا۔ میرے پاس دو سے تین کتابیں تھیں لیکن ڈپٹی صاحب نے باوجود میرے اس یقین دلانے کے کہ یہ لاہور سی آئی ڈی کی طرف سے سنسر ہو چکی ہیں یہ سب کتابیں اپنے طور پر ایک بار پھر سنسر کرنے کے لیے رکھ لی تھیں۔ صرف ہیر وارث شاہ کا ایک نسخہ انہوں نے مجھے اپنے ساتھ لے جانے کی اجازت دی تھی۔ سب طرف سے مایوس ہو کر میں نے اپنے سوٹ کیس میں سے ہیر وارث شاہ نکالی اور اپنے گلے کے پورے زور سے تان لگائی۔

ہیر آکھیا جو گیا جھوٹ آکھیں کون رٹھڑے یار مناوندا ای

ایسا کوئی ناں ملیا میں ڈھونڈھ تھکی جیہڑا اکھیاں نوں موڑ لیاوندا ای

جیل کے سناٹے میں یہ آواز گونجی اور پھر گرم ہو گئی پھر خاموشی اور سکوت طاری ہو گیا۔

ہیر پڑھنے میں بھی مجھے لطف نہیں آ رہا تھا۔ صبح سے چائے بھی نہیں پی تھی اور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ صاحب نے آئندہ کے لیے چائے کی طرف سے صاف جواب دے دیا تھا اس لیے طبیعت بہت پریشان تھی تھوڑی دیر تک خاموش لیٹے ہوئے میں اپنی اس منحوس زندگی کے بارے میں سوچتا رہا۔ اتنے میں کسی چیز نے زور سے میری کمر پر کاٹا۔

میں گھبرا کر اٹھا اور اٹھ کر جو میں نے چٹائی پر پھٹی ہوئی اپنی سفید چادر پر نظر دوڑائی تو مجھے اپنے اس بستر پر کروڑوں کی تعداد میں چیونٹیاں نظر آئیں۔ قطار اندر قطار وہ چاروں طرف سے چلی آرہی تھیں اور میرے بستر پر ہی نہیں

پورے جسم پر حملہ کر چکی تھیں۔ چیونٹیوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ سفید چادر پر انہوں نے بھورے رنگ کی ایک اور چادر بچھا دی تھی۔ نہ جانے کب سے وہ بھوکی پیاسی اس سرزمین پر رہ رہی تھیں۔ آج ان کو اپنی غذا نظر آرہی تھی اور وہ دیوانہ وار میری طرف بڑھ رہی تھیں۔ میں سرپکڑ کر بیٹھ گیا۔ ایک مصیبت کے ساتھ کتنی بہت سی مصیبتیں چلی آرہی تھیں۔ اب اس عذاب سے کیسے نجات حاصل کروں؟ چار پائی نہیں ہے۔ زمین پر لیٹوں گا تو ان سے چھٹکارا پانے کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی۔ میں کہاں پر آ گیا ہوں۔ خدا تعالیٰ نے تو یہ فرمایا تھا کہ قبر میں چیونٹیاں عذاب الہی بن کر نازل ہوں گی مگر میں قبر میں نہیں ہوں۔ بہت سوچا کہ کہیں قبر میں تو نہیں آ گیا ہوں حالات ملتے جلتے تھے آثار و قرائن سے بھی شبہ ہوتا تھا کہ قبر ہی میں ہوں لیکن بہر حال دماغ نے یقین دلایا کہ قبر میں نہیں ہوں۔ تو پھر یہ عذاب الہی کیوں نازل ہو رہا ہے میں نے تنگ آ کر ان کو مارنا شروع کیا مگر وہ کہاں ختم ہونے والی تھیں۔ ایک مارتا تو دس اور آجاتیں سگریٹ سلگا کر بہت سی زندہ آگ میں جلا ڈالیں مگر ان کا جذبہ بہت زبردست تھا کسی طرح باز نہیں آتی تھیں۔ آخر میں ہی تنگ آ کر اور یہ سوچ کر چپ بیٹھ گیا کہ بہت دنوں سے خانہ خالی میں پریشان تھیں، اب دیو آ گیا ہے تو یہ بھی جوش میں آرہی ہیں۔ آہستہ آہستہ کم ہو جائیں گی۔ یہ فیصلہ کر کے لیٹ تو گیا مگر اتنی چیونٹیاں بھلا آرام کہاں لینے دیتی ہیں۔ وقت گزارنے کے لیے میں نے مجبور ہو کر پھر ہیر وارث شاہ اٹھائی اور ایک تان پھر گلے کے پورے زور سے لگائی۔

اسیں فقر اللہ دے ہاں پورے گج منگ لے اساں تھیں گوریئے نی

سوال کسے دامول ناں رد کریئے، دن رات اللہنوں سوریئے نی

موت کا سکوت ایک دفعہ پھر ٹوٹ گیا۔ خاموشی اور سکوت کا طلسم ختم ہو گیا اور گویا یہ ڈراؤنی آواز دوپہر کے سینے

میں پوست ہو گئی۔

پھر خاموشی چھا گئی..... اچانک احاطہ کا دروازہ کھلا اور ایک کالا کلوٹا سپاہی وردی پہنے احاطے میں داخل ہوا۔

دروازہ کو اندر کی طرف سے احتیاط سے بند کر کے وہ قدم قدم چلتا ہوا میری طرف بڑھ رہا تھا۔ میں تو یہی سمجھا کہ یہ بھی مجھ سے کہے گا کہ ڈپٹی صاحب نے حکم دیا ہے سی کلاس کے قیدی ہیر وارث شاہ اونچے سروں میں نہیں پڑھ سکتے کیونکہ روز اس کی اجازت نہیں دیتے لیکن وہ بڑی معصومیت سے میرے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔

”تسیں ہیر پڑھ رہے سو؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں!“ میں نے کہا۔

”میں تو ڈرتے ڈرتے آیا ہوں ہمیں حکم ہے کہ آپ کے پاس نہ بیٹھیں آپ کی باتیں نہ سنیں لیکن میں ہیر کاٹپہ

سن کر آگیا ہوں۔ کیا آپ مجھے تھوڑی دیر ہیر نہیں سنائیں گے؟“

میں نے اس کو بہت اصرار سے اپنے پاس بٹھا کر بہت دیر تک یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ میں کسی کے سامنے ہیر گا کر نہیں پڑھ سکتا صرف اپنی تنہائی کے خوف سے نجات پانے کے لیے میں تھوڑی دیر گانے لگا تھا۔

پہلے تو اسے یقین نہیں آیا مگر تھوڑی دیر کے بعد جب اس کی سمجھ میں میری بات آگئی تو وہ میرے پاس بیٹھ کر ہیر کی کتاب کھول کر پڑھنے لگا۔

”تم پڑھ سکتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”میں تو چار جماعتیں پڑھا ہوا ہوں جناب؟“ اس نے فخریہ لہجہ میں کہا۔

تھوڑی دیر تک اپنے آپ گنگناتے رہنے کے بعد اس نے اونچے سروں میں ہیر پڑھنا شروع کر دی۔ اس کی آواز بہت اچھی تھی۔ گھنٹہ بھر تک وہ ہیر گاتا رہا اور میں سنتا رہا۔ اس طرح اہل پنجاب کے اس عشقیہ قصے کے زور نے میری مصیبت کے اس پہاڑ سے دن میں چند لمحوں کے لیے خوشیوں کے موتی بھر دیئے۔

سپاہی نے بڑی حسرت سے مجھے بتلایا کہ اسے ہیر پڑھنے کا بے حد شوق ہے مگر آج تک وہ اپنی قلیل تنخواہ میں سے تین چار روپے نکال کر یہ کتاب نہیں خرید سکا۔ اس لیے اسے پڑھنے میں دقت ہو رہی ہے۔ میں نے اس سے کہا تم میرے پاس آ کر روزانہ اس کا سبق لے لیا کرو اور مجھے تھوڑی دیر تک ہیر سنا بھی دیا کرو۔ اس نے ڈرتے ڈرتے مجھ سے کہا ”میں تو سارا دن آپ کے پاس بیٹھا ہوں مگر ڈرتا ہوں۔ پھر بھی چوری چھپے میں آجایا کروں گا اور آپ سے پڑھ بھی لیا کروں گا اور آپ کو سنایا بھی کروں گا۔ اچھا اب دیر ہو گئی ہے کوئی آفیسر نہ آجائے میں چلتا ہوں۔“

اس کے جانے کے بعد میں دیر تک قیدیوں اور قیدیوں کے ان محافطوں کے بارے میں سوچتا رہا جو اپنا شوق پورا کرنے کے لیے اپنے روایتی ورثہ کے عاشق ہونے کے باوجود اسے خرید کر اپنے پاس رکھنے کی استطاعت سے محروم ہیں۔

اس کے جانے کے بعد احاطہ کے باہر پھر تالا پڑ گیا۔ پھر وہی کنج قفس تھا اور پھر وہی تنہائی تھی۔

ڈاکٹر صاحب کی آمد

شام کے سائے اب کچھ بڑھ گئے تھے۔ میں نے کمرہ میں سے باہر نکل کر احاطہ میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ احاطہ کے باہر چہل پہل کے آثار نظر آنے لگے تھے کیونکہ قیدی اب مختلف بیروں میں اپنی مشقتوں سے فارغ ہو کر آچکے تھے اور ادھر ادھر بیٹھے گپ کر رہے تھے، کچھ ٹہل بھی رہے تھے، بعض قیدی دو دو چار چار کی ٹولیوں میں جمع ہو کر گانے کا شغل بھی کر

رہے تھے۔ میں نے یہ تمام منظر احاطہ کے دروازہ کی درزوں میں سے جھانک کر دیکھا۔ میرا درزوں کے ساتھ لگ کر اس طرح جھانکنا بالکل ایسا ہی تھا جیسے مسلمان پردہ نشین عورتیں اپنے گھروں میں سے باہر کی دنیا کو دروازوں کی درمیانی درزوں میں جھانک لیا کرتی ہیں۔

اپنے مقابلے میں مجھے یہ اخلاقی قیدی جو نہ معلوم کتنی چوریوں اور ڈاکوؤں کے مقدمات میں ماخوذ تھے، بہت ہی خوش قسمت نظر آتے تھے کیونکہ وہ میری طرح تنہا نہیں تھے۔ انہوں نے جیل خانے میں بھی اپنی چھوٹی سی دنیا آباد کر لی تھی۔ ان کی اپنی چھوٹی چھوٹی خوشیاں اور چھوٹے موٹے غم تھے۔ اپنی دوستیاں، دشمنیاں اور اپنے پروگرام تھے وہ اپنے ہم جنسوں میں تو تھے لیکن میرے ارد گرد تو تنہائی اور اداسی اور ویرانی کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا۔

دروازہ سے الگ ہو کر میں نے پھر احاطہ میں ٹہلنا شروع کیا۔ احاطہ کی لمبائی میرے کوئی بتیس قدموں میں ختم ہو جاتی تھی۔ وقت گزارنے کے لیے میں نے اپنے قدم گننا شروع کئے پھر چوڑائی دیکھی کوئی بیس قدم ہوگی لیکن احاطہ کی چار دیواری بہت ہی اونچی تھی۔ مجھے اپنے گرد کی دیواریں میلوں اونچی نظر آرہی تھیں اور سر پر آسمان کا ایک ٹکڑا جو ٹوپی کی شکل میں اس چار دیواری پر جھکا ہوا تھا اس کے علاوہ اور کچھ بھی نہ تھا۔

وقت گزارنے کے لیے میں نے اس پہلے روز جس قسم کی حرکتیں کی ہیں، انہیں یاد کر کے مجھے اب تو ہنسی آتی ہے لیکن اس وقت میں بچوں کی طرح ان حرکتوں ہی سے دل خوش کر رہا تھا۔ احاطہ میں چکر لگاتے ہوئے میں اپنے قدموں کو گنتا تھا۔ پھر چلنے سے زمین پر جو نشان بنتے تھے انہیں گنتا تھا۔ پھر ہوا کی سائیں سائیں میں درختوں کے جو پتے زمین پر گرتے تھے انہیں جمع کر کے ان کو مختلف ڈھیریوں میں تقسیم کرتا تھا لیکن دن کسی طرح گزرنے ہی میں نہ آتا تھا۔ یوں تو مجھے اس احاطہ میں آئے چار پانچ گھنٹے ہی گزرے تھے لیکن مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا گویا میں صدیوں سے اس جگہ مقید ہوں۔ اس چار دیواری میں، اس آسمانی ٹوپی کو سر پر رکھے میں دیر تک یہ سوچتا رہا کہ میں بیسویں صدی کا روبن کرو سو تو نہیں ہوں جسے اہرنسی طاقتیں اس گمنام جزیرے میں پھینک گئی ہیں۔ لیکن ٹھوس مادی حقیقتیں میرے سامنے تھیں۔ ٹھوس بھوری دیواریں میری چھاتی پر سوار تھیں اور میں ایک لمحہ کے لیے بھی اس حقیقت کو فراموش نہیں کر پاتا تھا کہ میں حمید اختر نظر بندی کلاس ہوں جسے روز آگ جلانے یا چائے پکانے کی اجازت نہیں دیتے، جسے سونے کے لیے چار پائی نہیں مل سکتی، جسے زندگی ہی میں ایک لمحہ میں اتار کر چیونٹیوں کے حوالے کر دیا گیا ہے اور جسے گرفتار کر کے گورنر پنجاب بالکل مطمئن ہیں کہ اس شخص کو احتیاطی طور پر نظر بند رکھنا ضروری تھا ورنہ بصورت دیگر امن عامہ میں خلل پیدا ہونے کا امکان تھا۔

شام کے کوئی چار بجے احاطہ کا دروازہ کھلا اور جیل کے ڈاکٹر صاحب نمودار ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب کے ماتھے پر

مجھ سے بات کرنے سے پہلے ہی تیوریاں پڑی ہوئی تھیں۔ ہسپتال کے دو مشقتی دوا کی شیشیاں ایک بکس میں رکھے ہوئے ان کے آگے چل رہے تھے۔ دوا کی ان آٹھ بوتلوں میں جوان کے ہمراہ تھیں، آٹھ، پندرہ، بیس، پچیس، تیس قسم کے نمبر لگے ہوئے تھے۔

میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ لاہور میں مجھے چائے پکانے اور پینے کی اجازت تھی لیکن یہاں پر میرا چائے کا سامان روک لیا گیا ہے۔ میرا معدہ ہمیشہ خراب رہتا ہے اور چائے کے بغیر میرے لیے زندہ رہنا ناممکن ہو جائے گا۔

”کوئی بات نہیں“ ڈاکٹر صاحب نے کہا۔

میں نے پھر کہا ”میری چھاتی میں درد رہتا ہے اور سانس لینے میں کافی تکلیف ہوتی ہے۔“

”پریشانیوں میں ایسا ہی ہو جاتا ہے“ ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا۔

”ڈاکٹر صاحب قبلہ!“ میں نے پھر عرض کی ”میرا معدہ اور ہاضمہ بے حد خراب ہے۔ ازراہ کرم کوئی دوائی دیتے جائیے ورنہ میرے لیے بہت مشکل ہو جائے گی۔“

ڈاکٹر صاحب نے مشقتی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”اس کو اٹھارہ نمبر دے دو“

مشقتی نے اٹھارہ نمبر کی بوتل اٹھائی۔ اس میں ایک خوراک انڈیلی اور میرے حوالے کر کے پھر کھڑا ہو گیا۔

میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ مجھے دوائی کسی شیشی میں ڈال کر دی جائے یا کوئی پڑیا ہی دے جائیں مگر انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ قیدیوں کو شیشی رکھنے کی اجازت نہیں ہے کیونکہ شیشی توڑ کر اور اس کا شیشہ کھا کر قیدی خودکشی کر سکتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب، ان کے مشقتی اور ان کی اٹھارہ، پندرہ اور بیس، پچیس نمبر کی بوتلیں چلی گئیں۔ دروازہ پھر بند ہو گیا۔ باہر پھر تالہ پڑ گیا۔ پھر وہی تنہائی اور ویرانی میرے چاروں طرف پھیل گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد باہر سے شور کی آوازیں آنے لگیں۔ میں نے دروازے کے سوراخوں میں سے جھانک کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ روٹی آگئی ہے۔ لاگری ایک بڑی سی جالی کندھوں پر اٹھائے چلے آ رہے تھے۔ جالی میں تنور کی بڑی بڑی روٹیاں تھیں اور لوہے کی بڑی بڑی بالٹیوں میں سبزی اور دال پکی ہوئی رکھی تھیں۔ دو تنہائی کے تمام قیدی اپنی اپنی کوٹھڑیوں میں سے اپنی لوہے کی باٹیاں اٹھالائے اور ایک قطار میں بیٹھ گئے۔ لاگری ہر قیدی کی بالٹی میں دال اور سبزی ڈالتا اور ہر ایک کے ہاتھ پر تنور میں لگی ہوئی دو روٹیاں رکھ دیتا تھوڑی دیر میں بھگتان ہو گیا اور قیدی روٹی کھانے میں مشغول نظر آئے۔

مجھے اس وقت سخت بھوک لگ رہی تھی چنانچہ جب میں نے ایک لائگری کو پتیل کا تھال ہاتھ میں لیے اپنے دروازہ کی طرف بڑھتے دیکھا تو میں نے دروازہ سے ہٹ کر اندر سے چٹائی اٹھائی اور باہر احاطہ میں بیٹھ کر روٹی کا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر میں احاطہ کا دروازہ کھلا اور لائگری روٹیاں چٹائی پر رکھ کر اور دال اور سبزی میری پلیٹ میں ڈال کر چلتا بنا۔

میری دال اور پیٹھے کی سبزی میں تیل تو حسب وعدہ نہیں ڈالا گیا تھا مگر میرے سامنے سوال یہ تھا کہ اس میں گرم کئے بغیر کئی کیسے ڈالوں۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے جو نظر اٹھا کر دیکھا تو چیونٹیاں ہزاروں کی تعداد میں جمع ہو کر آن پہنچی تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ چیونٹیاں روٹیوں پر ریگتی نظر آئیں۔ میں نے ایک بار روٹیوں کو جھاڑ کر رکھا مگر یہ ظالم تو آن واحد میں روٹیوں کی اندرونی تہوں تک پہنچ چکی تھیں ان سے بچنے کو کوئی صورت ہی نہ تھی۔

گھی گرم تو نہ کیا جاسکا مگر چونکہ گرمی کی وجہ سے پگھلا ہوا تھا اس لیے اسے اسی صورت میں دال اور سبزی میں ڈال کر میں نے کسی نہ کسی طرح چند لقمے زہر مار کئے۔ مٹی کے پیالہ میں پانی پی کر خدا کا شکر ادا کیا اور چٹائی پر دراز ہو کر ہیر وارث شاہ پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔

شام ہو گئی تھی مگر یہ شام کتنی اداس اور کس قدر گرانا رہی۔ اس کا ایک ایک قدم مجھے کچلتا ہوا گزر رہا تھا۔ اس کی ویرانی اور اس کی خاموشی اور سکوت اور اس کا سناٹا چاروں طرف بکھرا پڑا تھا۔ میرے اپنے وجود اور میری روح میں اتنی کسک اور ایسا درد تھا جسے میں برداشت نہ کر پاتا تھا۔ تنہائی مجھے کانٹے کھا رہی تھی لیکن اسے برداشت کرنے اور اس ظلم کو سہنے کے سوا کچھ بھی تو نہ ہو سکتا تھا۔

پہلی رات

اس کمرے کا دروازہ بند ہوا۔ پھر اس پر ایک موٹا تالہ پڑ گیا۔ پھر احاطہ کا دروازہ بند ہو گیا اور اس پر بھی ایک تالہ پڑ گیا۔ میرے کمرے کے سلاخ دار دروازہ سے باہر ایک مدہم سی لائین رکھ دی گئی تھی۔ میں نے بستر اس طرح جمایا کہ لائین کی روشنی اتنی تو اندر پہنچ جائے جس میں میں کچھ پڑھ سکوں۔

میں لیٹ تو گیا مگر عجیب پر اسرار اور ڈراؤنی رات تھی۔ چاروں طرف خاموشی تھی مگر یہ خاموشی جیسے زبان بن کر مجھے ڈس رہی تھی۔ ایسا ڈراؤنا سکوت اور اس قدر خوفناک ماحول تھا کہ میرا دل دہلنے لگا۔ کمرے میں جب کوئی چھپکلی سرسراتی تو مجھے ایسا معلوم ہوتا گویا سانپ یا بچھو ادھر ادھر چل پھر رہے ہیں۔ باہر گہری تاریکی تھی اور میں ایک ادیب، ایک حسن کار اور ایک جذباتی انسان مردہ لاش کی طرح اس کال کوٹھڑی میں لیٹا ہوا تھا۔

اس طرح لیٹے لیٹے ایک مدت گزر گئی۔ رات آدھی گزر چکی تھی۔ لائین جھلملا کر بجھ گئی اور جولائی کی اس تپتی اور آگ برساتی ہوئی رات میں بالکل تنہا اور بے یار و مددگار زمین پر لیٹا ہوا یہ سوچتا رہا کہ کیا واقعی نوع انسانی نے کوئی ترقی کی ہے۔ ایٹم اور سائنس کے اس زمانے میں اخلاقی قیدیوں ہی کے ساتھ نہیں بلکہ سیاسی قیدیوں کے ساتھ بھی یہ سلوک روا رکھا جاتا ہے کہ انہیں زمین پر لٹایا جاتا ہے۔ بند کمروں اور اندھی کال کوٹھڑیوں میں ملتان جیسے شہر میں بند کیا جاتا ہے۔ جیل کا گھنٹہ بجتا رہا پہرہ والے نمبردار پہرہ بدلتے رہے اور چکر کے برج کا نمبردار پکار پکار کر جیل کے سکوت کو توڑتا رہا مگر مجھے کسی طرح بھی نیند نہ آتی تھی۔

برج کا نمبردار جیل کے ایک ایک علاقہ کا نام لے کر پکارتا ”پیرک چھ نمبر؟“ اس کی آواز گونجتی۔

سب اچھا! ”چھ نمبر کا پہرہ دار نمبردار پورے زور سے جواب دیتا

”ہسپتال کا کمرہ!“

”سب اچھا!“

”اول تنہائی؟“

”سب اچھا!“

”دوم تنہائی؟“

”سب اچھا!“

جب اس دوم تنہائی کے نمبردار نے چیخ کر سب اچھا کہا تو میرا دل چاہا کہ چیخ کر کہوں، ادھر سب اچھا نہیں ہے۔

ادھر تو بڑا کرب اور بڑا درد ہے۔ ادھر ایک کال کوٹھڑی میں ایک ادیب پڑا سو رہا ہے اور تم کہہ رہے ہو سب اچھا۔ بھلا سب اچھا کیسے ہو سکتا ہے۔ یہاں تو موت ہی موت ہے، ظلم ہی ظلم ہے اور تم سب اچھا کہہ رہے ہو۔ اگر وہ نمبردار میرے پاس ہوتا تو مجھے یقین ہے کہ میں اس کا گلا گھونٹ دیتا۔

میرے چاروں طرف پھانسی والے قیدی تھے۔ رات جوں جوں گزر رہی تھی، ان کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔

وہ ایک دوسرے کو آوازیں دے رہے تھے، گارہے تھے، چلا رہے تھے، اللہ رحم کرے گا کی دعائیں مانگ رہے تھے مگر ان کی آوازوں میں موت کے خوف کی آمیزش صاف جھلک رہی تھی۔ آدھی رات تک وہ ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے۔ ان میں سے ایک آدھ کے گانے کی آواز بھی آئی۔ ان کے درد بھرے فقرے بھی سنائی دیتے رہے مگر ان سے جیل کا سکوت اور موت کی سی خاموشی ٹوٹتی نہیں تھی بلکہ اور بڑھتی تھی کیونکہ ان کی آواز میں ایسا سوز اور اس قسم کا گداز تھا جو ہر موت

کے دروازے پر پہنچنے والے کے دل میں پیدا ہو جاتا۔ میں ان میں سے کسی سے واقف نہ تھا ان میں سے کسی کو نہ جانتا تھا لیکن لاہور میں پھانسی والوں کے پاس رہ کر میں اچھی طرح سے سمجھ گیا تھا کہ یہ آوازیں انہی لوگوں کی ہیں۔ آدھی رات کے وقت وہ بھی خاموش ہو گئے۔ صرف پہرہ والے نمبردار اور برج والا چننا رہا۔

تالے

زمین پر لیٹے لیٹے میں نے یہ حساب لگانا شروع کیا کہ میں کتنے تالوں میں بند ہوں۔ ایک تالہ میرے کمرے پر تھا۔ دوسرا تالہ احاطہ کی چار دیواری کے دروازہ پر تھا۔ تیسرا تالہ دوم تہائی کے پھانک پر تھا۔ چوتھا تالہ اس راستے کے دروازہ پر تھا جو دوم تہائی کے پھانک سے جیل کی ڈیوڑھی کو جاتا تھا اور پانچواں اور چھٹا تالہ جیل کی ڈیوڑھی کے اندرونی اور بیرونی دروازوں پر تھا۔

یہ حساب لگاتے لگاتے مجھے ہنسی آگئی اور میں نے اپنے آپ سے مخاطب ہو کر ذرا بلند آواز میں کہا ”حمید اختر! حضرت یوسف کو بی بی زلیخا نے سات تالوں میں بند کیا تھا اور تجھے حکومت پنجاب نے چھ تالوں میں بند کر دیا ہے۔ اگر حکومت تجھے بھی سات تالوں میں بند کرتی تو شاید تیرا نام بھی تاریخ کی کسی کتاب میں، کسی روایت میں زندہ رہ جاتا۔“ لیکن حضرت یوسف تو خدا کے پیغمبر تھے اور میں ایک معمولی انسان تھا۔ نہ تو میں حضرت یوسف کا مقابلہ کر سکتا تھا اور نہ ہی حکومت پنجاب بی بی زلیخا بن سکتی ہے۔ اس لیے میں اپنی اس بھونڈی مثال پر دیر تک ہنستا رہا اور یہ سوچتا رہا کہ کتنے ہی تالے لگ جائیں، کتنی ہی پابندیاں عائد کر دی جائیں، انسانی روح تو قید نہیں کی جاسکتی۔ اسے کون مقید کر کے رکھ سکتا ہے۔ اس پر کون پابندی لگا سکتا ہے؟

یہ سوچتے سوچتے مجھے یہی ساری تکلیفیں اور پابندیاں اور تالوں اور دروازوں کا یہ سارا نظام انتہائی مضحکہ خیز معلوم ہونے لگا میرے دل سے ایک دم سارا بوجھ اتر گیا۔ مجھے واقعی اس ساری واردات، اس سارے عمل پر ہنسی آنے لگی اور تھوڑی دیر کے بعد میں بے سدھ ہو کر سو گیا۔

صبح سویرے آنکھ کھلی تو میری دیکھی، چائے کی کیتلی اور چائے کی پتی کا ڈبہ میرے سرہانے رکھا تھا۔ غالباً جیل والوں نے مجھے زیادہ تنگ کرنا مناسب نہ سمجھتے ہوئے قوانین میں ترمیم کر کے اس کی اجازت دے دی تھی۔ صبح سویرے چائے کو اپنے اس قدر قریب دیکھ کر میری باچھیں کھل گئیں۔ کمرہ کا دروازہ کھل چکا تھا۔ چنانچہ میں چائے کا سامان اٹھا کر احاطہ میں بنے ہوئے چولہے کی طرف بھاگا۔

چولہا نہ معلوم کب سے ویران پڑا تھا۔ اس کا منہ دیکھ کر مجھے خیال ہوا کہ چائے تو آگئی لیکن چولہا گرم کرنے کی

کیا صورت ہوگی کیونکہ میرے پاس ایندھن کا تو نام و نشان تک نہ تھا۔

تھوڑی دیر سوچ بچار کرنے کے بعد میں نے جھاڑوا اٹھائی، اسے چولہے میں جھونکا کچھ تنکے چٹائی میں سے نکالے، ایک پرانی قمیض پھاڑی اور کسی نہ کسی طرح چائے بنا ڈالی۔

چٹائی پر بیٹھ کر میں دیر تک چائے کی چسکیاں لیتا رہا۔ اس وقت مجھے اس وقتی حظ کے سوا اور کچھ بھی یاد نہ رہا۔

چائے کا آخری گھونٹ ختم کرنے سے پہلے میں نے کئی دفعہ اپنی چائے کے ساتھ سگریٹ پینے کے عادت پر قابو پانے کی کوشش کی۔ بد قسمتی سے میں مدت سے چائے کے ساتھ سگریٹ پینے کی عادت میں مبتلا تھا۔ لاہور جیل میں ہر پندرہ روز کے بعد ملاقات کے وقت اتنے سگریٹ گھر سے آجاتے تھے۔ کہ یہ عادت کسی نہ کسی طرح پوری ہوتی گئی۔ مگر لاہور سے دوسو میل دور ملتان جیل میں ایک تو یہ امید ہی نہ تھی کہ باقاعدگی سے گھر سے ملاقات کرنے کے لیے لوگ آتے رہیں گے اور ضرورت کا سامان پہنچتا رہے گا۔ پھر ڈپٹی صاحب نے یہاں ایک اور قانون وضع کر لیا تھا جس کی رو سے پچھلے روز مجھے صرف ایک پیکٹ سگریٹ ملا تھا۔ باقی کے تمام سگریٹ دوسرے سامان کے ساتھ انہوں نے جیل کی ڈیوڑھی ہی میں رکھ لیے تھے۔ اس نئی پابندی کی وجہ سے میں اور بھی پریشان تھا اور سگریٹ نوشی کی عادت میں حتی الامکان کمی کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ چنانچہ میں نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے یہ فیصلہ کیا کہ چائے پینے کے دوران میں سگریٹ نہ پیوں بلکہ وہی ایک سگریٹ چائے ختم کر کے پیوں تاکہ پھر چار گھنٹے آرام سے نکل جائیں۔

چائے سے فارغ ہو کر میں نے پیکٹ کھولا تو اس میں کوئی سگریٹ موجود نہ تھا۔ رات اندھیرے میں پریشانی کے عالم میں میں نے اپنا سارا اشاک ختم کر ڈالا تھا۔ بڑی بوکھلاہٹ میں میں اپنے کمرے سے باہر نکلا۔ احاطہ میں سے گزر کر احاطہ کے دروازہ پہ پہنچا۔ دروازہ باہر سے مقفل تھا۔ دروازوں میں سے دیکھا۔ آس پاس کوئی آدمی نہ تھا۔ دوم تنہائی کے تمام قیدی مختلف بیرکوں میں مشقت کرنے چلے گئے تھے۔ جن کی مشقت مونج کوٹنے کی تھی وہ کسی ایک خاص بیرک میں پہنچا دیئے گئے تھے جہاں مونج کوٹنے کا کام ہوتا ہے۔ دوسرے کارخانے میں کاغذ گھونٹنے، درمی بنانے یا اسی قسم کی مختلف مشقتوں کے سلسلے میں اپنے اپنے کام پر جا رہے تھے۔ دروازوں میں سے باہر مجھے نوکری والا جمعہ ار بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ پھانسی کی کوٹھڑی پر مختلف پہریدار سپاہی موجود تھے۔ اگرچہ ان کو اپنی ڈیوٹی کی جگہ سے ہلنے تک کی اجازت نہ تھی اور نہ ہی میرا ان سے کوئی واسطہ تھا بلکہ میرا دروازہ تک پہنچنا اس کے لیے نوکری سے ہاتھ دھونے کے برابر تھا۔ میں بڑی پریشانی کے عالم میں دروازہ کے ساتھ لگا بالکل اسی طرح دیر تک کھڑا رہا جس طرح مسلمان پردہ نشین خواتین گھروں سے باہر جھانک کر دیکھا کرتی ہیں۔ چائے کے بعد اور پھر صبح کے وقت سگریٹ نہ ہونا بڑی قیامت کی بات تھی۔

میں نے کئی بار دروازہ تھپتھپایا مگر وہاں کوئی سننے والا نہ تھا۔ مجھے اپنے آپ پر، جیل پر اور ڈپٹی صاحب پر اتنا سخت غصہ آ رہا تھا کہ میں بڑی مشکل سے اپنے آپ کو چیخنے چلانے سے باز رکھنے میں کامیاب ہوا، ورنہ جی تو چاہتا تھا کہ ابھی اس قدر زور سے چلاؤں کہ اچھا خاصا ہنگامہ پیدا ہو جائے۔

کوئی ایک گھنٹہ کے بعد جمعدار صاحب نمودار ہوئے۔ پھانسی کی کوٹھڑیوں کے پہریدار سپاہیوں نے غالباً ان کو یہ بتا دیا تھا کہ میں چیخ رہا ہوں۔ وہ جمعدار نظر بند کو بڑی زبردست چیز سمجھتا تھا چنانچہ وہ تالہ کھول کر بڑا سہا اور ڈرا ہوا سا اندر داخل ہوا اور بولا ”جناب! میں کیا کروں؟ اول تنہائی، دوم تنہائی اور ہسپتال کا علاقہ سب کے سب میرے چارج میں ہیں اور مجھے ہر طرف جا کر دیکھ بھال کرنا پڑتی ہے۔ میں یہاں رہوں اور اول تنہائی یا ہسپتال میں کوئی ہنگامہ ہو جائے تو میری شامت آجاتی ہے۔ جیل کا قانون تو اندھا ہے ہی!

میں نے کہا ”حضرت! باتیں نہ بنائیے، بھاگ کر ڈیوڑھی سے سگریٹ کا ایک پیکٹ لے آئیے۔“

جمعدار تھوڑی دیر میں خالی ہاتھ لوٹ آیا۔ اس نے بتایا کہ ڈپٹی صاحب ابھی آئے نہیں اور جس صندوق میں آپ کا سامان رکھا ہوا ہے اس کے قفل کی چابیاں انہی کے پاس ہیں اس لیے ان کے آنے پر ہی سگریٹ مل سکیں گے۔

دس بجے تک جمعدار نے ڈیوڑھی کے کوئی چار چکر لگائے ادھر میرا برا حال تھا۔ سگریٹ میرے اپنے تھے۔ قانون عام اخلاقی قیدیوں تک کو سگریٹ اور بیڑی اپنے پاس رکھنے کی اجازت دیتا ہے مگر ڈپٹی صاحب نے مجھ پر محض اپنے جاہ و جلال کا غلبہ ڈالنے کے لیے سگریٹ اپنے پاس رکھ لیے تھے اور میں چونکہ احاطہ میں قید تنہائی میں بند تھا اس لیے ان تک پہنچ کر ان سے لڑ بھی نہیں سکتا تھا۔

دیر تک میں نئی مصیبتوں اور پابندیوں پر غور کرتا تھا کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کیا کروں۔ دس پندرہ روز تک ڈپٹی صاحب نے مجھے سخت پریشان رکھا۔ سگریٹ ختم ہو جاتے، جمعدار ان کے پیچھے دوڑتے رہتے اور کافی تنگ کرنے کے بعد وہ اس دن کا پیکٹ مجھے دے کر میرے حال پر رحم کرتے، بہر حال دس پندرہ دن کے بعد میرے سگریٹ ڈیوڑھی کی بجائے میرے پاس ہی رہنے لگے تھے۔

ڈسٹرکٹ جیل ملتان میں یہ دوسرا دن میرے لیے بڑی ہی مصیبت کا دن تھا۔ ملتان کی گرمی بڑی خوفناک تھی پھر تیز تیز ہوا چلتی اتنی گرداڑتی کہ میرا منہ، ناک، آنکھ اور تمام سامان اس میں لت پت ہو جاتا۔

پوچھا

جیل کی زندگی میں پوچے کو زبردست اہمیت حاصل ہے۔ ہر جیل میں قیدی اور حوالاتی صبح سویرے تمام احاطوں

اور بیرکوں میں باقاعدگی سے پوچا کرتے ہیں۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ پانی کی بالٹیاں بھر کر وہ زمین پر گرا دیتے ہیں پھر اس پر سی سے بندھے ہوئے دری یا ٹاٹ کے ایک ٹکڑے کو اس طرح پھیر دیتے ہیں کہ زمین کی سطح پانی کو جذب کر کے اس کو ہموار کر دیتی ہے اور گردوب جاتی ہے۔

دس بجے کے بعد میرے احاطہ میں بھی حوالاتیوں کا ایک قافلہ داخل ہوا لیکن جمعہ اساتھ تھا اس لیے کہ حوالاتی مجھ سے بات چیت نہ کر سکیں اور ان کے خیال کے مطابق میں ان میں اپنے جراثیم ڈالنے میں کامیاب نہ ہو جاؤں۔

اس کام کے دوران البتہ یہ ضرور ہوا کہ احاطہ کا دروازہ کھل گیا اور مجھے اپنی اسی چھوٹی سی جیل کے باہر ذرا بڑی جیل دیکھنے کا موقع ملا۔ باہر بھی جیل ہی تھی اس سے آگے بھی جیل ہی تھی مگر مجھے اپنے احاطہ کی چار دیواری کے باہر کی جیل بڑی آزاد اور دلچسپ معلوم ہو رہی تھی۔ لمحہ بھر کے لیے میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ میں اگر عام قیدیوں کی طرح کسی چوری، ڈاکے یا اغوا کے مقدمہ میں آتا اور ان کے ساتھ رہتا، پوچا کرتا، مشقت کرتا تو یہ میرے سیاسی قیدی ہونے سے بہتر رہتا۔ کیونکہ باہر تمام قیدی ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ ان میں آپس میں دوستیاں، دشمنیاں، پسندیدگی، ناپسندیدگی اور محبت اور نفرت کے انسانی جذبے موجود ہوتے ہیں مگر میں تو سیاسی قیدی ہونے کے جرم میں ایسے کنوئیں میں ڈال دیا گیا تھا جس میں سے کچھ بھی نظر نہ آتا تھا اور جس میں رہ کر میں تمام بنیادی انسانی جذبوں سے محروم ہو گیا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد جمعہ کو کسی کام کے لیے حوالاتیوں کو چھوڑ کر احاطہ سے باہر جانا پڑا۔ اس کے جانے کے بعد میں احاطہ کے دروازہ کی دہلیز پر بیٹھ گیا۔ اس دروازہ کے چاروں طرف پھانسی والے قیدی تھے۔ ان کی شکلیں عجیب ڈراؤنی اور خوفناک تھیں۔ ایک تو ان کے ساتھ یہ تصور وابستہ ہونا کہ وہ قتل کر کے آئے ہیں کچھ کم خوفناک نہیں ہوتا، دوسرے ان کی زرد شکلیں ان کو رکھے جانے کا طریقہ اس قدر ظالمانہ ہے کہ انہیں ایک نظر دیکھنے کے بعد ہر آدمی پر دہشت اور ڈر غالب آ جاتا ہے۔ مجھ میں ان کی طرف دیکھنے اور ان سے آنکھ تک ملانے کی جرات نہ تھی۔

وقت گزرنے لگا

آہستہ آہستہ میں اس قید تنہائی کا بھی عادی ہو گیا۔ وقت گزرنے لگا وقت گزرتا رہا۔ وقت تو ہمیشہ ہر جگہ گزرتا ہے۔ کسی کو اپنی چمکی میں پس کر برابر کرتے ہوئے اور کسی پر رحم اور اپنے اکرام کی بارش کرتے ہوئے۔ مجھے وقت اپنے بے رحم ہاتھوں میں پس کر ہی گزر رہا تھا۔

دن اتنے پہاڑ سے لمبے تھے اور راتیں اتنی کرب ناک اور تپتی ہوئی تھیں کہ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کیا کروں۔ دن بھر میں اپنے احاطے میں ٹہلتا رہتا۔ احاطہ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک میرے اپنے ہی قدموں کے نشان بن

جاتے۔ صبح کو حوالاتی پوچا کرنے کے لیے آتے تو یہ نشان مٹ جاتے۔ دروازہ پوچے کے لیے دس منٹ کھلتا اور پھر مقفل ہو جاتا۔ پھر بھنگی آتا۔ دروازہ کھلتا اور پھر مقفل ہو جاتا۔ پھر روٹی دینے کے لیے لانگری آتا۔ دروازہ ایک منٹ کے لیے کھلتا اور پھر مقفل ہو جاتا۔ شام کو راجہ صاحب آتے۔ اب ان کے چہرے کی خشونت نرمی میں تبدیل ہو گئی تھی۔ ان کا وہ چہرہ جو پہلے دن مجھے اس قدر خوفناک دکھائی دیا تھا، اب دب گیا تھا۔ اب ان کی ہنسی اور ان کی نرم و نازک عینک اس پر غالب آ گئی تھی۔ وہ روزانہ شام کو ایک چکر لگاتے، مسکراتے ہوئے اور ہنستے ہوئے مجھ سے پوچھتے ”کوئی تکلیف؟“

میں جواب دیتا ”کوئی ایک تکلیف ہو تو عرض کروں، یہاں تو اول و آخر تکلیف ہی تکلیف ہے۔ اس لئے آپ سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

کبھی کبھی میں کوئی چھوٹی موٹی تکلیف رفع کرنے کی خواہش ظاہر کرتا تو وہ بہت مسکرا کر بڑے اعتماد سے یہ کہہ کر چلے جاتے۔ ”جی بس بالکل ابھی ٹھیک ہو جائے گا“ اور پھر کئی دن نظر نہ آتے۔ ان کی شکل و صورت کے برعکس وہ نوجوان اور نو آموز ہونے کی وجہ سے ابھی لوگوں کو صاف جواب دینے کے عادی نہیں ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ ان میں کچھ سماجی اور مجلسی شعور بھی موجود تھا جس کی وجہ سے وہ چند ہی روز بعد مجھ سے ہر مطالبہ پر ہاں کہہ دیتے لیکن اسے پورا نہ کر سکتے تو میرے پاس ہفتہ ہفتہ بھر نہ آتے۔

دن اتنے ویران تھے اور راتیں ایسی کڑی تھیں کہ میں کبھی کبھی بلبلا اٹھتا۔ چاروں طرف میلی بھوری اور بے مہر دیواریں تھیں اور سر پر آسمان کی ٹوپی، مگر یہ ایسی سلیمانی ٹوپی تھی جسے پہن کر میں خود کچھ نہ دیکھ سکتا تھا۔ ان دنوں میں بڑی سنجیدگی سے غور کرتا رہا کہ زمین اور آسمان کے درمیان میرے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہے۔ میرے قدموں کے نیچے زمین ہے اور سر پر آسمان اور بس اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ یہی دو اٹل حقیقتیں ہیں۔ یہی سب سے بڑی صداقت ہے اور اسی کو انسان فراموش کر کے ان کے درمیان کی چیزوں کے بارے میں سوچتا رہتا ہے اور ان میں دلچسپی لیتا ہے۔ خود میں نے بھی یہی کیا کہ زمین اور آسمان کی طرف کبھی توجہ ہی نہیں کی۔ آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر جو کچھ ہے اسے ہی دیکھتا رہا۔ پھولوں سے، بچوں سے، عوتوں سے، باغوں سے، ندیوں اور چشموں سے پیار کرتا رہا۔ مگر اب آ کر یہ معلوم ہوا کہ ان میں سے کوئی بھی سچا رفیق نہیں ہے۔ کوئی پھول نظر کے سامنے نہیں کھلتا۔ کوئی زلف نہیں لہراتی، کسی چشمہ کا شفاف پانی نظر نہیں آتا۔ صرف دو حقیقتیں ہیں اٹل اور انسان کی ازلی رفیق، زمین جو نیچے تھی اور آسمان جو سر پر ہے اس کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہے۔

ریا کاری

پہلے دس پندرہ روز کے تجربے سے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ریا کاری جیل کے آفیسروں میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ وہ کبھی سچی بات نہیں کہتے۔ وہ کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ ہیں۔ ڈپٹی صاحب اب میرے ساتھ بہت مہربانی سے پیش آتے اور میرے سامنے آکر نوکری والے جمعداروں اور سپاہیوں سے کہتے ”بھئی بھئی کبھی کبھی اس کے پاس آ بیٹھا کرو تاکہ اس کی تنہائی میں کچھ کمی ہو جائے۔“ مگر باہر نکل کر انہی سے کہتے ”خبردار! اس کے پاس ہرگز نہ جانا اور کسی قیدی، کسی حوالاتی کو ادھر جھانکنے بھی مت دینا۔“ بچارے جمعدار اور سپاہی عجیب مصیبت میں تھے۔ آخر تنگ آ کر وہ مجھ سے سچ سچ کہہ دیتے۔

ایک روز تو میں تنہائی سے تنگ آ کر بوکھلا گیا۔ شام کو ڈپٹی صاحب آئے تو میں نے ان سے کہا ”جناب عالی! میں اس تنہائی سے پاگل ہو جاؤں گا میں نے کوئی سنگین جرم نہیں کیا۔ میرے وارنٹ پر قید تنہائی کی سزا نہیں لکھی۔ مجھے سیفٹی ایکٹ میں نظر بند کرنے کا وارنٹ ہے، قید تنہائی میں مار ڈالنے کے لیے نہیں لکھا ہوا ہے۔ اگر مجھے مارنا ہی ہے تو ایک ہی دن مار کر قصہ ختم کر دیجئے۔“

ڈپٹی صاحب نے بہت سوچ بچار کر کے بظاہر ہمدردانہ لہجہ میں کہا ”تمہارے وارنٹ پر تنہائی کی قید نہیں لکھی ہوئی مگر تمہاری تنہائی آٹومیٹک قسم کی ہے۔ کیونکہ نظر بندوں کے قانون میں یہ لکھا ہوا ہے کہ انہیں دوسرے قیدیوں سے نہ ملنے دیا جائے، اب کوئی اور سیاسی قیدی آجائے تو اسے تمہارے ساتھ رکھ دیا جائے۔ اس کے علاوہ تو اور کچھ نہیں ہو سکتا۔“ میں نے کہا ”خدا کے لیے کسی اور کو گرفتار کرائیے۔ یہ اہالیانِ ملتان اس قدر مردہ دل کیوں ہو گئے ہیں۔ کوئی صاحبِ دل اس شہر میں ایسا نہیں ہے جو ایک تقریر کر کے گرفتار ہو جائے۔ مولوی مودودی کے چیلے ہی کو پکڑ لائیے کوئی انسان تو ہو جس سے میں بات کر سکوں۔“

مگر افسوس ہے کہ نہ تو ڈپٹی صاحب میری بات مانے اور نہ ملتان شہر ہی نے کوئی صاحبِ دل پیدا کیا۔

میں نے علامہ اقبال کے اس مصرع کا ورد کرنا شروع کر دیا کہ.....

یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

حسن عابدی

چند روز بعد مجھے معلوم ہوا کہ اس جیل میں ایک اور سیاسی قیدی آیا ہے۔ بس اڑتی اڑتی یہ خبر مجھ تک پہنچ گئی۔

آفیسر لوگوں نے اس معاملہ میں بات تک نہ کی۔ ملازموں اور نمبرداروں کی زبانی معلوم تو ہو گیا کہ کوئی اور سیاسی قیدی آیا ہے مگر یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کون ہے۔ آفیسروں سے میں اس وجہ سے نہ پوچھ سکا کہ ان سے پوچھا تو وہ کہیں گے کیسے معلوم ہوا اور ممکن ہے وہ ڈیوٹی والے جمعدار ہی کو معطل کر دیں یا کوئی سزا دے دیں کہ یہ بات مجھ تک کیسے پہنچ گئی۔

مجھ پر پابندیاں ایسی سخت تھیں کہ ایک مہینہ کے بعد مجھے نئے سیاسی قیدی کی شکل و صورت اور حلیہ معلوم ہوا۔ جو کچھ مجھے معلوم ہوا اس سے مجھے یہ اندازہ کرنے میں کوئی مشکل نہیں ہوئی کہ وہ حسن عابدی ہے۔ مگر اسے مجھ سے علیحدہ رکھ کر جیل والوں نے مجھ پر یہ ثابت کر دیا کہ میرے بارے میں یا تو قید تنہائی کے احکامات حکومت کی طرف سے ہیں جو یہ لوگ مجھے بتا نہیں رہے ہیں، یا یہی لوگ میرا دماغ درست کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

کوئی ڈیڑھ مہینہ کے بعد مجھے اس بارے میں راجہ صاحب سے بات چیت کرنے کا ایک بہانہ ہاتھ آ گیا۔ ”سول ملٹری“ اور ”زمیندار“ اخبار جو مجھے پڑھنے کے لیے ملتے تھے پہلے میرے پاس کئی کئی دن پڑے رہتے تھے مگر جب سے حسن عابدی آیا تھا ڈیوٹی سے بار بار آدمی چکر لگاتا اور اخبار کا مطالبہ کرتا۔ ایک شام میں نے راجہ صاحب سے کہہ دیا ”آج کل اخبار میرے پاس پہنچتا ہے تو فوراً واپسی کا مطالبہ شروع ہو جاتا ہے کیا جیل میں کوئی دوسرا سیاسی قیدی آ گیا ہے؟“ راجہ صاحب نے پہلے تو انکار کیا مگر ابھی ان کی جیل کی سروس چند برسوں کی تھی اس لیے ان میں ریا کاری کم تھی۔ پھر وہ جھوٹ بولتے ہوئے فوراً پکڑے جاتے تھے چنانچہ میں نے ان کے جھوٹے انکار پر ان کو پکڑ لیا تو وہ مان گئے۔

میں نے فوراً انہیں ان کا دوسرے سیاسی قیدی کے آنے پر اسے میرے ساتھ رکھے جانے کا وعدہ یاد کرایا تو وہ بولے ”بی کلاس کا سیاسی قیدی ہے اس لیے اسے آپ کے ساتھ نہیں رکھا جاسکتا۔“

بات ختم ہو گئی۔ حسن عابدی کو ہمارے ساتھ لاہور جیل میں تو سی کلاس ہی میں رکھا گیا تھا مگر بعد میں شاید اسے بی کلاس مل گئی تھی۔ اس لیے ایک جیل میں ہوتے ہوئے بھی ہم لوگ الگ الگ رہنے پر مجبور کر دیئے گئے۔ کوئی ایسا قانون تو مجھے نہیں معلوم تھا مگر مجھے بتایا یہی گیا کہ ہم کو ایک ساتھ نہیں رکھا جاسکتا۔

اس شام مجھے ایک بار پھر یہ سوچنا پڑا کہ مجھ پر سی آئی ڈی والوں کی خاص نظر عنایت ہے۔ ندیم صاحب کو کلاس مل گئی تھی عابدی کو بھی مل گئی میں نے بھی لاہور جیل میں ان کے ساتھ ہی بہتر کلاس حاصل کرنے کی عرضی دی تھی، مگر پولیس والوں نے مجھے سی کلاس میں رکھنے کا فیصلہ کیا تو ضرور میں نے کوئی سنگین جرم کیا ہے۔

اس سنگین جرم کو ڈھونڈنے کی میں نے بہت دنوں کوشش کی، لاکھ مغز کھپائی کی مگر مجھے اپنا کوئی بھی سنگین جرم یاد نہ آیا۔ میں کہانیاں لکھتا تھا۔ اخباروں میں مضمون لکھتا تھا۔ کمیونسٹ پارٹی کے مرکزی اخبار میں کام کرتا تھا۔ اس میں سے

ہر حیثیت مجھے بی کلاس کے قابل بناتی تھی۔ ادیب کو بہتر کلاس ملتی ہے۔ اخبار نویس کو بہتر کلاس ملتی ہے۔ کیونست پارٹی کے مرکزی اخبار میں کام کرنے والا بھی دنیا بھر میں بہتر کلاس کا مستحق ہوتا ہے مگر مجھے یار لوگوں نے چاروں شانے چت کر رکھا تھا۔

اسی ہفتے میں پریڈ کے موقع پر سپرنٹنڈنٹ صاحب سے کاغذ، قلم، دوات اور کلاس کے لیے عرضی لکھنے کی اجازت حاصل کر لی۔ چنانچہ اگلے روز میں نے دوبارہ ہوم سیکرٹری کو عرضی لکھی۔ اس میں بہتر کلاس کی درخواست کی اور مہینوں اس حماقت میں مبتلا رہا کہ میری عرضی پر کوئی ایکشن لیا جائے گا اور مجھے بہتر کلاس مل جائے گی۔

نئے سپرنٹنڈنٹ آگئے تھے۔ کیمبل پور کے پٹھان تھے اور مجھے جب یہ معلوم ہوا کہ وہ فارسی کے کافی سلجھے ہوئے شاعر بھی ہیں تو مجھے ایک گونہ تسکین ہوئی کہ شاعر خواہ جیل کا سپرنٹنڈنٹ ہی کیوں نہ ہو، شریف آدمی ہوگا۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب واقعی شرافت کے پتلے تھے چنانچہ پریڈ پر انہوں نے مجھ سے جب پوچھا کہ تم کیا ہو تو میں نے جواب دیا کہ ”افسانہ نگار اور اخبار نویس ہوں۔“

وہ یہ جواب سن کر کچھ سوچتے ہوئے جانے لگے تو میں نے کہا ”حضور ایک گزارش ہے۔“ وہ رک گئے تو میں نے کہا ”تنہائی کی قید میں رکھ کے آپ لوگ مجھ پر سخت ظلم کر رہے ہیں۔ میرے وارنٹ پر بھی کہیں قید تنہائی نہیں لکھا ہوا اور میں اس تنہائی میں پاگل ہو جاؤں گا۔“

انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا ”واہ؟ ادیب اور شاعر لوگوں کو تو تنہائی کی تلاش رہتی ہے۔ تنہائی میں سوچنے اور غور و فکر کرنے کا موقع ملتا ہے۔ آپ اس سے اس قدر گھبرائے ہوئے کیوں ہیں؟“

میں نے کہا ”جناب؟ یہ تنہائی تو میرے لیے بیماری ہو گئی ہے۔ ایسی تنہائی تو کسی بھی ادیب اور شاعر نے کبھی نہیں مانگی ہوگی۔ پھر اگر آپ مجھے تنہائی میں رکھ کر سوچنے اور غور و فکر کرنے کا موقع دینا چاہتے ہیں تو قلم، دوات اور کاغذ رکھنے کی بھی اجازت دے دیجئے تاکہ میں کچھ لکھ ہی سکوں۔“

”حکومت کی طرف سے بڑی سخت پابندی ہے“ انہوں نے کہا ”کہ آپ لوگوں کے پاس کاغذ، قلم، دوات نہ رہنے پائے۔ قلم، دوات تو نظر بند کو مل ہی نہیں سکتی۔ آپ پڑھتے اور سوچتے رہئے، باہر جا کر لکھئے۔“

جاتے جاتے انہوں نے کہا ”آپ قرآن شریف پڑھا کیجئے آپ کے دل کو قرار آ جائے گا“ پھر ڈپٹی صاحب سے مخاطب ہو کر بولے ”ان کو ایک قرآن شریف بھجواد دیجئے“ یہ کہہ کر وہ اپنے سٹاف کے قافلہ سمیت رخصت ہو گئے۔

میں نے دل میں سوچا کہ میرے دل کو تو آپ کی گفتگوں رہی کافی قرار آ گیا ہے۔ اب قرآن شریف پڑھ کر کیا

کروں گا۔

اگست کا مہینہ بھی گزر گیا۔ ستمبر شروع ہو گیا۔ رت بدل رہی تھی۔ درختوں کے پتے دن بھر گرتے رہتے اور بدلتی ہوئی رت کی اداسی پورے ماحول، پوری فضا اور پوری دنیا پر چھا گئی تھی۔ میں تنہائی کے کنوئیں میں اسی طرح غرق رہا۔ گھر سے کوئی نہ آیا تھا۔ بہن کے خط آتے تو ان میں اس کی بیماری کا ذکر ہوتا جس سے پریشانی اور بڑھ جاتی۔ راتیں اسی طرح تڑپتے ہوئے گزرتیں۔ وقت گزارنے کے لیے میں نے عجیب عجیب راستے نکالے تھے۔ جو اخبار مجھے پڑھنے کے لیے ملتے تھے وہ اس قسم کے تھے کہ ان کو پڑھنے کے بعد میں اپنے آپ سے سوال کرتا کہ ”کون کہتا ہے سیاسی قیدیوں سے مشقت نہیں لی جاتی۔ یہ اخبار پڑھنے کے لیے دے کر جسمانی ہی نہیں بلکہ ذہنی مشقت بھی کرائی جاتی۔ حالت یہ ہو گئی تھی کہ میں ان اخباروں کو الف سے ی تک پڑھتا بلکہ یادگار..... اور پرنٹر پبلشر تک کی لائنیں تک پڑھتا۔ انگریزی اخبار کو پہلے صفحے کے پہلے کالم سے پڑھنا شروع کرتا۔ عام طور پر پہلے صفحے کی خبریں اندر کے صفحوں یا آخری صفحوں پر جاتی ہیں ایسی صورت میں میں پہلے صفحے پر آدھی خبر پڑھ کر چھوڑ دیتا اور اندر کے صفحوں یا آخر تک خبر پڑھ کر ختم نہ کرتا بلکہ ترتیب وار خبریں پڑھتا رہتا۔ جو خبر پہلے صفحے پر ختم ہو جاتی اسے اس امید پر چھوڑ دیتا کہ اخبار ختم کر کے اسے مکمل کروں گا اس طرح سارا اخبار پڑھنے کے ساتھ ساتھ ایک دلچسپی قائم رہتی اور ذہن میں یہ خیال لگا رہتا کہ پتہ نہیں اس خبر کے آخر میں کیا لکھا ہوگا۔ اخبار ختم کر کے اسے پڑھوں گا۔ پھر میں نے اس عادت کو اور بھی ترقی دی اور تمام خبریں آدھی پڑھنے کے بعد اخبار مکمل کر کے پھر ان کے آخری حصے پڑھتا تا کہ وقت کسی نہ کسی طرح کٹ جائے۔

چیونٹیاں اسی طرح تنگ کر رہی تھیں۔ ان سے بچنے کے تمام ذرائع میں نے آزما کر دیکھ لیے تھے مگر وہ میرے بستر، میری روٹی اور کھانے کی تمام چیزوں تک فوراً پہنچ جاتیں۔ بسترز میں پر تھا اس لیے ان کو اس تک پہنچنے میں بڑی آسانی تھی مگر میرے پاس ان کو روکنے کا کوئی بھی ذریعہ نہ تھا۔ تنگ آ کر میں نے ان کے متعلق سوچنا ہی چھوڑ دیا اور انہیں پوری آزادی دے دی کہ وہ قبر میں پہنچنے سے پہلے مجھ پر عذاب الہی بن کر نازل ہوں۔

لڑ جھگڑ کر میں نے لائین اندر اپنے سرہانے رکھنے کی اجازت لے لی، مگر لائین کے ساتھ ہی ہزاروں اور بلائیں بھی نازل ہو گئیں۔ اس کے روشن ہوتے ہی ہزاروں پتنگوں اور کیڑوں مکوڑوں کی درجنوں قسمیں میرے سرہانے آ کر جمع ہو جاتیں۔ شمع کے یہ پروانے کبھی شمع پر گرتے تو کبھی مجھ پر۔ ان کی یلغار سے تنگ آ کر لائین کو ذرا فاصلہ پر رکھتا تو کچھ نظر نہ آتا۔ پھر قریب کرتا تو پروانے زچ کرتے میں یہی سوچتا رہتا کہ پرانے شاعر کتنے بیہودہ تھے جو عمر بھر ان پتنگوں کے قصیدے گاتے رہے جن کی مکروہ شکلوں سے گھن آتی ہے اور جو جسم سے ٹکراتے ہیں تو رو نگھٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

ایک دن ایک چھپکلی کہیں سے آنکلی تھی، ننھی سی جان تھی مگر اس نے آتے ہی پروانوں کا صفایا شروع کر دیا۔ مجھے چھپکلی سے ہمیشہ نفرت رہی مگر اس روز سے میں نے اس سے عشق شروع کر دیا۔ اس کے بعد سے تو ہمیشہ پروانوں کی آمد کے بعد میں اس کا منتظر رہتا اور اگر وہ کچھ دیر کے لیے نہ آتی تو میں اپنے فرش پر بیٹھ کر اس کا انتظار کرتا رہتا اور تنہائی میں اسے پکارتا ”اے مری شمع شبستانِ وصال! جانِ جہاں، میری نازنین گلغامِ حسینہ؟ تو کہاں ہے؟ جلدی آ کہ شمع کے یہ پروانے میری جان کھا رہے ہیں۔“

حشرات الارض

صاحب نظر لوگ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ ملتان کی سر زمین حشرات الارض کے لیے مشہور ہے۔ تنہائی میں میں نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کیا کیونکہ میری کوٹھڑی اور میرے احاطے میں اتنی قسم کے کیڑے مکوڑے تھے کہ اس سے پہلے میں نے ان کو کبھی دیکھا تک نہیں تھا۔ چیونٹیاں ہی کوئی پانچ قسم کی تھیں۔ ایک تو بہت باریک اور بڑی نازک اندام قسم کی بھوری چیونٹیاں تھیں۔ پھر ان سے ذرا بڑی تھیں۔ پھر ایک اور قسم بھی تھی جو ان دونوں سے بڑی تھیں اور ان کا جسم سیاہی مائل تھا۔ اس سے بڑھ کر ایک اور قسم کی چیونٹی بھی تھی جو مکوڑے اور چیونٹی کے درمیان کی ارتقائی کڑی نظر آتی تھی۔ یہ سب سے شریف قسم کی چیونٹیاں نظر آتی تھیں کیونکہ یہ بستر پر میرے ساتھ لیٹی رہتی تھیں مگر کاٹنے کی تکلیف نہ کرتی تھیں۔

ان کے علاوہ ایک روز ایک کنکھجور صاحب بھی برآمد ہوئے مگر آپ کی موت آپ کو دن کے وقت باہر لے آئی تھی۔ چنانچہ میں نے ان کو مار کر وہیں دفن کر دیا۔

ایک رات میں سویا ہوا تھا کہ ایک مینڈک صاحب ٹہلتے ہوئے آئے اور میری چھاتی پر سوار ہو گئے۔ میرے جسم کو ٹھنڈک محسوس ہوئی تو میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ مینڈک کو اپنے اوپر سوار دیکھ کر میری چیخ نکل گئی۔ میں نے گھبرا کر اسے اپنے جسم سے الگ کر کے پھینکا مگر وہ پھر اطمینان سے میری طرف بڑھنے لگا۔ خوش قسمتی سے لائین ابھی جل رہی تھی۔ میں نے اسے دوسری بار جوتی سے پرے دھکیلا مگر وہ پھر پلٹا اور گھور کے میری طرف دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں کے ڈھیلے باہر ابلے پڑے تھے اور وہ ٹکٹکی باندھے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے پسینے آ گئے۔ فرار کا کوئی راستہ نہ تھا۔ دروازہ کا جنگلا مقفل تھا۔ احاطہ کا دروازہ بھی بند تھا۔ میں ہمت کر کے اٹھا اور جھاڑو لے کر اور آنکھیں بند کر کے میں نے اسے بڑے زور سے جنگل سے باہر احاطہ کے صحن میں پھینک دیا۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد کیا دیکھا ہوں کہ ٹہلتے ہوئے پھر تشریف لارہے ہیں۔

اب تو میں سنجیدگی سے یہ سوچنے لگا کہ یہ کوئی بدروح ہے اور یہ میرا پیچھا نہ چھوڑے گی۔ گھبرا کر میں نے چلانا اور

نمبردار کو بلانا شروع کیا۔ کوئی دس پندرہ منٹ کے بعد پہرہ والا نمبردار برآمد ہوا۔ احاطہ کا دروازہ کھول کر وہ میرے جنگلہ کے پاس آکھڑا ہوا اور بولا ”شاہ جی ڈاکٹر کو بلاؤں؟“

وہ بیچارہ یہ سمجھا کہ شاید میں بیمار ہوں یا میرے پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔ میں نے اس کو مینڈک سے اپنے معرکے کی پوری داستان سنائی اور ہکلاتے ہوئے کہا ”یارا میں نے چار بار باہر پھینکا ہے مگر یہ پھر آجاتا ہے۔“

نمبردار نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا ”ذرا اب کی بار اسے پھر باہر دھکیل دو۔“

نمبردار کی موجودگی کی وجہ سے میرا حوصلہ واپس آ رہا تھا۔ میں نے ہمت کر کے مینڈک کو ایک بار پھر باہر دھکیلا۔ نمبردار نے جھٹ اسے پکڑ کر اپنے ہاتھ پر بٹھلایا اور بولا۔ ”مینڈک کو کبھی باہر کی طرف نہیں دھکیلنا چاہیے کیونکہ اسے جس طرف سے روکو یہ پھر اسی طرف آتا ہے۔“

نمبردار تو یہ کہہ کر رخصت ہو گیا مگر میں بڑی دیر تک مینڈک کے کردار کے اس پہلو پر غور کرتا رہا جو اب تک میری نظروں سے پوشیدہ تھا۔ رات میں نے سوچا کہ انسان تو یہاں مجھ سے کوئی نہیں ملے گا۔ حشرات الارض میں رہتے ہو تو انہی سے دوستی کرو اور انہی میں سے ایک بن جاؤ، تب گزارا ہوگا۔

ایک روز شام کے وقت میں اپنے احاطہ میں ٹہل رہا تھا۔ باہر کا دروازہ اسی طرح مقفل تھا۔ میرے سر پر وہی آسمانی ٹوپی اور قدموں کے نیچے وہی بے رحم زمین تھی۔ میں نے چٹائی بچھا کر کئی بار باہر احاطے میں بیٹھنے کی کوشش کی مگر چیونٹیاں کسی طرح بیٹھنے ہی نہ دیتی تھیں۔ میرے چٹائی پر بیٹھتے ہی ان کی یلغار شروع ہو جاتی اور مجھے اس زور سے کاٹتیں کہ مجھے مجبوراً اٹھ کر ٹھلنا پڑتا۔

اتنے میں میرا دروازہ کھٹکھٹایا جانے لگا۔ میں نے دروازے کے قریب آ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب اپنی اٹھارہ نمبر، پندرہ نمبر اور پچیس نمبر وغیرہ کے ساتھ باہر موجود ہیں۔ جس جمدار کے پاس میرے تالے کی چابیاں تھیں وہ آس پاس کہیں نہیں تھا۔ ظاہر ہے اسے جیل میں اور بہت سے کام بھی تھے۔ چنانچہ وہ جیل کے یا کسی اپنے کام کی وجہ سے ادھر ادھر ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے مشقتی سے کہا ”دروازوں کے بیچ میں سے دوائی کی خوراک دے دو۔ دروازہ کھولنے کی کیا ضرورت ہے؟“

ہسپتال کے مشقتی نے دروازے کے دونوں پٹ ذرا سے کھینچ کر ٹین کی وہ ڈیبا میری طرف بڑھادی جو قیدیوں کو دوائی پلانے کے لیے بنائی گئی تھیں۔ میں نے دوائی پی لی مگر اس روز یہ سوچ کر میرے دل میں ایک مبہم سا خوف ضرور پیدا ہوا کہ اب ڈاکٹر صاحب نے یہ راستہ دیکھ لیا ہے۔ شام کے وقت روزانہ دوائی پینے کے بہانے سے جو یہ دروازہ ذرا سی

دیر کے لیے کھلتا تھا اور میں جو اپنے احاطے سے باہر کی دنیا پر ایک نظر ڈالتا تھا اب وہ بھی نصیب نہ ہوگی۔ چنانچہ آئندہ کے واقعات نے میرے اس اندیشے کو صحیح ثابت کر دیا۔

ڈاکٹر صاحب کے جانے کے بعد میں ابھی بیچ و تاب کھا ہی رہا تھا کہ احاطہ کا دروازہ کھلا اور راجہ صاحب مسکراتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ ان کے ساتھ ڈیوڑھی کا ایک نمبر دار بھی تھا جس نے مٹھائی، آم، بسکٹ کے ڈبے، چائے، چینی، گھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سگریٹ کے پیکٹ اٹھائے ہوئے تھے۔

میں فوراً سمجھ گیا کہ حبیب پاسلوی، جسے یاد کر کے میں لاہور سنٹرل جیل کی ڈیوڑھی ہی میں ہنسنے اور رونے لگا تھا آخر کار میرا مقام پتہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا اور ٹمبس تمبیز کے اس شہر میں جہاں میں حشرات الارض کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا ہوں وہی میرے لیے یہ سب کچھ بھیج رہا ہے۔

حبیب میرا بچپن کا دوست ہے اور لدھیانہ کے ایک سکول میں ہم دونوں قرآن شریف حفظ کیا کرتے تھے۔ میں نے قرآن حفظ کر لیا تھا اور جیل میں تھا۔ اس نے قرآن حفظ نہیں کیا تھا اس لیے جیل سے باہر تھا۔

اس کے اخلاص اور محبت کے بارے میں بچپن کی زندگی سے لے کر آج تک مجھے کبھی کوئی شبہ نہیں ہوا لیکن اس روز اس نے جو انواع و اقسام کے لذیذ میوؤں، بسکٹوں، سگریٹوں اور ضروریات کی چیزوں کے انبار میرے لیے بھیجے تو مجھے جیل کی اس ساری زندگی میں پہلی بار ایک قسم کے تحفظ کا احساس ہوا۔ پہلے مجھے یہ خیال لگا رہتا تھا کہ ایک تو ملتان تک میرے گھر کے لوگوں اور بالخصوص میری بہن کا پہنچنا ہی ناممکن ہے پھر یہ کہ ہمارے ذرائع بھی اتنے نہیں ہیں کہ وہ میری ضروریات پوری کر سکیں سی کلاس میں رکھ کر مہربان حکومت نے مجھے ہی نہیں بلکہ میرے گھر والوں کو بھی شکنجے میں کس لیا تھا۔ سی کلاس میں دو عدد روٹی اور تیل میں پکی ہوئی سبزی کے علاوہ اور کچھ نہ ملتا تھا۔ ویسے تو باہر سے ہم ضرورت کی چیزیں منگوا سکتے تھے مگر ضرورت کی چیزوں کے لیے ظاہر ہے پیسہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ میری کم از کم ضروریات دو سیر گھی، دو سیر چینی، دودھ کے دو ڈبے، سگریٹ بیڑی وغیرہ اس قسم کی تھیں کہ تیس چالیس روپے ناہوار خرچ کر کے یہ سامان مجھ تک پہنچ سکتا تھا۔ مگر یہ رقم کہاں سے آئے گی۔ یہ سوال مجھے بے حد پریشان کرتا۔ دنیا بھر کی آزاد حکومتیں سیاسی نظر بندوں کی ضروریات ہی پوری نہیں کرتیں بلکہ ان کے پیچھے رہ جانے والوں کو بھی الاؤنس وغیرہ دیتی ہیں، کیونکہ جب حکومت ایک شخص کو بغیر مقدمہ چلائے، بغیر کسی جرم کے نظر بند رکھتی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ حکومت نے اپنی مصلحت کے پیش نظر ان کو بند کیا ہے اور قانونی اور اخلاقی طور پر اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کی تمام ضروریات پوری کرے مگر ہماری حکومت نے قانون اور اخلاق ایک مدت سے چھوڑ رکھا تھا اس لیے اگرچہ ہمیں احتیاطاً نظر بند کیا گیا تھا مگر یہ نظر بندی اس قسم کی تھی

کہ جس سے ہمارے ساتھ ہمارے گھر والے بھی مصیبت میں پھنس گئے تھے۔ پھر بھی میں مدت سے اسی پریشانی میں مبتلا تھا کہ میرا خرچ کہاں سے چلے گا۔ مگر اس روز جب حبیب نے یہ سامان بھیجا تو میری باچھیں کھل گئیں اور راجہ صاحب کے جانے کے فوراً بعد میں نے وہ سامان اپنے سامنے رکھ کر اسے چکھنے کا فیصلہ کیا۔ کافی دنوں سے جیل کی دال سبزی کھاتے کھاتے کسی اچھی چیز کے لیے زبان ترس گئی تھی۔ جیل کی دال سبزی تو معلوم ہوتا تھا صابن میں گھول کر پکائی جاتی ہے۔ اس لیے میں نے منہ کا ذائقہ بدلنے کے فیصلے کو فوری طور پر عملی جامہ پہنانا شروع کیا۔

سب سے پہلے میں نے آم کی ایک قاش کھائی۔ پھر بسکٹ کا ایک ڈبہ کھول کر اس میں سے ایک بسکٹ نکال کر کھایا۔ پھر دوسرا ڈبہ کھول کر اس میں سے دوسری قسم کا ایک بسکٹ کھایا۔ دودھ کا ایک ڈبہ کھولا اور اس میں سے ایک چمچ سے دودھ بھی نوش کیا۔ حتیٰ کہ آخر میں میں نے تھوڑی سی چینی بھی پھانگی اور خدا کا شکر ادا کر کے بڑی فراغت سے ایک سگریٹ سلگایا۔

سگریٹ کے ابھی دو ہی کش لیے ہوں گے کہ میری دیرینہ رفیق چیونٹیاں پرے باندھ کر سامان پر حملہ آور ہو گئیں۔ آم، دودھ، چینی، بسکٹ کوئی چیز بھی ان کی زد سے محفوظ نہ رہی۔ پریشانی کے عالم میں میں نے ادھر ادھر دیکھا مگر وہاں یہ سامان رکھنے کے لیے کچھ بھی نہ تھا۔ سوائے خدا کی زمین کے اور یہ دیکھ دیکھ کر میری روح فنا ہوئی جا رہی تھی کہ چیونٹیاں بسکٹوں کی اندرونی تہوں تک پہنچ چکی تھیں۔ ایک بار تو میں نے یہ فیصلہ بھی کر لیا کہ تمام بسکٹ ابھی کھا جاؤں کیونکہ یہ اس سے بہتر ہوگا کہ آٹھ روز میں چار بسکٹ میں کھاؤں اور بارہ یہ کھا جائیں۔ اس فیصلہ پر عمل تو نہ ہو سکا مگر اس سامان کو ان کی زد سے محفوظ رکھنے کا کوئی طریقہ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ میں کبھی اسے بغل میں رکھتا، کبھی سر پر اور کبھی بازوؤں میں لٹکا کر ٹھہلتا مگر اس کا نتیجہ سوائے اس کے اور کچھ نہ نکلتا کہ چیونٹیاں میرے جسم تک پر یلغار کر دیتیں۔ تنگ آ کر میں نے اسی طرح یہ جملہ سامان اپنی کوشٹری کے ایک کونے میں رکھ دیا اور اسے خدا اور چیونٹیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔

اس رات اپنے بستر پر لیٹ کر میں دیر تک اس عجیب و غریب اور مضحکہ خیز پوزیشن کے بارے میں سوچتا رہا کہ میں اور حبیب ایک شہر میں ہیں اور ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہیں۔ قانون ہمیں ملنے تک کی بھی اجازت نہیں دیتا۔ اس بے رحم اور اندھے قانون نے نظر بندوں کے لیے ماں باپ، بھائی بہن اور بیوی کے علاوہ اور کوئی رشتہ ہی باقی نہیں رہنے دیا۔ دوست یار، عزیز کوئی بھی ملاقات نہیں کر سکتا۔ دیر تک میں اپنے خیالوں میں گم یہ سوچتا رہا کہ ملتان میں میرے کتنے عزیز دوست ہیں خود حبیب کا گھر بالکل میرے اپنے گھر کی طرح ہے حبیب کے والد، والدہ، بہن بھائی اور دوسرے عزیز سب مجھے اپنے گھر کے فرد کی طرح چاہتے ہیں۔ مگر وہ مجھے مل سکتے ہیں نہ میں ان سے، ان کے علاوہ اسی گھر میں بچپن کے

اور کتنے دوست ہیں۔ صدیق جو مجھے ہمیشہ اس بات کا رعب دیتا ہے کہ ایک بارتیسری جماعت میں جب سکول کے لڑکے مجھے سینے لگے تھے تو اس نے میری حفاظت کی تھی۔ مشتاق، نذیر، بشیر اور وہ سارا گھر جس میں میں بڑی خوشی خوشی جایا کرتا تھا، آج مجھ سے اس قدر قریب ہو کر بھی اس قدر دور ہے۔

اس رات مجھے نیند نہ آئی۔ رات بھر میں اپنے ہمسائے پھانسی والوں کی باتیں سنتا رہا۔ اس ڈیڑھ مہینے کے عرصے میں میں ان کی آوازوں سے شناسا ہو چکا تھا ان میں سے کسی کو بھی میں نے دیکھا نہیں تھا لیکن ان کی آواز کی کپکپاہٹ اور ان کے دل کی دھڑکن میرے اتنی قریب تھی کہ میں نے ان کی آوازوں کے ذریعہ اپنے ذہن میں ان کی الگ الگ شکلیں قائم کر لی تھیں۔

ان میں سے ایک نوجوان لڑکا تھا۔ وہ رات رات بھر ماہیا گاتا۔ اس کی آواز میں بلا کا سوز تھا وہ گاتا تو مجھے ایسا معلوم ہوتا جیسے اس کی روح فریاد کناں ہے۔ وہ کسی لڑائی میں کسی عزیز کے قتل کے سلسلے میں چودہ مہینے سے پھانسی کو کوٹھڑی میں بند تھا۔ دن رات اسی سیمٹ کی بنی ہوئی پختہ فرش کی کوٹھڑی میں رہتا جس کے درو دیوار پر موت برس رہی ہو۔ کتنا کٹھن کام ہے یہ کچھ وہی جانتے ہیں جنہوں نے اس زندگی کو دیکھا ہو۔ سیشن کی عدالت سے موت کی سزا ہونے کے بعد کے چودہ مہینوں سے وہ ہائیکورٹ، فیڈرل کورٹ اور رحم کی اپیلوں کے چکر میں تھا اور موت کے دروازے پر زندگی کی امید کی ایک ٹٹماتی ہوئی شمع لیے اپنی قسمت کے فیصلے کا منتظر تھا۔ اس کا نام غلام عیسیٰ تھا۔

اس کے ساتھ ہی تین اور قیدی بھی تھے۔ یہ تینوں ضلع مظفر گڑھ کے بلوچ تھے۔ ان کی آوازیں پاٹھ دار تھیں مگر موت کے دروازہ پہ پہنچ کر ان آوازوں میں بھی ایسا سوز پیدا ہو گیا تھا جو بیان نہیں کیا جاسکتا۔ ان میں ایک کا نام جو غالباً سب سے بڑا تھا مرید خان تھا۔ اس سے چھوٹا لال خان اور اس سے چھوٹا نصیر خان تھا۔ یہ تینوں بھائی ایک ہی قتل کے الزام میں ڈیڑھ ڈیڑھ سال سے کوٹھڑیوں میں بند تھے۔

ان کے علاوہ ایک اور بھی تھا جس کی آواز اکثر آتی رہتی۔ وہ رات بھر گایا کرتا تھا۔ اس کی آواز اتنی کمزور، اس قدر معصوم اور فریاد سے پر تھی کہ اس کا گانا سن کر میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ وہ اکثر ماہی کی یہ کلی گایا کرتا تھا۔

اساں تیتھوں کی لیناں
فکر نہ کریں جن وے
سدا کوٹھیاں نہیں رہناں

کوٹھی جیل کی اصطلاح میں پھانسی کی کوٹھڑی کو کہتے ہیں۔ حیات محمد ایک سال سے اس کوٹھی میں تھا اور اس امید

میں تھا کہ ہمیشہ یہاں نہیں رہے گا۔

ان کے علاوہ تین چار اور تھے۔ ان میں غلام محمد تھا جو طبعاً خاموش رہا کرتا تھا۔ وہ بہت نمازیں پڑھتا، قرآن شریف بھی پڑھتا۔ اسے ایک روز معلوم ہوا کہ میں سید ہوں تو اس نے ایک نمبر دار کے ذریعہ مجھے یہ پیغام بھیجا کہ میں اس کی رہائی کے لیے دعا کروں۔ اس کے بعد جب دوسروں کو معلوم ہوا تو انہوں نے بھی رات کو مجھے پکار پکار کر دعا کرنے کے لیے کہا۔

میں ان سے کہنا تو چاہتا تھا کہ میری دعا میں اثر ہوتا تو میں خود ہی کیوں یہاں پڑا سڑا کرتا مگر ان کا دل توڑنا، انہیں امید کی اس ٹٹماتی ہوئی شمع سے محروم کرنا میرے بس میں نہیں تھا۔ وہ بچوں کی طرح معصوم تھے۔ وہ سب موت کے دروازوں پر زندگی کے بھکاری تھے۔ ان میں سے بہت سے بے گناہ بھی ہوں گے اور جو گنہگار بھی ہوں گے انہوں نے نہ معلوم کس اضطراری لمحے میں کس جذبہ سے مغلوب ہو کر قتل کیا ہوگا۔ ان کے اس اقدام کے پیچھے ان کی صدیوں پرانی جہالت تھی۔ ان کا غلط ماحول، ان کا غلط سماجی نظام اور غلط تربیت تھی، انہیں مجرم ٹھہرانا اتنا آسان نہیں ہے جتنا بادی النظر میں سمجھا جاتا ہے۔

یہ سب کے سب موت کے مسافر اور زندگی کے بھکاری میرے احاطے کے چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے۔ ہر شام ان کو ایک کوٹھڑی سے دوسری میں تبدیل کر دیا جاتا۔ انہیں ایک دن سے زیادہ کسی کوٹھڑی میں مسلسل طور پر رہنے کی اجازت اس لیے نہیں دی جاتی کہ کہیں وہ سرنگ وغیرہ لگانے کی کوشش نہ کریں۔ اس تبدیلی کو جیل میں اڑوی بدلنا کہتے ہیں۔ اڑوی بدلنے کی وجہ سے میری قریب ترین کوٹھڑیوں میں کسی شام مرید خان ہوتا، کسی شام لال خان اور کبھی حیات محمد یا نصیر اور غلام محمد ہوتے۔ جو بھی میرے قریب آتا وہ سب سے پہلے پکار کر مجھے سلام کرتا پھر فریاد کے لہجے میں کہتا ”شاہ جی! دعا کرو، مشکلیں آسان ہو جائیں۔“

اس رات غلام عیسیٰ اور مرید خان میرے آس پاس تھے۔ رات کے کوئی دس بجے جب جیل کی فضا مکمل طور پر پر اسرار اور خاموش تھی اور جیل کے ماحول کی سنگینی اپنے پورے عروج پر تھی، غلام عیسیٰ نے مرید خان کو پکارا۔

”مرید خان! اس نے کہا۔“

”جی اوئے غلام عیسیٰ.....“ مرید خان نے بڑے پیار سے جواب دیا۔

”مرید خان دے حال؟“

”اللہ رحم کرے گا، اللہ فضل کرے گا۔ اللہ کوٹھیاں توڑے گا“ مرید خان نے مشین کی طرح یہ رٹے ہوئے

فقرے دہرا دیئے۔ جیسے ان کے علاوہ اور کچھ سوچ ہی نہیں سکتا۔ اپنے شعوری اور غیر شعوری اندیشوں کو دبانے کے لیے اپنے آپ سے خوفزدہ وہ اتنے زور زور سے بول رہا تھا جیسے اگر اس نے یہ نہیں کیا تو معلوم نہیں کیا آفت آجائے گی۔ پھانسی والے سب اسی طرح بولتے ہیں وہ کبھی اپنے منہ سے ناامیدی کا اظہار نہیں کرتے۔ آخری دن تک، آخری وقت تک وہ امیدوں کے چراغ روشن کئے بیٹھے رہتے ہیں۔ اس سنگدل کوٹھڑی کے پتھر پر لیٹ کر وہ کبھی یہ نہیں کہتے کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ وہ بچیں۔ مرید خان بھی یہی کہہ رہا تھا۔ غلام عیسیٰ کی آواز میں بڑا ہی درد اور بڑا ہی کرب شامل تھا۔

میں اپنے بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ مجھے چاروں طرف موت نظر آتی تھی۔ تنہائی کی قید میں پھانسی والوں کے درمیان رہنے کی ذہنی اذیت میرے لیے سب سے زیادہ تکلیف دہ تھی۔ چنانچہ میں نے اپنے اندر اٹھتے ہوئے طوفانوں کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنے دروازہ کے جنگلہ کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ غلام عیسیٰ کہہ رہا تھا ”مرید خان اب تو وارث تنگ آگئے ہیں۔“

”اللہ رحم کرے گا“ مرید خان نے تیزی سے کہا۔

غلام عیسیٰ تھوڑی دیر تک خاموش رہا پھر اس نے کہا ”مرید خان! میری بیوی کے زیور تو سیشن کی عہدالت تک پہنچتے پہنچتے ہی بک گئے تھے۔ ہائیکورٹ اور فیڈرل کورٹ میں ہماری زمین بھی بک گئی۔ اب اگر میں بھی نہ رہا تو میری ماں، میرا باپ، بیوی اور دونوں بچے بھکاری ہو جائیں گے۔“

”غلام عیسیٰ! اللہ رہائیں دے گا۔ اللہ تقصیریں معاف کرے گا۔ دل نہ چھوڑ۔“

”میں دل تو نہیں چھوڑ رہا ہوں مگر مجھے اپنے گھر والوں کا بہت فکر ہے، مجھے اپنی بیوی کا اور بچوں کا خیال ہے۔“

مرید خان اب کی بار چپ رہا۔ وہ خود اپنی زمین، اپنے بچوں اور اپنی بیوی کے بارے میں سوچ رہا ہوگا۔ اس ملک میں جہاں قانون اور انصاف فروخت ہوتا ہے جہاں لوگ انصاف حاصل کرنے کے لیے اپنی زمین، زیور، جائیداد، سب کچھ فروخت کر دیتے ہوں وہاں مرنے والوں کے لیے لاکھوں اندیشے ہیں، ہزاروں غم ہیں چنانچہ سب چپ ہو گئے، حیات محمد خاموش ہو گیا تھا، مرید خان خاموش ہو گیا تھا۔ غلام عیسیٰ، لال خان، نصیر اور غلام محمد سب خاموش تھے۔ اپنے اپنے اندیشوں میں اپنے اپنے افکار میں سب کھو گئے اور نفا کی سنگینی اور سنگ دلی اور بھی بڑھ گئی۔

میں اپنے بستر پر دیر تک پڑا اثر پتا رہا۔ دیر تک اس وحشیانہ نظام، اس زندگی، اس دنیا، اس قانون اور انصاف سے نفرت میرے اندر بڑھتی رہی۔ انسان کتنا عظیم ہے اور کس قدر حقیر ہے۔ آج بھی ظلم اور جبر اور طاقت کی حکومت ہے۔ آج

بھی موت ہی سب سے زیادہ زور آور ہے اور کچھ نہیں۔

آدھی رات کی اس ساعت میں جب ہر طرف خاموشی اور ہول اور سناٹا تھا اور میرے ارد گرد کالی بھوری دیواریں اور کٹہرے اورتالے تھے میں اپنی کوٹھڑی کے درمیان بیٹھا رو رہا تھا۔ اس روز میرا دل چاہتا تھا کہ میں دھاڑیں مار مار کر روؤں مگر میں نے ضبط کیا اور خاموشی سے آنسو بہاتا رہا۔ بڑی دیر تک، ایک مدت تک، مجھے یوں معلوم ہوا گویا روتے روتے مجھے صدیاں بیت گئیں۔ دل بھر کر رونے کے بعد ذرا سا اطمینان ہوا۔ آج بھی میں سوچتا ہوں تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیوں رویا تھا۔ ان آنکھوں میں جو مدتوں پہلے خشک ہو چکی تھیں، جن میں غم جاناں اور غم دوراں نے کوئی نمی باقی نہیں چھوڑی تھی، اتنے بہت سارے آنسو کہاں سے آگئے تھے۔ ایک بچے کی طرح رونے کے لیے میرے پاس اتنا بڑا خزانہ کہاں سے آیا تھا۔ بہت ایمانداری سے بہت دیر تک سوچنے کے بعد بھی میں سمجھ نہیں سکا کہ میں کیوں رویا تھا لیکن ایک بات ضرور ہے کہ میں اس وقت اپنے دکھ، اپنے غم اور اپنی تکلیف سے نہیں رویا تھا اس لیے کہ اپنی حد تک میں دکھوں کو برداشت کرنے کا عادی ہوں۔ میری زندگی نے اس سے بڑی مصیبتیں بھی دیکھیں مگر اس روز موت کے مسافروں کی آوازوں اور انسان کی بے بسی نے مجھے رونے پر مجبور کر دیا۔ اس روز رونے کے بعد مجھے عجیب تجربہ ہوا۔ رونے میں دکھ بھی تھا تکلیف اور بے بسی کا احساس بھی تھا مگر اس میں ایک شدت بھی تھی۔ میرا سارا کرب، سارا کھر دراپن اور ساری سختی گویا اس میں بہ گئی تھی اور جب میں کافی دیر کے بعد آنسو پونچھ کر لیٹا تو مجھے اپنا جسم اور اپنی روح اس قدر ہلکی پھلکی، اتنی نازک اور معصوم معلوم ہوئی کہ خود میں حیرت میں آ گیا اور مجھے یوں معلوم ہونے لگا گویا میں ایک خوردسال بچہ ہوں جسے اپنے تجربوں، اپنے احساسات اور اپنی ضدوں کے علاوہ اور کچھ بھی معلوم نہیں۔ چنانچہ یہی سب کچھ سوچتا سوچتا میں تکیہ پر سر رکھ کر نہ جانے کب سو گیا۔

اسی دو مہینائی میں میرے احاطے کے باہر بڑے بڑے زبردست لوگ موجود تھے۔ آہستہ آہستہ ان کے بارے میں مجھے تفصیلات معلوم ہونے لگیں۔ کبھی کوئی سپاہی یا جمعدار آفیسروں کی نظر بچا کر میرے پاس آ بیٹھتا تو وہ کسی کی بات کر دیتا۔ کبھی رات کو گوشت والا نمبردار پانچ منٹ کے لیے آکھڑا ہوتا تو ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگتیں۔ اسی طرح مجھے اس کنوئیں میں غرق ہونے کے باوجود وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنے ارد گرد کی دنیا کے بارے میں تھوڑی بہت واقفیت تھی۔

دو مہینائی میں عام طور پر جیل کے مجرم یا خطرناک ڈاکو اور بے حد خطرناک مجرم رکھے جاتے تھے۔ ان میں سے ایک اسلم کا نام بہت مشہور تھا۔ اپنے دروازے میں سے اسے کئی بار دیکھا تھا۔ نوجوان سال کا تھا مگر اس پر غار

ستائیس مقدمے تھے۔ جیل کی اصطلاح میں وہ ابھی تک حوالاتی تھا کیونکہ اس کے خلاف سب مقدمے ابھی عدالت میں تھے۔ ایک دو مقدموں میں چار چار چھ چھ مہینہ کی سزا بھگتنے کے بعد وہ پھر حوالاتیوں کی فہرست میں آ شامل ہوا تھا۔ حوالاتی کو گھر کے کپڑے پہننے پڑتے ہیں۔ جیل کے کپڑے اسی قیدی کو ملتے ہیں جسے عدالت نے سزا دے کر مجرم ٹھہرا دیا ہو۔ چنانچہ مقدمہ چلنے کے دوران حوالاتی اپنا لباس پہنتے ہیں۔ ان سے ہلکی مشقت پانی بھرنا، پوچا کرنا، جھاڑو دینا وغیرہ لی جاتی ہے جیل کی اصل مشقت مونج کوٹنا، بان بٹنایا کارخانہ میں کام کرنا، سزا ہونے کے بعد شروع ہوتی ہے۔

جس زمانے کا میں ذکر کر رہا ہوں اس وقت اسلم حوالاتی تھا۔ وہ لٹھے کی سفید چادر لمبل کی قمیض اور تلہ دار جوتی پہنے رہتا۔ وہ کوئی کام نہ کرتا تھا۔ جمعدار اور سپاہی ڈز کے مارے اس سے کام لینے کی بجائے اسے دوسرے حوالاتیوں کے کام کی نگرانی پر مامور کر دیتے تھے۔ کیونکہ یہ مشہور تھا اسلم جس سپاہی یا جمعدار سے لڑ پڑتا ہے اس کی خیریت نہیں ہوتی۔ دشمنی نکالنے کے طریقے بھی اس کے اپنے تھے۔ مثلاً جس جمعدار سے اسلم کو پر خاش ہوتی وہ اس کی نوکری کے عرصے میں کسی کوٹھڑی کا تالہ غائب کر دیتا۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ کسی تالے کے پاس سے وہ گزر بھی جائے تو تالہ ٹوٹ کر گر پڑتا ہے اور غائب ہو جاتا ہے۔ تالہ گم ہونے کی صورت میں جمعدار کو پانچ روپیہ جرمانہ ہوتا اور اس کا رپکار ڈ بھی خراب ہو جاتا تھا جس سے اس کو ترقی ملنے کی امید ختم ہو جاتی۔

اسلم نے اس طرح ایک دو جمعداروں کو سبق پڑھا کر سیدھا کر لیا تھا۔ اب وہ جیل میں لارڈوں کی طرح رہتا۔ کسی قیدی سے صابن لیتا، کسی دوسرے سے تیل حاصل کرتا اور کسی تیسرے کو اپنے کپڑے دھونے کا حکم دیتا۔ سگریٹ بیڑی بھی وہ نذرانہ کے طور پر وصول کرتا تھا۔ اور مزے میں گزار رہا تھا۔

ایک روز آنکھ بچا کروہ میرے دروازے کے باہر آ کر مجھے آواز دے کر سلام بھی کر گیا تھا اور جاتے ہوئے چائے کی پتی بھی لے گیا تھا میں نے چپ چاپ بڑی خوشی سے اسے پتی دے دی۔ جمعدار نے اسے میرے دروازہ کے باہر کھڑا ہوا دیکھ کر تو لیا مگر منہ دوسری طرف پھیر کر بالکل انجان بن گیا۔

ایک اور بھی تھا

ایک اور قیدی بھی اسلم کی ہمسری کا دعویٰ کرتا تھا۔ اس نے دو چار ڈاکے ڈال کر سات سال کی سزا حاصل کی تھی۔ اسلم ایک دن اس کو دروازہ سے باہر لا کر مجھ سے ملا گیا۔ یہ شخص بھی بہت آرام سے گزر کرتا تھا میں نے اس سے پوچھا تو کہنے لگا ”پچانوے ہزار کے ڈاکے ڈالے تھے، پندرہ ہزار مقدموں پر خرچ ہوا، دس ہزار جیل کے آفیسروں سے مل کر ان کو کھلاؤں گا اور ساتھ ساتھ خود بھی یہاں بیٹھ کر کھاؤں گا۔ گھر والوں کے پاس ساٹھ ستر ہزار بیچ رہے گا وہ بھی بے فکری

سے دن کاٹیں گے۔ پانچ چھ سال کے بعد باہر جاؤں گا تو کچھ نہیں تو تیس چالیس ہزار تو باقی ہوگا۔ مزے سے ساری زندگی کٹ جائے گی۔“

مجھے چند دن بعد معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب نے اس کے کارڈ پر ہلکی مشقت لکھ دی ہے اور اسے مریض بنا کر اس کا آدھ سیر دودھ لگایا ہوا ہے جب اس کا دل ہلکی مشقت کرنے کو بھی نہیں چاہتا تھا اس وقت وہ ٹہلتا ہوا ہسپتال جاتا۔ ڈاکٹر صاحب کو سلام کرتا۔ وہ اس میں کوئی بیماری دریافت کر کے ہفتہ بھر کے لیے اس کی مشقت معاف کر دیتے یا ہسپتال کا کھانا لگا دیتے اور ضرورت پڑتی تو اسے ہسپتال میں داخل کر دیتے۔ یہ سب کچھ باقاعدہ ٹھیکہ پر ہوتا اور ٹھیکہ کی شرائط کی پابندی دونوں طرف سے ہوتی تھی۔

تین چار مہینوں میں مجھے صرف اتنی باتیں معلوم ہو سکی تھیں، اور ان کی روشنی میں اپنے احاطہ میں تنہائی کی قید گزارتے ہوئے اکثر بیچ و تاب کھاتا ہوا یہ سوچتا کہ سیاسی قیدی ہونے کی بجائے کتنا اچھا ہوتا اگر میں کسی اخلاقی جرم میں آیا ہوتا۔ میں نے کہیں ڈاکہ ڈالا ہوتا یا اغوا کے مقدمہ میں ماخوذ ہوتا۔ اس صورت میں کم از کم میں اس بے رحم تنہائی سے تو بچا رہتا جو میری روح کو گھن لگا رہی تھی۔ ڈاکو اور خونی مجرم سب باہر تھے۔ اکٹھے تھے، وہ گاتے، ہنستے، کھیلتے اور میں اپنے دروازوں کی درزوں میں سے رشک بھری نظروں سے ان کو دیکھتا رہتا۔

اسلم اور وہ دوسرا ڈاکو کبھی کبھی نئے قیدیوں کو جمع کر کے انہیں اپنے معرکوں کی داستانیں سناتے، بیڑیاں پیتے، قہقہے لگاتے اور میں ان کو دیکھ دیکھ کر اس حسرت میں پڑا جلا کرتا کہ اور کچھ نہیں تو انہی میں شامل ہو سکتا۔ اتوار کو قیدیوں کو مشقت سے چھٹی ہوتی ہے۔ اس روز وہ کپڑے دھوتے ہیں، نہاتے ہیں اور گپ لڑاتے ہیں۔ اتوار کو جیل کا دفتر بند ہونے کی وجہ سے آفیسر لوگ بھی ایک دو چکر لگا کر گھر واپس چلے جاتے ہیں۔ اس لیے اتوار کو عام طور پر جیل میں بڑی چہل پہل ہوتی ہے۔

دوم تنہائی میں میرے احاطہ سے باہر، احاطہ کے دروازے کے سامنے اتوار کو عام طور پر مجلس موسیقی منعقد ہوتی۔ قیدیوں میں گانے والے بھی ہوتے ہیں۔ میراثی، نقلے اور قوال سبھی جیل کی چار دیواری میں موجود ہوتے ہیں۔ چنانچہ اتوار کو قیدی جمعدار کے لیے ایک چٹائی بچھا کر اسے بٹھا دیتے اور کسی قوال کو پکڑ کر قوالی شروع کر دیتے۔ کوئی گھڑا بجاتا، کوئی ماہیا گاتا، پھر نقلیں ہوتیں، قیدی، جمعدار اور سپاہی سب محظوظ ہوتے کچھ بھی ہو زندہ رہنے اور دل خوش کرنے کے لیے ان کے پاس لاکھ بہانے تھے اور یہ سب اس لیے تھے کہ وہ اکٹھے تھے، ایک ساتھ تھے، ایک میں تھا کہ ان کی ان دلچسپیوں میں بھی شریک نہ ہو سکتا تھا۔ بس دور ہی سے اپنے دروازے کی ننھی درزوں میں سے جھانک کر ان کو دیکھ لیتا اور پھر اپنی چٹائی

آبیٹھتا۔ میرے لیے اس تنہائی کا ایک ایک لمحہ صدیوں لمبا تھا۔ بعض اوقات کسی سے باتیں کئے ہفتوں گزر جاتے، کچھ کتابیں آگئی تھیں انہیں پڑھتا۔ اخبار پڑھتا مگر میرے اندر جو گھلاوٹ پیدا ہوگئی تھی، جذبات و احساسات کا جو طوفان امنڈا پڑتا تھا اسے قابو میں رکھنے کے لیے کچھ نہ ہو سکتا تھا۔ اس زمانے میں کچھ لکھنے کے لیے میری انگلیاں ٹوٹی رہتیں۔ میں سوچتا اگر کچھ لکھنے کی اجازت ہی مل جائے تو وقت آسانی سے کٹ جائے مگر جیل کے آفسروں سے بار بار درخواست کرنے کے باوجود مجھے کاغذ، قلم، دوات رکھنے کی اجازت نہ ملی۔ لاہور میں یہ معلوم ہوتا تھا کہ سپرنٹنڈنٹ اگر چاہے تو ایک کاپی صفحہ نمبر وغیرہ لگا کر دے سکتا ہے مگر جیل کا قانون اس قدر پکدار ہوتا ہے کہ یہاں کے آفسروں نے ایسے کسی قانون کے وجود ہی سے انکار کر دیا۔ بلکہ مجھے یہ بھی بتایا کہ نظر بندوں کے پاس قلم یا کاغذ کا ٹکڑا برآمد ہونا بالکل ایسا ہی جرم ہے جیسے کسی کے پاس بغیر لائسنس کے پستول برآمد ہو جائے۔ راجہ صاحب، ڈپٹی صاحب اور سپرنٹنڈنٹ صاحب ہمیشہ یہی جواب دیتے کہ نظر بندوں کے پاس کاغذ، قلم، دوات وغیرہ ہو تو جیل کے بارے میں کچھ لکھ کر باہر بھیج سکتے ہیں۔ میں نے ان کو بہت سمجھایا کہ آپ صفحات پر نشان لگا کر مجھے دے دیجئے مگر انہوں نے میری ایک نہ مانی۔

کچھ جیل کے نظام کے بارے میں

جیل میں کیسے کام ہوتا ہے؟ جیل میں مجرموں کو رکھ کر ان کی اصلاح ہوتی ہے یا وہ زیادہ بگڑتے ہیں؟ اس موضوع پر دنیا بھر میں لوگ سوچتے اور غور و فکر کرتے رہتے ہیں۔ ہماری جیلوں کا جو نظام اور جو طریق کار ہے اس کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

ملزم یا مجرم جب جیل لایا جاتا ہے تو اسے سب سے پہلے ڈاکٹری معائنہ کے لیے ڈاکٹر صاحب کے پاس بھیجا جاتا ہے۔ وہاں پر اس کا وزن ہوتا ہے، اس کی مشقت اس کی صحت کے مطابق مقرر کی جاتی ہے اور پھر اسے جیل کے کسی ایک حصہ میں بھیج دیا جاتا ہے۔ ملتان ڈسٹرکٹ جیل میں دس ماہ کا عرصہ گزارنے کے بعد مجھے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ جیل میں رشوت خوری کس عروج پر ہے۔

جو قیدی پہلی بار جیل میں آتے ہیں وہ تو بہت سختی برداشت کرتے ہیں لیکن جو عادی مجرم ہوتے ہیں وہ ایسے ڈھنگ سے سارا کاروبار بناتے ہیں کہ جیل میں آکر وہ مزے سے اپنے دن پورے کرتے ہیں۔ عادی مجرم ڈیوڑھی میں پہنچتے ہی دربان کو انگلیوں کے اشاروں سے بتا دیتے ہیں کہ وہ اتنی رقم بطور رشوت دے سکتے ہیں۔ دربان اور چکر جمعدار اس رقم کے مطابق اس کو جیل کے حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ مثلاً کوئی لاوارث غریب ملزم یا پہلی دفعہ جیل آنے والا سیدھا دوم تنہائی جیسے سخت علاقے میں بھیج دیا جاتا تھا مگر جو قیدی پرانے اور دانا بیان راز میں سے تھے وہ کسی کھلی ہرک میں بھیج

دیئے جاتے تھے۔ پھر ڈاکٹری معائنہ کے وقت وہ ڈاکٹر صاحب سے فیس طے کر لیتے اور ڈاکٹر صاحب دس پانچ روپے کا وعدہ لے کر ایک چالیس پونڈ وزن والے قیدی کا وزن اس کے کارڈ پر ایک سو پانچ پونڈ درج کر دیتے اور لکھ دیتے کہ وہ کمزور ہے اس لیے ہلکی مشقت دی جائے۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ پہلی بار آنے والا قیدی دس سیر مونج کوٹن یا ایک سیر بان بٹنا اور عادی مجرم صرف جھاڑو دینے یا پانی اٹھانے کا کام کرتا۔ اس طرح پہلی بار آنے والا مجرم جب ان حقیقتوں سے آگاہ ہوتا تو وہ بھی یہی رویہ اختیار کرتا اور دوسری باری آنے کے لیے مکمل طور پر ہر سبق پڑھ کر تیار ہو جاتا۔ جیل سے جو ایک خوف اور ڈر کا پہلو ہے وہ ختم ہو جاتا تھا۔ ملتان جیل کے ڈاکٹر صاحب کے بارے میں تو مشہور تھا کہ وہ چونی لیکر بھی قیدی کی مشقت ایک دو روز کے لیے معاف کر دیتے ہیں۔

عادی مجرم پہلے دن جو شرائط طے کرتے تھے، وہ جلد از جلد پوری کر دیتے اور کسی سپاہی یا جیل کے ملازم کو اپنے کسی عزیز رشتہ دار یا دوست کے پاس بھیج کر اور اسے ایک دو روپے کا لالچ دے کر وہ مقررہ رقم منگوا لیتے تھے۔

جیل کے ملازم

جیل کے بھی ملازم بے ایمان نہیں ہوتے، ویسے اس حقیقت سے کون آگاہ نہیں ہوگا کہ بے ایمانی اور رشوت خوری کی سرحدیں پہلے پہل مفلسی سے شروع ہوتی ہیں۔ جیل کے معمولی سپاہی کی تنخواہ پچاس روپے کے قریب ہے۔ ان کی نوکریاں اس قدر سخت اور ظالمانہ ہیں اور تنخواہ اس قدر قلیل ہے کہ وہ مجرموں سے خود کوئی کام حاصل کرنے تک کی کوشش کرتے ہیں۔ جیل کے وارڈ یا سپاہی آٹھ گھنٹہ دن میں اور تین گھنٹے رات میں نوکری دیتے ہیں اور اس کی نوعیت اس قسم کی ہوتی ہے کہ انہیں ہر وقت نوکری سے درخواست کیا جاسکتا ہے۔ رات کی نوکری میں اکثر سپاہیوں کو تین تین گھنٹہ مستقل طور پر دوڑنا پڑتا ہے۔ جیل کی بڑی چار دیواری کی حفاظت جسے کورٹ موقعہ کہا جاتا ہے ان کے ذمہ ہوتی ہے۔ چنانچہ اس چار دیواری کے دو دو فرلانگ لمبے ٹکڑوں پر ایک سپاہی کی ڈیوٹی ہوتی ہے۔ رات کو ڈیوٹی سے لوہے کا ایک ٹکڑا نمبر لگا کر ایک سپاہی کو دیا جاتا ہے۔ وہ وہاں سے بھاگ کر دو فرلانگ کے فاصلے پر کھڑے ہوئے سپاہی کو یہ ٹکڑا دیتا ہے۔ اگلا سپاہی اس ٹکڑے کو اس سے اگلے سپاہی کو دیتا ہے وہ اس سے اگلے کو اس طرح یہ ٹکڑا چکر کاٹ کر پھر ڈیوٹی پہنچ جاتا ہے جس کا مطلب ہے کہ ڈیوٹی میں بیٹھا ہوا جمعہ دار یہ سمجھتا ہے کہ ”سب اچھا“ ہے اور کام ٹھیک ٹھاک ہو رہا ہے لوہے کے اس ٹکڑے کو پترا کہا جاتا ہے۔ پترا اگر ایک منٹ کے لیے رک جائے تو فوراً پتہ کیا جاتا ہے، اگر کسی سپاہی کو غافل پایا جائے تو اس کی پیشی اگلے روز سپرنٹنڈنٹ کے سامنے ہو جاتی ہے۔ سپرنٹنڈنٹ اس جرم میں سپاہی کو فوراً درخواست کر سکتا ہے۔

ڈیوٹی کے پاس والے سپاہی کا یہ کام ہوتا ہے کہ وہ پترا اگلے سپاہی کو دیکر ایک منٹ کے اندر واپس ڈیوٹی

بچے اور دوسرا پترالے لے۔ اس سے اگلے سپاہی کے ذمہ بھی یہ ہوتا ہے۔ چنانچہ اس طرح دو فرلانگ کی اس لمبائی کو سپاہی گھنٹے بھر میں ساٹھ دفعہ طے کرتا ہے۔ بوڑھے بورھے سپاہی دمہ اور کھانسی کے مارے ہوئے یہ غریب سردیوں اور بارش اور آندھی میں رات کو مسلسل بھاگتے رہتے ہیں۔ ان کی حالت دیکھ کر مجھے اکثر یہ خیال آتا تھا کہ ان سپاہیوں سے تو پرانے اور عادی مجرم زیادہ آرام سے رہتے ہیں۔ پھر ان کو اس ظالمانہ نوکری کے بعد تنخواہ اتنی کم ملتی ہے کہ اس زمانے میں اس تنخواہ میں ان کا گزارہ نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے وہ ہر ممکن بے ایمانی کرتے ہیں۔ محکمہ جیل کی طرف سے سپاہیوں کے لیے مولویوں کے ذریعہ اس تبلیغ کرانے کا انتظام تو کر دیا گیا ہے کہ وہ رشوت نہ لیں مگر محکمہ نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ اس قلیل تنخواہ میں ان کا گزارہ کیسے ہو سکتا ہے اور یہ کہ ساری خرابیوں کی جڑ یہ ہے کہ ملازموں کو بہتر تنخواہ دی جائے۔

جیل کے آفیسر اور ملازم

جیل کے آفیسروں کا عتاب بھی زیادہ تر سپاہیوں اور ملازموں پر ہی نازل ہوتا ہے۔ جیل کے سپرنٹنڈنٹ کو یہ اختیار ہے کہ وہ جب چاہے سپاہی کو درخواست کر دے۔ کچے ملازم تو ایسے حکم کی آئی جی کے پاس اپیل بھی کر سکتے ہیں مگر پکے ملازم کو اپیل کا حق بھی نہیں ہے۔

جیل کے آفیسر عام طور پر خطرناک مجرموں سے بچتے ہیں۔ کیونکہ بعض مجرم ایسے دل جلے ہوتے ہیں کہ وہ آفیسروں کے سامنے ڈٹ جاتے ہیں، انہیں گالیاں دیتے ہیں، ان کی بے عزتی بھی کر دیتے ہیں اور بعد میں ان کی سزا بھگتنے کے لیے بھی تیار رہتے ہیں۔ ایسے مجرموں سے آفیسر ان عام طور پر بچتے ہیں اور ان کو ہینڈل کرنے کا کام سپاہیوں اور جمعداروں پر چھوڑ دیتے ہیں۔ لیکن سپاہی اور ملازم اکڑ بھی نہیں سکتے۔ اس لیے کہ ان کے خلاف فوراً ایکشن لیا جاتا ہے اور وہ فوراً درخواست کر دیئے جاتے ہیں جس کی وجہ سے اکثر ملازم اس قدر دبے ہوئے، اس قدر خستہ حالت میں نظر آتے ہیں کہ ان کو پناہ دینے والا سوائے قیدیوں کے اور کوئی نہیں ہوتا جن سے مل کر وہ ان کی ضروریات بھی پوری کرتے ہیں اور اپنی بھی۔

جیل میں جو اسناخ کی جاتی ہے اس کا اندازہ تو اس سے ہو سکتا ہے کہ ایک قیدی نے جو تین چار بار پہلے بھی جیل کاٹ چکا تھا مگر اب لاوارث تھا۔ ایک سپاہی سے ٹھیکہ کیا ہوا تھا۔ یہی قیدی نقب زنی میں چھ مہینے کاٹ رہا تھا۔ اسے ایون کھانے کی عادت تھی۔ پہلے جب بھی وہ پکڑا گیا اس کے ایک دو دوست اور رفیق کار اس کی ضروریات پوری کرتے رہے مگر اس بار اس کے دوست بھی دھر لیے گئے تھے اور کسی اور جیل میں تھے۔ اس قیدی کا دنیا میں کوئی نہ تھا۔ کوئی گھر، کوئی زمین، مکان یا جائیداد نہ تھی۔ روزگار نہ تھا۔ اس کے پاس بس ایک فن تھا اور وہ تھا نقب زنی کا۔ وہ اسی کی کمانی کھاتا تھا۔ مگر

جل میں آکر وہ اپنے اس فن سے کام نہ لے سکتا تھا اور افیم کا عادی ہونے کی وجہ سے بری حالت میں تھا..... لیکن دو پارروز میں اس نے ایک سپاہی سے ٹھیکہ کر لیا۔ ٹھیکہ کی شرائط یہ تھیں کہ سپاہی اسے چھ مہینے تک افیم اپنے پاس سے لا کر دیتا رہے گا اور قیدی رہا ہونے کے بعد جو چوری کرے گا اس کا سارا مال اس سپاہی کو دے گا۔ یہ شرائط تحریری نہیں تھیں تاہم دونوں پارٹیوں کو ایک دوسرے پر اعتماد تھا۔ چنانچہ سپاہی ہر پندرہ دن کے بعد اس کو آدھا تولہ افیم لا دیتا۔ اس امید پر کہ رہا ہونے کے بعد وہ کہیں نقب لگا کر اسے مال دے گا۔ وہ اکثر اٹھتے بیٹھتے بھی کہتا۔ ”اللہ نے چاہا تو اب ہمارے دن بھی پھر ہی جائیں گے“ یہ تو مجھے معلوم نہیں ہوسکا کہ اس کے دن پھرے یا نہیں مگر مجھے اتنا یقین ضرور ہے کہ رہا ہونے کے بعد اس نے اپنی شرط ضرور پوری کی ہوگی۔ شرط پوری ہونے میں رکاوٹ بھی کیا ہو سکتی تھی جبکہ اسے یہ تحفظ بھی تھا کہ اگر وہ پکڑا گیا تو پھر اسی جیل میں آجائے گا جہاں اسے سنبھالنے والے قانون کے رکھوالے موجود تھے۔

اسی قیدی کو میں نے ایک روز اپنے دروازہ کے باہر ٹہلتا ہوا دیکھا تو میں بھی اپنے دروازہ کے پاس پہنچ گیا۔ جیل میں تعارف ہوتے دیر نہیں لگتی، میں اس کو پہچانتا تھا۔ وہ میرے متعلق سب کچھ جانتا تھا۔ بہر حال ہماری ملاقات کبھی نہ ہوئی تھی۔

دو چار تمہیدی فقروں کے بعد میں نے اس سے پوچھا ”تم کہاں کے رہنے والے ہو؟“ ”فیروز پور کے ضلع کا“ اس نے کہا۔

”رہتے کہاں ہو؟“ میں نے دوسرا سوال کیا۔

”لاہور کے ضلع میں۔“ ”پھر یہاں کیسے آکر پھنس گئے؟“

اس پر وہ مسکرایا اور بولا ”بس شاہ جی تقدیر کھینچ لائی ہے۔ اپنا اصول تو یہ تھا کہ اکیلے چوری کرو۔ جس گاؤں میں رہتا تھا وہاں سے رات کو چپکے سے نکل جاتا تھا اور کہیں اپنا کام کر کے صبح سویرے واپس آ جاتا تھا۔ دو تین چوریاں کر کے میں نے بکریاں خرید لی تھیں اور سودا گر بنا پھرتا تھا۔ مگر تقدیر خراب نکلی۔“

کچھ دیر رک کر اس نے پھر کہا ”میرے دو شاگرد ملتان کے ضلع میں کام کرتے تھے وہ میرے پیچھے پڑے ہوئے تھے کہ ایک بڑا موٹا گھر دیکھا ہے مگر میرے بغیر کام نہیں چلے گا۔ ایک دو مہینہ تو میں ان کو ٹالتا رہا۔ آخر جب انہوں نے بت مجبور کیا تو ان کے ساتھ چل پڑا اور رات کو یہاں آ کر نقب لگا دیا۔“

”پھر؟“ میں نے بے صبری سے پوچھا۔

”اجی پھر کیا واقعی اتنا مال تھا کہ میں اٹھانہ سکتا تھا۔ زیور اور نوٹوں کی پوری گٹھڑی میں نے باندھ لی اور اسے

کندھے پر رکھ کر باہر نکلنے ہی والا تھا کہ دس پندرہ آدمی اندر آگئے اور میری ایسی تیسری پھر گئی۔
”مگر یہ سب کیسے ہوا؟“

”شاگردوں کی نا تجربہ کاری کی وجہ سے“ اس نے کہا ”میں نے ان کو باہر پہرہ دینے کے لیے چھوڑا ہوا تھا۔ وہ سارے شوقین لونڈے صبر نہ کر سکے، سگریٹ سلگا کر پینے لگے اور نظر میں آگئے اور پھر جب لوگ انہیں دیکھ کر آگئے تو اس طرح بھاگے کہ مجھے آواز بھی نہ دی۔“

ایک جمعہ کو آتے دیکھ کر وہ میرے دروازہ کے سامنے سے بھاگ گیا۔ میں بھی اپنی چٹائی پر آ بیٹھا۔

صاحب دل

اسی زمانے میں جیل والوں نے ایک سرنگ پکڑ لی۔ سرنگ لگانے والوں کا لیڈر اسلم تھا۔ اس نے دو تین آدمیوں سے مل کر کورٹ موقع سے کوئی پینتیس گز کے فاصلے پر سے سرنگ کھودنا شروع کی۔ روزانہ تھوڑا سا وقت نکال کر یہ دو تین آدمی تھوڑی سی سرنگ کھود آتے ورنہ ہی اندر کچھ قیدیوں کو اپنے ساتھ بھگالے جانے کے لیے تیار بھی کرتے رہے تھے۔ سرنگ انہوں نے ایک دیوار کی آڑ سے شروع کی تھی۔

چنانچہ کافی دنوں تک اور کافی لمبی سرنگ کھودنے تک کسی کو کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ سرنگ لگانے والوں کا کمال یہ تھا کہ انہوں نے اس کی مٹی بھی کسی طریقہ سے اندر ہی بکھپا ڈالی تھی۔ یہ بھی سنا جاتا تھا کہ انہوں نے اپنے ساتھ بھگالے جانے والے کوئی پچاس آدمی تیار کر لیے تھے۔

کہا جاتا تھا کہ سرنگ جیل کی حدود سے باہر نکلنے ہی والی تھی کہ یہ لوگ پکڑے گئے۔ چنانچہ انہیں فوراً بیڑیاں پہنا کر چکی بند کر دیا گیا۔

کئی روز یہ لوگ بند رہے۔ میں اپنے دروازہ کی درزوں میں سے بھی ان کو نہ دیکھ سکا۔ ایک روز میں بیڑی کی آواز سن کر دروازے کے پاس آکھڑا ہوا اور باہر جھانکنے لگا۔ بیڑی پہننے والا اسلم تھا جو میرے دروازہ کے باہر قریب ہی کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر کوئی پریشانی یا کسی قسم کا کوئی فکر نہ تھا۔

میں نے مذاقا اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا ”اوئے اسلم! اسلم تو نے اتنے قیدیوں کو جیل سے نکالنے کا پروگرام بنایا تھا، مجھے اس پروگرام میں کیوں نہ شریک کیا؟“

اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا ”قسمت چکر کھا گئی ورنہ اس وقت ہم باہر ہوتے اور سپرنٹنڈنٹ اور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ یہی بیڑیاں پہنے آپ کے سامنے پھرتے نظر آتے۔“

یہ بدل اور حوصلہ مندانہ جواب سن کر میں دنگ رہ گیا۔ اسلم بالکل مطمئن کھڑا تھا۔ مجھے اس جیل میں آئے ہوئے تقریباً اڑھائی تین مہینے گزر چکے تھے۔ یہ سارا عرصہ قید تنہائی میں گزرا تھا۔ کبھی کوئی قیدی جمعداروں اور جیل کے ملازموں کی آنکھ بچا کر میرے دروازے کے باہر، جو ہر وقت متفصل رہتا تھا، آکھڑا ہوتا تو اس سے کوئی بات ہو جاتی ورنہ عام طور پر ہفتوں مجھے کسی سے بات کرنے کی سعادت حاصل نہ ہوتی۔ صبح کے وقت چند حوالاتی احاطہ صاف کرنے کے لیے آتے، پانچ منٹ کے لیے دروازہ کھل جاتا۔ وہ چلے جاتے تو دروازہ بند ہو جاتا۔ اسی طرح صبح شام بھنگی اور لاٹگری کے آنے پر چند منٹ کے لیے دروازہ کھلتا اور پھر بند ہو جاتا۔ دوسرے تیسرے روز راجہ صاحب شام کے وقت چکر لگاتے اور چند منٹ کے لیے ادھر ادھر کی گیس ہانک کر چلے جاتے۔ کبھی کبھار ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ صاحب بھی آجاتے۔ اب ان کا رویہ بہت بدل گیا تھا۔ تصنع اور ریکاری کا جو خول انہوں نے اپنے فرائض کی صورت میں اپنے اوپر چڑھایا ہوا تھا اس میں سے اب مجھے ان کی اصل شکل و صورت اور اصلی طبیعت کی جھلکیاں نظر آنے لگی تھیں وہ میری کوئی بات تو نہ مانتے تھے مگر ان سے بات چیت کے دو چار مواقع حاصل ہونے کے بعد مجھے ان سے مل کر خوشی ہونے لگی کیونکہ ان کا مبلغ علم جیل کے عام آفیسروں سے بہت زیادہ تھا۔ بیس سال تک اس غیر انسانی ماحول اور اس محکمہ کی نوکری کرنے کے باوجود انہوں نے کچھ کھویا نہیں تھا۔ لٹریچر، ادب، شاعری، سیاست اور اخباری معاملات کے بارے میں وہ بے تکان اور بہت اچھی گفتگو کرتے تھے۔ اب مجھے ان کا انتظار رہتا تھا۔

میرے مطالبات پر وہ ہمیشہ طرح دے کر مجھے دھوکا دینے اور ٹالنے کی کوشش کرتے۔ عام طور پر وہ یہ ظاہر کرتے تھے کہ وہ میری بڑی مدد کرنا چاہتے ہیں مگر نوکری سے مجبور ہیں اس لئے کچھ نہیں کر سکتے۔ میں ان کی باتوں سے ان کا مفہوم صاف سمجھ جاتا مگر ہمیشہ خاموش رہتا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ ان کا جادو مجھ پر چل گیا ہے اور میں سمجھتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح گزارنی ہے، اسے ہنس کر گزاروں یا رو کر، گزارنی بہر حال ہے۔

اس دو تین مہینے کے عرصے میں میری صحت بہت خراب ہو گئی تھی۔ قید تنہائی میں رہنے اور خاص طور پر پھانسی والوں کے درمیان رہنے کی وجہ سے میں بیک وقت جسمانی اور ذہنی اذیتوں میں مبتلا تھا اور اس کا اثر میری صحت پر بھی پڑ رہا تھا میں نے اس سارے عرصے میں باہر سونے کی اجازت حاصل کرنے، خود کھانا پکانے اور تنہائی سے نجات حاصل کرنے کی اجازت لینے کی کوشش کی مگر ہمیشہ ناکامی ہوئی، ڈپٹی صاحب اور راجہ صاحب بہت مہربانی سے پیش آتے تھے مگر میری کسی جائز بات کو بھی ماننے کے سلسلے میں صاف انکار بھی نہ کرتے اور ہاں بھی نہیں کہتے تھے مثلاً میں جس کوٹھڑی میں بند کیا جاتا تھا اس میں بجلی کا پن اور کنکشن وغیرہ سب کچھ موجود تھا ان حضرات سے لائین کی مدہم اور ناکافی روشنی کی شکایت کر

کے بجلی حاصل کرنے کی درخواست کرتا رہا۔ وہ ہمیشہ وعدہ کرتے رہے مگر اتنا معمولی کام تک بھی انہوں نے کر کے نہیں دیا۔ پہلے دن تو انہوں نے کہا کہ جیل کا بجلی والا ملازم چھٹی گیا ہوا ہے، واپس آئے گا تو دس منٹ میں یہ کام ہو جائے گا۔ دو چار روز کے بعد یاد دہانی پر انہوں نے فرمایا کہ اس کے لیے بجلی کے محکمہ سے اجازت حاصل کرنی پڑے گی۔ یہ بات غلط تھی مگر میں نے تکلیف میں ان سے اجازت حاصل کرنے کی درخواست کی جو انہوں نے فوراً منظور کی اور بتایا کہ بجلی والوں کو چھٹی لکھ دی گئی ہے۔

اس چھٹی کا مزید تین چار ماہ تک جواب نہیں آیا کیونکہ چھٹی لکھی ہی نہیں گئی تھی آخر ایک دن آئی جی کے دورے سے پہلے بغیر کسی چھٹی کے انہوں نے مجھے بجلی دیدی اس کام میں بہر حال ساڑھے چھ ماہ خرچ ہوئے۔

تین چار ماہ میں کسی نہ کسی طرح اس زندگی کا عادی بھی ہو گیا تھا۔ ضروریات کی تمام چیزیں حبیب پاسلوی بھیج دیا کرتا تھا اس لیے اس طرف سے اطمینان تھا۔ کتابیں گھر سے آگئی تھیں اور اخبار جیل سے مل جایا کرتے تھے۔ کتابیں اور اخبار چاٹ چاٹ کر میں تنہائی کا یہ وقت گزارتا تھا جو کسی طرح گزرنے میں نہ آتا تھا۔ میں نے زمانہ قدیم کے باشندوں کی طرح سائے کے حساب سے اپنے اوقات مقرر کر لیے تھے۔ دوپہر کو اپنی کونٹری میں لیٹے لیٹے میں درجنوں بار اٹھ کر مغربی سایوں کو دیکھتا، اور ڈھلتی ہوئی دھوپ سے اندازہ لگا کر چائے کے وقت کا انتظار کرتا۔ اپنے اوپر خود ہی یہ احتساب عائد کر کے میں نے اس زندگی میں بھی نظم و ضبط پیدا کرنے کی کوشش کی۔ سامان اتنا نہیں ہوتا تھا کہ میں صبح شام کی چائے کے علاوہ بھی چائے پی سکوں۔ اس لیے میں چائے کے وقت کی پابندی کرتا تھا اور اس وقت کے انتظار میں بیٹھا رہتا۔

یہ خیال مجھے بار بار تنگ کرتا رہتا کہ اسی جیل کی چار دیواری میں میرا ایک رفیق حسن عابدی بھی ہے، اسے اگرچہ بہتر کلاس ملی ہوئی تھی مگر یہاں پر اس کا والی وارث کوئی نہیں ہے۔ کھانے اور چائے کا سامان تو اسے جیل سے مل جاتا ہوگا۔ مگر سگریٹ، صابن یا کوئی اور چیز جو باہر سے آسکتی تھی وہ اسے کبھی نہ ملتی ہوگی۔ نہ کوئی اس کی ملاقات کرنے والا تھا اور نہ کوئی اسے سامان بھیجنے والا تھا۔ حجاب بنانے تک کا سامان بھی اس غریب کے پاس موجود نہ تھا۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر ہم دونوں ایک ساتھ رہ سکتے پھر وہ جیل کے دوسرے انتہائی گوشے میں تھا، مجھے اس کی کوئی خبر، کوئی اطلاع نہیں ملتی تھی۔ بس اتنا ضرور معلوم تھا کہ وہ ہے اسی جیل میں، کئی بار میں نے آفیسروں سے درخواست کی کہ ہمیں ایک ساتھ رکھا جائے لیکن میری درخواست ہمیشہ یہ کہہ کر ٹھکرائی جاتی رہی کہ حکومت یعنی پولیس کے احکامات ہی یہ ہیں کہ ہمیں ایک دوسرے سے الگ رکھا جائے۔

اسی زمانے میں ایک روز ڈپٹی صاحب ٹہلتے ہوئے میرے غریب خانہ کی طرف آنکلتے تو میں نے ان سے اخبار باقاعدہ نہ ملنے کی شکایت کی اور کہا ”اخبار دینے میں بھی بے قاعدگی اختیار کرنے کے معاملہ میں حکومت کے کوئی احکامات نہیں ہیں اس لیے اخبارات ہی باقاعدگی سے ملتے رہیں تو آپ کی بڑی عنایت ہوگی۔“

ڈپٹی صاحب اس فقرے سے محظوظ ہوئے۔ ویسے ان کی مزاح کی حس کافی تیز تھی اور اس روز تو وہ بہت اچھے موڈ میں تھے چنانچہ انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا کہ کل سے وہ جیل میں قیدیوں کو پڑھانے کے لیے جو ماسٹر صاحب مقرر ہیں ان کی ڈیوٹی لگا دیں گے کہ وہ باقاعدہ مجھے اخبار پہنچاتے رہیں۔ یہی ماسٹر صاحب جیل کی لائبریری کے انچارج بھی تھے۔

ڈپٹی صاحب رخصت ہونے لگے تو میں نے ان سے پوچھا ”جیل کے محکمہ میں رہنے کے باوجود آپ کی خوش ذوقی کیسے قائم رہ گئی اور یہ کہ اس محکمہ میں نوکری کرنے کے باوجود اپنے شہتہ ذوق کو قائم رکھنا بڑے حوصلہ کا کام ہے۔“ میں اس روز تنہائی سے بہت زچ ہو گیا تھا اور انہیں کسی بہانے سے روک کر ”باتیں کرنے“ کی عادت پوری کر رہا تھا۔ حقیقتاً مجھے ان کے ذوق کے متعلق ہمیشہ تعجب ہوتا تھا۔ اس وقت موقعہ پا کر میں نے ان سے صاف صاف پوچھا تو وہ مسکرا کر کہنے لگے ”میرا اصل حوصلہ یہ نہیں ہے کہ میں ایسے حالات میں اپنی ان عادتوں کو کیسے برقرار رکھ رہا ہوں۔ میرا اصل حوصلہ یہ ہے کہ میں جس قسم کے گھر میں رہتا ہوں اس میں رہ کر بھی زندہ ہوں۔ جو آدمی میری بیوی کو جانتے ہیں، تعجب تو ان کو ہونا چاہیے کہ میرے جیسا آدمی اس کے ساتھ نباہ کئے جا رہا ہے۔ میرا اصل حوصلہ تو یہ ہے۔“

یہ بات انہوں نے ہنستے ہوئے کہی تھی، معلوم ہوتا تھا کہ وہ گھر سے پریشان ہو کر یا لڑ جھگڑ کر آئے ہیں۔ کافی عیال دار آدمی تھے اس لیے لڑائی جھگڑا ہونے کی بھی نوبت آسانی سے آسکتی تھی مگر اس روز ان کی یہ بات سن کر مجھے یہ محسوس ہوا کہ ہمارے اس غیر فطری معاشرہ میں کوئی بھی آدمی اپنی صحیح جگہ پر نہیں ہے۔ یہ ڈپٹی صاحب جن کا نام شیخ محمد شریف ہے اگر کسی شرافت کی نوکری پر ہوتے تو شاید اس سے کہیں بہتر کام کر سکتے جو وہ یہاں پر کر رہے ہیں۔ میرے ساتھ گھلنے ملنے کے بعد مجھے ان کی شخصیت کے کئی اور اچھے اور بہتر پہلو دکھائی دیئے مگر بد قسمتی سے ان کی آفیسری ان کی تمام خوبیوں پر غالب آئی ہوئی تھی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ خود انہوں نے اس نوکری کی وجہ سے اپنی صورت مسخ کر لی تھی اور اب اسی ڈھرے پر چل نکلے تھے جس پر چلنے کے لیے وہ دنیا بھر میں سب سے زیادہ ناموزوں آدمی تھے۔

ماسٹر صاحب

اگلی صبح ڈپٹی صاحب ایک ذبلے پتلے منحنی سے آدمی کو اپنے ساتھ لیے میرے احاطہ میں داخل ہوئے یہ شخص اس

قدر خستہ حال، کمزور اور ناتواں نظر آ رہا تھا کہ معلوم ہوتا تھا ہوا کے جھونکے سے ابھی اڑ جائے گا اور ہم دیکھتے دیکھتے رہ جائیں گے۔

اس کی عمر تو کچھ زیادہ نظر نہ آتی تھی مگر اس کا چہرہ ان تمام مصیبتوں اور آفات ارضی و سماوی کا آئینہ دار تھا جو اس جانِ ناتواں پر نازل ہوتی رہی ہوں گی۔ پہلی ہی نظر میں میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ یہ وہی ماسٹر صاحب ہیں جن کے بارے میں اگلے روز شیخ صاحب ذکر کر رہے تھے۔ چنانچہ انہوں نے مجھے بتا بھی دیا کہ یہ ماسٹر صاحب ہیں جو جیل کے ملازم ہیں۔ ان کا کام قیدیوں کو حرف شناسی کرانا ہے۔ یہ مجھے آئندہ اخبار باقاعدگی سے پہنچاتے رہیں گے اور اگر تنہائی کی وجہ سے کبھی بیہوش ہونے کے قریب پہنچ جاؤں تو یہ میرے پاس دو چار منٹ بیٹھ بھی جایا کریں گے۔

ماسٹر صاحب اس سے اگلے دن صبح کونو بجے کے قریب دروازے میں سے نمودار ہوئے اور دہلیز پر کھڑے ہو کر انہوں نے اخبار میری طرف بڑھا دیئے۔ میں نے ان سے کہا ”قبلہ! میں تنہائی کی وجہ سے بے ہوش ہونے والا ہوں اس لیے ڈپٹی صاحب کے حکم کے مطابق آپ دو چار منٹ کے لیے میرے پاس بیٹھ جائیں۔“

وہ کچھ جھجکتے ہوئے، شرماتے لجاتے ہوئے، اپنے آپ ہی سے شرمندہ دو قدم آگے بڑھے، میں بھی دو قدم ان سے ہاتھ ملانے کے لیے بڑھا مگر وہ گھبرا کر پھر پیچھے ہٹ گئے۔

دو منٹ تک وہ اسی طرح کھڑے رہے، ادھر ادھر کی باتیں ہوئیں۔ وہ گھبرا کر چاروں طرف دیکھتے جاتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ڈر کے مارے مرے جا رہے ہیں۔ اتنے میں ایک جمعدار پاس سے گزرا تو انہوں نے بڑی رحم طلب نظروں سے میری طرف دیکھ کر فرمایا ”دیکھا جمعدار گھور کر دیکھ رہا ہے۔ اب یہ جا کر رپورٹ کر دے گا کہ یہ ماسٹر نظر بند سے باتیں کر رہا تھا۔ اس لیے میں اب چلتا ہوں، پھر حاضر ہوں گا۔“

ماسٹر صاحب تو یہ کہہ کر چلے گئے مگر مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دقت نہ ہوئی کہ ڈپٹی صاحب نے کمال فراخ دلی سے اس شخص کو مجھے اخبار پہنچانے کی اجازت کیوں دے دی ہے۔ غالباً انہوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ ماسٹر صاحب دنیا بھر میں بے ضرر ترین آدمی ہیں۔

اس روز کے بعد سے آہستہ آہستہ میں نے ماسٹر صاحب کو اپنے پاس دو چار منٹ بٹھانے کی عادت تو ڈال دی، وہ بیٹھ تو جاتے تھے مگر نوکری سمجھ کر اور ہمیشہ گھبرائے ہوئے اور محبوب سے نظر آتے۔

ماسٹر صاحب ایک شریف النفس، مجہول، مسکین اور فاتر العقل انسان تھے اور دنیا بھر سے شاک کی تھی۔ حالات، آفیسران حتیٰ کہ جمعداروں اور سپاہیوں سے بھی وہ ڈرتے رہتے تھے جو ان سے آدمی مخواہ لیتے تھے۔ ان کی شرافت کا یہ

عالم تھا کہ کبھی کبھی میں ان کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے محض عادتاً ان سے کہتا کہ حکومت نے مجھے سیاسی نظر بند ہونے کے باوجود جانوروں کی طرح رکھا ہوا ہے تو وہ جھٹ سے فرمادیتے ”جی ہاں! مگر شکر کیجئے کہ آپ کو اخبار مل جاتا ہے۔ اگر وہ بھی بند کر دیں تو آپ ان کا کیا کر سکتے ہیں جی ہاں، وہ سب کچھ کر سکتے ہیں۔“

کبھی میں ان سے کہتا ”کھانا اچھا نہیں ملتا، صحت خراب ہو رہی ہے“ تو وہ جواب دیتے ”جی ہاں کھانا تو بہت خراب ہے مگر خدا کا شکر ادا کیجئے کہ کھانا آپ کو ملتا ہے، اگر کھانا بند ہی کر دیں یا ایک ہی وقت دیا کریں یا کم دیا کریں تو آپ کیا کر سکتے ہیں۔ بابا وہ حاکم ہیں جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ ان سے سب کچھ سچ ہے۔“

میری حالت زار اور قید تنہائی کی اذیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ میں پہروں ان ماسٹر صاحب کا انتظار کرتا رہتا اور اگر کسی دن وہ تشریف نہ لاتے تو میں اس طرح بیقرار رہتا گویا کوئی معشوق وعدہ کر کے مجھ سے ملنے نہیں آیا۔

ماسٹر صاحب ہمیشہ غائب دماغ بھی رہتے تھے۔ وہ باتیں کرتے تو ایک ہی منٹ میں کہیں سے کہیں نکل جاتے اور پھر ایک دم سے چپ ہو کر منہ میں کچھ بڑبڑانے لگتے۔ انہیں اس حالت میں دیکھ کر مجھے ہنسی تو بہت آتی مگر میں ہنسی کو پی جاتا اور گفتگو شروع کرنے کی کوشش کرتا ”ماسٹر صاحب اب تو موسم تبدیل ہو رہا ہے۔“

”اچھا؟“ وہ بڑا سا منہ کھول کر نہایت حیرت بھرے لہجے میں کہتے۔ دراصل وہ بغیر بات سنے اور سمجھے اپنی ہی دھن میں منہ کھول دیتے تھے۔ مگر بد قسمتی سے میں ان کی ان حرکتوں سے محظوظ بھی نہ ہو سکتا تھا میرا ہمیشہ جی چاہتا تھا کہ انہیں کندھوں سے پکڑ کر زور زور سے ہلاؤں اور پھر اپنی بات کہوں۔

حوالاتی اور دفعہ 109

صبح سویرے حوالات کے مشققی پوچھا کرنے کیلئے میرے احاطے میں روزانہ آتے تھے۔ اب مجھے اس جیل میں آئے کافی مدت ہو چکی تھی اور جمعدار، ملازم اور آفیسر تک میری شرافت کے قائل ہو چکے تھے۔ اس لیے کبھی کبھی جمعدار احاطہ کا تالہ کھول کر اور حوالاتیوں کو پوچھا کرنے، جھاڑو دینے کی ہدایات دے کر ادھر ادھر کسی کام سے نکل جاتے۔ ویسے جمعداروں کی موجودگی میں بھی میں حوالاتیوں سے کبھی کبھار بات چیت کر لیتا تو وہ اب زیادہ تعرض نہ کرتے تھے۔

اس سارے عرصے میں پچاس فیصدی سے زیادہ حوالاتی پوچھنے پر یہی بتاتے رہے کہ وہ دفعہ ایک سو نو یعنی آوارہ گردی میں پکڑ کر لائے گئے ہیں۔ جیل میں رہ کر مجھے ایسا معلوم ہونے لگا تھا گویا پوری قوم آوارہ گردی کی طرف مائل ہے، جسے دیکھو آوارہ گردی میں چلا آ رہا ہے۔ روزانہ دس بیس آدمی اس جرم میں پکڑ کر اندر بھیج دیئے جاتے تھے۔

کافی دنوں کے بعد معلوم ہوا کہ جرائم کی رفتار بڑھنے پر حکومت محکمہ پولیس کو ہوشیار رہنے کی تاکید کرتی ہے۔

پولیس کے آفیسران ماتحتوں کو ڈانٹتے ہیں اور ماتحت تھا نیداز وغیرہ جرائم کے سدباب کے لیے یہ طریقہ اختیار کرتے ہیں کہ جس پر بھی شک ہوا پکڑ کر اندر ڈال دیا۔ کسوٹی یہ مقرر کر لی جاتی ہے کہ جو آدمی حقیقتاً آوارہ گرد نہیں ہوگا اس کی ضمانت دینے والے آجائیں گے جن کی ضمانت نہ ہوگی وہ یقیناً آوارہ گرد ہوں گے۔ ان کو عدالت سے سزا ہو جائے گی جو دو ماہ سے چھ ماہ تک کے عرصے کے لیے ہوتی ہے۔

جرائم کے سدباب کا یہ طریقہ حکومت کے ان دوسرے کارناموں میں سے ایک ہے جن کو وہ بغیر سوچے سمجھے عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرتی رہتی ہے۔ یہ کرم فرماتا نہیں سوچتے کہ جرائم کیوں بڑھ رہے ہیں۔ ایک معمولی عقل کا آدمی بھی یہ بات آسانی سے سمجھ سکتا ہے اور سمجھتا ہے کہ ملک میں جوں جوں بے روزگاری اور کساد بازاری بڑھتی ہے، جوں جوں لوگوں کی قوت خرید کم اور ضروریات زندگی گراں ہوتی ہیں، جرائم بڑھتے ہیں۔ ان کی جڑ اس معاشرہ میں ہے جو مجرم پیدا کرتا ہے، اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتا اور جرائم کم کرنے کے سلیمانی طریقے دریافت کرنے کے لیے سب موجود رہتے ہیں۔

اس ضمانت والے طریقہ میں بھی یہی ہوتا ہے کہ جو لوگ نسبتاً خوش حال اور کھاتے پیتے ہوتے ہیں ان کے ضامن آجاتے ہیں مگر لاوارث، غریب، پردیسی اور مہاجر لوگ دھکے کھاتے پھرتے ہیں۔ کتنے ہی ایسے حوالاتی تھے جو روتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم غریب مہاجر ہیں ہماری ضمانت بھلا یہاں پر کون دے گا۔

ایک بڑھے کو میں کبھی نہیں بھولوں گا جو میرے احاطہ کی دہلیز کے ساتھ لگا بیٹھا اس طرح رورہا تھا اور اتنے بڑے بڑے آنسو بہا رہا تھا کہ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا وہ ابھی ان آنسوؤں میں پکھل کر بہہ جائے گا۔

میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ دو روز سے یہاں ہے اور آج اس کی لڑکی کی شادی کی تاریخ ہے۔ اس ضعیف العمر غریب کسان نے ہچکیوں کے درمیان یہ کہا کہ وہ خانیوال کی تحصیل میں کیسی گاؤں میں رہتا ہے، مشرقی پنجاب کا مہاجر ہے۔ اپنی جوان بیٹی کی شادی کے موقع پر وہ تحصیل لودھراں میں اپنے ان چند رشتہ داروں کے پاس انہیں لینے لے لیے جا رہا تھا جو ان سے ناراض ہونے کی وجہ سے اس شادی میں شرکت نہیں کر رہے تھے۔ سفر کے دوران ہی پولیس والوں نے اسے ملتان سٹیشن پر آوارہ گردی میں گرفتار کر کے جیل بھیج دیا اور اپنا کوٹہ پورا کر کے اور جرائم کا سدباب کر کے بڑے اطمینان سے گھر چلے گئے مگر اس بے چارے کی دنیا برباد ہو گئی۔ وہ اس طرح رورہا تھا کہ مجھ سے دیکھنا نہ گیا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ اس کا کوئی ضامن نہیں ہے، اسے کسی پر یہ امید نہیں ہے کہ وہ اس کی ضمانت دے گا۔ اسے تو صرف یہ فکر تھی کہ کسی نہ کسی طرح اپنے گھر اطلاع پہنچا دے۔

اطلاع پہنچانے کی ایک ہی صورت ہو سکتی تھی اور وہ یہ کہ وہ کارڈ لکھ کر اپنے گھر اطلاع دے دے کہ وہ اس طرح پکڑا گیا ہے مگر جیل میں ہو اخلاقی قیدی کو مہینہ میں ایک کارڈ لکھنے کی جو اجازت ہوتی ہے اس کی صورت بیان کرنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

قیدی کے لیے ضروری ہے کہ وہ پریڈ کے دن (جو ہفتہ میں ایک ہوتا ہے) سپرنٹنڈنٹ صاحب سے سوال یعنی درخواست کرے کہ وہ اسے کارڈ لکھنے کی اجازت دے دیں۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب کی اجازت ملنے کے بعد اس علاقے کے منشی کا فرض ہوتا ہے کہ وہ ڈیوڑھی سے کارڈ لے کر لکھے اور اس کے بتائے ہوئے پتے پر روانہ کرے۔ روانہ کرنے سے پہلے تمام کارڈ ڈیوڑھی میں جاتے ہیں۔، جہاں جیل کے آفیسر انہیں پڑھ کر سنسرت کرتے ہیں۔ اس سنسرت بازی کے لیے خطوط ہفتوں ان کے پاس پڑے رہتے ہیں تب کہیں جا کر یہ روانہ ہوتے ہیں اور بعض اوقات روانہ کرنے کی بجائے ادھر ادھر پھینک بھی دیئے جاتے ہیں۔

اب یہ غریب بڑھا پہلے تو پانچ روز تک سپرنٹنڈنٹ صاحب کے دورہ کا انتظار کرتا۔ ان کی اجازت ہوتی تو منشی صاحب کے رحم و کرم پر دو چار یا چھ روز تک پڑا رہتا اور پھر اس کا کارڈ ڈیوڑھی پہنچتا جہاں سے کہیں مہینہ بھر کے بعد وہ روانہ کیا جاتا۔

یہ سارا معاملہ سوچ کر میں اس غریب بڑھے اور اس کے گھر والوں کی تقدیر کے بارے میں غور کرتا رہا اور اس کی اس جوان بیٹی کی زندگی کے بارے میں سوچتا رہا جو ہاتھوں میں مہندی لگائے اپنے باپ کے انتظار میں بیٹھی ہوئی تھی اور اسے اتنا بھی پتہ نہ چل سکا کہ وہ کہاں ہے۔ زندہ ہے یا مردہ ہے۔

مگر قانون کے محافظوں کو اس غریب بوڑھے یا اس کے خاندان یا اس کی بیٹی کی زندگی سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ انہیں اس کی کوئی پروا نہ تھی کہ ان کی ایک معمولی جنبش قلم سے ایک غریب گھر برباد ہو رہا ہے۔، ایک دنیا اجڑ رہی ہے، ایک خاندان جو پہلے ہی سے تباہ حال ہے اور بھی تباہ ہو جائے گا۔ انہیں تو قانون چلانے، قانون بنانے اور قانون استعمال کرنے سے غرض تھی۔ اس قانون کا وار کس پر پڑتا ہے، اس کی کاٹ کتنی گہری، کتنی شدید اور کس قدر خوفناک ہے، اس سے انہیں کوئی غرض نہ تھی۔

کتنی انوکھی تھی یہ دنیا، کتنے ظالمانہ تھے یہ قانون اور کتنی دکھی اور غمگین انسان اس چار دیواری میں محبوس تھے۔ ہمارے معاشرے اور ہمارے سماج میں غریب انسان کو کتنے جانگداز امتحانوں میں سے گزرنا پڑتا ہے اس کا اندازہ جیل ہی میں پہنچ کر ہو سکتا ہے جہاں انسانوں کو پکڑ پکڑ کر تالوں اور کٹھروں اور زنجیروں میں جکڑ دیا جاتا ہے اور یہ نہیں سوچا جاتا

کہ خرابی کہاں پر ہے؟

اس چار پانچ سال کے عرصے میں میں نے دیکھا کہ حکومت نے ایک ہی کام سیکھا تھا کہ اس خرابی، اس ظلم اور جبر کے خلاف جہاں سے آواز بلند ہوتی ہے اسے ختم کرنے کی کوشش کرو۔ اس آواز کو دبا دو۔ کاش وہ اتنا سوچتے کہ یہ آواز کہاں سے اور کیونکر بلند ہو رہی ہے۔

اس شام میری طبیعت نے حد افسردہ تھی، عجیب بے کلی اور بے بسی کے عالم میں میں اپنے احاطے میں ٹہلتا رہا، کھانا کھانے کے لیے بیٹھا ہی تھا کہ باہر سے رونے کی آواز آنے لگی۔ رونا کیا تھا یوں معلوم ہوتا تھا گویا کوئی آدمی درد سے چنگھاڑ رہا ہے۔ آواز کافی دور سے آرہی تھی مگر اس کی ایک ہی لہر نے مجھے لرزادیا۔ میں بھاگ کر دروازہ کے پاس پہنچا۔ دروازہ تھپتھا کر میں نے جمعدار کو بلایا اور اس سے پوچھا کہ کہ رونے کی آواز کیسی ہے؟

اس نے مسکراتے ہوئے لاپرواہی سے کہا ”ادھر ڈیوڑھی سے پاس کسی کو بید زنی کی سزا مل رہی ہے۔“

یہ سن کر مجھ میں کھانا کھانے کی تاب بھی باقی نہیں رہی اور میں چپ چاپ اپنی کوٹھڑی میں جا کر لیٹ گیا اور اپنی زندگی اور اپنے ساتھی دوسرے قیدیوں کی زندگی کے بارے میں دیر تک پڑا سوچتا رہا، چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔

معمولات

میں نے یہاں پر بھی اپنے معمولات مقرر کر لیے۔ انہی دنوں مجھے باہر سے جو کتابیں آئیں ان میں ایک کتاب یوگا کے متعلق بھی تھی چنانچہ اس کتاب کو پڑھ کر میں نے یوگیوں کے ورزشی آسن یاد کر لیے۔ صبح سویرے اٹھ کر میں سادھی لگا کر اور آنکھیں بند کر کے آدھ گھنٹہ بیٹھا رہتا اور صبح سویرے کا وقت گیان دھیان میں صرف کرتا۔ صبح کا اصلی تصور تو میرے ذہن سے بھی مٹ گیا تھا۔ پوکیسے پھٹتی ہے، مشرق سے سورج کی کرنیں کیسے نمودار ہوتی ہیں اور کارگہ عالم میں سورج کس طرح اپنی ضیا پاشیاں کرتا ہے۔ یہ سب کچھ تو مجھے بھول گیا تھا۔ اس لیے میں نے گیان دھیان اور یوگا کے آسنوں کی مشق کر لی۔ گھنٹہ بھر اسی طرح گزار کر میں اپنی کوٹھڑی کے تالہ کھلنے کا انتظار کرتا۔ تالہ کھلتا تو کیتلی اٹھا کر میں سیدھا چولہے کے پاس پہنچتا۔ چائے پکاتا، مگر خود ہی اسے اٹھا کر اندر لاتا اور پیالی سامنے رکھ کر آدھ گھنٹہ تک آہستہ آہستہ چائے پیتا۔ اس سے فارغ ہو کر ایک سگریٹ سلگاتا اور احاطہ ہی میں چہل قدمی شروع کر دیتا۔ اس وقت تک دیوار کے سرے پر سے سورج نظر آنے لگتا تھا۔ چہل قدمی سے فارغ ہو کر میں چٹائی بچھا کر کوئی کتاب پڑھنے لگتا، دس بجے تک کھانا آجاتا کھانا کھا کر پچھلے روز کا اخبار پڑھتا۔ اخبار دس بجے کے قریب ملتا تھا اور ایک روز پرانا ہوتا تھا مگر میں اس پر ٹوٹ پڑتا اور دو گھنٹہ میں اردو اور

بڑی اخبار کا ایک ایک لفظ پڑھ ڈالتا۔

دوپہر عام طور پر بڑی مشکل سے کھتی تھی دوپہر میں اتنی سنسان اور غمگین اور خوفناک تھیں کہ میں اپنے آپ ہی سے ڈرتا رہتا۔ ان دوپہروں کی خاموشی اور ان کا وہ بے روح سناٹا کسی طرح کم نہ ہوتا تھا۔ عجیب سنسان سے دن تھے، ہوا ان بھر چلتی رہتی اور پتیل کے پتے ٹپ ٹپ میرے احاطہ کے صحن میں گرتے رہتے ان پتوں کے گرنے سے اور ہوا کی مائیں سائیں سے فضا اور بھی غمگین اور بھی اداس معلوم ہوتی تھی۔

میں دس بجے سے دو بجے تک کوئی ایک ہزار بار اٹھ کر سایوں کو دیکھتا۔ دوپہر کے ڈھلنے اور پھر سائے کے اس نشان تک پہنچنے کا انتظار کرتا جو میں نے چائے کے وقت کے لیے دیوار پر لگا رکھا تھا۔ ہر دوپہر مجھے صدیوں لمبی نظر آتی تھی مگر پھر بھی کسی نہ کسی طرح ہر دوپہر گزر جاتی اور میں چائے پکاتا، چائے پیتا اور ڈاکٹر صاحب کی آمد کا انتظار کرتا۔ ڈاکٹر صاحب تین بجے کے قریب آتے تھے وہ باہر سے دروازہ تھپتھپاتے اور ایک مشقتی دروازے کے پٹ کو ذرا سا کھول کر ٹین کی وہ ڈبیا جس میں اٹھارہ نمبر کی خوراک ہوتی تھی آگے بڑھا دیتا۔ میں دوئی پی لیتا۔ ڈاکٹر صاحب کی اٹھارہ نمبر میں کوئی اثر نہیں تھا۔ کیونکہ ایک روایت کے مطابق (جو بالکل صحیح معلوم ہوتی تھی) ڈاکٹر صاحب نے پندرہ، اٹھارہ، بیس اور پچیس روز پرانا پانی رکھا ہوا تھا۔ لیبل صرف اس لیے لگائے گئے تھے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ پانی کتنے دن پرانا ہے۔ اس حقیقت کے انکشاف کے باوجود میں سارا سال روزانہ یہ خوراک پیتا رہا، صرف اس لیے تاکہ ایک منٹ ہی کے لیے مجھے کوئی مخاطب تو کرے، مجھ سے کوئی بات تو کرے۔

چار بجے کھانا آتا اور پانچ بجے مجھے کوٹھڑی میں بند کر کے اس پر تالہ ڈال دیا جاتا۔ پھر احاطہ کا تالہ پڑ جاتا۔ پھر دو مہینے کا بڑا اچھا ٹک بھی مقفل ہو جاتا اور لمبی خوفناک رات شروع ہو جاتی۔

یہ راتیں بڑی سنسان تھیں، کمرے کے سلاخ دار دروازہ اور کھڑکیوں میں سے باہر احاطہ کی جود یواریں نظر آتی تھیں وہ اس قدر بلند تھیں کہ ان کے اوپر چاروں طرف سے آسمان ایک تیلی لکیر کی صورت میں نظر آتا۔ چاروں طرف سے دیواروں کے سروں پر آسمان کی طرف دو فٹ چوڑی لکیر نظر آتی جس میں اندھیری راتوں کو ستاروں کی شمعیں روشن نظر آتیں، کیسے خوبصورت ننھے ننھے ستارے رات بھر ٹمٹماتے رہتے۔ اس وقت میرے دل میں ایک ہی حسرت ہوتی، کاش میں پورے آسمان کو، آسمان کے پورے ستاروں کو دیکھ سکوں۔ میں اس آسمان کو بھول چکا تھا جس کی نیلی چادر میں ہزاروں، لاکھوں روشن ستارے رات بھر جگمگاتے رہتے ہیں۔ میں ہر رات یہ عہد کرتا کہ اب رہا ہونے کے بعد میں فطرت کے اس حسن کو اپنے دل اور اپنی نگاہوں کے قریب رکھوں گا جس سے مجھے ظالمانہ طریقہ سے الگ کیا گیا ہے۔ زندگی میں

کتی ہی بار ان ستاروں کو دیکھا تھا مگر ایسا حسن، ایسا جوش اور ایسی مسرت کبھی نظر نہ آئی تھی، یا محسوس نہیں کی تھی جو اس وقت محسوس ہوتی تھی، چاندنی راتوں میں تنہائی کی بے کلی اور بھی بڑھ جاتی۔ چاندنی میری کوٹھڑی سے باہر دودھ کی طرح کھینچ رہتی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا یہ چاندنی ان بھوری میلی دیواروں سے لپٹ لپٹ کر رو رہی ہے اس چاندنی کا حسن اور لازوال اور اس قدر زبردست ہوتا تھا کہ میں گھنٹوں اپنے دروازے کی سلاخوں کو پکڑے بیٹھا رہتا اور اس چاندنی کو دیکھ رہتا۔ یہ چاندنی اپنے ساتھ کتنی یادیں، کتنے غم اور کس قدر اسرار لیے آتی تھی میں اپنے دروازے میں بیٹھ کر گھنٹوں دودھیا چاندنی کو جیسے پیتا رہتا تھا۔

اکتوبر کے آخر تک راتیں بھی لمبی ہونے لگی تھیں اور کسی طرح گزرنے ہی میں نہ آتی تھیں۔ لائین کی مدد سے روزانہ میں روزانہ پروانے آتے اور اس پر نثار ہو جاتے، روزانہ میں اپنی محبوب چھپکلی کا انتظار کرتا جو آ کر مجھے ان سے نجات دلا دیتی تھی۔ کسی روز چھپکلی نہ آتی تو میری بے کلی بڑھ جاتی اور میں اس مکروہ صورت کو تنہائی میں بیٹھا پکارتا رہتا۔ بس یہی میرا ساتھی تھے۔

صلیب

میرے احاطے کی شمالی دیوار کے باہر بجلی کا ایک کھمبا تھا۔ پہلی راتوں میں چاند اس کھمبے کے پیچھے سے نمودار ہوتا۔ کھمبا اس قسم کا تھا کہ اس کا سایہ میری کوٹھڑی کی دیوار پر ایک صلیب کی شکل میں پڑتا، پھر چاند اپنے سفر پر روانہ ہوتا تو صلیب بھی میرے سر ہانے کی دیوار پر سفر شروع کرتی کبھی دوسری دیوار سے، اس طرح یہ سفر رات بھر جاری رہتا۔ میں اس صلیب کو دیکھتا رہتا اور ہر رات مصلوب ہوتا تھا۔ ہر رات مجھے ایسا معلوم ہوتا گویا میں پھانسی کے تختے پر لٹک رہا ہوں اور میں پہروں یہ سوچتا کہ وہ لوگ کتنے خوش نصیب تھے جو ایک ہی بار مصلوب ہو کر نجات پا گئے۔ آج کے انسان کو تو ہر رات نئے طریقہ سے مصلوب ہونا پڑتا ہے، ہر رات کی ذہنی اذیت اور ذہنی موت برداشت کرنی پڑتی ہے۔

وقت اس طرح گزر رہا تھا۔ وقت کسی نہ کسی طرح گزر ہی جاتا ہے۔ لیکن جو زمانہ گزر گیا تھا اس کی اذیت بھول گئی تھی مگر جو زمانہ پہاڑ کی طرح سر پر کھڑا تھا، اس کے بارے میں میں سخت اذیت میں مبتلا رہا۔ اکتوبر کے آخر میں اخباروں کی بعض خبروں سے اتنا اندازہ تو ہو گیا تھا کہ بعض نظر بند چھ ماہ کے بعد رہا کر دیئے جائیں گے میری چھ ماہ کی بندی 9 نومبر کو ختم ہونے والی تھی۔ کل بیس بائیس دن باقی رہ گئے تھے۔ ان دنوں میں وہ سارا سکون ختم ہو گیا جو اس زندگی کا عادی ہو جانے کی وجہ سے مجھے حاصل ہونے لگا تھا۔ دل میں بار بار یہ خیال آتا کہ شاید میں رہا ہو جاؤں، شاید میں بھی ان خوش قسمت لوگوں میں سے ہوں جو نومبر کے شروع میں رہا ہو جائیں گے۔

امید کی اس شمع نے ایک بار پھر بے چین کر دیا۔ یوگا کے آسن اور گیان دھیان کے اوقات میں بھی یہ خیال بار بار ذہن میں پیدا ہوتا کہ نہ معلوم کیا ہو جائے سیٹھی ایکٹ یوں تو سدا بہار ہے۔ اس کی کوئی مدت ہی نہیں۔ حکومت چاہے تو ایک نظر بند کو تا عمر قید رکھ سکتی ہے اور رکھا ہوا بھی ہے لیکن میں اپنے متعلق سوچتا تھا کہ میں کوئی اہم آدمی نہیں ہوں۔ میں نے ابھی تک کوئی کارنامہ بھی سرانجام نہیں دیا۔ اپنی پرانی زندگی پر نظر ڈالتا تو مجھے اپنا کوئی جرم بھی ایسا نظر نہ آتا جس پر میں ایک روز کی سزا کا بھی مستحق ہو سکتا۔ پھر مجھ پر یہ کرم فرمائی کیوں ہو رہی ہے؟ ابھی تو مجھے بہت کچھ کرنا تھا۔ صرف پروگرام بنائے تھے، صرف خیال ہی خیال میں عہد کیا تھا کہ اس زندگی کو، اس جان حزیں کو وطن کی بے بسی پر قربان کرنا ہے۔ میں اکثر سوچتا، کاش! میں نے کوئی ایک کارنامہ ہی سرانجام دیا ہوتا، کوئی ایک کام تو کیا ہوتا ابھی تو بغیر کسی وجہ کے محض دوسروں کے ساتھ پکڑ لیا گیا ہوں۔

ان تمام باتوں کے باوجود میرے دل میں یہ اندیشہ پختہ تھا کہ میں رہا نہیں کیا جاؤں گا۔ میرے متعلق پولیس کچھ بہت زیادہ سختی کی طرف مائل نظر آتی تھی۔ بہتر کلاس علم طور پر پولیس کی سفارش سے ملتی ہے۔ ہماری عرضیوں پر ندیم صاحب اور حسن عابدی کو بی کلاس مل گئی تھی مگر مجھے ابھی تک اس سے محروم رکھا گیا تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ پولیس نے مجھے بہتر کلاس دینے کی مخالفت کی ہے اور پولیس اس کی مخالفت کرتی ہے تو میں نے ضرور کوئی بڑا جرم کیا ہوگا۔

نومبر 51ء کی تین چار تاریخ کے اخباروں میں خبر آگئی کہ احمد ندیم قاسمی اور ظہیر کاشمیری کو رہا کر دیا گیا ہے۔ یہ خبر پڑھ کر اور حکومت کی طرف سے نئے وارنٹ نہ آنے کی وجہ سے مجھے واقعی یہ اندیشہ پیدا ہو گیا کہ میں رہا کر دیا جاؤں گا، تاہم دل میں یہی شبہ تھا کہ مجھ پر حکومت کی نظر کرم کچھ زیادہ ہے وہ بھی باقی رہا اور میں یہ بھی سوچنے لگا تھا کہ اگر رہا کرنا ہوتا تو مجھے بھی ندیم اور ظہیر کے ساتھ کر دیا جاتا۔

دو تین نومبر سے لے کر آٹھ نومبر تک کا جو ہفتہ تھا وہ تو جیسے میرے احاطہ میں آ کر جم گیا تھا۔ مجھے اکثر یوں معلوم ہوتا گویا وقت نے چلنے سے انکار کر دیا ہے۔ ہر بار احاطہ کا دروازہ کھلتا تو میں امید و بیم کی کشمکش میں مبتلا ہو جاتا۔ ہر آفیسر کے آنے پر مجھے یہ اندیشہ بھی ہوتا کہ چھ مہینے کی مزید نظر بندی کا وارنٹ لے کر آیا ہے اور یہ خیال بھی ہوتا کہ شاید رہائی کے احکامات آگئے ہوں۔

آخر 9 نومبر کا وہ تاریخی دن آپہنچا۔ صبح سویرے میری آنکھ کھلی۔ اس روز یوگا کے آسن اور سادھی لگانے کو بھی دل نہ چاہا۔ ویسے میں مایوس سا تھا۔ خیال یہ تھا کہ چونکہ رہا کئے جانے والوں کو مقررہ دن سے ہفتہ دس دن پہلے ہی رہا کر دیا جاتا ہے اور ندیم اور ظہیر کی رہائی بھی ہو چکی ہے اس لیے میں رہا نہیں ہوں گا مگر نئے احکامات نہ آنے کی وجہ سے کچھ

پریشانی بھی تھی۔

کوئی ساڑھے چھ بجے ڈپٹی صاحب آئے تو میں نے ان سے کہا ”خدا کے لیے بتائیے کہ مجھے جانا ہے یا نہیں پر رہنا ہے۔ اگر مجھے توسیع کی اطلاع مل جائے تو میں اس کشمکش سے تو نجات پا جاؤں۔“

”تم بستر وغیرہ باندھ کر تیار رہو“ انہوں نے کہا ”اگر تمہیں رکھنا ہوتا تو اب تک تمہارے احکامات آگے ہوتے۔ خیال ہے کہ تم رہا ہو جاؤ گے۔“

ان کے جانے کے بعد میں نے بستر باندھا۔ سوٹ کیس میں کپڑے اور کتابیں جمائیں اور رہا ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

کوئی آٹھ بجے احاطہ کا دروازہ کھلا ڈپٹی صاحب دروازہ میں نمودار ہوئے۔ ان کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا اور ان کے ساتھ ساتھ ایک نمبردار قلم دوات اٹھائے ہوئے چلا آ رہا تھا۔

انہیں اس شان سے آتے دیکھ کر مجھے یہ سمجھنے میں ذرا بھی دقت نہ ہوئی کہ رہائی کی بجائے آج تو وسیع نظر بندی کے احکامات آگئے ہیں۔ چنانچہ سب سے پہلا کام میں نے یہ کیا کہ اپنا بستر فوراً کھول دیا اور ڈپٹی صاحب سے ملنے کے لیے آگے بڑھا۔

انہوں نے گلا صاف کرتے ہوئے کچھ تسلی آمیز فقرے بولنا شروع کئے غالباً ان کو یہ ہدایات ہوتی ہیں کہ ایسے احکامات اس طرح مت سناؤ کہ نظر بند کو صدمہ پہنچ جائے اور اسی کا ہارٹ فیل ہو جائے۔ مگر میں تو اپنی حکومت کے بارے میں پہلے ہی سے کچھ زیادہ پر امید نہ تھا۔ اس لیے مجھے زیادہ صدمہ نہیں ہوا۔ چنانچہ میں نے ان کی بات کاٹ لی اور دست بستہ عرض کی ”حضور! میں زیادہ دیر شش و پنج میں مبتلا نہیں رہ سکتا۔ آپ جو بری خبر بھی لائے ہیں سنا دیجئے، میں بالکل تیار ہوں۔“

انہوں نے ٹائپ شدہ دس سطری مسودہ میرے سامنے کر دیا۔ وہی منحوس عبارت درج تھی ”گورنر پنجاب کو اطمینان ہے کہ..... حمید اختر کی نظر بندی مزید چھ مہینے کے لیے امن عامہ کی حفاظت کے پیش نظر اشد ضروری ہے اس لیے اسے 9 مئی 52ء تک نظر بند رکھا جائے گا۔“

میں نے اس پر دستخط کر دیئے۔ اس وقت مجھے معلوم ہو رہا تھا کہ ڈپٹی صاحب مجھ سے زیادہ پریشان ہیں۔

پھر وہی سلسلہ روز و شب

یہ تو برے آثار ہیں فانی، غم ہو، خوشی ہو، کچھ تو ہو!

دل کا یہ کیا حال ہوا، مغموم نہیں، مسرور نہیں

نظر بندی کے نئے دن شروع ہو گئے۔ مگر یہ اس قسم کے دن نہ تھے جس طرح پہلی ششماہی کی نظر بندی کے شروع میں تھے۔ اس وقت میں اگرچہ اس دام میں نیا تھا مگر اس وقت کتنے رفیق، کتنے دوست ساتھ تھے۔ اب کچھ بھی نہیں تھا بس ایک بے رحم لامتناہی تنہائی تھی، یہ احاطہ تھا اور آسمان کی ٹکڑی تھی جو ٹوپی کی شکل میں میرے سامنے تھی۔ میں بہت دنوں تک اپنے ساتھیوں کے بارے میں سوچتا رہا جو میری طرح ابھی اندر تھے، دادا منصور، غلام محمد، محمد افضل، حسن عابدی، شمیم اشرف سبھی لوگ ابھی اندر تھے۔ ندیم صاحب اور ظہیر کا شمیری رہا ہو گئے تھے مگر وہ باہر کیا کر رہے ہوں گے۔ ان کی باتیں کیسی ہوں گی۔ وہ کس سے ملتے ہوں گے۔ خاص طور پر ندیم صاحب اس دنیا کو کیسے دیکھتے ہوں گے جس میں ہم اور وہ اکٹھے گھومتے تھے۔ ایک ساتھ پھرتے تھے۔

آہستہ آہستہ وقت گزرنے لگا۔ میں اس دنیا کو بھول گیا جو اس احاطہ سے باہر تھی۔ اس کی صورت میرے ذہن سے بھی نکل گئی۔ کبھی کبھی رات کی تنہائیوں میں میں یہ ضرور سوچتا کہ وہ پھولوں، باغوں، گلزاروں اور آبشاروں کی دنیا کیسی ہے؟ وہاں اب بھی پھول کھلتے ہوں گے اور زرق برق لباس میں لوگ سڑکوں پر ٹہلتے ہوں گے۔ اپنے دکھوں، اپنے غموں اور اپنی خوشیوں کا ذکر کرتے ہوں گے مگر میں کہاں ہوں، جہاں کوئی آواز نہیں ہے، جہاں امید کی روشنی کی کوئی شعاع نظر نہیں آتی ہر طرف سکوت مرگ ہے، ہر طرف بھوری دیواریں ہیں اور تالے اور کٹھرے ہیں، زنجیریں ہیں۔

میں یہ بھول گیا کہ سر شام مغرب میں شفق کے رنگ کیسے دل آویز ہوتے ہیں، کیونکہ چھ ماہ سے میں نے وہ لکیر بھی نہیں دیکھی تھی جہاں زمین اور آسمان ملتے ہیں، کچھ بھی نظر کے سامنے نہ تھا۔ صرف بھوری اور بے مہر دیواریں تھیں اور سنگدل زمین تھی۔

نومبر کی ایسی ہی ایک رات میں میرے احاطہ کے باہر پھانسی والوں کی پہلی کوٹھڑی سے حیات محمد نے مجھے

”حیات محمد! کیا حال ہے؟“

”حیات محمد! شکر ہے خدا کا، گزر رہی ہے۔“

”شاہ جی! تم تو پچھلے ہفتے رہا ہونے والے تھے“ اس نے کہا۔

”میری قید بڑھ گئی ہے۔“

”قید بڑھ گئی ہے؟ کوئی اور مقدمہ نکل آیا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

میں نے حیات محمد کو بڑے مشکل سے سمجھایا کہ میرا مقدمہ تو ایک بھی نہیں ہے مجھے تو احتیاطاً قید کیا ہوا ہے۔ یہ

بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔

تھوڑی دیر کے بعد اس نے کہا ”شاہ جی! آپ سردار ہیں، سید ہیں، خدا آپ کی دعا ضرور قبول کرے

گا۔ میرے لیے دعا کرنا۔ میں نے رحم کی اپیل کی ہوئی ہے۔“

میں اس سے کہنا چاہتا تھا کہ میری دعا میں اثر ہوتا تو میں خود آج یہاں کیوں پڑا رہتا لیکن موت کے اس

مسافر کا دل توڑنے کی ہمت اپنے میں نہ پاتے ہوئے میں نے اس سے کہا ”ضرور دعا کروں گا حیات محمد! خدا نے چاہا تو تم

رہا ہو جاؤ گے..... مگر پہلے تم مجھے ماہیا سناؤ۔“

رات کے سناٹے میں اس نے گانا شروع کیا۔

اساں تیتھوں کی لیناں
فکر نہ کریں چن وے
سدا کوٹھیاں بیس رہناں

اس کی آواز سوز سے بھری ہوئی تھی وہ اپنی روح کے سارے غنا اور ساری مستی کو بروئے کار لاتے ہوئے گار

تھا اس کی آواز سن کر اس سے اگلی کوٹھڑی میں سے غلام عیسیٰ نے بھی گانا شروع کیا۔

گڈی آبی کائی والی اے
اونے نکٹ ناں دینیں بابو
ساڈی رات جدائی والی اے

یہ سن کر مرید خاں اپنی پاٹھ دار گونجیلی آواز میں کوئی بلوچی نغمہ گانے لگا۔ وہ بار بار ”ڈاچی والیا

مہاروئے“ کی رٹ لگا رہا تھا۔

غلام عیسیٰ نے کہا ”مرید خان! تجھے گانا نہیں آتا۔“

مرید خان نے کہا ”گانا نہیں آتا، تو نے اگر مجھے اپنی ڈاچی پر چڑھ کر گاتے ہوئے سنا ہوتا تو یہ بات کبھی

کہتا: اب تو جیل کی تیل والی ڈال کھانے اور ڈیڑھ سال تک کوٹھی میں بند رہنے کی وجہ سے میں گانا بھولتا جا رہا ہوں مگر باہر کی دنیا میں میرا گانا سن کر سوانیاں (غور تیں) کام کاج چھوڑ کر میرے گرد ہو جاتی تھیں۔“

”اچھا مرید خان اللہ رحم کرے گا“ غلام عیسیٰ نے کہا۔

آمین! آمین!!!“ مرید خان نے جواب دیا۔

پھر خاموشی چھا گئی۔ پھانسی والے اپنے اپنے اندیشوں میں غرق ہو گئے اور اپنی اس دنیا کے بارے میں سوچنے لگے جسے وہ باہر چھوڑ آئے تھے اور جس سے ان کے سارے تعلق ٹوٹ گئے تھے۔ میں بھی خاموش ہو گیا اور اپنی لکروں میں غلطان چپ چاپ لیٹا ہوا کتاب پڑھنے لگا۔

باہر ہوا چیختی ہوئی چل رہی تھی۔ درختوں کے پتے سائیں سائیں کر رہے تھے۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ عجیب دہشت تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا گویا یہ رات کبھی ختم نہ ہوگی بلکہ موت ہے جو چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے کبھی کبھی نیات محمد کے کروٹ بدلنے کی آواز آتی، پھر وہ گنگناتا۔

”سدا کوٹھیاں نہیں رہناں۔“

اور پھر خاموشی چھا جاتی۔

اس زمانے میں میرا ذہن بالکل خالی ہو گیا۔ احساس جیسے بالکل فنا ہو گیا تھا۔ رنج، غم، خوشی یا جذبہ کچھ بھی دل میں موجود نہ تھا۔ بس ایک سناٹا ایک بے حسی تھی جو سارے وجود پر طاری رہتی۔

میں صرف یہ سوچ کر پریشان رہتا تھا کہ میری نظر بندی کی توسیع کی خبر میری بیمار بہن اور میری بڑی بہن نے کس طرح سنی ہوگی اور ان دونوں بہنوں کو اس سے کس قدر تکلیف ہوئی ہوگی۔ اس توسیع نظر بندی کے بعد میں نے جو خط لکھا تھا اس کا جواب مجھے میری بھتیجی عذرا نے دیا تھا۔ اپنے گھر میں عذرا مجھے سب سے زیادہ پیاری ہے۔ اس نے لکھا تھا کہ بہن سخت بیمار ہے اور میری نظر بندی کی مدت بڑھنے سے اسے سخت صدمہ ہوا ہے۔ آخر میں عذرا نے یہ بھی لکھا تھا کہ میں نے سکول میں خانہ داری کی کلاس میں بہت سے کھانے پکانے سیکھے لیے ہیں اور اب وہ میرا انتظار کر رہی ہے تاکہ میں آؤں تو وہ مجھے یہ تمام کھانے پکا کر کھلائے۔

آخر میں عذرا نے لکھا تھا ”چچا جان! میں آپ کی تصویر کو روزانہ صاف کرتی ہوں اور اسے صاف کرتے وقت سے رونا آ جاتا ہے۔ میں بڑی مشکل سے اپنے آپ کو ضبط کرتی ہوں، خدا سے دعا ہے کہ آپ جلد میرے پاس آ جائیں اور پھر آپ کے پاس بیٹھ کر آپ کی باتیں سنا کروں۔ آپ کی تابعدار بیٹی عذرا خانم۔“ عذرا کا یہ خط پڑھ کر تھوڑی دیر کے

لیے میری نظر کے سامنے اپنا سونا گھر پھر گیا۔ پھر میں نے سوچا ”یہ معلوم ایسے کتنے اور گھر ہوں گے جہاں کتنی ہی ننھی عصوم رو جس عذرا کی طرح روتی ہوں گی مگر وہ جو قلم کی ایک جنبش سے یہ لکھ کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ”ہمیں اطمینان ہے کہ اس شخص کو ابھی اور چھ ماہ تک جیل میں رکھنا ضروری ہے“ وہ اس حقیقت کو بھلا کیسے سمجھ سکتے ہیں؟

ان دنوں اپنی بے حسی اور بے دلی کی رعایت سے مجھے فانی کا یہ شعر اکثر یاد آتا تھا اور میں اکثر گنگنا تا رہتا تھا

کہ۔

یہ تو برے آثار ہیں فانی، غم ہو، خوشی ہو، کچھ تو ہو

دل کا یہ کیا حال ہوا مغموم نہیں، مسرور نہیں

یہ شعر میں نے اپنے واحد ساتھی یعنی اخبار پہنچانے والے ماسٹر صاحب کو بھی سنایا۔ انہوں نے فوراً یہ شعر

نوٹ کر لیا اور وہیں بیٹھ کر منہ میں بڑبڑاتے ہوئے اسے یاد کرنے لگے۔ اس دن کے بعد ان کا معمول تھا کہ صبح کے وقت

اخبار لے کر جو نہی وہ احاطہ میں داخل ہوتے تو زور سے پکارتے۔

یہ تو برے آثار ہیں فانی.....

یہ شعر انہوں نے اتنی بار اور اس طرح پڑھا کہ مجھے یہی شک ہونے لگا کہ یا تو وہ مجھے فانی سمجھ رہے ہیں یا

اپنے آپ کو۔ انہیں غالباً یہی ایک شعر یاد تھا۔ خیر یہاں تک تو ٹھیک تھا مگر بات یہاں تک بڑھی کہ میں ان سے کسی روز اگر

یہ کہتا ”ماسٹر صاحب! آج تو موسم بدلا ہوا نظر آتا ہے۔“

تو وہ فوراً جواب دیتے ”جی ہاں! یہ تو برے آثار ہیں فانی.....“

میں کہتا ”مصر میں حالات بہت خراب ہو گئے ہیں؟“

وہ فوراً جواب دیتے ”یہ تو برے آثار ہیں فانی.....“

میں کہتا ”آج کل اخبار میں کوئی خبر ہی نہیں ہوتی“ تب بھی وہ جھٹ سے بول اٹھتے ”یہ تو برے آثار ہیں

فانی.....“

انہوں نے اس شعر کو اس قدر گیدا کہ بالآخر مجھے اس سے نفرت ہو گئی۔ اگر میں بات بدلنے کے لیے ان سے

سے کہتا کہ فانی کا یہ شعر مجھے اس کے سارے دیوان پر بھاری نظر آتا ہے تو وہ جواب دیتے ”اچھا؟“ اور اس قدر تعجب سے

منہ کھول لیتے کہ میں پریشان ہو جاتا اس کے باوجود میں ان کا انتظار کرتا اور پہروں پہ سوچتا کہ وہ اخبار دینے آئیں گے

ان سے دو منٹ بات کر کے اپنی تنہائی میں ذرا کمی کر لوں گا۔

اپنی دنیا میں

جب باہر کے سارے دروازے بند ہو گئے، جب امیدوں کی تمام شمعیں جھلملا کر بجھ گئیں اور جب مجھے یہ معلوم ہونے لگا کہ میں اپنی پیدائش سے لے کر اس وقت تک اسی گہرے کنوئیں میں ہوں انہی دیواروں کی قید میں، اور ان اونچی بے رحم دیواروں کے باہر کچھ بھی نہیں ہے تب میں نے اپنے اندر ایک نگاہ ڈالی، اس وقت میں نے ہر طرف سے مایوس ہو کر اپنے ہی دل کی گہرائیوں میں اترنے کا فیصلہ کر لیا اور مجھے مایوسی نہیں ہوئی کیونکہ باہر کے دروازے بند ہونے کے بعد جب اندر کے دروازے کھلے تو مجھے اپنی زندگی کی ساری داستان یاد آگئی۔ اس دل میں، اس مدفن میں کتنی یادیں دفن تھیں، بچپن کی زندگی سے لے کر اس وقت تک کی زندگی کے تمام واقعات اور گزرا ہوا بچپن، لدھیانہ میں گزرے ہوئے نوجوانی کے دن، بمبئی میں گزرے ہوئے جوانی کے لمحات اور ان کی یادیں، یادوں کا ایک پورا قافلہ تھا، کتنے ہی دوستوں کی شکلیں نظروں کے سامنے پھر گئیں جن کو میں فراموش کر چکا تھا۔ جو زندگی کے بہتے ہوئے سمندر میں نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ میں نے تنہائی کی ان راتوں میں ان سب یادوں کو آباد کیا۔ ایک ایک واقعہ اور ایک ایک حادثہ کو اپنے دل کی تہوں سے نکالا اور ان کی گرد جھاڑ کر ان کا ایک گلزار اپنے سامنے آراستہ کر لیا۔

نومبر دسمبر کی ان سرد ستانی راتوں میں، جو کسی طرح ختم ہونے میں نہ آتی تھیں، میں اپنی کول کوٹھڑی میں لیٹا حسین خواب دیکھتا رہا۔ اس وقت کتنے محبوب نظر کے سامنے ہوتے، کتنے ہی جسم، کتنی ہی آنکھیں اپنی جانب نگراں دکھائی دیتیں اور محبوبوں کے کھلتے ہوئے ہونٹ اور لہراتی ہوئی زلفیں یاد آتیں۔ میں تصور ہی میں ان زلفوں سے لپٹ کر کتنی بار رویا ہوں۔ اپنے ذہن میں میں نے ہزاروں بار بھنچے ہوئے شگفتہ لبوں کا نقشہ بنایا اور بھولی ہوئی یادوں کے مزاروں سے کتنے ہی حسین جسموں کو کھینچ لایا۔ زندگی میں کہیں بھی، کسی راستے پر، میری زندگی کے کسی ایک لمحے میں بھی جہاں کہیں کسی حسین، کسی خوبصورت شے کا داخلہ ہوا تھا میں نے اسے ڈھونڈھ کر نکال لیا اور اس سے اپنا اجڑا ہوا دیار روشن کیا۔

کال کوٹھڑی کے اس بے رحم فرش پر لیٹے لیٹے میں نے اپنی زندگی کے سارے واقعات کو یاد کیا۔ اپنی فطرت، اپنی عادتوں اور اپنی کمزوریوں کا جائزہ لیا۔ اس فرش پر لیٹ کر میں نے ان سنگدل محبوبوں کو پکارا جو مجھے فراموش کر چکے تھے اور پھر ان شیریں دہنوں اور ان مہربان حسینوں کو یاد کیا جنہوں نے میری زندگی کو دوام بخشا تھا۔ جن کی باتیں، جن کے زلف و رخسار، جن کی تصویریں، جن کے تمام نقش میرے ذہن میں محفوظ تھے، جن کے لطف و کرم نے مجھے روح کا ارتقاء بخشا تھا۔

ان یادوں سے میں اس اندھیرے میں اجالا بھرنے کی کوشش کرتا رہا کیونکہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔

زمین اور آسمان کی ازلی، ابدی حقیقتوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ پھول نہیں تھے، بچے نہیں تھے، چشمے اور زندگی اور زندگی کا حسن اور بان کا بانکپن سب کچھ فنا ہو گیا، مٹ گیا تھا اور اس بے بسی اور محرومی نے میرے احساس کو جلا دے دی تھی۔ احساس کی شدت بڑھ گئی تھی جس کی وجہ سے میری برباد یاد کا ہر ایک پہلو مجھے کئی طرح ڈستا تھا۔ میں نے ہر وار کو برداشت کیا۔ اس کی تکلیف کو بھول کر اس میں سے لذت حاصل کی۔ ایک ایسا مقام بھی آتا ہے جب انسان اپنے دکھوں، اپنے غموں اور اپنے زخموں سے لذت حاصل کرتا ہے۔ میرے لیے یہ مقام آ گیا تھا اور میں نے اسے سنبھال لیا تھا۔ اس کے دامن میں بیٹھ کر میں نے تنہائی کے یہ خوفناک لمحے گزار دیئے۔

دسمبر میں سردی بڑھ گئی تھی۔ اگر اس وقت میں ان یادوں سے اپنی سونی اور ویران دنیا کو آباد نہ کر لیتا تو یقین ہے کہ زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔

اس زمانے میں باہر سرد ہوا چیختی ہوئی چلتی رہتی۔ باہر احاطہ میں پھیلی ہوئی چپ چاپ خاموش لیٹی ہوئی چاندنی کو ایک نظر دیکھنے سے یوں معلوم ہوتا گویا اس حسن کو قابو میں کرنا کسی انسان کے بس میں نہیں۔ چاندنی کے اس حسن کو دیکھ کر ذہن جو کچھ محسوس کرتا اسے بیان کرنا اس قدر مشکل ہے کہ میں پہروں یہ سوچتا رہتا کہ ان محسوسات کو نوکِ قلم پر لانے کے لیے ابھی انسان کو صدیوں کی مدت درکار ہے۔ اس گہری پراسرار خاموش اور گھمبیر چاندنی میں میں رات بھر جنگلہ کے ساتھ لگا بیٹھا رہتا اور راتوں کی خاموش گفتگو سنتا رہتا۔ دم بدم بڑھتی پھیلتی ہوئی مستانی ہوا کتنے ہی بے نام پیغام دے جاتی اور میری روح کتنے ہی اندیشوں اور دکھوں سے لرزتی رہتی۔

پھر اندھیری راتیں آجاتیں۔ دروازہ کی سلاخوں میں سے باہر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا گویا سیاہی کیا ایک چادر لیٹی ہوئی ہے اور موت اپنے پر پھیلائے پوری دنیا پر مسلط ہے لیکن اس سیاہی میں سیاروں کی شعیں زیادہ روشن ہو جاتی تھیں اور میں دیر تک کھڑکی کی سلاخوں میں سے دیواروں کے اوپر آسمان کی پتلی لکینز میں ان ستاروں کو دیکھتا اور اپنی زندگی کے بارے میں غور کرتا رہتا۔

نئے ساتھی

انسانوں کی طرف سے مایوس ہو کر اور یہ سوچ کر کہ ابھی نہ معلوم اور کتنا عرصہ مجھے یہ آسمانی ٹوپی سر پہ پہنے اسی گہرے کنوئیں میں رہنا ہے، میں نے اپنی کوٹھڑی میں ادھر ادھر نظر دوڑا کر کچھ نئے ساتھی ڈھونڈھ نکالے اور انہی سے مل کر وقت گزارنے لگا۔ معمولی سا جائزہ لینے کے بعد مجھے یہ معلوم ہو گیا کہ اس کوٹھڑی میں میرے علاوہ ایک اور جاندار بھی ہے۔ یہ جاندار ایک بیاتھا جس نے بجلی کی اس تار کے آخری سرے پر اس ہوڈر کے نیچے اپنا آشیانہ بنا رکھا تھا۔ جس میں

بجلی کا کنکشن اور بلب موجود نہیں تھا۔ یہ بیا سیاہ رنگ کا چھوٹا سا پرندہ تھا اور اس کی کھال اور اس کے سیاہ پر بے حد چمکدار تھے مگر خود یہ اس قدر دل برداشتہ اور گوشہ نشین واقع ہوا تھا کہ کئی کئی دن اس کی صورت نظر نہ آتی۔ اس کا گھونسلہ بھی بڑی خستہ حالت میں تھا۔ مگر وہ اسے ہانے اور ٹھیک کرنے کی طرف بھی کوئی توجہ نہیں دے رہا تھا۔ اسے دیکھنے کے بعد معلوم ہوتا تھا کہ اسے کوئی تازہ غم پہنچا ہے جس کی وجہ سے وہ بے ثباتی دنیا کا شاکی نظر آتا ہے۔ باوجود سخت جاڑے کے اس نے نہ تو اپنا گھونسلہ ٹھیک کیا اور نہ ہی اپنا گھریسا نے کی طرف کوئی توجہ دی تھی۔ بس وہ اپنی موجودہ حالت میں مست اور مطمئن نظر آتا تھا۔ سر شام وہ کوٹھڑی میں داخل ہو کر گھونسلہ کے پاس بیٹھ جاتا اور نوحہ و نالہ و فریاد کناں نظر آتا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اپنے اس ٹوٹے پھوٹے ویرانے میں داخل ہو جاتا۔

میں نے اس سے دوستی کرنے کی کوشش سب سے پہلے کی کیونکہ اس کے اور میرے حالات میں کافی مماثلت پائی جاتی تھی، مگر اس نے میری طرف کوئی توجہ نہیں دی، ایسا معلوم ہوتا تھا گویا وہ ان معاملات سے بالاتر ہو چکا ہے۔

اس طرف سے مایوس ہو کر میں ان کبوتروں کی طرف متوجہ ہوا جو اکثر میری کوٹھڑی میں آ کر بیٹھ جایا کرتے تھے۔ صبح کے وقت ناشتہ کے لیے مجھے جو چنے ملتے تھے وہ میں نے ان کو ڈالنا شروع کر دیئے شروع شروع میں تو انہوں نے بھی پرواہ نہیں کی بلکہ پہلے روز جب میں نے ان کی بے بیازی سے تنگ آ کر ہاتھ کے اشارے سے انہیں نیچے اترنے کے لیے کہا تو ایک بزرگ کبوتر نے آنکھیں کھول کر پھر اسی طرح بند کر لی گویا کہہ رہا ہو ”بڑے مطلبی ہو یا را!“ مگر خیر دو ایک روز کے بعد یہ کبوتر میرے قریب آگئے اور دو چار دن اور گزرنے کے بعد تو میں انہیں پکڑ بھی لیتا تھا۔ انہیں گود میں بٹھاتا، چومتا اور پھر چھوڑ دیتا۔ ان کے ساتھ میرا وقت اچھی طرح گزرنے لگا۔ یہ بھی آنکھیں کھول کر مجھے اس طرح دیکھتے گویا پوچھ رہے ہوں۔ ”تم کون ہو؟ یہاں کیسے آگئے ہو؟“

مہینوں یہ کبوتر میرے دوستوں کی حیثیت سے میرے آس پاس رہے، ان کے نیلے پر اور ان کی سرخ چونچلیں اور ان کے گرم جسم اور سانس سے میں نے ہمیشہ اپنے لیے مسرت کا سامان پیدا کیا۔ ایک روز اچانک ایک جمعہ اس وقت میری کوٹھڑی میں داخل ہوا جب میں ایک کبوتر کو ہاتھ میں لیے پچکار رہا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا ”اوہو؟ اب اتنی دوستی ہو گئی ہے۔ ذرا ادھر تو لائیے۔“

میں نے کبوتر اسے دے دیا۔ تھوڑی دیر پچکارتے رہنے کے بعد وہ اسے ہاتھ میں لے کر احاطہ سے باہر نکل گیا میں نے اسے بہت پکارا مگر اس نے تیزی سے دروازہ بند کر دیا اور باہر سے قفل چڑھا دیا۔

دروازہ کے پاس آ کر جب میں نے سلاخوں میں سے باہر دیکھا تو مجھے وہ جمعہ ایک بلیڈ سے اس کبوتر ذبح

کرتا ہوا نظر آیا۔ اپنے اس عزیز اور پیارے دوست کی یہ ہلاکت مجھ سے دیکھی نہیں گئی۔ میں نے کوئی شور بھی نہیں کیا۔ بس چپ چاپ اندر آ کر بیٹھ گیا لیکن میری وہ رات بڑی بے چینی کے عالم میں گزری اور اپنے اس دوست کو یاد کر کے میں بہت دیر تک روتا رہا۔ ایک چھوٹی سی خوشی تھی اسے بھی ظالموں نے ختم کر دیا۔ وہ کیسا پیارا اور بھولا پرندہ تھا۔ اس نے مجھ پر بھروسہ کیا تھا، وہ میرا دوست اور رفیق تھا لیکن یہ جلا داسے بھی مار کر ہضم کر گئے۔

اس حادثہ کے باوجود جب تک میں دوم تہائی کے اس احاطہ میں رہا، کبوتروں سے میری دوستی باقی رہی۔ دو چار روز کے بعد ایک شام میرے احاطہ کا دروازہ کھلا تو میں نے دیکھا کہ ایک جمعدار غلام محمد (پھانسی والے) کو لیے میرے احاطہ کے باہر کھڑا ہے۔ غلام محمد کی آواز اور اس کی سزا کے متعلق مجھے چھ ماہ سے معلوم تھا مگر اس کی شکل میں نے اس روز دیکھی۔ وہ ڈیرہ غازی خان کا رہنے والا تھا اور اس کی عمر کوئی چالیس سال کے قریب تھی۔ چودہ ماہ پھانسی کوٹھڑی میں دن رات بند رہنے کی وجہ سے اس کا رنگ زرد اور جسم بالکل بے جان معلوم ہو رہا تھا۔ جب وہ میری کوٹھڑی کے ساتھ والی کوٹھڑی میں بند کیا جاتا تو ہمیشہ مجھے بلایا کرتا تھا۔ میری اور اس کی گفتگو بہت دفعہ ہوئی تھی۔ لیکن اس کی شکل اور اس کا مردہ جسم دیکھ کر میں گھبرا گیا۔ آج جب وردی بدلتے وقت اس کو ایک کوٹھڑی سے نکال کر دوسری کوٹھڑی میں بدلا جانے لگا تو اس نے جمعدار سے بہت منت سماجت کر کے مجھ سے ایک منٹ کے لیے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ یہ خواہش اس نے محض اس وجہ سے کی تھی کہ اسے کسی نے میرے متعلق یہ کہہ دیا تھا کہ میں سید ہوں۔ چنانچہ جب میں دروازہ کے پاس پہنچا تو اس نے میرے روکنے کے باوجود میرے گھٹنوں کو ہاتھ لگایا، میرا ہاتھ چوما اور بولا ”شاہ جی! میرے لیے دعا کرو میری رحم کی اپیل گئی ہوئی ہے۔ بس پھانسی نہ ملے، سزا چاہے چودہ سال کی ہو جائے وہ میں کاٹ لوں گا۔“

میری زبان پھر بند ہو گئی۔ حقیقت حال کا اظہار کرنے سے میری زبان نے پھر انکار کر دیا۔ میں اسے کیسے کہہ سکتا تھا کہ دعا میں کچھ نہیں رکھا۔ میں اس مردہ جسم سے جو چودہ ماہ سے مرگِ مسلسل میں مبتلا تھا اس کی آخری امید کا سہارا کیسے چھین سکتا تھا۔ امید کیوہ ننھی سی شمع جو اس کے نہاں خانہ دل میں لرز رہی تھی اسے بجھانا مناسب نہ سمجھ کر میں نے اس سے دعا کرنے کا وعدہ کیا اور اس کے جانے کے بعد واقعی میں نے اپنے دل کی گہرائیوں سے اس کے لیے دعا مانگی اور اس کی نجات اور رہائی کے لیے رات بھر دعا کرتا رہا۔

اٹھائیس دسمبر کی شام کو آٹھ مہینے جیل میں رہنے اور چھ مہینے کی قید تہائی کاٹنے کے بعد مجھے یکا یک ایک کاپی اور قلم دوات رکھنے کی اجازت دی کہ ہمیں قلم، دوات اور ایک کاپی جس پر خوع سپرنٹنڈنٹ صاحب صفحہ نمبر وغیرہ لگائیں

دیدی جائے۔ پھر اس پر یہ نگرانی بھی رکھی جائے کہ اس میں سے کوئی صفحہ پھاڑ کر ہم باہر نہ بھیج دیں۔ انتیس کی شام کو مجھے کاپی مل گئی تھی اور تیس کی شام کو قلم بھی مل گیا۔

اپنا قلم اتنی مدت کی جدائی کے بعد اپنے ہاتھ میں لے کر میں شراہیوں کی طرح مست ہو گیا۔ یہ قلم کتنی بڑی نعمت ہے۔ مجھے اس سے علیحدہ کر کے یار لوگوں نے بالکل مار دیا تھا۔ اس روز اس قلم اور سفید کاغذ کو اپنے سامنے دیکھ کر میں جھوم اٹھا۔ میں نے پاگلوں کی طرح کئی بار اس قلم کو چوما اور اپنے دل میں عہد کیا کہ اب کبھی تنہائی کی شکایت نہیں کروں گا اور اس ویران تنہائی میں اپنے اس قلم کی مدد سے خیالوں کے محل تعمیر کروں گا۔ اپنے تصور سے کرداروں کی ایک فوج بناؤں گا اور پھر لہلہاتی ہوئی فصلوں کو دیکھ کر جی خوش کروں گا۔ انہیں آپس میں محبت اور نفرت کر نیکا سبق دوں گا۔ ان میں سے بعض کو انسانی بلندیوں کے عروج پر لے جاؤں گا اور بعض کو موت کے گھاٹ اتار کر ان کے کفن دفن کا انتظام کروں گا اور پھر خیال ہی خیال میں ان کی تربت پر بیٹھ کر عقیدت کے دو آنسو بھی بہا دوں گا۔

اس روز قلم اور کاغذ ہاتھ میں لے کر بیٹھتے ہی مجھے اپنے سامنے بے شمار کردار قطار در قطار ہاتھ باندھے کھڑے نظر آئے۔ میں نے شطرنج کے کھلاڑی کی طرح ان کے رخ متعین کئے، ان کی حدود مقرر کر کے میں انہیں آگے بڑھانے کی فکر ہی میں تھا کہ رات کا سناٹا ٹوٹ گیا۔

الارم

اس وقت رات کے کوئی نو بجے ہوں گے۔ قلم میرے ہاتھ میں تھا اور کاغذوں کی کاپی سامنے تھی۔ یکا یک میرے احاطے کے باہر پھانسی والوں کی کوٹھڑیوں کے سامنے سے ایک سیٹی کی آواز آئی۔ پھر دوسری سیٹی بجی، پھر ایک دم سے بہت سی سیٹیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ اس کے بعد برج کا گھنٹہ مسلسل بجنے لگا۔ اس ہنگامے کو جیل کی اصطلاح میں الارم ہونا کہتے ہیں۔ الارم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جیل کے نظام میں کچھ گڑ بڑ ہے، کوئی قیدی بھاگتا ہوا پایا گیا یا کسی قیدی نے کسی آفیسر پر حملہ کر دیا کسی نے خودکشی کی کوشش کی۔ الارم ہونے کے بعد یہ ضروری ہوتا ہے کہ تمام نمبردار اور سپاہی خواہ وہ جیل کے اندر ڈیوٹی پر ہوں یا جیل سے باہر کوارٹروں میں، خطرہ کی جگہ پر پہنچ جائیں۔ جیل کے تمام آفیسر بمعہ ڈاکٹر صاحب کے خطرہ کے موقع پر پہنچتے ہیں۔ الارم ہونے کے بعد جمعہ داروں اور ملازم سپاہیوں کو اجازت ہوتی ہے کہ وہ جسے بھی سامنے پائیں لاشیوں سے پیٹنا شروع کر دیں۔ جیل کے قانون کے مطابق الارم ہونے کے بعد اگر ملازم کسی قیدی کو مارتے مارتے ہلاک بھی کر دیں تو اس کا کوئی ہرج نہیں ہوتا۔

اس وقت الارم میرے احاطے کے باہر سے شروع ہوا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ خطرہ کہیں آس پاس ہے مگر

اس کی نوعیت کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ نہ صرف میری کوٹھڑی مقفل تھی بلکہ باہر کا احاطہ بھی بند اور مقفل تھا۔ چند منٹ کے اندر تمام ملازم لائشیاں لے کر آ موجود ہوئے، نمبرداروں اور اسسٹنٹوں کی آوازیں بھی آنے لگیں۔ تھوڑی دیر کے بعد ”اٹن شن“ کی آواز آئی جس کا مطلب تھا کہ سپرنٹنڈنٹ صاحب بھی موقع واردات پر پہنچ گئے ہیں۔

میں دیوار کے ساتھ کان لگا کر کھڑا تھا۔ باہر کی بات چیت سننے کے بعد معلوم ہوا کہ حیات محمد پھانسی والے نے خودکشی کی کوشش کی تھی۔ مگر حیرت یہ تھی کہ اتنی سخت نگرانی اور پہرہ کے باوجود وہ ایسی کوشش کر سکتا تھا۔ آدھ گھنٹے کے بعد ایک نمبردار گشت کرنے کے لیے آیا تو اس کی زبانی معلوم ہوا کہ حیات محمد نے کبل اوڑھ کر اپنا کرتہ اور پاجامہ اتارا اور ان کو پھاڑ کر ایک رسی بنائی پھر اس پھدے کو گلے میں ڈال کر وہ جنگلہ کے ساتھ لٹکنے کے لیے باندھ ہی رہا تھا کہ پہرے والے سپاہی کی نظر پڑ گئی اور اس نے الارم کے لیے وسل دے دیا۔ نمبردار ساتھ ڈاکٹر کو گالیاں بھی دے رہا تھا۔ اس نے کہا ”شاہ جی! دیکھو تو سہی، حیات محمد تو زندگی کے دکھ سے تنگ آ کر مرنے کی کوشش کر رہا تھا یہ ڈاکٹر کبخت کہتا تھا کہ حیات محمد مرنے کا بہانہ کر کے دودھ لگوانا چاہتا ہے۔ بھلا اس میں دودھ لگوانے کی کیا بات۔“

اس گڑبڑ میں اس روز لکھنے کے پروگرام پر عمل نہ کر سکا۔ میری طبیعت سخت مکرر ہو گئی تھی اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ قانون حیات محمد کو وقت اور دن مقرر کر کے باقاعدہ طور پر بارنا چاہتا ہے۔ اس غریب کو یہ اجازت بھی نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ مر کر اس مرگِ مسلسل سے نجات حاصل کر لے۔

میں اس رات، رات بھر حیات محمد کے متعلق سوچتا رہا۔ ابھی کل ہی تو وہ کہہ رہا تھا کہ وہ مرنا نہیں چاہتا۔ اسے اپنی بیوی اور بچوں کا خیال ہے اسے زندہ رہنے اور اپنے بچوں سے آزادی کے ساتھ ملنے کی خواہش ہے۔ ابھی ایک ہی روز پہلے اس نے مجھ سے دعا کرنے کے لیے کہا تھا۔ پھر یہ یکا یک اسے کیا ہوا کہ اس نے پھانسی کا پھندا خود ہی اپنی گردن میں ڈالنے کی کوشش کی۔ کیا امید کی وہ آخری شمع بھی بجھ گئی جو اسے ڈیڑھ سال سے اس سنگین کوٹھڑی میں زندہ رکھ رہی تھی۔ ملازموں نے حیات محمد کو پھر کوٹھڑی میں بند کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب اگرچہ کہہ رہے تھے کہ وہ حرامزادہ دودھ لگوانا چاہتا ہے لیکن وہ دوسرے آفیسروں کے ساتھ بغیر اس کا دودھ لگائے ہی چلے گئے۔

جیل میں پھر خاموشی چھا گئی۔ رات پھر گہری اور پراسرار ہو گئی۔ اس رات کسی نے بھی ماہیا گانے کی کوشش نہیں کی۔ پہرہ والے تینوں سپاہی کچھ دیر تو خاموش رہے پھر اسی طرح باتوں میں مشغول ہو گئے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

”آج کی کوئی خبر سناؤ بھئی“ ایک سپاہی نے دوسرے سے کہا۔

دوسرا جو شاید ادھر ادھر سے روزانہ اخبار پڑھ کر آیا کرتا تھا بولا ”کوئی خاص خبر تو نہیں، آج اخبار میں لکھا تھا کہ بحرالکابل بھی جنگ میں شامل ہو جائے گا۔“

”اچھا!“ پہلے سپاہی نے کہا، ”بحرالکابل ہندو ہے یا مسلمان؟“

”نام سے تو مسلمان معلوم ہوتا ہے“ دوسرے سپاہی نے کہا اور پہلا اس پر مطمئن ہو گیا۔

جنوری کے شروع میں کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا۔ دن اسی طرح گزر رہے تھے۔ صرف پپیل اور شیشم کے پتے تیزی سے گرنے لگے۔ میرا احاطہ روزانہ ان پتوں سے بھر جاتا۔ ہر طرف خزاں کا دور دورہ تھا، چاروں طرف عجیب حسرت آمیز مایوسی برستی تھی، درخت ویران ویران سے نظر آتے اور احاطہ کے در دیور پر عجیب درد انگیز بے کسی چھائی رہتی۔ میرے دل میں ایسی اجاڑ اور ایسی بے نام ویران لہریں ابھرا کرتیں کہ انہیں بیان کرنا مشکل ہے۔ ان دنوں ساری فضا روتی ہوئی معلوم ہوتی۔ راتوں کو ہوا اتنے زور سے چلتی اور پتے ہوا کے زور سے اس طرح سائیں سائیں کرتے کہ میرا دل ڈوب جاتا۔ ایسی بے رحم تنہائی، اتنی بے نام کسک اور اس قدر مایوسی تھی کہ میں رات رات بھر جاگتا رہتا اور ہوا کے رونے پینے اور چلانے کی آوازیں سنتا رہتا اور یہ سوچتا کہ جس انسان نے اس کائنات میں سب سے پہلے کسی نغمہ کو جنم دیا ہے اس نے یقیناً درختوں کے پتوں اور ہوا کے رونے سے خیال لیا ہوگا۔ دنیا میں سب سے پہلا نغمہ انسان نے انہی آوازوں کو سننے کے بعد ایجاد کیا ہوگا اور پھر جن حالات میں مجھے رکھا گیا تھا وہ بھی دنیا کے ابتدائی انسانوں کے رہن سہن سے مختلف نہ تھے۔

اس احاطہ میں کبھی کبھی آدھی رات کے وقت باہر کی دنیا کی آوازیں بھی پہنچ جاتی تھیں۔ احاطہ کے شمال مغرب کی طرف سے جیل کی آخری دیوار کہیں قریب ہی تھی۔ اس سے پرے غالباً کوئی راستہ تھا۔ رات کو اس راستے پر چھکڑے اورتانگے گزرنے کی آواز آتی تو میری روح تڑپ کر رہ جاتی۔ کبھی کبھی اسی طرف سے کوئی نغمہ، کوئی گیت بھی بہتا ہوا میری طرف آنکلتا۔

جس روز مجھے کلاس ملی، اس سے اگلی شام کو غلام محمد پھانسی والے کی آخری ملاقات آگئی۔ غلام محمد کو ملنے والوں میں اس کی بہن بھی تھی۔ میں نے اسے اپنے دروازے کے سوراخوں میں سے دیکھا۔ وہ بالکل حواس باختہ اور بوکھلائی ہوئی نظر آتی تھی۔ اس کے سر کے بال کھلے تھے اور اس کی کھلی آنکھیں حیران اور غم سے بھری ہوئی تھیں۔ یکا یک اس نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر مارے اور چلا کر بولی ”میرا ویرا! میں تجھے اس کے بعد کہاں ڈھونڈوں گی؟“

غلام محمد چپ چاپ بیٹھا تھا۔ دروازے کے سوراخوں میں سے مجھے اس کے چہرے کا صرف ایک ہی حصہ نظر

آ رہا تھا۔ اس کی بہن چلانے کے بعد گر پڑی اور بے ہوش ہو گئی۔ پھر اس کی بیوی اور دوسرے رشتہ دار آ گئے۔ سب مل کر رخصت ہو گئے مگر وہ بت بنا خاموش بیٹھا تھا۔ وہ مرنے سے پہلے ہی مر چکا تھا۔

اس رات جیل کا پورا ماحول سازشی سا نظر آتا تھا۔ پہرے والے بہت چست تھے۔ آفیسر لوگ رات کو بار بار چکر لگاتے رہے۔ رات بھر موت درود یوار پر چلتی ہوئی معلوم ہوتی رہی۔ رات بھر میں زندگی اور موت کے فلسفہ پر غور کرتا رہا۔ ساری رات مجھے یوں معلوم ہوتا رہا گویا میں خود پھانسی کے تختہ پر لٹک رہا ہوں۔ یہ تصور کہ صبح سویرے ایک جیتا جاگتا انسان مار دیا جائے گا، میرے اعصاب پر سوار تھا۔ موت بھی اپنے پاس کہیں بالکل قریب محسوس ہو رہی تھی۔ موت کے استقبال کی تیاریاں کس قدر زور و شور سے ہو رہی تھیں۔

صبح چار بجے پانی کی بالٹی غلام محمد کو دے دی گئی۔ اس نے خاموشی سے غسل کیا اور پھر وہ اسے اس کی کوٹھڑی سے نکال کر پھانسی گھر کی طرف اس کے آخری سفر پر لے کر روانہ ہو گئے۔ غلام محمد نے مجھے آواز دے کر کہا ”شاہ جی! میری بخشش کی دعا کرنا۔“

ابھی پندرہ روز پہلے وہ اپنی رہائی کی دعا کرنے کے لیے کہہ رہا ہے۔ میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور خاموش رہا۔ مجھ میں بات تک کرنے کی سکت باقی نہیں رہی تھی۔

ساڑھے چار بجے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور چھ بجے اس کی لاش اس کے ورثا کے حوالے کر دی گئی۔

پھر تین ہی روز بعد ایک اداس شام کو حیات محمد کے گھر والے اس سے ملنے کے لیے آ گئے۔ پھانسی والوں کو آخری ملاقات سے پہلے تک یہ نہیں بتایا جاتا کہ ان کو مارنے کی تاریخ مقرر ہو گئی ہے۔ انہیں اسی وقت معلوم ہوتا ہے جب ان کے وارث، عزیز، رشتہ دار روتے ہوئے ان کے پاس آ جاتے ہیں۔ اس منحوس ہفتہ میں یہ دوسرا واقعہ تھا۔ اس رات بھی میں سو نہیں سکا اور رات بھر تڑپتا رہا یہ سب اکیلے موت کے غاروں میں دھکیلے جا رہے تھے مگر مجھے ہر ایک کے ساتھ موت کے گھاٹ اترنا پڑتا تھا۔ اس سے پہلے بھی اور اب بھی میں ہمیشہ یہی محسوس کرتا تھا گویا ان کی بجائے میں پھانسی کے تختہ پر لٹک رہا ہوں۔

حیات محمد کی ملاقات ختم ہو گئی، گنتی بند ہو گئی۔ اس رات کسی نے نہ تو کوئی تان لگائی اور نہ ہی کوئی کسی سے کوئی بات چیت کر رہا تھا۔ بس ہر طرف خاموشی اور ویرانی تھی اور موت کے استقبال کی تیاریاں تھیں۔ سپاہی پہرے پر پہلے سے زیادہ چستی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ حیات محمد نے اس رات اپنا وہ گانا بھی نہیں گایا۔

اساں تیتھوں کی لیناں
فکر نہ کریں چن وے
سدا کوٹھیاں نہیں رہنا

وہ دس بجے رات تک خاموشی سے لیٹا رہا۔ دس بجے کے قریب اس نے پہرے والے سپاہی کو مخاطب کر کے اس سے قرآن شریف فراہم کرنے کے لیے کہا۔ دو منٹ میں نمبر دار نے اسے قرآن شریف دے دیا۔ حیات محمد نے قرآن پڑھنا شروع کیا۔ پہلے تو اس کی آواز کافی بلند تھی مگر آہستہ آہستہ مجھے یوں معلوم ہوا گویا اس آواز میں سے اس کی بطوبت اور تری نکل گئی ہے اب یہ آواز بالکل خشک اور خالص آواز تھی اس میں کسی جذبے، کسی خیال اور کسی احساس کا پتہ نہ چلتا تھا حیات محمد قرآن شریف ایسے پڑھ رہا تھا کہ جیسے وہ اپنے خیالوں سے بچنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اپنے اندیشوں اور اپنی مصیبتوں کے خیال سے بچنے کے لئے وہ قرآن پڑھتا رہا کوئی نصف گھنٹے کے بعد اس نے قرآن شریف بند کر دیا اور خاموشی سے پختہ فرش پر لیٹ گیا میں اس دوران اپنی کوٹھڑی میں ٹہلتا رہا مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا گویا میں جہنم جہنم سے یہیں ٹہل رہا ہوں، اسی درد اور اسی کرب میں مبتلا ہوں۔ یہ رات کیسے گزرے گی۔ موت کی وادیوں میں جانے والے مسافروں کے درمیان میں تنہا کہاں کس لیے پڑا ہوں، میری منزل کہاں ہے؟ اور ان کی منزل کونسی ہے؟ یہ سب سوچتا اور اپنے بارے میں سوچتا اور اپنے دکھ میں لپٹا ہوا میں ٹہلتے ہوئے یوں محسوس کر رہا تھا گویا میرے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈالا جا چکا ہے اور مجھے آج کی رات ہی حیات محمد کے ساتھ اس دنیا سے کوچ کر جانا ہے۔

بارہ بجے اس نے مجھے آواز دی ”شاہ جی! سو گئے ہو؟“

میں اس سے ڈر رہا تھا اور اس کے ساتھ باتیں کرنا نہیں چاہتا تھا مگر اس نے جس محبت سے مجھے بلایا تھا اس کی وجہ سے میں نے مختصر سا جواب دے دیا ”نہیں حیات محمد! جاگ رہا ہوں۔“

”شاہ جی! میرے لیے دعا کرنا، خدا مجھے بخش دے، میں گنہگار ہوں، میں نے اپنی عورت کے لیے قتل کیا تھا۔ مگر اب میری عورت کیا کرے گی، میرے بچے کیا کریں گے؟ میری ساری زمین، ہمارا پورا گھر بک گیا ہے اور میرے مقدمہ پر ہمارا سب کچھ لگ چکا ہے، اب ان کا میرے بعد کیا ہوگا؟“

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ میں جواب دے بھی کیا سکتا تھا۔ میرے ساتھ والی کوٹھڑی میں رنج بھی وہ بند ہوتا ہمیشہ اپنے گھر والوں کی باتیں کرتا تھا، امید ظاہر کرتا تھا کہ وہ بچ جائے گا۔ میں ہمیشہ اسے تسلی دیا کرتا تھا کہ تم رہا ہو جاؤ گے۔ آج سارے راستے ختم ہو گئے تھے، ساری امیدیں مٹ گئی تھیں۔ اب میں اس سے کیا کہوں۔ اب

میں کیسے اسے تسلی دوں۔ جس سفر پر وہ روانہ ہو رہا ہے اس کے بارے میں کچھ کہنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔

حیات محمد کافی دیر تک خاموش رہا۔ پھر اس نے آہستہ آہستہ لا الہ کا ورد شروع کر دیا۔ اس کی آواز ڈوبی ہوئی اور کسی گہرے کنوئیں سے آتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ یہ گہرہ و کنواں خود اس کی زندگی اور اس کی اپنی مصیبتوں کا تھا جس میں سے نکلنے کے لیے آج اس کی روح مضطرب تھی۔

دو بجے کے بعد اس نے مجھے پھر بلایا ”شاہ جی! میرا کہا سنا معاف کرنا، میرا تو اب وقت قریب آ رہا ہے۔“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میرا دل بھرا آیا تھا۔ خاموشی سے میں نے اپنا منہ تکیہ میں چھپا لیا۔ یہ ایسا نازک اور اس قدر دردناک وقت تھا کہ مجھے اپنے جسم میں چھریاں چبھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا ساری فضا مجھے ڈس رہی ہے۔ رات کے ایک ایک لمحہ کو میں نے اپنے اوپر وار کرتے ہوئے پایا۔

تین بجے کے بعد حیات محمد کی آواز میں ایک سکون سا آ گیا۔ وہ اب محض زبان کی حرکت سے کلمہ پڑھ رہا تھا ورنہ اس کی آواز میں دور دور تک زندگی کا نشان نہ ملتا تھا۔ کلمہ پڑھنے کے ساتھ ساتھ اس نے دیوار پر ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا۔ اس کا ہاتھ دیوار پر سرسرا تا رہا۔ گویا وہ اپنی زندگی کی ساری روشنی اور حرارت اور اپنی تمام امنگیں اور خواہشیں اس دیوار میں سمیٹنا چاہتا ہو۔ مجھے دیوار پر اس کے ہاتھ پھیرنے کی آواز سن کر ایسا معلوم ہوا گویا اس کے ہاتھ باتیں کر رہے ہیں، کوئی پیغام دے رہے ہیں اور دیوار بول رہی ہے۔

پونے چار بجے کے قریب اسے پروگرام کے مطابق پانی کی باٹھی دے دی گئی۔ اس نے غسل کیا اور چار بجے اسے کوٹھڑی سے نکال دیا گیا۔ پھر پھانسی کی کوٹھڑیوں سے اس کو پھانسی گھر کی طرف لے جایا جا۔ نے لگا تو اس نے سب کے درمیان کھڑے ہو کر بلند آواز سے کہا ”بھائیو! کہا سنا معاف کرنا، السلام علیکم، یہ کہہ کر وہ علی علی کے نعرے لگاتا ہوا اپنے سفر کی آخری منزل کے لیے چل پڑا۔

پھانسی گھر کے راستے پر میری مضطرب روح بھی اس کے ساتھ ساتھ تھی۔ میں نے حیات محمد کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ میں اس کا جسم، اس کی آنکھیں، اس کا ناک نقشہ کچھ بھی تو نہیں دیکھا تھا۔ ایک دیوار کے فاصلے پر ایک سات آٹھ مہینہ ساتھ ساتھ رہنے کے باوجود میں نے اسے نہیں دیکھا تھا لیکن ہماری آوازوں کی ملاقات روزانہ ہوتی تھی، آج بھی ختم ہو گئی۔ حیات محمد کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ انسانوں نے ایک قتل کے جرم میں ایک اور قتل کر دیا تھا۔ کتنا انوکھا اور کتنا ظالمانہ طریقہ ہے کاش ہم یہ سوچ سکیں کہ حیات محمد نے قتل کیوں کیا؟ اس کے اسباب کیا تھے؟ اس کی جہالت، اس کی صدیوں کی معاشی غلامی، اس کے وحشیانہ جذبات جنہیں تہذیب کی بھٹی میں جلا کر قابو میں رکھنا نہیں سکھایا

گیا تھا، سبھی اس قتل کے ذمہ دار تھے جو حیات محمد نے کیا تھا۔ یہ قتل سماج کی ذمہ داری ہے وہ سماج جس نے حیات محمد کو جنم دیا اور قتل کرنے تک کی عمر اور عقل تک پہنچایا وہ اس کا ذمہ دار ہے پھر اس قتل کے بعد اس قتل کے لیے ایک اور آدمی کیوں مار دیا گیا؟

میرے یہ دن بہت برے گزرے، یہ دن تھے بھی بہت برے، دن بھر سردتھکا دینے والی ہوائیں چلتیں اور شیشم کے پتے گرتے رہتے، دن بھر اور رات بھر افسردہ، اداس نغمے فضا میں گونجتے رہتے۔ راتوں کی خاموشی میں حیات محمد کے وہ گیت یاد کیا کرتا تھا۔ وہ تو کہتا تھا ”سدا کوٹھیاں نہیں رہناں“ اب کیوں نہیں گاتے ہو حیات محمد، تم کہاں ہو؟

میں ان دنوں حساب لگاتا رہتا کہ مجھے زندگی کی مسرتوں سے علیحدہ ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے۔ اس وقت تک تقریباً دس ماہ ہو چکے تھے۔ یہ دس مہینے میری زندگی میں ایک صاف سلیٹ کی طرح تھے ان میں نہ تو میں نے کسی سے محبت کی اور نہ کسی سے نفرت۔ اس عرصے کا میرے زندگی کی مسرتوں اور خوشیوں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا یہ مدت میری زندگی میں شامل ہی نہیں ہے۔ کیونکہ اس عرصے میں نہ کوئی آنچل میرے قریب لہرایا اور نہ ہی میں نے کسی جسم کی آنچ محسوس کی۔ نہ ہی میں نے حرارت اور حسن کا کوئی شعلہ بھڑکتا ہوا دیکھا۔ کوئی لطیف آواز، کوئی نغمہ، کوئی بھی حرارت نہ تھی۔ یہ سارا عرصہ نہ تو میرے لیے پھول کھلے اور نہ ہی بہار کے کسی نغمے نے کہیں جادو جگایا۔ کوئی شیریں آواز، کوئی صدا، کوئی سحر نہ تھا جو اس لق و دق صحرا میں میرا ساتھ دیتا اس عرصہ میں بہت سے قیدی رہا ہوں کچھ ایسے بھی تھے جو قید حیات ہی سے رہا ہو گئے مگر میں ابھی تک بند تھا۔ زندگی سے محروم تھا، روشنی سے محروم تھا آخر کیوں؟

یہ وہ زمانہ تھا جب کوئٹہ پھوٹنے لگتی ہیں اور بہار فتنے جگاتی ہے، جب دیوانے اپنے گریبان چاک کرتے ہیں اور جب سرسوں پھول جاتی ہے اور سرسوں کے کھیتوں میں شفق تک زردی ہی زردی ہوتی ہے۔ بسنت کی زردی جو بہار کا رنگ ہوتی ہے اور جو شاموں کی شفق کی سرخیوں سے مل کر مسرتوں کے گیت گاتی ہے مگر میں نے زمین اور آسمان کے ملنے کی جگہ اور شفق کی سرخی کو ایک مدت سے نہیں دیکھا تھا۔

موت کی وادیوں میں

حیات محمد کی موت کے کوئی ہفتہ بھر بعد ایک شام جیل میں پھر وہی سازشی ماحول نظر آنے لگا جو موت کی وادیوں کا ماحول ہے۔ اس شام جیل کے آفسروں تک کے چہرے گہری فکر و تشویش میں مبتلا نظر آتے تھے۔

جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ کل صبح مرید خان، اس کے بھائی لال خان اور نصیر خان اور غلام عیسیٰ چاروں کو پھانسی

دی جانے والی ہے تو میرا ذہن پاگل پن کی حدوں کو چھونے لگا۔ بہتر کلاس ملنے سے پہلے مجھے یہ کہا جاتا تھا کہ مجھے اور حسن عابدی کو اس لیے ایک ساتھ نہیں رکھا جاتا کیونکہ میں سی کلاس میں ہوں اور وہ بی کلاس میں، اب مجھے مہینہ بھر سے بہتر کلاس ملی ہوئی تھی لیکن میرے زور دینے پر معلوم ہوا کہ حکومت نے ہمیں الگ رکھنے ہی کے لیے حکم دیا ہوا ہے۔ یہ جواب سن کر میں خاموش ہو گیا تھا مگر اس شام میں نے حقیقتاً بڑی منت سماجت سے جیل کے آفسروں سے درخواست کی کہ مجھے حسن عابدی کے پاس رہنے دیا جائے یا جیل کے کسی اور حصے میں تبدیل کر دیا جائے کیونکہ اگر میں یہیں پر رہا تو مر جاؤں گا۔ میری بات پر کسی نے دھیان نہیں دیا اور سب اپنی مجبوری ظاہر کر کے رخصت ہو گئے۔

اس شام جب مرید خان، لال خان، نصیر خان اور عیسیٰ کے عزیزان سے آخری ملاقات کرنے کے لیے آنے لگے تو اس وقت میں اپنے احاطہ میں ٹہل رہا تھا۔ آخری ملاقات کے وقت مرنے والے کے عزیز، رشتہ دار اور دوست سولہ تک کی تعداد میں آسکتے ہیں۔ چونکہ اس روز تین بھائی یعنی مرید خان، لال خان اور نصیر خان کے علاوہ ایک چوتھا غلام عیسیٰ بھی تھا اس لیے ان کی ملاقات کرنے والے ستر کے قریب مرد عورتیں جیل کے اندر تھے۔ انہیں چار چار چھ کر کے مختلف گروہوں میں پھانسی کی کوٹھڑیوں کے درمیان لایا جا رہا تھا۔ جیل کے تمام آفیسر موقع کی نزاکت کی وجہ سے اس جگہ پر موجود تھے اور یہ آخری ملاقات ہو رہی تھی۔

اس دن دو پہر ہی سے آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اوو چنگھاڑتی اور روتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ پتے گر رہے تھے جیل میں پتے ہمیشہ ہی گرتے رہتے ہیں۔ پورا ایک سال جیل میں رہ کر میں اپنے تجربے کی روشنی میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ جیل کے درختوں سے پتے ہر موسم اور ہر رت میں گرتے رہتے ہیں۔

اس شام میں مستقلاً دروازے کے پاس کھڑا دروازے کی درازوں میں سے جھانک جھانک کر مرنے والوں اور ان کے ملاقاتیوں کو دیکھتا رہا۔ مرنے والے اور ان سے ملنے والے سبھی پھٹے حالوں تھے۔ سب گاڑھے کے تہہ اور کرتے پہنے ہوئے تھے۔ سبھی کے چہروں پر موت کے نقش ابھرے ہوئے نظر آتے تھے، ہر آنے والے کے چہرے پر ادا سی اور اضطراب نظر آتا تھا۔

چار چار کی ٹولیوں میں وہ ڈیوڑھی سے آکر پھانسی والوں کی کوٹھڑیوں کے سامنے بیٹھ جاتے۔ پانچ منٹ تک باتیں کرتے، اپنے پلوؤں سے اپنی آنکھیں پونجھتے اور مرنے والوں سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو جاتے۔ شام گئے تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ رات قریب آگئی تھی مگر مرید خان، لال خان، نصیر خان اور غلام عیسیٰ کی کوٹھڑیوں کے سامنے چار چار آدمی بیٹھے تھے اور اپنے ان رفیقوں کو رخصت کر رہے تھے جو انجانی منزلوں اور ان دیکھی راہوں کی طرف روانہ ہونے کے لیے

تیار بیٹھے تھے۔

اس دوران ایک بار ایک عورت کی چیخ سنائی دی۔ میں نے دیوانگی میں دروازوں کو اتنے زور سے کھینچا کہ میرے احاطہ کا یہ بوسیدہ دروازہ اکھڑتے بچا۔ اس طرح میں نے دونوں دروازوں کے درمیان اتنا فاصلہ کر لیا کہ اب میں آسانی سے باہر نظر ڈال سکتا تھا۔ چیخنے والی عورت غلام عیسیٰ کی کونٹھڑی کے سامنے اپنے ننھے سے بچے کو لیے کھڑی تھی۔ اس بچی کو میں اس کا وہ ننھا بچہ تھا جو غلام عیسیٰ کے جیل میں آنے کے بعد پیدا ہوا تھا۔ یہ وہ بچہ تھا جسے غلام عیسیٰ آج تک گلے سے نہیں لگا سکا تھا۔ یہ وہ بچہ تھا جس نے اپنی ایک سالہ زندگی میں کبھی اپنے اس باپ کی گود کی گرمی کو نہیں محسوس کیا جو آج ہمیشہ کے لیے اس دنیا سے جا رہا تھا۔ غلام عیسیٰ کی عورت چیخ رہی تھی اور اس کا بچہ بے خبر تھا اور مسکرا رہا تھا۔ یہ عورت بمشکل بیس بائیس سال کی ہوگی۔ اس نے تہہ باندھا ہوا تھا اور ویل کی سیاہ قبض پہن رکھی تھی۔ اس کے گلے میں تعویذوں کی ایک لڑی اور ایک کنٹھا لٹک رہا تھا۔ یہ کنٹھا جو اس کے سہاگ کی یادگار تھی جسے پہن کر وہ دلہن بنی اپنے دولہا سے ملی ہوگی مگر آج یہ کس کی بارات میں کون سے دولہا کو رخصت کرنے آئی ہے۔ دنیا کی رسم تو یہ ہے کہ دلہنیں رخصت ہوتی ہیں۔ دلہنیں اپنے سفر پر روانہ ہوتی ہیں اور نئی دنیا میں آباد کرتی ہیں لیکن یہ ایسا انوکھا دن تھا کہ اس کی ایک شام میں ایک دلہن اپنے دولہا کو اس سفر پر روانہ کرنے آئی ہے جس سے وہ کبھی واپس نہیں آئے گا، جس کے کبھی واپس آنے کی کوئی امید نہ تھی۔

غلام عیسیٰ کو بھی میں نے آج ہی دیکھا تھا۔ وہ بیس پچیس سال کا تو مندو جوان تھا۔ اس کے جسم میں زردی اور موت کے خوف کی آمیزش کے باوجود چٹانوں کی پختگی نظر آتی تھی۔ اس کا رنگ سفید تھا۔ کبھی زندگی میں، کھلے کھیتوں کے درمیان اس نے الغوزہ بجا کر اور بانسری کی تانیں اڑا کر اس عورت کا دل موہ لیا ہوگا جو آج اس کے سامنے بت بنی کھڑی تھی۔ یہ عورت جو پھول اور بہار اور خوشبو لاتی ہے، آج اپنے یتیم کے لیے آہوں اور سسکیوں کے علاوہ کچھ بھی نہ لائی تھی۔

دفعاً غلام عیسیٰ نے دروازے کی سلاخوں میں سے اپنے دونوں ہاتھ بڑھا کر اپنے بچے کو پکڑ لیا مگر وہ اسے اپنے سینے کے ساتھ نہ لگا سکا کیونکہ اس کے اور اس کے خون کے درمیان لوہے کا منحوس کٹہرہ حائل تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہونٹ کھول کر بچے کو چومنے کی کوشش کی مگر اس کا ہاتھ لوہے کے جنگلہ سے ٹکرا گیا اور اس نے اپنا سر جھکا لیا۔ اس کی عورت جو پاس ہی کھڑی تھی، چیخ مار کر گر پڑی اور بے ہوش ہو گئی۔ گرنے اور بے ہوش ہونے کے بعد اس کے ہونٹ ایک بار پھر تپے اور پھر ایک دوسرے سے مل گئے۔ فروری کی اس سہانی شام یہ حسینہ پتھر کے ننگے اور بے رحم فرش پر اپنے شوہر کے جنگلہ کے بالکل سامنے بے ہوش پڑی تھی اور ہوا سائیں سائیں کرتی ہوئی اور اس کے بالوں کو چھوتی ہوئی گزر رہی تھی۔ اس کی انہیں ہوا میں لہرا رہی تھیں اور وہ بے ہوشی میں لمبے لمبے سانس لے رہی تھی۔ اس کا مجازی خدا جنگلہ کے پیچھے کھڑا اپنی

آنکھوں سے آنسو پونچھ رہا تھا۔ اس کا ایک سالہ بچہ اس کے ان ہاتھوں میں لٹک رہا تھا جو جگہ سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

تھوڑی دیر کے بعد عورت ہوش میں آگئی۔ آنکھیں کھولنے سے پہلے اس نے اپنے ہونٹ داکئے۔ یہ ہونٹ جن پر اب اس کا محبوب کبھی اپنے ہونٹ مثبت نہ کر سکے گا پتلے اور نازک شاداب ہونٹ جن میں زندگی اور حسن اور حرارت تھی، یہ ہونٹ کھلتے اور بند ہوتے رہے۔ پھر اس نے آنکھیں کھولیں۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی اور اپنے سینے پر ایک دو ہتھ مار کر چلائی ”غلام عیسیٰ! اس کے بعد میں تجھے کبھی زندہ نہیں دیکھوں گی۔ اب مجھے تیری لاش ملے گی۔“

جیل کے آفیسروں اور جمعداروں نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی، اسے سمجھانے اور چمکانے، پچکارنے کی کوشش کی مگر وہ ایسی آنکھوں سے ان سب کو اور اس سارے منظر کو دیکھ رہی تھی گویا اس کے کانوں میں کوئی آواز نہیں پہنچ رہی، گویا وہ ان میں سے کسی کو نہیں پہچانتی۔

آہستہ آہستہ وہ اسے کندھے سے پکڑ کر لے گئے۔ غلام عیسیٰ پھر اپنی کوٹھڑی کے پچھلے حصے میں چلا گیا۔ باقی کے سب ملاقاتی بھی چلے گئے۔ رات ہوگئی، گنتی بند ہونے لگی، تالے بجنے لگے، زنجیروں اور کٹھروں کی اس دنیا کو رات کی سیاہی نے اپنے تسلط میں لے لیا۔ چاروں طرف خاموشی چھا گئی۔

اس روز بھی ”سب اچھا“ ہو گیا۔ روزمرہ کے معمول کے مطابق اس رات بھی برج کا نمبردار پکارتا رہا اور نمبر دار ”سب اچھا“ کہتے رہے۔ کئی بار برج کے نمبردار نے دو م تہائی کی پکار لگائی اور کئی بار دو م تہائی کے نمبردار نے ”سب اچھا“ کہہ دیا مگر اس رات سارے قیدی خاموش رہے۔ قصوری قیدی جو چکیوں میں بند تھے خاموش رہے۔ پھانسی والے جو کل صبح موت کی وادیوں میں جانے والے تھے، خاموش رہے وہ پھانسی والے بھی جو ابھی موت اور زندگی کی کشمکش میں مبتلا تھے، خاموش رہے اور ان سب کے نگران پہرہ والے سپاہی بھی خاموش رہے۔ صرف ہوا چلتی رہی اور روتی رہی۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے، کبھی کبھی بادل چھٹتے تو مجھے اپنی سلاخوں میں سے کوئی ننھا ستارہ ٹٹماتا ہوا نظر آ جاتا۔ پھر اندھیرا بڑھ جاتا۔ پھر فضا کی سنگینی اور بھی پراسرار اور بھی گہری اور تکلیف دہ ہو جاتی۔ رات کی تاریکی اور اس کا جادو بڑھ جاتا۔

اپنی کال کوٹھڑی میں لیٹے لیٹے میں دیر تک یہ سوچتا رہا کہ آج جو ہوا چل رہی ہے وہ کل بھی چلے گی اور آج ستاروں کی جو شمعیں جل رہی ہیں وہ کل بھی جلیں گی۔ مگر آج کی ہوا میں یہ دیوانگی، یہ سرگوشی کیسی ہے؟ فطرت اپنے سارے حربے آزما رہی ہے، فطرت اپنے سارے خزانے لٹا رہی ہے اس لیے کل جس صبح کا اچالا ہوگا اور جس ہوا کی نرمی

اور جس فطرت کی خوبصورتی سامنے آئے گی اس میں مرید خان، لال خان، نصیر خان اور غلام عیسیٰ کا کوئی حصہ نہ ہو گا۔ سورج کی جو سنہری کرن کل صبح دنیا میں قدم رکھے گی اس کی آنکھ ان کی لاشوں کو دیکھے گی اور ان کے چاہنے والوں کی گریہ زاری اور آہ و بکا سنے گی۔

رات بھر ہوا روتی رہی۔ رات بھر بادل آسمان کی نیلی چادر اور اس کے روشن ستاروں کو اپنے لہادوں میں لیے اڑتے رہے، رات بھر میں اپنے جنگلے کو پکڑ کر بیٹھا رہا اور رات بھر میں نے پھانسی کے رے کو اپنی گردن میں پایا۔ اس رات میں جانے کتنی بار مرا اور پھر زندہ ہوا۔ دوبارہ مرنے کے لیے..... موت آگئی تھی اور آس پاس دبے قدموں پھر رہی تھی۔ اس قدموں کی چاپ اور اس کی گرفت میری اپنی گردن کے گرد تھی۔ کتنا گہرا سناٹا تھا جسے ہوا کی چینیں توڑ توڑ کر پھینک رہی تھیں، مگر یہ سناٹا اور بڑھتا تھا اور سنگین ہو جاتا تھا۔

جب رات دوپہر کے قریب گزر گئی تو مرید خان نے غلام عیسیٰ کو پکار کر کہا ”غلام عیسیٰ! کوئی بات کر، تو چپ کس لیے ہے؟“

غلام عیسیٰ نے کہا ”مرید خان! کیا باتیں کروں؟ آج ساری باتیں ختم ہو گئی ہیں۔“

مرید خان خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے پھر کہا ”غلام عیسیٰ تو گھبرا تو نہیں رہا.....؟“

”نہیں مرید خان! میں گھبراتا نہیں، موت برحق ہے مگر سوچتا ہوں، میری بیوی ابھی بہت چھوٹی ہے، اس کے سامنے تو ساری عمر پڑی ہے، وہ کیا کرے گی.....“

مرید خان نے ”اللہ رحم کرے گا“ والا اپنا فقرہ نہیں دہرایا اور خاموش رہا۔

غلام عیسیٰ نے پھر کہا ”مرید خان؟ تم نے میری عورت کو دیکھا تھا؟“

ہاں! ”مرید خان نے کہا۔“

”تم نے اس کی آنکھیں دیکھی ہیں؟“

”نہیں۔“

تم دیکھتے تو سہی، اس کی آنکھیں مرگ کی آنکھوں جیسی ہیں۔ جب جاتے وقت وہ مجھے دیکھتی تھی تو میرا جی

چاہتا تھا ان آنکھوں میں بیٹھ جاؤں۔ مرید خان! ان میں آنسوؤں کے سمندر تیر رہے تھے، اس کا کیا بنے گا مرید خان!“

مرید خان تھوڑی دیر خاموش رہا پھر اس نے کہا ”غلام عیسیٰ! رب نون یاد کر۔“

غلام عیسیٰ خدا کو یاد کرنے لگا۔ آہستہ آہستہ وہ دیر تک کچھ پڑھتا اور دیوار پر ہاتھ پھیرتا رہا۔

لال خان نے غلام عیسیٰ کو آواز دے کہ کہا ”ذرا پکار کر دیکھ شاہ جی جاگ رہے ہیں؟“
نہیں سو گئے ہیں“ غلام عیسیٰ کی آواز آئی۔

مجھے ایسا معلوم ہوا گویا غلام عیسیٰ نے میرے منہ پر طمانچہ مار دیا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ مرنے والوں کا سانس دینے کے لیے کون جاگتا ہے۔ وہ سمجھتا تھا میں اپنے بستر پر آرام سے لیٹا ہوا سو رہا ہوں گا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ مجھے پکار گزر رہی ہے۔ میں نے پکار کر کہا ”غلام عیسیٰ! میں جاگ رہا ہوں۔“
”اچھا تو پھر ہماری بخشش کی دعا کرنا شاہ جی! ہمارا وقت تو قریب آرہا ہے۔“

تھوڑی دیر کے بعد میں نے مرید خان سے پکار کر کہا ”مرید خان! وہ تمہارا ڈاچی والا گیت سننے کو بہت چاہتا ہے۔“

مرید خان کھوکھلی اور بے روح سی ہنسی ہنسا۔ پھر اس نے اپنی پاٹھ دار آواز میں گانا شروع کیا
”ڈاچی والیا موڑ مہاروے..... ڈاچی والیا موڑ مہاروے۔“

لیکن ڈاچی والے کو اس کی سسی رخصت کر کے جا چکی تھی۔ ہیرا اپنے رانجھے کو سر شام ہی رخصت کر گئی تھی۔ اب ڈاچی والا کیسے واپس آئے گا۔ اس کی مہار اس کے قابو میں نہیں تھی وہ تو اپنے آخری سفر پر روانہ ہو گیا تھا..... خاموشی چھا گئی۔

معمول کے مطابق پونے چار بجے جیل کا تمام سٹاف پہنچ گیا۔ مرنے والوں کو زندگی ہی میں نہلا دیا گیا۔ انہیں ان کوٹھڑیوں سے نکال لیا گیا۔ وہ قطار میں سپاہیوں کی حفاظت میں پھانسی گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

روانہ ہونے سے پہلے مرید خان کی آواز سنائی دی۔ وہ سپرنٹنڈنٹ سے درخواست کر رہا تھا ”ہم تینوں بھائیوں اور غلام عیسیٰ کو ایک ہی بار تختے پر کھڑا کیا جائے اور لیک ہی جھٹکا دیا جائے۔ غلام عیسیٰ بھی ہمارا بھائی ہے۔“
ان کی درخواست منظور ہو گئی تو مرید خان نے خوشی کا ایک نعرہ لگایا اور ”السلام علیکم، کہا سنا معاف کرنا“ کہہ کر اپنے قافلہ کے ساتھ موت کی طرف روانہ ہو گیا۔

صبح سپاہیوں کی زبانی معلوم ہوا کہ ان چاروں کو تختے پر کھڑا کر دیا گیا۔ وہ سب باتیں کرتے رہے صرف لال خان تختے پر کھڑا ہونے کے بعد بار کپکپایا مگر اس کے بھائی مرید خان نے اسے کہنی کا ٹھوکا دیتے ہوئے کہا ”لال خان! ہمت سے کام لو اور مردوں کی موت مرد“ پھر وہ چاروں مردوں کی موت مر گئے۔

میں دن بھر یہ سوچتا رہا کہ یہ کون سا جذبہ ہے جو انسان کو ہنستے کھیلتے موت کی وادیوں کی طرف لے جاتا ہے

ان کے سامنے کوئی مقصد، کوئی نصب العین، شہادت کا کوئی تصور نہیں تھا۔ پھر بھی وہ ہنستے ہوئے مر گئے۔ قبائلی زندگی اور اس کی روایتوں کے ابھی کتنے نشانات ہمارے سماج میں موجود ہیں۔

اس ایک ہفتے میں غلام محمد، مرید خان، لال خان، نصیر خان اور غلام عیسیٰ سب ماردیے گئے۔ ان کی جگہ نئے لوگ آ گئے۔ پھانسی کی کوٹھڑیاں پھر پر ہو گئیں مگر تمام قیدی اور پرانے حوالاتی اور ملازم ان مرنے والوں کو یاد کر کے آبدیدہ ہو جاتے۔ حیات محمد کے ماہیے اور غلام عیسیٰ کے ڈھولے اور مرید خان کی ڈاچی کا گیت سب ختم ہو گئے تھے۔ ”ڈاچیوں والے“ نہ جانے کہاں چلے گئے تھے۔ مرنے والے تو مر کر غم سے نجات پا گئے تھے مگر جو زندہ تھے وہ ابھی اپنی اپنی تقدیر کے چکر میں پھنسے ہوئے تھے۔

فروری کا پورا مہینہ میں اپنے وجود سے ان کے خیال کو علیحدہ نہ کر سکا۔ سردی کم ہو رہی تھی مگر ہوائیں ایسی اداس تھیں اور فضا اس قدر پر اسرار رہتی کہ طبیعت کو سکون نہ ہوتا تھا۔ بہار کی آمد آمد تھی۔ پتے اب بھی گرتے تھے مگر اب کوئلیں بھی پھوٹی نظر آتی تھیں۔ درختوں کی شاخوں میں سے زرد زرد شگوفے نکلتے دکھائی دیتے تھے۔ شاعروں نے جو بہار کے موسم کو جنوں کا موسم کہا ہے تو کچھ غلط نہیں ہے اس لیے کہ ہواؤں اور میری قید تنہائی کی مصیبت نے مجھ میں جنون کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ میں پہروں چپ چاپ لیٹا رہتا۔ کوئی خیال، کوئی جذبہ، کچھ بھی نہ تھا۔ اپنے اندر باہر ویرانی ہی ویرانی نظر آتی۔ کوئی پھول، خوشبو کا کوئی تصور، حسن کی کوئی تصویر نظر کے سامنے نہ تھی۔ نظروں کے سامنے نہ تو پھول تھے اور نہ زلفوں کے لہراتے ہوئے سانپ تھے۔ زلف و لب و رخسار کے افسانے بھولتے جا رہے تھے۔ زندگی میں کچھ بھی باقی نہ تھا۔

میرے کبوتر اسی طرح تھے۔ میں انہیں اپنے چنے اور بچی ہوئی روٹیاں ڈال دیتا اور وہ اسی طرح میری گود میں آ کر بیٹھے رہتے۔ میری کوٹھڑی کی چھت میں بجلی کی تار کے ساتھ بے جا جو گھونسلہ تھا اسے بلب لگاتے وقت اتار کر پھینک دیا گیا تھا۔ وہ نامعلوم کدھر چلا گیا۔ میں بہت دنوں اس بیچارے کی تقدیر کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ تو پہلے ہی پریشان حال اور دنیا کا ستایا ہوا تھا۔ اب وہ کہاں ہوگا؟ میں معمول کے مطابق صبح یوگا کے آسن لگا کر سماجی لگاتا اور گیان ودھیاں میں لگا رہتا۔ ماسٹر صاحب آتے اور اخبار دے کر اور یہ تو برے آثار ہیں فانی“ کہہ کر رخصت ہو جاتے۔ میرے سامنے وقت اور فاصلے اور زندگی اور موت کا کوئی تصور باقی نہیں رہا تھا۔

اسی بے حسی اور جمود کے عالم میں فروری اور مارچ کا مہینہ گزر گیا۔ کتنے ہی نئے شگوفے پھوٹے، کتنی ہی کوئلیں نکلیں مگر اس زندگی میں بہار کا نشان نہ تھا۔ بہار جیسے ان اونچی، بھوری دیواروں کو پھاندنے سے معذور تھی۔

پچھلے کئی ماہ سے ڈپٹی صاحب روزانہ صبح سویرے جمعداروں، سپاہیوں اور نمبرداروں کی ایک فوج لے کر آجاتے اور میرے سامان کی مکمل تلاشی لیتے۔ وہ کہتے تھے کہ حکومت کا حکم آیا ہے کہ پھانسی والوں کی روزانہ تلاشی کے ساتھ ساتھ سیاسی نظر بندوں کی تلاشی بھی روزانہ ہونی چاہیے۔ تلاشی لینے کا طریقہ اگرچہ حد درجہ اہانت آمیز تھا اور اگرچہ چھ ماہ تلاشی لیتے رہنے کے باوجود میرے پاس سے کوئی قابل اعتراض چیز برآمد نہ ہوئی تھی مگر میں اس وجہ سے چپ ہو رہتا کہ چلو اس بہانے ڈپٹی صاحب سے گپ ہی ہو جاتی ہے۔

ایک صبح کو سویرے سویرے ڈپٹی صاحب آتے وقت سویٹ پیز کا گلدستہ لے آئے تو میری عید ہو گئی۔ میں نے ان کے ہاتھ سے پھول لیتے ہوئے کہا۔

بوئے یارمن ازیں ست وفامی آید

گلم زدست بگیرید کہ از کار شدم

انہوں نے میرا یہ شوق دیکھا تو روزانہ مجھے پھول بھیجنے لگے۔ ان کی خوشبو اور دلفریبی سے میں اس قدر مسحور ہوتا کہ گھنٹوں ان کو منہ سے لگائے بیٹھا رہتا۔

اپریل کے شروع میں ایک صبح ڈپٹی صاحب نے آکر مجھ سے کہا ”بوریا بستر سمیٹ کر تیار ہو جاؤ۔“
 ”کہاں چلنے کے لیے؟“ میں نے حیرت سے کہا۔
 ”حسن عابدی کے پاس!“ انہوں نے جواب دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد ان سے معلوم ہوا کہ ہمیں ایک ساتھ رکھنے کے احکامات موصول ہو گئے ہیں۔ وجہ یہ تھی کہ خود جیل والوں نے لکھا تھا کہ وہ اے کلاس نظر بندوں کو الگ الگ رکھنے کی جگہ اس جیل میں نہیں تھی، پھر راشن اور مشقتی بھی الگ الگ دینے پڑتے تھے جس میں جیل والوں کو تکلیف ہوتی تھی۔ خاص طور پر اس لیے بھی کیونکہ یہ جیل چھوٹی تھی اور برتن وغیرہ بھی اتنے نہیں تھے کہ دو آدمیوں کو الگ الگ دینے جاسکتے۔ بہر حال میں نے خوشی خوشی اپنا سامان باندھا اور مشقتیوں کے سر پر رکھوا کر ڈپٹی صاحب کے ساتھ روانہ ہو گیا۔

حسن عابدی کے احاطہ میں جانے کے لیے چکر میں سے ہو کر گزرنا پڑتا تھا۔ جب ہم لوگ چکر میں پہنچے تو وہاں عجیب نقشہ نظروں کے سامنے دیکھا۔ ہیڈ وارڈر اور بہت سے سپاہی اور جمعدار ایک بڑھے کو گھیرے کھڑے تھے، بڑھا ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔

ڈپٹی صاحب نے ڈانٹ کر ملازموں سے پوچھا ”کیا معاملہ ہے؟ یہاں پر کیا ہو رہا ہے؟“

چیف وارڈرنے آگے بڑھ کر کہا ”جناب اس بڈھے کی رہائی کے احکامات آئے ہیں مگر یہ جاتا نہیں ہے۔“
 ”معلوم ہوا کہ بڈھے کو ہفتہ بھر پہلے گداگری کے انسداد کے سلسلے میں جیل بھیج دیا گیا تھا مگر یہ اب چونکہ حکام کے خیال میں گداگری کی لعنت ختم ہو گئی تھی اس لیے اس کو چھوڑا جا رہا تھا مگر یہ بڈھا بصد تھا کہ اسے رہا نہ کیا جائے۔
 ڈپٹی صاحب نے اسے رہا ہونے پر مجبور کیا تو وہ ان کے قدموں پر گر پڑا اور روتے ہوئے کہنے لگا ”بچیاں والیا، چار دن پیٹ بھر کر روٹی کھا لینے دے۔ بس دس دن اور مجھے یہیں رہنے دے۔ باہر تو کبھی پیٹ بھر کر کھانے کو نہیں ملا یہاں کم از کم دو وقت روٹی تو مل جاتی ہے۔“

ڈپٹی صاحب نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی اور اس سے کہا کہ اس کی رہائی کے احکامات آنے کے بعد اسے اب وہ جیل میں نہیں رکھ سکتے مگر وہ ہاتھ باندھ کر منت سماجت کئے جا رہا تھا اور کہہ رہا تھا ”جناب! آپ کے بچوں کی درازی عمر کی دعائیں کروں گا۔ میں بے وسیلہ ہوں باہر آنا بہت مہنگا ہے اور کھانے کو کوئی نہیں دیتا۔ یہاں تو روٹی ملتی ہے حضور، جناب! مجھے دس دن اور یہاں پر کاٹ لینے دو۔“

بڑی مشکلوں سے اس بڈھے کو دھکے دے کر جیل سے باہر نکالا گیا مگر مجھے یقین ہے کہ وہ دو چار روز کے بعد پھر آیا ہوگا اس لیے کہ بھوکے کو روٹی نہ ملے تو اس کے لیے جیل کی غلامی آزاد رہ کر بھوکا مرنے سے کہیں بہتر ہوتی ہے۔ اس کی زندہ مثال سامنے تھی۔

حسن عابدی نے مجھے دیکھا تو پہلے تو اسے یقین ہی نہیں آیا۔ پھر وہ لپٹ کر گلے مل گیا۔ لاہور میں ہم لوگ پندرہ روز ساتھ رہے، پھر جولائی سے لے کر اس مارچ کے مہینے تک اسی جیل میں رہے لیکن الگ الگ، اس لیے جب ملے تو ہماری خوشی کا ٹھکانا نہ تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے یہ فیصلہ کرنے میں کوئی دقت نہ ہوئی کہ اسے اگرچہ مجھ سے بہت پہلے بہتر کلاس مل گئی تھی لیکن وہ مجھ سے زیادہ اذیت برداشت کر چکا ہے کیونکہ اس کے چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی اور اس کے ہونٹ خشک نظر آ رہے تھے۔ اس ایک سال کے عرصے میں اس سے ملاقات کرنے کے لیے کوئی نہ آیا تھا۔ کسی نے اسے باہر سے کوئی تحفہ، زندگی کی کوئی خوشبو یا کوئی پیغام نہ بھیجا تھا۔ اسے اس وقت تک سگریٹ بھی نہ ملے تھے، کلاس بہتر ہونے کے باوجود اسے کپڑے دھونے کے لیے صابن نہ ملا تھا بلکہ سال بھر جیل میں رہنے کے بعد اس کے کپڑے تک پھٹ چکے تھے۔ شیو کا سامان بھی اسے اس وقت تک نہیں ملا تھا۔

اس روز آپس میں ملنے کے بعد ہمیں اتنی خوشی ہوئی کہ ہم دن بھر سگریٹ اور بیڑیاں پھونکتے اور گپ لگاتے رہے۔ اس کا احاطہ میرے احاطہ سے بہت زیادہ بڑا تھا۔ چنانچہ ہم ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر احاطہ کی چار دیواری میں ٹہلتے

اور اپنی سال بھر کی جدائی کے قصے ایک دوسرے کو سناتے رہے۔ اس احاطے میں بیری کا ایک درخت بھی تھا۔ ہم نے اس درخت پر چڑھ کر بیر کھائے۔ شام کو باتیں کرنے اور قہقہے لگانے کا کام شروع کیا تو اگلی صبح تک ہنستے رہے۔ اس پہلی رات ہم ایک منٹ کے لیے بھی نہ سو سکے۔ باتیں اور باتیں کرنے کی پیاس اس قدر زیادہ تھی کہ کئی دن تک ہم نان سٹاپ بولتے رہے۔

حسن عابدی کا مشقتی کوئی گرہ کٹ تھا۔ وہ ہمارا راشن لینے کے لیے سٹور میں جاتا تو کسی حوالاتی سے بیڑیوں کا بنڈل، کسی سے اپنے لیے جوتا یا کوئی اور ضرورت کی چیز اڑا لاتا یا چرالاتا۔ حسن عابدی نے مجھے بتایا کہ ابھی دو ماہ پیشتر وہ رہا ہوا تھا مگر چار دن بعد واپس آ گیا۔ واپس آ کر وہ تمام قیدیوں سے ”السلام علیکم، السلام علیکم“ کہہ کر بڑے تپاک سے ملتا رہا گویا بڑے لمبے سفر سے واپس آیا ہو، یہ مشقتی جو ابھی بہت کھیلتا تھا۔ جب جیل کے ملازموں کی نگرانی بہت بڑھ جاتی تو وہ صبح قیدیوں کے ہمراہ اپنی بیرک سے نکلتے وقت اپنی جوتی ہاتھ میں لے لیتا اور کسی قیدی سے کہتا ”بول سیدھی جوتی یا الٹی“

قیدی کچھ مان لیتا تو یہ شخص چلتے چلتے ہوا میں اچھال دیتا۔ اگر جیت جاتا تو اس جوتی کے ساتھ اس قیدی کی جوتی بھی لے آتا اور کہیں بیچ دیتا۔ اگر ہار جاتا تو اپنی جوتی بھی دے آتا اور شام کو کوئی دوسری کہیں سے مارلاتا۔ دو تین ماہ سے اسے کوئی ملنے کے لیے نہیں آیا تھا۔ چنانچہ ایک روز وہ منشی سے ایک کارڈ لے آیا اور مجھ سے کہنے لگا ”جناب! میرے گھر ایک خط تو لکھ دیجئے۔ منشی سالے تو دس دس دن منتیں کراتے ہیں۔“

مجھے چونکہ قلم دوات رکھنے کی اجازت مل چکی تھی اس لیے میں نے اس کے ہاتھ سے کارڈ لے کر اس سے بولنے کے لیے کہا۔ اس نے خط لکھوانا شروع کیا۔

جناب والدہ صاحبہ!

السلام علیکم کے بعد واضح ہو کہ میں خیریت سے ہوں اور آپ کی خیریت خداوند کریم سے نیک مطلوب ہے۔ صورت احوال یہ ہے کہ میں آپ کے لیے اور آپ میرے لیے مرچکے ہیں۔ میں سخت بیمار ہوں اور مرنے کے قریب ہوں۔ زندگی کی کوئی امید باقی نہیں رہی۔ اگر آپ لوگوں کو میرا منہ دیکھنا ہے تو ایک بار آ کر منہ دیکھ جائیے اور اپنا منہ بھی مجھ کو آخری وقت دکھا جائیے۔ آتے وقت پانچ سیرگڑ، دو سیر صابن، چالیس بیڑی کے بنڈل، ایک پمپ کاشو، پانچ سیر گھی، چار ٹکیہ بنانے کا صابن، دو سیر سرسوں کا تیل اور.....

میں نے کہا ”اوجرا مزادے! تو تو مر رہا ہے پھر یہ سب سامان کس لیے منگواتا ہے؟“

وہ مسکرا کر بولا ”تسلیں لکھو تاں سہی جناب!“ میں نے لکھ دیا۔

اپریل کا مہینہ حسن عابدی کے احاطہ میں گزارا۔ ملتان میں اپریل ہی سے گرمی شروع ہو جاتی ہے۔ مئی کی نو تاریخ کو میری دوسری ششماہی کی معیاد ختم ہوتی تھی۔ حسن عابدی نے بیس اپریل 52ء کو اپنا ایک سال پورا کر لیا تھا اور اسے مزید چھ ماہ کی نظر بندی کے احکامات مل چکے تھے۔ میرے لیے ابھی انتظار کے دس دن باقی تھے۔ یہی امید تھی کہ شاید میں بھی حسن عابدی کے ساتھ اور چھ مہینے بند رہوں۔ گرمیوں کا موسم پھر منہ کھولے سامنے کھڑا تھا۔

مئی کی ابتدائی تاریخوں کو ہمیں باہر سونے کی اجازت مل گئی۔ سال بھر کے بعد کھلے آسمان کے نیچے لیٹ کر ہم نے دیر تک ستاروں کی فروزاں موسموں کو دیکھا اور نیلے آسمان اور اس کی پہنائیوں کے متعلق غور کرتے رہے۔ سال بھر کے بعد ہم اس قابل ہو گئے تھے کہ صبح سویرے اٹھ کر ٹہل سکیں اور اپنے احاطہ کی طرف آتی ہوئی اور گنگنائی ہوئی صبح کو دیکھ سکیں۔

اس احاطہ میں بے شمار درخت تھے ان درختوں پر رات بھر الو بولتے۔ میں اور حسن عابدی اپنے بستروں سے اٹھ کر اور اینٹیں اٹھا اٹھا کر الوؤں کو مارنے کی کوشش کرتے، مگر اندھیرے میں ہم انہیں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اندھیرے میں صرف الو کی آنکھ ہی کھلی رہتی ہے اس لیے تو ہم دونوں اندھیرے میں اپنے ان جرموں کی تلاش کرتے رہتے جن کی سزا ہمیں مل رہی تھی مگر ہمیں اپنے ایسے کوئی جرم نظر نہ آتے تھے لیکن دیکھنے والے دیکھ چکے تھے اور ہمیں نہیں بتاتے تھے۔ ہم مکمل اندھیرے میں تھے۔

کبھی کبھی سویرے کوئی بلبل ہمارے احاطہ کے درختوں پر آ بیٹھتا اور اپنی لمبی فریاد بھری آواز میں گانے لگتا۔ بہار کی یہ صبحیں کس قدر دل فریب اور کتنی پر نور تھیں اور بلبلوں کے یہ نغمے کیسے جادو بھرے تھے لیکن یہ ساری مسرت اور خوشی ہمارے اندر کی غمگینی سے ٹکرا کر جیسے لوٹ آتی۔ ہم بلبلوں کے نغموں سے اور بھی زیادہ پریشان اور غمگین ہو جاتے۔ مگر صبح سویرے ہم دونوں میں سے جس کے کام میں سب سے پہلے اس نغمہ کی آوازیں آتی وہ دوسرے کو جگا ضرور دیتا اور پھر ہم دونوں بیٹھ کر یہ آواز سنتے رہتے۔ پھر صبح ہوتی، ہم چائے پیتے اور اپنے اپنے کام میں لگ جاتے۔

وقت اسی طرح گزرتا رہا۔ حسن عابدی کی کشمکش ختم ہو چکی تھی مگر میں ابھی امید و بیم کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ جوں جوں نومئی کی تاریخ قریب آرہی تھی، یہ کشمکش بڑھتی جاتی تھی۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ چھ ماہ کی مزید نظر بندی کے احکامات موصول ہوں گے یا رہا ہو جاؤں گا۔ فیصلہ کرنا اس لیے بھی مشکل تھا کہ جس طرح بغیر جرم کے پہلے ایک سال جیل میں رکھا گیا ہوں ویسے اور بھی سال دو سال تک رکھا جاسکتا ہوں مگر چونکہ بعض ساتھی رہا بھی ہو چکے تھے اس لیے یہ امید بھی تھی کہ شاید رہا ہو جاؤں۔

آخر 9 مئی کی صبح آہنچی۔ میں نے اپنا سامان نہیں باندھا بلکہ اسی طرح بیٹھا رہا۔ حسن عابدی اور میں بار بار

دروازے کی طرف دیکھتے تھے۔ لیکن اس روز آٹھ بجے تک کوئی نہیں آیا۔

آٹھ بجے اچانک ڈیوڑھی سے ایک نمبردار مجھے لینے کے لیے آگیا۔ اس نے مجھے اپنا سامان بھی ساتھ لینے کو کہا۔ آخر رہائی کی تاریخ آگئی تھی مگر کوئی اعتبار نہ تھا۔ کیونکہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ ڈیوڑھی پہنچ کر مجھے بتا دیا جائے کہ تمہاری نظر بندی کی توسیع کے احکامات ٹیلی فون پر موصول ہو گئے ہیں اس لیے واپس چلے جاؤ۔ قانون ہی ایسا ہے کہ سب اعتبار اٹھ گئے تھے۔ میں جب چلنے لگا تو حسن عابدی سے گلے ملا۔ اس نے گلے ملتے ہوئے مجھ سے کہا ”باہر جا کر صرف ایک کام کرنا۔ کسی طرح یہ معلوم کرنا کہ میں نے کیا جرم کیا ہے؟ مجھے ابھی تک اپنا کوئی قانونی جرم معلوم نہیں ہے۔ اگر تم معلوم کر کے بتا دو تو بڑی نوازش ہوگی۔“ اور آج جبکہ مجھے رہا ہوئے تقریباً نو ماہ ہو چکے ہیں اور حسن عابدی اب تک ڈسٹرکٹ جیل ملتان میں پڑا سڑ رہا ہے، میں یہ اعتراف کرتا ہوں کہ بڑی تلاش کے باوجود مجھے حسن عابدی کے جرم کی کوئی فہرست نہیں ملی۔ میں کوشش کے باوجود یہ معلوم نہیں کر سکا کہ حسن عابدی پونے دو سال سے کس لیے نظر بند ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ میں سال بھر کس لیے نظر بند رہا ہوں..... میری زندگی کا ایک سال، پورے تین سو پینسٹھ دن میری مجموعی زندگی سے کس لیے الگ کر دیئے گئے تھے اور میں سال بھر ساری دنیا سے الگ کر کے کس لیے قید تہائی کے کنوئیں میں غرق کر دیا گیا تھا۔

مجھے صرف اتنا معلوم ہوا ہے کہ میں زندگی سے ایک سال تک چھڑا رہا ہوں۔ میں ابھی تک اپنے آپ کو ویسا نہیں پا رہا ہوں جیسا میں 9 مئی 51ء کو گرفتار ہوتے وقت تھا۔ میں زندگی سے پیچھے رہ گیا ہوں اور یہ حسین سرسبز و شاداب زندگی جو میری نظر کے سامنے پھیلی ہوئی ہے مجھے بالکل اجنبی، بالکل ویران سی نظر آتی ہے۔ جس کے حسن، نعمون، خوشبوؤں اور بہاروں کے لیے میں روتا رہتا تھا۔ وہ اجڑی اجڑی سی معلوم ہوتی ہے۔ میں دن بھر اس کے پیچھے پیچھے بھاگا پھرتا ہوں اور اسے اپنے کمزور بازوؤں کی گرفت میں لینے کی کوشش کرتا ہوں مگر یہ میرے بس میں نہیں آتی۔

اکثر جب میں دن بھر زندگی کی کشمکش میں مبتلا رہنے اور باومخالف کے تھپڑے کھانے کے بعد تھک ہار کر رات گئے اپنے گھر میں آ کر اپنے بستر پر دراز ہوتا ہوں اور جب میری بہن مجھے دیر سے آنے پر ڈانٹتی ہے اور جب وہ سینے کے درد سے چلا کر وٹ بدلتی ہے اور جب میں جاگتا ہوا ہونے کے باوجود انجان بننے کی کوشش کرتا ہوں تو مجھے وہ بڈھا یاد آجاتا ہے جس نے شیخ محمد شریف ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ ملتان جیل سے ہاتھ باندھ کر کہا تھا ”بچیاں والیا! مجھے رہا نہ کر، دس دن اور یہاں پر گزار لینے دے..... باہر تو کوئی روٹی نہیں دیتا..... باہر زندہ رہنا تو بڑا مشکل کام ہے.....“

حمید اختر

کے لکھے

چند افسانے

صحافی کالم کار سیاسی کارکن اور دانشور ہونے کے ساتھ ساتھ حمید اختر ایک افسانہ نویس بھی تھے انہوں نے لاتعداد افسانے لکھے ذیل میں ان کے چند افسانے تحریر کئے جا رہے ہیں تاکہ اس کتاب کے قارئین کو ان کے اس فن سے بھی آشنائی ہو سکے

آؤ بچو

آؤ! آج ہم تمہیں اپنے بچپن کی داستان سنائیں، ہمارا بچپن تمہارے بچپن کا سا نہیں تھا۔ جس عہد کا ہم ذکر کر رہے ہیں وہ تو ایک طلسماتی زمانہ تھا۔ جس میں زمانے سے ہمارا رشتہ مضبوط تھا۔ یہ بہت پرانی داستان ہے قریباً پون صدی پہلے کا ذکر ہے مگر اس دور کے لمس آج بھی ہمارے جسم کی ایک ایک پور میں رچے بسے ہوئے ہیں۔ ہمارے لیے اس وقت زمین اور آسمان کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ دن بھر ہم چھوٹے چھوٹے بچے، بالکل تمہاری طرح کے، خیر تمہاری طرح کے خوش لباس اور خوش پوشاک تو ہم نہیں تھے اس لیے کہ ہمارے بدن پر پورے کپڑے ہی نہیں ہوتے تھے، باغوں، کھیتوں کھلیانوں، ریتلے میدانوں اور پانی کی کھاڑیوں میں گھومتے رہتے۔ تمہیں تعجب ہوگا کہ کھیت کھلیان، ریگ زار اور دریا یک جا کیسے ہو گئے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ ہمارے گاؤں میں یہ سب کچھ موجود تھا۔ اس کے مغرب میں ریت کے ٹیلے تھے جہاں ہم دن بھر ان کو کھود کھود کر گھر بناتے، ایک دوسرے پر ریت پھینکتے، پھر پاس ہی باغ میں جا کر بیر توڑتے، اسی طرح شام ہو جاتی، رات دبے پاؤں آتی اور ہمارا احاطہ کر لیتی۔ آسمان ستاروں سے روشن ہو جاتا۔ ہم پہروں بیٹھے آسمان پر جگمگاتے ہوئے ستاروں کو دیکھتے رہتے اور سوچتے رہتے کہ وہاں ستاروں سے آگے اور کیا ہے؟ ان میں کون کون رہتا ہے۔ یہ کہاں سے آتے ہیں اور کہاں چلے جاتے ہیں۔

رات کو جب ہم درختوں بھرے کھلے صحن میں لیٹتے تو ہماری نگاہیں انہی ٹٹماتے ہوئے منور ستاروں پر مرکوز رہتیں۔ ہم انہیں گننے کی کوشش کرتے۔ جن راستوں پر یہ سفر کرتے ہم ان کا پتہ رکھتے تھے۔ کہکشاں کا نظارہ کرتے رہتے اور وہاں تک پہنچنے کے منصوبے بناتے۔ آسمان ایک ایک رات میں کئی کئی رنگ بدلتا۔ رات جب گہری اور تاریک ہو کر عجیب و غریب ہلکی آوازوں سے بھر جاتی تو ایک پرندہ اچانک ہمارے اوپر سے گزر جاتا، ہم مدتوں اس کے پروں کی آواز

مٹتے رہے مگر اسے کسی نے کبھی نہیں دیکھا۔ کچھ لوگ کہتے تھے یہ فرشتہ ہے جو ہمیں دیکھنے آتا ہے۔ ہم روزانہ اس کا انتظار کرتے مگر وہ کبھی کبھار آتا اور فضاء میں اپنے پروں سے ارتعاش پیدا کر کے چلا جاتا۔ ہم پھر آسمان کی طرف دیکھتے رہتے۔ کبھی یہ گرانبارا، بوجھل اور سرمئی ہو جاتا۔ کبھی صاف اور شفاف آئینے کی طرح اپنی آغوش وا کئے ہمیں اپنی طرف بلاتا۔ اندھیری راتوں میں درختوں کی شاخیں سرسراتی ہوئی ہوا کے زور سے ہلتیں تو ہمیں قسم قسم کی شکلیں اور ہیولے نظر آتے، کبھی ان کے پتوں پر معکوس روشنی کی دھنک رنگوں کا سمندر بنتی ہوئی نظر آتی اور جب کبھی بارش اور طوفان آتا تو بجلی کے سرد کوندوں میں درخت گویا زندہ ہو جاتے اور ہم سے کچھ کہنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے نظر آتے۔ منور چاندنی راتوں میں یہی ہمارے دوست بن جاتے۔ ان کی لہلہاتی ہوئی شاخوں اور گنگناتے ہوئے پتوں میں موسیقی کی لہریں روں دواں ہو جاتیں۔

پیارے بچو! تم نے تو رات میں کبھی ستاروں کو دیکھا نہیں ہوگا۔ اور تم شاید درختوں کی زبان بھی نہیں سمجھتے۔ مگر ہم تمہاری طرح سال بھر بند کمروں میں نہیں سوتے تھے۔ ہمارے پاس بجلی، پنکھا، ریڈیو، فریج، ٹیلی ویژن، اور ایر کنڈیشن نہیں تھے۔ ہم گرمی کے دنوں میں پوری دوپہریں درختوں کے سایوں میں ان سے باتیں کرتے رہتے۔ ہم جب پیڑوں کے تنوں سے کان لگاتے تو ان کی آوازیں واقعی ہمیں سنائی دیتی تھیں، الگ الگ درختوں کی الگ الگ آوازیں، شیشم، شہتوت، ببول اور نیم کے درخت سب الگ الگ بات کرتے تھے، ہوا ان کی شاخوں کو گدگداتی تو فضاء ایک عجیب قسم کی بے نام لہروں سے بھر جاتی۔ ہم ان عجیب طلسماتی آوازوں کے سحر سے نکل ہی نہیں سکتے تھے۔ جب ہوا بند ہوتی تو یہ درخت خاموش، ساکت اور بے ہنگم نظر آتے تھے مگر جب ہوا کے جھونکے ان کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے تو گویا ان میں جان پڑ جاتی اور یہ مست ہاتھیوں کی طرح جھومنے لگتے۔

پھر کسی دن، سخت چلچلاتی ہوئی دھوپ کو کہیں سے آکر بادل ڈھانپ لیتے، اس وقت ہم کتنے خوش ہوتے یہ تمہیں بتا ہی نہیں سکتے۔ ہم ان بادلوں کی طرف دیکھتے جو جھومتے ہوئے آتے، پہاڑوں کی طرح گراں بار پانی سے بھرے ہوئے گہرے نیلے، سرمئی، سفید، اور مختلف رنگوں سے مزین زمین کو اور انسانوں اور کھیتوں اور کھلیانوں کو سیراب کرتے ہوئے گزر جاتے، گرمی کے مارے ہوئے انسان باہر نکل آتے اور ان کی آوازوں اور زمین کی خوشبو سے فضاء ایک طلسماتی حسن سے معمور ہو جاتی۔

ہم دن بھر لہلہاتی فصلوں اور گنگناتے درختوں میں گھومتے۔ ان سے باتیں کرتے اور ان کے ساتھ ساتھ رہتے۔ ہر درخت اور ہر فصل کا اپنا ایک علیحدہ لمس تھا۔ اپنی الگ خوشبو تھی۔ پھر ہم ریت کے ٹیلوں کے ساتھ ساتھ اگے ہوئے

سرسراتے سرکنڈوں میں چھپ جاتے، یہ ہمارے سب سے اچھے دوست تھے۔ یہ جب تیز ہوا میں لہلہاتے اور باد شمال ان کو چھیڑتی ہوئی گزرتی تو فضاء عجیب قسم کی گنگناہٹ سے لبریز ہو جاتی اور زندگی روشنی اور حرارت سے معمور ہو جاتی۔ ہم میں سے اکثر کے پاؤں میں جوتے نہیں ہوتے تھے لیکن یوں سرد اور تھپی ہوئی زمین پر چلتے ہوئے اس سے ہمارا رشتہ گویا اور بھی مضبوط ہو جاتا۔ ہم میں سے کسی کے پاس پیسہ نہیں ہوتا تھا۔ اس زمانے میں لوگوں کے پاس پیسے ہوتے ہی نہیں تھے۔ اس چھوٹے سے گاؤں میں زندہ رہنے کے لیے ہر ایک کے پاس زمین تھی جو اپنے بچوں کے لیے ضرورت کی سب چیزیں اگل دیتی تھی۔ انہی چیزوں کے بدلے ضرورت کی دوسری اشیاء مل جاتیں اور یوں جیبوں کو روپوں سے بار بار بھرنے اور پھر بار بار خالی کر کے واپس آنے کی نوبت ہی نہیں آتی تھی۔

پیارے بچو! یہ بڑا سنہری دور تھا۔ جس میں انسان ہوا میں معلق نہیں ہوا تھا بلکہ زمین سے اس کا رشتہ بہت مضبوط تھا۔ ریلوے لائن ہمارے گاؤں سے پندرہ میل اور پختہ سڑک پانچ میل دور تھی۔ برسوں ہم ریل کی صرف باتیں ہی کرتے رہتے تھے۔ ہمارے بزرگ سو پچاس کوس کا سفر گھوڑے کی پیٹھ پر کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا ریل کی لگام ان کے ہاتھ میں نہیں ہے معلوم نہیں وہ انہیں کس طرف لے جائے۔ گھوڑے کی لگام تو ان کے ہاتھ میں رہتی تھی۔

ہمارے گاؤں کے مشرق میں دریا تھا۔ جب ہم ریت کے ٹیلوں پر کھیل کھیل کر تنگ آ جاتے تو بھاگے بھاگے دریا تک پہنچ جاتے۔ یہ عام طور سے بہت مہربان اور مشفق نظر آتا تھا۔ بس چپ چاپ زمین پر لیٹا رہتا۔ اس کا پانی شفاف اور ساکن تھا۔ دور افق تک اس کے پانی کی چادر تھی ہوئی نظر آتی اور ایسا معلوم ہوتا گویا وہاں افق کے پاس آسمان جھک کر اس سے سرگوشیاں کر رہا ہے اور اس کا حال پوچھ رہا ہے۔ اس کے کناروں پر بیٹھے ہوئے ہم عجیب پر اسرار آوازیں سنتے رہتے، سرکنڈوں کے جھاڑ اور ببول کے درخت تیز ہوا میں لہراتے تو سارے ماحول میں سیٹیاں سی بج اٹھتیں اور حشرات الارض کی صدائیں فضاء کو ایک عجیب حزن سے بھری ہوئی موسیقی سے معمور کر دیتیں۔ ہوا تیز ہوتی تو دریا کی ساکن سطح پر لہریں ابھرتیں اور یہ گویا زور زور سے سانس لینا شروع کر دیتا۔ مگر جب بارش ہوتی اور آس پاس کے ندی نالے پانی سے لبریز ہو کر دریا کا رخ کرتے تو یہ پرسکون لہریں طوفانی موجوں کی شکل اختیار کر لیتیں۔ سطح دریا پر سفید جھاگ کے تودے بن جاتے اور اس کا پاٹ بڑھنا شروع ہو جاتا۔ تب آس پاس کے دیہات میں قیامت مچا ہو جاتی۔ لوگ گھروں سے نکل کر اونچے ٹیلوں پر بیٹھ جاتے اور بے بسی سے دیکھتے رہتے کہ دریا ان کے گھروں کی دیواروں اور چھتوں کو کس طرح نکل رہا ہے۔ دیکھتے دیکھتے گاؤں کے گاؤں صاف ہو جاتے۔ جب دریا کی بھری ہوئی لہریں پرسکون ہو کر لوٹ جاتیں اور یہ عفریت اپنے پرانے راستے تک محدود ہو جاتا تو آس پاس کے دیہات میں سوائے طبعے کے اور کچھ باقی نہیں رہتا تھا۔

بچو! تم یہ جان کر حیرت زدہ ہو جاؤ گے کہ گنتی کے چند دنوں ہی میں یہ گاؤں دوبارہ آباد ہو جاتے تھے۔ سارا گاؤں مل کر ایک دو دن میں ایک گھر بنا دیتا۔۔۔ جس کا گھر بننا وہ سب کے لیے کھانا پکواتا، تمہیں اندازہ ہو گا کہ ان دنوں میں دس روپے سے بھی کم میں چاولوں کی ایک دیگ پک کر تیار ہو جاتی تھی جو ساٹھ ستر آدمیوں کی شکم پری کے لیے کافی ہوتی، باری باری پورا گاؤں سب کے گھر بنا دیتا۔ مٹی سے کچھ اینٹیں تیار ہو جاتیں۔ لکڑی جنگل سے کاٹ لی جاتی۔ چھت کے لیے سرکنڈے کاٹ کر لائے جاتے۔ پندرہ بیس روز کی کوشش سے گاؤں پھر آباد ہو جاتا، زندگی معمول پر آ جاتی، اہل چلنے لگتے۔ رہٹ گنگناتے اور گوریاں گیت گاتیں، راتوں کو بانسری کی تانیں اڑتیں، بچے اترتے ہوئے دریا کی دین، پانی کے جو ہڑوں میں مچھلیاں پکڑتے، پرندوں کے پیچھے دوڑتے، زمین سے نمو، زندگی اور قوت حاصل کرتے۔ ہم لوگ جانتے تھے کہ جب سپیدہ سحر نمودار ہوتا ہے تو افق کے کس حصے سے کون سے پرندوں کا غول نمودار ہوتا ہے، ان کے لیے رزق کہاں پر ہوتا ہے۔ پھر سورج کی پہلی کرن کون سی سمت سے ہوا کے دوش پر کن پرندوں کو لاتی ہے۔ وہ کہاں سے دانہ چگتے ہیں اور کہاں جا کر پانی پیتے ہیں۔ کبھی کبھی ہم ان کے ساتھ ساتھ چلتے اور صاف ہوا سے ہمارے پیچھے اس حد تک بھر جاتے کہ ہم پرندوں کے ساتھ اڑنے کی کوشش کرتے۔

بچو! ہم دنوں مہینوں اور برسوں ان کی رفاقت میں رہے تمہیں کچھ پتہ ہے کہ بلبل کس موسم میں کوکتی ہے۔ تلیروں کے غول کن رتوں میں آبادیوں کا رخ کرتے ہیں۔ فاختائیں کون سے موسم میں زیادہ بولتی ہیں اور کون کون سے موسموں میں ان کی بازگشت کہاں کہاں سنائی دیتی ہے۔ مور کب فریاد کرتا ہے۔ مولے اور ہد ہد اور ٹیڑیاں کہاں سے آتی ہیں اور کہاں جاتی ہیں۔ سارسوں کے قافلے کس ترتیب سے چلتے ہیں۔ تم یہ سب نہیں جانتے مگر ہم جانتے تھے۔ تمہیں تو شاید یہ بھی معلوم نہیں ہو گا کہ گندم کی بالیاں پک کر تیار ہوتی ہیں تو ساری فضاء مہک اٹھتی ہے۔ مکئی کے بھٹوں کی خوشبو کیسی ہوتی ہے۔ سرسوں کب پھولتی ہے اور سردستانی چاندنی راتوں میں سرسوں کے کھیت کیسی جنونی کیفیات پیدا کرتے ہیں اور دھان کی بالیاں ہوا کے زور سے لہلہاتی ہیں تو گہرے سبز رنگ کا سمندر نگاہوں کے سامنے پھیل جاتا ہے اور یوں لگتا ہے گویا ہزاروں لاکھوں اپسرائیں رقص کر رہی ہیں۔

پیارے بچو! افسوس تم یہ سب کچھ نہیں جانتے۔ مار دھاڑ، لوٹ مار اور قتل کی خبریں تمہارے لیے معمول بن چکی ہیں۔ مگر ہمارے بچپن میں کہیں شوکوس پر بھی کوئی قتل ہو جاتا تو سرخ آندھی آ جاتی تھی، مائیں بچوں کو چھپالیتی تھیں اور ہر طرف سے توبہ استغفار کی صدائیں سنائی دیتی تھیں۔ تم اس زندگی سے، اس معصوم حسن سے، ان گیتوں اور ان صدائقوں سے بہت آگے نکل گئے ہو۔ تم اندھیری راتوں میں خاموشی کی زبان سے ناواقف ہو، جب ہر طرف سناٹا ہوتا ہے مگر اس کی

پیسے کی کہانی

رسہ کوئی خاص مضبوط نہیں تھا۔ یہی پٹ سن کا رسہ تھا جو مہینہ بھر پہلے گھر میں گائے باندھنے کے کام آتا تھا۔ اس وقت کبھی کسی کو خیال بھی نہیں ہوا تھا کہ یہ رسہ بڑی بہو کے اس مصرف میں آئے گا۔ بہو کے پانچوں بچے چھوٹے اور بڑے سبھی صحن میں بیٹھے رو رہے تھے۔ ننھے کو تو رونے کا ہوش ہی نہیں تھا۔ وہ ماں کی چار پائی کے پاس بیٹھا مٹی کے ڈھیلوں سے کھیلے جا رہا تھا۔

گلو نے ایک مرتبہ چار پائی پر بے حس پڑی ہوئی اپنی بیوی کو دیکھا پھر آہستہ آہستہ اس کی آنکھیں اس رسہ پر جم گئیں اور وہ سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ گلو کی ماں مسلسل روئے جا رہی تھی اور ہر نئی آنے والی عورت کے گلے سے لپٹ کر دھاڑنے لگتی تھی۔ ابھی تک بہو کے گلے میں رسہ پڑا ہوا تھا۔ لوگوں نے بتلایا کہ پولیس لاش کا معائنہ کرنے کے بعد رسہ کو اپنے قبضہ میں کر لے گی، تب لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھیجی جائے گی۔ گلو سے یہ دیکھا نہ گیا کہ اس کی بیوی، اس کے پانچ بچوں کی ماں، پھندا گلے میں ڈالے یوں چھت سے لٹک رہی ہے۔ لیکن پولیس کی تحقیق و تفتیش کے پیش نظر اسے رسہ کھولنے کی جرأت نہیں ہوتی۔

گلو کو بیوی کی موت کا جس قدر صدمہ تھا اس سے زیادہ افسوس اس بات کا تھا کہ دو سال کی کشمکش اور مسلسل جھگڑوں کے بعد دوسری شادی کی تاریخ مقرر ہوئی تھی اور اب جب کہ اس کی شادی میں آٹھ دس دن باقی تھے یہ مصیبت آ پڑی۔ اسے خطرہ تھا کہ اس حادثہ کے بعد شادی طویل عرصے کے لیے ملتوی ہو جائے یا پھر یہ بھی ممکن ہے کہ لڑکی والے موجودہ صورت حال میں صاف انکار دیں۔ اس موہوم خوف کے ساتھ ساتھ اس کے دل کے ایک گوشہ میں یہ خیال بھی موجود تھا کہ راستہ کاروڑا اب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے صاف ہو گیا اور یہ جھگڑے جیسے ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں گے۔ اس کے بعد پھر کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ اطمینان کے اس شعوری احساس کے ساتھ اسے یہ بے حس عورت اپنے اعصاب پر سوار نظر آرہی تھی جس کے ساتھ اس نے زندگی کے بارہ برس گزارے تھے۔ چودہ برس کی عمر میں وہ اس کے گھر میں آئی تھی۔ اس وقت گلو کے ہاں رزق کی ریلن پیل نہ تھی۔ اپنے باپ کے ساتھ وہ دن بھر تلج میں کشتی چلایا کرتا تھا اور پتن پر سے

ایک ایک کر کے دس بارہ پور پہنچا کر رات کو جب تھک ہار کر واپس گھر آتا تو ایک گرم، جوان اور متناسب جسم اس کے انتظار میں ہوتا۔ عیساں اس زمانے میں اپنی نو عمری کے دور میں بڑی خوبصورت لڑکی تھی اور پھر اسے اس ایک آدمی کے سوا دنیا میں کسی سے کوئی غرض نہیں تھی۔ وہ شام کے بعد گھر پہنچتا تو اس کے آنگن میں داخل ہوتے ہی عیساں ایسے نظر آتی جیسے بھکی ہوئی ہرنی کو جنگل میں راستہ مل گیا ہو۔ کھانا کھانے کے دوران یا اس کے بعد گلو کو گھڑی بھر کی تنہائی نصیب ہوتی تو وہ اپنے پیار کے اظہار کے لیے عیساں کے کان کے پاس منہ لے جا کر کہتا۔

”تیری ماں کی۔۔۔ آج تو پورن مل کی دکان کا سا زاسرہ لوٹ لائی ہے۔ پیسے بھی دیئے ہیں یا بین بجا کر اسے مست کر آئی ہے۔“

دو ایک سال اسی طرح گزر گئے۔ گھر کی غریبی تو دور نہیں ہوئی لیکن کشتی بہر حال ثابت و سالم رہی۔ چوچلے رہے۔ زمین سیراب ہوتی رہی اور گلو اور عیساں دن پورے کرتے رہے۔

ایک رات عیساں نے گلو سے کہا۔۔۔ ”ایک بات بتاؤں کسی سے کہو گے تو نہیں۔“

”نہیں“ گلو نے چار پائی پر لیٹتے ہوئے اور اسے اپنی بانہوں میں لیتے ہوئے کہا۔ ”میری بہن صنرا کی منگنی ہو گئی ہے۔ شادی بھی ہونے والی ہے۔“

گلو اٹھ کر بیٹھ گیا۔۔۔ ”کیا کہا، ارے وہ سگی! آٹھ برس کی تو اس کی عمر ہے تیرے ماپے اب لڑکیوں کو اتنی عمر میں گھر سے نکالنے لگے ہیں؟“

”نہیں، نہیں۔۔۔ عیساں نے کہا۔۔۔“ آج دوپہر کو میری ماں کشن پور سے آئی تھی، کہتی تھی جلال لاہور سے واپس آ گیا ہے۔ وہ ہمارا رشتہ دار ہے لیکن ہم سے کبھی ملتا نہیں تھا نہ ہی گاؤں میں آتا تھا۔ اب عمر اس کی پچاس برس کے قریب ہے۔ وہ ہمیشہ لاہور ہی میں رہا ہے۔ اسے دو مالدار بہنوں نے جن کے خاندان میں اولاد دزینہ نہیں ہوتی تھی اور لڑکے پیدا ہوتے ہی مر جاتے تھے اپنا متنبی بنایا ہوا تھا۔ جلال کو انہوں نے بچپن ہی سے اپنے پاس رکھا لیا تھا اور پالا پوسا۔ اب وہ مر گئی ہیں اور ان کی ساری دولت کئی سیر سونا اور بہت سا روپیہ نقد جلال ہی کے پاس ہے اور اب وہ ہمارے ہی گھر میں رہے گا۔“

کچھ دیر خاموشی رہی۔ گلو کے بازوؤں کی گرفت ڈھیلی ہو گئی۔

”میری ماں کہتی ہے۔۔۔“ عیساں نے کہا۔۔۔ ”جلال نے شاید ان عورتوں کو زہر دے کر مار ڈالا ہے اور ان کے مال پر قبضہ کر کے بھاگ آیا ہے۔ اس لیے لاہور کے نام سے گھبراتا ہے۔ پھر دونوں ایک ساتھ بھی تو نہیں مر سکتی تھیں۔“

۔ کیوں گلو؟“ اس نے گردن اونچی کر کے کہا۔۔۔ ”مگر خیر ان کا دین ایمان جانے۔۔۔ میری ماں نے اسی سے صفائی کی مگنی کر دی ہے۔“

”مگر وہ اتنی چھوٹی سی ہے اور وہ سالہ پچاس برس کا۔“

”بیڑی ڈبیا۔۔۔ کچھ سمجھا کر عیساں نے بات کو کاٹتے ہوئے کہا۔۔۔“ وہ کہتا ہے سگی کو میں خود پالوں گا اور سال دو سال میں کھلا پلا کر نکلوا کر کے اس سے بیاہ کر لوں گا۔ میری ماں کہتی ہے۔۔۔ عورتوں کے ساتھ رہنے سے اسے بچے بچیوں کو دیکھنے کا موقع نہیں ملا اس لیے اس کو چھوٹی عمر کے بچے، نوجوان لڑکیاں اور کم عمر کے لوگوں سے بہت محبت ہے وہ کہتا ہے سگی کو میں خود پالوں گا۔ میرا باپ بھی کہتا ہے کہ جلال دمہ کا مریض ہے سال دو سال میں مر جائے گا تو سارا روپیہ اپنے قبضہ میں ہوگا۔ بہت سارا روپیہ ہے اس کے پاس ایک ٹرنک بھرا ہوا ہے۔ اس کا ٹرنک بھی ہمارے گھر میں ہی ہے۔ اس کا ایک ماموں اور ایک نانا ہے لیکن وہ ہمارے ”شریکے“ کے لوگ ہیں۔ اس لیے وہ ان کے پاس رہنے کی بجائے ہمارے ہی گھر میں رہتا ہے۔“

”اس پیسے میں ہمارا بھی حصہ ہوگا۔“ گلو نے بستر پر بیٹھتے ہوئے بڑی بیقراری سے کہا۔

”میرے ماں باپ کے پاس ہوگا تو وہ کچھ نہ کچھ ضرور دیں گے مگر کسی سے بات نہ کرنا۔“

”خاک دیں گے، شادی پر تو انہوں نے مجھے کچھ نہیں دیا۔“

”جادو ہو۔ پھر وہی بات کرتا ہے اس وقت ان کے پاس تھا ہی کیا؟ جب ہوگا تو دے دیں گے۔“

”یا الہی“ گلو نے خلوص نیت سے دعا مانگی ”صفائی کو فوراً جوان کر دے اور اس بوڑھے جلال کا جلدی خاتمہ کر

دے۔“

”بیڑی ڈبیا“ عیساں نے خاوند کو دکھا دیتے ہوئے کہا۔

آٹھ دس دن گزر گئے۔ گلو کو اس سلسلے میں مزید تفصیل معلوم نہ ہو سکی۔ عیساں کے ماں باپ اس کے گاؤں سے تین چار میل مغرب میں موضع کشن پور میں رہتے تھے۔ گلو کا دل کئی بار چاہا کہ بھاگ کر وہاں کے حالات اور خاص طور پر جلال کے متعلق کچھ باتیں معلوم کر آئے۔ لیکن ستلج بھر رہا تھا اور اس کا بوڑھا باپ اکیلا کشتی قابو میں نہیں رکھ سکتا تھا۔ پتن پر بڑی بھیڑ رہتی تھی۔ سال کے یہ دو مہینے تو کمائی کے ہوتے ہیں۔ باپ اسے سویرے سویرے دونوں چھوٹے بھائیوں کے ہمراہ اٹھا کر لے جاتا تو شام گئے ہی واپسی ہوتی۔ کبھی کبھی تو رات بھی پتن پر گزارنا پڑتی تھی۔ ان ہی دنوں اکا دکا وارداتوں کی خبریں آنے لگیں۔ لیکن ان خبروں سے پتن پر کوئی ہل چل نہیں ہوئی۔ اس پتن تک ہندوستان کی آزادی کی کوئی مصدقہ

خبر نہیں پہنچی تھی۔ لیکن آزادی کے دن بہر حال قریب آرہے تھے۔ جب آزادی سر پر آ پہنچی جب تین والوں کو بھی پتہ چلا اور گلگلو اور اس کے خاندان اور گاؤں والوں اور عیاشاں کے گاؤں والوں سبھی کو گھر بار چھوڑ کر پندرہ میل کے فاصلے پر ایک کیمپ میں پناہ لینی پڑی۔

انہیں کیمپ میں پہنچے ایک ماہ ہو گیا تھا۔ ان کا اور عیاشاں کے گھر والوں اور جلال کے ماموں اور نانا کا ڈیرہ پاس ہی تھا۔ یہ ڈیرہ دار ایک کھلے جنگل میں سر پر چند پھٹی پرانی چادریں تانے بیٹھے ہوئے تھے۔ لیکن ہر خاندان نے زمین کے ایک مخصوص رقبے کو کسی نہ کسی چیز سے محصور کر کے اپنا قبضہ جمالیا تھا۔ کیمپ میں کسی قسم کی کوئی خبر نہ تھی۔ ابھی یہاں سے انخلا عمل میں آنا شروع نہیں ہوا تھا۔ اس لیے لوگ جیسے آہستہ آہستہ یہاں بس سے گئے تھے۔ صبح سویرے مہاجر کیمپ میں مقیم خاندانوں کے مرد کیمپ سے باہر ڈرتے ڈرتے ایندھن کی تلاش میں جاتے عورتیں چکی پیتیں، کبھی کبھی اشیائے خوردنی کا توڑا ہو جاتا تو کچھ شیر دل نوجوان قریبی دیہات میں جو مسلمانوں کی اکثریت والے گاؤں تھے مگر ان کے کیمپ میں آجانے کی وجہ سے تقریباً خالی پڑے تھے، رات کے وقت چھاپہ مار کر اناج کی گٹھریاں باندھ لاتے اور راستے میں شکر قندی، کماد، مکئی کے بھٹے، جو کچھ بھی ہاتھ لگتا اٹھالاتے۔ شام کو چولہے سلگتے، حقہ کی گڑ گڑ کی آوازیں آتیں اور پاکستان پہنچنے کے پروگرام بنتے۔

انسانوں کے اس عظیم الشان ہجوم میں پریشانی کے زیادہ تر لمحے وہی ہوتے جب کسی کے پاس اناج یا لکڑی یا ایسی ہی فوری ضرورت کی کوئی چیز ختم ہو جاتی تھی۔ آخر کار گلگلو اور اس کے عزیزوں کے ان تینوں خاندانوں پر بھی یہ وقت آن پڑا۔

عیاشاں کے باپ کے ڈیرے میں جس کی حد بندیوں کے لیے رسہ باندھ دیا گیا تھا، یہ سب لوگ بیٹھے ہوئے تھے اور اناج اور ایندھن کے حصول کے مسئلہ پر سوچ بچار کر رہے تھے۔

جلال نے کہا ”لکڑیاں اور گیہوں قیمتاً مل جائیں تو چاہے کتنی قیمت ادا کرنی پڑے لے لیتے کیوں نانا جی“ اس نے عیاشاں کے باپ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”مگر مشکل ہے کہاں قیمتاً کوئی چیز ملنے کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ بڑا مشکل وقت آن پڑا ہے۔“

”یوں کام نہ بنے گا۔ اس کے ماموں نے حقہ کا کش لیتے ہوئے کہا ”کیمپ سے باہر نکلتے ہیں، لوگ ادھر ادھر سے لکڑیاں کاٹ کر لاتے ہیں۔ کسی کو زیادہ پیسوں کا لالچ دیں گے۔ شاید کوئی کام بن جائے۔ مگر یہاں بیٹھنے سے تو کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ ہاتھ پیر چلاؤ تو کوئی نہ کوئی سبیل نکل ہی آتی ہے۔“

”چلو پھر کوشش کریں“۔ عیساں کے باپ نے فوراً اٹھتے ہوئے کہا۔ جلال کا ماموں اور بڑھا نانا بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ جلال کی حیثیت عیساں کے باپ کے گھر میں اب تک ایک مہمان کی سی تھی۔ اسے گھر میں کبھی کسی نے ایک تنکا دوہرا کرنے تک کے لیے نہیں کہا تھا۔ مگر آج تینوں آدمی اسے ایک جان جوکھوں کے کام پر اپنے ساتھ لے جانے کے لیے منتظر کھڑے تھے۔ پہلے تو اسے یہ بات بڑی بری لگی مگر کچھ دیر بعد یہ سوچ کر اٹھ کھڑا ہوا کہ شاید پیسوں کی ضرورت کی وجہ سے اسے ساتھ لے جانے پر اصرار کیا جا رہا ہے۔

جب یہ لوگ کیمپ سے دو تین فرلانگ آگے نکل گئے تو جلال نے کہا ”یہاں تو آدم نہ آدم کی ذات نظر آتی ہے۔ بھلا یہاں کون لکڑیاں اور اناج لے کر آئے گا۔“

”ذرا دس قدم آگے چل کر ان درختوں کے نیچے تھوڑی دیر کے لیے بیٹھ جاتے ہیں۔ وہ راستہ ہے اور لوگ ادھر ہی سے گزر کر کیمپ میں جاتے ہیں۔ شاید کوئی مل جائے“ اس کے ماموں نے کہا۔

جلال بادل نحو استہ آگے بڑھا، لیکن جھاڑیوں کے پاس پہنچتے ہی عیساں کے باپ نے اسے پیچھے سے اپنی گرفت میں لے کر زمین پر گرا دیا۔ اس کا ماموں چشم زدن میں اسکی چھاتی پر سوار ہو گیا اور بوڑھے نانا نے لپک کر اس کی ٹانگیں مضبوطی سے پکڑ لیں۔ جلال کچھ بھی سمجھ نہ سکا۔ اس کا رنگ زرد پڑ گیا۔ اس نے ہاتھ باندھے لیکن عیساں کے باپ نے آگے بڑھ کر اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔ اس کے ماموں نے دھوتی میں اڑسی ہوئی چھری نکال کر جلال کی گردن پر رکھ دی۔

چھری کندھی، اس نے دونوں ہاتھوں سے بڑے زور سے اسے دبا کر چلانے کی کوشش کی۔ پچاس برس کی عمر میں جلال کی گردن کا تناؤ کم ہو چکا تھا۔ جلد لٹکی ہوئی تھی۔ پہلے تو چمڑا کلنے کی بجائے چھری کے ساتھ ساتھ ادھر ادھر ہوتا رہا۔ لیکن بالآخر ایک جگہ سے کٹ گیا۔ ماموں نے چھری کی نوک سے شہ رگ کو اوپر اٹھایا۔ جلال ایک بار تو تڑپا اور اس کی ٹانگیں بڑھے نانا کے ہاتھ سے چھوٹ کر چھاتی پر بیٹھے ہوئے ماموں کی کمر میں زور سے لگیں پھر وہ ٹھنڈا ہو گیا۔ خون بھی بہت تھوڑا نکلا تھا۔ عیساں کا باپ ایک طرف کھڑا ہو گیا لیکن ماموں نے جلال کی قمیض سے سونے کی زنجیر، سٹڈ بٹن، ہاتھ سے گھڑی اور جیب سے بٹوہ نکال لیا اور تینوں آدمی خاموشی سے کیمپ کی طرف واپس روانہ ہو گئے۔

راتے میں انہوں نے کوئی بات نہیں کی لیکن ڈیرے پر پہنچتے ہی دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ کچھ لوگ جمع ہو گئے تو ان میں سے ایک نے بڑی درد بھری آواز میں کہا ”خدا نے ہمیں ہاتھ دے کر رکھ لیا ہے ورنہ سکھ ہمیں بھی مار ڈالتے۔ ہمیں کیا معلوم تھا جلال کی موت ہمیں لکڑیاں خریدنے کے بہانے لیے جا رہی ہے۔ سارا جتنا اس کی طرف لپک پڑا۔“

سکھ غنڈے اکاڈ کا مسلمانوں پر حملے کرتے ہی رہتے تھے۔ مرنے والوں کی لاشیں تک نہ ملتی تھیں۔ کوئی انہیں اٹھا کر لانے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ جلال کی موت کو بھی لوگوں نے اسی طرح قبول کر لیا اور پھر رونے والا کون تھا۔ رونے والے تو اسے اپنے ہاتھوں قتل کر آئے تھے۔

اگلی شام جلال کے نانا اور ماموں نے عیशाں کے باپ سے ٹرنک کا مطالبہ کیا۔ یہ خبر دو چار آدمیوں تک پہنچ گئی کہ جلال کے ٹرنک میں بڑا سونا اور پیسہ تھا۔ انہی میں یہ دونوں شامل تھے مگر یہ ٹرنک عیशाں کے باپ کے قبضے میں تھا وہ ان دونوں کی بات سن کر پہلے خاموش رہا پھر اس نے حقہ کاش لیتے ہوئے کہا ”سارا پیسہ تو تم نے اس کی جیب سے نکال لیا ہے ٹرنک میں چار کپڑے تھے ان کی وارث میری لڑکی ہے جو اس کی بیوی تھی۔ تم اس ٹرنک کے کیا لگتے ہو۔“

”ہم اس کے خاندانی وارث ہیں۔“ جلال کے نانا اور ماموں نے کہا ”تمہاری بیٹی سے اس کا نکاح تو نہیں ہوا تھا۔ اس کے مال کے حق دار ہم ہیں، ہم عدالت میں جائیں گے۔“

لڑائی بڑھ گئی مگر یہ سرگوشیوں اور خاموشی کی لڑائی تھی۔ جلال کے ماموں اور نانا بڑے غصے مگر آہستگی سے عیशाں کے باپ کو گالیاں دیتے رہے۔ وہ بیٹھا حقہ پیتا رہا۔ جلال کی وراثت پر جھگڑا زور شور سے ہوتا تھا۔ لیکن اس کی موت کا ذکر آتے ہی بات سرگوشیوں میں ہونے لگتی۔ تھوڑی دیر بعد پھر ٹرنک کی ملکیت پر بات آجاتی۔ دونوں آدمیوں کی یہ پیش کش بھی عیशाں کے باپ نے ٹھکرا دی کہ ٹرنک ان کے سامنے لا کر رکھا جائے اور پھر تینوں آدمی حصہ تقسیم کر لیں۔ لیکن ٹرنک کا مال اب ٹرنک میں بھی تھا ہی نہیں وہ اس کی اور اس کی بیوی کی مگر کے گرد تھا۔ ٹرنک میں صرف کپڑے تھے۔ بہت دیر جھگڑا ہوتا رہا مگر فریقین میں سمجھوتہ نہ ہو سکا۔

پاکستان بننے کے بعد یہ تینوں خاندان ملتان میں آباد ہوئے۔ جلال کے ماموں اور نانا نے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ عیशाں کا باپ اپنی لڑکی کو لے کر عدالت میں پیش ہوا۔ لڑکی کی طرف سے حلیہ بیان پیش کیا گیا جس میں کہا گیا تھا کہ اس کا نکاح جلال سے ہوا تھا اور اب وہ عمر بھر دوسری شادی نہیں کرے گی بلکہ اس کی یاد میں کنواری بیٹھی رہے گی۔ بیان میں کہا گیا تھا کہ چند زیورات جو جلال نے شادی پر اسے دیئے تھے راستے میں گم ہو گئے بقیہ چند سو روپے ہیں جو اس کے گزارے کے لیے اس کے پاس ہیں اور وہ انہی کے سہارے زندگی کے دن پورے کرے گی۔

عدالت نے صفائی اور اس کے باپ کے حق میں ڈگری دے دی۔ جلال کا نانا اگلے ہی دن شاہ شمس تبریز کے مزار پر جا بیٹھا۔ ان دنوں وہاں آنے والے لوگ اسے ولی کا درجہ دیتے ہیں۔ اسے کچھ ہوش نہیں ہے کسی نے کچھ دے دیا ورنہ ہر وقت یاد الہی میں مگن رہتا ہے۔ مرد عورتیں شاہ شمس تبریز کی زیارت سے فارغ ہو کر باہر نکلتے ہیں تو اسی کی زیارت

کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ بعض ضعیف الاعتقاد سجدہ بھی کر ڈالتے ہیں۔ کتنوں کی مرادیں اس کے توسط سے پوری ہوئیں۔ جلال کا ماموں عدالت کے فیصلہ سے ٹھیک دس دن بعد پاگل ہو گیا اور کئی برس تک اس شہری سڑکوں پر الف ننگا پھر تارہا۔ وہ بار بار اپنے ہاتھ مروڑتا تھا اور چیختا تھا۔ دو تین برس بعد ایک سردرات کو وہ ٹھٹھر کر مر گیا۔ اس کی لاش میونسپلٹی والے اٹھالے گئے۔ گلو کی حالت قیام پاکستان کے کئی ماہ بعد تک خراب رہی۔

اسے مکان تو اچھا مل گیا لیکن روزگار کوئی نہیں تھا۔ باپ نے سرزمین پاک پر قدم رکھتے ہی جان دے دی تھی۔ اب وہ چار بھائیوں میں بڑا تھا اور خاندان کا بزرگ تھا لیکن بے روزگاری اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی تھی۔ ماں محلہ بھر کی خبریں اسے لا کر سنا تی اور وہ ماں کو روزگار تلاش کرنے کی روداد سناتا۔ ماں بیٹے میں بڑی یک جہتی اور انتہائی محبت تھی۔ لیکن خاندان کی حالت خراب ہوتی گئی۔ اس دوران گلو نے عیशाں سے کئی بار کہا تیرے ماں باپ نے جلال کی اتنی دولت صاف کی ہے کچھ وہیں سے لے آ۔ لیکن عیशाں کی ماں نے بیٹی کے سامنے قرآن پاک پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی تھی کہ جلال کو سکھوں نے مارا تھا۔ اس نے ٹرنک کھول کر دیکھا مگر اس میں کچھ بھی نہیں تھا، بس لفافے ہی لفافے تھے۔ چند زیور تھے جو لحاف میں سیئے تھے لیکن لاہور سے گاڑی میں سوار ہوتے ہوئے وہ لحاف بھی کسی نے کھسکا لیا۔ چند سو روپے نقد تھے ان میں سے کچھ خرچ ہو گئے ہیں۔ وہ بیٹی کا مال ہے اسے عمر بھر گزارا کرنا ہے۔

یہ باتیں سن کر عیशाں بھی خاموش رہی۔ بظاہر اس کے ماں باپ کے گھر کی حالت بھی ویسی ہی تھی۔ کسی دن گھر میں دال پک جاتی تھی تو کسی دن نمک مرچ ہی سے گزارا کرنا پڑتا تھا۔ ان کا گھر گلو کے گھر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ عیशाں دن میں ایک دو بار وہاں ہو آتی مگر کئی ماہ کی ٹوہ کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ ان کے پاس کچھ نہ تھا یا اگر ہے تو برائے نام ورنہ اس کا باپ ماں اور بھائی بہنیں ایسے پھٹے حالوں میں نہ ہوتے۔ گلو نے اس دوران اسے ایک دو بار مارا پٹا بھی لیکن ایسی باتیں بہر حال دن کے وقت ہوتیں۔ رات کو کوئی چیز راز میں نہ رہتی اور گلو کو بھی یقین ہو گیا کہ اس کی بیوی کے والدین کے پاس کچھ بھی نہیں۔

ایک دن عیशाں پچھلی کوٹھڑی میں گلو سے لپٹ گئی ”مجھے پتہ چل گیا ہے میری ماں نے سونا کہاں چھپا کر رکھا

ہے۔“



ایک ہی بات

”یہاں بیٹھ جاؤ بس ٹھیک ہے۔ تھوڑا سا اور میرے قریب سرک آؤ۔ مجھے ہوا کے خراٹوں سے ڈر معلوم ہو رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا آج کی رات کبھی ختم نہ ہوگی گویا یہ رات ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ ایسی ہی سیاہ، ایسی ہی ڈراؤنی اور اسی طرح خوفناک! اور میں اسی طرح تنہا، پریشان اور افسردہ رہوں گا..... کیا تم میری تنہائی کو کم کر سکو گی؟“ نوجوان سرگوشی کے لہجے میں اپنی ہی کہے جا رہا تھا۔ لیکن اس کے سامنے بیٹھی ہوئی نوجوان عورت پتھر کے بت کی طرح ساکت و صامت تھی۔

نوجوان نے جس کی آنکھوں میں ابھی وہسکی کے نشے کا اثر باقی تھا نے بڑی بے کسی سے عورت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”کچھ بولونا، تم جواب کیوں نہیں دیتیں؟“

”کیا جواب دوں؟“

”جو بھی تم مناسب سمجھو۔“

”میں تو کچھ بھی کہنا کوئی جواب بھی دینا مناسب نہیں سمجھتی! لیکن آپ کو اگر کسی خاص جواب کی ضرورت ہو تو ارشاد فرمائیے میں بالکل جواب دوں گی!“

”دیکھو مجھے اس قدر تکلیف نہ پہنچاؤ۔ میں اپنی زندگی میں پہلے ہی بہت پریشان اور مصیبت زدہ ہوں۔ اس زندگی نے مجھے دکھوں اور صدموں کے علاوہ کچھ نہیں دیا۔ یہ آج کی رات تو میں اپنی ساٹ زندگی سے علیحدہ رکھنا چاہتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ آج کی اس بات پر میری اصل زندگی کا سایہ تک پڑے۔“

”آپ کے حکم کی تعمیل ہوگی۔“ عورت نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

”دیکھو یہ دوسرا وار ہے جو تم مجھ پر کر رہی ہو اب کے دوسری بار تم نے مجھے جھٹکا دینے اور پریشان کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ مجھ پر اس قسم کے حملے نہ کرو۔ تم میرے میدان میں آ کر میرے ہی ہتھیاروں سے میری کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر مجھے شکست دینے کی کوشش کر رہی ہو۔ خدا کے لیے یہ نہ کرو۔ اس کا یہ

موقع نہیں ہے۔“

وہ تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ نوجوان نے سگریٹ سلگایا اور عورت نے کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے اپنے ماتھے کا

پسینہ پونچھا۔

نوجوان نے جیسے اپنے آپ سے کہا ”وہسکی کا ایک اور پیگ مل جاتا تو کتنا اچھا ہوتا!“

”ہاں وہسکی کا ایک پیگ اور مل جاتا تو کتنا اچھا ہوتا!“ عورت نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔

”تم وہسکی پیتی ہو؟“

”نہیں“

”پھر تم ایک اور پیگ کے لئے بے قراری کیوں ظاہر کر رہی ہو؟“

”میں شراب نہیں پیتی مگر پینے والوں کو میں نے بہت دیکھا ہے۔ میں ہر رات پینے والوں کو دیکھتی ہوں۔ وہ ہر

رات میرے پاس آتے ہیں۔ وہ ہر رات مجھے اپنے پاس لے جاتے ہیں۔ جانے وہ کیا ڈھونڈ رہے ہیں، جانے انہوں

نے کیا کھودیا ہے؟ ہر آنے والا میرے پاس اس طرح آتا ہے گویا میں ہی وہ پہلی عورت ہوں جس کا اسے جنم جنم سے انتظار

تھا۔ گویا وہ مجھی سے ملنے کا منتظر تھا۔ اور اب اس کی بھنگی ہوئی روح مطمئن ہو گئی ہے۔“

”میں بھی بھنگ گیا ہوں۔ میری روح بھنگ رہی ہے۔“ نوجوان نے کہا ”اور یہ رات کس قدر سنسان ہے اور

میری زندگی کتنی تاریک ویران اور ساٹ ہے۔ تم اس میں زندگی کا کوئی شعلہ داخل کر دو۔ خدا کے لیے تم اپنے طنز کے

تیروں کو چھپالو اور کچھ پھولوں اور خوشبوؤں کی بات کرو، کوئی بہار کا گیت سناؤ، کسی وادی کی داستان سناؤ..... کیا تم بالکل

تہی دامن ہو؟ تمہارے پاس مجھے دینے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے؟“

”میری زندگی میں نہ تو کوئی پھول ہے اور نہ کہیں پر کسی خوشبو کا گزر ہے۔ وہسکی کا نشہ اترنے کے بعد تمہیں معلوم

ہوگا کہ خود میں بھی وہ نہیں ہوں جو نظر آ رہی ہوں۔ کیوں کہ میرا دامن خالی ہے۔ مجھ سے کچھ لینا چاہتے ہو تو تم کو مجھے پہلے

کچھ دینا پڑے گا۔ تم جو کچھ مجھے دو گے وہی میں تمہیں لوٹا دوں گی۔ میں کسی کا کچھ نہیں رکھتی۔“

نوجوان جذباتی ہو گیا۔ اس نے عورت کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے ٹھنڈی سانس بھری۔ باہر ہوا فرائے

بھرتی ہوئی چل رہی تھی۔ اس کمرے میں ایک ننھی سی شمع جل رہی تھی۔ گھر کے تمام دروازے اور کھڑکیاں بند تھیں مگر ہوا

کے جھونکے کسی نہ کسی طرح اندر داخل ہو رہی جاتے تھے اور شمع ہوا کے زور سے اس طرح جھلملاتی گویا ابھی بجھ جائے گی۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“ نوجوان نے کہا۔

”گلزار۔“ عورت نے جواب دیا۔

”مجھے اپنا اصلی نام بتاؤ۔“ نوجوان نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”اصلی نام پوچھ کر کیا کرو گے؟ مگر معلوم ہوتا ہے تم اس قدر بھولے اور بے خبر نہیں ہو جس قدر نظر آتے

ہو۔۔۔۔“

”تم بالکل ٹھیک سمجھ رہی ہو مگر تم اپنا اصلی نام بتانے سے گریز کیوں کر رہی ہو؟“

”میں اصلی نام بتانے سے گریز کیوں کر رہی ہوں؟ نہیں میں نام بتانے سے گریز نہیں کر رہی۔ مجھے تو یہ بھی

معلوم ہے کہ اس کے بعد تمہارا سوال کیا ہوگا۔ میں جانتی ہوں کہ اس کے بعد تم مجھ سے پوچھو گے کہ میں کہاں کی رہنے والی ہوں؟ میں یہاں کیسے آئی؟ میں ہر رات کس لیے بکتی ہوں؟ مجھے تمہارے آنے والے سوالوں کا ڈر ہے اور میں اس قابل نہیں ہوں کہ ان پرانے زخموں کو پھر سے تازہ کروں۔ میرا اصلی نام پوچھنے کے بعد تمہیں میرے ساتھ میرے ماضی کے کھنڈروں کا سفر کرنا پڑے گا۔ تمہیں میرے ہمراہ ان اندھی اور غلیظ گھاٹیوں میں اترنا پڑے گا جنہیں میں بڑی مشکلوں سے عبور کر آئی ہوں۔ تم میں اتنی ہمت ہے؟“

نوجوان تھوڑی دیر تک سوچتا رہا۔ پھر اس نے جیسے اپنے آپ سے کہا ”کاش وہ سکی کا ایک ہی پیگ کہیں سے مل

سکتا؟“

عورت سے مخاطب ہوتے ہوئے اس نے کہا ”نہیں، نہیں میں تمہارے ساتھ تمہارے ماضی کے کھنڈروں کا

سفر کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں کیونکہ خود میری زندگی ایک کھنڈر ہے۔ میں تمہارے ہمراہ ان اندھی اور غلیظ گھاٹیوں کو عبور کرنے کے قابل نہیں ہوں کیونکہ میں بھی ایسی کتنی ہی اندھی گھاٹیاں عبور کر کے یہاں تک پہنچا ہوں۔ میں آج کی رات یہ ساری حقیقتیں بھول کر کچھ اور باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ ایسی باتیں اور ایسی کہانیاں جو میری حقیقی زندگی میں نہیں ہیں۔۔۔ آؤ آج ہم مل کر ان شبستانوں کا ذکر کریں جن میں فانوس جلتے ہیں۔ ان مندروں کی باتیں کریں جن میں دیو داسیاں پھولوں کی مالائیں ہاتھوں میں لیے دن رات ناچتی رہتی ہیں۔ کچھ ایسی ہی میٹھی باتیں، کچھ ان لوگوں کا ذکر کریں جنہیں ہم ہمیشہ ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ لیکن جو کبھی نہیں ملتے۔“

”بس یا کچھ اور؟“ عورت نے طنز سے بھرپور لہجے میں پوچھا۔

نوجوان اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے بے چینی سے کمرے میں ٹہلتے ہوئے بے قراری سے کہا ”تمہارا خمیر کس مٹی

سے اٹھا ہے؟ تم کتنی سخت ہو، تم پتھر ہو۔ کیا ہو۔ میں آج ہمہ تن جذبات ہوں اور اپنی زندگی کی حقیقی غلاظتوں سے بھاگ کر

یہاں پہنچا ہوں۔ انہیں بھولنے کے لیے آیا ہوں۔ یہ رات میری زندگی کے ریگزار میں پھولوں سے لدا ہوا ایک نخلستان ہے۔ مگر تم مجھے گردن سے پکڑ کر اسی گندی دنیا میں گھسیٹ لاتی ہو جس سے بھاگ کر میں یہاں تک آیا ہوں۔ تم میرا ایک قدم بھی اندھیرے سے روشنی کی طرف نہیں بڑھنے دیتی۔ تم کسی چیز کی بھی ہوئی ہو۔ کیا تم آج کی رات مجھ پر رحم نہیں کر سکتی؟“

عورت نے کوئی جواب نہیں دیا۔ باہر ہوا تیز ہو گئی تھی۔ کبھی کبھی کوئی کتا زور سے بھونکتا تو فضاء زیادہ پر اسرار ہو جاتی اور کمرے میں جھلملاتی ہوئی شمع زور سے بھڑک اٹھتی۔ ہوا کے زور سے دروازے زور سے بچتے اور نوجوان گھبرا کر دروازے کی طرف دیکھنے لگتا۔ معلوم ہوتا تھا وہ کسی خطرے سے سخت ڈرا ہوا ہے۔ جیسے ابھی کسی کے ان دروازوں کو توڑ کر اندر داخل ہونے کا خطرہ ہے مگر دوسرے ہی لمحے میں ہوا کے تیز فرائے سنائی دیتے اور نوجوان اطمینان سے سگریٹ کے لمبے لمبے کش لینے لگتا۔

”کیوں؟ کس سے ڈر رہے ہو؟“ عورت نے پوچھا۔

”ہاں میں ڈر رہا ہوں ساری دنیا سے، تم سے، اپنے آپ سے۔ مجھے ہر صدا کے ساتھ یہ خیال تنگ کرتا ہے کہ

ابھی کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔ ابھی کوئی دروازہ توڑ کر اندر داخل ہوگا۔ اور میری خوشی کے یہ چند لمبے بھی چھین لے گا۔“ عورت نے مسکراتے ہوئے اور اپنے داہنے ہاتھ سے نوجوان کے بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے کہا ”ان چھوٹی چھوٹی باتوں سے ڈرتے ہو۔ ابھی تو تم اتنی اونچی باتیں کر رہے تھے اور ابھی تم اس قدر چھوٹی باتوں کے لیے پریشان نظر آتے ہو؟ مجھے تم پر رحم آتا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ نوجوان نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔ ”میں رحم کا طالب ہوں۔ طنز کے تیر برداشت کرنے کے

قابل نہیں ہوں۔ تم اب ٹھیک راستے پر چل رہی ہو۔ تمہیں مجھ پر رحم کرنا چاہیے۔ خدا کے لیے مجھ پر رحم کرو۔ مجھے رحم و کرم کی بھیک دو۔“

”تم کیا کام کرتے ہو؟“

”یہ اس سوال کا حصہ ہے جو میں ابھی تم سے کر چکا ہوں اسے پوچھنے کے بعد تمہیں میرے ساتھ میری زندگی کے

اندھیرے راستوں پر بھٹکنا پڑے گا۔ تم اس خاموش اور آرام دہ کمرے سے نکل کر اور پھولوں کی خوشبو چھوڑ کر ان وادیوں

میں جانے کا مطالبہ کر رہی ہو جہاں کانٹے ہی کانٹے ہیں۔ تم بار بار کوشش کر رہی ہو کہ میں چند لمحوں کی خوشی سے اپنی جھولی

نہ بھر سکوں۔ اگر تمہارا یہی فیصلہ ہے تو مجھے کوئی عذر نہیں مگر ایک بار پھر سوچ لو۔۔۔“

”میں سوچ چکی ہوں تم اپنی بات کہو۔“

”تو سنو! وہ آخری تیس روپے جو میری جیب میں تھے وہ میں نے تمہاری اس رات کی رفاقت کے لیے ادا کر دیے ہیں۔ میں اس وقت ایک بے کار آدمی ہوں۔ میری زندگی اندھیرے گھروں سے شروع ہوئی اور یقین ہے کہ کسی دن ان روشن شاہراہوں پر ختم ہو جائے گی۔“

تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد نوجوان نے پھر کہنا شروع کیا ”مجھے معلوم ہے تیس روپے میں میں نے یہ مہنگا سودا کیا ہے۔ لیکن میں اس آخری بوجھ سے بڑی جلدی پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔ میں نے یہی بہتر سمجھا کہ جو کل ہونے والا ہے وہ آج ہی ہو جائے۔ میرے لیے اب کوئی کام، رزق کمانے کا کوئی راستہ نہیں ہے اور میں اور میرے متعلقین بھوکے ہیں۔ پھر بھی میں نے اپنا سب کچھ لٹا دیا۔ صرف ایک رات کی خوشی کے لیے صرف اس لیے کہ مرنے سے پہلے میں زندگی سے تھوڑا سا حسن تھوڑی سی خوشبوئیں لے کر اپنا دامن بھریوں۔ مگر افسوس ہے کہ یہ امید بھی پوری ہوتی نظر نہیں آتی۔ کیونکہ جس غم سے چھٹکارا پانے کے لیے یہاں تک پہنچا تھا وہ تو پہلے سے بھی بڑھ گیا ہے۔۔۔“

عورت کچھ دیر تک خاموش رہی۔ پھر اس نے کہا ”مجھے افسوس ہے کہ تم نے تیس روپے میرے لیے خرچ کئے۔ حالانکہ آج کل میری قیمت اتنی نہیں رہی۔ اگر یہ رقم میرے پاس ہوتی تو شاید میں تمہیں لوٹا دیتی۔“

”یہ رقم تمہاری نہیں تو اور کس کی ہے؟“

”اس کی جس نے آج کل مجھے اپنی حفاظت میں رکھا ہوا ہے۔“ عورت نے طنز بھرے لہجے میں جواب دیا۔

پھر خاموشی چھا گئی۔ ہوا کے زور سے پھر کھڑکیوں کے بجنے کی صدا آنے لگی۔ نوجوان نے اٹھ کر کھڑکی کھول دی اور آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ آسمان پر کہیں کہیں اکا دکا ستارے ٹمٹارے تھے۔ گرد کی ایک باریک سی تہ پورے آسمان پر محیط تھی۔ کہیں کہیں سے کوئی ستارہ گرد کی اس تہ میں سے جھانک کر نظر ڈالتا اور پھر..... چھپ جاتا۔ کبھی کبھی ہوا کے زور سے کھڑکیوں کے شور کی آواز بلند ہوتی اور ساری فضاء کراہ کر رہ جاتی۔ نوجوان نے کھڑکی میں سے باہر جھانکتے ہوئے کھوئی ہوئی سی آواز میں کہا ”نہیں کچھ بھی نہیں ہے۔ ہر طرف مایوسی اور اداسی ہے۔ ہر طرف موت ہی موت ہے۔ یہ رات جسے میں اپنی اجاڑ زندگی میں ایک روشن ستارہ بنا کر رکھنا چاہتا تھا۔ تیزی سے گزر رہی ہے..... ختم ہو رہی ہے۔ روشنی اور چمک کے بغیر حرکت اور نور کے بغیر اور یہ ہوا کس قدر تیکھی اور کتنی اداس ہے.....“

عورت نے کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے کہا ”تم شاعر ہو؟“

”نہیں!“

”تو پھر تم کیا ہو۔ تم کیا کرتے ہو؟“

”جھک مارتا ہوں۔“

”جھک تو تم اب بھی مار رہے ہو..... مگر اس سے پہلے کہاں رہے؟ کیا کرتے رہے؟ تم کہاں سے آئے؟“

”میں اندھیرے میں پیدا ہوا.....“

”اس زبان میں میری سمجھ میں تمہاری باتیں نہیں آئیں گی۔ مجھے تو عام فہم زبان میں بتاؤ کہ تم کون ہو، تمہارا نام

کیا ہے؟“

”میرا نام کچھ بھی سمجھ لو، مگر صاف صاف لفظوں میں اپنی کہانی بیان کرنے سے پہلے میں تم سے یہ وعدہ لینا چاہتا

ہوں کہ تم بھی۔۔۔“

”ہاں ہاں میں وعدہ کرتی ہوں، میں تو اس بازار کی جنس ہوں جہاں کوئی کام معاوضہ کے بغیر نہیں ہوتا۔۔۔“

”کیا وعدہ کرتی ہو؟“

”جو کچھ بھی تم ہو اور جو کچھ تم مانگو۔ اب تم اپنی بات سناؤ۔“

”میں دس سال سے ایک بازار سے دوسرے بازار میں ایک دروازے سے دوسرے دروازے میں بکتا پھر رہا

ہوں۔ تم یہ نہ سمجھو کہ بکنے کی جنس صرف تم ہی ہو۔ میں بھی تمہاری طرح بکاؤ مال ہوں میں بھی تمہاری طرح سب سے قیمتی

لیکن سب سے کم قیمت جنس ہوں۔ میں ساری عمر آسائشوں کے خواب دیکھتا رہا لیکن ساری عمر سراب.....“

”دیکھو تم پھر فلسفہ اور شعر کی زبان میں گفتگو کر رہے ہو۔ میں اس زبان کو نہیں سمجھ سکتی۔ میرے سامنے تم صاف

صاف باتیں کرو تو اچھا ہے۔۔۔“

نوجوان نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔ ”نہیں میں اتنا نہیں گر سکتا۔ مجھے اس قدر نیچے آنے پر مجبور نہ کرو۔

میں تم سے صاف لفظوں میں آٹے اور نمک اور مرچ کی باتیں نہیں کر سکتا۔ صاف لفظوں میں یہ باتیں انہی چیزوں کی باتیں

ہیں۔ یہ وہی چیزیں ہیں جنہوں نے مجھے عمر بھر اپنے چکر میں باندھ کر رکھا۔ صبح و شام میرے سامنے یہی منزل بن کر آتی

ہیں۔ ان کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں ہے جسے میں اپنی داستان کا عنوان بنا سکوں۔ کم از کم آج کی رات تم جب میرے

سامنے بیٹھی ہو مجھے ان کی کہانی بیان کرنے کے لیے مجبور نہ کرو۔ تم جو دنیا میں شعر و حسن لے کر آتی ہو اور پھولوں اور نغموں

کی دنیا ہو، اپنی موجودگی میں مجھے اپنی یہ داستان سنانے کے لیے مجبور نہ کرو..... نہیں میں اتنا نہیں گر سکتا مجھے اس قدر نیچے

آنے کے لیے مجبور نہ کرو..... آج تو میں تمہارے ساتھ تمہاری زبان میں تمہارے وجود کی نغمگی اور تمہاری سانسوں کے

تعلقی زبان میں بات چیت کرنے کے لیے یہاں آیا ہوں مجھے اسی طرح کہنے دو جیسے.....“

وہ ایک دم اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے تیزی سے بولنے لگا۔ ”تو سنو میں ایک جگہ ملازم تھا۔ یہ جگہ کوئی بھی سمجھ لو، کوئی دفتر کسی اخبار کا یا کسی فرم کا یا کسی دکان کا دفتر تم کہیں بھی سمجھ لو۔ اس لیے کہ ان میں سے کوئی جگہ ایسی نہیں ہے جہاں میں کبھی کبھی رہ نہیں چکا ہوں۔ ہر جگہ مجھے ضمیر بیچنے کے لیے مجبور ہونا پڑا۔ ہر دفتر میں مجھے اپنے ذہن کا سودا کرنے کے لئے کہا گیا۔ کہیں مجھے انسانوں پر لعنت بھیجنے اور جانوروں کے قصیدے لکھنے پڑے تو کہیں پھولوں کو مسلنے اور معصوم روحوں کی قبریں کھودنے کا کام سپرد ہوا۔ میں نے یہ سب کچھ کیا۔ یہ سب کچھ کرتا رہا۔ پھر بھی بھوک میرے سامنے منہ پھاڑے کھڑی ہے۔ بس یہی میری داستان ہے اور یہ بھوک اور بے کاری اور خرید و فروخت کی داستان ہے جس کے بارے میں اس وقت اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہہ سکتا.....“

اپنی بات ختم کر کے نوجوان کرسی پر گر پڑا اس کی گردن ڈھلک گئی اور اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے۔ وہ تیزی سے ہانپتے ہوئے لمبے لمبے سانس لینے لگا۔

باہر سڑک پر ایک کار فرائے بھرتے ہوئے گزر گئی اور اس کی آواز فضاء کے شور میں مل کر اس پر ایک اور نقش چھوڑ گئی۔ کھڑکیاں بجنے اور ہوا کے زور سے دروازوں کے شور کی صدا ایک بار پھر بڑھ گئی۔ مگر ان آوازوں سے ان کے کمرے کی اداسی اور غمگینی اور اس کی فضاء اور بھی زیادہ بوجھل ہو گئی۔

اس طرح خزاں کی اس اداس رات کا گیت سنتے یہ نوجوان عمر دور عورت بہت دیر تک اس خاموش کمرے میں بیٹھے رہے۔ نوجوان ٹکٹکی باندھے چھت کو مسلسل گھورے جا رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ ماتھے پر سے پسینہ پونچھتا اور آنکھوں سے عورت کی طرف دیکھتا اور عورت کو اپنی طرف دیکھتے ہوئے پاتا تو گھبرا کر اور محبوب ہو کر نظریں جھکا لیتا۔

عورت بھی کافی دیر کرسی پر خاموش بیٹھی رہی۔ وہ دیکھنے میں بری نہیں تھی۔ اس کے نقش تیکھے اور پلکیں دراز تھیں اور اس کی لمبی زلفیں اس کے چہرے کا احاطہ کئے ہوئے لہرا رہی تھیں۔ اس کے ہونٹ بھی پتلے تھے مگر اس کے چہرے پر وہ شادابی اور چمک کہیں نہیں تھی جو کیشیم کے ذروں سے پیدا ہوتی ہے اور ان کے نہ ہونے سے فنا ہو جاتی ہے۔ اسے غور سے دیکھنے پر یہ محسوس ہوتا تھا گویا کھیت میں سے ابھی کوئی فصل کاٹ کر لے گیا ہے۔ مگر اس کا ہاتھن اب بھی باقی ہے۔

تھوڑی دیر کی اس گراں بار خاموشی کے بعد وہ کرسی سے اٹھی اور اس نے اپنا دوپٹہ اتار کر کرسی کی پشت پر رکھ دیا پھر وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کونے میں پچھی ہوئی چار پائی پر جا کر دراز ہو گئی۔

”میں تھک گئی ہوں میں اب کافی دیر جم کر بیٹھ نہیں سکتی امید ہے تم مجھے کرسی پر بیٹھے رہنے کے لیے مجبور نہیں کرو“

گے اور اب تورات بھی کافی گزر چکی ہے“ اس نے کہا۔

”ہاں اب تورات کافی گزر چکی ہے۔“ نوجوان نے صرف اتنا کہا۔ وہ اس طرح بول رہا تھا جیسے اپنے آپ سے بمصروف گفتگو ہو۔

”تو تم نہیں لیٹو گے؟“ عورت نے پوچھا۔

”نہیں ابھی نہیں“ کہتے ہوئے وہ کرسی گھیٹ کر چار پائی کے قریب لے آیا اور ٹکٹکی باندھ کر عورت کو دیکھنے لگا۔ عورت نے کروٹ بدل کر منہ نوجوان کی طرف پھیر لیا۔ اس کی زلفیں ایک بار پھر پھیلیں۔ اس کی پلکیں ایک بار ذرا کپکپائیں۔ پھر اس نے اپنے آپ کو اس طرح قابو میں کر لیا کہ اس کا چہرہ پھر صاف اور واضح نظر آنے لگا۔ اس کے چہرے کے خطوط زیادہ روشن اور مانوس نظر آنے لگے۔ اس نے تکیے پر اپنا سر رکھ دیا اور وہ اپنی آنکھیں کبھی بند کرنے اور کبھی کھولنے لگی۔ کبھی کبھی وہ آنکھیں بند کر کے لمبے لمبے سانس لینے لگتی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا وہ بار بار اپنی کسی اندرونی گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کر رہی ہے۔

”تم مجھے اس طرح کیوں گھور رہے ہو؟ تم کیا تلاش کر رہے معلوم ہوتا ہے تم نے کچھ کھو دیا ہے۔۔۔“

نوجوان نے لیٹی ہوئی عورت کی تھوڑی کو پکڑ لیا اور اس پر جھکتے ہوئے بولا ”یہ تم ہی ہو جو گم ہو چکی ہو۔ میں تمہارے سامنے بیٹھا تمہیں ہی تلاش کر رہا ہوں۔ لیکن تم مجھ ہی سے برگشتہ ہو۔ مجھی پروا کر رہی ہو۔ میں تم کو اور تمہارے ماضی کو ڈھونڈ رہا ہوں۔“

عورت تڑپ کر اٹھ بیٹھی۔ اس نے کہا ”میں نے تم پر کبھی کوئی وار نہیں کیا۔ میں جب بھی تم پر کوئی وار کرتی ہوں تو دراصل اپنے آپ پر حملہ کرتی ہوں۔ تم تو مجھ پر اتنا بڑا الزام نہ لگاؤ۔۔۔“

”تم نے مجھے اپنا اصلی نام اب تک نہیں بتایا۔ تمہیں میں کس نام سے پکاروں۔ گلزار! یہ نام جو تم نے مجھے بتایا ہے اس نام سے تمہیں پکارتے ہوئے مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا میں اپنے آپ سے جو اکھیل رہا ہوں۔ جھوٹ بول رہا ہوں۔ اپنے آپ کو دھوکا دے رہا ہوں۔“

”میرا اصلی نام مجھ سے نہ پوچھو تو بہتر ہے۔ وہ نام جسے اس بھری دنیا میں میری نانی ماں سب سے پہلے اپنے ہون پر لاتی تھی، جسے ہونٹوں پر رکھ کر ملانے میرے کانوں میں کلمہ پڑھا تھا اسے اب میں اپنی زبان پر لاتے ہوئے ڈرتی ہوں۔ جس نام سے ایک عمر تک میرے بھائیوں نے مجھے مخاطب کیا اور جسے ہونٹوں پر لا کر میرا مرحوم باپ مجھے اپنی آغوش میں لیے بیٹھا رہتا تھا اور دن رات ہر موسم میں ہر فصل میں جو میرے نام اس گھر کے آنگن میں اچھلتا تھا وہ اب میں اپنی

زبان پر نہیں لاسکتی۔ اسی نام سے میری کنواری سہیلیاں مجھے پکارتی تھیں۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کمرے میں یہاں بیٹھ کر اگر میں اصلی نام کو اپنے لبوں پر لائی تو یہ مجھے ڈس لے گا.....“

عورت یہ کہتے ہوئے رونے لگی۔ اس کی لمبی بوجھل پلکوں پر کئی ستارے جھلملائے۔ اس نے جب پلو سے اپنی آنکھیں صاف کیں تو یہ آنکھیں جیسے سوتے سوتے ایک دم بیدار ہو گئیں۔ اور ساری دل کشی اور ساری رعنائی اور ساری معصومیت جاگ اٹھی۔ نوجوان کو یوں معلوم ہوا گویا لو سے جھلسی ہوئی کلی کو شبنم سیراب کر گئی ہے۔ اس نے اپنے ہاتھوں کی انگلیوں سے عورت کی آنکھیں چھپاتے ہوئے کہا ”تمہاری آنکھیں بڑی سفاک ہیں یہ تو مجھے جلائے ڈال رہی ہیں۔ ان آنکھوں میں میری اور تمہاری تاریخ کے کتنے ورق پڑے ہیں۔ یہ آنکھیں مجھ سے نہیں دیکھی جاتیں۔ میری زندگی کی ابتداء بھی ایسی ہی آنکھوں سے ہوئی تھی مگر وہ جانے اب کہاں ہیں؟“

عورت نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا ”تم بھی یہی کہتے ہو۔ وہ بھی یہی کہتا تھا کشور! ان آنکھوں کا جانسوز حسن مجھے کسی دن جلا ڈالے گا۔ وہ بھی اسی طرح میری آنکھوں کی بند کر دیتا تھا اور میرے سامنے اسی طرح بیٹھا رہتا تھا۔۔۔ مگر چھوڑو میں کون سے قصے لے بیٹھی ہوں۔“

”نہیں نہیں کشور! مجھے بتاؤ مجھے اس کے متعلق کچھ اور بتاؤ۔ پھر کیا ہوا؟“

”پھر یہ ہوا کہ میں گم ہو گئی میں گم کر دی گئی اور خاک و خون کے ایک طوفان میں انہوں نے مجھے لوٹ کر مار ڈالا۔ کشور کو مار کر ایک دن انہوں نے نسیم اور گلزار اور شمیم جانے کتنے ناموں سے مجھے جنم دیا۔ لیکن کشور کے مرنے کے ساتھ ساتھ وہ بھی مر گیا۔ اس روز ہمارے گھر ہمارے محلے، شہر اور ہماری دنیا میں آگ ہی آگ، خون ہی خون تھا۔ وہ مجھے بچانے کے لیے بھاگا آ رہا تھا مگر بچانے والا خود ہی مارا گیا۔ پھر میری ماں، میرے بہنیں، میرا بھائی باپ سب مر گئے۔ میرا گھر اور میری دنیا مر گئی اور اب کچھ بھی باقی نہیں ہے۔ صرف گلزار باقی ہے جو ایک جنس ہے۔ جس نے مجھے اپنی کوکھ سے جنم دیا تھا اسی نے مجھے مار ڈالا۔ شاید میرا کوئی اب بھی باقی ہو کہیں اس دنیا کے کسی کونے میں موجود ہو مگر مجھے ان کی صورتیں، ان کی باتیں، ان کا گھر اپنا گھر کچھ بھی یاد نہیں ہے۔ کبھی کبھی تنہائی میں مجھے ان کی آوازیں سنائی دیتی ہیں تو میرے ذہن میں کتنی ہی گھنٹیاں بج اٹھتی ہیں۔ کتنے ہی شگوفے کھل جاتے ہیں۔ جس طرح وہ میرا نام لیتے تھے اس طرح اب مجھے پکارنے والا کوئی نہیں ہے۔ وہ شیرینی وہ رس اور وہ پیار مر گیا۔ دنیا میں اس کا وجود کہیں پر نہیں ہے۔ میں یہی سوچتی رہتی ہوں۔ اب میں کیا کروں؟“

عورت خاموش ہوئی تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی لیکن نوجوان ایک سگریٹ سلگا کر خاموشی سے بیٹھا رہا۔

کے ایک تیز جھونکے سے شمع بڑے زور سے جھلملائی مگر پھر اپنی اصلی حالت پر آگئی اور چپ چاپ جلنے لگی۔ باہر ہوا تھم گئی تھی اور رات کی خاموشی آواز بنتی جا رہی تھی۔ عورت نے کچھ دیر کے بعد پھر کہا ”اس کے علاوہ مجھے اپنے بارے میں کچھ بھی یاد نہیں ہے۔ اپنے بارے میں اس سے زیادہ میں کچھ بھی نہیں بتا سکتی۔ چار سال سے یا پانچ سال سے یا پانچ سو اور پانچ ہزار سال سے جانے کب سے اسی طرح کن کن ہاتھوں میں سے گزر رہی ہوں۔ مجھے کچھ یاد نہیں ہے کہ میں کن کن گھروں میں گئی ہوں کیوں گئی میں کس دنیا میں سے گزری ہوں اور کس جہان میں سے گزر رہی ہوں۔ تم مجھے اپنے سامنے بٹھا کر مجھی کو تلاش کر رہے ہو۔ حالانکہ میں خود جنم جنم سے اپنے آپ کو تلاش کر رہی ہوں سہاگ کے اس جوڑے کو تلاش کر رہی ہوں جو ایک بکس میں پڑا پڑا جل کر راکھ ہو گیا۔ مہندی کی ان پتیوں کو ڈھونڈ رہی ہوں جو ان ہاتھوں کے لیے پیدا کی گئی تھیں مگر جو جنگل کی آگ میں جل کر راکھ بن گئیں۔ تم مجھے بھلا کیسے تلاش کر سکو گے؟ پہلے خود مجھے اپنے آپ کو ڈھونڈ لینے دو۔“

بات کرتے کرتے اس کی ہچکی بندھ گئی اور وہ دیر تک اسی طرح روتی رہی۔ اس کے رونے میں برابر اضافہ ہوتا گیا۔ اس کی آنکھیں سوچ گئیں اور اس کے چہرے پر نیلی رگیں ابھر آئیں۔ نو جوان کو یوں معلوم ہوا گویا یہ عورت ہمیشہ سے رورہی ہے اور ہمیشہ روتی رہے گی کبھی چپ نہ ہوگی۔۔۔۔۔ وہ کچھ دیر تک بے حس و حرکت بیٹھا خوفزدہ نظروں سے اسے دیکھتا رہا لیکن جب عورت کی آنکھیں اس کے آنسوؤں سے دھل کر ایک بار پھر شاداب ہو گئیں اور جب اس کی دراز زلفیں ایک بار پھر کپکپائیں تو نو جوان نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لیتے ہوئے کہا۔

”بس اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں کو یاد کر کے تم نے رونا شروع کر دیا۔ ابھی تو تم اتنی اونچی باتیں کر رہی تھی اور اب محض پرانی یادوں کے مدفن سے ایک ذرا سا پردہ ہٹا کر رونے پر تل گئی ہو۔ تمہاری یہی کمزوری تو ہمیشہ تمہیں تکلیف پہنچاتی ہے۔ تمہاری وہ سخت گیری کیا ہوئی جسے لے کر تم اس کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ کاش تم نے کبھی اپنے آپ کو اپنی طاقت کو اور قوت کو سمجھ لیا ہوتا۔ اس طاقت اور عظمت اور قوت سے تم کبھی تخت طاؤس پر بیٹھتی ہو تو کبھی نیل کے پانیوں پر حکمرانی کرتی ہو۔ کبھی فرانس کے میدانوں میں بڑے بڑے سپہ سالاروں کو سرنگوں کرتی ہو تو کبھی افریقہ کے جنگلوں میں اپنی حکمرانی کے سکے چلاتی ہو۔ پھر دیکھتے دیکھتے تم بابل کے بازاروں میں رسوا نظر آتی ہو۔ ہانگ کانگ کی بین الاقوامی شاہراہوں اور ہائیڈ پارک میں بجلی کے کھمبوں کے ساتھ کھڑی ہو جاتی ہو۔ تم اپنے ہی دام میں بار بار پھنس جاتی ہو۔ وہ تمہیں کبھی بن باس دیتے ہیں تو کبھی رومتہ الکبریٰ میں چاندی کے چند سکوں کے لیے نیلام کر دیتے ہیں۔ مگر تم پھر بھی وہی ہو۔ تم پر اتنے گہرے گھاؤ اور اتنے زخموں کا صرف اتنا اثر ہوتا ہے کہ تمہاری آنکھوں کے آنسوؤں کی روانی بڑھ جاتی ہے۔۔۔۔۔“

”خدا کے لیے چپ رہو! مجھ میں تمہارے یہ واسپہنے کی طاقت باقی نہیں ہے۔ خدا کے لیے چپ رہو۔ کسی طرح اپنی زبان بند رکھو۔“

”میں تمہارا حکم ماننے کے لیے تیار ہوں، لیکن تم رو کیوں رہی ہو؟ مجھے صرف اتنا بتا دو کہ ابھی جو تم اس قدر سخت دل، ظالم اور پتھر کی بنی ہوئی نظر آرہی تھیں وہ کیا بات تھی اور اب جو تم ہوا کی طرح نرم اور ندی کی طرح رواں ہو، اور جو تم بیٹھی بیٹھی اس طرح پکھل رہی ہو تو یہ کیا بات ہے۔ تم کب تک اپنے آپ کو تلاش کرتی رہو گی! اب ڈھونڈ بھی چکو۔“

عورت پھرتیکے پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔ باہر ہوا اب بالکل تھم گئی تھی۔ نوجوان نے اٹھ کر کھڑکی کھول دی اور آسمان پر نظر جما کر باہر دیکھنے لگا۔ آسمان اب صاف ہو چلا تھا۔ ستارے پہلے سے زیادہ روشن نظر آ رہے تھے۔ مگر رات چپ چاپ گزر رہی تھی قدم بڑھائے جا رہی تھی۔



علاج

گھر بھر میں کہرام مچا ہوا تھا۔

نوکر نوکرانیاں اور گھر کے لوگ سبھی ادھر ادھر بھاگ رہے تھے، بہو کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں، دن کے گیارہ بجے کا وقت تھا مگر یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے دلہن کو کچی نیند سے اٹھا دیا گیا ہو۔ وہ چوبیس پچیس برس کی دراز قد، متناسب جسم اور غلامی آنکھوں والی خوش شکل خاتون تھی۔

لاؤنج میں مڑے ہوئے کھلونے، پھٹے ہوئے رسالے، اخبارات اور چھوٹے بڑے کپڑے بے ترتیبی سے بکھرے پڑے تھے۔ آغا فرید بڑی بے بسی سے بیوی کی طرف دیکھ رہے تھے، چار سال کی گڑیا سی بچی ایک کونے میں بیٹھی رو رہی تھی، ماں اور باپ دونوں اسے گود میں لینے کی کوشش میں ناکام ہو چکے تھے۔

”بچوں کے تمام ڈاکٹر تین چار روز بعد کا وقت دے رہے ہیں، ایسی ایمر جنسی کے لیے کسی کمبخت کے پاس وقت نہیں ہے، لعنت ہو ان پر۔۔۔ آغا فرید نے جھنجھلاتے ہوئے کہا۔ بہو کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے ”سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں، ہر ممکن کوشش کر چکی ہوں مگر اس کا چڑچڑاپن کم ہونے کی بجائے روز بروز بڑھ ہی رہا ہے۔“

بوڑھی آیا جواب تک دم سادھے دروازے میں کھڑی تھی بات چیت میں شامل ہو گئی۔ ”بی بی جی میں تو آپ کو جگانا نہیں چاہتی تھی مگر گڑیا نے آج تو بہت ہی ہنگامہ کر دیا برتن توڑ ڈالے اور زور زور سے رونے لگی تو مجھے بیگم صاحبہ کے خیال سے آپ کو جگانا ہی پڑا۔“

بڑی بیگم، بیگم درانی آغا فرید کی والدہ تھیں، ہائی بلڈ پریشر اور شوگر کی مریضہ تھیں۔ وہ اوپر کے کمرے میں رہتی تھیں اور ان کی راتیں بالعموم جاگتے ہی گزرتیں البتہ صبح سویرے وہ دو تین گھنٹے سوتی تھیں، اس لیے گھر میں نوکروں، بچوں پڑوسیوں حتیٰ کہ ملنے جلنے والوں تک کو ہدایت تھی کہ صبح کے وقت کسی قسم کا شور نہ ہو۔

دلہن نے ایک دفعہ پھر بچی کو گود میں اٹھانے کی کوشش کی۔ وہ اپنی جگہ سے ہلی تک نہیں بلکہ ماں کی کوشش کے جواب میں اس نے ڈھول بجاتے ہوئے بھالو کو دیوار میں زور سے مارا اور زور سے چلانے لگی، آغا فرید کی ہمت ہوئی تو وہ

دو قدم بچی کی طرف بڑھے مگر وہیں رک گئے۔

”میرا خیال ہے ہمیں واپس اپنے پرانے مکان میں چلے جانا چاہیے ورنہ یہ بچی اپنے آپ کو مار ڈالے گی، تین ہفتے ہو گئے ہیں مگر اس نے ابھی اس مکان کو اپنی رہائش گاہ کے طور پر قبول نہیں کیا۔ ہر وقت روتی رہتی ہے۔ کسی کا کہنا نہیں مانتی، کس کی نہیں سنتی، اس طرح یہی نہیں ہم سب ہلکان ہو جائیں گے۔“ بیگم فرید نے شوہر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

آغا فرید ایک دم چونک پڑے، ریسیور اٹھا کر ایک نمبر ملایا اور محکمہ صحت کے ایک بڑے افسر سے یوں مخاطب ہوئے ”ارے بھائی کیا بتاؤں، ہماری بچی کسی بیماری میں مبتلا ہو گئی ہے، چند روز سے ہمارا آرام و سکون غارت ہو گیا ہے۔ اب تک اس کی معمولی ضد سمجھ کر برداشت کرتے رہے مگر آج صبح تو اس نے اپنے تمام کھلونے توڑ دیئے۔ دو گھنٹے سے مسلسل روئے جا رہی ہے۔ کسی بات کا جواب نہیں دیتی، کسی کا کہنا نہیں مانتی، دو تین معروف چائلڈ سپیشلسٹوں سے وقت لینے کی کوشش کی مگر سبھی تین چار روز بعد کا وقت دے رہے ہیں، آپ ہی کچھ کیجئے کوشش کر کے آج شام تک وقت لے دیجئے۔“

اس لمبی داستان کے جواب میں ادھر سے جو کچھ کہا گیا وہ کسی کو سنائی نہیں دیا۔ البتہ کچھ دیر بعد ریسیور کو چونگے پر رکھتے ہوئے آغا فرید نے اعلان کیا ”علی حسن نے آج ہی ڈاکٹر سے وقت لے دینے کا وعدہ کیا ہے، فکر نہ کرو شام تک کچھ ہو جائے گا۔“

آغا فرید کی بات اس کی بیوی نے نہیں سنی۔ وہ بچوں کی پرورش اور نگہداشت پر ایک موٹی سی کتاب کھول کر پڑھ رہی تھی۔ ایک خاص صفحہ تلاش کرنے اور اس کو غور سے پڑھنے کے بعد وہ اٹھ کر شوہر کے پاس گئی دیکھو اس نے بھی یہی لکھا ہے۔ بعض اوقات بچے جگہ کی تبدیلی کو قبول نہیں کرتے، چڑچڑے ہو جاتے ہیں، توڑ پھوڑ کرتے ہیں اور کسی کی نہیں سنتے۔“

”بڑی مشکل میں پھنس گئے ہیں۔ آغا فرید نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا ”ہم نے کتنے ارمانوں سے یہ مکان بنایا تھا، کتنے ماہ یہاں شفٹ ہونے کا انتظار کیا مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بچی کی صحت اور بہتری کے لیے اس کو چھوڑ کر واپس پرانے مکان ہی میں جانا ہوگا۔“

ماں نے ایک دفعہ پھر اٹھ کر بچی کو گود میں لینے کی کوشش کی، اس دفعہ وہ آرام سے گود میں بیٹھ گئی مگر زیادہ زور سے رونا شروع کر دیا۔ ماں بھی ساتھ ہی رونے لگی۔ ان دونوں کو دیکھ کر آغا فرید کا دل بھر آیا۔ وہ آنسو پیتے ہوئے لاؤنج سے اٹھ کر بیڈ روم میں چلے گئے اور سیدھے باتھ روم میں گھس گئے۔

بچی کے رونے کی آواز بلند تر ہوتی گئی۔ اس کو چپ کرانے کی کوشش کی گئی تو وہ اور بھر گئی اور ماں کی گود سے اتر کر ٹوٹے کھلونوں کو اٹھا کر دیواروں اور درازوں میں مارنے لگی۔

شور بڑھتا گیا۔ نوکر دم سادھے کھڑے تھے۔ اوپر کی منزل سے دروازہ کھلنے کی آواز آئی تو نوکروں کے رنگ فق ہو گئے۔ وہ دہشت زدہ ہو کر اوپر سیڑھیوں کی طرف دیکھنے لگے۔ بہو کے چہرے پر بھی اضطراب کی لکیریں کھینچ گئیں۔ اس نے بچی کے منہ پر ہاتھ رکھنے کی کوشش کی جس کے جواب میں اس نے زیادہ زور سے دھاڑنا شروع کر دیا۔ آغا فرید بھاگتے ہوئے بیڈروم سے لاؤنج میں آگئے اور اس سارے منظر کو بے بسی کی تصویر بنے دیکھنے لگے۔

بیگم درانی نے تلو قدموں سے سیڑھیاں اتر رہی تھیں، وہ تقریباً پچپن برس کی، بھاری بھر کم اور شکل سے انتہائی معتبر نظر آنے والی خاتون تھیں۔ ان کے سر کے بال ابھی سیاہ تھے مگر کنپٹیوں پر کچھ سفید بال چاندی کے تاروں کی طرح لہرا رہے تھے۔ وہ پوری سنجیدگی اور رعب کے ساتھ لاؤنج میں داخل ہوئیں۔

”امی جان! میرا خیال ہے ہمیں واپس پرانے مکان میں جانا پڑے گا۔“ آغا فرید نے تقریباً بھرائی ہوئی آواز میں کہا ”گڑیا نے ہمارے اس مکان میں منتقل ہونے کی تبدیلی کو تسلیم نہیں کیا۔“

”ہوں۔“ بیگم درانی نے کچھ سوچتے ہوئے آیا کو اپنے پاس بلایا ”گڑیا آج صبح کتنے بجے اٹھی تھی؟“ انہوں نے

پوچھا۔

”قریب ساڑھے سات بجے“ آیا نے جواب دیا۔ ”گھنٹہ بھر تو کھلونوں سے کھیلتی رہی، اس کے بعد رونے لگی۔“

کھلونے پھینک دیئے، جو چیز ہاتھ میں آئی توڑ ڈالی اور۔“

”اس نے دودھ پیا؟“ بیگم درانی نے بہو سے پوچھا۔

بہو نے آیا کی طرف، آیا نے بیرے کی طرف اور بیرے نے باورچی کی طرف دیکھا اور پھر سبھی بیک زبان بول

پڑے۔ ”نہیں بیگم صاحبہ۔ دودھ تو اس نے مانگا ہی نہیں۔“

”جاؤ اس کے لیے دودھ کا گلاس لاؤ۔“

دودھ آیا تو دادی نے پچکار کر چھوٹی گود میں اٹھالیا۔ تھوڑی سی مدافعت کے بعد بچی نے دودھ پی لیا۔

اس کے بعد وہ گود سے اتر گئی اور ٹوٹے ہوئے کھلونوں کو جوڑنے لگی، پھر وہ دن بھر ان سے کھیلتی رہی۔



مرزا دبیر الحسن کیسے مرے

جنازہ بہت بڑا تھا۔

مروجہ سماجی معیار کے مطابق مرزا دبیر الحسن نہ تو ملک گیر شخصیت کی حیثیت رکھتے اور نہ ہی مال و دولت کے لحاظ سے کسی بلند مرتبے کے مالک تھے ان کی کوئی جائیداد بھی نہ تھی، چالیس برس سے وہ اسی مکان میں رہائش پذیر تھے جس میں 1947ء میں روہیل کھنڈ سے ہجرت کے بعد لاہور میں آکر آباد ہوئے تھے جس جگہ ہجرت کے بعد مرزا نے قیام کیا، تقسیم سے پہلے وہ ہندوؤں کا محلہ تھا، قیام پاکستان کے بعد اس میں مشرقی پنجاب، یوپی، دہلی، بہار اور ہندوستان کے مختلف حصوں سے آنے والے مہاجر آکر بس گئے تھے۔ اس زمانے میں یہ کشادہ سڑکوں اور کھلی گلیوں کا محلہ تھا مگر مرزا صاحب کی وفات کے وقت تک یہ شہر کی گنجان ترین آبادیوں میں شمار ہونے لگا تھا۔ خالق حقیقی کے پاس جانے سے پہلے مرزا نے زندگی کی چالیس بہاریں اسی محلے میں گزاریں۔ ایک ہندو دیوتا کے نام پر آباد اس محلے کا اسلامی نام انہی کی کوششوں کا مرہون منت تھا۔

مرزا دبیر الحسن ایک محبت وطن، دیانتدار اور دردمند انسان تھے۔ میں دس بارہ برس ان کے پڑوس میں روچکا تھا۔ اس کے بعد اگرچہ میں کاروبار کے نام پر زمانے کے مروجہ طریقوں پر عمل کر کے ترقی کرتا ہوا شہر کے امیر ترین علاقے میں منتقل ہو گیا تھا مگر ہماری دوستی آخر وقت تک برقرار رہی۔ نقل مکانی کے ابتدائی زمانے میں مہینے میں دو ایک بار میں ان سے ملنے چلا جاتا اور ایک آدھ بار وہ اپنی کھٹارہ کار میں مجھ سے ملنے ضرور آتے۔ پھر ایسی ملاقاتوں کا درمیانی عرصہ بڑھنے لگا مگر ہمارا رابطہ قائم رہا۔ مرزا اپنے علاقے میں بہت مقبول اور ہر دل عزیز تھے۔ یہی وجہ تھی کہ مرزا کے معروف معنی میں بڑا آدمی نہ ہونے کے باوجود مجھے ان کے جنازے میں اتنے بہت سے لوگوں کی شمولیت پر حیرت نہیں ہوئی۔ وہ اپنی نیک نفسی اور دیانتداری کی وجہ سے اپنے محلے میں ہی نہیں آس پاس کے علاقوں میں بھی معروف تھے۔

کلمہ شہادت کی ہر پکار پر شہدان لا الہ کا ورد کرتے ہوئے اور قبرستان کی طرف جاتے ہوئے میرے سامنے ان کی پوری زندگی کی جیسے فلم چل رہی تھی۔ مرزا تحریک پاکستان کے پر جوش کارکن تھے اور روہیل کھنڈ کی سنگلاخ سرزمین پر

انہوں نے پاکستان کے مطالبے کے حق میں دیوانہ وار کام کیا تھا۔ ان کے علاقے میں تحریک پاکستان نے کبھی زور نہیں پکڑا تھا۔ یہاں کے مسلمان عوام نے اس مقصد کے حصول کے لئے اس طرح کام نہیں کیا تھا جس طرح ہندوستان کے بعض دوسرے حصوں میں، مگر مرزا نے بی اے کے آخری سال میں تعلیم چھوڑ کر جدوجہد کی راہ اختیار کی اور جب دنیا کے نقشے پر ایک نیا مسلم ملک ظاہر ہوا تو انہوں نے دارالحرب سے دارالامن کی طرف ہجرت کا اعلان کر دیا۔ ان کے اہل خاندان، دوستوں، عزیزوں، ہمدردوں سبھی نے انہیں اس سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ ان کو سینکڑوں ایکڑ میں پھیلی ہوئی وسیع خاندانی جاگیر کی طرف متوجہ کیا۔ ان کی سپاہیانہ خاندانی تاریخ کے واسطے دیئے مگر وہ یہ سب کچھ اور بہن بھائیوں کو چھوڑ کر پاکستان آ گئے۔ انہوں نے چلتے وقت جاگیر بھی اپنے حصے کی بھائیوں اور بہنوں کے نام وقف کرنے کا اعلان کیا اور چلے آئے۔ پاکستان میں اپنے دوستوں کے اصرار کے باوجود کلیم داخل نہیں کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ اپنا سب کچھ اپنے بھائیوں اور بہنوں کو دے آئے ہیں اب اس کے عوض وہ یہاں زمیں جائیداد کا مطالبہ کیسے کر سکتے ہیں۔ البتہ رہائشی مکان پر وہ اپنا حق تصور کرتے تھے۔ پاکستان آنے کے بعد وہ لاہور کے ایک معمولی سے محلے کے چھوٹے سے مکان میں آباد ہو گئے۔ یہیں انہوں نے متوسط درجے کے شریف پنجابی گھرانے میں شادی کی، یہیں بساطی کی دکان کھولی اور چالیس برس اسی محلے میں گزار دیئے۔

اس زمانے میں ہم پڑوسی تھے مگر مرزا کے جوہر مجھ پر آہستہ آہستہ کھلے، ابتداء میں ملک سے ان کی مجنونانہ وابستگی نے مجھے کافی پریشان بھی کیا میں ان دنوں اس نئے ملک میں اپنا خراج وصول کرنے کے لیے دوسرے دوستوں اور آس پاس بسنے والے سبھی لوگوں کی طرح نئی دنیاؤں کی تلاش میں تھا۔ رشوت، الاٹمنٹ اور اشیائے ضرورت کی کمی کی وجہ سے بلیک مارکیٹنگ اس زمانے میں مروجہ قانون بن چکے تھے اور ہر آدمی دولت لوٹنے کی دھن میں لگا ہوا تھا۔ مرزا نہ صرف اپنے چھوٹے سے مکان میں اور بساطی کی دکان پر قانع تھے بلکہ میرے جیسے لوگوں کا ہاتھ بھی روکتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہم نے ملک اسلام کے نام پر بنایا ہے اور اسلام اپنی ضرورت سے زیادہ مال رکھنے کی اجازت نہیں دیتا۔ وہ کہتے یہ لوگ مال و دولت کے پیچھے کیوں بھاگ رہے ہیں، ہمیں تو اس ملک کو بنانا ہے، یہاں اسلامی نظام رائج کرنا ہے، عدل و انصاف کی ان داستانوں کی دہرانا ہے جن سے ہماری تاریخ کے اوراق بھرے پڑے ہیں۔ مرزا کی یہ باتیں مجھ سمیت کسی نے نہیں سنیں مگر ان کی نیکیوں اور خلوص کی وجہ سے لوگ ان کے گرویدہ ضرور ہو گئے۔ وہ آس پاس گلی محلہ میں ہر کسی کی مشکل میں کام آتے، شادی بیاہ، مرگ، بیماری، غرضیکہ ہر موقع پر لوگ ان سے مدد طلب کرتے اور مرزا رات دن کسی بھی وقت حاضر رہتے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی شہرت اپنی گلی سے محلے اور محلے سے آگے شہر کے بعض دوسرے علاقوں تک پھیل گئی۔ وہ لوگوں

کے دلوں پر حکمرانی کرتے تھے اور ان کو دیکھ کر لوگوں کے سر عزت اور احترام سے جھک جاتے تھے۔

مرزا دبیر الحسن کو لاہور بہت پسند تھا۔ کہتے ”یار آغا شہر ہو تو ایسا، یہاں کے لوگ کھلے دل کے مالک ہیں، کھل کر ہنستے ہیں، ٹھونس کر کھاتے ہیں، صبح ہی سے سری پائے نوش کرنا شروع کر دیتے ہیں اس سے فارغ ہوتے ہیں تو دوپہر کے کھانے کی فکر کرتے ہیں اور وہیں سے رات کے کھانے کی طلب شروع ہو جاتی ہے۔“ بعد میں مرزا نے بھی لاہوریوں کے یہی طور طریقے اپنائے، ان کے آٹھ بچے ہوئے۔ ابتدائی دور میں جب ان کے پہلے تین بچے چار سے آٹھ سال کی عمر میں تھے تو مرزا انہیں سائیکل پر بٹھا کر ناشتہ کرانے لے جاتے، حلوہ پوری، دہی لسی، سری پائے جو کچھ سامنے آتا بچوں کے پیٹ میں ٹھونستے رہتے۔ گھر میں بھی دیسی گھی اور بھنے گوشت کی ہمیشہ فراوانی رہی۔ میں نے انہیں کئی دفعہ اس اسراف سے روکنے کی کوشش کی مگر وہ کہتے ”میں پاکستان کے لیے تندرست اور توانا نسل تیار کر رہا ہوں۔“

یہ تندرست اور توانا نسل تو گویا ان کی کمزوری بن گئی تھی۔ وہ خود تو خوش خوراک تھے مگر ان کا زیادہ وقت بچوں کو کھلانے، ان کے لیے طرح طرح کی غذاؤں کی اہتمام کرنے اور انہیں ورزش کرانے میں صرف ہوتا۔ زندگی کے بیس پچیس سال انہوں نے اس طرح گزارے جیسے کسی مشن کی تکمیل میں لگے ہوئے ہیں۔ اس زمانے میں جب شہر میں جعلی اشیاء کا جنہیں دکان دار نمبر ٹو کا نام دیتے تھے رواج عام ہوا اور مرزا کے آس پاس کے دکاندار نعلی مال بیچ بیچ کر لوگوں کو لوٹتے اور خوش حال سے خوش حال تر ہوتے گئے مرزا ابالی مشکلات میں گھر گئے کیونکہ انہوں نے جعلی مال کو اصلی مال کے نام پر فروخت کرنے اور خریدنے سے انکار کر دیا تھا۔ لوگ ان کے پاس سمبھت سی تجویزیں لے کر آتے رہے۔ میرے سمیت ان کے اکثر دوستوں نے ان کے آس پاس پھیلی ہوئی خوش حالی کی طرف ان کی توجہ دلائی مگر وہ برابر انکار کرتے رہے۔ ان کا کہنا تھا میں خلق خدا سے دھوکہ نہیں کر سکتا، میرے خدا نے مجھے یہ وطن دیا، میرا مذہب میرے خدا کا عطیہ ہے میں اپنے وطن اور اپنے ایمان سے دھوکہ نہیں کر سکتا۔ ان کے دوستوں نے انہیں سمجھانے بھجانے کی بہت کوشش کی اور بہتی گنگا میں چھلانگ لگانے کی لاکھ ترغیبات دیں مگر وہ اپنے فیصلے پر ڈٹے رہے۔ ان کے دو ہی شوق تھے، بچوں کے لیے انواع و اقسام کے کھانوں کا اہتمام کرنا، ان کی جسمانی صحت بحال رکھنے پر اصرار کرنا اور مطالعہ کرنا۔ مرزا بے پناہ مطالعہ کرتے تھے دیکھنے والوں کو ان کی ان دو متضاد معروضیوں پر اکثر حیرت ہوتی۔ وہ کھانے میں لاہوری پہلوانوں اور حصول مطالعہ میں بڑے بڑے دانشوروں کو مات کرتے تھے۔ ابتدائی پانچ سات سال ان کے محلے میں لوگ ان کی بیٹھک میں آکر بڑے شوق اور انہماک سے ان کی علمی باتیں سنتے۔ مرزا کے اپنے قہل کے مطابق علم کی اس ترسیل میں انہیں خود بھی بہت مزا آتا مگر جوں جوں وقت گزرتا گیا، شہر بڑھتا اور پھیلتا گیا، کاروبار فروغ پاتے رہے۔ پیسے کی ہوس نے ابن آدم

سے دوسرے سارے شوق چھین لیے اور لوگ مرزا کی علمی گفتگو سے کئی کترانے لگے یا شاید ان کے پاس اس کا ر فضول کے لیے وقت نہیں رہا تھا۔ اس زمانے میں وہ کچھ افسردہ سے رہنے لگے تھے۔ ایک روز میں ان کے ہاں گیا تو کہنے لگے ”یار آغا دنیا کو کیا ہو گیا ہے۔ ہم نے یہ ملک ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کے لیے تو نہیں بنایا تھا، ہمیں تو یہاں اسلام کا مثالی نظام نافذ کرنا ہے مگر لوگ معلوم نہیں کیوں بے کار بھاگ دوڑ میں لگے ہوئے ہیں۔“

میں یہاں یہ بھی بتا دوں کہ میں آغا و آغا نہیں ہوں میرا تعلق ایک معمولی سے خاندان سے ہے اور جعلی کلیم پر خاصی بڑی جائیداد نہ ملتی یا یہ ملک نہ بنا تو میں شاید کہیں کلر کی کر رہا ہوتا۔ مگر دینے والے نے جب مجھے اتنا کچھ دیا تو مرزا صاحب کا پیار سے بولا جانے والا لفظ آغا آہستہ آہستہ میرے نام کا جزو بن گیا اور جب میں شہر کے ایک خوش حال اور مہنگے علاقے میں بنگلہ تعمیر کر کے اس میں منتقل ہوا تو اپنے نام کی تختی لکھواتے وقت میں نے آغا بھی لکھوا لیا چنانچہ اب تو برسوں سے لوگ مجھے آغا بلند بخت کے نام سے جانتے ہیں۔

مرزا کو بیوی بھی اتفاق سے اچھی ملی تھی۔ وہ تمام عورتوں کی طرح دنیا داری کے تقاضوں پر مرزا کو متوجہ کرتی اور بے لفظوں میں آنے والی ذمہ داریوں کا احساس دلانے کی کوشش بھی کرتی مگر مرزا کی منطق خاص طور پر اپنے بیان پر مرزا کا اپنا اعتماد دیکھتے ہوئے خاموش ہو جاتی۔ بعد میں تو اس نے کچھ کہنا چھوڑ دیا تھا۔ ایک طرح بی بی نے مرزا کی امامت کو تسلیم کرتے ہوئے خود سپردگی اختیار کر لی تھی آہستہ آہستہ وہ ان کے رنگ میں رنگی گئی۔ بیگم مرزا شکل صورت کی بہت اچھی تھیں وہ پردہ کرتی بھی تھیں اور نہیں بھی۔ مرزا صاحب کے نزدیک عورت کے لیے اس حد تک پردہ کرنا روا تھا جس حد تک اسلام نے اجازت دی ہے، چنانچہ بیگم مرزا نے برقع کبھی نہیں پہنا تھا، باہر نکلتیں تو چادر سے جسم ڈھانپ لیتیں۔ چہرہ کھلا رہتا، گھر میں آنے والوں کے درمیاں تو کبھی آ کر نہ بیٹھتیں البتہ باہر ملنے جلنے والوں سے بلا تکلف سلام دعا کر لیتیں اس لیے میرا اس سارے زمانے میں ان سے زیادہ میل ملاپ نہیں رہا۔ مرزا صاحب کے ہاں جاتا تو ہماری محفل ان کی بیٹھک میں جمتی، بچے چائے کھانا وغیرہ وہیں لے آتے۔ بیگم مرزا ہماری گپ شپ میں شامل ہوتیں اور نہ ہی دخل در معقولات کرتیں۔

میری بیوی مرزا کی بیگم سے بہت چڑتی تھی اس لیے ہمارے دونوں گھرانوں کی خواتین کا زیادہ میل ملاپ کبھی نہیں رہا۔ اصل میں میں نے شادی دنیاوی ضرورتوں کے تحت کی تھی، میرے سسرال نے میری ترقی میں نمایاں کام کیا۔ ویسے میری بیوی معمولی شکل و صورت کی عورت تھی اور بیگم مرزا کے غیر معمولی حسن اور اچھی عادات کی وجہ سے میری بیگم عمر بھر اس سے جلتی رہی۔ اس معاملے میں میں نے ہمیشہ خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا۔

مرزا کی چالیس سالہ زندگی کی تصویر فلم کی طرح میرے ذہن پر چلتے چلتے رک گئی اور میں ان کی بیوی کے بارے میں سوچنے لگا۔ اتنی لمبی رفاقت کے بعد وہ بے چاری اب کس حال میں ہوگی اور تین چھوٹے بچوں کا جواب ان کے ساتھ رہتے تھے، بوجھ کیسے اٹھائے گی۔ مجھے معلوم تھا کہ گزشتہ دو تین برس سے مرزا کے مالی حالات بہت خراب تھے وہ کسی کے سامنے دست سوال تو پھیلاتے نہیں تھے میں نے دو ایک بار دہلی زبان میں کچھ مالی مدد کی پیش کش کی تو انہوں نے ہنس کر ٹال دیا اور اس موضوع پر بات کرنے سے ہی گریزاں رہے۔ چلتے چلتے میں نے فیصلہ کر لیا کہ دو چار روز بعد اپنے عزیز ترین دوست کے گھر جا کر اس خاندان کو پیش آنے والی مشکلات پر بیگم مرزا سے بات چیت کروں گا اور جو کچھ ہو سکا ان کے لیے کروں گا۔

جنازے کا جلوس قبرستان کے قریب پہنچ گیا تھا۔ میرے ذہن پر چالیس برس کے واقعات، مرزا کی لا پرواہیاں، بے فکر اپن اور بچوں کی شکم سیری کے سلسلے میں ان کی دست درازیوں کی تصویر پر تصویر ابھر کر آرہی تھی کہ کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

میں نے مڑ کر دیکھا یہ میرے اور مرزا کے پرانے پڑوسی مولوی قدوس تھے۔ ”کچھ پتہ ہے؟“ انہوں نے سرگوشی کرتے ہوئے میرے کان میں کہا۔

”کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”آپ کو پتہ نہیں، پتہ بھی کیسے ہو سکتا ہے۔ آپ اب بہت ڈوہرتے ہیں۔ مرزا کی عقل مند بیوی نے معاملہ کو سنبھالنے میں بڑی ہوشیاری اور دانش مندی کا ثبوت دیا۔ آپ غالباً کل شہر سے باہر تھے؟“

”کس معاملہ کو۔۔۔“ میں نے مولوی قدوس سے پوچھا اس لیے کہ ان کے لہجے کی پراسراریت کی وجہ سے میرا تجسس بڑھ رہا تھا۔

”آپ کے دوست مرزا دبیر الحسن نے خودکشی کی ہے۔“

میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ دماغ ماؤف ہو گیا میرے قدم سست پڑ گئے۔ میری یہ حالت دیکھ کر مولوی قدوس آگے بڑھ کر جنازے کے جلوس میں گم ہو گئے۔ میں نے غور کیا تو اپنے آپ کو سب سے پیچھے پایا۔

تیزی سے آگے بڑھ کر میں نماز کے لیے ترتیب دی جانے والی صفوں میں جا شامل ہوا مگر مجھے نہ تو دعائیں دے رہی تھی نہ تکبیر، اس سارے عرصے میں میں یہی سوچتا رہا کہ مولوی قدوس بڑا کمینہ آدمی ہے اور ایک اچھے نیک انسان کے بارے میں بے پرکی اڑا رہا ہے۔ جب میت کو لحد میں اتارا جا رہا تھا اس وقت بھی میں ایک پرانی خستہ قبر پر بیٹھا کبھی

مولوی قدوس کو کوستا اور کبھی مرزا دبیر الحسن کی زندگی کے ان چالیس برسوں کا تجزیہ کرتا جو ہم نے ایک ساتھ گزارے تھے۔ شام ہو چکی تھی قبر پر مٹی ڈالی جا رہی تھی ویسے تو یہ منظر ہمیشہ ہی بڑا اداس کن اور دل ہلانے والا ہوتا ہے مگر جب آپ کا کوئی عزیز، کوئی پیارا، کوئی محبوب جو کل تک آپ کی زندگی کو حرارت فراہم کر رہا تھا اسے منوں مٹی کے نیچے دبتا ہوا دیکھ کر ہر آدمی کا کلیجہ پھٹ جاتا ہے لیکن یہ شام تو واقعی بہت روح فرسا تھی۔ اوائل پھاگن کی اداس ہوا چل رہی تھی۔ آسمان ابر آلود تھا اور ہوا سے لرزتے ہوئے جنڈ اور کریر کے درخت آسمان پر پھیلے ہوئے بادلوں کے ساتھ مل کر پوری فضاء کو پر اسرار بنا رہے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ ہمارے قبرستانوں میں جنڈ اور کریر کے جھاڑی نما درخت ہی کیوں اگتے ہیں۔ یہاں اچھے، بڑے، اونچے اور گھنے درخت کیوں نہیں لگائے جاتے۔ قبرستانوں میں بنجر زمین میں اگنے والی جھاڑیاں ہی کیوں نظر آتی ہیں۔ ابھی میں ان باتوں پر غور کر رہا تھا کہ چوہدری شہاب دین میرے برابر آ کر بیٹھ گئے۔ چوہدری صاحب بھی ہمارے پرانے زمانے کے ساتھی اور مرزا کے زبردست مداحوں میں سے تھے۔ انہوں نے اگرچہ پھلوں کی پھیری سے ریڑھی لگانے اور اس کے بعد آڑھت منڈی میں نمایاں مقام حاصل کرنے کا سفر بڑی کامیابی سے طے کیا تھا مگر مجھ سے اور مرزا سے ان کے تعلقات ایسے ہی تھے جیسے قیام پاکستان کے بعد ابتدائی آٹھ دس برسوں میں تھے، انہوں نے اسلام پورہ چھوڑا ضرور تھا مگر اپنے پرانے مکان سے تعلق نہیں توڑا تھا، ان کی پہلی بیوی وہیں تھی، نئی کوٹھی میں انہوں نے دوسری بیوی کو رکھا تھا۔ اور باری باری دونوں جگہ قیام کرتے تھے۔ ایک روز گارڈن ٹاؤن میں ایک روز اسلام پورہ میں۔

چوہدری شہاب دین نے اپنا منہ میرے کان کے پاس لاتے ہوئے کہا ”آغا جی مرزا نے اچھا نہیں کیا۔“ چوہدری کی بات سن کر میرا جسم سنسنانے لگا ساری حسیں بیدار ہو گئیں۔ میں نے سوالیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا تو انہوں نے کہا ”رات کو جب یہ وقوعہ ہوا آپ گھر پر نہیں تھے، بیگم مرزا نے مجھے بلایا اور صرف اتنا کہا کہ اب اس خاندان کو ذلت و رسوائی اور کورٹ کچہری سے بچانے کے لیے آپ ہی کچھ کر سکتے ہیں۔ آغا بیدار بخت گھر پر نہیں میں ان کے اور آپ کے سوا کسی سے اس معاملے میں بات نہیں کر سکتی۔ مجھے انہوں نے صرف اتنا بتایا کہ مرزا نے خود ہی اپنی جان لی ہے اور جسم پر بندوق کی گولی کا نشان بھی موجود ہے آپ ذرا نہلانے والے.....“

میں ان کا مطلب سمجھ گیا، بھابی کو میں نے ہاتھ کے اشارے سے مزید بات کرنے سے منع کر دیا اور محلے کے ملا سے جس نے میت کو غسل دینا تھا سمجھا بچھا کر کام کرا لیا اس کی کچھ خدمت بھی کرنی پڑی مگر اللہ کی ذات سب کا پردہ رکھنے والی ہے۔“

لاکھ کریدنے کے باوجود چوہدری شہاب دین اس سے زیادہ کچھ نہ بتا سکے۔ واپسی پر تھوڑی دیر مرزا کے گھر کے باہر چھٹی ہوئی درمی پر بیٹھ کر میں آنے جانے والوں کی باتوں سے بالکل بے خبر رہا۔ سارا وقت یہی سوچتا رہا کہ مرزا جیسا آدمی جو زندگی اور توانائی سے بھرپور تھا، جس کے جسم کے ہر ریشے سے زندگی پھوٹی تھی، جس کے سامنے زندگی کے بڑے بڑے مقاصد تھے کیسے اس انجام کو پہنچا۔ مرزا کے گھر سے اپنے گھر آتے ہوئے اپنی نئی کار میں بیٹھا میں ایک دفعہ پھر ماہی کی یادوں میں کھو گیا۔ مرزا کی بھرپور زندگی، بچوں سے ان کی والہانہ محبت جس کا سارا زور انہیں دن بھر کھلاتے پلاٹے رہنے پر صرف ہوتا تھا، وطن اور مذہب سے ان کی عقیدت اور صوفیانے کرام کی سوانحات سے اخذ کئے گئے واقعات ملنے بیان میں ان کے والہانہ پن کے واقعات مجھے برابر یاد آ رہے تھے۔ چند برس قبل انہیں کچھ صدے ضرور پہنچے تھے مثلاً جب ان کے تینوں بڑے بیٹے انہیں چھوڑ کر علیحدہ ہو گئے تو وہ کافی عرصہ بہت افسردہ اور بچھے بچھے رہے۔ انہیں ان کے جانے کا اتنا دکھ نہیں تھا جتنا اس بات کا تھا کہ وہ حرام کی کمائی کے پیچھے بھاگ رہے ہیں، دو بیٹیاں شادی کے بعد اپنے گھر چلی گئی تھیں مگر ان کی جگہ تین بہوؤں نے لے لی تھی۔ مرزا کی آرزو تھی کہ خاندان ایک ہی جگہ جم رہے۔ وہ اتفاق کی برکتوں اور بہن بھائیوں کی محبت کے قصے کہانیاں اٹھتے بیٹھتے انہیں سناتے رہتے۔ کبھی وہ پرکھوں کی داستانیں لے بیٹھتے اور بڑے جذباتی انداز میں روہیل کھنڈ کی سنگلاخ زمین پر بسنے والے اپنے خاندان کا ذکر کر کے بچوں کو ساتھ رہنے پر مجبور کرتے، گھر میں کھانے پینے کی اب بھی ویسے ہی فراوانی تھی مگر بڑھتی ہوئی قیمتوں اور مرزا کی محدود آمدنی کی وجہ سے اب گھر میں اکثر تلخ کلامیوں کی نوبت آ جاتی تھی، بیٹے بہانے بہانے سے مرزا کو دیاداری کا راستہ دکھانے کی کوشش کرتے، آنے والے مشکل وقت سے ڈراتے مگر مرزا کہتے میرے دوست تو تم لوگ ہو مجھے دنیاوی دوست کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ میں اپنی نیند سوتا ہوں، اپنی مرضی سے اٹھتا ہوں، رزق حلال کما تا ہوں اپنے اس وطن اور اس میں رہنے والے لاکھوں کروڑوں افراد کی ترقی اور خوش حالی کے لیے دعا گو ہوں۔ تم بھی یہی کرو۔ بچے آہستہ آہستہ ان باتوں سے تنگ نظر آنے لگے۔ وہ زمانے کے بدلے ہوئے حالات اور نئی ضرورتوں کے اسیر ہوتے ہوتے رزق حلال کے سحر میں زیادہ دن گرفتار نہ رہ سکے کہ رزق حلال سے ٹیلی ویژن، وی سی آر، فریج، کچھ بھی نہیں ملتا تھا۔ دوسرا بیٹا کچھری میں ملازمت کرتا تھا۔ معمول کے مطابق رشوت لینا شروع کی۔ اس کی اور بھانج کی ڈھکی چھپی خوش حالی دیکھ کر بڑے بیٹے نے بھی مال بنانا شروع کر دیا۔ اس کے بعد تیسرے بیٹے نے جو پر اپنی کام کرتا تھا، دیانتداری اور ایمانداری کا راستہ ترک کر کے جعلی دستاویزات کے ذریعے ایک ایک پلاٹ کو چار چار دفعہ فروخت کرنا اور لوگوں کو لوٹنا شروع کر دیا۔

مرزا صاحب کو ان تبدیلیوں اور اپنے گھر میں نقب لگنے کا اندازہ تھوڑے ہی دنوں میں ہوا تو وہ بچھ سے گئے۔



بشریٰ اعجاز، تسنیم کوثر اور حمید اختر ایک تقریب کے موقع پر



تسنیم کوثر، حمید اختر، سعدیہ حمید ایک تقریب کے موقع پر



نارنگ ساقی صاحب اور حمید اختر کی ایک یادگار تصویر



حمید اختر، ملک مقبول احمد، حافظ حسین احمد، مفتی ڈاکٹر غلام سرور صاحب اور
چراغ روشن کر سمن کا ایک کاٹے ہوئے



علامہ عبدالستار عاصم اور جناب حمید اختر (2 اپریل 2008ء پی سی ہوٹل لاہور)



پروڈیوسر افتخار مجاز، حمید اختر، آئی اے رحمن، انتظار حسین، پی ٹی وی لاہور سنٹر

مفتی ڈاکٹر غلام سرور قادری بخاری، ملک مقبول احمد اور جمید اختر

ایک دن میرے ہاں آئے تو کہنے لگے ”آغا یہ تو ہماری دنیا ہی نہیں رہی، یہ بچے ہمیں بے وقوف سمجھتے ہیں اور من مانی کر رہے ہیں اب تو انہیں سمجھاتے ہوئے ڈر آنے لگتا ہے۔“

اس روز میں نے کھل کر مرزا صاحب سے باتیں کیں، انہیں بدلتی ہوئی دنیا اور تبدیل ہوتی ہوئی قدروں سے آشنا کرانے کی کوشش کی، یہ بھی سمجھایا کہ اولاد جوان ہو جائے تو اسے اپنے فیصلے خود کرنے دو مگر مرزا تو زندگی کے تیس برس وطن کی تعمیر اور قوم کو اسلام کے فیوض سے مالا مال کرنے کی جدوجہد کر چکے تھے اور اب بھی اپنے عہد پر قائم تھے اس لیے وہ میری باتوں سے مطمئن نہیں ہوئے۔ اگرچہ اب ان کے بیان میں وہ پہلا ساز و رنہیں تھا۔ گھر میں ان کی آواز کمزور سے کمزور تر ہوتی گئی اور بالآخر ان کے تینوں بیٹے حیلوں بہانوں سے علیحدہ مکانوں میں بیٹھ گئے۔ اپنے اپنے گھروں میں وہ سبھی کم از کم مرزا صاحب سے کہیں زیادہ خوش حال اور مطمئن نظر آتے تھے۔

مرزا دبیر الحسن بدلے ہوئے حالات کی وجہ سے افسردہ ضرور تھے مگر ان کے ایمان کی پختگی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ ایک بیٹی اور دو بیٹے جوان کے پاس رہ گئے تھے بدستور ان کی توجہ کا مرکز بنے رہے۔ ان کی آخری عمر کی یہ اولاد کھانے پینے سے گریزاں تھی، وہ ڈانٹ ڈپٹ کر انہیں اچھی خوراک کھانے پر مجبور کرتے تھے۔ تو انا اور تندرست نسل کی تیاری کا عزم بدستور ان کے ذہن پر چھایا ہوا تھا۔ اتفاق سے ان کا سب سے چھوٹا بیٹا جو ویسے بھی چھوٹا ہونے کی وجہ سے لاڈلا تھا کافی خوش خوراک تھا اور جسمانی تندرستی کا رسیا تھا۔ مرزا صاحب نے ہارے ہوئے جواری کی طرح اسے اب اپنی امیدوں کا مرکز بنا لیا۔ تنگدستی، محدود آمدنی اور بڑھتی ہوئی گرانی کے باوجود انہوں نے اس کی خوراک کا ایک چارٹ تیار کیا اور اس پر عمل کراتے رہے، چھانڈے، دو سیر دودھ اور بارہ بادام اس کی روزانہ خوراک کا حصہ تھے جو مرزا اپنے سامنے اسے نوش کراتے، پندرہ برس کی عمر سے لے کر ساڑھے سالہ برس تک وہ اسے صبح شام اپنے ساتھ رکھتے۔

اسے اپنا فلسفہ زندگی سمجھاتے، ورزش کراتے، اسے دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے، بیٹا پاس آجاتا تو ان کا چہرہ سرخ اور حوصلے بلند ہو جاتے مگر بیٹا سترہویں برس میں داخل ہوا تو مرزا کے مالی حالات بہت بگڑ گئے۔ اصل میں انہوں نے آمدنی بڑھانے پر کبھی توجہ ہی نہیں دی تھی۔ آمدنی وہی رہی اور قیمتیں برق رفتاری سے بڑھنے لگیں تو حالات زیادہ بگڑ گئے اور اس گھر میں یہ پہلی بار دیکھنے میں آیا کہ مرزا گھر والو سے دبی دبی زبان میں اخراجات کم کرنے کے لیے کہنے لگے۔ ان دنوں ایک روز میں ان کے ہاں گیا تو بہت پریشان نظر آئے۔ کہنے لگے ”آغا بڑا مشکل وقت آ گیا ہے۔ دکان سے یافت کم ہو گئی ہے۔ قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگی ہیں۔ زندگی میں پہلی بار گھر کے اخراجات کم کرنے پر مجبور ہوا ہوں۔ پہلے تو میں گھر کو مار مار کر کھلاتا تھا اب بچے مجھے کھانے کو دوڑتے ہیں۔ خیر کھانے پینے کے اخراجات میں کمی کی حد تک اور سب لوگ

مان گئے ہیں مگر یہ کمبخت چھوٹا نہیں مانتا۔ پوری خوراک نہیں ملتی تو بڑبڑ کرتا ہے۔ اسے دیکھ کر میرے سینے پر آری چل رہا ہے کڑھتا ہوں اور کچھ نہیں کر سکتا، کروں بھی کیا؟ دیکھ تو کیا جوان نکلا ہے۔ ابھی سترہ برس کا بھی نہیں ہوا مگر ماشاء اللہ نہیں معلوم ہوتا ہے قد بھی مجھ سے اونچا ہے۔ یہ سب اچھی خوراک کا نتیجہ ہے۔ مگر اب انڈے بھی بیس روپے درجن ہو گئے ہیں، دودھ کے دام کہاں سے کہاں پہنچ گئے، اسے کیسے کھلاؤں کیا کروں؟“

اس دن میں نے مرزا کی بات ہنس کر ٹال دی مگر آج گھر واپس جاتے ہوئے میں یہی سوچ رہا تھا کہ اب کیا مرزا ہی نہیں جانے کتنے اور لوگ ہوں گے جن کے ساتھ یہ دنیا اور یہ معاشرہ ایسا سلوک کر رہا ہے کہ ملک و قوم کی خدمت کے جذبے سرد پڑتے جا رہے ہیں۔ مرزا تو پختہ ایمان اور آہنی عزم کے آدمی تھے، عام آدمی کب تک خیالوں کی دنیا میں رہ سکتا ہے، کتنے لوگ ہوں گے جو دنیا کی نفسا نفسی کا حصہ نہ بنے ہوں گے ورنہ تو یہی بے رحم سفاک دنیا انہیں کچلتی اور روندتی ہوئی آگے نکل گئی ہوگی۔ اپنے بارے میں سوچ کر مجھے ایک گویا اطمینان ہوا کہ اس نئے ملک میں آ کر میں نے وہی کچھ کرنا جو سب سمجھدار لوگ کر رہے ہیں۔ میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ مجھ سے مرزا جیسی کوئی حماقت سرزد نہیں ہوئی۔ میرا حال اور مستقبل محفوظ تھا۔ لیکن مرزا کی نیکی، خدا ترسی اور خوش فہمیوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں بار بار یہ سوچتا رہا کہ اس غریب کو ان نیکیوں کا اجر اب اس دنیا میں تو نہیں ملے گا، دوسری دنیا میں شاید کچھ مل سکے۔ یاد آیا کہ ایک دفعہ میرے ہاں آئے اور آتے ہی بولے ”آغا عجیب سی بات ہے سوچتا ہوں تم سے کہوں یا نہ کہوں؟“

میں نے حیرت سے پوچھا ”کیا ہوا مرزا؟“

کہنے لگے ”دو تین روز سے بہت خوف زدہ ہوں، یہ معلوم نہیں کہ مجھ پر کس چیز کا خوف طاری ہے مگر ہر وقت ڈگمگاتا رہتا ہے۔ نیند نہیں آتی، رات کو آنکھ لگتی ہے تو بڑے بڑے بوٹوں کی پریڈ نظروں کے سامنے آ جاتی ہے۔ اور میں جاگ جاتا ہوں۔ دکان پر بیٹھتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ کمر پر کوڑے پڑ رہے ہیں۔ یار آغا دیکھو میں روہیل کھنڈ کا پیدائشی ہوں میرے بزرگوں نے کئی مغل بادشاہوں کی سلطنتیں بچائی تھیں۔ ہمارے خاندان کے لوگ ہمیشہ شمشیر بکف رہے۔ ان کی زندگی میں ڈر اور خوف نام کی کوئی چیز موجود ہی نہیں تھی۔ میں جو ان کی اولاد میں سے ہوں اپنے اور اپنے آس پاس سے ڈرتا ہوں یہ بزدلی مجھ میں کہاں سے آگئی۔ آغا بتاؤ مجھے کیا ہو گیا ہے؟“

میں نے غور سے مرزا کی طرف دیکھا۔ مرزا اب بوڑھے ہو گئے تھے، ساٹھ برس سے زیادہ عمر کے آدمی کو جتنی کام کرنا چاہیے تھا وہ اس سے کہیں زیادہ کام کرتے تھے۔ ان کے بال سفید اور چہرے پر تھکن کے آثار تھے۔ پھر بھی شاید وہ اس ذہنی خلجان میں مبتلا نہ ہوتے اگر ملک کی ترقی اور خوشحالی کے ان کے خواب چکنا چور نہ ہو جاتے۔ پچھلی چند ملاقاتوں

میں وہ اگرچہ مارشل لاؤں کے بار بار نفاذ اور اسلام کے نام پر خلق خدا کو بے وقوف بنانے کی کوششوں پر خاصے مضطرب نظر آتے تھے مگر ان کے حوصلے بلند تھے ان کے عزائم وہی تھے۔ اپنے آس پاس کے لوگوں سے وہ اسی پر عزم لہجے میں بات کرتے تھے اور انہی کو اس ملک کو وارث قرار دیتے تھے۔ بار بار کہتے انتظار کرو اچھا وقت ضرور آئے گا۔ میرا اور آپ کا زمانہ۔۔۔

پھر یہ کیا ہوا؟ مرزا نے اپنی جان کیوں لے لی؟ یہ سوچتے سوچتے میں گھرا گیا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اس رات میں اچھی طرح سو نہیں سکا۔ رات کو کئی بار آنکھ کھلی، جب بھی جاگتا مرزا کا پر عزم چہرہ سامنے آ جاتا۔ وہ ایک ان تھک آدمی تھے۔ نیک نیت اور سب کا بھلا چاہنے والے۔ ان کا سفر کہاں سے شروع ہوا؟ روہیل کھنڈ کی سنگلاخ چٹانوں سے ہوتے ہوئے وہ نئی دنیاؤں کی تلاش میں لاہور پہنچے، یہاں انہوں نے جینے کا حق ادا کیا۔ اس بدلتی ہوئی خود غرض اور وفانا آشنا دنیا میں انہوں نے مرتے دم تک عہد وفا نبھایا، بیوی بچوں سے، وطن سے دوستوں سے، پڑوسیوں اور آس پاس رہنے والوں سے پیار، محبت اور شفقت کے رشتے استوار کئے۔ انسانیت اور ابن آدم کی اس سے بڑی خدمت اور کیا ہو سکتی تھی۔ وہ بلاشبہ مثالی انسان تھے۔ انہوں نے کبھی بے ایمانی سے دولت جمع کرنے یا اپنے خاندان کا مستقبل بنانے کے لیے دوسروں کو دھوکہ دینے کے بارے میں سوچا تک نہیں تھا۔ وہ بلاشبہ ایک اچھے مسلمان، ملک کے ذمہ دار شہری اور ہر معیار سے ایک بلند کردار انسان تھے۔ پھر وہ کس مصیبت میں گرفتار ہوئے؟ کیوں انہوں نے اتنا بڑا قدم اٹھایا؟ میں جتنا سوچتا اتنا ہی پریشان ہوتا۔ اتفاق سے اس زمانے میں فراغت کی وجہ سے میں جاسوسی ناول پڑھتا تھا۔ میرا سارا کاروبار ان دنوں میرے بڑے بیٹے نے سنبھال لیا تھا، اس لیے میں فارغ تھا۔ گزشتہ ایک ڈیڑھ برس میں اس نے حیرت انگیز حد تک درست فیصلے کئے تھے۔ اس لیے اب مجھے فکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی، میں نے جو تربیت اسے دی تھی وہ اس کے اور میرے کام آ رہی تھی۔ اسی وجہ سے گزشتہ کئی ماہ سے مجھے فراغت ہی فراغت تھی، دفتر میں جاتا ضرور تھا مگر ایک آدھ گھنٹے کے لیے۔ خوش حالی اور فالو وقت گزارنے کے لیے میں نے زندگی میں دوسری بار مطالعہ کرنا اپنا معمول بنانے کی کوشش کی۔ ابتداء ادب عالیہ کے مطالعہ سے کی، مگر بیس برس کے مقابلے میں اب یہ تحریریں پھسکی بلکہ بے معنی نظر آنے لگیں۔ اصل میں انسان کی مطالعہ کی عادت بھی اس کی سماجی حیثیت کی پابند ہوتی ہے۔ جوانی میں جب ادب کے مطالعہ کی لذت سے آشنا ہوا تو میں ایک ایسا غریب نوجوان تھا جو اپنی جڑوں سے علیحدہ ہو چکا تھا مگر دل انسانی دردمندی سے لبریز تھا۔ یہ شاید انہی محرومیوں کا احساس تھا کہ ان دنوں افسانوں اور ناولوں کے کردار گویا میرے اندر حلول کر جاتے تھے۔ میں ان کے دکھ ان کے غموں اور بربادیوں میں برابر شریک ہوتا۔ ان کے ساتھ روتا، انہی کے ساتھ ہنستا، کلاسیکی ادب کے

بعض معروف کرداروں نے ان دنوں کئی کئی دن اور کئی کئی رات میرا پیچھا کیا لیکن ماضی کے جن المیوں پر میں اس وقت رونا تھا اب وہ مجھے احمقانہ نظر آتے تھے۔ چند ہی روز بعد میں نے ادب کے مطالعہ سے ہاتھ کھینچ لیا اور امریکہ سے شائع ہونے والے جدید کمرشل ناول پڑھنا شروع کئے۔ ابتداء میں تھوڑی سی مشکل ضرور پیش آئی لیکن آہستہ آہستہ ان کا سحر مجھ پر طاری ہو گیا۔ نئے امریکی ناول عام طور پر تھیرافزا تجسس سے پر اور جنسی مناظر سے مزین ہوتے ہیں۔ ان میں ہر پچاس صفحے کے بعد بستر کا ایک منظر ضرور ہوتا ہے اور وہ بھی ایسا کہ ابتدائے شباب کے زمانے میں ہم چھپ کر جو کوک شاستر وغیرہ پڑھا کرتے تھے وہ بھی ان کے سامنے ہیچ ہوتے ہیں۔ یہ میرے لیے ایک نئی دریافت تھی اور میں نشے کے عادیوں کی طرح ان جاسوسی اور جنسی ناولوں کا باقاعدہ قاری بن گیا۔ بستر میں مرد اور عورت کی موجودگی اور ان کی سرگرمیوں کی تفصیلات میری بوڑھی ہڈیوں کو گرمانے کا کام دیتیں اور میں تجسس کی ایک لائن کے پیچھے بھاگتا ہوا بیڈروم کے مناظر سے لطف اندوز ہوتا رہتا، یہ ایک نئی دنیا تھی جسے میں نے بڑھاپے میں دریافت کیا تھا مگر جو نئی نسل کے لیے معمول کی بات بن چکی تھی۔ شہر کے فیشن ایبل علاقوں میں لڑکے لڑکیاں یہی ناول کتابوں کی دکانوں سے خریدتے نظر آتے۔ شہر کے ہر کونے اور ہر مہنگی مارکیٹ میں کتابوں کی دکانوں پر اس نوع کی کتابیں نظر آتی تھیں اور ان کی خرید و فروخت جاری تھی۔

مرزا دبیر الحسن کے جنازے اور پھر ان کے گھر میں حاضری دینے کے بعد رات کو میں سوتے جاگتے انہی جاسوسی ناولوں کے تجربے کی روشنی میں مرزا کی زندگی کے خاتمے کے اسباب ڈھونڈتا رہا۔ میرے دل میں کئی بار مرزا کی بیوی کے بارے میں برے برے خیالات آئے، وہ ان عورتوں میں سے نہیں تھی جن کی جسمانی وجاہت عمر کے اثرات کو رد کر دیتی ہے۔ وہ آج بھی مناسب خدو خال، بڑی بڑی آنکھوں اور نسوانی حسن کا ایک پرکشش پیکر تھی۔ آخر ایسی خبریں ہمارے اخبارات میں روزانہ شائع ہوتی رہتی ہیں کہ چھ بچوں کی ماں آشنا کے ساتھ بھاگ گئی یا آشنا کے ساتھ مل کر شوہر کو قتل کر دیا اور فرار ہو گئی۔ کہیں مرزا کے ساتھ بھی کوئی ویسا ہی جادو تو پیش نہیں آیا البتہ وہ اتنی نیک عورت تھی کہ چند ہی لمحوں بعد یہ خیال ذہن سے نکال دینا پڑا مگر میرا تجسس کسی طرح کم نہ ہوا۔ رات بھر میں یہی سوچتا رہا کہ آخر مرزا کو ہوا کیا؟ انہوں نے یہ قدم کیوں اٹھایا؟۔ صبح تک میرے ذہن میں ایک بہت پیارے دوست کی موت کے افسوس سے زیادہ اس عقدہ کو حل کرنے کی خواہش حاوی ہوتی گئی۔ میں اگرچہ رات بھر سو نہیں سکا تھا اور اگرچہ اگلے روز میرا مرزا کے گھر جانے کا کوئی پروگرام نہیں تھا مگر صبح ہوتے ہی میں چائے کی پیالی پینے کے بعد مرزا کی بیگم سے ملنے اور ان کے اس انتہائی اقدام کے بارے میں معلومات حاصل کرنے گھر سے چل پڑا۔

بیگم مرزا شاید میرا انتظار ہی کر رہی تھیں دروازہ انہوں نے خود ہی کھولا، تینوں بچے ابھی سوئے ہوئے تھے۔ میں

نے ڈیوڑھی میں سے بیٹھک کے دروازے کی طرف قدم بڑھایا تو بیگم دبیر مرزا نے کہا ”بھائی صاحب بیٹھک کی کھڑکیاں باہر کھلتی ہیں۔ جہاں سے آواز باہر جاتی ہے۔ آپ اندر ہی آجائیے۔“ چالیس برس میں پہلی بار میں نے اندر سے اس گھر کا نقشہ دیکھا۔ مرزا کے ہاں ابھی تک بان کی چار پائیاں چل رہی تھیں۔

ان کے اپنے کمرے میں دوہٹی اور درری پر مشتمل میلا سا بستر لگا ہوا تھا۔ تکیے کا غلاف اگرچہ صاف تھا مگر جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ ایک کرسی پڑی تھی جس کا ایک بازو نہیں تھا، میں اسی کرسی پر بیٹھ گیا، بیگم مرزا چار پائی پر میرے سامنے بیٹھی تھیں، وہ غم و اندوہ کی تصویر نظر آرہی تھیں ان کی موٹی موٹی غلافی آنکھیں غمناک اور سوچی ہوئی تھیں۔ اس وقت وہ اپنے آپ میں نہیں تھی۔ میری طرف دیکھتے ہوئے انہوں نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر دو لفظ بولنے کے بعد ان کا گلارندھ گیا اور وہ ہچکیاں لے کر رونے لگیں۔

میرا تجربہ ہے کہ رونے کا عمل بھی مختلف سماجی مراتب کا پابند ہوتا ہے۔ اپنے موجودہ سماجی مرتبے پر پہنچنے کے بعد میں بہت کم رویا ہوں مگر اپنے عزیز دوست کے پھڑنے اور ان کی بیگم کے زار و قطار رونے کی وجہ سے میں بھی اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا اور بڑی دیر تک روتا رہا۔ کافی دیر تک رونے دھونے کے بعد جب ہم دونوں کے دل کا بوجھ ہلکا ہوا تو میں نے ہمت کر کے پوچھا ”بہن یہ قیامت کیسے ٹوٹی؟ مرزا نے آخر ایسا کیوں کیا؟ ایسی کونسی مصیبت آپڑی تھی کہ انہوں نے اپنی جان ہی دے دی۔۔۔“

بیگم مرزا نے اپنے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں روتے اور ہچکیاں لیتے ہوئے جو داستان سنائی وہ مختلف ٹکڑوں میں تھی۔ تقریباً دو گھنٹے میں مجھے اصل واقعات سے آگاہی حاصل ہو سکی۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ میں ان ٹکڑوں کو انہی کے الفاظ میں بیان کروں البتہ اس ساری گفتگو کا لب لباب ضرور بیان کروں گا۔

جو کچھ انہوں نے بتایا وہ کچھ اس طرح سے ہے

گزشتہ دو تین ماہ سے مرزا بہت چڑچڑے ہو گئے تھے۔ زندگی بھر انہوں نے کسی بچے کو ڈانٹا تک نہیں تھا مگر اب وہ بات بات پر ناراض ہوتے، جو آدمی عمر بھر کھانے کھلانے کا شوقین رہا اور جو ڈانٹ ڈپٹ کر بیوی بچوں کو انواع و اقسام کے کھانے کھلانے کے لیے شہر بھر میں مشہور تھا اب بیوی بچوں کو زیادہ کھانے سے ٹوکنے لگا تھا۔ بچے جن کی عادتیں انہوں نے خود بگاڑی تھیں کھانے کی کمی یا کمتر معیار کی شکایت کرتے تو مرزا ان سے الجھ پڑتے۔ اکثر کہتے کہاں سے آئے گا گوشت، پچاس روپے سیر گوشت خریدنے کی اب مجھ میں ہمت نہیں ہے۔ ایک دن دونوں بیٹوں میں سے بڑے بیٹے نے کالج کے لیے نیابلیر خریدنے کو کہا تو اس کو بری طرح ڈانٹ دیا۔ بچے بھی حیران تھے انہوں نے باپ کا یہ رویہ کبھی دیکھا

سوچا تک نہیں تھا، زندگی بھران کی فرمائشیں پوری کرتے رہے۔ گوشت، پھل، مٹھائی گھر میں ہر چیز کی فراوانی رہی ہے مگر جب مرزانے ہر چیز سے ہاتھ کھینچ لیا تو بچے بھی احتجاج کرنے لگے۔ ان کے شور مچانے پر مرزا اور بگڑتے، کبھی انہیں گالیاں دیتے کبھی اپنے آپ کو، آخری دنوں میں وہ قناعت کا بہت زیادہ درس دینے لگے تھے اور خوراک اور لباس سے بے نیازی کو صوفیاء کا مسلک قرار دیتے تھے مگر بچے ان کی باتوں پر کان نہیں دھرتے تھے۔ وہ اتنا مانگتے تھے جو ان کی عادت تھی۔ مہینہ بھر سے گھر میں مسلسل کشیدگی کے آثار تھے۔

جس روز شام کو یہ واقعہ ہوا وہ ایک معمولی بات پر مشتعل ہو گئے تھے۔ انہوں نے ہفتہ بھر قبل پندرہ روپے درجن کے حساب سے انڈے خریدنے کے بعد آئندہ گھر میں انڈے لانے کی ممانعت کر دی۔ چھوٹے بیٹے کو تین روز سے انڈا کھانے کو نہیں ملا تو اس نے ضد کر کے ماں سے پیسے لیے اور چھ انڈے ابا ل کر کھانے کے لیے پلیٹ میں رکھے ہی تھے کہ مرزا باہر سے آگئے۔ گھر کے لوگوں کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ مرزا نے اسی چھوٹے کی ہاکی اٹھائی اور پورے زور سے اس کی کمر پر رسید کر دی، ماں بچانے کے لیے آگے بڑھی تو ایک آدھ ہاتھ اسے بھی پڑا۔ پھر انہوں نے لڑکے کو ہاکی سے خوب مارا، اس کا گریبان پکڑ کر کھینچا اور پورے زور سے چیخے ”چھ انڈے کھائے گا حرام زادے، تجھے رستم پاکستان بننا ہے، تیرا پیٹ ہی نہیں بھرتا، انڈے بیس روپے درجن ہو گئے ہیں، دودھ آٹھ روپے کلو ملتا ہے۔ مگر تیرا دوزخ معمولی خوراک سے نہیں بھرتا، کب بھرے گا تیرا یہ دوزخ! کب چھوڑو گے میری جان، کب مجھے معاف کرو گے، کب مجھے چین ملے گا۔“

مرزا پاگلوں کی طرح بچے کو مارتے جاتے تھے اور زور زور سے بولتے جاتے تھے، گھر والے حیران تھے کہ انہوں نے زندگی بھر اپنے کسی بچے پر ہاتھ نہیں اٹھایا تھا بلکہ بیوی سے ہمیشہ اسی بات پر ناراض ہوئے کہ وہ بچوں کو کبھی کبھار ایک ہاتھ رسید کر دیتی تھی۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، سب بیٹھے دیکھتے رہے، اور مرزانے بچے کی ہڈی پسلی ایک کر دی۔ اس کے بعد وہ اپنے کمرے میں چلے گئے اور اندر سے کنڈی بند کر لی۔

اندر سے کافی دیر تک ان کے رونے کی آواز آتی رہی، وہ پہلے بلند آواز سے پھر آہستہ آہستہ روتے رہے، پھر ایک لمبی خاموشی چھا گئی، گھر والوں نے سمجھا وہ تھک کر سو گئے ہیں مگر دو گھنٹے کی خاموشی کے بعد اندر سے بندوق چلنے کی آواز آئی۔

جب دروازہ توڑ کر گھر والے اندر داخل ہوئے تو مرزا اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کر چکے تھے، ان کے سامنے یہ خط پڑا تھا۔

بیگم مرزا نے اپنے پرس سے نکال کر ایک مڑا تڑا کاغذ میری طرف بڑھا دیا۔
کاغذ پر خون کے دھبے صاف نظر آرہے تھے اور مرزا کی تحریر بھی صاف اور واضح تھی۔ لکھا تھا۔
”جدائی کی گھڑی آ پہنچی ہے۔ اب اس شہر کا پانی مجھ پر حرام ہے۔ رزق کے سارے دروازے
بند ہو چکے ہیں، پیٹ کے دوزخ بھڑک رہے ہیں۔ یہ آگ ٹھنڈی ہونے کا کوئی سامان نظر نہیں آتا، لوگو!
ان لوگوں میں اس دنیا کو چھوڑ کر جا رہا ہوں۔“

اس کے بعد تین سطروں کی جگہ خالی تھی اس کے بعد لکھا تھا۔
”سید الشہداء نے میدان کر بلا میں فرمایا تھا ”لوگو تمہارے شکم لقمہ حرام سے پر ہیں اور تمہارے
لوگوں پر مہر لگ چکی ہے۔“

مجھے آج پورا ملک کر بلا کا میدان نظر آتا ہے، جس میں لقمہ تر وہی کھا رہے ہیں جنہیں حرام کا لقمہ
بیسر ہے۔ اللہ کی مخلوق بھوکی ہے، لاچار ہے، ان سے مسلسل دھوکہ کیا جا رہا ہے۔ رزق حلال برکت سے
خالی ہے۔ لوگ اس طرح خاموش ہیں جیسے آزمائش کی گھڑی میں کوئی خاموش تھے۔ کوئی بولتا نہیں، کوئی
وقت کے حکمرانوں کو گریبان سے نہیں پکڑتا۔ یہ لوگ اللہ کے رسول کا یہ فرمان کیوں بھول گئے ہیں کہ اگر
ظالم حکمران کو اس حال میں دیکھو کہ وہ محرمات الہی کو حلال کرتا ہے، اللہ کے عہد کو توڑتا ہے، سنت رسول
کی مخالفت کرتا ہے، اور اللہ کے بندوں پر زیادتی کرتا ہے تو ان کی حالت پر اپنی آواز یا عمل کے ذریعے
ان کو جو نہ رو کے تو وہ بھی اسی ظالم کی طرح مستحق عذاب ہے۔“

پھر تین سطریں چھوڑی ہوئی تھیں اور اس کے بعد لکھا تھا۔
”کیا فرق ہے اس وقت کے اور آج کے حالات میں؟ یہاں بھی آج کر بلا کا سماں ہے جہاں
ظالم، دھوکے باز اور فریبی سریر آرائے سلطنت ہیں اور مخلوق خدا ذلیل و خوار ہے۔ ابن آدم بھوکا ہے۔
مسلمان دھوکے اور فریب کے نام پر زندہ ہے۔ کسی کو کسی کی پروا نہیں، خلق خدا مکرو فریب کے آزار میں
لا ہے۔“

انسان، انسان کا گلا کاٹ رہا ہے، دولت ہی رتبے کا معیار ہے۔ نیکی شرافت اور اخوت سبھی کچھ

ختم ہو گیا ہے شرف انسانیت ختم ہو چکا ہے۔ انسانوں کو اللہ اور اس کی شریعت کے نام پر گمراہ کیا جا رہا ہے۔ میں ان کو، ان کے اسلام کو، ان کی شریعت کو مسترد کرتا ہوں اور اپنی جان کی قربانی دیتا ہوں۔ یہ ملک اب طالع آزماؤں کے ہاتھ میں ہے جو جھوٹ، فریب اور نقلی وعدوں کے ذریعے اپنے اقتدار کو طول دے رہے ہیں۔ میں انہیں ان کے بلند مرتبت مقام سے نہیں ہٹا سکتا۔ ان سے لڑ نہیں سکتا کہ میرے جسم کے خون کا آخری قطرہ تک یہ نہ چوڑ چکے ہیں اس لیے میں اپنی زندگی ختم کر رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ میں حرام موت مر رہا ہوں مگر یہ موت اس حلال زندگی سے کہیں زیادہ بہتر ہے جسے بسر کرنے لیے مجھے مجبور کیا جا رہا ہے۔“

(1991ء)



انجمن ترقی پسند مصنفین بمبئی

کے 1946-47ء کے

چند اجلاسوں کی روداد

1946-47ء میں حمید اختر اپنے قیام بمبئی کے دوران انجمن ترقی پسند مصنفین کی مقامی شاخ کے سیکرٹری کی حیثیت میں انجمن کے ہفتہ وار جلسوں کی روداد رقم کیا کرتے تھے جو ڈیڑھ دو برس بڑے تو اتر کے ساتھ بمبئی سے شائع ہونے والے ہفتہ وار ”نظام“ میں شائع ہو کر برصغیر کے کونے کونے تک پہنچتی رہی بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ملک کے تمام بڑے بڑے ادبی مراکز میں اس کا بے چینی سے انتظار کیا جاتا تھا۔ یہ ترقی پسند تحریک کے عروج کا زمانہ تھا اور اس تحریک سے متعلق تقریباً سبھی بڑے نام اس وقت بمبئی میں موجود تھے جن کی اکثریت ان ہفتہ وار ادبی جلسوں میں شریک ہوتی۔ اس وجہ سے ان جلسوں کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی کہ ان کی کارروائی میں حصہ لینے والے بالعموم ترقی پسند ادب تخلیق کرنے والے ادیب، شاعر اور نقاد ہوتے تھے۔ ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کی بحث کے باوجود اس زمانے میں ترقی پسند اور غیر ترقی پسند ادیبوں کی تقسیم اتنی زیادہ نمایاں نہیں تھی، اس لیے معروف ترقی پسند ادیبوں کے علاوہ دوسرے بیشتر ادیب اور شاعر بھی جلسوں میں شریک ہوتے لہذا ان اجلاسوں میں سے چند کی روداد زیر نظر کتاب میں شامل کی جا رہی ہے جو کہ بلاشبہ حمید اختر کے عظیم ادبی اور ملی کردار کی ایک جھلک ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

روداد انجمن

12 دسمبر 1946ء

اردو ترقی پسند مصنفین کا یہ اجلاس مدھوسودھن کی صدارت میں منعقد ہوا۔

حاضرین: سجاد ظہیر، سردار جعفری، رضیہ سجاد ظہیر، کیفی اعظمی، ساحر لدھیانوی، قدوس صہبائی، مجروح سلطان پوری، عادل رشید، ڈاکٹر ہمدانی (اندھیری کالج)، رفعت سروش، نشاط شاہدوی، محمد صفدر، محمد مہدی، عالی جعفری، انوار، مرزا ہارون خوشتر، ناصر شمسی، محمد حسین جعفرانی اور دوسرے اصحاب۔

سب سے پہلے حمید اختر نے پچھلی میٹنگ کی روداد پڑھ کر سنائی۔ اس کے بعد سجاد ظہیر نے فرانسیسی شاعر اور ناولسٹ لوئی اراگان کے متعلق ایک طویل مضمون پڑھا جس پر لوئی اراگان کے عوامی تحریکوں کی طرف سے آنے والے تدریجی عمل اور اس کے پس منظر پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا تھا۔

مضمون ختم ہونے پر ظ۔ انصاری نے سجاد ظہیر سے کہا کہ لفظ ”سوریلزم“ کا ترجمہ ”ماورائیت“ جو اس مضمون میں کیا گیا ہے اس سے مفہوم پوری طرح واضح نہیں ہوتا۔ مضمون سے جب پتہ چلتا ہے کہ تحریک کس طرح کن کن منزلوں

سے گزری ہے تو ”ماورائیت“ کے لفظ سے مفہوم کافی حد تک غیر واضح رہ جاتا ہے اس کی بجائے اگر ”تخیلیت“ یا اس قسم کا کوئی اور لفظ ڈھونڈ لیا جائے تو اچھا ہوگا۔ ”تخیلیت“ بھی حقیقت سے بہت زیادہ قریب ہے۔ محمد صفدر نے کہا کہ ”سوریلزم“ کا لفظ حقیقت سے آگے اور پرے کسی شے کی طرف اشارہ کرتا ہے..... ”ماورائیت“ میں حقیقت سے آگے کا احساس تو آ جاتا ہے لیکن اس لفظ سے فوراً صوفیت کا خیال ذہن میں آتا ہے۔“

سجاد ظہیر: اس لفظ سے میں خود مطمئن نہیں ہوں لیکن اس وقت اگر مضمون کی ماہیت پر بحث کی جائے تو زیادہ اچھا

ہے۔

ظ۔ انصاری نے مضمون کی ماہیت کے سلسلے میں اعتراض کرتے ہوئے کہا..... ”معنوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ لونی اراگان اور اس کا آرٹ خاص ادوار سے گزرا ہے۔ ایک وہ دور جب اراگان بالکل فراری ذہنیت رکھتا تھا، دوسرا وہ دور جب وہ عوامی تحریکوں سے وابستہ ہو گیا۔ اس سلسلہ میں اگر دوسرے دور کے ساتھ پہلے دور کی شاعری کے حصے بھی اس میں پیش کر دیئے جاتے تو زیادہ اچھا تھا۔“

سجاد ظہیر: اس کی کوشش کی گئی تھی مگر اس میں دشواری یہ ہے کہ اس کی پرانی نظمیں اول تو ملتی بہت کم ہیں اور اگر ملتی ہیں تو بے معنی ہیں، سمجھ میں نہیں آتیں۔ اس لیے ان کا ترجمہ کرنا بہت ہی مشکل کام ہے۔

مدھو سودھن: یہ کام انصاری صاحب سرانجام دے دیں گے۔

ظ۔ انصاری: اس کی اب ضرورت نہیں کیونکہ ہماری زبان میں اب ایسا ادب پیدا ہو گیا ہے جو سمجھ میں نہیں

آتا..... (قبہہ)

اس کے بعد مجروح سلطانپوری سے پروگرام کے مطابق غزل سنانے کے لیے کہا گیا۔ مجروح سلطانپوری نے کہا کہ غزل سنانے سے پہلے وہ اپنے اور ترقی پسندوں کی تحریک کے متعلق کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ صاحب صدر کی اجازت پر انہوں نے کہا کہ ”مجھ سے قدوس صہبائی صاحب کی طرف سے یہ کہا گیا ہے کہ انہیں کچھ خطوط ایسے ملے ہیں جن میں پوچھا گیا ہے کہ کیا مجروح سلطانپوری ترقی پسند ہیں؟ اگر ہیں تو کیسے؟ اس سلسلہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارے یہاں مختلف ان خیال لوگ آتے ہیں اور آنے بھی چاہئیں کیونکہ ہماری مخلصانہ باتیں سن کر یہاں آنے والے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اگر ہم غیر ترقی پسندوں کو یہاں آنے سے روکیں گے تو یہ بھی مندر اور اچھوت والا قصہ ہو جائے گا۔“ اپنے متعلق انہوں نے کہا کہ ”میں رجعت پرستی سے سخت نفرت کرتا ہوں اور ترقی پسندی میں انتہا پسند نہیں ہوں۔“

ساحر لدھیانوی: مگر آپ سے یہ کس نے کہا ہے کہ غیر ترقی پسند کو یہاں آنے کی اجازت نہیں ہے؟ ابھی ابھی

لوئی اراگان والے مضمون میں سجاد ظہیر صاحب نے اپنی اور اراگان کی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اراگان نے کہا کہ ہمیں (ترقی پسند ادیبوں کو) سب سے زیادہ خیال اس بات کا رکھنا چاہیے کہ ہم مختلف الخیال لوگوں کو اپنے ہاں بلائیں تاکہ وہ ہم سے قریب ہو کر صحیح راستہ پہچان سکیں۔ اس اصول کے بعد یہ بات عجیب سی معلوم ہوتی ہے۔

صاحب صدر کے استفسار پر قدوس صہبائی نے کہا..... ”میں نے اعتراض نہیں کیا بلکہ پرائیوٹ طور پر مجروح سلطانپوری صاحب کو اطلاع دی تھی کہ چونکہ فضلی فلمز میں آپ کی پیروڈی کے متعلق ”نظام“ کے صفحات میں کافی کچھ چھاپا جا چکا ہے اور اگرچہ یہ مسئلہ ابھی زیر بحث ہے۔“

22 دسمبر 1946ء

اردو ترقی پسند مصنفین کا یہ جلسہ ”یوم مخدوم“ کی شکل میں منعقد ہوا۔

حاضرین کی تعداد آج کے جلسہ میں نسبتاً زیادہ تھی۔ ترقی پسند مصنفین کی گزشتہ میٹنگ میں دیواری اخبار کی تجویز پیش کی گئی تھی۔ اس ہفتہ اس تجویز پر عمل شروع ہوا تھا۔ اس ہفتہ کے دیواری اخبار کے درمیان میں مولے قلم سے مخدوم کا یہ شعر لکھا دکھائی دیتا تھا۔

حیات لے لے کے چلو کائنات لے لے کے چلو

چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے لے کے چلو

..... اور اس شعر کے عین اوپر مخدوم کی بڑی سی ایک تصویر آویزاں تھی..... سیاہی مائل چہرے پر وہی جانی پہچانی

مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ ایک نظر دیکھنے پر معلوم ہوتا تھا جیسے خود مخدوم بیٹھا پورے یقین کے ساتھ کہہ رہا ہو..... ”میں جانتا ہوں تم اس راز کو سمجھ رہے ہو اور میں نے سمجھ لیا ہے.....“

حیات لے لے کے چلو کائنات لے لے کے چلو

چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے لے کر چلو

اس لیے میں عوامی طاقتوں کی مشعل لیے ہر بھٹکنے والے کو راہ دکھا رہا ہوں اور دکن کی سیاہ پتھریلی دھرتی پر خشک

چٹانوں کے پیچھے ایک نئی فوج تیار کر رہا ہوں جس نے ہر استبدادی قوت کے سامنے سینہ تان کر لڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے جو

مستقبل کے معماروں کی فوج ہے اور جو سارے زمانے کو ساتھ لے کر چلنے کے لیے اٹھی ہے۔ ان کے جسم صدیوں کے ظلم

سے دب گئے ہیں مگر اب اپنے پرانے ملبوسات کو اتار رہے ہیں۔ یہ بہت بھولے ہیں، معصوم ہیں، سادہ ہیں، اپنی راہ

میں بچھے ہوئے کانٹوں کو ہٹانے سے ڈرتے ہیں۔ میں پوری قوت سے آگے بڑھ کر ان سے نجات پانے کے لیے کہہ رہا

ہوں۔ کیا تم نے میری آواز نہیں سنی! میں تمہاری آواز کا منتظر ہوں۔“

مینگ شروع ہوتے ہی سیکرٹری نے پچھلے ہفتے کی روداد پڑھ کر سنائی۔ اس کے بعد سجاد ظہیر نے ”یوم مخدوم“ کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے مخدوم کی شاعری اور شخصیت کا مختصر تعارف کرایا۔ انہوں نے کہا کہ آج ہر طرف سے رجعت پرست ترقی پسندوں پر حملہ کر رہے ہیں اور حملے اس وقت تک ختم نہیں ہو سکتے جب تک اس رجعت پرستی کا بالکل خاتمہ نہیں ہو جاتا اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب ہم شعر و ادب میں ترقی پسندی کے ساتھ ساتھ عملی دنیا میں بھی پورے ترقی پسند ہو جائیں، ایسے ترقی پسند جیسا کہ مخدوم ہے۔ انہوں نے بتلایا..... ”مخدوم حیدر آباد کے کالج میں پروفیسر تھے۔ نظریاتی طور پر وہ بہت پہلے ترقی پسند ہو گئے تھے۔ یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب ہمارے ساتھ سبب حسن بھی حیدر آباد میں تھے۔ سبب حسن اور مخدوم میں بہت مباحثے ہوتے رہتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مخدوم نہ صرف مکمل ترقی پسند شاعر ہو گئے بلکہ وہ پورے ترقی پسند انسان بھی بن گئے اور اس طرح ان کی زندگی میں ایک ایسا وقت آیا جب انہوں نے محسوس کیا کہ انہیں ابھی اور آگے بڑھایا جائے چنانچہ وہ نوکری چھوڑ کر اپنا وقت مزدوروں اور کسانوں کو دینے لگے۔ ادبی محاذ پر انہوں نے حیدر آباد کو ریاست ہونے کے باوجود ترقی پسند ادب کا ایک مضبوط قلعہ بنا دیا اور آج حیدر آباد میں جب بھی کوئی کانفرنس یا مشاعرہ کیا جاتا ہے، اس کا مطلب ترقی پسندوں کا اجتماع ہوتا ہے۔ سیاسی محاذ پر مخدوم پچیس ہزار مزدوروں کو ٹریڈ یونینوں میں لائے۔ آج وہ ٹریڈ یونین کانگریس کا صدر اور وہاں کے مزدوروں اور کسانوں کے محبوب رہنما ہیں.....“ سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے انہوں نے کہا..... ”ان دنوں حیدر آباد کی حکومت ہر سطح سے عوامی تحریکوں کو دبانے کی کوشش کر رہی ہے وہاں کمیونسٹ پارٹی کو اور مزدوروں کے اداروں کو غیر قانونی قرار دیا گیا ہے۔ مخدوم کے وارنٹ جاری ہو چکے ہیں لیکن وہ مزدور رہنما روپوش ہو کر حکومت سے برابر ٹکر لے رہا ہے۔“

آخر میں انہوں نے کہا..... ”ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم مخدوم اور حیدر آباد کی موجودہ عوامی تحریک سے متعلق ایک پمفلٹ شائع کریں تاکہ انجمن کے ایک ممتاز رکن کی زندگی کو مثال کے طور پر پیش کیا جاسکے۔“

”یوم مخدوم“ کے سلسلے میں مرکزی عوامی تہذیبی دستے کے تین رکن بنا دیئے۔ پریتی سرکار اور پریم دھون بھی آج کی محفل میں شریک ہوئے تھے۔ سجاد ظہیر کی اس مختصر تقریر کے بعد ان تینوں نے مخدوم کا مشہور ترانہ ”یہ جنگ ہے جنگ آزادی.....“ گایا۔

اس کے بعد سردار جعفری نے ”سرخ سویرے کا شاعر“ کے عنوان سے اپنا مضمون پڑھا۔ مضمون کافی طویل اور بے حد دلچسپ تھا، مخدوم کی شخصیت اور شاعری پر اتنا اچھا تبصرہ غالباً پہلے کبھی نہیں ہوا۔ بنارس جیل میں سردار جعفری اور

مخدوم کی پہلی ملاقات سے لے کر آج تک کے مخدوم پر یہ مضمون بے حد پسند کیا گیا۔ صدر جلسہ اس مضمون سے کافی متاثر ہوئے اور اس کے خاتمہ پر انہوں نے کہا کہ ”اس مضمون پر غالباً کچھ نہیں کہا جائے گا“۔

لیکن ظ۔ انصاری صاحب نے اپنے آئینی لہجہ میں صدر کو متنبہ کرتے ہوئے فوراً جواب دیا۔ ”یہ فیصلہ آپ نے کیسے کیا؟“ صدر صاحب جھینپ گئے اور ظ۔ انصاری کے وجود پر ایمان لاتے ہوئے بولے..... ”فرمائیے.....“

ظ۔ انصاری نے مخصوص لہجہ میں جواب دیا۔ ”جعفری صاحب! نثر کی غالباً یہ پہلی چیز ہے جو میں نے آپ سے سنی ہے اور اسے سننے کے بعد میرا یہ یقین متزلزل ہو گیا ہے کہ آپ صرف نظم ہی اچھی لکھتے ہیں لیکن ایک بات کہوں کہ اقبال اور ٹیگور کے قومی اور مخدوم کے بین الاقوامی ترانوں کے مقابلے کا ٹکڑا کچھ غیر موزوں سا معلوم ہوتا ہے۔“

سردار جعفری نے کہا کہ ”انہوں نے یہی لکھا ہے کہ اقبال کا.....“

سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا

اور ٹیگور کا.....

جن من گن ادھن نائے

..... دونوں جغرافیائی وحدت لیے ہوئے ہیں لیکن مخدوم کی نظم کی سرحدیں کہیں ختم نہیں ہوتیں۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے کہا۔ ”!چونکہ اقبال نے یہ نظم 1905ء میں لکھی تھی جب ہماری تحریک اتنی اٹھی ہوئی نہیں تھی جتنی کہ اب ہے جب مخدوم نے یہ نظم لکھی اور ٹیگور نے بھی ہندوستان کے ہی حسن، عظمت اور بزرگی کو بیان کیا، جو جغرافیائی وحدت لیے ہوئے ہے لیکن مخدوم کہتا ہے.....“

سارا سنسار ہمارا ہے

ہم افرنگی، ہم امریکی، ہم چینی جاں بازان وطن، ہم سرخ سپاہی ظلم شکن، آہن پیکر فولاد بدن، کیونکہ اس وقت ملکوں کی سرحدیں ختم ہو چکی ہیں۔“ انہوں نے کہا کہ مضمون کے اسی ٹکڑے کے ساتھ ایک فقرے میں اقبال اور ٹیگور کی شخصیات کو ہمالیہ اور مخدوم کو دریا سے تشبیہ دی گئی ہے۔

سجاد ظہیر: آپ نے اپنے مضمون میں ٹیگور اور اقبال کی شخصیت کا مقابلہ کیا ہے یا ان دونوں کی ان نظموں سے مخدوم کی نظم کا؟

سردار جعفری: صرف ان تینوں نظموں کا ذکر کیا ہے اور اس کی وجہ یہ بتائی جا چکی ہے کہ یہ مضمون لکھنے کا خیال مجھے ایک ایسی محفل میں سو جھا تھا جہاں مختلف صوبوں کے آدمی جمع تھے اور جہاں یہ تینوں نظمیں پڑھی گئی تھیں۔ جہاں تک

شخصیات کے مقابلے کا تعلق ہے وہ تو ہو ہی نہیں سکتا اور نہ ہی اس کا سوال پیدا ہوتا ہے۔

ظ۔ انصاری نے سردار جعفری سے ایک اور سوال پوچھتے ہوئے کہا۔ ”جہاں آپ نے درمیانی طبقے کی قدروں کو روند کر آگے بڑھنے کا ذکر کیا ہے، وہ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔“

سردار جعفری نے کہا کہ ”ایک دور میں درمیانی طبقے کی ہر قدر کو روندنا ہی ترقی پسندی سمجھا جاتا تھا۔“ اس سلسلے میں انہوں نے بتلایا کہ اکثر اوقات کسی امیر دوست کے صوفے پر بیٹھ کر بیڑی پینے کو ترقی پسندی سمجھا جاتا رہا ہے حالانکہ یہ درست نہیں۔

مدھو سودھن نے سردار جعفری سے پوچھا کہ ”اس مضمون میں آپ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ آج کا شاعر مزدوروں میں کام کر کے ہی لکھ سکتا ہے اور یہ کہ یہ بات مخدوم اپنے تجربے کی بناء پر کہتا ہے کہ مزدوروں میں جا کر انسان اپنی جڑیں دھرتی کی گہرائی میں محسوس کرتا ہے لیکن ایک دوسری جگہ آپ نے لکھا ہے کہ مخدوم نے کہا کہ مزدوروں میں کام کرنے کے بعد شاعری جاری نہیں رکھی جاسکتی۔“

سردار جعفری: اس سے مراد یہ ہے کہ مزدوروں میں بارہ چودہ گھنٹے کام کرنے کے بعد اتنی فرصت نہیں ہوتی کہ انسان باقاعدہ شعر لکھتا رہے۔ یہ بات اگر فقرے سے صاف طور پر واضح نہیں ہوتی تو اسے واضح طور پر لکھ دیا جائے گا۔ اس کے بعد مجروح سلطان پوری نے مخدوم کی مشہور نظم ”انقلاب“ سنائی جس کا ٹیپ کا مصرعہ یہ ہے..... گزر بھی جا کہ تیرا انتظار کب سے ہے

ظ۔ انصاری نے ”مخدوم“ کے عنوان سے ایک نظم سنائی جو بے حد پسند کی گئی۔

مجروح سلطان پوری نے کہا کہ ”اس نظم میں درد کو مؤنث باندھا گیا ہے حالانکہ درد مذکر ہے۔“

ظ۔ انصاری: درد فارسی کا لفظ ہے اور اسے مذکر یا مؤنث دونوں طرح استعمال کیا جاسکتا ہے۔

وشوا متر عادل: تو پدرا اور مرغ کو آپ کیا کہیں گے؟

ظ۔ انصاری: اس کا فیصلہ یہ لفظ استعمال کرنے کے تصور کے احساس سے ہو سکتا ہے۔

باقاعدہ پروگرام ختم ہونے کے بعد پریتی نے پریم دھون کا لکھا ہوا ایک گانا سنایا جو تہذیبی دستے نے فساد کے

موضوع کے لیے تیار کیا تھا اور بنارائے نے ایک بنگالی گیت سنایا۔ اس کے بعد پریم دھون نے دو گیت سنائے، ایک پنجابی اور ایک ہندوستانی اور یہ مجلس ختم ہوئی۔

29 دسمبر 1946ء

اردو ترقی پسند مصنفین کا یہ اجلاس صہبائی کی صدارت میں ہوا۔

حاضرین: سجاد ظہیر، سردار جعفری، کیفی اعظمی، مجروح سلطان پوری، رضیہ سجاد ظہیر، انور، مدھو سوڈھن، محمود بریلوی، ایم۔ این۔ وائل، رفعت سروش، محمد مہدی، ظ۔ انصاری، محمد علی، پریم دھون، محمد صفدر، نشاط شاہدوی اور دوسرے اصحاب۔

سیکرٹری کے روادار سنانے کے بعد رفعت سروش نے دو نظمیں سنائیں جنہیں پسند کیا گیا۔ ایک نظم کا مصرعہ تھا.....

اپنی منزل کی طرف پھر بھی بڑھا جائے گا

”بڑھا جائے گا“ کے متعلق سجاد ظہیر نے کہا کہ ”بڑھا جائے گا“ کے معنوں میں بڑھے جائے گا کچھ کھلتا ہے، کیا

یہ صحیح ہے؟“

کیفی اعظمی نے کہا کہ ”بعض جگہ مثلاً دہلی میں ”بڑھتا جائے گا“ لکھا جاتا ہے۔ اس لیے اسے صحیح سمجھ لینے میں کوئی خاص ہرج نہیں۔“

اس کے بعد محمود بریلوی نے جو اس مجلس میں بالکل نئے تھے ”ہندو اور اردو شاعری“ کے عنوان سے ایک مقالہ سنایا۔

مقالہ ختم ہوتے ہی ظ۔ انصاری نے کہا..... ”اگر یہ تنقیدی اصولوں کو پیش نظر رکھ کر لکھا گیا ہے تو اس میں تنقید کہیں نہیں ہے اور اگر یہ اردو کے ہندو شاعروں کی فہرست بنانے کے خیال سے لکھا ہے تو فہرست مکمل نہیں ہے۔“ محمود بریلوی نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ وہ اردو ادب کی تاریخ پر ایک کتاب لکھ رہے ہیں۔ اس کتاب میں سے ایک چھوٹا سا حصہ نکال کر انہوں نے یہاں پر پڑھ دیا ہے۔

ظ۔ انصاری: مگر آپ کے مقالے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اردو شاعری میں ہندوؤں نے مسلمانوں کا ہاتھ بٹایا حالانکہ اردو مسلمانوں اور ہندوؤں کی مشترکہ میراث ہے۔

محمود بریلوی نے کہا کہ وہ انصاری صاحب کی اس رائے سے متفق ہیں کہ اردو ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ میراث ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ ”ہندوؤں نے مسلمانوں کا ہاتھ بٹایا“ والے فقرے سے ممکن ہے غلط فہمی پیدا ہوتی ہو مگر ان کا مقصد یہ ہرگز نہیں تھا لیکن چونکہ انہوں نے سیکرٹری کے کہنے پر جلدی میں اس کتاب میں سے یہ حصہ چن لیا تھا، اس لیے ہو سکتا ہے آپ ٹھیک کہتے ہوں۔

آخر میں انہوں نے کہا..... ”مجھے صرف مضمون پڑھنے کے لیے کہا گیا تھا۔ یہ نہیں بتلایا گیا تھا کہ یہاں پر تنقید ہوتی ہے اور اس زور کی ہوتی ہے۔“ کیفی اعظمی نے کہا ”اس مضمون کی تمام خوبیوں کے باوجود یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس سے کون سا مقصد حل ہوتا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ اس سے پہلے انجمن ترقی اردو والے بہت سی کتابیں اس قسم کی چھاپ چکے ہیں جن میں ہندو شعراء کی مثالیں پیش کر کے وہ اردو کو مشترکہ زبان ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ بات کچھ دیر پہلے ٹھیک تھی مگر اب حالات کچھ اور شکل اختیار کر چکے ہیں کیونکہ ہر بات کے کچھ تاریخی اسباب ہوتے ہیں۔ اگر آپ کا خیال ہے کہ ایسی کوششوں سے آپ لوگ ان اختلافات کی خلیج پاٹ سکتے ہیں تو یہ درست نہیں کیونکہ ان حالات میں یہیں بہت سی اور باتوں پر غور کرنا ہوگا۔“

نیز انہوں نے مقالے کے اس حصے پر اعتراض کرتے ہوئے جس میں مقالہ نگار نے مہاراجہ کشن پرشاد کے متعلق لکھا تھا کہ ”اردو شعراء کی سرپرستی کرتے تھے، کہا.....“ یہ بات قطعی طور پر غلط ہے کیونکہ انہی کے زمانے میں فانی مرحوم حیدرآباد میں جو تیاں چٹھاتے پھرتے رہے۔ کشن پرساد کو ان کی سرپرستی کی توفیق نہیں ہوئی۔ انہی کے زمانے میں جوش ملیح آبادی پر حیدرآباد جانے کی پابندی لگی جو اب تک قائم ہے۔ ہاں یہ درست ہے کہ جو شاعر درباری آداب بجالاتے رہے، انہیں جاگیریں بھی ملیں اور یہ بھی کہہ دیجئے کہ ان کی سرپرستی بھی کی گئی مگر اس سے عوام یا کسی عوامی تحریک کو کوئی فائدہ پہنچا ہو مجھے اس سے اختلاف ہے۔“

محمود بریلوی: میں یہ تسلیم کرتا ہوں اور اتنی زوردار تنقید کے بعد بحث کرنے کی مجھ میں ہمت نہیں لیکن میری ایک درخواست ہے کہ جب کوئی نیا آدمی یہاں آئے تو ذرا نرمی سے کام لیا جائے۔ (اس پر ایک زوردار قہقہہ پڑا)۔
اس کے بعد نشاط شاہدوی نے ”صلیب کے سائے میں“ کے عنوان سے ایک نظم پڑھی۔

محمد مہدی نے کہا..... ”ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر مغربی شہنشاہیت پر چوٹ کرنا چاہتا ہے مگر نظم کے مجموعی تاثر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پوری چوٹ مشین پر ہے۔“

حمید اختر: مشینوں میں عزرائیل کی روح پھونکے جانے سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ شاعر مشین کے وجود کے خلاف کچھ نہیں کہہ رہا ہے بلکہ اس عزرائیل کی روح کو برا سمجھتا ہے جو سرمایہ دار طبقے نے اپنی بھلائی کے لیے مشین میں پھونک دی ہے۔

نیاز حیدر: مگر یہ پہلو واضح نہیں ہے۔

مجروح سلطان پوری: اگر شاعر نے صلیب کو عیسائیت کے Symbol کے طور پر استعمال کیا ہے تو نظم مبہم ہے

اور اس میں عیسائیت کے بنیادی عقائد پر چوٹ معلوم ہوتی ہے۔

نشاط شاہدوی نے کہا..... ”اس نظم کا مرکزی خیال یہ ہے کہ مفلسی اور بیکاری کی وجہ سے لوگ عام طور پر عیسائی جاتے ہیں تاکہ انہیں مادی آسائشیں مل سکیں۔ اسی قسم کا ایک ہندو نوجوان گر جا جاتا ہے، وہاں صلیب کے سامنے جو کچھ دیکھتا اور سوچتا ہے اس سے اس کا دماغ معطل ہو جاتا ہے کہ انگریزوں نے باوجود حبشیوں میں انسداد غلامی کے ہندوستان جیسے پورے ملک کو غلام بنا لیا ہے..... وغیرہ وغیرہ“۔

ظ۔ انصاری: جو کچھ آپ نے بتلایا وہ نظم سے بھی ظاہر ہو جاتا ہے لیکن اس نوجوان کے سوچنے میں تسلسل بھی ہونا چاہیے۔ وہ کبھی عیسائیت کے بنیادی اصولوں پر نکتہ چینی کرتا ہے اور پھر مشینوں میں عزرائیل کی طرح حلول کر جانے غور کرتا ہے جہاں تک حبشیوں کی غلامی کا تعلق ہے، اب بعض عربوں نے بھی اسے رنج کیا ہے۔

نشاط شاہدوی: میرا مطلب یہی ہے کہ انگریزی عربوں کے برے رواجوں کو ختم کرنے کے لیے انسداد غلامی کا قانون پاس کرواتے ہیں اور پھر خود اتنے بڑے ملک کو غلام بنا لیتے ہیں۔

ظ۔ انصاری نے کہا کہ یہ چیز واضح نہیں، آپ اس نظم پر نظر ثانی کریں تو اچھا ہے۔

قدوس صہبائی نے کہا کہ ان کے خیال میں صلیب سے پھانسی کا تصور ذہن میں آتا ہے۔ میرے خیال کے عنوان غلط ہے اور نظم میں Treatment اچھا نہیں ہے۔

سردار جعفری کا خیال تھا کہ نظم مبہم نہیں۔ انہوں نے کہا کہ ایک شاعر کے قول کے مطابق انگریز نے اپنی تہذیب کوڑوں، بائبل اور آتشک کے ذریعہ پھیلائی ہے۔ ہندوستان میں عیسائیت سامراج اور شہنشاہیت کے ساتھ ساتھ آئے والے پادریوں کے گروہ کے گروہ لائے ہیں۔ اس لیے نظم میں غلامی اور سامراج کا ذکر واضح طور پر نظر نہیں آتا لیکن نظم مبہم نہیں ہے۔

پہلے مصرعے سے تو یہ صاف طور پر ظاہر ہو جاتا ہے۔

نظم کے ایک حصے کے متعلق انہوں نے کہا۔ ”تیری بانہوں کا سہارا لے کر“ میں افلاس اور غلامی کا انداز نہیں ظاہر ہوتا بلکہ جنس حاوی ہو جاتی ہے۔

ظ۔ انصاری نے سردار جعفری سے کہا کہ ان کے اس بیان سے ایسا معلوم ہونے لگا ہے جیسے اب تک جو کچھ اس نظم کے بارے میں کہا گیا ہے وہ سب غلط فہمیوں کی بناء پر کہا گیا تھا جو اب دور کر دی گئی ہیں۔

قدوس صہبائی: لیکن یہ ان کی بات ہے آپ بے شک اسے تسلیم نہ کریں ویسے سردار جعفری نے آپ کے

Negative بیان کو Positive میں لے لیا ہے جس سے سب کچھ واضح ہو جاتا ہے اور سردار جعفری کا بیان آپ کے بیان کا نتیجہ ہے۔

اس کے بعد نیاز حیدر نے اپنا گیت سنایا۔

سردار جعفری نے کہا۔ ”آپ نے افریقیوں کے بجائے افرنگوں لکھا ہے، یہ صحیح نہیں ہے۔“ نیاز حیدر نے اسے تسلیم کر لیا۔

ظ۔ انصاری نے نیاز حیدر کے گیت کے ایک مصرعہ کے متعلق کہا۔ ”وہ جوش و خروش کی پھنکاریں“ میں ”ش“ غائب ہو جاتا ہے۔

سردار جعفری نے کہا کہ بحر جس میں یہ نظم ہے، فارسی کی نہیں بلکہ ہندی کی ہے اور یہ اردو میں رائج اور یہ وہی بحر ہے جس میں..... ”الٹی ہو گئیں سب تدبیریں.....“ ہے۔

انہوں نے کہا کہ یہ اردو میں رائج ہے اور جائز ہونے کی سند انہیں اس وقت یاد نہیں، وہ اگلے ہفتے دے دیں گے۔

ظ۔ انصاری: تو پھر اگلے ہفتے پر بات رہی۔

پروگرام کے مطابق مجروح سلطان پوری نے ایک غزل سنائی جو بے حد پسند کی گئی۔

محمد ماجد نے کہا کہ اس غزل کے بارے میں کچھ کہنا اگرچہ بدذوقی ہے لیکن غزل کے اس مصرعہ میں.....
”جو بہت بڑھیں تیری منزلیں تو قدم کے خار نکل گئے“

”قدم“ پاؤں کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ کیا یہ صحیح ہے؟

کیفی: میرے خیال میں دونوں طرح ٹھیک ہے لیکن یہاں ناگوار گزرتا ہے۔

کیفی اعظمی نے غزل کے پہلے مصرعہ پر اعتراض کرتے ہوئے کہا..... ”مجھے سہل ہو گئیں منزلیں وہ ہوا کے رخ

بھی بدل گئے“ میں اگر رخ سمت کے معنوں میں استعمال ہوا ہے تو یہ صحیح نہیں ہے۔“

مجروح: رخ انداز کے معنوں میں استعمال ہوا ہے یعنی ہوا کے انداز بھی بدل گئے۔ میرے خیال میں یہ صحیح ہے۔

قدوس صہبائی: اگر ”زمانے بدل گئے“ درست ہے تو ”وقت بدل گئے“ بھی درست ہے اور ”ہم نے اچھے

وقت دیکھے ہیں“ وغیرہ بولا جاتا ہے۔

کیفی: مگر میرا اعتراض قائم ہے اس لیے کہ یہاں ”رخ“ ہے اور اب تک ”رخ بدل گئے“ نہیں بلکہ ”رخ بدل

گیا“ استعمال ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے کہا..... ”مجھے سہل ہو گئیں منزلیں“ خلاف فصاحت ہے۔

مجروح: اگر سامع کے طور پر لوگوں کو یہ اچھا معلوم ہوتا ہے کہ ہوا ہے تو میرے خیال میں اسے نہیں بدلنا چاہیے۔
آخر میں مجروح سے دو غزلیں اور سنی گئیں اور مجلس ختم ہو گئی۔

5 جنوری 1947ء

اردو ترقی پسند مصنفین کا یہ اجلاس ساحر لدھیانوی کی صدارت میں منعقد ہوا۔

حاضرین: سجاد ظہیر، رضیہ سجاد ظہیر، سردار جعفری، کیفی اعظمی، ساحر لدھیانوی، مدھو سودھن، انور، وشوا متر عادل، مہندر ناتھ، کلیم اللہ، قدوس صہبائی، محمد صفدر، ظ۔ انصاری، محمد مہدی، یزدانی جالندھری، عادل رشید، عالی جعفری، محمد اقبال چودھری، محمد حسین جعفری، محمد یوسف، محمد اسحاق، سالک انصاری، نشاط شاہدوی، بالم، جنید، ارشد بیگ چغتائی۔

سیکرٹری نے پچھلی میٹنگ کی روداد پڑھ کر سنائی۔ اس کے بعد عادل رشید نے ”سرخ سویرا“ کے عنوان سے ایک افسانہ پڑھا۔ افسانہ ختم ہونے پر مدھو سودھن نے کہا..... ”افسانہ بہت طویل ہے“۔ کیفی اعظمی نے کہا..... ”طویل ہونے کے علاوہ یہ فیصلہ بھی ہونا چاہیے کہ یہ افسانہ ہے بھی یا نہیں؟“

وشوا متر عادل: اسے افسانہ نہیں کہا جاسکتا۔ یہ ایک قسم کا سیاسی تبصرہ ہے۔

کیفی اعظمی:..... اور تبصرہ بھی بالکل کچا ہے۔ پچھلی جنگ عظیم سے لے کر موجودہ جنگ تک ایک بیان سا ہے اور اس کے بعد عارضی حکومت بننے کا ذکر ہے پھر افسانے کا مرکزی کردار کہتا ہے کہ اس عارضی حکومت سے تو وہی دفتری حکومت اچھی تھی جو اس سے پہلے قائم تھی۔ حالانکہ یہ چیز غلط ہے کیونکہ سچا مزدور، لال نشان والا، جیسا کہ اس افسانے کے مرکزی کردار کو بتایا گیا ہے، کبھی یہ نہیں کہہ سکتا۔ اگر یہ کہانی ہے تو کہانی لکھنے والے کی عملی سیاست اور مزدوروں کی زندگی سے بے خبری اس سے صاف ظاہر ہوتی ہے۔ کہانی میں شروع سے آخر تک ایک سیدھا سا خط کھینچ دیا گیا ہے لیکن افسانہ کی بڑی شرط افسانویت ہے جو اس میں کہیں نہیں۔ اس کے علاوہ افسانے کو دلچسپ بھی ہونا چاہیے مگر اس میں دلچسپی نام کو نہیں۔

ارشاد بیگ چغتائی: میرے خیال میں افسانے کے لیے دلچسپ ہونے کی کوئی شرط نہیں۔

کیفی: یہ ٹھیک ہے لیکن کامیاب افسانے میں اتنی دلچسپی ضرور ہونی چاہیے کہ پڑھنے والا اسے اچھی طرح پڑھ سکے مگر افسانویت بے حد ضروری ہے جو اس میں بالکل نہیں ہے۔

سردار جعفری: میں کیفی کی رائے سے اتفاق کرتا ہوں۔ کسی بھی کردار کے نہ ابھرنے کی وجہ سے اسے افسانہ نہ

نہیں کہا جاسکتا۔ اس میں کوئی تجزیہ نہیں۔ افسانے کی کوئی بھی خصوصیت نہیں ہے۔ پہلے خیال تھا کہ اگر افسانہ مکمل افسانہ نہیں ہے تو کم از کم سیاسی تبصرہ ہی ٹھیک ہوگا۔ مثلاً افسانے میں پچھلی جنگ کے بعد کے وقت کا ذکر کرتے ہوئے قائد اعظم کا ذکر کیا گیا ہے۔ حالانکہ یہ خطاب اس وقت تک وجود میں نہیں آیا تھا۔

عادل رشید: قائد اعظم کا ذکر افسانے کے دوسرے حصے میں ہے۔ پہلی جنگ کا ذکر ختم کرنے کے بعد دوسری جنگ کے ذکر کی ابتداء میں قائد اعظم کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہاں سے افسانے کا دوسرا حصہ شروع ہوتا ہے۔

ساحر لدھیانوی: یہ ٹھیک ہے قائد اعظم کا ذکر اس وقت ہوا ہے جب دوسری جنگ عظیم کے متعلق لکھا گیا ہے اور یہ پہلے حصے سے علیحدہ ہے۔

سردار جعفری: مگر اس کے علاوہ اس افسانے میں لکھا ہوا ہے کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد دنیا اسی جگہ ہے جہاں پہلے تھی۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ آج برطانوی ہی نہیں، دنیا بھر کی شہنشاہیت کمزور ہو چکی ہے۔ پچھلی جنگ کے بعد تحریکیں ابھریں، اتنی ابھریں کہ دنیا کے 1/2 حصے پر عوام کی حکومت قائم ہو گئی یعنی سوویت روس میں۔ اس کے علاوہ ایشیا کی آزادی کی تحریکیں مضبوط ہوئیں۔ ہندوستان، چین اور اسلامی ممالک کی آزادی کی تحریک کہیں بھی اس افسانے میں نظر نہیں آتی۔

اس میں صرف ایک بات نظر آتی ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار یہ کہتا ہے کہ چونکہ برطانوی امپریلزم اس وقت بھی تھی اور آج بھی ہے اس لیے دنیا نے کوئی ترقی نہیں کی۔ اسی طرح دوسری جنگ کے بعد کا ذکر کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ لڑائی بھی چودھراہٹ قائم رکھنے اور بانٹ چوٹ کرنے کے لیے لڑی گئی ہے، یہ غلط ہے۔ اس جنگ میں انسانیت کی بہبود کے لیے کوششیں کی گئیں اور جس طرف سے ایسی کوششیں ہوئیں انہیں کامیابی ہوئی۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اگرچہ ہندوستان عملی شکل میں غلام ہے لیکن یورپ سے برطانوی اور امریکی سایہ اٹھ چکا ہے۔ یورپ میں کوئی ملک ایسا نہیں جہاں مزدور تحریک مضبوط نہ ہوئی ہو۔ یونان میں اگرچہ امپریلسٹوں کی ریشہ دوانیاں جاری ہیں لیکن عوامی طاقتیں وہاں بھی ابھر رہی ہیں۔

یہ افسانہ اگرچہ اپنی ظاہری شکل میں سیاسی ہے لیکن اس کا مرکزی کردار سیاست میں کبھی حصہ نہیں لیتا۔ افسانے میں شروع سے لے کر آخر تک وہ ہمیں کھولی میں اوندھا لیٹا نظر آتا ہے۔ وہ اسی طرح اپنی عمر گزار دیتا ہے۔ آخر میں فساد کے دنوں میں وہ دو چہرے کھاتا ہے اور یکا یک اسے سرخ سویرا نظر آنے لگتا ہے حالانکہ اس کا کوئی نفسیاتی پس منظر بیان نہیں کیا گیا۔

وشوا متر عادل: میرے خیال میں افسانے کا عنوان بدل دینا چاہیے۔

ساحر: عنوان بدلنے والی تو کوئی بات نظر نہیں آتی۔

قدوس صہبائی: افسانے میں زبان کی غلطیاں بھی ہیں مثلاً ”لیڈران قوم“ اور ”لیڈران ملک“ غلط ہے۔

سجاد ظہیر: لیکن آج کل یہ عام طور پر استعمال ہوتا ہے جو طنزیہ طور پر ”لیڈران قوم“ اور ”لیڈران ملک“ کہا جاتا

ہے۔

قدوس صہبائی: ویسے تو استعمال ہوتا ہے لیکن ادبی افسانے میں ٹھیک نہیں۔

اس کے بعد حمید اختر نے ابراہیم جلیس کے ناول ”چور بازار“ پر لکھا ہوا تبصرہ پڑھا۔ ساحر لدھیانوی نے کہا کہ

تبصرے کے اس آخری فقرے یعنی ”چور بازار اس دور کے ادب میں تاریخی حیثیت رکھتا ہے“ کا سارے تبصرے سے کوئی

تعلق معلوم نہیں ہوتا۔

حمید اختر: تبصرے میں ناول کی خامیوں اور خوبیوں دونوں کا ذکر ہے۔ آخر میں ناول کو تاریخی حیثیت اس لیے

دی گئی ہے کہ اگرچہ اس میں خامیاں ہیں مگر اس کے باوجود نچلے متوسط طبقے کے نوجوانوں کی زندگیوں کے مکمل خاکے اس

میں پیش کیے گئے ہیں جو اردو ادب میں اس سے پہلے اس طرح پیش نہیں کیے گئے تھے۔

محمد مہدی: میرے خیال میں یہ درست نہیں کیونکہ ہمارے ملک میں آج کل کے تقریباً سبھی لکھنے والے متوسط یا

نچلے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لیے اکثر لکھنے والوں نے اس طبقے کے نوجوانوں کی زندگی کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔

انور: تبصرے سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اور لوگوں نے بھی لکھا ہے لیکن ”چور بازار“ کے مصنف نے بہت سچے اور

صحیح خاکے پیش کیے ہیں۔

سردار جعفری: میرے خیال میں جس قسم کے نوجوان اس ناول میں پیش کیے گئے ہیں ان کو متوسط طبقے کے

نوجوانوں کا نمائندہ نہیں کہا جاسکتا۔ اگرچہ اس قسم کے نوجوان بھی ہوتے ہیں لیکن اس کے علاوہ دوسرے نوجوان بھی ہیں جو

صحیح دل و دماغ سے سوچتے ہیں۔

حمید اختر: میرا مقصد یہ تھا کہ جس قسم کے نوجوانوں کو اس ناول میں پیش کیا گیا ہے، ہمارے نچلے متوسط طبقے میں

اس قسم کے نوجوانوں کی اکثریت ہے اور ان کے متعلق اسی طرح آج تک نہیں لکھا گیا جس طرح جلیس نے لکھا ہے اس

لیے اسے تاریخی حیثیت دی گئی ہے۔

سجاد ظہیر نے کہا کہ وہ اس رائے سے متفق نہیں ہیں کہ اکثریت ایسے نوجوانوں کی ہے۔ یہ تو کہا جاسکتا ہے کہ نچلا

توسط طبقہ تاریخی حیثیت سے زوال پذیر ہے، اس کے ساتھ ساتھ نئی زندگی کی تڑپ بھی ہے مگر اس ناول کے کردار کشمکش اور الجھن میں گرفتار رہتے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ ان کو کسی نے زہر دے دیا ہے۔ وہ نیچے سے نیچے ہی چلے جاتے ہیں اور یہ اخلاقی اور جسمانی انحطاط اس وقت تک جاری رہے گا جب تک وہ زندہ ہیں۔ ناول میں اس طبقے کے بدترین افراد کو پیش کیا گیا ہے جنہوں نے زندگی سے ہار مان لی ہے۔ اس لیے اسے تاریخی حیثیت دینا درست نہیں معلوم ہوتا۔

حمید اختر: میں آخری فقرہ بدل دوں گا۔

ساحر لدھیانوی نے کہا..... ”آخر میں تبصرہ نگار نے کہا کہ ہے کہ ہر اردو پڑھنے لکھنے والے نوجوان کا فرض ہے کہ وہ اس ناول کا مطالعہ کرے، یہ کہاں تک صحیح ہے؟“

حمید اختر: یہ میری رائے ہے، آپ بے شک نہ پڑھیں۔

محمد صفدر: نچلے متوسط طبقے کے اکثر نوجوان فرسٹریشن کا شکار ہو رہے ہیں اور یہ اب بھی جاری ہے۔ ابھی تک اس چیز کو نفسیاتی نقطہ نظر سے سامنے نہیں لایا گیا۔ میرے خیال میں اس پہلو پر بھی روشنی ڈالنی چاہیے۔

سردار جعفری: اس چیز پر کسی دوسرے وقت بحث کی جائے گی۔

مدھوسودھن: تبصرے سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ مصنف کا اپنے کرداروں کے بارے میں کیا رویہ ہے؟

حمید اختر: ناول کے عام کرداروں کی طرح مصنف کی اپنے رائے بھی وہی ہے جو ناول کے کسی دوسرے کردار کی کہی جاسکتی ہے۔ مصنف کا کوئی علیحدہ اور واضح نقطہ نظر نہیں دکھائی دیتا۔

پروگرام کے مطابق اب مدھوسودھن نے اپنے ایک طویل افسانے کا پہلا حصہ سنایا۔ چونکہ افسانہ مکمل نہیں تھا اس لیے اس پر بحث نہیں ہو سکی۔

سردار جعفری نے کہا..... ”آپ کچھ بتا سکتے ہیں کہ اس سے آگے کیا ہے؟“

مدھوسودھن نے کہا..... ”دوسرا حصہ تو لکھا جا چکا ہے، آخری حصہ ابھی لکھنا باقی ہے۔ اس کے بعد اس افسانے کا مرکزی کردار فیروز آخر میں اس لڑکی سے شادی کر لیتا ہے۔ شادی کے بعد اسے اس سے نفرت ہو جاتی ہے اور وہ اسے ہر طرح سے تنگ کرتا ہے۔ ایک روز کار میں ہلکا حادثہ ہونے کی وجہ سے لڑکی ڈر جاتی ہے کہ کہیں حمل نہ گر جائے لیکن وہ ہر شام اسے کار میں بٹھا کرتی چلاتا ہے اور اسے ہر طرح سے تنگ کرتا ہے۔ آخر میں حادثہ ہو جاتا ہے اور لڑکی کے ہاں مردہ بچہ پیدا ہوتا ہے۔ آخر میں وہ کہتی ہے کہ ”میں زندگی کو جنم نہیں دے سکی۔“

آخر میں ظ۔ انصاری نے میننگ میں ہونے والی تنقیدوں سے متعلق ایک تجویز پیش کرتے ہوئے کہا کہ.....

”کبھی کبھی ایسا معلوم ہونے لگتا ہے جیسے تنقید کرنے والا محض تنقید کرنے کے لیے بولتا ہے اور اس کے ذہن میں یہ ہونا کہ بس پرزے اڑادیے جائیں۔ حالانکہ سب سے پہلے تنقید کرنے والے کو یہ سوچنا چاہیے کہ اس کی اپنی تنقیدیں جاری رہیں تو نہ صرف یہ کہ کوئی تعمیر کام نہیں ہو سکے گا بلکہ پڑھنے والوں کا بھی برا حال ہو جائے گا۔ اس لیے صدر جلسہ کو اس طرف خاص توجہ دینی چاہیے اور اس چیز پر باقاعدہ غور کرنا چاہیے۔“

سجاد ظہیر نے کہا کہ اس مسئلہ پر وہ بھی کچھ کہنا چاہتے تھے۔ انہوں نے کہا..... ”میں نے نظموں کے سلسلے میں محسوس کیا ہے کہ نظم سن کر فنی اور معنوی طور پر جو اثر ہمارے شعور پر پڑتا ہے اس کی مدد سے ہمیں زیادہ سے زیادہ محفوظ ہونا چاہیے۔ کبھی کبھی یہ معلوم ہونے لگتا ہے کہ اگر ہم صرف اس خیال سے نظم پڑھیں یا سنیں کہ اس میں خرابی یا خوبی کیا ہے تو نظم خواہ اچھی ہو یا بری ہم اس سے محفوظ نہیں ہو سکتے۔“

اس لیے صحیح طریقہ یہ ہے کہ ہم اثر سے لذت یاب بھی ہوں اور اس پر ناقدانہ نظریں بھی رکھیں۔ اگر ہم صرف خط اٹھانے یا صرف تنقید کرنے کی نظر سے نظم پڑھیں یا سنیں گے تو ہمارا مقصد فوت ہو جائے گا۔“ سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے انہوں نے کہا..... ”اسی طرح افسانوں پر خیالات اور کردار نگاری کے لحاظ سے صحیح اظہار خیال ہونا چاہیے۔ پروگرام اسی لیے چھوٹا رکھا جاتا ہے کہ ان پر صحیح تنقید ہو سکے۔“

انہوں نے مزید کہا کہ ”پڑھنے والوں کو خود پتہ ہوتا ہے کہ اس پر تنقید ہوگی اور اس چھوٹے سے جلسہ میں ہمارے یہی کوشش ہونی چاہیے کہ ہم صحیح رائے کا اظہار کریں۔ تنقید والے خواہ نئے ہوں یا پرانے، ان پر سخت سے سخت احتساب ہونا چاہیے۔ جن اصولوں کے سمجھنے میں اختلاف ہو، ان پر بحث ہونی چاہیے لیکن اعتراض کرنے والوں کو خود بہت زیادہ سوچ سمجھ کر چلنا چاہیے۔ اس کے علاوہ جو لوگ یہاں پڑھتے ہیں وہ اگر تنقیدوں سے رنجیدہ ہوں تو میننگ کا فائدہ کیا ہے کیونکہ ہمارا اصل مقصد تو یہ ہے کہ ہم چیزیں سنیں اور اس پر صحیح تنقید کریں۔“

آخر میں انہوں نے کہا کہ ”تنقید میں اگر خلوص اور سنجیدگی ہے تو سخت سے سخت تنقید ٹھیک ہے اور اس میں ہمیں کسی کے سیاسی یا اخلاقی عقیدوں پر چوٹ کے خیال سے بھی ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر ہماری تنقیدوں میں ذرا سا استہزا شامل ہو گیا تو یہ چیز بے حد خطرناک ہوگی۔ اس سلسلے میں سوچ سمجھ کر چلنا چاہیے۔“ اس کے بعد جلسہ برخواستہ گیا۔

19 جنوری 1947ء

یہ دیواری اخبار کا ہفتہ تھا۔ انجمن کی دیواری اخبار ”فانوس“ رضیہ سجاد ظہیر کی نگرانی میں ہر پندرہویں دن نکلتا تھا۔

ہے۔ اس بارے اس سلسلے کا تیسرا نمبر نکلا تھا اور پہلے دو نمبروں سے زیادہ بہتر، زیادہ دلچسپ اور جاذب توجہ تھا۔ خصوصاً دو مضمون..... ”چند معلومات“ اور ”اب تیرا احوال سنا دیں گے ہم ان کو“ بہت دلچسپ تھے۔ ”چند معلومات“ میں ترقی پسند مصنفین کی کچھ کانفرنسوں کا ذکر کیا گیا تھا جن میں ہمارے کچھ نامور ادیب، غریب کارکنوں کی معمولی معمولی فروگزاشتوں پر اس قدر روٹھ جاتے تھے کہ ارادے اور اصرار کے باوجود کانفرنس میں شرکت نہیں کرتے تھے۔ ترقی پسند ادب کی تحریک نے جہاں اور بہت سی تعمیری خدمتیں انجام دیں وہاں پر غیر ضروری تکلفات کو بھی ختم کر دیا۔

”غالب تر احوال سنا دیں گے ہم ان کو“ کی سرخی کے تحت رضیہ سجاد ظہیر نے چند رفیقوں کے ذہنی اور جسمانی کوائف بڑے دلچسپ انداز میں سنائے تھے جو بہت پسند کیے گئے۔ اس اخبار کے بعض اور کالم بہت مفید اور پر لطف رہتے ہیں۔ مثلاً تہذیبی خبریں، کتابیں، ہماری تحریک اور نمبروں کی ادبی سرگرمیاں۔

وہ تمام احباب جو جلسہ شروع ہونے سے کچھ قبل آگئے تھے، دو باتیں ضرور پوچھتے تھے، آج حمید اختر، سردار جعفری، ساحر اور ظ۔ انصاری وغیرہ کہاں ہیں؟

اور یہ سارے ہندوستان میں کمیونسٹوں کے دفتروں اور گھروں کی تلاشیاں کس سلسلے میں ہوئی ہیں؟ پولیس کیا ڈھونڈ رہی ہے، کیا لے گئی؟ قومی حکومت کے ہوتے ہوئے جمہوری حقوق پر یہ حملہ شرمناک ہے وغیرہ وغیرہ۔

حمید اختر، ساحر لدھیانوی، ظ۔ انصاری، سردار جعفری، قدوس صہبائی اور رفعت سروش یہ لوگ رائے پور اردو کانفرنس میں شرکت کے لیے گئے ہوئے تھے اور مدھوسودھن، انور، محمد صفدر، وشو امتر عادل، سجاد ظہیر، سلطانی بیگم، نور بانو، دانیال لطفی، اقبال چودھری، صابر، محمد علی اور دوسرے احباب موجود تھے۔ ٹھیک وقت پر یعنی 3 بجے محمد مہدی صاحب کی صدارت میں اجلاس میں شروع ہوا۔

ابتداء میں رضیہ سجاد ظہیر نے ڈاکٹر ملک راج آنندے کے انگریزی ناول ”قلی“ کے ایک باب کا ترجمہ سنایا۔ عام طور سے حاضرین کی رائے یہ تھی کہ ترجمہ شگفتہ اور سلیس ہے۔ عبارت میں کہیں جھول اور انگریزیت پیدا نہیں ہوئی۔ بعض دوستوں نے دو تین لفظوں کو بدلنے کا مشورہ دیا جس کو مترجم نے منظور کر لیا۔ اس کے بعد جناب رمزی امر و ہوی نے دو قطعے اور ایک نظم سنائی۔ نظم میں موجودہ سماج ک ایک غیر اہم اور مجہول عنصر قدامت پرست سے خطاب تھا۔ رمزی صاحب نے نظم جس جوش کے ساتھ کہی ہے، اسی طرح پڑھی بھی۔

وشو امتر عادل نے اپنے رپورٹاژ ”غندہ ایکٹ کے سائے میں“ کا ایک حصہ بھی اس جلسے میں سنایا۔ یہ رپورٹاژوری کے کسانوں کی ایک انقلابی جدوجہد اور پولیس کے ان مظالم کے متعلق ہے، جن کو حکومت بمبئی غندے پن

کی تہمت کے نیچے دبا دینا چاہتی ہے۔ عادل چند دوستوں کے ساتھ ورلی کسانوں کی حالت خود دیکھ کر آئے ہیں۔ انہوں نے اپنے مشاہدات انگریزی روزنامے ”فری پریس جنرل“ میں بھی شائع کرائے ہیں اور اب ان ہی کو ایک طویل رپورٹ تاثر کی شکل میں لکھ رہے ہیں۔ گزشتہ جلسہ میں انہوں نے صرف وہ تمہیدی حصہ سنایا تھا جس میں اپنی اور اپنے ساتھ جانے والوں کی ذہنی اور نفسیاتی عکاسی کی ہے۔ افسوس ہے کہ اس جلسے میں رپورٹ تاثر مکمل نہ ہو سکا اور انہوں نے تمہید کا مزید کچھ حصہ جو لکھ لیا تھا، وہ سنایا اور باقی واقعات زبانی بتائے۔

رپورٹ تاثر مکمل نہ ہونے کی وجہ سے زیادہ بحث تو نہ ہو سکی لیکن مدھوسودھن، سجاد ظہیر، سلطانہ بیگم، جناب صدر اور دوسرے ساتھیوں نے عادل صاحب کو مشورہ دیا کہ وہ تمہید کا زیادہ حصہ قلم زد کریں ورنہ اندیشہ ہے کہ پس منظر منظر پر اور تمہید نفس مضمون پر غالب آجائے گی۔ خود عادل صاحب کا اصل مقصد بھی ورلی کسانوں کی جدوجہد کو اجاگر کرنا تھا۔ اس لیے انہوں نے مشورے پسند کیے۔

سلطانہ بیگم نے یہ بھی کہا کہ آپ نے جو ایک جگہ ”جوڑے میں پھول نکلے ہوئے تھے“ استعمال کیا ہے، یہ صحیح محاورہ نہیں ہے۔ پھول نکلے ہیں کیونکہ نکلنے کے لیے سوئی کا استعمال ضروری ہے۔

رضیہ سجاد ظہیر: یہ ٹھیک ہے لیکن اب پھول نکلنا عام طور پر استعمال ہوتا ہے۔ میں نے کرشن چندر کے یہاں بھی پڑھا ہے ویسے اچھا بھی لگتا ہے۔

سلطانہ بیگم: اگر آپ یوں کر دیتے کہ ”پھول اڑنے سے ہوئے تھے“ تو بہتر ہوتا۔

رضیہ سجاد ظہیر: اس سے بہتر تو یہ ہوتا کہ ”پھول جوڑے میں گندھے ہوئے تھے“ اور اڑنے کو تو پھول نہیں اڑتے جاتے۔ کلی دار فرس پر پانچامہ اڑسا جاتا ہے۔

محفل میں خوب قہقہے لگے۔ عادل صاحب نے کہا کہ وہ غور کر کے اس ترکیب کو بدل دیں گے۔

عادل صاحب کے رپورٹ تاثر کے بعد اقبال چودھری صاحب ہمارے حلقے میں مہمان کی حیثیت رکھتے تھے جو حال ہی میں سنگا پور سے تشریف لائے ہیں۔ کتاب کا ناسن کر یہ توقع بندھی تھی کہ وہ سنگا پور کے محاذ کے تاثرات اور مشاہدات سنائیں گے لیکن انہوں نے اپنی کتاب کا وہ حصہ سنایا جس میں انہوں نے اپنے نزدیک دوسری جنگ عظیم کے محرکات اور اسباب بتائے تھے۔ یہ حصہ اختلافی بھی تھا مگر دلچسپ بھی۔ اس لیے صدر صاحب نے اپنے محترم مہمان سے کہا کہ وقت بہت کم رہ گیا ہے ورنہ ہم آپ سے کتاب کا کوئی دوسرا باب سننے کی درخواست کرتے۔

آخر میں سجاد ظہیر صاحب نے احباب کے استفسار اور صدر صاحب کی اجازت سے وہ حالات بتائے جو

14 جنوری کو تمام ہندوستان میں کمیونسٹ پارٹی، مزدور سبھاؤں، سٹوڈنٹ یونین اور مہان سوویت کے دفاتر کی تلاش کے سلسلے میں پیش آئے۔ انہوں نے اپنی تقریر میں بتایا کہ نوکر شاہی کا یہ منظم حملہ صرف کمیونسٹ پارٹی پر نہیں ہے اور نہ کمیونسٹ اس حملہ سے خوفزدہ ہیں۔ یہ حملہ دراصل ہماری شہری آزادی، ہمارے جمہوری حقوق اور پریس کی آزادی پر حملہ ہے۔ بے شک کمیونسٹ اخبار نے ان خفیہ اور خطرناک فوجی منصوبوں کا پردہ چاک کیا جو عارضی حکومت کی تشکیل سے پہلے عوامی تحریکوں کو کچلنے کے لیے بنائے گئے تھے۔ کمیونسٹوں کو اپنے اس فرض کی دلیرانہ ادائیگی پر فخر ہے اور تمام مہان وطن کو خوش ہونا چاہیے کہ سامراجی سازشیں پردے میں نہ رہ سکیں لیکن چھ مہینے کی طویل مدت گزر جانے کے بعد حکومت کا اس طرح یکبارگی چونکنا کسی بڑے حملے کی ابتداء ہے۔ دراصل انگریزی حکومت مزدوروں، کسانوں اور ریاستی پر جا کی موجودہ انقلابی تحریکوں سے بوکھلائی ہوئی ہے۔ موجودہ حالت میں جبکہ سارے قومی پریس نے اس حملے کی مذمت کی ہے اور عارضی حکومت کے نائب صدر پنڈت جواہر لعل نہرو نے اعلان کر دیا ہے کہ سیاسی عقائد کے اختلاف کے باوجود یہ اقدام عارضی حکومت کے ایماء سے نہیں ہوا۔ تمام ترقی پسند ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ اس ظالمانہ اقدام کی مخالفت میں آواز بلند کریں اور عارضی حکومت کے اس حملے کی زد میں خود ترقی پسند مصنفین بھی آگئے ہیں اور بنگالی زبان کے مشہور ادیب ہیرن مکر جی کے گھر کی بھی تلاشی ہوئی ہے۔ لہذا ہم کو پر زور طریقے سے حکومت کے اس فعل کی مذمت کرنا چاہیے۔

حاضرین نے متفقہ طور پر یہ طے کیا کہ انجمن کی طرف سے ایک بیان شائع ہونا چاہیے۔ اس بیان کا مسودہ تیار کرنے کے لیے ڈاکٹر ملک راج آنند، مدھو سودھن، وشوا متر عادل اور سجاد ظہیر پر مشتمل ایک کمیٹی چنی گئی اور ہدایت کی گئی کہ کمیٹی جلد از جلد مسودہ تیار کر کے اگلے جلسے میں شریک کرے۔ جلسہ چھ بجے شام کو ختم ہوا۔

26 جنوری 1947ء

دیودھرا اسکول آف میوزک، بمبئی میں کل ہند ترقی پسند مصنفین کا اجتماع ایک نمائندہ اجتماع تھا۔ کچھ عرصے سے تمام زبانوں کے ترقی پسند مصنفین کا مشترکہ اجتماع بھی نہ ہوا تھا اور اتفاق سے اسی اتوار 26 جنوری کو یوم آزادی بھی تھا۔ ہر زبان کے شاعروں اور ادیبوں نے ترقی پسند مصنفین کے ایک مشترکہ اجتماع کے متعلق اپنا خیال ظاہر کیا تھا۔ اس لیے ٹھیک 10 بجے صبح کو یہ جلسہ منعقد ہوا۔ 22 جنوری کو آزادی کا وہ یادگار دن تھا جب انگریزی سامراج کے خلاف عوام کے رہنماؤں نے آزادی کے حصول تک سامراج کے خلاف ایک مسلسل جدوجہد جاری رکھنے کے عہد نامے پر عمل کرنے کا عزم کیا تھا اور عوام کو ہر قسم کی آزادی حاصل کرنے پر آمادہ کیا تھا..... آج پھر اسی عہد کو دہرانے اور جدوجہد کو جاری رکھنے کی قسم کھانے کا دن تھا۔

تقریباً تین سو سے زیادہ آرٹسٹ، ادیب اور شاعر اس اجتماع میں شریک تھے۔ ہرزبان کے نمائندے اس جلسے میں جمع ہوئے تھے۔ ترقی پسند مصنفین کے علاوہ ہندوستانی عوامی تھیٹرز ایسوسی ایشن کے نمائندے اور ہندوستانی آرٹسٹ بھی موجود تھے۔ ساما اور یکمرہٹی کے مشہور زمانہ ترقی پسند مصنف اور ادیب نے جلسے کی صدارت کی۔ قابل ذکر اصحاب میں حسب ذیل ادیب و شاعر موجود تھے۔

ڈاکٹر ملک راج آنند، شاہد لطیف، عصمت چغتائی، سجاد ظہیر، رضیہ سجاد ظہیر، وشو امتر عادل، صفدر میر، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، سلطانہ بیگم، عابد گلریز، نشاط شاہدوی، ظ۔ انصاری، بھوگی لال گاندھی، سواب تسھ (ایڈیٹر سنسکار)، ایم۔ ڈیبائی (ایڈیٹر، بمبئی ورستمان)، بی۔ ٹی۔ اشرا (ایڈیٹر، بھارت سماچار)، رتی کمارویاس (کاٹھیاوار کے ایک ماہر موسیقی) شمشیر بہادر سنگھ، راجیو سکسینہ، رمیش سنہا، بلراج سہانی، نور جہاں، دینیتی سہانی، شاننا گاندھی، موہن سہگل کپور اور انیل ڈی سلوا۔

جلسے کی ابتداء ہندوستانی عوامی تھیٹرز ایسوسی ایشن کے مذہبی دستے کے ان گانوں سے ہوئی جن کا موضوع آزادی سے تعلق رکھتا تھا پھر کچھ نظمیں پڑھی گئیں جس کے بعد جنرل سیکرٹری سجاد ظہیر نے ایک تقریر کی جس میں انہوں نے ترقی پسند مصنفین کی تحریک کی نشوونما کا تذکرہ کرتے ہوئے ادبی تقاضوں کا تاریخی پس منظر پیش کیا۔ سجاد ظہیر نے اپنی تقریر میں تفصیل کے ساتھ وہ منازل بیان کیں جنہیں طے کر کے ترقی پسند مصنفین موجودہ منزل تک پہنچے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ ہر دور میں اس تحریک کے مخالف جگہ جگہ سے اپنی اغراض یا دوسرے مقاصد کے پیش نظر سرگرم کار رہے ہیں لیکن ترقی پسند مصنفین مخالفوں کی مخالفتیں نظر انداز کر کے بڑھتے چلے گئے۔ انہوں نے اس بات کی پروا کبھی نہیں کی کہ انہیں ڈھنڈورچی کہا جاتا ہے اور اس بات پر زور دیا کہ آج کے ادب کو سیاست اور پروپیگنڈہ سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ انہوں نے بتایا کہ آزادی، انقلاب اور ترقی ہمیشہ نئے ادیبوں کا موضوع رہا ہے اور انہوں نے سیاسی، معاشرتی اور معاشی، شہری، شخصی اور تحریر و تقریر کی آزادی کی نہ صرف تبلیغ و حمایت کی ہے بلکہ اکثر ادیبوں نے اس مقصد کے لیے عملی قربانیاں بھی دی ہیں اور اب بھی قربانیاں دینے کا عزم رکھتے ہیں۔

ادب میں کھلے رجعت پسندوں کا ذکر کرنے کے بعد سجاد ظہیر صاحب نے بتایا کہ کچھ ایسے دشمن بھی پیدا ہو گئے ہیں جو خود اس تحریک میں داخل ہو کر رخنہ اندازی کرنا چاہتے ہیں اور محض الفاظی عبارت آرائی، فارم اور ہیئت کی تبلیغ کر کے ادب اور زندگی کے بنیادی مقاصد کی بیخ کنی کرنا چاہتے ہیں۔ یہ نئے رجعت پسند مار آستین ہیں اور ان سے ادبی تحریک کو پاک و صاف رکھنے کے لیے ترقی پسند مصنفوں، آرٹسٹوں اور شاعروں کو نہ صرف اپنے مقاصد کی تبلیغ و اشاعت

میں بلکہ عملی زندگی میں زیادہ سرگرمی اور زیادہ خلوص کا اظہار کرنا پڑے گا۔

سجاد ظہیر کی تقریر کے بعد ڈاکٹر ملک راج آنند نے ایک ریزولوشن پیش کیا۔ اس ریزولوشن کے ذریعہ کمیونسٹ پارٹی کے خلاف ہمہ گیر خانہ تلاشیوں، گرفتاریوں اور مقدموں کی مذمت کی گئی اور مطالبہ کیا گیا کہ ”پیپلز ایج“ کے ایڈیٹر کے خلاف جو مقدمہ چلایا جانے والا ہے، واپس لے لیا جائے۔ وہ تمام کاغذات جو کمیونسٹ پارٹی کے دفاتر سے لے جائے گئے ہیں، وہ بھی واپس کر دیئے جائیں اور ہندوستان کی عارضی حکومت کو چاہیے کہ وہ فوراً ایک تحقیقاتی کمیٹی کے ذریعہ ان الزامات کی تحقیق کرائے جو پمفلٹ موسومہ ”آپریشن اسائلم“ (Operation Asylum) میں پیش کیے گئے ہیں۔

ڈاکٹر آنند نے ریزولوشن کی تحریک کرتے ہوئے اپنی تقریر میں کہا کہ.....

”ایسے حملے آنے والے زمانے کے واقعات کی ایک تصویر ہیں۔ اگر ایسی چیزیں جاری رہتی ہیں تو میں آپ کو آگاہ کرتا ہوں کہ ملک میں ادب، آرٹ اور کلچر کی نشوونما کا کوئی موقع باقی نہ رہے گا..... اور ہماری اس پچاس سالہ جدوجہد کا حاصل صفر کے برابر رہ جائے گا جو ہم نے ایک آزاد بہترین زندگی گزارنے کے لیے کی ہے.....!“

اگر ہم ایسے حملوں کے خلاف اٹھ کھڑے نہیں ہوتے جو خواہ کمیونسٹ پارٹی کے خلاف کیے گئے ہوں یا عوامی تھیٹر کے خلاف یا ملک کی کسی دوسری جماعت اور ادارے کے خلاف تو کل ایسا ہی حملہ ہمارے خلاف بھی ہوگا اور یقین کیجیے کہ وہ تمام مصنف، ادیب، فنکار اور آرٹسٹ جو صاف گوئی اور تلخی کے ساتھ ایک بات کہنا چاہیں گے خاموش کر دیئے جائیں گے۔ ہم پر مقدمے چلائے جائیں گے۔ اس وقت ہندوستان میں جمہوریت ہوگی نہ آزادی نہ آرٹ نہ کلچر نہ ادب.....“

ریزولوشن کی تائید برلاج سہنی (ہندوستان کے مشہور اداکار اور ڈائریکٹر) نے کی۔ انہوں نے تائیدی تقریر میں کہا کہ ”یہ ہمارے رہنماؤں کے منہ پر ایک طمانچہ ہے، یہ تمام عوام کے منہ پر ایک طمانچہ ہے اور ہمیں اس کا مناسب جواب دینا چاہیے..... آج جبکہ ہم پھر یوم آزادی کے موقع پر اپنی زندگیوں کو خدمت ملک کی نذر کرنے کا عہد کر رہے ہیں، ہم کو برطانوی سامراج سے صاف صاف کہہ دینا اور اسے متنبہ کر دینا چاہیے کہ ہم ایسی دست درازیوں کو برداشت نہیں کریں گے.....“

ریزولوشن کو بالاتفاق رائے تمام حاضرین نے منظور کیا۔ یہ جلسہ تقریباً دو گھنٹے منعقد رہنے کے بعد ختم ہوا۔

2 فروری 1947ء

حسب معمول آج جیون ہاؤس میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا جلسہ 3 بجے دن شروع ہوا۔ جلسے کی صدارت

اسرار الحق مجاز نے کی۔ صدارت کی تحریک کیفی اعظمی نے کی اور قدوس صہبائی نے اس کی تائید کی۔

آج حاضری میں ارکان اور مہمانوں میں مندرجہ ذیل اصحاب موجود تھے۔

کیفی اعظمی، سردار جعفری، اسرار الحق مجاز، اختر الایمان، سلطانہ بیگم، انور بانو، میراجی، اوم پرکاش، قدوس صہبائی، مدھو سوہن، وشوا متر عادل، محمد صفدر، موہن سہگل، انور، ظ۔ انصاری، نشاط شاہدوی، عالی جعفری، رفیق گوالیاری، محمد مہدی، افتخار احمد، منیش نرائن، ہارون خوشتر، سعید انیس، احمد غلام مصطفیٰ احمد، شوکت عزیز، ظفر رحیم، ناصر شمسی، محمد یونس محوی، محمد حسین جعفرانی، سالک انصاری، محمد علی فخر الدین، اقبال حسین اور تجمل حسین۔

کیفی اعظمی نے اختر الایمان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ وہ ہماری درخواست پر پونا سے جلسے میں شرکت کرنے آئے ہیں۔ وہ اپنا ایک طویل منظوم ڈرامہ سنائیں گے۔ اختر الایمان نے طویل نظم نکال کر جلسے سے معذرت کی کہ یہ نظم بہت طویل ہے اور جو صاحب اسے سنتے سنتے دلچسپی نہ محسوس کریں وہ جاسکتے ہیں لیکن علی سردار جعفری نے اختر الایمان کو یقین دلایا کہ انجمن کی یہ رسومات نہیں ہیں اور اسے پوری دلچسپی سے سنا جائے گا۔

نظم کا عنوان تھا ”سب رنگ“..... اور ”رنگ“ اس کی تشریح کرتے ہوئے اختر الایمان نے کہا کہ اسے حصہ یا باب کہہ سکتے ہیں پھر نظم کا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ یہ نظم سیاسی نظریوں پر ایک طنز ہے اور منظوم ڈرامہ کی شکل میں لکھی گئی ہے۔ اس کے کردار مختلف جانوروں کی شکل میں پیش کیے گئے ہیں لیکن ہر جانور ایک سیاسی نظریے کا نشانہ ہے البتہ اس میں آدم کا کیریکٹر سامراج کے نظریے کی ترجمانی کرتا ہے۔ علاوہ ازیں اس کا ماحول ہندوستان ہے۔ اس کے بعد مختلف نظریوں کی مختصر تشریح کی اور مختلف جانوروں کے Symbol بنائے اور نظم شروع کی جسے خاصی توجہ سے سنا گیا۔ یہ نظم مع ابتدائی تعارف تقریباً 35 منٹ میں ختم ہوئی اور حاضرین نے محسوس کیا کہ یہ اتنی طویل نہیں ہے جتنی کہ وہ توقع کر رہے تھے۔

نظم کے ختم ہونے پر صدر نے جلسے سے مخاطب ہو کر کہا کہ اگر کوئی صاحب سوال کرنا چاہیں یا کوئی اعتراض ذہن میں آیا ہو تو وہ فرمائیں۔

ظ۔ انصاری نے اس کا آغاز کیا اور سب سے پہلے نظم کے عنوان پر اعتراض کرتے ہوئے بتایا کہ یہ کچھ مناسب نہیں ہے کیونکہ سنسکرت میں ”سب رنگ“ جذبات کے لیے مستعمل ہے اور اس میں وہ تخیل پیش نہیں کیا گیا ہے۔ قدوس صہبائی نے ظ۔ انصاری کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ آدھی نظم پڑھی جانے کے بعد آپ تشریف لائے ہیں اس لیے آپ نے وہ تعارف نہیں سنا جو نظم کے آغاز میں اختر الایمان نے بیان کیا تھا۔ ظ۔ انصاری نے دوسرا اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ ”نظم میں کہیں کہیں جھول ہے۔“

اختر الایمان: یہ سیاسی نظریات کی پیشکش ہے اور طنز ہے۔ اتنی طویل نظم میں کہیں کہیں آپ جھول محسوس فرمائیں تو یہ بات خلاف امید نہیں ہوگی۔

سلطانہ بیگم: نظم کا خیال اور موضوع بہت اچھا ہے لیکن اگر یہ اور زیادہ طویل ہوتی تو مناسب تھا۔
اختر الایمان: اصل میں اس کو جس طرح مکمل کرنا چاہتا تھا وہ ممکن نہ ہو سکا، اگرچہ اپنی موجودہ شکل میں بھی یہ نامکمل نہیں ہے لیکن ابھی اس میں بہت کچھ اضافہ کیا جاسکتا ہے۔

سردار جعفری: مجھے اس نظم میں کافی بلندیاں اور موضوع کے اعتبار سے خوبیاں نظر آتی ہیں لیکن چند ایسے نقطے ضرور ہیں جو نہ ہوتے تو نظم بڑی مکمل اور بہتر ہو سکتی تھی۔ سب سے پہلے تو میرے خیال میں آپ نے Symbolism میں ایک فروگزاشت کی ہے۔ دوسری بات نظم کی مختلف بحروں سے تعلق رکھتی ہے۔

Symbols کے بارے میں مجھے کہنا یہ ہے کہ بعض تو بہت اچھے ہیں مثلاً سرمایہ دار کے لیے گدھ کا Symbol اور عدم تشدد کے لیے الو کا Symbol لیکن جہاں انگریزی سامراج کے لیے آدم یا انسان کا Symbol رکھا گیا ہے، اس سے انسان کی تحقیر محسوس ہوتی ہے کیونکہ انسان کا تاریخی رول اور تخلیقی عمل عناصر قدرت پر غلبہ و اقتدار حاصل کر کے انسانیت کی معراج تک پہنچنا ہے لیکن یہاں انسان کو حرس و ہوس، ملک گیری اور سامراج کا نشان بنا دینے سے مقصد الٹا ہو جاتا ہے۔

انسان میں خود طبقاتی کشمکش اس کا ثبوت ہے کہ انسان سچی انسانیت کا قیام چاہتا ہے اور تمام عناصر قدرت پر مکمل اقتدار حاصل کر کے انسانی مساوات پیدا کرنا چاہتا ہے۔

اختر الایمان: اصل میں انسان اور آدم کے لفظ میں فرق محسوس کرنے سے یہ اعتراض باقی نہیں رہتا۔ میری مراد یہاں انسانیت کی تحقیر نہیں بلکہ آدم کا وہ برا کردار پیش کرنا ہے جو سامراج اور زر پرستی کے برے نتائج میں رونما ہوتا ہے۔

سردار جعفری: اس کے باوجود غلط فہمی باقی رہتی ہے جب تمام کرداروں کے لیے جانوروں کے Symbol استعمال کیے گئے ہیں تو Exploitation کا Symbol بھی جانوروں میں سے لیا جاسکتا تھا مثلاً شیر کو آدم کی جگہ رکھا جاسکتا تھا۔ اس سے کوئی کمزوری پیدا نہیں ہو سکتی۔ دوسری بات یہ ہے کہ خود نظم کے کیریٹر اچھی طرح Establish نہیں ہوتے۔ کچھ چیزیں ذہن میں رہ گئی ہیں مثلاً اگر نظم کا سنانے سے پہلے تعارف کرایا جائے تو یہ محسوس نہیں ہو سکتا کہ خود کیریٹر کس کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اس لیے اگر نظم کو طویل کر دیا جائے تو مناسب ہوگا۔

تیسری چیز اس کی ڈرامائی شکل ہے۔ ہندوستان کے ادب میں اب تک Symbolic Drama نہیں آیا

ہے لیکن ایک کہانی ہونے کی حیثیت سے خاکہ ضروری چیز ہے۔

اختر الایمان: اصل میں ڈرامہ کی مکمل تکنیک اس میں استعمال نہیں کی جاسکتی لیکن اس کے باوجود اس میں ایک خاکہ ضرور موجود ہے۔

مدھوسودھن: لیکن ہر کہانی کے خاکے میں تضاد اور ٹکراؤ پایا جاتا ہے۔

سردار جعفری: نظم میں تضاد تو کرداروں کے اندر بہت ہی نمایاں ہے لیکن سب سے بڑی چیز Motive نہیں نظر آتا۔

قدوس صہبائی: Motive تو پہلے ہی بتایا جا چکا ہے یعنی مختلف سیاسی نظریوں پر طنز ہے اگرچہ یہ صرف تعارف سے محسوس ہوتا ہے۔

اختر الایمان: اس میں پہلی چیز تو طنز ہے۔ جگہ جگہ یہ طنز ملے گا مثلاً بندر کا مکالمہ اور بیل کی تقریر جو مزدور کا Symbol ہے، دوسرے یہ نظم چونکہ Symbolic ہے اور اسے ہندوستان کے ماحول کے پس منظر میں لکھا گیا ہے، اس لیے آدم کے Symbolic کو پوری انسانیت کا Symbol نہیں بلکہ انگریزی سامراج کا Symbol سمجھنا چاہیے پھر مستقلاً پوری نظم میں مختلف نظریوں کی کشمکش جاری رہتی ہے۔ آدم کو اگر شیر کہا جاتا ہے تو خامی باقی رہ جاتی۔ اگرچہ آدم بھی ایک جانور ہے لیکن حیوان مطلق میں اس کا شمار نہیں۔ اگر کسی جانور کا Symbol رکھا جاتا تو جانوروں کی برتری یا ہمسری ثابت ہوتی اور یہ بڑی خامی ہوتی۔ جانوروں میں آدم وہ ہے جو اور جانوروں سے پہلے شعور یافتہ ہوا اور چالاکی، فریب اور عیاری کا نشان بنا۔

سردار جعفری: یہ ٹھیک ہے کہ انسانوں میں ایک چھوٹی سی ٹولی ایسی ہے جو اپنے ذاتی مفاد کے لیے چالاکی اور عیاری سے کام لیتی ہے لیکن آدم یا انسان Abstraction ہے جو ساری انسانیت اور اس کی بہترین خصوصیات عمل اور جدوجہد کی ترجمانی کرتا ہے۔ آدم کا تصور بڑی پاکیزہ چیز ہے۔ آپ نے انسان کی جو جدوجہد دکھائی ہے اس میں شعور کا Exploit کرنے والی طاقت دکھایا گیا ہے حالانکہ شعور انسان کو جانور سے ممتاز کرتا ہے اور اسے عناصر فطرت پر قابو حاصل کرنے میں مدد دیتا ہے۔

اختر الایمان: اصل میں اس مفہوم اور معنی کے لیے شعور کا استعمال میں نے نہیں کیا ہے۔ میں نے آدم کو اس کے ارتقائی مدارج کے اعتبار سے یہاں نہیں پیش کیا ہے بلکہ جانور کی حیثیت سے آدم کا درجہ بلند ہے۔

انور: اگر فریب، عیاری، مکاری کے اعتبار سے کسی کیریئٹر کو امتیازی دکھانا ضروری تھا تو ایسے جانوروں کے

کیریٹر رکھے جاسکتے تھے جو فریب و مکر کے لیے مشہور ہیں مثلاً گیدڑ یا لومڑی۔

مدھوسودھن: یہ ٹھیک ہے کہ انسان کے سوا کچھ اور ہوتا کیونکہ انسان کے ہاتھ میں ترقی اور انسانیت کے جوہر تھیاری ہیں وہ خود اس بات کی علامت ہیں کہ انسان نے نیچر پر فتح پائی ہے۔

سردار جعفری: میرا تو اب بھی یہی خیال ہے کہ انسان Abstract ہے، مجموعی انسانیت کے لیے اس کو کسی برے اور پست نشان کے طور پر استعمال نہ کیا جانا چاہیے۔ اس سے انسانیت کی برتری کو دھبہ لگتا ہے۔

مہمانوں میں سے میراجی نے کہا کہ ”آدم اور انسانیت میں مصنف نے جو فرق پہلے ہی محسوس کرانا چاہا ہے اسے نظر انداز نہ کرنا چاہیے صرف آدم کہنے سے انسان مراد نہیں لیا جاسکتا۔“

سردار جعفری: آخری چیز جو مجھے کھٹکتی ہے وہ مختلف بحروں کا استعمال ہوتا ہے جس کی وجہ سے نظم کا Rethym باقی نہیں رہتا۔ اگرچہ اس میں ”چار رنگ“ یا چار باب ہیں لیکن اکثر ہر کیریٹر کے مکالمے میں بحر بدل جاتی ہے۔ یہ زیادہ اچھا ہوتا کہ ایک بحر میں ایک رنگ ہوتا۔ ہر رنگ کے مکالمے ایک ہی بحر میں ہوتے۔ اس سے مسلسل موسیقیت باقی رہتی اور عام پڑھنے والوں کی دلچسپی ہوتی۔

دشو متر عادل: ایک بحر میں ایک پوری نظم ہوتی تو اس سے Monotony پیدا ہو جاتی۔ جانوروں نے جو باتیں کی ہیں وہ ایک ہی بحر میں غیر فطری معلوم ہوتیں۔

سردار جعفری: مگر شاعری میں لفظ ”غیر فطری“ کا معیار بالکل دوسرا ہے۔

اس موقع پر عادل مسلسل کچھ بولتے رہے جو سمجھ میں نہ آسکا اور صدر جلسہ نے محمد صدر سے اپنی نظم پڑھنے کو کہا۔ صدر نے نظم پڑھنے سے پہلے آٹھ دس کا پیاں تقسیم کیں۔ نظم کا عنوان تھا ”بیمار لڑکی“۔

نظم سنانے سے پہلے انہوں نے کہا کہ Monolouge ہے اور موسم خزاں ہے، بہار تک اس کا زمانہ ہے۔ اس کے پانچ حصے ہیں پھر نظم سنائی ہے۔

نظم ختم کرنے پر محمد مہدی نے صدر سے پوچھا کہ آخر اس نظم کو لکھنے سے آپ کا مقصد کیا تھا؟

میراجی: مقصد یہ کہ لڑکی بیمار ہے اور بحالت بیماری اس کے تخیل کی مختلف کیفیات دکھائی گئی ہیں۔

ظ۔ انصاری: یہ نظم کچھ تجرباتی سی معلوم ہوتی ہے۔ اس سے اوپر چڑھنے کا تصور میری سمجھ میں نہیں آیا۔ اس میں گڑھے گڑھے سے نظر آتے ہیں۔

مدھوسودھن: تو کیا جس چیز میں گڑھے نظر آئیں وہ تجرباتی ہو جاتی ہے۔

ظ۔ انصاری: شاید آپ نے اس میں منظر نگاری کی کوشش کی ہے۔ منظر تو آپ کی نگاہ میں ضرور ہے لیکن منظر نگار کا فرض ادا نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح مصرعوں میں ربط نہیں ہے مثلاً یہ مصرعہ.....

کبھی شام آئے گی خاموش خاموش سوتی رہو

ابھی شام آئے گی خاموش خاموش سوتی رہو

آپس میں کوئی تعلق نہیں رکھتے۔

صدر: یہ اصل میں ڈرامیک نظم ہے۔ الفاظ اور ٹکڑوں پر زور دے کر پڑھنے کی ضرورت ہے۔

قدوس صہبائی: یہ نظم بظاہر کسی انگریزی نظم کا چر بہ معلوم ہوتی ہے جس میں خیال کے اندر ابہام پیدا ہو گیا ہے یا

خیال صرف ادا نہیں کیا گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے سوچا انگریزی میں ہے اور لکھا اردو میں ہے۔

صدر: سوچنے اور لکھنے کے متعلق خیال کسی قدر ٹھیک ہو سکتا ہے۔

سردار جعفری کے اس مصرعہ پر کہ.....

مگر میری مردہ رگوں میں ابھی تک اندھیرا ہے اعصاب سے زرد کھرا..... پتے ہوئے کہتا جاتا ہے۔

”خاموش خاموش سوتی رہو“

..... کہا کہ ”رگوں کا اندھیرا سمجھ میں نہیں آیا۔ اس کا کیا مفہوم ہے؟“

9 فروری 1947ء

آج کا اجتماع انجمن کے دیواری اخبار ”فانوس“ کا تازہ شمارہ آنے کی وجہ سے ذرا دلچسپ ہو گیا تھا۔ مہمان اور

ممبر جو آتے گئے سب سے پہلے اخبار پڑھنے میں مصروف رہے۔ ایک ترقی پسند فونو گرافر اور آرٹسٹ نے ”فانوس“ کے چند فونو لیے۔

ابتداء میں حاضری کم تھی۔ آج بعض صاحبان کافی دیر سے آئے اور وقت پر آ جانے والوں نے محسوس کیا کہ

حاضر ساتھیوں کو وقت کی پابندی کا احساس دلایا جائے تو بہت اچھا ہو۔ آج حاضرین میں سردار جعفری، اسرار الحق مجاز،

ناصر شمسی، محمد صفدر، ظفر الحسن، وشو متر عادل، کیفی اعظمی، مدھو سودھن، قدوس صہبائی، محمد مہدی، اوشاد یوی، سلطانہ بیگم، نور

بانو، نشاط شاہدوی، احمد علی علوی، عرش تیموری، سعید انیس احمد، عالی جعفری، احمد علی، محمد علی، محمد حسین، اقبال راشد حسین،

ارشاد بیگ چغتائی، ظ۔ انصاری، ہارون خوشتر اور رفیق گوالیاری موجود تھے۔

تحریک صدارت اور تائید کے بعد ناصر شمسی کو صدر چنا گیا۔ سب سے پہلے قدوس صہبائی نے پچھلے ہفتے کی

روداد سنانی۔

اس کے بعد ہارون خوشتر (بیبئی کی انجمن کے ایک رکن) سے اپنا افسانہ ”بارہ آنے“ پڑھنے کو کہا۔ کیفی اعظمی نے ہارون خوشتر کا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ خوشتر نہ صرف یہ کہ مزدور علاقے میں رہتے ہیں بلکہ خود مزدور ہیں اور پہلی مرتبہ کسی مجلس میں اپنا افسانہ سنا رہے ہیں۔ یہ افسانہ مزدوروں کی زندگی سے تعلق رکھتا ہے جس کے بعد خوشتر نے افسانہ پڑھا۔ افسانہ ختم ہونے پر صدر کے دریافت کرنے پر کہ کوئی اعتراض یا اظہار خیال کیا جائے، عام خموشی رہی۔

اس کے بعد مہمان ظفر الحسن صاحب سے (جو نشر گاہ حیدرآباد کے اسٹنٹ ہیں) دو افسانے سنانے کی درخواست کی گئی۔

ظفر صاحب نے بطور تمہید کہا کہ یہ افسانے دراصل افسانچے ہیں اور نشر گاہ حیدرآباد سے براڈ کاسٹ ہو چکے ہیں۔ پہلے افسانے کا عنوان تھا ”گولی“..... یہ چند سطروں کا خاکہ تھا جس کے ختم ہونے پر ظ۔ انصاری صاحب نے اعتراض طبعی کے جواب میں کہا کہ ”لگے ہاتھ دوسرا افسانہ بھی سن لیا جائے پھر خیالات ظاہر کیے جا سکیں گے“۔ ظفر صاحب نے دوسرا افسانہ ”پریس کانفرنس“ سنایا۔ یہ نسبتاً ذرا طویل تھا۔ ختم ہونے پر قدوس صہبائی نے کہا کہ اس افسانے کا عنوان اگر ”گونگا“ ہوتا تو مناسب تھا کیونکہ اس میں ایک گونگے کی ہندو مسلم فساد کے وقت بے بسی دکھائی گئی ہے۔ وہ خود کونہ مسلمان ظاہر کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہے نہ ہندو اور اس لیے ہندو اور مسلم فساد یوں کے ہاتھوں سے اس نے زخم بھی کھائے اور آخر میں ایک فوجی کے ہاتھوں گولی کا نشانہ بن گیا۔

محمد صفدر: میرا خیال ہے کہ افسانے کا عنوان ”گولی“ ہی مناسب ہے کیونکہ آخر میں ”گونگا“ آتا ہے اور اس کی اصلیت اس طرح ظاہر کرنے سے ایک تخیر پیدا کرنے کا مقصد ظاہر ہوتا ہے۔

ظفر الحسن: مجھے کوئی عذر نہیں اگر آپ عنوان کو ”گونگا“ رکھ لیں لیکن اس عنوان سے یہ سنایا اور نشر کیا جا چکا ہے۔

سردار جعفری: کوئی ہرج نہیں مگر میرا بھی یہی خیال ہے کہ ”گونگا“ عنوان زیادہ مناسب ہوگا۔

محمد صفدر نے اس مرحلے پر ”پریس کانفرنس“ اور ہارون خوشتر کے افسانے ”بارہ آنے“ پر بھی اعتراض کیا۔

”پریس کانفرنس“ کے متعلق ان کا خیال تھا کہ Exposition اچھا نہیں ہے اور ”بارہ آنے“ میں فنی خامیوں کی جانب ایک سرسری اشارہ کرنے کے بعد کہا کہ اس کا آخری حصہ حذف کر دیا جائے تو اچھا ہے۔

سردار جعفری: یہ ہارون صاحب کا پہلا افسانہ ہے۔

قدوس صہبائی: موضوع اور تھیم اچھا ہے لیکن ٹریٹمنٹ میں خامی ہے۔ اس کے باوجود بھی خوشتر صاحب کی نظر اپنے طبقے پر بہت گہری نظر پڑی ہے۔ نشوونما کی بہت امید ہے۔
محمد صفدر: اور ”پریس کانفرنس“.....

ظ۔ انصاری: میں یہ سوچ رہا ہوں کہ کیا ظفر صاحب کے افسانوں کو افسانہ کہنا چاہیے؟
قدوس صہبائی: افسانے نہیں تو کیا خاکے ہیں.....
ظفر الحسن: جن پر افسانے کی مکمل تعمیر ہو سکتی ہے۔
قدوس صہبائی: پہلا خاکہ بہت اچھا ہے۔

اس کے بعد سردار جعفری سے ان کی کتاب ”اقبال“ کا ایک باب سنانے کے لیے فرمائش کی گئی۔

سردار جعفری نے مقالہ یا باب سنانے سے پہلے پندرہ منٹ میں کتاب کے تعارف کے طور پر اقبال کے متعلق چند ضروری باتیں جن میں انہوں نے یہ بھی کہا کہ..... ”اقبال پر اب تک کم و بیش تیس سے زیادہ کتابیں میری نظر سے گزر چکی ہیں لیکن ان تمام کتابوں میں ایک قسم کا ذہنی انتشار جھلکتا ہے۔ اصل میں اقبال کو صرف ان کی شاعرانہ تصانیف سے سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ میں آٹھ سال سے اس کتاب پر کام کر رہا ہوں لیکن مجھے اعتراض ہے کہ اب بھی وہ تمام میٹرل نہیں ملا جو اقبال کے حاشیہ نشینوں اور معتمدوں نے دبا رکھا ہے۔ ایسی ہی ایک کتب ”اقبال نامہ“ تھی جس میں اقبال کے خطوط کافی اہم تھے لیکن اس کتاب کی اشاعت کو روپے کے زور سے روک دیا گیا۔ پبلشر کو روپیہ دے کر سب کا پیاں حاصل کر لی گئیں مگر چند سطریں جو شائع ہو گئی تھیں ان ہی میں سے ایک مجھے بھی دیکھنے کا موقع مل گیا۔

میرا خیال ہے کہ ہر لکھنے والے نے اقبال کو یا تو پیغمبر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے یا فاسٹ لیکن شاعری میں ان تمام اہمیتوں اور تقاضوں کو نظر انداز کر دیا جو ان پر اثر انداز ہوتے ہیں مثلاً اقبال، شبلی اور حالی کی تحریکوں کو ہی لے کر آگے بڑھے ہیں۔ افسوس ہے کہ اقبال کے وہ خطوط جو حالی اور شبلی کو لکھے گئے یا ان کے جوابات نہ مل سکے ورنہ اس سے یہ اندازہ ہوتا کہ اقبال کے رجحانات کا سماجی پس منظر اصل موضوع ہونا چاہیے۔ میں ان رجحانات کے متعلق یہ نتیجہ نکال سکا ہوں کہ ایک زمانے میں ان کے اندر اصلاح یا ریفارمز کا رجحان تھا اور جب اس رجحان کی تاریخی ضرورت کم ہونی شروع ہوئی تو اس نے مذہبی تجدید کے رجحانات کی شکل اختیار کر لی لیکن انقلابی رجحانات نہ بدل سکا۔

ریفارمز اور تجدید مذہب دو الگ الگ تحریکیں تھیں، پہلی سرسید کی تحریک ریفارمز کا نتیجہ تھی اور دوسری شاہ ولی اللہ کے فلسفے کا نچوڑ۔ اقبال کی شاعری میں اسی لئے ان دونوں کا امتزاج دیکھا جاسکتا ہے جسے نہ سمجھ کر تضاد کہا جاسکتا ہے۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ خود ہماری تحریکوں میں بھی یہ رجحان نظر آتا ہے لیکن قومی تحریک جب شباب پر آجائے تو انقلابی ہو جاتی ہے۔ ریفارمز اس مرحلے پر رجعت پسندانہ تحریک بن جاتی ہے اس کا دور ختم ہو جاتا ہے۔ نقادوں نے یہاں تک پہنچ کر جب ان کی شاعری میں تجدید مذہب کا دور دیکھا تو ان کا پختہ کلام لے کر تضاد ثابت کرنا شروع کر دیا۔ اس میں جمہوریت کی تائید بھی تھی اور تردید بھی۔ قوم و وطن کی مخالفت کے باوجود پاکستان کے قومی خطوں کا مطالبہ بھی تھا مگر ذہنی ارتقاء میں یہ چیز ناگزیر ہے کہ دونوں رجحانات آئیں۔ کتاب کا یہ حصہ دوسرا باب ہے جسے سنانے کے لیے یہ تعارف ضروری تھا.....“

اس کے بعد جعفری نے مقالہ باب سنایا جس میں پورا ایک گھنٹہ صرف ہوا۔ ختم کرنے پر ظ۔ انصاری نے سوال کیا کہ ”اس میں تضاد کا پس منظر ظاہر نہیں کیا گیا؟“

جعفری: یہ اصل میں پوری کتاب کا ایک جزو ہے۔ دوسرے ابواب میں اس کا تفصیلی تذکرہ کیا گیا ہے..... اور مزید تشریح کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ”تضاد کا ایک اور سبب اقبال کی شاعری میں Idealism یا Materialism دونوں کا وجود بھی ہے جب وہ فلسفہ اور اصول کا روحانی پہلو پیش کرتے ہیں تو یہ چیز Idealism ہو جاتی ہے مگر جب دنیا کا حقیقی وجود قائم کرتے ہیں تو یہی چیز Materialism بن جاتی ہے مثلاً روحانی نظموں میں تصوف کا عکس بھی موجود ہے جسے ”ابلیس کی مجلس شوریٰ“ لیکن حقیقی دنیا کے اندر خصوصاً قومی تحریک کے بارے میں ان کا امتزاج ہو جاتا ہے۔“

ارشاد بیگم چغتائی: قومی تحریک میں یہ امتزاج کیا مفہوم رکھتا ہے؟

سردار جعفری: میں اسے تحریکوں سے سمجھ سکتا ہوں مثلاً خلافت کی تحریک اور سوراج کی قومی تحریک جس طرح دونوں کا امتزاج ہوا۔ یہ بات ثابت کرتی ہے کہ اب روحانی تحریک اور ایک انقلابی تحریک آزادی کس طرح آپ میں مل گئی تھیں۔

1921ء کے بعد جب نوآبادیوں میں انقلابی تحریکیں شروع ہو گئیں اور مزدوروں اور کسانوں کی تحریکیں ابھرنے لگیں تو سماجی اصلاح کی تحریک نے اپنی افادیت بلکہ مفہوم بھی کھو دیا، دور اصلاح ختم ہو گیا اور یہ رجحان رجعت پسندانہ بن گیا۔

کیفی اعظمی: میرا خیال ہے کہ وقت بہت زیادہ ہو گیا ہے اور یہ بحث مقالہ کے موضوع سے ہٹ کر اقبال کے پیش کردہ تمام اصولوں اور نظریوں پر حاوی ہوتی جا رہی ہے۔ اس لیے اس کو کسی دوسرے موقع کے لیے اٹھا رکھنا چاہیے۔

اس موقع پر صدر جلسہ نے بحث کے خاتمہ کی ضرورت کا اظہار کیا لیکن ارشاد بیگم چغتائی اور ظ۔ انصاری نے کہا

کہ مزید سوالات کرنا چاہیے۔

سردار جعفری نے ان کے مختصر جواب دیتے ہوئے کہا کہ تجدید مذہب کا مفہوم اقبال کے ہاں تمام اچھی تحریکوں میں سے اچھی چیزیں لے کر ان کو اسلامی ظاہر کرنے کا تصور ہے۔ ان کا مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ اسلام میں سب کچھ موجود ہے لیکن مذہبی تجدید کی تحریک انقلابی تحریکوں کے مقابلے میں مقبول نہ ہو سکی تو انہوں نے کہا کہ تمام انقلابی تحریکوں کے اصول بھی اس پر منطبق کرنا چاہیے اور اس سلسلے میں انہوں نے Religious Reconstruction (اقبال کے ایک فلسفیانہ خطبے کا اقتباس) سنایا۔

اس کے بعد مزید بحث کرتے ہوئے صدر جلسہ نے مجلس برخواست کی۔

16 فروری 1947ء

جلسہ مقررہ وقت پر شروع ہوا۔ تحریک صدارت اور تائید کے بعد ساغر نظامی نے صدارت کے فرائض انجام دیئے۔ حاضرین اور مہمانوں میں ساغر نظامی، عصمت چغتائی، اسرار الحق مجاز، مجروح سلطانپوری، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، دشو متر عادل، مدھو سو دھن، محمد مہدی، ظ۔ انصاری، قدوس صہبائی، سلطانہ بیگم، اوشا کشپ، چھادی بیگم، رفعت سروش، محمد صفدر، عرش تیموری، احمد علی علوی، رئیس الدین فریدی، ہارون خوشتر، اقبال چودھری، اوم پرکاش دھون، رفیق گوالیاری، ناصر شمسی، ارشد محمود، عالی جعفری، راشد حسین، سعید انیس احمد، منیش، محمد علی، یوسف علی، غلام عباس مولوی اور عباسی موجود تھے۔

ابتداء میں قدوس صہبائی نے سابقہ جلسے کی روداد سنائی پھر عرش تیموری نے (جو بحیثیت مہمان شریک تھے) اپنا افسانوی مضمون ”جنت اور جہنم“ پڑھنے کی خواہش کی جس کی صدر نے اجازت دے دی۔

عرش تیموری نے بتایا:..... ”یہ ایک طنز ہے اور اس کا نا حاصل یا خلاصہ فساد کے ایک ہلاک شدہ کی عالم بالا میں سیر یا سفر ہے۔“

مضمون پڑھا گیا اور ختم کرنے کے بعد عرش تیموری نے کہا کہ اس کا تیسرا حصہ ابھی نہیں لکھا گیا ہے۔

مہدی: ہم نے جو دو حصے سنے ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ مضمون کا محرک کوئی مقصد نہیں بلکہ محض لکھنے کے لیے لکھا گیا ہے اور چند ایسی تحریکوں پر اور افراد پر ضروری اور غیر ضروری حملے کیے گئے ہیں جو عوامی تحریکیں اور افراد ہیں.....

کیفی اعظمی: تیموری صاحب نے اس کا مقصد طنز ظاہر کیا ہے لیکن اس میں طنز اچھی اور بری دونوں چیزوں پر کیا

گیا ہے۔ سیاسی جماعتوں اور مختلف خطوں کی زبانوں پر بھی ایک دل دکھانے والا اور غلط طرز ہے پھر اس سے کچھ ایسے نتائج بھی نہیں اخذ کیے گئے جن کا مقصد ترقی پسند ادب یا عوامی فائدہ میں ظاہر ہو، اس سے کوئی روشنی حاصل نہیں ہوتی۔ غیر ضروری طور پر یہ مضمون طویل ہے اور میں اس کے لکھنے کی ضرورت کا اندازہ نہیں کر سکا ہوں۔

جعفری: شاید آپ کو حیدرآباد کی زبان بری معلوم ہوتی ہے لیکن مجھے ایک مخصوص علاقے یا خطے کی زبان کا مذاق اڑانا قابل اعتراض معلوم ہوتا ہے اور یہ نہ صرف بد مذاقی ہے بلکہ دل آزاری بھی ہے۔

مہدی: بلکہ ایک قسم کا تعصب ہے جو ناپسندیدہ ہے۔

عرش: ہو سکتا ہے..... لیکن آپ اس مضمون پر ہنس تو رہے تھے۔

جعفری: اس پر تو میں نہیں ہنسا بلکہ میں اور وہ دوست جو آپ کا مقصد سمجھنا چاہتے ہیں، آپ پر ہنس رہے تھے۔

میری تو رائے ہے کہ کسی دوسری جگہ کی زبان پر ہنسنا تنگ نظری کی دلیل ہے اور تعصب ہے۔

عرش: مگر لٹریچر خود بھی تو تعصب کی پیداوار ہے۔

مہدی: تنگ نظری اور تعصب کی وجہ سے کوئی اچھا لٹریچر کبھی پیدا نہیں ہوا، نفرت اور خصوصاً ایک بڑے مقصد کے

لیے نفرت کبھی اچھا، پائیدار اور حقیقی ادب پیدا نہیں کر سکتی۔

جعفری: آپ نے کوئی صحت مند چیز پیدا نہیں کی۔ حیدرآباد کی زبان کی نقل تو آپ نے کر لی لیکن اس زبان میں

جو حلاوت و شیرینی ہے، اس زبان سے حیدرآبادی عوام کو جتنی محبت ہے اس کا اندازہ بلکہ تصور کرنے کی ضرورت بھی آپ

نے محسوس نہ کی۔ یہ تو ایسی ہی بات ہو گئی جیسے دہلی اور لکھنؤ پچھلے زمانے میں ایک دوسرے کا مذاق اڑاتے رہے ہیں ویسے

ہی آپ یو۔ پی کے باشندے ہونے کی حیثیت سے حیدرآباد کا مذاق اڑا رہے ہیں حالانکہ وہ ولی دکنی کا وطن ہے۔

رئیس فریدی: (جو پہلی بار مہمان کی حیثیت سے شریک ہوئے) جو زبان معیار سے گر جاتی ہے اس پر اعتراض

کرنے کا حق ہے۔

کیفی اعظمی: زبان کا معیار اصل میں عام زبان اور روزمرہ میں لوگوں کی بول چال نہیں بلکہ اس کا معیار علمی زبان

سے متعین کیا جانا چاہیے۔

یو۔ پی، دہلی اور پنجاب کے عوام جو زبان بولتے ہیں اور جتنی مختلف بولیاں وہاں رائج ہیں، وہ علمی زبان اور ادبی زبان کا

معیار نہیں ہیں۔ اگر یو۔ پی کی ”پوربیا“ زبان پر کوئی حیدرآبادی ادبی زبان کو سامنے رکھ کر اعتراض شروع کر دے تو یہ چیز

الکل آپ کے اعتراض کے مانند ہوگی حالانکہ متعدد ضلعوں کی وہ بڑی پیاری روزمرہ بولی جانے والی زبان ہے۔ حقیقت یہ

ہے کہ حیدرآباد نے اردو کی سب سے زیادہ خدمت کی ہے، اسے بنایا ہے مٹایا نہیں۔

عرش تیموری: میرا مقصد حیدرآباد کے اس فیصلے کے خلاف احتجاج بھی ہے جس کی رو سے انجمن ترقی اردو کی گرانٹ بند کی گئی ہے۔

قدوس صہبائی: لیکن اس کا تذکرہ بلکہ اشارہ بھی آپ کے مضمون میں نہیں ہے بلکہ عام طور پر مذاق اڑانے کا جذبہ معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح آپ نے بمبئی کی بگڑی ہوئی اردو کا بھی تمسخر کیا ہے اور کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہر چیز کا مذاق اڑانے کے لیے آپ نے یہ مضمون لکھا ہے۔

سردار جعفری: آپ نے حیدرآباد کی جس زبان کا مذاق اڑایا ہے وہ وہاں کے لوگوں کی بے انتہا محبوب زبان ہے اور میں آپ کے علم میں وہ چیز لاتا ہوں کہ اس دکنی زبان میں شعر کہنے والا ایک حیدرآبادی شاعر دہقانی جب اپنا کلام سناتا ہے تو ہزاروں، لاکھوں حیدرآبادی اسے سننے کے لیے جمع ہو جاتے ہیں۔ وہ ایک تعلیم یافتہ اور اچھا شاعر ہے اور نہایت لطیف تشبیہیں، استعارے اور طنز استعمال کرتا ہے۔ اس لیے آپ کی جانب سے یہ نہ صرف باعث تعجب ہے بلکہ کچھ اپنی برتری کا احساس بھی ہے۔ اس چیز نے پنجاب میں لکھنؤ اور دہلی کے خلاف مخالفانہ جذبہ پیدا کر دیا۔ اسی نے لکھنؤ اور دہلی کو آپس میں دست و گریباں کیا اور قضیہ کسی نہ کسی شکل میں اب بھی جاری ہے۔ تو نے الفت کرنی ہے اور تجھے الفت کرنی ہے کا قصہ ایسا اہم نہیں ہے کہ تمام بنیادی مقاصد کو نظر انداز کر کے پنجاب، دہلی اور لکھنؤ ایک دوسرے سے گتہ جائیں۔

میں آپ کو یہ بھی بتاؤں کہ انگریزی میں King English معیاری نہیں۔ وہاں بھی ہر علاقے کی علیحدہ بولی ہے۔ اس کا مقصد یہ تو نہیں کہ اسکاٹ لینڈ اور ویلز کی زبان پر انگریزوں کا شروع کر دے۔ طنز Satire کا بھی ایک خاص مقصد ہوتا ہے اور وہ صرف یہ ہے کہ غیر انسانی اور سوسائٹی کے لیے مضرت رساں عناصر کی بے حقیقی اور مضرتیں محسوس کرنا دے۔ مثلاً فرانس کا ایک زبردست مفکر اور طنز نگار ولٹیئر ہمیشہ جاگیردار طبقے کا یا ان کی اخلاقی و سماجی قدروں کا مذاق اڑایا کرتا تھا جو انسانیت کے لیے مضرت رساں تھیں۔ اس نے کبھی ان Values کا مذاق نہیں اڑایا جو حقیقی چیزیں منفی قدریں رکھتی تھیں۔ بہت ممکن ہے کہ آپ نے مثبت اور منفی کے متعلق لکھنے سے پہلے غور ہی نہ کیا ہو۔ آپ کا یہ کارنامہ لاکھوں کروڑوں انسانوں کو دکھ پہنچانے والا ہے۔ بمبئی کی زبان میں مذاق اڑانے کے بعد اور حیدرآباد کی زبان پر حملہ کرنے کے بعد اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ ہمیں اس کا حق نہیں ہے اور نہ یہ انسانیت ہو سکتی ہے۔ یہ کہہ کر آپ دامن نہیں چھوڑ سکتے کہ یہ طنز ہے کیونکہ اگر اچھی اور بری چیزوں میں آپ تمیز نہیں کر سکتے تو آپ کبھی اچھے ادب کی تخلیق نہیں کر سکتے۔

ظ۔ انصاری: بنیادی مقاصد کے علاوہ آپ کے پیش کردہ مضمون میں فنی اغلاط بھی ہیں اور بلندیاں بھی

مفقود ہیں۔ طنز و ظرافت آپ نے مقصد ظاہر کیا ہے۔ فنی حیثیت سے مضمون میں یہ خامی ہے کہ اکثر مقامات پر سنجیدہ ہو جاتا ہے..... بلکہ ضرورت سے زیادہ سنجیدہ۔

قدوس صہبائی: ایک اور فنی غلطی کرداروں کی پیشکش ہے حالانکہ آپ نے کردار نقلی دیئے ہیں لیکن ان کے نام ایسے بھونڈے پن سے بدل دیئے ہیں کہ وہ اصلی معلوم ہوتے ہیں۔ اگر آپ کو ان اصلی کرداروں کا مذاق اڑانا تھا تو جرأت کر کے اصلی نام پیش فرمادیتے۔

ظ۔ انصاری:..... اور ماحول آپ نے بہمی کی سوسائٹی کو بنایا ہے۔ جنت کو بہمی کا عکس بنا کر پیش کیا ہے اور پھر کچھ چیزوں اور تحریکوں کا نام لے کر اس طرح طنز کیا ہے جو طنز نہیں بلکہ دبی چھپی سی مخالفت کو ظاہر کرتا ہے اور مزاح و ظرافت سے اتنا نیچے اتر آتا ہے جو قابل افسوس ہے مثلاً آپ نے جہاں ترقی پسند مصنفین کی انجمن کا تذکرہ کیا ہے وہاں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو اس جماعت سے للہی بغض ہے۔

عرش تیوری: میں نے ترقی پسند انجمن کے اصلی اور جعلی ممبروں کا ذکر کیا ہے اور اسی لیے یہ مضمون پڑھا ہے کہ آپ اسے ناپسند کریں۔

سردار جعفری: شاید اب آپ نے دل کی بات کہی۔ اگر ترقی پسند انجمن کے خلاف آپ کو لکھنا تھا اور یہ سمجھ کر لکھنا تھا کہ اس کے ممبروں کو آپ تکلیف پہنچائیں تو میں آپ کو یہ بتایا چاہتا ہوں کہ یہ مضمون اس سے بھی زیادہ سخت تنقید کا مستحق ہے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس ادبی آرگنائزیشن کے اندر صرف ان لوگوں کی گنجائش ہے جو ادب اور زندگی کے متعلق ایک خاص نظریہ رکھتے ہیں، جو اس کے بنیادی مقاصد کو تسلیم کرتے ہیں جو اس کے مینی فیسٹو اور بنیادی اعلان نامہ کو ادبی نصب العین تصور کرتے ہیں۔ اس اعتبار سے آپ کا یہ مضمون رجعت پسندانہ ہے۔ نئے ادب اور نئے زاویے کے متعلق آپ نے جو کچھ فرمایا وہ کسی طرح بھی سنے جانے کے قابل نہیں کیونکہ آپ نے اس بنیاد کو ہی نہیں مانا ہے کہ ادب میں جب تک صحت مند نظریہ نہ ہو وہ افادی ادب نہیں ہو سکتا اور اس کے بعد اگر آپ انجمن ترقی پسند مصنفین میں آتے ہیں اور اگر اس کا مذاق اڑانے کی کوشش کرتے ہیں تو انجمن کے سامنے بحیثیت جماعت اور جماعت کے افراد کے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ یا تو ہم آپ کو روک دیں یا خود خاموش ہو جائیں۔

احمد علی علوی: مگر جہاں تک میرا خیال ہے یہ ترقی پسندی کے اصول پر حملہ نہیں ہے۔

مہدی: اگر آپ اس خیال سے آئے ہیں کہ جیسے لوگوں کے خلاف آپ نے لکھا ہے وہ اسے سنیں تو یہ بڑی خراب

بات ہے۔

رئیس فریدی: اس کا مقصد یہ ہے کہ اگر کوئی آدمی آپ کے بنیادی نظریات کے خلاف ہو تو آپ اس کی بات نہیں سنیں گے۔

جعفری: تو یہ آپ نے عجیب سوال کیا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کا وجود ہی اس مقصد کے لیے ہوا ہے کہ اس میں ترقی پسند مقاصد کو ماننے والے شامل ہوں۔ ہماری ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ اگر ہمارے مخالف ہمارا نقطہ نظر معلوم کرنا چاہیں تو ہم انہیں بڑی خوشی سے اس بات کا موقع دیں کہ وہ اپنے اختلاف یا شکوک و شبہات کا اظہار فرمائیں اور ہم ان کے جوابات دے سکیں۔ اس کے دو ہی نتیجے نکل سکتے ہیں..... یا تو وہ اپنے اصول و عقائد پر قائم رہیں گے یا ہمارے نظریہ ادب و فن کو قبول کر لیں گے۔ آپ دیکھتے اور سنتے ہوں گے کہ اسی وجہ سے ہمارے درمیان متعدد ایسے دوست اور مہمان آتے ہیں جو ہماری جماعت کے رکن نہیں ہیں لیکن ایک آواز بھی ان کے خلاف نہیں اٹھائی گئی بلکہ ہمارا تو مقصد یہ بھی ہے کہ ہم اپنے مخالفوں کو دلائل اور معقولیت سے اپنے خیالات کا حامی بنا سکیں لیکن اس کا طریقہ یہ نہیں ہے جو عرش تیموری صاحب نے اختیار کیا اور جس پر انہیں اصرار ہے۔ ایک طریقے سے وہ ہمیں Provoke کر رہے ہیں اور اس مقصد کے لیے صرف ہماری جماعت اور ارکان پر ایک غیر منطقی اور ناپسندیدہ مجلسی بے اصولی کے ماتحت پھبتیاں کس رہے ہیں بلکہ انہیں اصرار ہے کہ وہ مضمون صرف اس لیے سنانے آئے تھے کہ اسے سن کر ناپسند کریں کیونکہ وہ ہم میں سے کسی کو پسند نہیں کرتے ہیں۔

مجروح: یہ بات یقیناً افسوسناک ہے مگر عرش تیموری صاحب ترقی پسند ہیں تو انہیں ضمنی اختلاف کے باوجود صحت مند نظریہ اختیار کرنے کی ضرورت تھی۔ بنیادی اصول سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔

احمد علی علوی: لیکن وہ کون سی چیز ہے جس نے آپ کو یہ سمجھنے پر مجبور کیا کہ وہ ترقی پسند ادب اور ترقی پسند مصنفین کا تمسخر اڑا رہے ہیں؟

قدوس صہبائی: مضمون کی اسپرٹ اور عرش تیموری صاحب کی تشریح اور تاویل اس کا ثبوت ہیں۔

سردار جعفری: جب عرش صاحب یہ فرماتے ہیں کہ ادب کی بنیاد تعصب پر ہے تو ظاہر ہے کہ وہ بنیادی مقصد سے انحراف کر رہے ہیں، کسی ترقی پسند کا یہ اصول نہیں ہے، نہ ہو سکتا ہے۔

عرش: میں نے ترقی پسندوں پر اعتراض نہیں کیا ہے بلکہ جعلی ترقی پسندوں پر اعتراض کیا ہے۔ مثلاً ان۔ م راشد، احسان دانش اور دوسرے لوگ۔

مجروح: لیکن آپ نے کسی جگہ کوئی امتیاز نہیں کیا ہے..... ایک ہی لاشی سے سب کو ہانک دیا ہے۔ اچھے اور

برے، روشن اور تاریک پہلو، تنقید و اعتراض کا ضروری جزو ہیں لیکن آپ کے مضمون میں یہ تنقید ہے نہ اعتراض ہے بلکہ یہ تنقید محض ہے۔

سردار جعفری: ن۔ م۔ راشد اور احسان دانش کے متعلق آپ یہ کیوں فتویٰ لگا رہے ہیں کہ وہ ترقی پسند نہیں ہیں۔ راشد، احسان، عصمت، وشو متر عادل سب ترقی پسند ہیں۔

مجروح: یہ ٹھیک ہے جہاں یہ ترقی پسندی سے محسوس یا غیر محسوس طور پر گریز کرتے ہیں۔ اس اصول اور مقصد کے پیش نظر خود انجمن میں مدعو کیے جاتے ہیں اور یہاں کی وہ کڑی تنقیدیں اس کا ثبوت ہیں جو ہر ہفتہ ممبروں کے مضامین پر ہوتی رہتی ہیں۔

کیفی اعظمی: بحث بہت طول پکڑتی جا رہی ہے۔ میں صرف یہ کہہ کر اس بحث کو ختم کرانا چاہتا ہوں کہ ہم یہاں تنقید میں خلوص برتتے ہیں لیکن میں آپ سے یہ دریافت کرنا چاہتا تھا کہ آپ نے تمام جماعتوں پر جو طنز کیا ہے، اس سے کوئی ادبی تنظیم اور جماعت بچ نہ سکی ہے۔ ہمارا یہ مقصد نہیں ہے کہ ہم کسی کو اپنی جماعت میں آنے سے روکیں لیکن جو چیز ہم نہیں سمجھتے اس سے متعلق ہم آپ سے کچھ سمجھنا چاہیں گے اور یہ باہمی مشورہ کے بعد ہی طے ہو سکتا ہے اور ہم باہم کسی نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں لیکن جب آپ کسی پر تنقید و تنقیص کرنا چاہیں تو اس تنقید پر تنقید سننے کے لیے آپ کو آمادہ ہونا چاہیے۔

رئیس فریدی: یہ خیال صحیح ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے کہ اگر حیدر آبادی اور پنجابی غلط اردو بولیں تو ان پر اعتراض نہ کیا جائے۔

وشو متر عادل: یہ ان لوگوں کا کوئی گناہ نہیں ہے۔ جان بوجھ کر وہ ایسا نہیں کرتے۔ ہندوستان کے مختلف علاقوں اور خطوں میں مختلف طرز اور تلفظ رائج ہیں۔ مثلاً حیدر آباد میں 'ق' کو 'خ' اور پنجاب میں 'ق' کو 'کاف' بولتے ہیں۔ حیدر آبادی اور پنجابی دانستہ اس معمولی سی غلطی کا ارتکاب نہیں کرتے۔

صدر نے اس مرحلے پر بحث نہ کرنے کی ضرورت کا اظہار کیا اور مجروح سلطانی پوری سے غزل پڑھنے کو کہا۔

مجروح نے ایک غزل سنائی جس کے بعد ساغر نظامی سے ان کی وہ نئی نظم پڑھنے کی خواہش کی گئی جو پچھلی رات مشاعرہ میں انہوں نے پڑھی تھی۔

ساغر نظامی نے نظم سے پہلے جو تعارف لکھا ہے، اسے پڑھا۔ اس وقت تک نظم کا عنوان تجویز نہیں کیا گیا تھا۔

(”نظام“ میں اشاعت کے لیے اس کا عنوان ”تعمیر“ رکھا گیا ہے۔) تعارف کے بعد انہوں نے کہا کہ ”یہ نظم اب بھی نامکمل ہے اور اس میں ترمیم کی گنجائش ہے“ پھر یہ نظم سنائی۔

نظم عام طور پر حد درجہ پسند کی گئی۔ بعض لوگوں نے ساغر صاحب سے کہا کہ ”شاید آپ کی یہ نظم زندگی بھر میں کہی جانے والی نظموں میں سب سے عمدہ ہے۔“

مجروح اور کیفی نے لفظ ”بابا“ پر ساغر کی توجہ دلاتے ہوئے کہا کہ عوام اس کا مفہوم نہیں سمجھتے حالانکہ یہ لفظ یہاں بالکل موزوں ہے لیکن مذاق عوام کے پیش نظر اسے بدل دینا چاہیے، کھٹکتا ہے۔ ساغر نے جواب میں بتایا کہ ”قاری کے لفظ ”خواجہ“ یا ”ملک“ کا مفہوم اس میں پوشیدہ ہے اور یہ تو میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ یہ حرف آخر نہیں ہے ابھی ترمیم کی گنجائش ہے۔“

مجروح: میں سمجھتا ہوں کہ لفظ ”بابا“ کے بجائے ردیف ”ہم نے“ کر دی جائے۔ باقی نظم مکمل ہے۔
نظم پڑھ کر ضمنی بحث ایک بند کے سلسلہ میں کی گئی اور چند منٹ کے بعد تقریباً پون گھنٹہ وقت زیادہ ہو جانے کے بعد جلسہ برخاست کیا گیا۔

2 مارچ 1947ء

اردو ترقی پسند مصنفین کا یہ اجلاس ساحر لدھیانوی کی زیر صدارت منعقد ہوا۔

حاضرین: سجاد ظہیر، ملک راج آنند، اسرار الحق مجاز، سردار جعفری، احمد علی علوی، اختر الایمان، مجروح سلطانی پوری، انیل ڈی سلوچہ صاحبہ، شیریں پارکر صاحبہ، گل صاحبہ، قدوس صہبائی، رمیش سنہا، خوشتر، محمد صفدر، ظ۔ انصاری، عبدالقادر انصاری، جنید، رفعت سروش، عارف جیلانی، محمد علی، اوم، ضیاء الحسن، پریم دھون، ارشد محمود، ہنس راشد، جعفرانی خلیل، رفیق عالی جعفری، محمد مہدی، سالک انصاری، عرش تیموری۔

شروع میں حمید اختر نے بتایا کہ پچھلی میٹنگ ”یوم نیوی“ کے طور پر منعقد ہوئی تھی اور اس میں تمام زبانوں کے ادیبوں اور فنکاروں نے حصہ لیا تھا۔ اس لیے اس کی باقاعدہ کارروائی نہیں لکھی گئی۔

باقاعدہ پروگرام شروع ہونے پر ہمارے مہمان اختر الایمان نے ایک نظم سنائی۔ نظم بہت مختصر تھی اور مطبوعہ بھی۔ اس لیے سردار جعفری نے کہا کہ اختر الایمان اگر ایک اور نظم سنائیں تو بہت اچھا ہو۔

دوسری نظم کے تین مصرعوں کے متعلق سردار جعفری نے کہا کہ وہ سمجھ میں نہیں آتے اور وہ تین مصرعے یہ تھے.....

دیکھ میں ہوش میں ہوں اے غم گیتی کے شعور

تجھے ملنے کی تمنا لیے آنکھوں میں کہاں

اپنے ظلمت کدے میں جان سنواری میں نے

انہوں نے کہا..... ”یہ تین مصرعے نظم کے درمیان میں آتے ہیں۔ موضوع کے اعتبار سے نظم میں شاعر نے اپنی محبوبہ سے ایک قسم کا اعتراف شکست کیا ہے لیکن ”اے غم گیتی کے شعور“ کا کیا مطلب ہے، یہ سمجھ میں نہیں آتا؟“

اختر الایمان: یہ بالکل ایسا ہے جیسے کوئی آدمی اپنی بیوی کو زبیدہ کہتے کہتے ننھے کی ماں کہہ دے یعنی محبوبہ کو غم گیتی کا شعور کہا گیا ہے۔

سردار جعفری: مطلب واضح نہیں ہوا۔ آپ اگر اور وضاحت کر دیں تو زیادہ اچھا ہوگا۔

اختر الایمان: میں حسن کو غم سمجھتا ہوں اور اس لیے عورت کو غم گیتی کا شعور کہتا ہوں یعنی حسن سے الجھنے کے بعد آدمی میں غم گیتی کا شعور پیدا ہوتا ہے۔

سردار: غالباً آپ کا مطلب یہ ہے کہ حسن کے مقابلے پر شکست کے بعد شعور پیدا ہوتا ہے اور کیا یہ اسی قسم کی بات ہے جیسی فیض نے کہی ہے کہ..... ہم نے اس عشق میں کیا کھویا ہے کیا پایا ہے۔

اختر الایمان نے مزید وضاحت کرتے ہوئے بتلایا کہ ان کا مطلب یہ ہے کہ آدمی ہر محاذ پر شکست کھانے کے بعد اسے فراموش کر دیتا ہے لیکن حسن کے مقابلے پر جب شکست ہوتی ہے تو اس کی کسک لازوال ہو جاتی ہے۔

سردار جعفری: اب میں کچھ سمجھ گیا ہوں لیکن اس چیز کو جب اقبال اور فیض کہتے ہیں تو الجھن نہیں ہوتی لیکن آپ کے ہاں ہوتی ہے۔

محمد صفدر: آپ سمجھ گئے ہیں لیکن ہم ابھی تک نہیں سمجھے۔

سردار: ان کا کہنا ہے کہ حسن کے مقابلے میں شکست کھانے کے بعد انسان اس شکست کی کسک کو ہمیشہ محسوس کرتا رہتا ہے لیکن ابھی تک میرا خیال یہی ہے کہ یہ بات مصرعوں سے واضح نہیں ہوتی، سمجھانے سے سمجھ میں آ جاتی ہے۔

ظ۔ انصاری نے کہا کہ اختر صاحب نے ”غم جاناں“ کا ذکر کرتے ہوئے اسے ہی ”غم دوراں“ کہہ دیا ہے۔

اختر الایمان: بہر حال اگر یہ مطلب نکلتا ہے تو بھی کچھ برا تو نہیں۔

ظ۔ انصاری: لیکن ذرا ٹھہریئے..... آپ کے اس شعر.....

چند لمحے جو ترے ساتھ گزارے میں نے

ان کی یاد کا تصور ابھی رخشندہ نہیں

..... میں کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ان لہجوں کی یاد اور تصور پہلے رخشندہ تھا اور اب نہیں رہا یا یہ کہ پہلے تھا نہ اب

ہے؟

اختر الایمان: یہی کہ نہ پہلے تھا نہ اب ہے۔

اس کے بعد قدوس صہبائی نے ایک مقالہ ”ترقی پسند ادب کا پس منظر“ کے عنوان سے پڑھا۔ ظ۔ انصاری نے قدوس صہبائی کی اس رائے سے اختلاف کا اظہار کیا کہ حالی Revivalist تھے۔ انہوں نے کہا کہ حالی کھلم کھلا مغرب کی تقلید کرتے اور کرنے کے لیے کہتے تھے۔

قدوس: غالباً آپ کے ذہن میں یہ مشہور مصرعہ.....
حالی اب آؤ پیروی مغرب کریں۔

..... ہے مگر Revivalism کوئی بری بات نہیں بشرطیکہ پرانی روایات کی مدد سے سماجی زندگی کو آگے بڑھنے کے لیے ابھارا جائے۔

ظ۔ انصاری: حالی نے سیاسی شعور کی بناء پر لوگوں کی سماجی زندگی کو آگے بڑھانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ تقلید مغرب کے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔ ہاں! البتہ شبلی کو آپ Revivalise کہہ سکتے ہیں۔

قدوس: شبلی ہرگز رجعت پسند نہیں تھے۔ انہوں نے اس زمانے کی مسلم لیگ کے خلاف بہت سی نظمیں لکھیں کیونکہ مسلم لیگ اس وقت رجعت پسند لوگوں کے ایک گروہ کا نام تھا۔ شبلی پورے ترقی پسند تھے۔

ظ۔ انصاری: شبلی مسلم لیگ کے خلاف اس لیے بھی نظمیں لکھتے تھے کہ اس میں بہت سے لوگ علی گڑھ گروپ کے تھے جس سے ان کو اختلاف تھا۔

ملک راج آنند نے قدوس صہبائی سے پوچھا کہ آپ حالی کو Revivalist کیوں کہتے ہیں؟

قدوس صہبائی: اس لیے کہ وہ پچھلے زمانے کے مسلمانوں کی تاریخ کو سامنے لا کر کہتے تھے کہ دیکھو تم نے یہ کام چھوڑ دیئے ہیں اور تمہاری تباہی کی وجہ یہی ہے، وغیرہ وغیرہ۔

سردار جعفری: میرے خیال میں قدوس کا جملہ واضح ہے۔ اس زمانے کے تمام لوگ Rivivalism کے Trend سے خالی نہیں تھے۔ حالی بھی ان ہی لوگوں میں سے تھے پھر بھی انہیں Rivivalist نہیں کہا جاسکتا۔ شبلی کو Revivalist کہنا تو اور بھی ظلم ہے کیونکہ انہوں نے ہمارے ادب اور ہماری سماجی زندگی میں جمہوریت کے مفہوم کو داخل کیا ہے۔ ”الفاروق“ وغیرہ لکھ کر انہوں نے اس مقصد کے لیے پرانے دور کی تاریخ سے بھی داد لی ہے۔ اسی طرح حالی پرانی چیزوں کی بنیاد پر ادبی اور سماجی زندگی کو آگے پہنچانا چاہتے تھے۔

سجاد ظہیر: Revivalism سے مراد تو یہ ہے کہ پرانی روایات کو اس طرح تازہ کرنے کی کوشش کی جائے کہ

اس سے زمانے کی موجودہ زندگی کی بڑھتی ہوئی روکو روکا جاسکے لیکن پرانی زندگی میں سے ایسے واقعات نکال کر پیش کرنا جو سماجی زندگی کو آگے بڑھائیں Revivalism نہیں کہلا سکتا۔ اس لیے قدوس صہبائی کا یہ جملہ صحیح ہے کہ حالی نے مسلمانوں کی تباہی کی جو جو ہات بتائیں وہ کافی حد تک صحیح نہیں ہیں۔ اس کے باوجود وہ بالکل ترقی پسند تھے کیونکہ انہوں نے سماجی زندگی کو آگے بڑھانے کے لیے نئی چیزوں کا ساتھ دیا۔

سردار جعفری نے کہا کہ ابھی ابھی انصاری صاحب نے کہا تھا کہ شبلی مسلم لیگ کے خلاف علی گڑھ گروپ کی وجہ سے تھے۔ یہ غلط ہے شبلی خود علی گڑھ کے گروپ سے تعلق رکھتے تھے۔

ظ۔ انصاری: انہیں اس گروپ سے اختلاف تھا اور اسی وجہ سے وہ ایک دفعہ یونیورسٹی سے علیحدہ بھی ہو گئے

تھے۔

سردار: مگر وہ اختلاف سیاسی تھا۔

پروگرام کے مطابق اب عارف جلالی نے ایک غزل سنائی۔ غزل کا ایک شعر تھا.....

عشق میں پہلے کوئی شوریدہ سر پیدا کریں

وسعت صحرا میں پھر دیوار دور پیدا کریں

ظ۔ انصاری نے کہا کہ یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ دیوار دور پیدا ہونے کے بعد ہی شوریدہ سر پیدا ہو سکتا ہے۔

اختر الایمان: آپ پہلے کسے پسند کرتے ہیں؟

ظ۔ انصاری: جو چیز پہلے ہوتی آئی ہے اور جو ٹھیک ہے یعنی دیوار دور۔

سردار جعفری: دیوار دور سے آپ کیا مراد رکھتے ہیں؟

ظ۔ انصاری: شاعری میں دیوار دور کے معنی رکاوٹ کے ہوتے ہیں اور رکاوٹوں کے بعد ہی شوریدہ سر پیدا ہوتا

ہے، پہلے نہیں۔

اس کے بعد علوی صاحب نے ایک ریزولوشن پیش کیا۔ ریزولوشن پیش کرنے سے پہلے انہوں نے

کہا..... ”ہم دیکھتے ہیں اپنی قومی زندگی میں ہم برطانوی سامراج سے اس وقت ٹکر لیتے ہیں جب وہ ہماری سماجی زندگی

میں مداخلت کرتا ہے اور اب ایسا دور آچکا ہے جب ہمارے ملک میں ملکی سامراج برسر اقتدار ہے یعنی بیرونی طور پر پیدا

ہونے والی کشمکش اندرونی کشمکش میں تبدیل ہو رہی ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ سیاسی مصلحتوں کا ڈھونگ رچا کر ہمارا یہ ملکی

سامراج ہماری سماجی زندگی میں دخل دے رہا ہے۔ اب ہمیں اس پر توجہ دینی چاہیے۔ کچھ عرصہ سے ہماری سب سے بڑی

اور سب سے طاقتور جماعت اپنے ہر مخالف کو چکنا چاہتی ہے۔ اس قسم کی چند ایک باتیں ہیں جن کو سامنے رکھ کر میں ریزولیشن آپ لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہوں۔“

ریزولیشن.....

”انجمن ترقی پسند مصنفین کا یہ جلسہ بمبئی پولیس کی اس حرکت پر، کہ اس نے عوامی تھیٹر کے مروجہ تماشے کے گیت ”بھاگولندن جاؤ“، ”ملاحوں کی بغاوت“ اور ”ہندو مسلم فساد بیلے“ کا بمبئی میں گانا اور کھیلے جانا ممنوع قرار دیا ہے، سخت مذمت کا اظہار کرتا ہے۔ یہ گانے اور تماشے ہزاروں آدمی کئی ماہ سے سن اور دیکھ رہے ہیں۔ عام طور پر لوگوں نے ان کی حب الوطنی اور فنی خوبی کو پسند کیا ہے۔ ہمیں تعجب اور افسوس ہے کہ کانگریس کی وزارت کے ہوتے ہوئے بمبئی کی پولیس کو اس کی جرأت کیسے ہوئی کہ وہ ہمارے تہذیبی کاموں میں رکاوٹ ڈالے۔“

اس سلسلے میں ہمیں یہ معلوم کر کے سخت تشویش ہوئی کہ بمبئی میں یوم شاہد کے موقع پر ہونے والے مشاعرے میں پولیس نے مداخلت کر کے سیاسی اور فرقہ وارانہ مسئلے کے متعلق نظمیں پڑھنے کو ممنوع قرار دے دیا ہے۔“

آخر میں ہمیش سنہانے کہا کہ اب سب باتوں کے باوجود اگر ہم منظم ہو کر ان چیزوں کی مخالفت کریں تو ہی کامیابی ہوگی، اس لیے کہ اس تصویر کا ایک اچھا رخ بھی ہے اور وہ یہ کہ دور دراز کے علاقوں میں ہماری انجمنیں قائم ہو گئی ہیں اور پوری قوت سے اپنا کام کر رہی ہیں۔

اس ریزولیشن کے متعلق اظہار رائے کرتے ہوئے سردار جعفری نے کہا..... ”اسے محض منظور کر دینا کافی نہیں ہوگا کیونکہ ہمارے تہذیبی کاموں پر جو حملہ ہوا ہے یہ یہیں پر ختم نہیں ہو جائے گا۔ یہ تو بالکل ابتداء ہے۔“ انہوں نے کہا کہ ہم میں سے اکثر شاعروں نے مشاعروں میں ہمیشہ ترقی پسند اور سیاسی نظمیں پڑھی ہیں اور اکثر رجعت پرستوں کی کوشش کے باوجود انہوں نے سیاسی نظموں کے علاوہ کبھی کچھ نہیں پڑھا مگر آج ہی کے مشاعرے پر جو پابندی سیاسی نظمیں نہ پڑھنے کی لگائی گئی ہے، وہ بہت خطرناک ہے اور اس بات کا اندیشہ ہے کہ اگر ہم نے جلدی اور موثر انداز میں اس کا تدارک نہ کیا تو یہ پابندی ہماری ادبی زندگی کے ہر شعبے میں لگادی جائے گی۔ کتابیں ضبط ہونا شروع ہوں گی اور یہ چیزیں یہاں بھی پہنچ سکتی ہیں کہ انگریز کے خلاف ہر جملے کو ضبط کر لیا جائے۔ آخر میں مجروح سلطانپوری نے ایک غزل سنائی جو بے حد پسند کی گئی۔

9 مارچ 1947ء

اردو ترقی پسند مصنفین کا یہ اجلاس 9 مارچ کو سجاد ظہیر کی صدارت میں منعقد ہوا۔

حاضرین: قاضی عبدالغفار، عصمت چغتائی، اسرار الحق مجاز، سردار جعفری، ساحر لدھیانوی، قدوس صہبائی، ظ۔ انصاری، سلطانہ بیگم، مجروح سلطانپوری، محمد علی علوی، یزدانی جالندھری، رئیس الدین فریدی، ارشاد بیگ چغتائی، عادل رشید، اقبال چوہدری، منیس انیس، یوسف، ضیاء الحسن، راشد حسین، عارف جیلانی، فرید، جعفرانی، عالی جعفری، عماد، رفیق اور دوسرے لوگ۔

سیکرٹری کی رپورٹ کے بعد ظ۔ انصاری نے ایک مقالہ ”اقبال پیام مشرق میں“ کے عنوان سے سنایا۔ مقالہ شروع ہونے سے پہلے انہوں نے کہا کہ..... ”پیام مشرق“ اقبال کے فارسی کلام کا ایک مجموعہ ہے۔ اس مقالے میں میں نے اس پر معمولی سی بحث کی ہے۔

مقالہ ختم ہونے پر سردار جعفری نے کہا..... ”انصاری صاحب نے اقبال کی شاعری پر کھنے کے لیے جس کتاب کا انتخاب کیا ہے وہ کافی نہیں ہے۔ علاوہ ازیں اس مقالہ میں دو باتیں بنیادی طور پر غلط ہیں۔ ایک تو یہ کہ اقبال کو اپنی فنی عظمت کا احساس نہیں تھا۔ دوسرے یہ کہ فن کے متعلق اقبال نے واضح طور پر کچھ کہا نہیں۔“

اس سلسلے میں سردار جعفری نے اقبال کے مضمون کا نام لیا جس میں اقبال نے آرٹ کے متعلق اپنے نظریات بیان کیے ہیں اور ان پر بحث کی ہے۔ اس کے علاوہ خطبہ الہ آباد کا ذکر بھی کیا جس میں اقبال نے فن سے بحث کی ہے۔ انہوں نے کہا..... ”اقبال کے متعلق اب تک جو کتابیں شائع ہوئی ہیں وہ ان کے فن کے متعلق نظریات سے بھری پڑی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کتاب میں کچھ نہ کچھ کہا گیا ہے۔ فنی اعتبار سے اگر اقبال کے کلام کا جائزہ لیا جائے تو اسے دو ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

پہلا دور: پیام مشرق یعنی 1924ء تک۔

دوسرا دور: اس کے بعد کا ہے جب اقبال نے کہا تھا کہ ”فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنا بندی“۔ ”زبور عجم“ میں بھی کئی جگہ معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کا نظریہ فن کے بارے میں کیا ہے۔ یہاں پر انہوں نے کہا ہے کہ ہیئت خود کوئی چیز نہیں، موضوع خود جاذبیت پیدا کر لیتا ہے۔ اس لحاظ سے ظ۔ انصاری کا یہ کہنا کہ اقبال کا اپنے فن کے متعلق کوئی نظریہ نہیں تھا بالکل غلط ہے اور انصاری صاحب کا یہ کہنا کہ اب تک کسی نے اقبال کے کلام کی فنی حیثیت پر کچھ نہیں لکھا، بھی غلط ہے حالانکہ اس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے عبدالواحد کی کتاب Iqbal And His Art کا ذکر بھی کیا جو اس موضوع پر بہت اچھی کتاب ہے۔ انصاری صاحب نے جو نظمیں منتخب کی تھی ان کے متعلق سردار جعفری نے کہا کہ آپ نے ”پیام مشرق“ کی صرف دو اچھی نظموں کا ذکر کیا ہے حالانکہ اس مجموعے میں

”تہائی“ جیسی نظم بھی شامل ہے جو ”تسخیر فطرت“ سے کسی طرح کم نہیں جس کا آپ نے ذکر کیا ہے مگر ”تہائی“ کو چھوڑ گئے۔

احمد علوی نے کہا..... ”مقالہ کے شروع میں آپ نے لکھا ہے کہ اقبال کے کلام کی فنی حیثیت کا جائزہ نہیں لیا گیا ہے محض تعریفیں کی گئی ہیں۔ حالانکہ خود آپ کا مضمون بھی اس ضمن میں آتا ہے کیونکہ دو ایک تنقیدی فقروں کے بعد آپ دامن بچا لیتے ہیں۔“

صاحب صدر نے انصاری احب سے جواب دینے کے لیے کہا تو انہوں نے جواب دیا..... ”جو کسی قسم کا اعتراض کرنا چاہیں وہ کر لیں۔ میں بعد میں سب کا جواب دے دوں گا۔“

چنانچہ قدوس صہبائی نے کہا..... ”انصاری صاحب نے موسیقی اور ترنم کا سہرا جو اقبال کے سر باندھا ہے، وہ صحیح نہیں کیونکہ اس سلسلے میں آپ نے جس نظم کی مثال دی ہے وہ جس بحر میں لکھی گئی ہے اسی میں فانی نے بھی لکھا ہے۔“

سجاد ظہیر نے کہا..... ”شروع میں معلوم ہوتا تھا کہ آپ اقبال کی فنی خامیوں ذکر کریں گے مگر آپ نے آخر میں محض یہ کہہ دیا ہے کہ اقبال کی فارسی ہندوستانی فارسی ہے وغیرہ وغیرہ اور وہ بھی محض دعویٰ کیا ہے، اس کا ثبوت نہیں دیا۔“

اس موقع پر عصمت چغتائی نے کہا ”آپ لوگوں کو جو برائیاں مقالے میں نظر آرہی ہیں وہ تو آپ بیان کیے رہے ہیں لیکن اگر کسی کو کوئی خوبی نظر آئی ہو تو وہ بھی بیان کر دی جائے۔“

سجاد ظہیر: خوبیاں تو بہت ہیں۔ اقبال کی شاعری کے بعض پہلوئے سرے سے ہمارے سامنے آگئے ہیں۔

قاضی عبدالغفار: سب سے بڑی خوبی تو یہ ہے کہ مقالہ مختصر ہے۔

ظ۔ انصاری نے سلسلہ وار جواب دیتے ہوئے سب سے پہلے سردار جعفری سے کہا.....

”جہاں تک مضمون کی تشنگی کا تعلق ہے، میں اسے تسلیم کرتا ہوں کہ میرے پاس وقت بہت کم تھا اور اقبال

لٹریچر بھی نہیں تھا۔ میں نے یہ مقالہ محض حافظے کی بناء پر لکھا ہے۔ کتاب کے انتخاب کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے، میں

اسے تسلیم نہیں کرتا کیونکہ میرے خیال میں ”پیام مشرق“ اقبال کے کلام میں ان کے پیغام سے قطع نظر آرٹ کے لحاظ سے

ان کی سب سے اچھی کتاب ہے۔ اس میں سے مثالیں بہت کم دے سکا ہوں، اس کا مجھے اعتراف ہے۔ میں نے تقریباً

ڈیڑھ سو اشعار نوٹ کیے تھے مگر اختصار اور وقت کم ہونے کی وجہ سے ان کو یہاں پر نقل نہیں کر سکا۔

دوسری بات فن کے بارے میں یہ ہے کہ اقبال کے ملفوظات میں ایک جگہ لکھا ہے کہ کسی صاحب نے ان سے کہا

کہ آپ کے کلام کا انگریزی ترجمہ ہونا چاہیے تو انہوں نے جواب دیا تھا کہ ان لوگوں کے فن کو ناپنے کے سانچے جدا گانے

ہیں اور کلام اقبال اور چیز ہے۔“

سردار: یہ ان کا انکسار تھا۔

انصاری: ہو سکتا ہے یہ انکسار ہو جسے آپ سمجھ گئے اور میں نہ سمجھ سکا۔

اس کے بعد انہوں نے قدوس صہبائی کے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ وہ بحر فانی کے ہاں اور اس سے پہلے کے شاعروں کے ہاں بھی موجود ہے۔ میں نے یہ نہیں کہا تھا اقبال نے بحریں ایجاد کی ہیں۔ میرا مطلب یہ تھا کہ اقبال نے ایسی بحریں منتخب کیں جو موضوع سے بہت مناسبت رکھتی تھیں۔

مثلاً ان کی نظم ”سرود انجم اور خودی“ میں..... انہوں نے جس بحر کا انتخاب کیا ہے، عربی زبان میں اس بحر میں نہیں لکھی جاتی جس میں اقبال نے لکھی ہے اور اس بحر کے انتخاب سے ہیئت اور مواد نے مل کر بے پناہ موسیقی پیدا کر دی ہے۔

سجاد ظہیر کے اعتراض کے متعلق انہوں نے کہا ”وہ صحیح ہے میں نے جو مثالیں انتخاب کی تھیں وہ بہت زیادہ تھیں اور مجھے مجبوراً چھوڑنا پڑیں۔“

سجاد ظہیر: اس دفعہ اگر آپ مقالہ لکھیں تو محض خامیوں کا ذکر کریں اور دعویٰ نہیں ثبوت بھی دیں۔

پروگرام کے مطابق اب ساحر لدھیانوی کو اپنی نظم ”قومی حکمرانوں کا نعرہ“ سنانا تھی مگر انہوں نے کہا کہ چونکہ وہ نظم ابھی نامکمل ہے اس لیے وہ آئندہ ہفتے سنائیں گے اور پھر ایک پرانی نظم سنائی، چونکہ ”نغمہ“ مطبوعہ تھی اس لیے اس پر بحث نہ کی گئی۔

خوش قسمتی سے قاضی عبدالغفار آج کی مجلس میں شریک تھے، سجاد ظہیر صاحب کے کہنے پر انہوں نے حیدرآباد کی حکومت کے گرانٹ بند کرنے اور انجمن ترقی اردو کے مسئلے پر مختصر روشنی ڈالی۔ ان کی تقریر کا خلاصہ اگلے ہفتے کی رپورٹ میں پیش کیا جائے گا۔

سب سے آخر میں عصمت چغتائی سے درخواست کی گئی کہ وہ اپنا ڈرامہ ”خانہ جنگی“ سنائیں۔ انہوں نے کہا کہ وہ بھی اسے مکمل نہیں کر سکے اس لیے کچھ دنوں کے بعد سنائیں گی مگر لوگوں کے اصرار پر انہوں نے کچھ حصہ زبانی اور کچھ پڑھ کر سنایا۔

چونکہ وہ ابھی اسے دوبارہ لکھ رہی تھیں اس لیے بعض لوگوں نے انہیں کچھ Suggestions دیں اور میٹنگ

ختم ہوئی۔

16 مارچ 1947ء

اردو ترقی پسند مصنفین کا یہ اجلاس ظ۔ انصاری کی صدارت میں منعقد ہوا۔ سیکرٹری نے پچھلی میٹنگ کی روداد پڑھ کر سنائی اور میٹنگ کا افتتاح مجروح سلطانپوری کی ایک غزل سے ہوا جسے سب لوگوں نے پسند کیا۔

مجروح سلطانپوری کی غزل کے بعد ہارون خوشتر نے ایک مطالعہ بعنوان ”آؤ چلیں“ پڑھا جس کے متعلق سب سے پہلے اختر الایمان نے کہا کہ یہ ان کی سمجھ میں نہیں آیا۔ محمد صفدر نے کہا کہ ہارون خوشتر اگر وضاحت کر دیں تو ممکن ہے کہ کچھ سمجھ میں آجائے۔ ہارون خوشتر نے کہا کہ اس مطالعے میں انہوں نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ایک لڑکا ایک لڑکی کو کس طرح پھانس لیتا ہے۔

مجروح: کیا آپ کا مطلب یہ ہے کہ اس میں ان دونوں کے جتنے بھی ڈائلاگ ہیں خصوصاً لڑکے کے وہ حقیقت پر مبنی نہیں بلکہ محض لڑکی کو پھنسانے اور ورغلا نے کے لیے وہ اس قسم کی باتیں کرتا ہے؟
خوشتر: اس میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ایک لڑکا کس طرح ادھر ادھر کی باتیں کر کے لڑکی کو ورغلا لیتا ہے.....؟

مدھوسودھن: آخر میں لڑکی لڑکے کے ساتھ جانے پر محض اس لیے راضی ہو جاتی ہے کہ اس کے ابا جان باہر سے آ رہے ہوتے ہیں اور انہیں دیکھ کر وہ ڈر کے مارے لڑکے کی خواہش کے مطابق باہر نکل جاتی ہے۔ اس کے باہر جانے میں ”ادھر ادھر“ کی باتوں کا دخل تو معلوم نہیں ہوتا۔

ظ۔ انصاری: اس سے کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ اس لڑکے نے جو باتیں کی ہیں ان میں کوئی دلکشی نظر تو نہیں آتی۔
مدھوسودھن: مگر ہو سکتا ہے اس لڑکی کو دلکشی نظر آگئی ہو۔

سجاد ظہیر: صاف طور پر کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ وہ لڑکی کو گھمانے کے لیے لے جانا چاہتا ہے.....
کیوں؟ یہ معلوم نہیں ہوتا۔ اس مطالعے سے کسی طرح نہ تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لڑکی کو ورغلا رہا ہے، نہ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس سے محبت کرتا ہے اور اب کسی غلط فہمی کی بناء پر لڑکی اس لڑکے سے ناراض ہے۔ اس لیے یہ بہت مبہم ہے۔

ظ۔ انصاری نے کہا..... ”اس افسانے یا مطالعے کے شروع میں ہم لڑکے اور لڑکی سے اس طرح ملتے ہیں کہ لڑکی لڑکے کو اپنے گھر آنے پر ٹوکتی ہے لیکن آخر میں وہ اس کے ساتھ چلی جاتی ہے۔ اس کا یہ جذباتی تضاد صحیح نہیں ہے نہ کوئی کردار واضح ہو کر ابھرتا ہے۔ ہم یوں تو نہیں سوچتے کہ ان دونوں کا مقصد کیا ہے مگر جب آپ لکھ رہے تھے تو آپ کے ذہن میں کیا تھا؟“

خوشتر: میرے ذہن میں یہ تھا کہ لڑکا لڑکی سے محبت کرتا ہے۔ لڑکے کے آنے پر وہ باہر جانے پر راضی نہیں ہوتی مگر بعد میں اس کی باتوں سے متاثر ہو کر اس کے ساتھ چلی جاتی ہے۔

ظ۔ انصاری: مگر یہ چیز بالکل واضح نہیں ہوتی۔ اگر آپ چند ایسے جملے بڑھا دیں جن سے ان کے پہلے تعلقات ظاہر ہوتے ہیں تو کوئی بات بن جائے گی۔

پروگرام کے مطابق اب رفعت سروش نے تین مصرعوں کی ایک نظم سنائی۔ نظم کا عنوان تھا..... ”صبح فردا“ نظم کے تینوں مصرعے یوں تھے.....

صبح فردا کی شعاعوں سے برستے ہوئے پھول

عیش ماضی کے تصور کو اجاگر کرتے

غم امروز پہ چھاتے ہی چلے جاتے ہیں

نظم سنائے جانے کے بعد مجروح سلطانپوری نے رفعت سروش سے پوچھا تھا کہ ”تصور کو اجاگر کرتے“ سے کیا مراد ہے؟

رفعت: اجاگر کرتے ہوئے۔

مجروح: پھولوں کا تصور اجاگر کرنا درست معلوم نہیں ہوتا۔

ساحر: یہ تو شاعر کی مرضی پر ہے، وہ چاہے جس چیز سے اجاگر کرائے۔

دشوا متر عادل نے کہا کہ نظم کا دوسرا یا درمیانی مصرعہ نظم کو بے معنی بنا دیتا ہے۔ نظم دونوں مصرعوں یعنی پہلے اور تیسرے مصرعے سے مکمل ہے۔

اختر الایمان نے کہا کہ ان کے خیال میں نظم اسی طرح مکمل ہے اور تینوں مصرعے ضروری ہیں۔ نظم سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو آدمی یہ کہہ رہا ہے اس کا ماضی شاندار ہے اور وہ مستقبل سے بھی مایوس نہیں ہے لیکن حال سے بہت مایوس ہے اور اس مایوسی میں شاندار ماضی اور آنے والا شاندار مستقبل دونوں اسے سہارا دیتے ہیں۔ اس کے تصور کو وہ چیز اجاگر کرتی ہے جو گہرے طور پر اس سے متعلق ہو۔ اس آدمی کا ماضی شاندار تھا جسے اس نے چھوا بھی ہے۔ ماضی کے تصور کے ساتھ اسے ماضی سے وابستہ لذتیں یاد آجاتی ہیں اور وہ حال کی مایوسی کو کم کر دیتی ہیں۔

مجروح سلطانپوری: کیا اس نظم کا پس منظر محض ذاتی اور رومانی ہے یا سیاسی؟

رفعت: اس نظم میں داخلیت اور خارجیت دونوں کا دخل ہے۔

سردار جعفری: اس نظم میں ایک خاص تجربے کو Generalise کیا گیا ہے۔ جیسے یہ کہا جائے کہ ”ہر صبح روشن ہوتی ہے“ یعنی ماضی کی صبح بھی روشن تھی کیونکہ ہر صبح روشن ہوتی ہے اور آج اگر شام کی تاریکی ہے تو کل صبح روشن ہوگی (کیونکہ ہر صبح روشن ہوتی ہے) لیکن نظم میں رفعت سروش نے فردا کا ذکر کرتے وقت صیغہ حال کا استعمال کیا ہے جس سے الجھن پیدا ہو جاتی ہے۔

سجاد ظہیر نے کہا کہ انہیں اختر الایمان کی تشریح سے اتفاق ہے یعنی وہ شخص اپنے شاندار ماضی سے حوصلہ حاصل کرتا ہے اور مستقبل کے متعلق پر امید ہے اور یہ دونوں چیزیں مل کر ”آج“ کے غم کو کم کر دیتی ہیں۔
ظ۔ انصاری نے کہا کہ نظم میں شکایت کا لہجہ ہے۔ جب تک ”کرتے“ کے لفظ کو ”کرتے ہوئے“ نہ سمجھا جائے، اس وقت تک معلوم نہیں ہوتا کہ شاعر مستقبل کی تعریف کر رہا ہے یا شکایت مگر اظہار بیان کی خامی کے باوجود اختر الایمان کی توجیہ بہت سی چیزوں کو ڈھانپ لیتی ہے۔

اس کے بعد ساحر لدھیانوی نے ”قومی حکمرانوں کا نعرہ“ کے عنوان سے اپنی نظم سنائی۔ اختر الایمان نے کہا کہ آخری مصرعہ کے بغیر بھی نظم بالکل مکمل کہنی جاسکتی ہے کیونکہ نظم جس طرح سے Develop کی گئی ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہی ہوگا (جو آخری مصرعہ میں بیان کیا گیا ہے)۔

مجروح: مگر یہ مصرعہ گراں نہیں گزرتا جبکہ اسے اڑانے سے نظم کئی فارم میں تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لیے آخری مصرعہ بھی ضروری ہے۔

ظ۔ انصاری: ایک مصرعہ میں ”برلا“ کی جگہ ”برلے“ استعمال کیا گیا ہے۔ چونکہ برلا ایک نام ہے اس لیے اسے برلے کہنا درست نہیں۔

وشو متر عادل: میرے خیال میں یہ کوئی غلطی نہیں۔ انگریزی میں Chuchils وغیرہ استعمال ہوتا ہے۔

سردار: پنجابی میں ”علیا“ کو پکارتے وقت ”علیئے“ کہہ کر پکارا جاتا ہے اس لیے میرے خیال میں ساحر کو یہ حق ہے کہ وہ برلا کو برلے لکھ لے جبکہ اس میں ایک لطیف طنز بھی ہے۔ ویسے لوگ ”پوٹا جا رہا ہوں“ کی بجائے ”پونے جا رہا ہوں“ عام بولتے ہیں۔

ظ۔ انصاری: جس وقت سے قومی حکومت مرکز میں آئی ہے اس وقت سے پہلے کشمیر کی تحریک جاری تھی۔ اس لیے اس کے متعلق یہ کہنا ٹھیک نہیں۔

ساحر: مگر تحریک تو قومی حکومت کے بننے کے بعد تک جاری رہی جسے دبا دیا گیا۔

ظ۔ انصاری نے ایک اور اعتراض کرتے ہوئے کہا..... ”قومی حکمرانوں کا نعرہ“ اس نظم کے لیے صحیح عنوان نہیں کیونکہ قومی حکمرانوں نے کبھی یہ کہا نہیں کہ وہ یہ کریں گے یا کر رہے ہیں۔“

سردار جعفری: مگر واقعات سے یہ چیز صاف طور پر سامنے آ جاتی ہے۔ تحریک واپس لینے کے لیے جب پنڈت نہرو کشمیر گئے تو ان کے سامنے لاٹھیاں بھی چلیں مگر انہوں نے بیان تک نہیں دیا۔

دشوا متر عادل: یہ ٹھیک ہے کہ یہ چیزیں نعرہ بنا کر کبھی پیش نہیں کی گئیں مگر یہ سب ان کے افعال سے ظاہر ہوتا

ہے۔

اختر الایمان نے انصاری صاحب کے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ موجودہ واقعات کو نظم کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ اگر سیاسی بیان دیا جاتا تو یہ چیزیں دوسری طرح بیان کی جائیں۔ بہر حال یہ نظم..... بیان نہیں۔

شیر چودھری: اگر عنوان ”وقت کا نعرہ“ کر دیا جائے تو میرے خیال میں زیادہ اچھا ہوگا۔

ساحر لدھیانوی: چونکہ یہ نظم مزدوروں اور کسانوں کے لیے لکھی گئی ہے، اسی لیے اس میں استعارے استعمال کرنے سے گریز کیا گیا ہے۔

اب سجاد ظہیر نے ”اردو شاعری اور اس کا مستقبل“ کے عنوان سے ایک مضمون پڑھا۔ مضمون شروع کرنے سے پہلے انہوں نے کہا کہ یہ تنقید نہیں صرف چند خیالات کا اظہار ہے جو ہماری پوری شاعری کا احاطہ نہیں کرتا۔ مضمون بہت پسند کیا گیا۔ اختر الایمان نے کہا کہ انہیں مضمون پر کوئی اعتراض نہیں ہے مگر وہ ایک مشورہ دینا چاہتے ہیں کہ سجاد ظہیر صاحب نے جہاں شاعروں کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے وہاں مثالیں صرف اچھے شاعروں کی دی ہیں۔ اگر وہ دوسرے شاعروں کی مثالیں بھی دے دیتے تو مضمون بالکل مکمل ہوتا..... انہوں نے کہا یہ صرف مشورہ ہے۔ آپ اسے قبول کریں یا نہ کریں تو سجاد ظہیر نے کہا وہ اس مشورہ کو قبول کرتے ہیں۔

ظ۔ انصاری نے کہا کہ میر کے زمانے کا موزانہ جب انفرادی یا س پرستی ہماری شاعری کا بہت بڑا حصہ تھی، آپ نے حافظ کے زمانہ سے کیا ہے اور اس سلسلہ میں نمونے کے طور پر آپ نے حافظ کا ایک شعر بھی دیا ہے۔ میرے خیال میں ان دونوں کے زمانوں میں مناسبت نہیں تھی۔ اس لیے یہ موزانہ غیر ضروری ہے۔

سجاد ظہیر: دونوں کے زمانے سیاسی اعتبار سے انحطاط اور ابتداء کے دور تھے۔

اختر الایمان: اور اس طرح دونوں میں مناسبت ایک تھی۔

محمد صفدر نے کہا کہ مضمون کے ابتدائی حصے میں لکھا گیا ہے کہ اردو شاعری ایک طرف فارسی اور دوسری طرف

ہندوستانی تہذیب کے سرچشموں سے فیض یاب ہوتی رہی۔ پہلا حصہ تو ٹھیک ہے مگر دوسرے کے متعلق میرا یہ خیال ہے کہ ہندوستانی تہذیب اردو شاعری پر بہت کم اثر ڈال سکتی ہے۔

اختر الایمان: نظیر کے متعلق کیا خیال ہے؟

صفدر: اسے استثناء قرار دیا جاسکتا ہے۔

سجاد ظہیر: ہندوستانی تہذیب سے میری مراد فلسفیانہ، خاص طور پر بھگتی وغیرہ کا تصور ہے۔ مسلمانوں کے آنے کے آٹھ سو برس بعد تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اردو شاعری پر ہندوستانی فلسفوں کا بہت زیادہ اثر پڑا۔ یہی چیز ہندوستانی تصورات کو ایرانی تصوریات سے جدا کرتی ہے۔

محمد صفدر: مگر خاص طور پر یہ چیز کبھی ظاہر نہیں ہوتی۔

سردار جعفری: اصل میں آپ واضح مثال ڈھونڈ رہے ہیں۔ جیسی فراق کے یہاں نظر آتی ہے لیکن ہندوستانی فلسفہ کا اثر ہماری شاعری کے نفسیاتی پس منظر پر پڑا ہے۔ بحروں پر بھی اثر پڑا ہے۔ فارسی کی کچھ بحر میں آئی ہی نہیں۔ کچھ بدل کر آئیں، اس لیے کہ وہ اسی طرح ہندوستانی مزاج کی مطابق نہیں تھیں۔ سردار جعفری نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ اسی طرح اور بہت سے پہلوؤں سے دیکھنے پر یہ اثر صاف معلوم ہو جاتا ہے۔ اگر ہم صرف غزل ہی کو معیار بنائیں تو یہ کافی نہیں ہوگا۔ کیونکہ غزل میں فارسی کا اثر ہی غالب رہا ہے لیکن میر حسن کی مثنویوں کو پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کی تہذیب کا اثر اردو شاعری پر کس قدر پڑا ہے۔ حتیٰ کہ میر انیس اپنے ایک مرثیہ میں کر بلا کا ذکر کرتے ہیں مگر اس میں رسم و رواج جو وہ بیان کرتے ہیں اس میں بالکل ہندوستانی تہذیب کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔

محمد صفدر: محاوروں اور تلمیحات کو دیکھنے پر ایرانی اثر ہی معلوم ہوتا ہے اور اسی قسم کے الفاظ تشبیہی ہیں جیسے سوسن، نرگس وغیرہ۔

سردار: ایرانی اثر غالب تو رہا ہے مگر اب کم ہوتا جا رہا ہے۔ انہوں نے میر انیس کی ایک غزل کے ایک مصرعہ کی مثال دیتے ہوئے کہا..... ”چنا ہے خانہ ہستی کی آستینوں کو“ میں آستینوں کو چنا خالص ہندوستانی بلکہ لکھنوی چیز ہے۔ سجاد ظہیر: کچھ چیزیں مشترک بھی ہیں بالکل ایسے ہی جیسے تاج محل ایرانی اور ہندوستانی دونوں تہذیبوں کا نمونہ ہے۔

صفدر: شاعری کا مزاج تلمیحات سے پہچانا جاتا ہے اور اردو شاعری میں تلمیحات ایرانی اور اسلامی ہیں۔ کچھ اثر

تو ہے یہاں کی تہذیب کا مگر میرے خیال میں یہ کہنا کہ اردو شاعری ہندوستانی تہذیب کے سرچشموں سے فیض یاب ہوتی رہی ہے، کافی حد تک صحیح نہیں ہے کیونکہ اردو شاعری نے ہندو یو مالا وغیرہ کو بالکل نہیں اپنایا۔

سجاد ظہیر: یہ ٹھیک ہے مگر ساتھ ساتھ انیس کو بھی تو دیکھیے جس نے کربلا کے میدان میں تمام ہندوستانی روایتوں کا ذکر کیا ہے۔ باپ بیٹے کے تعلقات، بیوی کی وفاداری وغیرہ کے متعلق خالص ہندوستانی نقطہ نظر سے لکھا گیا ہے۔ سردار جعفری نے کہا کہ ہماری شاعری میں یوسف زلیخا کے ساتھ ساتھ نل دہنتی کا ذکر بھی آتا ہے جو بالکل ہندوستانی چیز ہے۔ انہوں نے کہا..... ”یہ صحیح ہے کہ اردو شاعری پر پوری طرح ہندوستانی تہذیب کے اثرات نہیں پڑے مگر ایسا شعوری طور پر نہیں کیا گیا۔“

آخر میں عارف جلالی نے ایک غزل سنائی جو بہت پسند کی گئی۔

23 مارچ 1947ء

اردو ترقی پسند مصنفین کا یہ اجلاس اسرار الحق مجاز کی صدارت میں منعقد ہوا۔

حاضرین: سردار جعفری، مہندر ناتھ، وشو امتر عادل، مجروح سلطانی پوری، محمد صفدر، ساحر لدھیانوی، یزدانی، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، سلطانہ فیضی، اوشاد یوی، رفعت سروش، رفیق، مدھو سودھن، مہدی، محمد علی، عالی جعفری، عبدالقادر، غلام عباس، محمد ابراہیم، ہری کرشن لال، ترلوک، ہارون، خوشتر اور دوسرے لوگ۔

حمید اختر نے پچھلی میٹنگ کی روداد پڑھی۔ اس کے بعد سردار جعفری نے علامہ اقبال کا ایک مضمون پڑھ کر سنایا۔ مضمون شروع کرنے سے پہلے انہوں نے کہا..... ”کچھ دن پہلے یہ فیصلہ ہوا تھا کہ انجمن کے جلسوں میں اساتذہ کی چیزیں پڑھی جانی چاہئیں اور کیونکہ اقبال کی نثر پر آج تک کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی، اس لیے بھی اس مضمون کا انتخاب مناسب ہے۔“ دوسری بات انہوں نے یہ کہی کہ چونکہ اس مضمون کا تعلق ادب کی بنیادی بحث سے ہے اور یہ چیز آج کل بہت ضروری ہے کیونکہ ایک طرف تو سنجیدہ، سیاسی مضامین کو ادب سے خارج کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور دوسری طرف ایسی گھناؤنی چیزیں لکھی جا رہی ہیں جو انتہائی بیمار ذہنیت کا پتہ دیتی ہیں۔ اس سلسلہ میں انہوں نے میراجی کی نظم ”آب جو تبارے“ اور سلام مچھلی شہری کی ”اس عورت کو جگاؤ“ کا حوالہ دیا۔

مضمون ختم ہونے پر محمد مہدی نے کہا کہ مضمون کے اس فقرے کا مفہوم واضح نہیں کہ ”ہر شے کی قدر و قیمت کا معیار یہی ہونا چاہیے کہ اس میں حیات بخشی کی قابلیت کس قدر ہے۔“

وہ تمام باتیں جن کی وجہ سے ہم جاگتے جاگتے اوگھنے لگیں اور جو جیتی جاگتی حقیقتیں ہمارے گرد و پیش موجود ہیں

(کہ انہی پر غلبہ پانے کا نام زندگی ہے) ان کی طرف سے آنکھوں پر پٹی باندھ لیں، انحطاط اور موت کا پیغام ہے۔ مہدی نے کہا کہ ان کے خیال میں اچھا شاعر ہونا علیحدہ چیز ہے اور کسی شعر کا صحت بخش نقطہ نظر رکھنا دوسری چیز ہے کیونکہ اچھے فارم والا آرٹسٹ بھی کامیاب آرٹسٹ کہلا سکتا ہے۔

سردار جعفری: بے شک ایسے لوگ آرٹسٹ تو ہو سکتے ہیں مثلاً جیمس جوائس اور ڈی۔ ایچ۔ لارنس مگر سماج اور زندگی کے لیے ان کا آرٹ مفید نہیں ہوتا بلکہ نقصان پہنچاتا ہے۔

محمد مہدی: اگر آرٹ کا مقصد حسن کی تخلیق ہے تو حسن تو ہیئت سے بھی پیدا ہو سکتا ہے۔

سردار جعفری: تکنیک پر عبور الگ چیز ہے۔ سعادت حسن منٹو کی کہانی ”موتری“ تکنیک کے لحاظ سے بالکل مکمل ہے مگر مواد کے لحاظ سے درست نہیں کیونکہ اس میں وہ ہندوستانی سپاست کی گندگی سے نکلنے کی کوئی صورت نہیں بتلاتا بلکہ انسان کچھڑ میں اور لت پت ہو جاتا ہے۔

وشو متر عادل: میرے خیال میں جیمس جوائس اور لارنس نہایت اچھے فنکار ہیں۔

سردار جعفری نے کہا کہ ”بولی اور دانتے کے ”طربیہ خداوندی“ کی طرح اپنے زمانے کے تمام سیاسی، سماجی اور فلسفیانہ رجحانات سمودینا چاہتا تھا لیکن زاویہ نگاہ کی غلطی کی وجہ سے وہ اپنے مقصد میں ناکام ہو گیا۔ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کی ابتداء میں آئر لینڈ کے بورژوا طبقے نے وہاں کے علم کو شکست دے دی تھی اور جیمس جوائس کو ڈبلن چھوڑ کر جانا پڑا تھا۔ اس کتاب پر اس شکست اور اس سے پیدا ہونے والی ذہنی، روحانی اور جذباتی گھٹن کے بھرپور اثرات ہیں۔ جیمس جوائس انسانیت سے مایوس ہے اور عوام سے نفرت کرتا ہے۔ وہ ماضی کی طرف بھاگتا ہے اور پرانے مذہبی اداروں سے تقویت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ جیمس جوائس کی ”یولی سینز“ زندگی کی تمام بنیادی قدروں کی نفی ہے اور انتہا یہ ہے کہ اس کی تکنیک اس ادبی انگریزی زبان کو ختم کر دینا چاہتی ہے جسے چومر، شیکسپیر، ملٹن، ڈکنسن اور دوسرے انگریزی ادیبوں نے صدیوں کی محنت سے بنایا ہے۔ اس سلسلے میں چرکین اور جان صاحب کی مثال دیتے ہوئے جعفری نے کہا کہ یہ شاعر جاگیرداری سماج کے انحطاط کی پیداوار ہیں اور یہ نہایت غلیظ اور گھناؤنے شعر کہتے تھے جس تکنیک کو استعمال کر کے میر اور غالب نے لطیف اور حسین شاعری کی وہ تکنیک جان صاحب کے ہاتھوں میں انتہائی پست درجے کے ادب کی خالق بن گئی۔ انحطاط پذیر جاگیرداری کے طبقہ اس سے بہت خوش ہوتا تھا لیکن زندگی اور سماج، ملک اور قوم کے لیے جان صاحب کی حیثیت ایک گھٹیا درجے کی منہ پھٹ بھانڈ سے زیادہ نہیں تھی۔

جس طرح جان صاحب مٹتے ہوئے جاگیرداری طبقے سے تعلق رکھتے تھے، اسی طرح جیمس جوائس مٹتے ہوئے

سرمایہ دار طبقے سے تعلق رکھتا ہے اور اب یہ طبقہ زندگی اور آرٹ کو مثبت قدریں نہیں دے سکتا۔

وشوا متر عادل نے کہا..... ”جیمس جوائس مٹتے ہوئے سرمایہ دار طبقے کو سراہتا تو نہیں۔“

جعفری نے کہا..... ”زندگی کی صحت مند قدروں سے انکار مستقبل کی طرف بڑھنے کی بجائے ماضی کی طرف

لوٹ کر جائے گا۔ رجحان تعمیر کا نہیں، تخریب کا ہے اور تخریب ہی سرمایہ داری اور مٹتے ہوئے بورژوا طبقے کی سب سے بڑی

خصوصیت ہے۔“ اس سلسلے میں انہوں نے Restoration Period کے انگریزی ڈرامہ نویس ابھرتے ہوئے

سرمایہ دار طبقے کے نہیں بلکہ مٹتے ہوئے جاگیر دار طبقے کے نقیب تھے جنہوں نے فرانس کے انحطاط میں جا کر پناہ لی تھی اور

Restoration کے بعد پھر انگلستان کے سٹیج پر آ کر اپنا سکہ جمانا چاہتے تھے۔ ان کے پاس شیکسپیر یا ملٹن کا صحت بخش

نقطہ نگاہ نہیں تھا۔

وشوا متر عادل: آپ نے ابھی جان صاحب اور چرکین کی مثال دی ہے۔ میرا خیال ہے کہ عوام انہیں بالکل پسند

نہیں کرتے۔

سردار جعفری: عوام جیمس جوائس کو بھی پسند نہیں کرتے۔

وشوا متر عادل: کیا نظیر کی نظم ”تربوز“ سماج کے لیے نقصان دہ ہے؟

سردار جعفری: بالکل نہیں۔

عادل: تو پھر تین قسم کا آرٹ ہوا، اول جس سے سماج کو فائدہ ہے، دوم جس سے نقصان اور سوم جس سے کچھ بھی

نہ ہو۔

سردار: یہ غلط ہے۔ اگر ”تربوز“ کو پڑھ کر جی خوش ہوتا ہے، روح کو بالیدگی ملتی ہے تو یہ ٹھیک ہے۔

محمد صفدر نے اقبال کے مضمون کی روشنی میں سردار سے پوچھا کہ اگر سلا دینے والی ہر چیز بری ہے تو غالب کے

کلام کے اس حصے کو کیا کہا جائے گا جو شکست خوردہ ذہنیت کا پروردہ ہے؟ کیا وہ صحت بخش ہے؟

سردار جعفری نے کہا کہ غالب کے ہاں صحت بخش اور غیر صحت بخش عناصر دونوں موجود ہیں۔ مٹی ہوئی زندگی اور

ابھرتی ہوئی زندگی کے نقش، دونوں ہی پائے جاتے ہیں مثلاً غالب کا یہ شعر.....

ہاں کھائیومت فریب ہستی

ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے

اس کا فلسفہ رجعت پرستانہ ہے اور یہ وہ فلسفہ ہے جو غالب نے صدیوں کے انحطاط سے وراثت میں پایا ہے

لیکن اس کا یہ دوسرا شعر.....

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں
..... یہاں زندگی کا حسن کھوجانے کا یہ عمل بالکل صحت بخش ہے۔

وشوا متر عادل نے کہا کہ ان کے خیال میں غالب مغل شہنشاہیت کے ختم ہونے پر نالاں تھے حالانکہ ان کا جذبہ صحیح نہیں تھا۔

سردار جعفری نے کہا کہ مغل شہنشاہیت کے ختم ہونے اور انگریزوں کے آنے کے اچھے اور برے دونوں اثرات پڑے ہیں۔ انگریز کے آنے سے سمانتی دور ختم ہوا اور مشین آئی جو یقیناً پہلے دور کے مقابلہ میں ترقی پسند چیز تھی مگر اس کے ساتھ ساتھ انگریز ہندوستان کے لیے غلامی بھی لے آئے جس کے خلاف ہم جدوجہد کر رہے ہیں۔

وشوا متر عادل: اس کا مطلب یہ ہوا کہ قدریں تو بدلتی رہتی ہیں اور آرٹسٹ خواہ مخواہ پس جاتا ہے۔

سردار جعفری: اس زمانے کے آرٹسٹ کا تجزیہ کیا جاسکتا ہے۔ آج کے معیار سے اس پر رجعت پرست یا ترقی پسندی کا لیبل نہیں لگایا جاسکتا مگر آج چیزیں صاف ہو گئی ہیں اور ہر چیز واضح طور پر نظر آنے لگی ہے۔ طبقاتی کشمکش اور آزادی کی جدوجہد نے بڑی واضح شکل اختیار کر لی ہے۔

عادل: تو پھر آج کا ادیب کیا کرے؟

سردار جعفری: دیکھے، سوچے، سمجھے اور پڑھے۔

مد و سودھن نے پوچھا کہ لکھنے والے کو ہر چیز شعوری طور پر پرکھنے کے بعد ہی لکھنا چاہیے یا اس میں لاشعور کا دخل بھی ضروری ہے؟

سردار جعفری نے کہا کہ دونوں چیزیں ہوتی ہیں۔ آرٹ میں شعور ہی نہیں لاشعور کا بھی دخل ہوتا ہے۔

ہری کرشن لال نے کہا کہ بعض ایسے آرٹسٹ گزرے ہیں جنہوں نے بڑھتی ہوئی زندگی کا ساتھ دیا مگر اس وقت کے لوگ انہیں سمجھ نہ سکے اور مخالفت کرتے رہے مگر صدیوں کے بعد وہ بہت بڑے آرٹسٹ مانے گئے۔ پینٹنگ کے سلسلے میں انہوں نے وان گوگ کا نام لیا۔

سردار جعفری نے کہا کہ پینٹنگ کے متعلق ان کی معلومات بہت زیادہ نہیں تاہم جہاں تک ان کی معلومات کا تعلق ہے، وان گوگ پہلا عوامی فنکار تھا۔ اسے نہ سمجھنے یا پسند نہ کرنے کا جہاں تک سوال ہے، اس سلسلے میں انہوں نے کہا

کہ اوپر کے لوگوں نے نچلے طبقوں کو آرٹ اور علم سے محروم کر دیا تھا اور یہی وہ لوگ تھے جن کے وہ بہت نزدیک تھے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ خلیج حائل رہی اور اوپری طبقوں نے وان گوگ کو پسند نہیں کیا۔

اس موقع پر شوامتر عادل نے کہا کہ وہ اس مسئلے پر وضاحت سے بحث کرنا چاہتے ہیں چنانچہ انہوں نے مجروح سلطانپوری اور کیفی اعظمی کا نام لیتے ہوئے پوچھا کہ ان میں سے کون سماج کے لیے نقصان دہ ہے اور کون مفید؟ سردار جعفری نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ چونکہ اب شخصیتیں درمیان میں آگئی ہیں اس لیے اس سوال کو بہت زیادہ وضاحت سے پیش کرنا پڑے گا۔ انہوں نے کہا ان میں سے ایک یعنی کیفی اعظمی سیاسی شاعر ہے، جو صرف سیاسی اور سماجی موضوعات پر لکھتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ فارمز بھی بنا لیتا ہے۔ دوسرا یعنی مجروح روایتی فارم یعنی غزل میں لکھتا ہے۔ آرٹ کی یہ دونوں شکلیں ہمارے سامنے ہیں۔

عادل: میں صرف مواد پر بحث کرنا چاہتا ہوں۔

سردار: ہیئت اور مواد کو علیحدہ علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ نظم میں ڈائریکٹنس ہوتی ہے اور غزل کو ہم دونوں طرح سے پڑھ سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ کیا کہا گیا ہے، دوسرے یہ کہ کس طرح کہا ہے۔ غزل کو پڑھتے وقت ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ اس میں کتنی روایتی اصلاحات ہیں (مثلاً کلی کا تبسم وغیرہ) اور کتنی نئی چیزیں ہیں۔ چنانچہ مجروح کے ہاں روایتی اصلاحات تو ہیں لیکن روایتی خیالات کم ہیں۔ پرانی چیزیں مثلاً کعبہ، بت خانہ، مجنوں وغیرہ روایتی استعارے ہیں۔ مجروح کی پرانی غزلوں میں یہ چیزیں ہیں مگر نئی غزلوں میں انہوں نے نئی چیزیں پیش کی ہیں۔ مثلاً اس کے دو شعر ہیں.....

لیے بیٹھا ہے دل اک عزم بیباکانہ برسوں سے

کہ اس کی راہ میں ہیں کعبہ و بت خانہ برسوں سے

اس شعر میں بھی خیالات نئے ہیں، اظہار پرانا ہے۔ ہم میں سے کوئی شاعر ایسا نہیں جس پر آرٹ کا روایتی اثر نہ

پڑا ہو۔ چنانچہ انہوں نے بتایا کہ ایک زمانے میں انہوں نے شعر کہا تھا.....

میں عہد وفا کرتا ہی نہیں میں ایک کادم بھرتا ہی نہیں

ہر موج سے مل لیتا ہوں گلے ہر ساحل سے ٹکراتا ہوں

..... اور جسے بعد میں کاٹ کر پھینک دیا گیا تھا۔ مجروح بھی جدوجہد کر رہا ہے، اس کی شاعری کی عمر تین سال

ہے۔ اس لیے اگر اس کی آدھی غزلیں بھی ایسی ہوں جو رجعت پرستانہ نہ ہوں تو یہی تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ ٹھیک کہہ رہا

ہے..... اور رہا شاعر اور سننے والوں کا تعلق، اس سلسلے میں سردار جعفری نے کہا..... ”مجروح خود تسلیم کرتے ہیں کہ کیفی کی

شاعری کو لوگ سیاسی حالات کی وجہ سے زیادہ پسند کرتے ہیں کیونکہ اس میں اجتماعی اپیل ہوتی ہے۔ آج کا شاعر طبقاتی جدوجہد کا ساتھ دیتا ہے اور آج کا آرٹسٹ شعوری طور پر اپنے طبقے کا انتخاب کرتا ہے اور جب تک وہ انتخاب کر چکتا ہے تو دیکھتا ہے کہ اس طبقے کی ذہنی صلاحیت کیا ہے۔ کیفی کی نظم سننے والے آرٹ، علم و ادب کی نعمتوں سے محروم کر دیئے گئے ہیں اور وہ شاعرانہ تشبیہیں اور استعارے نہیں سمجھ سکتے۔ سمجھتے ہیں تو وہ لوگ جن کے خلاف یہ نظمیں لکھی جاتی ہیں یعنی جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کا طبقہ۔ ایسی صورت میں آرٹسٹ کا مقصد ختم ہو جاتا ہے۔ اس لیے مجبوراً آرٹسٹ کو آرٹ کی بلند سطح سے نیچے اترنا پڑتا ہے تاکہ وہ ان لوگوں کو نیچے سے اٹھا کر اوپر لے آئیں، اس لیے نہیں کہ آرٹ کو نیچے لے جائیں۔ اس اعتبار سے کیفی کے شعروں کو اسی نقطہ نگاہ سے سمجھنا پڑے گا کیونکہ اس کے آرٹ کی کسوٹی عوام ہیں۔ مجروح کے ہاں فارم پرانا، خیالات نئے ہیں۔ کیفی نئے خیالات کے ساتھ نیا فارم بھی اختیار کرتا ہے۔ مثلاً وہ کہتا ہے کہ.....

پکارتا ہے افق سے لہو شہیدوں کا
کہ ایک ہاتھ سے کھلتی نہیں گلے کی رس

یا یہ مصرعہ کہ.....

نوید فتح ہے قلب عوام کی دھڑکن

ہر اعتبار سے آرٹ کی کسوٹی پر پورے اترتے ہیں۔“

و شوا متر عادل: مگر اس شاعری کو عوام نہیں سمجھتی۔

سردار جعفری: آپ یہاں بیٹھ کر فیصلہ کر رہے ہیں۔ ہم عوام میں جا کر آئینہ کی طرح دیکھتے ہیں کہ وہ کیا سمجھتے ہیں کیا نہیں سمجھتے۔ اس میں سننے والے کے عقائد اور اس کی حیثیت بھی کام کرتی ہے۔ اس سلسلے میں ایک مثال کے ذریعہ انہوں نے بتایا کہ ساحر نے جب اپنا مجموعہ کلام بیچا تو پبلشر نے ان سے ایک نظم اس میں سے نکالنے کے لیے کہا جس کا ایک مصرعہ ہے.....

افق روس سے پھوٹی ہے نئی صبح کی ضو

پبلشر نے کہا کہ اس میں آرٹ نہیں ہے۔ اس پر ساحر نے کہا کہ اگر.....

نیسے از حجاز آید کہ نہ آید

..... آرٹ ہے تو یہ کیوں نہیں؟

آخر میں سردار نے کہا کہ ہمیں کسی آرٹ سے متعلق غور کرتے وقت تین چیزوں کا خیال رکھنا ہوگا۔ (1) گلیا کہ

رہا ہے۔ (2) کس کے لیے کہہ رہا ہے (3) کیسے کہہ رہا ہے۔ دشوا متر عادل نے کہا کہ اس طرح سے آرٹ کی یونیورسل ویلیو ختم ہو جاتی ہے۔

سردار جعفری نے جواب دیا کہ ہم تو اس کے قائل ہی نہیں ہیں۔

دشوا متر عادل نے کہا کہ وہ ایک مثال پیش کرتے ہیں اور وہ یہ کہ یوسف ظفر اکثر وہی باتیں کہتے ہیں جو متوسط طبقے کے لوگ سوچتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان کا نقطہ نظر درست ہو مگر اکثر لوگ اسی طرح سوچتے ہیں۔
محمد صفدر: یہ غلط ہے۔ اس لیے کہ یوسف ظفر محض فرار کے قائل ہیں۔

سردار: میرے نقطہ نظر کے مطابق تو یوسف ظفر اپنی صلاحیتوں کو تباہ کر رہے ہیں۔ وہ اس درمیانی طبقے کی گھٹن کا شکار ہیں جس کا کوئی مستقبل نہیں۔

عادل: آپ متوسط طبقے کو پھانسی پر کیوں چڑھاتے ہیں؟

سردار: ہم پھانسی پر نہیں چڑھاتے، وہ خود انحطاط پذیر ہے۔ اگر ہم اپنے اپنے گھروں کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ اس طبقے کے کتنے آدمی جوا کھیلتے ہیں، بیکار رہتے ہیں، رنڈی بازی کرتے ہیں۔
عادل: مگر متوسط طبقے کے لوگ یوسف ظفر کی شاعری کو پسند کرتے ہیں۔

محمد مہدی: یہ امر بحث طلب ہے۔

عادل: کیا نچلے طبقے کے لوگ کیفی کی نظم کو پسند کرتے ہیں؟

سردار: ہاں! مشاعرہ میں پانچ پانچ دس دس ہزار آدمی سنتے ہیں۔ آپ کبھی آرٹ کی بلندی سے اتر کر وہاں پہنچے ہوں تو آپ کو معلوم ہو۔

عادل: میں تو نہیں مانتا کہ یہاں کے مزدور کیفی کی نظم سمجھ لیتے ہوں!

سردار: آپ پھر غلطی کر رہے ہیں شاید آپ کو معلوم نہیں کہ مدن پورہ میں یو۔ پی کے مزدور آباد ہیں جن کی مادری زبان اردو ہے۔

عادل: موجودہ اردو شاعروں میں صحت مند نقطہ نظر رکھنے والے شاعروں کو اگر ہم گننے بیٹھیں تو یہی نام ہمارے

سامنے آتے ہیں، جوش، جعفری، کیفی، ساحر۔

سردار: میں اس میں اور ناموں کا اضافہ کروں گا مثلاً فیض، قاسمی اور ان کے علاوہ بہت سے اور بھی ہیں۔ دوسرا

گروہ غیر صحت بخش نقطہ نظر رکھنے والوں کا ہے جس میں سب سے پہلے میراجی ہیں، جن کا تحریری بیان ہے کہ ان کے

نزدیک ماضی اور حال کا وجود ہے، مستقبل ہے ہی نہیں اور ان کے ہاں Frustration کا یہ عالم ہے کہ وہ ایک عورت کے پیشاب کرنے پر نظم لکھتے ہیں جس میں کوئی حسن نہیں محض گندگی ہے..... ذہنی، روحانی اور وجدانی گندگی اور ان کے ہاں یہی رجحان حاوی ہے۔

عادل نے کہا کہ میراجی کے یہاں ترقی پسند چیزیں بھی ہیں۔ اس پر سردار جعفری نے جواب دیا کہ پھر ایسی چیزیں آپ ڈھونڈ سکتے ہیں جنہیں ترقی پسند کہا جاسکے مگر حاوی رجحان وہی Frustration ہے اور اس کو سامنے رکھ کر ہی ہمیں فیصلہ کرنا ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ برٹش امپیریلزم کی مخالفت ترقی پسندی ہے مگر یہ مخالفت ہٹلر نے بھی کی۔ وہ ترقی پسند نہیں کہلا سکتا اس لیے کہ درمیان میں اور بہت سی قدریں بھی ہیں لہذا ہمیں مجموعی طور پر دیکھنا ہوگا اور جب ہم دیکھتے ہیں تو میراجی کے متعلق یہی کہنا پڑے گا کہ وہ اس مقام پر پہنچ گئے ہیں جہاں حسن کو گندگی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور اسی ضمن میں سلام مچھلی شہری کا نام بھی آتا ہے۔ رجعت پرستوں کا گروہ ان ہی دو پر مشتمل ہے۔

مدھوسودھن: آخر کون سی چیز کہنے پر آپ آرٹسٹ کو ترقی پسند اور کون سی چیز کہنے پر رجعت پسند کہیں گے؟

سردار جعفری نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا..... ”اس کا کوئی ابدی معیار نہیں۔ ایک چیز ایک وقت میں ترقی پسند اور دوسرے وقت میں رجعت پرست ہو سکتی ہے۔“

مدھوسودھن: یہ کیسے؟

سردار: جو زیادہ سے زیادہ آدمیوں کو مادی اور روحانی فیض پہنچائے۔ اس سلسلہ میں شیکسپیر نے سرمایہ داری کی تعریف کی اور تجارتی سرمایہ داری کو آسمان پر پہنچا دیا۔ اس وقت سرمایہ داری نسبتاً زیادہ اچھی چیز تھی۔ اس لیے شیکسپیر نے ٹھیک کہا، مگر آج سرمایہ داری کی حمایت کرنا سراسر رجعت پرستی ہے۔

مدھوسودھن: کیا حسن پیدا کرنے میں کوئی افادیت ہے؟

سردار جعفری: حسن بجائے خود کچھ نہیں، جب اسے چیزوں سے علیحدہ کر لیں تو وہ کیا رہ جاتا ہے؟ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ سمندر حسین ہے، ستارے حسین ہیں مگر صرف حسین ہیں بالکل بے معنی بات ہوگی۔ حسن کو مادہ اور جسمانییت سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔

مدھوسودھن: مثلاً رنگ کیا ہے؟

سردار: رنگ رنگ ہے، مادہ ہے۔

مدھوسودھن: کیا یہ آسمان مادہ ہے؟ کیونکہ آپ اس کے حسن کی تعریف کرتے ہیں؟

سردار: ہاں مادہ ہے کیونکہ آسمان اس فضاے بسیط کا نام ہے جس میں ایتھر ہے۔ حسن مادے اور جسمانیات نے الگ ہو کر اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتا۔ آخر میں انہوں نے کہا کہ یہ طویل فلسفیانہ بحث ہے لیکن سچ اور جھوٹ کی اصل کوئی عمل ہے۔ تصور پرست فلسفی کمرے میں بیٹھ کر کہے گا کہ یہ کیپسٹن کی ڈبیا نہیں ہے کیونکہ اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے آپ کہیں گے کہ یہ ڈبیا ہے۔ اس طرح کوئی فیصلہ نہیں ہوگا مگر وہی فلسفی جب کمرے سے نکل کر باہر بازار میں سگریٹ خریدنے آئے گا تو ہمیشہ کیپسٹن کی ڈبیا طلب کرے گا۔ کیپسٹن کی ڈبیا پر شک کر کے کبھی چھتر کو کیپسٹن نہیں سمجھے گا اس لیے سب باتیں محض عمل میں آ کر حل ہوتی ہیں۔

پروگرام کے مطابق اب اقبال چودھری نے جاپان سے متعلق اپنے ایک طویل افسانے کا کچھ حصہ پڑھ کر سنایا۔ چونکہ افسانہ مکمل نہیں تھا اس لیے اس پر کوئی بحث نہیں ہوئی۔ آخر میں یزدانی جالندھری نے فساد کے متعلق اپنی طویل مثنوی کا ایک حصہ پڑھ کر سنایا۔ ابھی کچھ چیزیں باقی تھیں مگر چونکہ وقت بہت ہو چکا تھا اس لیے میٹنگ کو یہیں ختم کر دیا گیا۔

14 اپریل 1947ء

ترقی پسند مصنفین کا یہ اجلاس ساحر لدھیانوی کی صدارت میں منعقد ہوا۔

پچھلے ہفتے کی روداد سنائی جانے کے بعد مجروح سلطانپوری نے ایک غزل سنائی۔ غزل سننے کے بعد صدر نے کہا کہ غزل پر تنقید کرنے سے پہلے لوگوں کو اس میں جو خوبیاں نظر آئی ہوں، وہ بیان کر دیں کیونکہ یہاں بالعموم سخت تنقید ہوتی ہے اور یہاں پر پڑھی جانے والی چیزوں کی خوبیوں کو بیان نہیں کیا جاتا جس سے یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ شاید اس چیز میں کوئی خوبی تھی ہی نہیں۔

سلطانہ بیگم نے کہا کہ اس غزل کی سب سے بڑی خوبی تو یہ ہے کہ اسے سننے کے بعد نئی زندگی کا احساس ہوتا

و شوا متر عادل نے کہا کہ وہ غزل کے اس شعر کا مفہوم نہیں سمجھ سکے.....

دل سادہ نہ سمجھا ماسوائے پاک دامانی

نگاہ یار کہتی ہے کوئی افسانہ برسوں سے

مجروح: یہ محبت کے افلاطونی تصور پر ایک طنز ہے۔

عادل: مجھے تو طنز کہیں معلوم نہیں ہوتا۔

میراجی: اس شعر میں محبت کا خالص مادی اور سائنٹفک نقطہ نظر ہے۔

عادل: وہ کیسے۔

مجروح: تصوف کی رو سے جو پاک دامانی کا تصور ہماری شاعری میں آیا ہے اس پر طنز کیا گیا ہے اور چونکہ جو بات کہی گئی ہے وہ غزل کی فارم اور غزل کے شعر میں ہے، اس لیے یہ طنز کنایتاً کیا گیا ہے۔
 وشوامتر عادل نے پھر اس بات پر زور دیا کہ طنز نہیں ہے بلکہ یہ تو کچھ اخلاق سے گری ہوئی بات ہے۔
 مجروح نے کہا کہ اگر آپ یہی مطلب سمجھتے ہیں تو آپ شعر نہیں سمجھ سکے۔
 میراجی نے عادل سے کہا کہ وہ جو کچھ سمجھ سکے ہوں، بیان کر دیں۔

عادل نے کہا کہ یہ لہجہ اور یہ بات غیر صحت مندانہ ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے کہا کہ ہمارے شاعروں نے افلاطونی محبت کا عام طور پر ذکر نہیں کیا۔

میراجی نے کہا کہ یہ بات غلط ہے۔ موجودہ شاعروں سے پہلی نس کے شاعروں نے ”پاک محبت“ کی ایک اصطلاح جاری کی تھی جس میں عام طور پر سینے سے اوپر کی ایسی محبت کا ذکر ہوتا ہے جسے گوشت پوست سے کوئی تعلق نہیں۔ محبت کے اس تصور پر طنز کیا گیا ہے۔

عادل: میری سمجھ میں شعر تو آ گیا ہے لیکن یہ بات شعروں میں واضح طور پر نہیں ہے۔
 مجروح نے کہا کہ شاعری کا پس منظر ذہن میں ہونا چاہیے پھر آپ شعر سمجھ سکتے ہیں۔ ہر شعر میں ہر بات کہنے کی نہ گنجائش ہوتی ہے نہ ضرورت۔

میراجی نے کہہ کر آپ یہ سمجھ لیں کہ شاعر مخاطب کے کر رہا ہے تو شعر آپ کی سمجھ میں آ جائے گا۔ وشوامتر عادل نے پھر کہا کہ ہمارے شاعروں نے اس افلاطونی محبت کا ذکر نہیں کیا۔

مجروح صاحب نے عادل صاحب سے درخواست کی کہ وہ کوئی دو شعر ایسے بتلا دیں جن سے ان کی رائے کا ثبوت ملے مگر انہوں نے کہا کہ اس وقت انہیں ایسے شعر یاد نہیں آ رہے ہیں مگر پاک دامانی پر طنز کرنا کسی طرح صحت مندانہ جذبہ نہیں۔

ساحر لدھیانوی نے کہا کہ پاک دامانی محاورہ ہے اور یہاں اس سے ذہنی محبت مراد ہے۔
 میراجی نے کہا کہ شعر صاف ہے۔ پاک دامانی کی مہمل ترکیب پر طنز کیا گیا ہے۔ اس کے بعد بھی وشوامتر عادل نے نہیں مانے تو میراجی نے شعر کے مطلب کو یوں بیان کیا کہ..... ”نگاہ یار جسمانی ملاپ کی خواہش مند تھی مگر دل صاحب پاک دامنی کے تصور میں الجھے رہے اور سمجھ ہی نہیں سکے اور اس بے خوف دل کو پتا نہیں چلا کہ نگاہ یار یہ کہہ رہی ہے۔“

انہوں نے کہا لفظ سادہ سے مطلب بالکل صاف ہو جاتا ہے۔

محمد علی نے پوچھا.....

”لیے بیٹھا ہے دل اک عزم بے باکانہ برسوں سے

..... میں عزم لیے بیٹھنا صحیح ہے؟“

مجروح نے کہا ”کیے بیٹھا“ اور ”لیے بیٹھا“ دونوں صحیح ہیں۔

اس کے بعد سلطانہ بیگم نے ”ٹھہرا پانی“ کے عنوان سے ایک خاکہ سنایا۔ شروع کرنے سے پہلے انہوں نے کہا

یہ خاکہ نامکمل ہے اور وہ اسے ابھی دوبارہ لکھنے کا ارادہ رکھتی ہیں۔

محمد صفدر نے کہا کہ اس خاکے میں ایک موبد کے کپڑوں، اس کے سیڑھیوں سے اترنے چڑھنے، نسوار لینے اور

بچوں کو تھپتھپانے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ آخر میں کبوتروں کا ذکر کس لیے کیا گیا ہے یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ مرزا اشفاق

بیگ نے پوچھا کہ کیا یہ خاکہ لکھ کر وہ موبد کی زندگی کے جمود کو دکھانا چاہتی تھیں اور کیا آخر میں کبوتروں کو لا کر اس زندگی میں

حرکت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے؟

سلطانہ: اگر اس کی زندگی کا جمود ظاہر ہو گیا ہے تو میں سمجھتی ہوں میں جو کچھ ظاہر کرنا چاہتی تھی وہ کہنے میں

کامیاب ہو گئی ہوں۔

عادل: مگر یہ کہیں نہیں بتایا گیا ہے کہ اس جمود کی وجہ کیا ہے؟

محمد صفدر نے کہا کہ ان کے خیال میں یہ بتانا ضروری نہیں ہے، سوال تو یہ ہے کہ اس خاکہ میں اس کی زندگی کا

جمود ظاہر بھی ہوا ہے یا نہیں؟

مجروح: ماحول کی اس گھٹن سے جو اس میں بیان کی گئی ہے، جمود کا احساس ہو جاتا ہے۔

محمد صفدر نے کہا کہ خاکے میں موڈ تو ظاہر ہو گیا ہے۔ اس کی حرکتیں بیان کی گئی ہیں جو خارجی اور سطحی قسم کی ہیں۔

جن روایات کی وجہ سے یہ صدیوں کی پرانی گھٹن ہے، اس پر روشنی نہیں ڈالی گئی ہے۔ کریکٹر کے اندر گھس کر اس کا مطالعہ

نہیں کیا گیا۔

سلطانہ بیگم نے کہا کہ ان کے خیال میں ان روایات کا ذکر کرنا ضروری نہیں تھا۔

صفدر: جس جمود کا ذکر آپ نے کیا ہے وہ ایک مردہ اقتصادی نظام کی روایتوں کا پیدا کردہ ہے، جن کے متعلق

اس میں اشارہ تک نہیں ہے۔

مجروح: میرے خیال میں اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ پڑھنے والے کو موبد کی زندگی کی گھٹن اور جمود سے نفرت پیدا ہوتی ہے۔

دشوا متر عادل فوراً بولے..... ”یہ آپ نے کیسے کہہ دیا؟ مجھے تو اس کی زندگی پر پیارا آنے لگا ہے۔“

ساحر لدھیانوی نے کہا..... ”اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو جمود پر پیارا آ گیا ہے۔“

مرزا اشفاق بیگ نے کہا کہ آخر میں کچھ ایزادی کر دی جائے تو ٹھیک ہو جائے گا۔

حمید اختر نے کہا کہ اصل میں رنگ آمیزی پوری طرح سے نہیں ہوئی۔ اگر کچھ اور پہلو بھی اجاگر کر دیئے جائیں تو

یہ مکمل ہو جائے گا۔

سلطانہ بیگم نے کہا کہ جیسا کہ انہوں نے پہلے کہا ہے وہ اسے دوبارہ لکھیں گی۔

آخر میں دشوا متر عادل کو ایک نظم سنائی تھی، نظم شروع کیے جانے سے پہلے بعض لوگوں نے پوچھا کہ نظم کا عنوان

کیا ہے؟

دشوا متر عادل نے کہا کہ ان کی نظم کا عنوان کوئی نہیں ہے، لوگوں نے پھر اصرار کیا تو انہوں نے کہا اس نظم کا

عنوان ہے ”ایک نظم“۔

(نظم جس طرح سے پڑھی گئی تھی)

کچھ ایسی باتیں سو جھی ہیں جن کو سن کر

رقصاں پاؤں ہلکے ہلکے دھیرے دھیرے

سحر آگئیں فانوسوں کی چھنتی چھاؤں میں

قالینوں کے سرخ دکتے گل بوٹوں پر

چھم چھم چھم، ہتم جاتے ہیں، جم جاتے ہیں

کچھ ایسی باتیں سو جھی ہیں جن کو سن کر

کانوں میں جھل جھل مل کرتے آویزے

لال دکتے انگارے سے بن جاتے ہیں

پیار بھری میٹھی نظروں کے نرم پوروں کو

دھیمے دھیمے اپنی لو سے جھلساتے ہیں

کچھ ایسی باتیں سو جھی ہیں جن کو سن کر
ریشم کے نازک ملبوس، سرکتے آنچل
سایوں کی مانند پھیل کرتا ریکی میں کھو جاتے ہیں
گرم حسین اعصاب تڑپ کر
خود اپنی نظروں میں رسوا ہو جاتے ہیں
کچھ ایسی باتیں سو جھی ہیں جن کو سن کر
ہنستی آنکھیں، ہنستی پلکیں

ہر جانی آغوش کی خواب دیدہ ولذت میں کھو جاتی ہیں
بجھتی راکھی بن کر آخر ٹھنڈی بے حس ہو جاتی ہیں
خاموشی سے خاموشی

تابند و گلدان سے پھولوں کی سو جھی لاشیں چمٹی ہیں
کیوں تیری آنکھوں میں آنسو بھر آئے ہیں

وہ نظم سنا چکے تو محمد صفدر نے کہا کہ نظم سمجھ میں نہیں آئی۔

وشوا متر عادل نے حاضرین کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا، کوئی صاحب مفہوم سمجھ گئے ہوں تو بیان کر دیں۔
جو مفہوم مجروح سلطانپوری سمجھتے تھے وہ یہ تھا کہ ایک دبا کچلا ہوا شخص ایک کمرے میں غمگین بیٹھا ہوا کچھ سوچ رہا ہے۔ اسے
کچھ باتیں یاد آتی ہیں جو گزر چکی ہیں اور وہ غمگین ہو جاتا ہے اور اس کی آنکھوں میں آنسو.....

وشوا متر عادل نے کہا ”یہ مطلب صحیح نہیں ہے“۔

محمد صفدر جو کچھ سمجھے وہ یہ تھا.....

ایک مرد ایک عورت سے کچھ کہتا ہے تو اس کے رقص کرتے پاؤں رک جاتے ہیں۔ ملبوس تاریک میں خوابیدہ
لذت میں کھو جائیں گی۔ کیا یہ بات اس کے ریفارم کے خلاف نہیں ہے۔
عادل نے کہا کہ اس مصرعو کو تبدیل کر دیں گے۔

محمد صفدر نے کہا کہ نظم کے تیسرے بند میں جہاں ریشم کے ملبوس کا ذکر ہے اس سے کیا مراد ہے؟
عادل نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا..... ”کچھ ایسی باتیں سو جھی ہیں جن کو سن کر وہ شرمندہ اور حجل ہوگی“۔

محمد صفدر: کیا شرمندہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ کپڑے اتار دے گی؟

عادل: ریشمی کپڑے اتار کر دوسرے پہن لے گی۔

صفدر: مگر اس بند کو سننے کے بعد برہنگی کا احساس ہوتا ہے کیونکہ بعد میں گرم حسین اعصاب کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے جیسا وہ انہیں چھو کر محسوس کر رہا ہے۔

ساحر: گرم حسین اعصاب کے ذکر میں ایک قسم کی لذت پائی جاتی ہے۔

عادل: یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس مرد کو احساس ہو کہ لڑکی کا جسم حسین ہے، گرم ہے مگر جو کچھ وہ کر رہی ہے وہ صحیح نہیں ہے۔

ساحر: مگر پھسلنے سے نفرت کا اظہار نہیں ہوتا بلکہ اس میں ایک قسم کا تلذذ ہے۔

میراجی: ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ لڑکی کی حالت سدھارنے کے نیک کام کے ساتھ ساتھ غیر شعوری طور پر اس لذت کو بھی ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتا اور مزے لے کر ریشمی ملبوس کے پھسلنے کا ذکر کرتا ہے۔

عادل: یہ غلط ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اسے ریشمی کپڑوں سے نفرت ہو جائے گی اور وہی ملبوس پھلس کر سایوں کی طرح تاریکی میں چلا جائے گا۔

اسرار الحق مجاز نے کہا کہ اس مصرعہ سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ہاتھ بڑھ کر اس کے ریشمی ملبوس کو پھسلا دے گا۔

عادل: یہ ہاتھ اس کا اپنا بھی تو ہو سکتا ہے۔

میراجی نے کہا..... ”ساری بحث کے بعد ہم نظم کو یوں دیکھتے ہیں کہ ایک امیر، عیاش لڑکی ہے۔ شاعر اس سے کہتا ہے کہ اس قسم کی بات کہوں تو یہ ہو جائے گا۔ اس قسم کی بات کہوں تو شرمندہ ہو جائے گی۔ اپنی نظروں میں رسوا ہو جائے گی وغیرہ..... اس کے بعد بالکل فلم کی کیمیرہ تکنیک سے شاعر لکڑی کو گلڈان سے چمٹی سوکھے پھولوں کی لاشیں دکھاتا ہے اور لڑکی کی آنکھوں سے آنسو آجاتے ہیں اور بس.....“

اس مصرعہ کے متعلق عادل نے پھر کہا کہ کپڑوں کو انہوں نے امارت اور عیاشی کا Symbol لیا ہے جو وہ ترک کر دے گی۔

ساحر لدھیانوی: آپ ایسا Symbol کیوں لیتے جس سے الجھن پیدا ہوتی ہے۔

عادل: اس لیے کہ اس میں شعریت زیادہ اور میں اسے بدلنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ نظم کا لہجہ بہت ہمدردانہ

ہے اور وہ پیار سے اسے سب کچھ کہہ رہا ہے۔ اس لیے وہ کپڑوں کے لیے نوچنے کا لفظ استعمال نہیں کر سکتا۔
کچھ لوگ اب بھی بولنے کے لئے تیار تھے مگر صاحب صدر نے مجلس برخواست کر دی۔

13 اپریل 1947ء

اردو ترقی پسند مصنفین کا یہ اجلاس ساغر نظامی کی صدارت میں منعقد ہوا۔

حاضرین: سردار جعفری، وشو امتر عادل، کیفی اعظمی، میراجی، ساحر لدھیانوی، محمد صفدر، سلطانہ بیگم، ذکیہ ساغر،
لطانہ فیضی، نور بانو، حور بانو، ضیاء الحسن، محمد مہدی، راشد حسین، شوکت عزیز، محمد حسین جعفرانی، کامل القادری، مصطفیٰ محمد علی،
ہارون خوشتر، وریندر دیو، بلدیوراج اور دوسرے اصحاب۔

پچھلی میٹنگ کی روداد سنائی جانے کے بعد سردار جعفری نے میکسم گورکی کا ایک مضمون ”انانیت کی شکست“
(Destruction of Personality) پڑھا۔ مضمون سنانے سے پہلے انہوں نے کہا کہ یہ مضمون ابھی ابھی
انگریزی میں ترجمہ ہو کر آیا ہے اور چونکہ یہ مضمون سوویت یونین میں لکھا گیا تھا، اس لیے اس کا پس منظر بیان نہیں کیا گیا۔
اس میں ادب میں شخصیت کا تصور بیان کیا گیا ہے اور اب کے تصور کی ان مختلف شکلوں پر بحث کی گئی ہے جو اس نے مختلف
ادوار میں اختیار کیں۔ انہوں نے کہا کہ اس میں سماجی ارتقاء کے چار بڑے بڑے دور ہیں۔

پہلا ابتدائی دور جو تہذیب سے پہلے بربریت کا دور ہے اور اسے دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے یعنی ابویت اور
امویت کے دور میں پروہت، قبیلوں کے سردار۔ پھر بادشاہی کا زمانہ آتا ہے۔

دوسرا بڑا دور غلامی کا دور ہے جس میں پیداوار غلاموں کی وجہ سے ہوتی تھی اور جس سے غلہ وغیرہ پیدا کیا جاتا تھا
اور ضروریات زندگی پوری کی جاتی تھی مگر غلامی کے دور میں ذاتی ملکیت قائم ہو گئی۔ تسلسل کلام جاری رکھتے ہوئے سردار
جعفری نے کہا کہ یہ ذاتی ملکیت بعض جگہوں پر پہلے قائم ہوئی اور بعض جگہوں پر بہت دیر کے بعد مثلاً ہندوستان میں
اٹھارہویں صدی تک ذاتی ملکیت کا پتہ نہ تھا۔

تیسرا بڑا دور سامتی دور ہے جس میں زمیندار اور کاشتکار وجود میں آئے اور چوتھا دور سرمایہ داری کا دور ہے جب
مشینوں نے ذرائع پیداوار پر قبضہ کر لیا اور انسانیت مشینوں کے مالک، سرمایہ داروں اور کام کرنے والے مزدوروں میں
ٹٹ گئی۔

مضمون ختم ہونے پر ایک سوال کے جواب میں سردار جعفری نے کہا کہ یہ مضمون بہت لمبا تھا، اس لیے انہوں
نے پورے مضمون کا ترجمہ نہیں کیا۔ بعض حصے جو پرانے روسی ادب اور اس کے اقتباسات سے متعلق تھے، چھوڑ دیئے گئے

ہیں۔

محمد مہدی نے کہا کہ اس تجزیے کی روشنی میں اگر ہندوستانی ادب کا جائزہ لیں تو وہ بہت فائدہ مند ہوگا۔

میراجی نے کہا کہ اگر سردار جعفری اس مضمون کو شائع کرانے سے پہلے اس کے آخر میں کچھ حصہ بڑھادیں اور

اس کی روشنی میں ہندوستانی ادب کا جائزہ لیں تو ان کے خیال میں یہ مضمون زیادہ مفید ہوگا۔

سردار جعفری نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ اس کے لیے دیو مالا اور Fold Lore پر عبور ہونا ضروری

ہے اور چونکہ ان دونوں پر انہیں پورا عبور نہیں ہے اس لیے اس تجویز کو عمل میں لانا ممکن نہیں ہے۔

محمد مہدی نے کہا کہ مضمون اپنی جگہ پر جامع اور بے حد مفید ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ترجمہ بھی نہایت خوبصورت ہے۔ اس

لیے اس پر اعتراض وغیرہ کی گنجائش ہی نہیں رہے گی۔ پروگرام کے مطابق اب کیفی اعظمی نے اپنی نظم ”جلال و جمال

سنائی۔ ذکیہ ساغر نے کہا کہ نظم بے حد خوبصورت اور ہر طرح سے مکمل ہے۔ ساغر نظامی نے کہا کہ جہاں تک تصور اور تفکر کی

توانائی کا تعلق ہے، وہ اس نظم میں شدت سے موجود ہے اور یہ چیز نظم کی بہت بڑی خوبی ہے۔

محمد صفدر نے کہا کہ ”جلال و جمال“ اس نظم کے لیے موزوں عنوان کیسے ہے؟ اس کا جواب دیتے ہوئے سردار جعفری نے

کہا کہ صوفیائے کرام کے نزدیک جمال شدت اظہار کا نام جلال ہے اور اس نظم میں اس جلال کا بھرپور اظہار ہے اور

ہمارے ماحول میں محبت کے گھٹے ہوئے تصور سے ظاہر ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ پچھلے دس بارہ سال سے اس تصور میں

تبدیلی ہوئی ہے۔ مثلاً اختر کی نظموں میں محبت اور حسن دونوں ابھرتے ہیں۔ خاص طور پر مجاز کی نظم میں جس کا ایک شعر

ہے۔

آؤ مل کر انقلاب تازہ پیدا کریں

دہر پر اس طرح چھائیں کہ سب دیکھا کریں

لیکن اس کے ساتھ دوسرا شعر ہے.....

تم کہ بن سکتی ہو ہر محفل میں فردوس نظر۔

مجھ کو یہ دعویٰ کہ ہر محفل پر چھا سکتا ہوں میں

سردار جعفری نے کہا کہ اس شعر میں عاشق کا ”میں“ زیادہ طاقتور دکھائی دیتا ہے اور محبوبہ کی شخصیت Passive نظر

ہے۔ شاعر کچھ یوں کہتا ہے کہ میں یہ کر سکتا ہوں وہ کر سکتا ہوں، اس لیے تم آؤ مگر کیفی کی نظم میں دونوں کا امتزاج اور شدت

ہے مثلاً.....

اے چیں بہ جبیں اے شعلہ بجاں
دو چار شرارے اور ابھی

اس میں حسن اور عشق کا بھرپور اظہار اور زمانے کی بندشوں کو توڑنے کا عزم دونوں طرف سے ہے۔ جیسا کہ
ساغر صاحب نے کہا ہے اس میں بھرپور توانائی ہے۔

میراجی نے کہا کہ انہیں اس سے اختلاف ہے کیونکہ نظم میں جمال کے تصور کا ثبوت تو ملتا ہے لیکن جلال کے وجود
کا امکان موجود ہے کیونکہ ”اور ابھی“ کے ٹکڑے سے معلوم ہوتا ہے کہ تکمیل میں ابھی اور وقت لگے گا اور ابھی اور وقت کی
ضرورت ہے، یعنی کچھ اور ہو سکتا ہے اور اگر کچھ اور ہو سکتا ہے۔

سردار جعفری نے کہا کہ یہ خیال ایک حد تک صحیح ہے۔ ابھی کچھ اور ہو سکتا ہے۔ کیفی اعظمی نے کہا کہ محبت کی تکمیل تک بڑھنے
کو بیان کیا گیا ہے۔

وشوا متر عادل نے کہا کہ نظم میں جو خوبیاں بیان کی گئی ہیں اس سے انہیں اتفاق ہے مگر اس کے ساتھ ہی نظم کے
پہلے اور آخری بند میں جو Symbol لیے گئے ہیں، وہ اس ماحول کو بگاڑ دیتے ہیں جو اس نظم نے پیدا کیا ہے اور جسے تیسرا
اور دوسرا بند پیدا کرتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ دوسرے بند میں ساحل، کشتی اور لہریں اور واضح منزل کا ذکر ہے۔ اس کے
مقابلے میں پہلے بند میں.....

نہروں میں ڈھلی جاتی ہے فغاں

صرف نعرہ لگانے کے لیے کہا گیا ہے اور اسی قسم کی نعرہ بازی آخری بند میں ہے جو نظم کو بگاڑ دیتی ہے۔

کیفی اعظمی: نعرے اور بغاوت جیسے دو لفظوں کی نظم میں موجودگی کی وجہ سے میں اب تک سوچ رہا تھا کہ آپ نے
اس پر اعتراض کیوں نہیں کیا۔ بہر حال اب سن لیجیے کہ پہلے بند میں زندگی اور محبت شروع ہوتی ہے۔ اس کے بعد زندگی کا
طویل راستہ ہے، منزل تک پہنچنے کی کوشش اور راستہ کی پابندیاں مگر چوتھے بند میں منزل پر پہنچنے کا عزم اور یقین بڑھ جاتا
ہے کہ.....

تکمیل بغاوت ہو جائے

اعلان محبت ہو جائے

ہر خواب حقیقت ہو جائے

اب چاہے قیامت ہو جائے

دوچار اشارے اور ابھی

وشوا متر عادل نے کہا کہ جو Symbol دوسرے اور تیسرے بند میں استعمال کئے گئے وہ پہلے اور چوتھے بند میں نہیں ہیں جس کی وجہ سے یہ علیحدہ علیحدہ معلوم ہونے لگتے ہیں اور نظم میں تسلسل نہیں رہتا۔ کیفی اعظمی نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ اتفاق سے اس نظم میں عاشق و معشوق دونوں ایسے کیریکٹر ہیں جو زندگی کے اور مراحل بھی آتے ہیں، ساحل اور منزل کا ذکر ان مراحل کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ نظم لکھتے وقت ان کے ذہن میں کچھ ایسے کیریکٹر بھی تھے جن کی محبت کی اٹھان بہت اچھی تھی مگر بعد میں مختلف وجوہات کی بناء پر ناکام ہو گئی۔ اس لیے اس نظم میں اپنی زندگی کے تمام مراحل ذہن میں رکھ کر تکمیل تک پہنچنے کی تیاری کی ہے۔ کچھ خامیاں بھی ہیں اس لیے کہا گیا ہے کہ دوچار ستارے اور ابھی۔ جہاں تک نعرہ زنی کا تعلق ہے، نظم نعرے سے شروع ہوتی ہے اور تکمیل بغاوت پر ختم ہوتی ہے اور تکمیل بغاوت میں تکمیل محبت کو کہتا ہوں۔

وشوا متر عادل نے کہا..... ”نظم ایک خاص خیال کو ظاہر کرتی ہے مگر مختلف بندوں میں متضاد Symbols استعمال ہونے کی وجہ سے پورا اثر نہیں کرتی۔“

کیفی اعظمی نے اس رائے سے اختلاف کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہر نظم چند خاص خیالوں پر حاوی ہوتی ہے۔ اگر یہ نظم ایک لمس کے احساس تک ہوتی تو کہا جاسکتا تھا کہ تضاد پیدا ہو گیا ہے۔ موجودہ صورت میں یہ درست نہیں۔

وشوا متر عادل: مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ ایک لڑکی سے محبت کرتے ہیں اور بغاوت وغیرہ کا ذکر کر کے اس محبت کو پاکیزہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

کیفی اعظمی: اتفاق سے یہ محبوبہ ایسی ہے جو زندہ رہنا جانتی ہے، محبت کرتی ہے اور تکمیل بغاوت کے لیے ساتھ چلتی ہے۔

میراجی نے کہا کہ نعرے کا جھگڑا کھڑا ہوا وہ انہیں محسوس نہیں ہوتا۔ نعرے سے اجتماع کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ تکمیل بغاوت سے کیفی کا مطلب تکمیل محبت ہے۔ انہوں نے کہا کہ اگر بغاوت کی جگہ مسرت ہو جائے تو یہ غلط فہمی رفع ہو سکتی ہے اور یہ کہ نعرہ بالکل نہیں کھٹکتا اور صحیح معلوم ہوتا ہے۔

سردار جعفری نے میراجی کی رائے سے اس لیے اختلاف کا اظہار کیا کیونکہ موجودہ سماج میں محبت اور مسرت بغاوت ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ اس لیے وہاں پر بغاوت ہی رہنا ضروری ہے۔

کیفی اعظمی نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ تکمیل مسرت بغاوت کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ اس لیے بغاوت

کی جگہ مسرت کا لفظ درست نہیں رہے گا۔

میراجی: پھر آپ بغاوت پر نظم لکھیے، محبت پر کیوں لکھتے ہیں؟

کیفی اعظمی: میں چاہتا ہوں کہ بغاوت ہو..... ان بندوں کے خلاف جو ہماری محبت میں حائل ہیں۔ ہمارے سماج میں چونکہ ارتکاب محبت ہی بغاوت ہے، اس لیے میں یہ کہتا ہوں کہ تکمیل بغاوت ہو جائے یعنی چھپ چھپ کر محبت نہ کرو بلکہ اس کا اعلان کر دو۔ یہ اس لیے کہ تکمیل ہمارے سماج میں جب لڑکا اور لڑکی محبت کرتے ہیں تو ہر جگہ یہ تذکرے ہوتے ہیں، چھپ چھپ کر باتیں ہوتی ہیں اور چھپ چھپ کر ملاقاتیں۔ اس لیے میں صورتحال کو ختم کر کے اعلان کرتا ہوں اور اعلان کرنے کے لیے کہتا ہوں کہ تکمیل بغاوت ہو جائے۔

میراجی: لفظ ”بغاوت“ کے ساتھ ایسی Assosiations ہیں جو ہمارے ذہن کو بندشوں کے خلاف بغاوت کی طرف نہیں لاتیں بلکہ سیاست کی طرف لے جاتی ہیں اور یہ غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے۔

کیفی اعظمی نے کہا کہ اگر بغاوت کا نعرہ اس فضا سے ہٹ کر بلند کیا جائے جو ہمارے سیاسی ماحول کی پیدا کی ہوئی ہے تو یہ غلط فہمی پیدا نہیں ہونی چاہیے اور ان کے خیال میں نظم اس سیاسی فضا سے علیحدہ ہے۔

میراجی نے اس غلط فہمی کے امکان کو رفع کرنے کے لیے ایک مشورہ دیا کہ اس بند کو یوں پڑھا جائے تو زیادہ اچھا ہو جاتا ہے.....

اعلان محبت ہو جائے

ہر خواب حقیقت ہو جائے

تکمیل بغاوت ہو جائے

..... یعنی پہلے مصرعہ کو تیسرے مصرعہ کی جگہ پڑھا جائے۔

کیفی اعظمی: میرے خیال میں نظم کے اس بند کو سمجھنے میں غلط فہمی کا امکان کم ہے کیونکہ جن چیزوں کے خلاف یہ بغاوت ہونی چاہیے وہ دوسرے، تیسرے، چوتھے، پانچویں مصرعے میں صاف ظاہر ہیں۔ پانچویں مصرعے کو قیامت پر ختم کرنے سے یہ چیز اور بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اب چاہیے قیامت ہو جائے لیکن تکمیل ضرور ہوگی۔

سردار جعفری نے کہا کہ اگر مصرعہ کی ترتیب میں رد بدل کرنا ضروری سمجھا گیا تو ان کے خیال میں پہلے مصرعے کو تیسرے کی بجائے چوتھے مصرعے کی جگہ استعمال کرنے سے یہ بند زیادہ اچھا بھائے گا یعنی یوں کہ.....

اعلان محبت ہو جائے

ہر خلوت خلوت ہو جائے

ہر خواب حقیقت ہو جائے

تکمیل بغاوت ہو جائے

اب چاہے قیامت ہو جائے

دو چار اشارے اور ابھی

20 اپریل 1947ء

اردو ترقی پسند مصنفین کا یہ اجلاس علی سردار جعفری کی صدارت میں منعقد ہوا۔

ہمارے ممبروں اور دیگر مہمانوں کے علاوہ اس میٹنگ میں حیدرآباد کے مشہور ادیب عزیز احمد بھی شامل تھے۔

پچھلی میٹنگ کی روداد سنائی جانے کے بعد قمر جلال آبادی نے ”بد دعا“ کے عنوان سے ایک نظم سنائی جس میں شاعر ایک کمن پچی کو دیکھ کر کہتا ہے کہ خدا کرے یہ جوان نہ ہو کیونکہ جوان ہونے کے بعد وہ طرح طرح کی مصیبتوں میں مبتلا ہوگی..... وغیرہ۔

کیفی اعظمی نے کہا کہ یہ نظم بہت خوبصورت ہے۔ الفاظ کا انتخاب، تشبیہ، استعارے بہت اچھے ہیں اور ایک خاص قسم کا ترنم بھی نظم میں موجود ہے لیکن موضوع اور مفہوم کے سلسلے میں یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک کمن لڑکی کے حق میں یہ دعا کرنا کہ وہ جوان نہ ہو کہاں تک صحیح ہے۔ انہوں نے پوچھا کیا شاعر کے ذہن میں جوانی کا تصور آلام اور مصائب وغیرہ کے علاوہ کچھ نہیں ہے؟

قمر جلال آبادی نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ اس نظم میں محض ایک پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے..... یعنی وہ لڑکی بہت غریب ہے، اس کے گھر کا ماحول اچھا نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس سے قطعاً یہ مراد نہیں کہ جوانی کے متعلق میرا نظریہ ہی یہ ہے۔

کیفی اعظمی: مگر لوگ دوسرے پہلوؤں کے متعلق بھی غور کرتے ہیں اور سوچتے وقت اتنے محدود نہیں ہو جاتے۔ سننے والوں کو آزادی ہوتی ہے کہ وہ نظم کے سب پہلوؤں پر غور کر کے کوئی نتیجہ نکال لیں۔ اس نظم میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ افلاس سے نجات پانے کا یہی ایک طریق ہے کہ لڑکی جوان نہ ہو اور بس.....

ساحر لدھیانوی نے کہا کہ ان کے خیال میں یہ نظم شاعر یہ چیز دیکھ کر کہتا ہے کہ وہ لڑکی ہنستے کھیلتے بچپن گزارتی ہے اور اسے کچھ زیادہ افکار نہیں گھیرتے لیکن چونکہ جوان ہو کر شادی وغیرہ کرنے کے سلسلے میں ایک خاص قسم کی حیثیت جو

اسے درکار ہے وہ اسے نہیں ملے گی اور اس طرح وہ طرح طرح کی مصیبتوں میں گھر جائے گی۔ اس لیے وہ بددعا کرتا ہے کہ لڑکی جوان نہ ہو۔

کیفی اعظمی: اسے ذرا اور کم کر کے سوچئے تو یہ ہوگا کہ اس کے طبقے کو جو نعمتوں سے محروم ہے، ختم ہی کر دیا جائے

اور بچوں کو پیدا نہ ہونے دیا جائے یا پیدا ہوتے ہیں تو انہیں مار دیا جائے۔

قمر: میں نے درد کو جس طرح دیکھا، اس طرح پیش کر دیا، درد کا علاج نہیں دیا۔

کیفی: یہ غلط ہے کیونکہ شروع سے آپ متاثر ہوتے ہیں اس کے بچپن سے اور پھر جب آخر میں کہتے ہیں کہ یہ کلی

کے پھول نہ بنے بلکہ کلی ہی رہے تو آپ اس کا علاج دے دیتے ہیں یعنی آپ کے خیال میں اس درد کا علاج یہی

ہے۔ جوان نہ ہو۔

قمر جلال آبادی نے کہا کہ یہ محض ایک پہلو ہے جو میں نے پیش کیا ہے۔ محض شاعرانہ نقطہ نظر سے اس میں

سیاست گہرا ہے۔

ار جعفری نے کہا کہ قمر صاحب کی شاعرانہ نظر بہت وسیع ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے کیفی اعظمی کی

رہنمائی کا اظہار کیا کہ شاعر غیر شعوری طور پر نظم میں درد کا علاج بیان کرتا ہے۔ انہوں نے ایک مشہور انگریز شاعر

کی مثال دی ہے، ہونے کہا کہ اس شاعر نے ایک ایسے بچے کو جو ماں کے پیٹ میں ہے، مخاطب کر کے کہا کہ تو پیدا نہ ہو کیونکہ

اگر تو دنیا سے آتا تو طرح طرح کی مصیبتیں تجھ پر ٹوٹ پڑیں گی وغیرہ وغیرہ..... یا پھر آپ کی نظم سن کر خیال ماتھس اور

ہندوستان کے بعض ماہرین اقتصادیات کی طرف جاتا ہے، جو یہ کہتے ہیں کہ مفلسی کی وبا اس لیے زیادہ ہے کیونکہ بچے

زیادہ ہوتے ہیں۔

انہوں نے کہا کہ نفسیات کی مدد سے بچے کو جوانی تک پہنچنے اور پھر جوانی سے بڑھاپے تک پہنچنے میں اس لیے

Persist کرنا پڑتا ہے کیونکہ زندگی بھر پور قسم کی نہیں ہوتی اور آپ نظم میں بھرپور زندگی کا تصور دینے کی بجائے زندگی کو ختم

دینے میں علاج ڈھونڈتے ہیں۔

حمید اختر نے کہا کہ شاعر نے یہ نظم ایک وقتی جذبے کے ماتحت لکھی ہے۔ وہ جذبہ صحیح ہے یا غلط اس کا فیصلہ ہم

لوگوں کو کرنا ہے۔

اس کے بعد ہمارے مہمان عزیز احمد نے ”اردو تنقید کا مستقبل“ کے عنوان سے ایک مقالہ پڑھا۔

27 اپریل 1947ء

اردو ترقی پسند مصنفین کا یہ اجلاس اسرار الحق مجاز کی صدارت میں منعقد ہوا۔

حاضرین: ندھو سو دھن، انور، میراجی، ظ۔ انصاری، نور بانو، محمد مہدی، انور مرزا، انیس احمد، جنید احمد، غلام مصطفیٰ، راشد حسین، محمد حسین، رفیق، عالی جعفری، صابر اور دوسرے مہمان۔

سب سے پہلے پچھلے ہفتے کی میٹنگ کی رواداد سنائی گئی۔ اس کے بعد صاحب صدر نے کہا کہ اساتذہ کے کلام کے سلسلہ میں اب ظ۔ انصاری حسرت موہانی کی ایک غزل پڑھ کر سنائیں گے۔

غزل شروع کرنے سے پہلے انہوں نے کہا کہ یہ غزل تیس سال پہلے کی ہے اور اس غزل کا خاص طور پر اس لیے انتخاب کیا گیا ہے کہ حسرت موہانی اگرچہ صرف تغزل کے قائل ہیں مگر اس غزل میں ان کی زندگی کے پہلوؤں پر اس طرح روشنی پڑتی ہے کہ ہمیں ان کی زندگی کے متعلق بہت کچھ معلوم ہو جاتا ہے اور تغزل کا لطف بھی قائم رہتا ہے۔

ظ۔ انصاری نے حسرت موہانی کی وہ غزل پڑھی جس کا مطلع ہے.....

ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی

اک طرف تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

میراجی نے ظ۔ انصاری سے پوچھا کہ اس غزل کا خاص طور پر انتخاب کیوں کیا گیا؟ کیا اس میں سب شعرا چھے ہیں؟ ظ۔ انصاری نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ اس غزل میں دو شعر تو صرف سیاسی ہیں اور اس کا انتخاب جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، اس لیے کیا گیا ہے کیونکہ اسی غزل میں بعض شعرا ایسے ہیں جن سے حسرت کی زندگی پر روشنی پڑتی ہے۔ میراجی: لیکن اگر مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ان کے کلام میں ایسے اشعار بہت ہی کم نظر آئیں گے۔

ظ۔ انصاری نے کہا کہ اس کے باوجود ان کے یہ اشعار بہت اہم ہیں کیونکہ مولانا حسرت موہانی نے شاعری کی تقسیم میں خود اپنی شاعری کا شمار فاسقاہ اور عاشقانہ شاعری میں کیا ہے مگر سیاسی مضمون ان کے ہاں بھی موجود ہے۔ میراجی نے کہا..... ”معلوم ہوا اس غزل کا انتخاب آپ نے اس لیے کیا ہے کہ اس میں بعض شعرا سیاسی ہیں اور بعض عشقیہ لیکن اگر ان کے کلام سے کسی ایک غزل کا انتخاب کرنا ہو تو یہ غزل اس کی نمائندگی نہیں کرے گی کیونکہ اگر وہی شعرا ایسے ہیں جن سے ان کی زندگی پر روشنی پڑتی ہے تو یہ انتخاب صحیح نہیں ہے۔“

ظ۔ انصاری نے کہا کہ حسرت موہانی کے ہاں سیاسی مضامین کافی ہیں مگر ان کا ذکر وہ صاف طور پر بہت کم کرتے ہیں۔ آخر میں میراجی نے پوچھا کہ ظ۔ انصاری صاف طور پر بتلا دیں کہ اس غزل کے انتخاب سے کیا نتیجہ نکالا

جائے؟

ظ۔ انصاری: یہی کہ شاعری میں زندگی سے کٹنے کا دعویٰ کرنے کے باوجود وہ زندگی کی حقیقتوں سے نہیں بچ سکتے اور اس کا اظہار کر گئے ہیں۔

پروگرام کے مطابق اب حمید اختر نے ”ریشم کے کیڑے“ کے عنوان سے ایک جاپانی کہانی کا ترجمہ سنایا۔ محمد مہدی نے اس فقرے پر کہ ”اس کے تیسرے حصے پر کسی طرح بھی زیادہ تھا“ اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس لڑکے کے جسم کے کوئی سے تین حصے ہیں جن کا مقابلہ کیا گیا ہے۔ انور نے کہا کہ یہ غلط فہمی پیدا نہیں ہو سکتی کیونکہ یہاں دو لڑکوں کا ذکر ہے جو لڑ رہے ہیں اور اس فقرے سے پہلے اور بعد کے فقرے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ مقابلہ دو لڑکوں میں ہے جن میں سے ایک طاقتور ہے اور دوسرا کمزور۔ میراجی نے کہا..... ”پھر بھی اگر ”تیسرے حصے“ کی بجائے ایک تہائی کر دیا جائے تو اچھا معلوم ہوگا۔“ محمد مہدی نے ایک اور فقرے کے متعلق کہا کہ اس سے مفہوم واضح نہیں ہوتا۔ حمید اختر نے کہا کہ پہلے اور آخری فقرے اور اس سارے پیرگراف سے صاف طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ مطلب کیا ہے تاہم اگر ضرورت ہوگی تو اس کو ٹھیک کر لیا جائے گا۔

آخر میں بمبئی کے کاتبوں کا ہڑتال سے ہمدردی کا ریزولوشن پاس ہوا اور ان کے لیے چندہ جمع کیا گیا۔

4 مئی 1947ء

اردو ترقی پسند مصنفین کا یہ اجلاس علی سردار جعفری کی صدارت میں منعقد ہوا۔

حاضرین: اسرار الحق مجاز، ممتاز مفتی، میراجی، مہندر ناتھ، ساحر لدھیانوی، شاہد لطیف، زیڈ۔ اے۔ بخاری، ظ۔ انصاری، محمد مہدی، محمد صفدر، انور، سلطانہ بیگم، نور بانو، انیس بشیر رومانی، حسین جعفری، عالی جعفری، حبیب تنویر، نذیر آصف، سلام یونان۔

پچھلے ہفتے کی میٹنگ کی روداد سنائی جانے کے بعد ظ۔ انصاری نے جوش ملیح آبادی کے تازہ مجموعے ”سنبل و سلاسل“ پر اپنا ریویو پڑھا جس کے متعلق انور نے کہا کہ تبصرہ بہت اچھا ہے۔

زیڈ۔ اے۔ بخاری نے کہا کہ تبصرہ نگار نے بہت حوصلے سے کام لیا اور خلاف توقع جوش کی خامیوں پر نظر ڈالی ہے حالانکہ عام طور پر جوش کو ہوا بنا دیا گیا ہے اور ان کی شاعری پر صحیح قسم کی تنقید نہیں کی جاتی۔ مجروح سلطانپوری نے کہا کہ ظ۔ انصاری نے ”سنبل و سلاسل“ کے پردے میں جوش کی پوری شاعری پر ایک مجمل سی نگاہ ڈالی ہے۔ جوش کے کلام میں

بے جا طوالت اور نئی اور نادر تشبیہات کا ذکر بہت اچھا ہے مگر یہ فقرہ کہ نشتر رکھنے کے بعد کیا کرنا ہے، جوش گھر سے سوچ کر ہی نہیں نکلے، قبیل اعتراض ہ کیونکہ یہ ذاتیات لیے ہوئے ہے، یہ تنقید کی زبان نہیں ہے۔

محمد مہدی نے کہا کہ تبصرہ صرف سنبل و سلاسل پر ہی نہیں ہے بلکہ معلوم یہ ہوتا ہے کہ تبصرہ نگار سنبل و سلاسل کا نام لے کر جوش کی پوری شاعری پر تنقیدی نظر ڈالتا ہے جو صحیح طریقہ ہے کیونکہ اگر جوش کی پوری شاعری کا جائزہ لیا جائے تو یہ بھی دیکھنا پڑے گا کہ جوش کی شاعری کی ابتداء کن حالات میں ہوئی اور اس وقت اس کی کیا اہمیت تھی۔ اگر ہم یہ پورا پس منظر بیان نہیں کریں گے تو ہماری تنقید مکمل نہیں ہوگی۔

مجروح سلطان پوری نے اس رائے سے اختلاف کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ تبصرے میں عام طور پر ان کی پوری شاعری پر تنقید نہیں ہے بلکہ اس کتاب کے مصنف کو اس کتاب کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ میراجی نے کہا کہ تبصرہ بہت اچھا ہے اگرچہ تبصرہ نگار نے اپنی رائے بہت دبا کر دی ہے۔

ساحر لدھیانوی نے کہا کہ ان کے خیال میں تبصرہ نگار نے یہ کہا ہے کہ جوش نے اپنی پچھلی شاعری کے مقابلے پر اس کتاب میں کوئی ترقی نہیں کی۔

صاحب صدر کی اجازت سے ظ۔ انصاری نے کہنا شروع کیا..... یہ تبصرہ ”سنبل و سلاسل“ پر ہی ہے۔ اس میں جوش کی شاعری کی خامیاں زیادہ دکھائی دیتی ہیں لیکن اگر ان کے اور مجموعوں کو شامل کر کے پوری شاعری پر تنقید کی جائے تو خامیوں کا ذکر کم ہو جائے گا کیونکہ باقی کے مجموعوں میں ان کی شاعری کی خوبیاں چھائی ہوئی ہیں۔ سنبل و سلاسل میں جوش کا فن کچھ نڈھال نظر آتا ہے۔ ان کے کسی دوسرے مجموعے میں اس قسم کی رباعی موجود نہیں ہے.....

یہ ریش یہ عمامہ یہ ڈھیلی شلوار

اپنی اک سال کی کمائی دے دوں

یہ ریچھ کی نقل پر اگر ہوتیار

محمد مہدی نے پھر کہا کہ تبصرے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تبصرہ نگار تنقید کو Generalise کر رہا ہے اور اس طرح سے رائے جو ایک کتاب کے متعلق ہے، ان کی پوری شاعری پر معلوم ہوتی ہے۔

ساحر لدھیانوی نے کہا..... ”جہاں تک انقلاب کا تعمیری تصور نہ ہونے کا تعلق ہے وہاں تک Generalisation صحیح ہے۔“

آخر میں ظ۔ انصاری نے کہا کہ ان کا مقصد ان کی پوری شاعری پر یہ رائے دینے کا نہیں تھا۔ اگر تبصرے سے

معلوم ہوتا ہے تو وہ ایک فقرہ بڑھا کر اس غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کریں گے لیکن مریاجی نے ان کی اس رائے سے اختلاف کا اظہار کیا۔ انہوں نے کہا کہ فقرہ بڑھانا صحیح نہیں ہے۔ اگر تبصرہ سنبل و سلاسل پر ہی کیا گیا ہے تو یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ باقی کی چار کتابیں بھی لوگوں نے پڑھی اور نقاد نے بھی ان کو پڑھا ہے۔ خاص طور پر یہ تنقید سنبل و سلاسل پر ہی ہے۔

زیڈ۔ اے۔ بخاری نے کہا کہ اگر جوش کی شاعری کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے یعنی (1) پھبتی بازی (2) صحافت نگاری تو ہمیں ان کی شاعری کو پرکھنے میں مدد ملے گی اور یہ چیز صاف طور پر سامنے آجائے گی کہ ان کی شاعری میں Agitation اور Observation کم ہے۔ محض پھبتی اور پرنٹنگ کی حیثیت سے دیکھا جائے تو ان کی شاعری کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

سردار جعفری نے کہا کہ انصاری صاحب نے تبصرہ میں جہاں غزل کا ذکر کیا ہے وہاں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ انصاری صاحب کیا کہنا چاہتے ہیں۔ کیا وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جوش نے غزل پر اعتراض کیوں کیا ہے یا یہ کہ زیادہ اعتراض کیا ہے؟

اسرار الحق مجاز نے کہا کہ تبصرہ نگار کا یہ فقرہ قابل اعتراض ہے کہ ”اقبال اور حالی نے غزل کو کہیں کا نہیں چھوڑا“۔ انہوں نے کہا کہ یہ فقرہ صحیح نہیں ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس سے تبصرہ نگار کی مراد کیا ہے۔
ظ۔ انصاری نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا ”میرا مطلب یہ ہے کہ جب غزل ہماری شاعری کے درخت کی فرسودہ ٹہنی ہے تو جوش اس پر بھتی بازی کرتے ہیں اور اس کا مذاق اس طرح اڑاتے ہیں جس طرح ان سے توقع نہیں ہوتی“۔

سردار جعفری نے کہا کہ بحث دوسری طرف جاری ہے۔ اس لیے ہم غزل پر اگلی میٹنگ میں بحث کریں گے۔ اس وقت پہلے اس بات کا فیصلہ کر لیں کہ اقبال اور حالی کے متعلق آپ نے یہ جملہ کس لیے کہا ہے..... یہاں بھی یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ آپ کیا چاہتے ہیں۔

ظ۔ انصاری نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ حالی اور اقبال نے غزل کو در ماندگی کی حالت میں چھوڑ کر یہ بتایا کہ غزل ہمارا ساتھ نہیں دے سکتی۔

سردار جعفری: مگر آپ کے اس جملے سے کہ انہوں نے غزل کو کہیں کا نہ رکھا، یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اقبال اور حالی گھٹیا غزل گو تھے۔ اس سے کسی کو اتفاق نہیں۔ انہوں نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا..... ”غزل میں اضافے

ہوتے رہتے ہیں۔ سعدی نے غزل میں جو نئے اضافے کیے اور اس کے بعد کے شاعروں کے ہاں سے یہ چیز حافظ کے ہاں آئی، اقبال نے بھی غزل میں اضافے کیے۔ اگر غزل کو محض عشق اور عاشقی سے محدود کر لیا جائے تب آپ کہہ سکتے ہیں کہ اقبال نے نقصان پہنچایا ہے۔ اگر آپ محدود نہیں کرتے تو یہ ماننا پڑے گا کہ اقبال نے غزل کی عظمت بڑھائی ہے۔“

ظ۔ انصاری نے کہا کہ ان کے خیال میں غزل ایک ایسا فارم ہے جس میں عشق و عاشقی کا ذکر ہوتا ہے۔ غالب کے بعد اس میں فلسفیانہ مضامین بھی آنے لگے ہیں۔ نیز اقبال کے کلام کا بہت کم حصہ غزل ہے۔ بخاری: کیا آپ کا مطلب یہ ہے کہ ان کا فارم صحیح نہیں ہے۔

مگر ظ۔ انصاری اس بات پر اڑے ہوئے تھے کہ حالی اور اقبال جو ایک نسل کے دو ذمہ دار شاعر تھے، انہوں نے غزل کو نظر انداز کر کے اس کی ترقی میں رکاوٹ ڈالی ہے۔

مجروح سلطانپوری نے کہا کہ غزل شاعری کی ایک روایتی اور تکنیکی شکل ہے جس میں تصوف، عشق اور جنسی مسائل کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اگر آپ کا مطلب یہ ہے کہ انہی چیزوں کا ذکر فارم ہے تو یہ بات غلط ہے۔

سردار جعفری نے کہا کہ ان کے خیال میں چند نظموں کو چھوڑ کر اقبال کی اکثر نظمیں غزل کی شکل میں ہیں کیونکہ نظم کے لیے خیال کی ابتداء، Development اور اختتام ضروری ہے۔ اقبال کی اکثر نظموں میں مثلاً خضر راہ، شعم و شاعر وغیرہ میں ہر شعر الگ اور اپنی جگہ پر مکمل ہے۔

یہاں پر نظم کا مسلسل خیال موجود نہیں ہے۔ ان کے ایک شعر سے دوسرے شعر تک خیال بدلتا ہوا ملتا ہے۔ مجموعی حیثیت سے تو چیز ایک بنتی ہے۔ اس کے علاوہ ان کی بال جبریل غزلوں سے بھری پڑی ہے۔

انہوں نے کہا کہ اقبال غزل کو شاعری کی بہت ترقی یافتہ شکل سمجھتے تھے اور انہوں نے عثمانیہ کے پرچوں میں اس خیال کو بار بار دہرایا ہے۔

سردار جعفری نے آخر میں ظ۔ انصاری کی اس رائے سے اختلاف کا اظہار کیا کہ ”مسدس حالی“ بے رنگ و سپاٹ ہے۔ انہوں نے کہا کہ اگر مسدس بے رنگ و سپاٹ ہے تو اسے شعر میں جگہ نہیں مل سکتی تھی اس کی شاعرانہ عظمت جو مسلم ہے اس صورت میں کیسے اور کہاں سے آئی۔

ظ۔ انصاری: بے رنگ و سپاٹ اس معنی میں ہے کہ اسے اگر نثری میں لکھا جائے تو بہتر یا وہ مختلف شکل میں نہیں ہوگی۔ کہیں کہیں ایسے بند ہیں جن میں شاعری موجود ہے۔

سردار: کیا آپ کا یہ مطلب ہے کہ اس میں غزل کی جاذبیت نہیں ہے کہ اس میں وہ شاعری نہیں جو فردوسی کے

ہاں ہے؟

ظ۔ انصاری: اس میں وہ دلکشی بھی نہیں جو ان کے شاگرد اقبال کے ہاں عام ہے۔

سردار جعفری نے کہا حالی اگر ایک بات کو سیدھے طریقے سے کہتے ہیں تو اس میں شاعری نہ ہونے کا فیصلہ کر دینا کسی طرح درست نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ فردوسی شاہنامے میں بالکل سیدھا چلتا ہے، کنائے بھی زیادہ نہیں ہے لیکن چونکہ ہماری پرانی روایات میں غزل کے علاوہ کچھ نہیں تھا، اس لیے آپ ”مسدس حالی“ کو سپاٹ کہہ دیتے ہیں۔ اسی میں وہ بناؤ نہیں ہے جو درباری شاعری میں ہوتا ہے۔

ظ۔ انصاری: کیا ”شکوہ“ میں درباری رکھ رکھاؤ ہے؟

بخاری: ”شکوہ“ میں شعریت تو ہے۔

مجروح: شکوے کے اثر کرنے میں داخلیت کا دخل ہے اور اگر اس طرح سے ہیئت کی جگہ مواد اور زیادہ اثر کرے تو یہ الفاظ کی سجاوٹ سے زیادہ با اثر اور اچھی چیز ہے۔

میراجی نے کہا کہ ریویو کے سلسلے میں بہت سی غیر متعلق چیزیں آگئی ہیں۔ اس لیے اس بحث کو ختم کر دیا جائے تو اچھا ہے۔ چنانچہ صاحب صدر نے اسے ختم کر دیا اور اگلے ہفتے غزل پر باقاعدہ پروگرام بنایا گیا۔ پروگرام کے مطابق اب انور نے ایک افسانہ ”دس سال کے بعد“ پڑھ کر سنایا۔

افسانہ ختم ہونے پر صاحب صدر نے کہا کہ چونکہ افسانہ طویل تھا اور وقت کم رہ گیا ہے، اس لیے اس پر مختصر بحث کی جائے۔

زیڈ۔ اے۔ بخاری نے کہا..... ”اس افسانے میں خارجی مشاہدہ بہت زیادہ ہے۔“

میراجی نے کہا کہ افسانہ بہت اچھا ہے اور جیمس جوائس کی تکنیک میں یہ پہلا افسانہ ہے جو ہمارے درپیش ہے۔ اگرچہ ایک دفعہ سننے پر پوری طرح سے تو رائے نہیں دی جاسکتی لیکن یہ طویل بہت ہے اور اس وجہ سے پوری نہیں دی جاسکتی۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ میٹنگ میں اتنا طویل افسانہ پڑھنے سے توجہ قائم نہیں رہتی۔

محمد مہدی نے کہا..... ”یہ افسانہ بہت اچھا ہے اور آر میں جہاں ڈرامائی ماحلو پیدا ہوتا ہے وہاں تو بہت ہی اچھا ہے لیکن چونکہ بہت سے لوگ طوالت کی وجہ سے اکتا گئے تھے، اس لیے وہاں پر زیادہ لوگوں نے غور نہیں کیا جہاں افسانے کا مرکزی کردار ہنٹر سے گھوڑے کو مارتا ہے۔ تانگہ والا اسے مارتا ہے اور عباس (مرکزی کردار) کا باپ کار میں پہنچ کر تانگے والے کو مارتا ہے۔ یہ حصہ سب سے اچھا ہے۔“

انہوں نے کہا کہ اس کا بہت تھوڑا حصہ کاٹ دیا جائے تو تکنیک کے لحاظ سے یہ بہت ہی اچھا افسانہ ہوگا کیونکہ اس میں افسانویت بہت ہے۔

بخاری: اس میں کچھ زبان کی غلطیاں ہیں۔ کیا ان کو ٹھیک کرنا چاہیے یا نہیں؟

سردار: زبان زیادہ سے زیادہ اچھی ہونی چاہیے۔

مجروح سلطانپوری نے کہا:..... ”افسانہ نگار مصوری پر بہت زور دیتا ہے۔“

محمد مہدی: یہ بالکل غلط ہے جسے آپ مصوری کہتے ہیں وہ منظر نگاری ہے لیکن یہ منظور نگاری بے جان نہیں ہے۔

سردار: مصوری سے ان کی مراد جزئیات ہیں۔

آخر میں زیڈ۔ اے۔ بخاری کو ایک غزل سنانا تھی۔ غزل شروع کرنے سے پہلے انہوں نے کہا کہ وہ یہ غزل

پڑھنا نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے یہ غزل یوم اقبال کے سلسلے میں ہونے والے مشاعرہ کے لیے لکھی تھی۔ چونکہ مجروح

سلطانپوری نے وہ غزل جو مشاعرہ کے لیے لکھی تھی، یہاں پڑھ دی تھی جس پر منتظمین مشاعرہ بہت برہم ہوئے تھے۔ اس

لیے وہ بھی اسی غزل کو جو مشاعرے کے لیے لکھی گئی تھی یہاں پر پڑھیں گے۔

غزل ختم ہنے پر میراجی نے کہا:..... ”یہ مصرعہ.....“

جو ہونا تھا سو ہوتا ہے لیکن یہ سب کیوں ہونا تھا

اگر بول دیا جائے.....“

جو ہونا ہو وہ ہوتا ہے لیکن یہ سب کچھ کیوں ہوتا ہے

تو مصرعہ بہت صاف اور واضح ہو جاتا ہے۔ اس طرح سے غلط فہمی پیدا ہونے کا امکان ہے۔“

بخاری نے کہا:..... ”اگر غلط فہمی پیدا ہونے کا امکان ہو تو اسے بدل دیں گے۔“

ظ۔ انصاری نے اس مصرعہ پر اعتراض کیا کہ.....“

خوابوں کی حلاوت بھول گئے تعبیریں ہم کو یاد سہی

انہوں نے کہا:..... ”اس میں حلاوت کا لفظ غیر ضروری ہے۔“

زیڈ۔ اے۔ بخاری: اس کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ کئی چیزیں ایسی ہیں کہ ہم ان کے ذمے دار نہیں۔ وہ تعبیریں

ہیں۔ ان کی وجہ سے مصیبت یا رجعت کے احساس میں لذت ہوتی ہے۔ اس کی وجہ ہمیں بھول گئی مگر اثرات باقی ہیں۔

خواب جن سے لذت سی ہے، بھول گئے اور مصیبتیں ہیں۔

سلطانہ بیگھ نے کہا کہ انہیں اس شعر سے نظریاتی اختلاف ہے۔

اس کا جواب دیتے ہوئے بخاری نے کہا..... ”بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن کے لیے آپ ذمہ دار نہیں ہونگے یہ بھگتنی پڑتی ہیں۔“

مجروح سلطانپوری: خوابوں کی حالت بھولنے کے غم کا جواز معلوم نہیں ہوتا۔

بخاری: میں ہر حرکت کو لذیذ سمجھتا ہوں۔

مہدی: آپ کو حرکت میں مزا آتا ہے لیکن خواب میں تو حرکت نہیں ہوتی۔

سردار: شاعر نے ان اثرات کو جو وہ بھگت رہا ہے، تعبیریں کہا ہے اور ان کے یاد رکھنے پر وہ اس لیے مجبور ہے

کیونکہ وہ موجودہ ہیں اور سر پر سوار ہیں۔

آخر میں حمید اختر نے دمیتی سہنی کی بے وقت موت پر اظہار افسوس کے لیے ریزولوشن پیش کیا۔ چند سیکنڈ

کے لیے تمام حاضرین کھڑے ہوئے اور ریزولوشن پاس ہوا۔ اس کے بعد یہ میٹنگ ختم ہوئی۔

11 مئی 1947ء

جیون ہاؤس 11 مئی، انجمن ترقی پسند مصنفین امروزہ جلسہ ایک بڑا اہم جلسہ تھا۔ دو ڈھائی مہینے کے بعد جنرل

سیکرٹری سجاد ظہیر صاحب واپس آئے تھے۔ اسی جلسہ میں غزل پر مباحثہ ہونے والا تھا اور اس میں غزل کے مخالف اور حامی

شعراء اور ادیبوں میں سے جوش ملیح آبادی، ساغر نظامی، ڈائریکٹر بخاری، علی سردار جعفری، سجاد ظہیر، ظ۔ انصاری، مجروح

سلطانپوری وغیرہ نے بحث میں نمایاں حصہ لیا۔ غزل کے حامیوں میں ڈائریکٹر بخاری، مجروح سلطانپوری اور ظ۔ انصار

نے اپنے خیالات ظاہر کیے۔ مخالفت میں جوش ملیح آبادی اور سردار جعفری بولے۔ عموماً جلسہ کی رائے غزل کی مخالفت میں

محسوس کی گئی۔ بحث بر سجاد ظہیر نے آخر میں ایک تبصرہ کیا۔ اسی جلسہ میں سجاد ظہیر نے پنجاب اور دہلی میں ترقی پسند مصنفین

کے قیام کی اطلاع دی اور تحریک کا جائزہ لے کر بتایا کہ یہ ایک نیک فال ہے کہ پنجاب اور دہلی کے اکثر مشور ادیب اور

شاعروں نے عملاً ترقی پسند مصنفین سے خود کو وابستہ کر لیا ہے۔ آخر میں جوش ملیح آبادی نے اپنی دو تازہ ترین نظمیں سنائی۔

جلسلے نے مرزا فرحت اللہ بیگ کی موت پر ایک تعزیتی تجویز بھی منظور کی اور احتراماً تمام حاضرین ایک منٹ

کے لیے کھڑے ہوئے۔

یہ اجلاس سجاد ظہیر کی صدارت میں منعقد ہوا۔

حاضرین: جوش ملیح آبادی، ساغر نظامی، اسرار الحق مجاز، زید۔ اے۔ بخاری، سردار جعفری، کیفی اعظمی، ساحر

لدھیانوی، ممتاز مفتی، میراجی، قدوس صہبائی، وشوا متر عادل، مدھوسودھن، ڈاکٹر صفر آہ، ظ۔ انصاری، مجروح سلطانپوری، رفعت سروش، دانیال لطفی، ضیاء الحسن، فیروز مستری، سلطانہ بیگم، نور بانو، ایوب سرور، محمد مہدی اور تقریباً تیس دوسرے اصحاب۔

اجلاس شروع ہونے پر سیکرٹری نے پچھلی میٹنگ کی روداد پڑھی۔

طے شدہ پروگرام شروع ہونے سے پہلے سجاد ظہیر نے جو ایک طویل دور سے واپس آئے تھے کہا کہ وہ اراکین انجمن اور حاضرین کو اپنے اس دورے کے سلسلے کی کچھ اچھی خبریں سنانا چاہتے ہیں۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی تنظیم کے معاملے میں انہوں نے بتلایا کہ بہت سی جگہوں پر نئی شاخیں قائم ہو گئی ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے دہلی کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ وہاں پر باقاعدہ کام شروع ہو گیا ہے۔ عہدہ داروں کے انتخاب میں ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کو صدر چنا گیا ہے اور دو سیکرٹریوں میں ایک وقار عظیم ہیں۔

انہوں نے یہ بھی بتلایا کہ دہلی کی انجمن نے کل ہند کانفرنس کا انتظام جو شاید دسمبر میں منعقد ہوگی، اپنے ذمے لے لیا ہے اور مرکزی انجمن کی سکیم یہ ہے کہ کل ہند کانفرنس سے پہلے تین چار صوبائی اور لسانی کانفرنسیں منعقد کی جائیں۔ یہ بنگال، مالا بار، کرناٹک اور دوسرے صوبوں میں علیحدہ علیحدہ انعقاد پذیر ہوں گی۔ آندھرا اوالے پہلے ہی کر چکے ہیں اور اردو کی پہلی کل ہند کانفرنس حیدرآباد میں ہو چکی ہے۔

ہندی والوں کے متعلق انہوں نے بتلایا کہ ہندی کے ترقی پسند ادیبوں نے الہ آباد یا لکھنؤ میں کانفرنس کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس کے پروگرام میں بڑے بڑے شہروں مثلاً دہلی، الہ آباد، لکھنؤ، کانپور وغیرہ میں کوی سمیلن منعقد کرنے کا فیصلہ بھی ہوا ہے۔ اس طرح سے وہ انجمن کے لیے پیسے جمع کر سکیں گے۔

انہوں نے اپنی انجمن کے اراکین میں سے چند ایک کا انتخاب کر کے ایک سب کمیٹی بنا دی ہے جو اپنا کام کر رہی ہے نیز وہ کل ہند اردو ہندی کا ایک مرکز بھی قائم کریں گے اور گزشتہ دس سال میں تخلیق شدہ ادب کا جائزہ لینے کا کام بھی شروع کر دیا گیا ہے۔ سب کمیٹی کے کاموں میں سب سے اہم یہ ہے کہ وہ ترقی پسند ادب پر مکمل تبصرہ کر کے آئندہ کا پروگرام مرتب کرے۔

اس سلسلے میں وہ مقالے تیار کریں گے جنہیں پڑھ کر ہندی ادب پر مجمل اور پورا تبصرہ سامنے آ جا جائے گا اور پاس کر لیا جائے گا۔ سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے سجاد ظہیر نے پنجاب کے سلسلہ میں بھی کچھ باتیں بتلائیں۔ انہوں نے کہا کہ پنجاب سے بہت تری پسند ادیب پیدا ہوتے ہیں لیکن وہاں جتنے اچھے ادیب ہوتے ہیں، تنظیم اتنی اچھی کبھی نہیں

ہوتی۔ خیال ہے کہ اب تنظیمی کام ٹھیک ہو جائے گا کیونکہ وہاں کے دو تین جلسے بہت اچھے ہوئے ہیں جن میں پنجاب کے بہت سے ادیب مثلاً راجندر سنگھ بیدی، ڈاکٹر تاثیر، فیض احمد فیض، ظہیر کاشمیری، فکر تو نسوی وغیرہ شامل ہوئے۔ ان جلسوں میں یہ فیصلہ بھی ہا کہ پنجاب میں انجمن کی مختلف شاخیں کھولی جائیں اور کانفرنس کی جائے، نیز اکتوبر میں تمام ہندوستان کے ادیبوں کی ایک علیحدہ میٹنگ بھی ہو جس میں باقاعدہ کام کرنے کا پروگرام بنایا جائے۔ انہوں نے یہ بھی بتلایا کہ راولپنڈی میں بھی ترقی پسند مصنفین کی شاخ قائم ہوگئی ہے۔ اس کے بعد غزل شروع ہوئی تو سردار جعفری نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا..... ”غزل ایشیائی انحطاط کی پیداوار ہے۔ ایران میں غزل شروع ہونے سے پہلے تک کی شاعری پر فردوسی کے ”شاہنامہ“ کی چھاپ ہے جس نے ایران کو پورے تین سو سال تک متاثر کیا۔ ”شاہنامہ“ انفرادی شاعرانہ صلاحیتوں کی پیداوار نہیں ہے نہ ہی وہ دربار کی پیداوار ہے۔ فردوسی نے دربار میں جانے سے پہلے یہ کوشش شروع کر دی تھی اور فردوسی سے پہلے بھی یہ کوششیں ہوتی تھیں۔ ”شاہنامہ“ کے واقعات میں سے کوئی بھی اس کے ذہن کی تخلیق نہیں ہے بلکہ ان پر عوامی چھاپ ہے اور چھوٹے چھوٹے واقعات کو Generalise کیا گیا ہے اور یہ قصے اور روایتیں ایران میں عام طور پر مشہور تھے اور چونکہ یہ عام لوگوں سے ”شاہنامہ“ میں آئے، اس لیے ”شاہنامہ“ نے کئی سو سال تک ایرانی شاعری پر اثر قائم رکھا۔“

سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے سردار جعفری نے کہا..... ”غزل اس رواج سے پیدا ہو کر الگ ہوگئی اور اس زمانے میں پیدا ہوئی جب چنگیز خاں کی یورشوں نے ایران کو تباہ کر دیا تھا۔ غزل کا پہلا موضوع عشق و عاشقی تھا چنانچہ سعدی کے ہاں غزل میں عاشقانہ مضامین ہی ملتے ہیں۔ سعدی نے جہاں پر تازیانے کا کام لینا چاہا وہاں غزل کو استعمال نہیں کیا۔ بغداد کے زوال پر غزل کے بجائے وہ نوحہ لکھتا ہے چنانچہ بعد کے شاعروں نے بھی غزل میں عشق و عاشقی کے مضامین ہی باندھے۔ ایشیا اور ایران کا انحطاط بڑھتا گیا۔ تاتاریوں کی یورشوں سے یہ حال ہو گیا تھا کہ شہر آج بستی تھے کل اجڑ جاتے تھے۔ اس کی وجہ سے ایران کی زندگی بہت ہی اتر اور انحطاط پذیر حالت میں تھی۔ لغداد اجڑ چکا تھا اس لیے ثباتی غزل میں داخل ہوئی کہ شاعری میں اس طرح پہلے موجود نہ تھی۔ بے ثباتی کا اظہار سب سے پہلے خوجو نے کیا لیکن چونکہ وہ حافظ کے مقابلہ پر ادنیٰ درجے کا شاعر تھا اس لیے زیادہ مقبول نہیں ہوا۔ حافظ نے عیش و طرب اور بے ثباتی کا حسین امتزاج بخشنا ہے اور اس قسم کے شعر کہے ہیں کہ.....

بیا کہ قصر اہل سخت ست بنیاد است
بیار بادہ کہ بنیاد عمر برباد است

حافظ نے یہ امتزاج اس طرح سے اور اس خوبصورتی سے دیا کہ اس سے نسلیں متاثر ہوئیں چنانچہ اس شکل میں یہ چیز ہندوستان میں آئی اور غزل کی مخالفت کرتے وقت اقبال نے حافظ کو Symbol بنا کر کہا ہے.....

ہشیار از حافظ صہبا گسار

جا مش از زہر اجل سرمایہ دار

اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے سردار جعفری نے کہا..... ”فلسفہ عجم میں اقبال نے بڑی خوبصورتی سے وحدت الوجود پر حملہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایرانی زیادہ عورتیں رکھ سکتے تھے اور انحطاط کی عوجہ سے ایک مسلسل خیال بیان نہیں کر سکتے تھے وہ تیزی کی طرح ایک پھول سے دوسرے پھول پراڑتے پھرتے تھے۔ ان کی شاعری پر عیاشی اور دنیا کی بے ثباتی کا غلبہ ہے۔ کچھ اسباب کی وجہ سے ہندوستانی شاعری پر براہ راست ایرانی شاعری کا اثر پڑا اور چونکہ ایران کی نثر اچھی نہیں تھی، اس لیے شاعری کا اثر ہی زیادہ لیا اور پھر فقیروں کے تکیوں اور مغل درباروں میں پروان چڑھی جہاں پر قصوں اور عیاشی شاعری میں شامل رہے۔

بعض لوگ آج بھی غزل کے علاوہ دوسری شاعری کو قبول نہیں کرتے لیکن یہ حقیقت ہے کہ بعض چیزیں ہم غزل میں نہیں کہہ سکتے۔ آج کی مشینیں اور کارخانے زندگی کی ایک حقیقت بن چکے ہیں۔ غزل کی نزاکت ان کو برداشت نہیں کر سکتی جب ہم نئے الفاظ تراشتے ہیں تو یہ کانوں کو برے معلوم ہوتے ہیں اور غزل کے مارے لوگ مایوس بننے لگتے ہیں۔ غزل انحطاط کی پیداوار ہے اور اس لیے بعض چیزیں اس میں ایسی ہیں جو ہمیں نقصان پہنچاتی ہیں لیکن شاعری دربار میں پہنچ کر ہمیشہ سکڑ جاتی ہے مگر تکنیک میں ترقی حاصل کر لیتی ہے۔ تشبیہیں اور استعارے نکھر جاتے ہیں جو زبان کی ترقی ہے اور جس سے ہمیں فائدہ ہٹانا چاہیے۔ اس کے ساتھ ہی نقصانات بھی ہوتے ہیں مثلاً روایتی خیالات اور روایتی الفاظ کا اثر پڑتا ہے اور ہم چند خاص نقطوں میں محدود ہو کر رہ جاتے ہیں مثلاً جلوہ اور طور وغیرہ۔

اقبال نے ہمیں نظم اور غزل کا امتزاج دیا ہے جو اس سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ اس کے ہاں غزلوں کا ایک موڈ ہے۔ ایک شعر میں ایک ہی خیال بیان کرنے کا نام تکنیک نہیں ہے۔ تکنیک سے الفاظ کی تراش خراش مراد ہے جسے ہم نظم اور غزل میں استعمال کر سکتے ہیں مگر روایتی غزل ہمارے کام کی چیز نہیں ہے۔“

آخر میں سردار جعفری نے کہا کہ مغل درباروں میں بھی بڑے بڑے شاعروں کے ہاں ہمیں زندگی کی چھاپ چھڑانے کی لاکھ کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہو سکے۔ مغل درباروں میں جن شاعروں نے کام کی باتیں جب بھی کی ہیں، غزل کو چھوڑ کر دوسری اصناف کو استعمال کیا ہے۔ تقریر ختم کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ غزل کی تکنیک سے ہم پورا فائدہ

اٹھا سکتے ہیں۔ بشرطیکہ اس روایتی انداز میں نہ رہے۔

سردار جعفری کے بعد مجروح سلطانپوری نے کہنا شروع کیا..... ”غزل کی موافقت اور مخالفت میں بہت کچھ کہا جا چکا ہے۔ اسے دہرانے کا کوئی فائدہ نہیں لیکن جعفری صاحب نے جو یہ کہا ہے کہ غزل اس لیے ہمارے کام کی نہیں کیونکہ یہ عوامی آرٹ میں شامل نہیں، یہ درست نہیں ہے کیونکہ غزل کو ہم نے اس کے لیے استعمال ہی نہیں کیا۔ اگر ہم اسے استعمال کرتے اور نا کامیاب ہو جاتے تب یہ بات کہی جاسکتی تھی۔ خیال میں بہت سی چیزیں شامل ہوتی ہیں۔ ہر وقت آدمی لیکچر دینے کے یا منطقی بحث کرنے کے موڈ میں نہیں ہوتا۔ بعض جزوی چیزیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں بیان کرنے کے لیے غزل کی ضرورت ہے۔ غزل ان جذبات کو دو مصرعوں میں بیان کرتی ہے، یہ ٹھیک ہے کہ اس دور میں نظم بہت ضروری ہے مگر غزل کی ضرورت نہیں ہے یہ کہنا بھی بالکل غلط ہے۔“

آخر میں مجروح سلطانپوری نے کہا..... ”غزل فارم کے لحاظ سے بہت صحت مند چیز ہے۔ اس زمانے میں سیاسی چیزیں ضروری طور پر غزل میں کہی جاسکتی ہیں اور اس طرح سے کہی جاسکتی ہیں کہ دوسروں کو متاثر کیا جاسکے۔ یہی وجہ ہے کہ غزل کی اہمیت اپنی جگہ پر ہے اور اسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔“

مجروح سلطانپوری کے بعد جوش ملیح آبادی کھڑے ہوئے اور انہوں نے کہا..... ”اب تک نفس غزل پر روشنی ڈالی گئی۔ اردو کی اور باتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ غزل کی تعریف ہے.....“ گفتگو کردن با زناں“ یعنی عورتوں سے میٹھی میٹھی باتیں کرنا غزل کہلاتا ہے۔ غزل میں یہ بھی ضروری ہے کہ ایک سے دوسرا شعر مختلف ہونا چاہیے۔ یہاں جو مسلسل غزلوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ درست نہیں۔ اس لیے کہ فن نے ایسی غزلوں پر قطعہ کی مہر لگائی ہے۔ غزل تو وہی ہے جس کا ہر شعر دوسرے سے مختلف ہو یعنی مطلع میں..... انتظار معشوق رہا ہے۔ حسن مطع میں وصل کے مزے لوٹے جا رہے ہیں۔ اگلے شعر میں شیخ سے ”جو تم پیزار“ ہو رہی ہے۔“ جوش صاحب نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے اپنے مخصوص لہجے میں کہا..... ”غزل ایک قسم کی خوردہ اندیشی اور خوردہ گوئی ہے جیسے ہارمونیم پر انگلیاں رکھ کر مختلف آوازیں نکالی جاتی ہیں۔ اس طرح غزل بھی ہارمونیم بازی ہے۔“

انہوں نے کہا..... ”نطق خیال کا داعی ہوتا ہے، بے ضرورت بولنے والوں کو لوگ بکواسی کہتے ہیں۔ اسی طرح شعر بھی اس وقت ہونا چاہیے جب دل میں کوئی جذبہ یا کوئی خیال ذہن میں ہو لیکن غزل گو یوں ہی شعر کہتے رہتے ہیں۔ میرا دعویٰ ہے کہ غزل گو عاشق، عاشق بالکل نہیں ہوتے، ان کا عشق مصنوعی ہوتا ہے بلکہ ان کا معشوق اب تک پیدا ہی نہیں ہوا۔ جس معشوق پر ان کا دلی دکنی مرا تھا، یہ بھی اب تک اسی پر مرے جا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ہر جذبے کی ایک عمر ہوتی

ہے مگر مشاق شاعر ایک وقت میں بیس یا تیس شعر کہہ لیتے ہیں جو مختلف خیالات اور جذبات کا اظہار کرتے ہیں حالانکہ ایک وقت میں انسا پر مرکب جذبات کا غلبہ نہیں ہوتا۔ اس سلسلہ میں بعض لوگ کہتے ہیں کہ غزل گو شاعر واقعات کو سنور میں جمع رکھتے ہیں۔ ضرورت پڑنے پر قافیہ کی ٹارچ لے کر سنور میں گھس جاتے ہیں اور وہاں سے حسب ضرورت چیزیں نکال لیتے ہیں مگر ”بیمار کر دیا“ وغیرہ جھولی نگینہ سازی ہے، قافیے اور ردیف کو ٹکرانے سے کبھی خوشبو لیکن اکثر بدبو پیدا ہوتی ہے، کبھی ہیں کانے اور کبھی ہیں کانے اور کبھی پو بارہ۔“

اس موقع پر مجروح سلطانپوری نے صاحب صدر کی طرف دیکھتے ہوئے اجازت طلب کی کہ وہ غزل کیس لسلے میں اپنی پوزیشن صاف کرنا چاہتے ہیں لیکن معلوم ہا جوش صاحب کی تقریر ابھی جاری ہے اور وہ کہہ رہے تھے..... ”اب ذرا غزل گوؤں کے معشوق کو بھی ملاحظہ فرمائیے۔ ان کو آج تک ایک بھی با وفا معشوق نہیں ملا حالانکہ مختلف قسم کے لوگ ہوتے ہیں..... اچھے، برے، با وفا مگر یا تو ہمارے غزل گو دوست چھانٹ کر ایسے شجرہ نسب والے معشوق تلاش کرتے ہیں جن کے خاندان میں وفاداری کا رواج نہیں ہوتا یا خود اتنے بد صورت ہوتے ہیں کہ ان پر کوئی عورت عاشق نہیں ہوتی پھر بے چاروں کو رقیب رو سیاہ ہمیشہ پیٹتا رہتا ہے۔ کبھی ایسا سننے میں آیا کہ کسی شاعر نے رقیب کا مارا ہو؟“

ایک مثال دیتے ہوئے انہوں نے کہا..... ”فانی جو بہت بڑے غزل گو سمجھے جاتے ہیں، ان سے غزل پر ایک روز گفتگو ہو رہی تھی۔ میں نے کہا بڑی مصیبت ہے جو تے میں کیل نکل آیا ہے اور بھی آتا بہت مہنگا ہو گیا ہے۔ بے موسم بارش ہو رہی ہے، کس قدر گرمی پڑ رہی ہے..... فانی حیران ہو کر بولے..... کیا ہوا تمہیں؟ میں نے کہا..... غزل فرما رہا ہوں۔ بس یہی غیر مربوط خیالات غزل کہلاتے ہیں۔“

آخر میں جوش صاحب نے کہا..... ”میر صاحب کو دیکھ لیجیے۔ ان کا دیوان ایک ریگستان ہے۔ چلتے چلتے راستے میں کیچڑ ملے گا، غلاظتیں آئیں گی، کھائیاں اور کھڈیلیں گے۔ اس طرح دس ہزار میل کی مسافت طے کر لیجیے تب کہیں جا کر ایک پھول ملے گا۔“

تقریر ختم کرتے ہوئے انہوں نے کہا..... ”غزل بالکل غیر فطری چیز ہے اور یہ خوردہ گوئی اور خوردہ اندیشی فوراً ختم ہو جانی چاہیے۔“

مجروح سلطانپوری پر کھڑے ہوئے اور بیل..... ”جوش صاحب نے سب سے بڑا الزام یہ لگایا ہے کہ غزل خوردہ اندیشی ہے اور خوردہ گوئی یعنی چھوٹا سوچنا اور چھوٹا چھوٹا کہنا حالانکہ یہ اعتراض نظم پر بھی ہو سکتا ہے۔ نظم میں بھی بسا اوقات ایک چھوٹے سے خیال کو بہت بڑا بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ عشق و عاشقی کے سلسلے میں معشوق کے آنے اور جانے پر

نظمیں بھی موجود ہیں۔“

انہوں نے کہا..... ”اچھی غزل میں ہمیشہ ایک موڈ ملتا ہے مثلاً اگر ہم غمگین ہوں تو ہمیں ہر چیز غمگین نظر آتی ہے۔ درخت، دیوار غرض یہ کہ ہر چیز پر غمگینی کا اثر ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں جب غزلیں کہی جاتی ہیں تو ان میں ایک موڈ ملتا ہے۔ مثال کے طور پر میری مشہور غزل دیکھیے.....

ہمارے آگے تیرا جب کسو نے نام لیا
دل ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا
میرے سلیقہ سے میری نبھی محبت میں
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

ان میں ایک ہی موڈ ہے۔“

سردار جعفری نے کہا کہ اسی غزل کا ایک اور شعر ہے.....

خراب رہتے تھے مسجد کے آگے میخانے
نگاہ مست نے ساقی کی انتقام لیا

اس شعر میں اور پہلے دو شعر میں کوئی تسلسل یا موڈ کی یکسانیت نہیں ہے۔

اس کا جواب دیتے ہوئے مجروح سلطانپوری نے کہا..... ”اس میں غصہ اور غم اور غصہ میں زیادہ فرق نہیں ہے۔“

مجروح سلطانپوری نے کہا..... ”گر ہم روایتی اور اصطلاحی تعریف سے ہٹ کر تکنیکی طور پر دیکھیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ غزل دو مصرعوں کا نام ہے لیکن ایک ہی شعر سن کر نہ سننے والا خوش ہوتا ہے نہ کہنے والا، اس لیے اسے ترتیب دے کر غزل کہا جاتا ہے۔ حقیقاً دو مصرعے ہی غزل ہوتے ہیں۔“

جوش ملیح آبادی نے اس سے اختلاف کا اظہار کیا اور کہا کہ ان کے خیال میں یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ دو مصرعے ہی

غزل ہوتے ہیں۔

سردار جعفری نے مجروح سلطانپوری سے پوچھا کہ کیا مثنوی کے ایک شعر کو غزل کہہ سکتے ہیں؟

مجروح نے کہا..... ”چونکہ مثنوی کا ایک عنوان ہوتا ہے۔ اس عنوان کے نیچے پڑھنے والا ایک ہی شعر پڑھ کر

مطمئن نہیں ہوتا اور وہ مکمل بھی نہیں کرتا۔ اس لیے اس غزل نہیں کہا جاسکتا۔“

اب ڈاکٹر صفدر آہ سینا پوری کی باری آئی۔

انہوں نے کہا..... ”غزل کے متعلق ”بازناں گفتگو کردن“ کہنا ایک غلط فہمی ہے۔ اس کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ چونکہ عورتوں سے جو گفتگو ہوتی ہے وہ مسلسل لیکچر نہیں ہوتے۔ کچھ چٹکے اور لطیفے بھی ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس خصوصیت سے غزل کا نام رکھا گیا ہے۔ غزل میں فلسفہ، تصوف، عرفان..... سبھی کچھ ملتا ہے اور یہ سب خیالات عورتوں سے گفتگو کرنے میں تھوڑے تھوڑے آتے ہیں چنانچہ ان ہی خیالات پریشاں کی خصوصیت سے غزل نام رکھا گیا۔“

انہوں نے یہ بھی کہا کہ غزل نے ہندوستان میں آ کر دوسری زبانوں کو متاثر کیا چنانچہ ہندی میں دوہا غزل کے اثر کے بعد پیدا ہوا۔ سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے انہوں نے کہا..... ”جس طرز نظموں کو ترتیب دے کر غزل بنائی جاتی ہے ویسے ہر شعر علیحدہ ہوتا ہے۔ غزلوں کو مرتب کر کے دیوان بنایا جاتا ہے۔ غزل کی خوبی یہ ہے کہ اس میں تغزل ہونا چاہیے۔ غزل کو اگر آپ رجعت پرستی کہہ سکتے ہیں تو آپ کو یہ ماننا پڑے گا کہ اس زمانہ کے لوگ ہی رجعت پرست تھے۔ ان سے آپ کیا توقع کرتے ہیں؟“

ساغر نظامی نے کہا..... ”مگر یہ تو آپ مانیں گے کہ غزل اس مخصوص کلچر کی طرف اشارہ کرتی ہے؟“

ڈاکٹر صفدر نے کہا کہ اس میں مضامین بدلتے رہتے ہیں۔ تصوف اور عاشقی کے علاوہ اب سیاست بھی آنے لگی ہے۔ ویسے غزل کا ہر شعر مکمل ہوتا ہے۔ اس میں وہ جامعیت ہے جو نظم میں ہو ہی نہیں سکتی۔ نظم کا ہر شعر اپنے سے پہلے اور اپنے سے آگے کے لیے نامکمل ہوتا ہے مگر غزل کا شعر مکمل خیال لیے ہوتا ہے اور ایسے ایسے موقعوں پر کام آتا ہے کہ ایک ہی شعر کو ہم محبت اور سیاست میں استعمال کر لیتے ہیں۔ انہوں نے ک ہاگہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے بعد جب ہندو، مسلمان، سکھ سب ناکام ہو کر لوٹے تھے تو انہوں نے (ڈاکٹر صفدر نے) ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے یہ شعر پڑھا تھا.....

بونے گل نالہ دل دود چراغ محفل

جو تیری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا!

..... اور اس شعر نے ایسا مزہ دیا تھا کہ کوئی نظم یا تقریر دے ہی نہیں سکتی۔“

جوش ملیح آبادی نے کہا..... ”ایک آدھ شعر کو چھوڑ دیجیے مگر مجموعی حیثیت سے غزل غیر فطری چیز ہے۔“

سردار جعفری نے کہا..... ”ڈاکٹر صاحب نے کہا ہے کہ غزل میں تغزل ہونا چاہیے.....“

اگر عثمانیوں پر کہ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے۔

کیا اس میں تغزل ہے یا نہیں؟“

ڈاکٹر صفدر نے کہا..... ”ہے تغزل نظم میں بھی ہو سکتا ہے۔“

سردار: اگر اس میں بھی تغزل ہے تو تغزل کا مطلب شاعری ہوا۔ تغزل سے آپ کیا مراد لیتے ہیں؟
ڈاکٹر صفدر نے کہا کہ اس وقت وہ ویسے ہی آگئے تھے۔ آج کل وہ ان چیزوں سے ’کٹ آف‘ ہیں تاہم وہ تغزل کی تعریف کرنے کی کوشش کریں گے۔ انہوں نے کہا کہ وہ تغزل کا بھدا سا مفہوم بیان کر سکتے ہیں، وہ یہ کہ ایک کیلیٹی ٹرئم اور Rythme کو تغزل کہتے ہیں۔

سردار جعفری: مگر یہ چیز تو شاعری میں غزل سے پہلے بھی موجود تھی۔

ڈاکٹر صفدر: لفظ سے جو معنی وابستہ کیے جاتے ہیں وہ اس لفظ کو مختص کرتا ہے۔ میں تو نفس غزل کی بات کرتا ہوں۔ اگر آپ غزل کا نام صراحی رکھ دیں تب بھی مجھے اعتراض نہیں ہوگا۔

آخر میں انہوں نے کہا..... ”جوش صاحب کو میر کے کلام میں کھائیاں اور صحرانظر آتے ہیں مگر پھول پھر بھی ملتے ہیں۔ غزل ہی زبان و شاعری کو قائم رکھ سکتی ہے۔ غزل ہی شاعری کی ابتداء ہے..... اور غزل ہی انتہا.....“

زیڈ۔ اے۔ بخاری آخر میں پھر کھڑے ہوئے۔ انہوں نے کہا..... ”میں ایک دو لفظ فہمیاں دور کرنا چاہتا ہوں۔ جعفری صاحب نے شاعری کو میرے ”دوغلہ آرٹ“ کہنے پر اعتراض کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ چیز عوام سے وابستہ نہ ہونے کی وجہ سے ہوئی۔ میں تو دوغلہ آرٹ محض اس وجہ سے کہہ رہا تھا کیونکہ اس کا اثر باواسطہ ہوتا ہے۔ رنگوں کا موسیقی کا اور رقص کا بغیر وساطت ہوتا ہے، اس لیے وہ اس سے علیحدہ ہیں۔ اس بات کو میں محض معمولی سا سائنٹفک بات کے طور پر کہہ رہا تھا۔“

جوش صاحب کی تقریر کے متعلق زیڈ۔ اے۔ بخاری نے کہا کہ وہ بہت دلچسپ تھی، وہ ہمیں راہ دکھانے کے بجائے پھبتی بازی پر لے آئے۔ میں نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ غزل ایک کھیل ہے، چیدہ چیدہ شاعر اچھے شاعر بھی تھے مگر.....

یہ نیادیکھا طریقہ قتل کا

آئینہ دکھلا دیا دو ہو گئے!

کھیل تو نہیں تو اور کیا ہے اور غزل کھیلنے کے لیے ہی ہم کہتے ہیں۔

جعفری صاحب نے نامانوس الفاظ کے لیے جو کچھ کہا ہے اس سلسلے میں میں یہ کہوں گا کہ الفاظ کبھی نامانوس نہیں ہوتے بشرطیکہ ٹھیک جگہ پر استعمال کیے جائیں۔ حالی نے بہت سے الفاظ کو موزوں طریقے سے استعمال کر کے مانوس کر

دیا۔ آخر میں انہوں نے کہا..... ”عوام کی زبان سے ہر شاعر کو استفادہ کرنا پڑتا ہے۔ الفاظ کو ہزاروں معنی ہوتے ہوتے ہیں۔ عوام ان میں سے بہت کم جاتے ہیں۔ بنیادی طور پر عوام سے متاثر ہو کر ہی ایسی زبان استعمال ہو سکتی ہے۔“

آخر میں صاحب صدر نے کہا..... ”چونکہ غزل موجودہ حالات میں کافی نہیں سمجھی جاتی، اس لیے یہ شاعری پھر حاوی نہیں ہے حالانکہ حالی سے پہلے ہماری شاعری پر غزل ہی حاوی تھی جہاں تک غزل کی خوبیوں کا تعلق ہے، ہمیں ماننا پڑے گا کہ پہلی غزل میں اچھے اچھے شعر بھی ہیں۔ بحث اس امر پر ہے کہ اظہار کا یہ طریقہ غلطہ جو غزل میں استعمال کیا جاتا ہے یعنی اس میں خیال کی تکمیل کا مکمل خاکہ نہیں ہوتا بلکہ غیر مربوط اشعار ہوتے ہیں۔“

انہوں نے کہا کہ وہ کلیے کے طور پر اس کو تسلیم نہیں کرتے کہ دو سو سال تک ہمارے شاعر فقیروں کے تکیوں یا درباروں میں رہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان دو سو سال میں اچھی قسم کی عشق و عاشقی کی شاعری موجود ہے، نفیس ترین خیالات بھی نظر آتے ہیں اور اچھا کہنے والوں کے ہاں یقینی طور پر صداقت ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ غزل کی صنف ہمارے ادب کی ضروریات کو مکمل طور پر پورا نہیں کر سکتی۔

انہوں نے کہا..... ”میں مجروح سلطانپوری کی اس بات سے متفق ہوں کہ بعض باتوں اور انداز کے لیے غزل ٹھیک ہے اور بعض کے لیے نظم۔ ان دونوں میں مقابلہ کرنا صحیح نہیں ہے بالکل اس طرح جس طرح گھڑے اور گلاس میں مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ دونوں کی علیحدہ علیحدہ ضرورت ہے۔ بشرطیکہ وہ اپنی ماہیت، معنویت اور فنی اعتبار سے درست ہوں۔ معنوی لحاظ سے غزل میں کافی انقلاب ہوا ہے۔ جعفری صاحب نے جو یہ کہا ہے کہ غزل کی روایات ہمیں محدود کر دیتی ہیں یہ بالکل درست ہے لیکن یہ روایتیں توڑی بھی جاسکتی ہیں۔“

آخر میں انہوں نے یہ کہا کہ بعض لوگ اچھی نظم کہہ سکتے ہیں بعض اچھی غزل، بعض دونوں اچھی کہہ سکتے ہیں لیکن اگر ہم انہیں جانچنے کے لیے معنویت اور ماہیت کا سانچہ مقرر کر لیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ میں ان دونوں کی ضرورت ہے۔

مجوزہ پر گرام ختم ہونے کے بعد جوش ملیح آبادی نے اپنی تازہ دو نظمیں سنائیں اور میٹنگ ختم ہو گئی۔

18 مئی 1947ء

اردو ترقی پسند مصنفین کا یہ اجلاس مجروح سلطانپوری کی صدارت میں منعقد ہوا۔

حاضرین: جوش ملیح آبادی، ڈاکٹر ایم۔ ڈی۔ تاثیر، سجاد ظہیر، ڈاکٹر یوسف حسن حیدر آبادی، علی سردار جعفری، کیفی

اعظمی، ساحر لدھیانوی، زیڈ۔ اے بخاری، قدوس صہبائی، ساحل بلگرامی، رضیہ سجاد ظہیر، نور بانو، حور بانو، سلطانہ بیگم، میرا

جی، وشوا متر عادل، مدھو سودھن، عالی جعفری، ظ۔ انصاری، اسرار الحق مجاز، حبیب تنویر، ایوب سرور اور دوسرے اصحاب۔ شروع میں پچھلی میٹنگ کی روداد پڑھی گئی۔ اس کے بعد ادکار رومانی نے ایک ریڈیائی ڈرامہ ”پھر بس میں“ سنایا۔

زیڈ۔ اے۔ بخاری نے کہا کہ یہ ڈرامہ پڑم کر سنانے کی چیز نہیں ہے۔ یہ تو باقاعدہ پڑیوس کیا جائے تبھی کوئی رائے قائم کی جاسکتی ہے۔

ڈاکٹر تاثیر نے کہا کہ بخاری صاحب ڈرامہ کے فن کے متعلق اپنی رائے کا اظہار تو کر سکتے ہیں اور چونکہ ریڈیو شین پر ان کے پاس جو ڈرامے آتے ہیں انہیں اسی طرح کاغذ پر پڑھ کر ہی فیصلہ کیا جاتا ہے کہ اچھے ہیں یا برے یا ان کی فنی خوبیوں اور خامیوں کا اندازہ بھی اسی صورت میں لگایا جاسکتا ہے۔ اس لیے اس ڈرامے پر بھی وہ اس طرح سے سن کر کوئی رائے تو قائم کر سکتے ہیں۔

زیڈ۔ اے۔ بخاری نے کہا کہ ڈرامے کو پروڈکشن سے کوئی تعلق نہیں یہ تو ایک خاص مقصد سے لکھا گیا ہے۔

اس کے بعد علی سردار جعفری کو ”ادب اور آرٹ کی طبقاتی بنیادیں“ کے عنوان سے ایک مقالہ سنانا تھا۔ مقالہ شروع کرنے سے پہلے انہوں نے کہا کہ وہ مقالے کو مکمل نہیں کر سکے۔ کافی حصہ تو مکمل ہے مگر کچھ حصے کے نوٹس انہوں نے لیے ہوئے جنہیں وہ ساتھ ہی پڑھ کر سنادیں گے۔

مقالہ ختم ہوئے ہی ظ۔ انصاری سامنے آئے اور انہوں نے کہا کہ سردار جعفری کا یہ مقالہ ایک خاص موضوع سے متعلق ہے مگر انہوں نے اس کی ابتداء ایک رسالے ”زگس“ کے ایڈیٹوریل کے ذکر سے کی ہے اور شروع میں اس کا انداز اس ایڈیٹوریل کے جواب سا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ان کو لکھنے کی تحریک اسے پڑھ کر ہی ہوئی ہوگی مگر ان کا موضوع چونکہ اپنی جگہ علیحدہ اہمیت رکھتا ہے اس لیے ان کا حوالہ دینا صحیح نہیں ہے۔ اگر اسے نکال دیا جائے تو بہت اچھا ہوگا۔

ظ۔ انصاری نے اس کے ساتھ ہی ایک دوسرا اعتراض سردار جعفری کے اس جملے پر کیا کہ جس ادب کی جڑیں عوام میں نہ ہوں وہ جان صاحب اور چرکین تو پیدا کر سکتا ہے، فردوسی اور اقبال پیدا نہیں کر سکتا۔ ظ۔ انصاری نے کہا کہ چرکین اور جان صاحب کی جگہ اگر ایسے شاعروں کے نام لکھ دیئے جائیں جو ہوا میں اڑتے ہیں تو بہتر ہوگا مثلاً ناسخ، ذوق وغیرہ۔

سردار جعفری نے کہا کہ جان صاحب اور چرکین نام انہوں نے اسی لیے لکھا ہے کیونکہ ان دونوں کے ہاں اور باری ادب کے انحطاط کے بدترین نمونے ملتے ہیں ویسے تو کوئی بڑا فنکار دربار میں رہ کر بھی زندگی سے علیحدہ نہیں ہو سکتا۔

ناخ و غیرہ کے ہاں پھر بھی زندگی ملتی ہے۔

چہ کین اور جان صاحب کے متعلق یہ کہنا کہ ان کی جڑیں عوام میں تھیں صحیح نہیں۔ وہ عوام کی پیداوار نہیں تھے ان کی شاعری انحطاط کی بدترین مثال تھی۔

ڈاکٹر تاثیر نے سردار جعفری سے پوچھا کہ اگر ”ادب کی جڑیں عوام کی زندگی میں“ کی بجائے فقرہ ”ادب کی جڑیں زندگی میں نہیں تھیں“ ہو جائے تو کیا ان کے مفہوم میں کوئی فرق پڑ جاتا ہے؟
سردار جعفری: بنیادی طور پر تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔

ڈاکٹر یوسف حسن: جعفری صاحب نے جو یہ لکھا ہے کہ وید اور مہا بھارت افراد کی نہیں بلکہ عوام کو پیداوار ہیں، یہ درست نہیں معلوم ہوتا ہے کیونکہ یہ افراد ہی کی لکھی ہوئی ہیں۔

سردار جعفری: میں نے عوامی پیداوار نہیں بلکہ اجتماعی پیداوار کا لفظ استعمال کیا ہے اور یہ لکھا ہے کہ شعر، نغمہ اور رقص پہلے اکٹھے تھے اور ان کی ابتداء اس طرح سے ہوئی کہ چوچلانے والے ”ہی ہا“ کی آواز نکالا کرتے تھے۔ ان کا یہ فعل اجتماعی ہوتا تھا۔ ”ہی ہا“ کے اسی Rythme سے نغمہ، شعر اور رقص پیدا ہوا ہے۔ یہ پہلے ایک ساتھ تھے مگر پھر آہستہ آہستہ علیحدہ ہو گئے۔ ”ہی ہا“ کی آواز چونکہ اجتماعی محنت سے ہوئی، اس لیے جب اسے محنت سے جدا کیا جائے گا تو اس کا اثر علیحدہ نہیں ہوگا۔

انہوں نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا کہ سرمایہ دارانہ دوزخ نے شاعری کو اجتماعیت سے علیحدہ کر کے Personal بنانے کی کوشش کی یعنی بغیر بحر اور بغیر قافیہ ردیف کے شاعری کو فروغ دینے کے تجربے کیے گئے جو اس لیے ناکام ہوئے کہ ان میں ترنم باقی نہیں رہا اور ترنم یا نغمہ کی جڑ ”ہی ہا“ میں ہے جو اجتماعی پیداوار ہے۔ انہوں نے کہا کہ شعر کی خصوصیت یہ ہے کہ ہم اسے گا کر پڑھنا چاہتے ہیں۔ اکیلے میں ہم گنگناتے ہیں اور بنیادی مجلسی یونٹ یعنی عاشق و معشوق بھی اسے گنگنا کر پڑھتے ہیں۔ یہ اجتماعیت ہے۔

ڈاکٹر یوسف حسن نے کہا کہ سوسائٹی نے کوئی چیز تخلیق نہیں کی بلکہ افراد ہی کی چیزیں ہمارے سامنے ہیں۔

سردار جعفری نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ اجتماعی سے مراد یہ ہے کہ فرد جو سالہ لیتا ہے وہ سوسائٹی سے ہی لیتا ہے۔ بعض اوقات ہم دیکھتے ہیں کہ ایک چیز لکھی گئی پھر اس کی دوسری کڑی ڈیڑھ سو سال بعد جا کر ملتی ہے۔ چونکہ افراد اسی سوسائٹی سے زبان و عقل اور دوسرا تمام مواد لیتے تھے۔ اس لیے اسے اجتماعی تخلیق کہا گیا ہے۔

ڈاکٹر یوسف: زبان و عقل اور دوسرا تمام سالہ تو سب کو ملتا تھا مگر سب لوگ تخلیق نہیں کر سکتے تھے۔ چند افراد تھے

جو یہ کام کرتے تھے۔

سردار جعفری: یہ بالکل ٹھیک ہے۔ میرا مطلب صرف یہ تھا کہ اس وقت کی تخلیقات میں اجتماعی احساسات اور اجتماعی قدریں ملتی ہیں۔ اس وقت جماعت فرد کی چیز کو اپنی چیز سمجھتی تھی اور کہنے والا دوسرے سے متعلق ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ ایک فرد کی چیزوں پر دوسرا فضا کر سکتا تھا۔ اس طرح سے دسیوں میں ویدا اور مہا بھارت جیسی چیزیں بنی ہیں۔ پروگرام کے مطابق اب جوش ملیح آبادی کو اپنی کتاب ”حرف آخر“ کا کچھ حصہ سنانا تھا۔ شروع میں انہوں نے کہا کہ ”حرف آخر“ کے اس حصے میں کائنات کی تخلیق سے پہلے کا منظر ہے اسے بیان کرنا نہایت مشکل کام تھا۔ نیسی کے اندر ہستی پیدا کرنا تھا۔

جونہی جوش صاحب نے نظم ختم کی لوگوں کی نظریں ظ۔ انصاری کی طرف اٹھنے لگیں۔ انہوں نے لوگوں کو مایوس نہیں کیا اور ایک اعتراض کرتے ہوئے کہا..... ”تخلیق کا تصور متعین نہیں تھا اگرچہ جوش صاحب نے اس کو باندھا ہے؟“ جوش ملیح آبادی نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ مقصد اس تصور کو باندھنا تھا۔

واشوا متر عادل نے حاضرین کو ظ۔ انصاری کے فقرے کا مفہوم سمجھاتے ہوئے کہا ”ان کا مطلب یہ ہے کہ جوش صاحب ایک ماحول پیدا کرنا چاہتے تھے جو پوری نظم پڑھنے کے بعد ذہن میں پیدا نہیں ہوتا۔ ہر شعر علیحدہ علیحدہ ٹھیک ہے۔“

جوش ملیح آبادی: یہ بہت مشکل کام تھا۔ نفی کو تو آپ لوگ اس طرح بیان کر سکتے ہیں کہ یہ نہیں تھا وہ نہیں تھا وغیرہ..... مگر تخلیق کائنات سے پہلے کیا تھا؟ اسے بیان کرنا بہت ہی مشکل تھا اور میں نے اسی کو بیان کیا ہے۔ مگر واشوا متر عادل کا خیال یہی تھا کہ نفی کی تصویر سامنے نہیں آتی۔

محمد صفدر نے کہا Nothingness کو بیان کرنے میں کوئی تصویر سامنے آ ہی نہیں سکتی۔ اس لیے اس کی توقع فضول ہے۔

ڈاکٹر یوسف حسن نے کہا کہ منطقی طور پر کوئی تصویر سامنے آ ہی نہیں سکتی۔ عزم تخلیق و امکانات محض کا خاکہ سامنے آتا ہے اور اس لحاظ سے کامیاب ہے۔

ڈاکٹر تاثیر نے کہا کہ اس نظم سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کائنات کے وجود سے پہلے خالق کو کچھ چیزیں پیدا کرنے کی آرزو تھی۔ ان ہی چیزوں کو ذکر اس نظم میں ہے۔ کیا شاعر کا تصور یہ ہے کہ مادہ کی تخلیق سے پہلے کوئی خالق موجود تھا؟ جوش ملیح آبادی: میں نے تو قوسین میں لکھ دیا ہے ”حسب روایات پیش ہیں“..... (قہقہہ)۔

ڈاکٹر تاثیر: یعنی یہ لکھا گیا ہے کہ اگر خدا ہوتا تو یہ سب کچھ کرتا؟

سردار جعفری نے کہا کہ انہوں نے یہ پوری نظم پڑھی ہے۔ اس میں جوش صاحب نے پہلے روایتی چیزیں بیان کی ہیں اس کے بعد دوسری۔

تاثیر: یہ غلط فہمی پیدا ہو جاتی تھی کہ شاعر کا تصور یہ ہے کہ کائنات کے وجود سے پہلے خالق موجود تھا۔
جوش ملیح آبادی: خدا نخواستہ۔

وشو متر عادل نے جوش صاحب سے پوچھا کہ یہ نظم جس زبان میں لکھی گئی ہے کیا وہ ایسی ہے جسے عوام سمجھ سکیں؟
جوش صاحب نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ آج نہیں سمجھتے تو کل سمجھنے لگیں گے مگر میں زبان کے متعلق اپنے ایک خاص معیار سے نیچے نہیں اتر سکتا۔

عادل: اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی جڑیں عوام میں نہیں۔

ڈاکٹر تاثیر: جوش صاحب کے فقرے کا مفہوم یہ ہے کہ کل جب عوام خواص سے اپنا حصہ چھین لیں گے اور آرٹ اور علم و ادب میں برابر کے شریک ہوں گے، اس وقت وہ ان سے لطف اندوز ہو سکیں گے۔

سردار جعفری نے کہا کہ یہاں پر لفظ عوام کی گت بن رہی ہے۔ اگر عوام نہیں سمجھیں گے کا مطلب یہ ہے کہ نچلے طبقے کے مزدور یا کستان نہیں سمجھیں گے تو یہ کوئی ایسی بات نہیں۔ نچلے درمیانی طبقے کے بہت سے لوگوں کو اس سے فائدہ ہوگا اور وہ سمجھ لیں گے۔

وشو متر عادل نے ایک دفعہ پر کہا کہ جوش صاحب زبان بہت مشکل لکھتے ہیں اور اتنی مشکل لکھتے ہیں کہ خود عادل صاحب اسے سمجھ نہیں پاتے..... اس لیے انہوں نے جوش صاحب سے کہا کہ وہ آسان زبان لکھا کریں تاکہ عوام اسے سمجھ سکیں۔

جوش صاحب نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا..... ”زبان کے معاملے میں میرا ایک خاص مذاق بن چکا ہے۔ اس کی وجہ میرے گھر کا ماحول ہے۔ میرے گھر میں فارسی بولی جاتی ہے۔ اس ماحول کے اثر سے اپنے آپ کو علیحدہ کرنا میرے بس کی بات نہیں“۔ ایک مثال دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ جب وہ کاشتکاروں میں جاتے ہیں تو ان سے گفتگو تک کرنے میں دقت پیش آتی ہے۔ اس لیے کہ وہ شروع ہی سے جس ماحول میں رہے ہیں، ان میں وہ زبان کبھی بولی ہی نہیں گئی جو وہ لوگ استعمال کرتے ہیں۔

ڈاکٹر یوسف حسن نے عادل صاحب کو مشورہ دیا کہ وہ جوش صاحب کی نظم کا ترجمہ کر لیا کریں تاکہ آسان ہو

جائے۔ جو لوگ Original سے محفوظ ہونا چاہتے ہیں انہیں موقع دیجیے کہ وہ بھی محفوظ ہوں۔ باقی آپ ترجمہ کر لیجیے یا کرا لیجیے۔

مدھوسودھن نے کہا..... ”جوش صاحب نے کہا ہے کہ وہ عوام کی زبان سے واقف نہیں کیا وہ عوام کی زندگی سے بھی واقف نہیں؟“

جوش: ہاں جاری رکھیے کہ جب زبان سے واقف نہیں تو حالات سے واقف نہیں جب حالات سے واقف نہیں تو ان سے ہمدردی نہیں.....

مدھوسودھن: میرا مطلب یہ تھا کہ آپ Inspiration عوام سے حاصل کرتے ہیں یا خواص سے؟
جوش صاحب نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا..... ”میں اسی زندگی کا آدمی ہوں اور اسی زندگی سے Inspiration حاصل کرتا ہوں۔“

ساحر لدھیانوی نے کہا..... ”یہ بحث غیر متعلق ہے۔ جوش صاحب کی تمام شاعری پر رائے دینے سے پہلے ضروری ہے کہ ان کے تمام مجموعوں کا مطالعہ کیا جائے۔“

جوش صاحب نے کہا کہ لفظوں کے انتخاب اور زبان کے معاملہ میں موضوع کا تعلق بھی ہے۔ بعض چیزیں آسانی سے بیان کر دی جاتی ہیں۔ بعض کے لیے مشکل الفاظ ضروری ہوتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ یہ کون اٹھا ہے شرماتا ہوا، میں الفاظ کا انتخاب نسبتاً بہت سہل ہے کیونکہ وہ موضوع آسان ہے۔

سجاد ظہیر نے آخر میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہاں پر بنیادی بحث شروع ہو گئی ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ادب میں مشکل نگاری جائز ہے، برخلاف اس کے بعض دوست یہ کہتے ہیں کہ مشکل نگاری ادب میں قطعی ناجائز ہے کیونکہ اسی فیصدی لوگ اسے نہیں سمجھتے اور چونکہ اسی فیصد لوگ نہیں سمجھتے اس لیے یہ افادی ادب نہیں۔ انہوں نے کہا کہ یہ کہنا قطعی طور پر غلط ہے۔ ہمیں اس کی شکایت نہیں ہونی چاہیے کہ کوئی تخلیق کم لوگوں کو سمجھ میں آئی ہے۔ شرط یہ ہے کہ تخلیق بلند پایہ ہو۔ دنیا کے بہترین ادب کا بہت بڑا حصہ مشکل زبان میں ہے۔ فلسفے اور معاشیات پر مشکل سے مشکل زبان میں ایسی کتابیں لکھی گئی ہیں جنہوں نے دنیا میں انقلاب پیدا کر دیا اور ان کی عوامی افادیت بھی مسلم ہے۔ سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ہمارے سماج میں آٹھ فیصدی لوگ پڑھے لکھے ہیں۔ اس میں بھی بہت کم ایسے ہیں جو اردو سمجھ سکتے ہوں۔ ایسی حالت میں تمام شاعر عام لوگوں کی سمجھ میں نہیں آسکتے۔ اس لیے ہماری پوزیشن یہ نہیں ہونی چاہیے کہ ہم ایسے ادب کو عوامی ادب نہ مانیں۔ سادہ لکھنے کی ضرورت کو شش کرنی چاہیے۔ اگر نہ لکھا جاسکتے تو لکھنے والوں کو

پورا حق ہونا چاہیے کہ مشکل زبان استعمال کریں۔ اس سلسلہ میں انہوں نے آزاد نظم کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ آزاد نظم کو کم لوگ پسند کرتے ہیں مگر میں بعض اچھی چیزیں بھی پیش ہوئی ہیں جو ٹھیک ہیں۔

عادل صاحب نے جوش صاحب سے پوچھا کہ وہ مشکل فارم ہی کیوں استعمال کر رہے ہیں؟

ڈاکٹر تاثیر نے کہا کہ عادل صاحب کا مطلب غالباً یہ ہے کہ جوش صاحب اتنا مشکل ڈکشن استعمال کرتے ہیں جتنا مشکل ضروری نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ عادل صاحب جوش صاحب کی اکثر نظمیں نہیں سمجھ سکتے۔ اس کی وجہ تربیت اور تربیت کے ماحول کا فرق ہے اور عادل صاحب کی یہ مشکل بالکل ذات قسم کی ہے۔

جوش صاحب نے کہا کہ کچھ قافیے کی پابندیاں بھی ہوتی ہیں مثلاً انہوں نے رقم کا قافیہ باندھا ہے جو چتکبرے سانپ کو کہتے ہیں مگر چتکبر ا قافیے میں نہیں آسکتا۔

آخر میں ڈاکٹر تاثیر نے کہا کہ جوش صاحب نے جو خدا کا روایتی تصور لیا ہے وہ مسلم Mythology سے متعلق ہے۔ ایسی حالت میں ایسے الفاظ جیسے اس نظم میں منتخب کیے گئے ہیں، اس کے لیے بے حد ضروری ہیں کیونکہ ان الفاظ کی اپنی روایت اور مزاج ہے اور ان کے بغیر نظم مکمل نہیں کہلا سکتی۔

شاعری میں منفی شعور کا وجود فرانسیسی شاعر ملارے اور ہلمدے شاعر غالب کے ہاں بیشتر ہی موجود ہے مثلاً میں عندلیب، گلشن نا آفریدہ ہوں۔ جوش نے بھی اس نظم میں اسی طرح منفی تصور ظاہر کیا ہے۔ آخر میں ڈاکٹر تاثیر نے ایک نظم سنائی اور اس کے بعد مجلس برخاست ہوئی۔

31 مئی 1947ء

”اگر ملک کی تہذیب کو بدترین قسم کے رجعت پرست اور سامراجی حملے سے بچانا ہے، اگر اپنے وطن کے دوسرے وطن پسندوں کی طرح ان جملوں سے آل انڈیا انجمن ترقی پسند مصنفین کے جنرل سیکرٹری سجاد ظہیر نے انجمن کی طرف سے اس جلسے کا آغاز کیا۔ جلسہ انجمن اسلام ہائی سکول کے ہال میں ہوا۔ حالانکہ ملک سے داختہ تھا لیکن ٹکٹ اور شہر میں کرفیو کی زبردست پابندیوں کے باوجود تمام ہال پر ہو گیا۔

ٹھیک پانچ بجے جلسہ شروع ہوا۔ جلسے میں اردو، ہندی، انگریزی کے ادیب اور فلمی صنعت کے بعض معزز اراکین ٹھیک وقت پر پہنچ چکے تھے چنانچہ مراٹھی زبان کے مشہور شاعر عمر شیخ، اقبال کی نظم اپنے خاص لے میں سنانے کو کھڑے ہوئے.....

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو

عمر شیخ مہاراشٹر کا محبوب شاعر جب اردو زبان کے نغم کو اپنی آتش نوائی میں جذب کر رہا تھا تو حاضرین کے چروں پر جذبات کا رنگ آ رہا تھا۔ اس کے بعد سجاد ظہیر نے اپنا مقالہ پڑھا۔ انہوں نے ترقی پسند ادب کی خصوصیات، اس کے فرائض اور اس کا مستقبل بتانے کے بعد اردو ادیبوں کو تین درجوں میں تقسیم کیا۔ ایک وہ ادیب جو آج بھی پرانی بے روح ہڈیوں سے رس چوسنے کی کوشش کر رہے ہیں اور ترقی پسند ادب پر شعوری طور پر ناروا حملے کرتے ہیں کیونکہ زندگی اور ادب کے تقاضوں کو وہ ہم آہنگ نہیں سمجھتے۔

دوسرے وہ لوگ جو پہلی صفوں سے نکل آئے ہیں اور ترقی پسند ادب کی کڑی ذمہ داری کو اپنے کاندھوں پر لینے کے لیے بڑھ رہے ہیں۔ تیسرے وہ ادیب جو ادب کو دنیا کی جمہوریت پسند عوامی طاقتوں کی پشت پر لانا چاہتے ہیں اور دنیائے انسانیت کے مفاد کے لیے اپنے ہتھیار سنبھالے ہوئے ہیں۔

سجاد ظہیر کے بعد رفعت سرور اور ان کے بعد ظ۔ انصاریڈا اُس پر آئے۔ ظ۔ انصاری نے اپنی مشہور نظم ”فیصلہ“ سنائی۔ ان کے بعد نیاز حیدر، عارف جلالی اور ڈاکٹر صفدر آہ نے اپنا اپنا کلام سنایا۔ آل انڈیا ریڈیو بمبئی کے ڈائریکٹر زیڈ۔ اے۔ بخاری نے بھی غزل سنائی اور پھر علی سردار جعفری، کیفی اور مجروح کی نظمیں دو دو بار سنی گئیں۔ جناب صدر نے ساغر نظامی صاحب کا نام پکارا لیکن وہ دورانِ مشاعرہ طبیعت ناساز ہونے کی وجہ سے جا چکے تھے۔

اسی دوران سلطانہ بیگم، کیفی اعظمی، رضیہ سجاد ظہیر اور مجروح جھولیاں پھیلانے ہوئے حاضرین سے انجمن کے لیے چندہ طلب کرتے رہے۔ ان لوگوں نے نظریں جھکائے جھکائے ترقی پسند ادب کے قدردانوں سے 110 روپے جمع کر لیے۔

حاضرین کے اصرار پر میراجی نے بھی اپنی ایک نظم ”بیوپاری“ سنائی اور انجمن کو چندہ بھی دیا۔ جلسہ 8 بجے ختم ہوا اور بے حد کامیابی کے ساتھ ختم ہوا۔ حاضرین نے انجمن کے اراکین سے مطالبہ کیا کہ اس قسم کے جلسے ہر ماہ کیے جائیں۔

حمید اختر کا جواب

ذیل میں حمید اختر سیکرٹری انجمن ترقی پسند مصنفین اردو کا بیان شائع کیا جا رہا ہے جو انہوں نے ماہر القادری اور کلکیل بدیوانی کے ناروا حملوں اور اعتراضات کے جواب میں انجمن کی جانب سے دیا ہے۔

”بمبئی کے بعض اردو روزناموں میں گزشتہ ہفتہ ماہر القادری صاحب اور شکیل بدایونی صاحب کے بیانات شائع ہوئے ہیں جن میں ترقی پسند ادب کی تحریک پر حملے کیے گئے ہیں اور اس بات کی تلقین کی گئی ہے کہ ترقی پسند ادب کی تحریک کا بائیکاٹ ہونا چاہیے۔“

جو اعتراضات ہماری تحریک پر کیے گئے ہیں وہ نئے نہیں۔ ترقی پسند مصنفین کی تحریک ملک میں گیارہ سال سے جاری ہے اور وقتاً فوقتاً افراد اور گروہ اس کو بدنام کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

ہم ان لوگوں سے بحث کرنا ضروری نہیں سمجھتے جنہوں نے ہم پر طرح طرح کے بے بنیاد الزام لگائے ہیں اور ادب دوست خود اس بات کا فیصلہ کریں گے کہ موجودہ دور میں اردو کے ادیبوں کو کون سا گروہ حریت اور انسانیت کا علمبردار ہے اور کون سا محض خود پرستی اور سرمایہ داروں کی کفکش برداری کا طرفدار۔

ہم اردو ادب کے دوستوں کی اطلاع کے لیے اپنی تحریک کے متعلق محض چند واقعات اور حقیقتوں کا اظہار یہاں کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ خود یہ فیصلہ کر لیں کہ سچائی کس کی طرف ہے اور بہتان و افترا کس کی جانب۔

(1) انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد اس کا وہ مشہور اعلان نامہ ہے جو 1936ء میں ملک کے بعض ممتاز ادیبوں کے دستخط سے شائع ہوا تھا اور جس میں ترقی پسند ادب کی تحریک کے مقاصد بیان کیے گئے تھے۔ اس بیان پر مولوی عبدالحق، ڈاکٹر عابد حسین، منشی پریم چند، جوش ملیح آبادی، ڈاکٹر عبدالعلیم (لکھنؤ یونیورسٹی)، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، ڈاکٹر محمد دین تاثیر، ڈاکٹر اعجاز حسین (الہ آباد یونیورسٹی)، پروفیسر آل احمد سرور، فیض احمد فیض وغیرہ کے دستخط تھے۔ منشی پریم چند نے ہماری پہلی کانفرنس کی صدارت کی۔ مولانا حسرت موہانی نے بھی اس میں حصہ لیا۔ مولانا آج بھی ہماری تحریک کے معاون اور سرپرست ہیں چنانچہ ڈیڑھ سال پہلے انہوں نے ترقی پسند مصنفین کی حیدرآباد کی کانفرنس میں شرکت کی۔ مولانا حسرت موہانی ہماری کانپور کی شاخ کے ممبر بھی ہیں۔ مولانا عبدالحق نے ہماری الہ آباد کی کانفرنس کی صدارت قبول فرمائی اور آج بھی وہ ہماری تحریک کے معزز سرپرستوں میں سے ہیں۔

(2) اردو کے ادیب اور شاعر جو اس وقت ہماری انجمن کے ممبر ہیں ان میں سے خاص خاص نام یہ ہیں..... جوش ملیح آبادی، حفیظ جالندھری، ڈاکٹر محمد دین تاثیر، فیض احمد فیض (ایڈیٹر، پاکستان ٹائمز لاہور)، قاضی عبدالغفار، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، کرشن چندر، پیرزادہ احمد ندیم قاسمی، راجندر سنگھ بیدی، ڈاکٹر عبدالعلیم، (پروفیسر، لکھنؤ یونیورسٹی)، ڈاکٹر اعجاز حسین (شعبہ اردو، الہ آباد یونیورسٹی)، پروفیسر آل احمد سرور (شعبہ اردو، لکھنؤ یونیورسٹی)، پروفیسر احتشام حسین (شعبہ اردو، لکھنؤ یونیورسٹی)، طفیل احمد خاں (ایڈیٹر، معاشیات ترقی اردو دہلی)، وقار عظیم (ایڈیٹر، آج کل دہلی)، احمد...

علوی (ایڈیٹر، مسلم سمیٹی)، ساغر نظامی، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، ڈاکٹر عزیز احمد (پروفیسر انگریزی، جامعہ عثمانیہ)، معین احسن جذبی (شعبہ اردو، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)، مخدوم محی الدین، سجاد ظہیر، عصمت چغتائی، فراق گورکھپوری، مجنوں گورکھپوری، مہندر ناتھ، اسرار الحق مجاز، ساحر لدھیانوی، فکر تونسوی (ایڈیٹر، ادب لطیف)، قدوس صہبائی (ایڈیٹر، نظام)، خواجہ احمد عباس، وشو امتر عدل، مدھو سو دھن، ظ۔ انصاری، سلطانہ بیگم، احمد اکبر آبادی، مجروح سلطانپوری، باری علیگ، دیوندر ستیا رتھی، ابراہمی جلیس، نظر حیدر آبادی، رفعت سروش، ظہیر کاشمیری، جاں نثار اختر، سید مطلبی فریدی آبادی، اختر انصاری، یونس احمد، وامتق مجتبیٰ، اظہر پرویز، شریف عنایت اللہ، صدیقہ بیگم، ریاض رونی، سلمان الارشد فاروقی، صہبا لکھنوی، عالی جعفری، مرغوب جوہری، نشاط شاہدوی، مسعود اختر جمال اور ان کے علاوہ سینکڑوں اور بھی نوجوان ادیب اور شعراء جو ہماری انجمن کے ممبر ہیں، ترقی پسند اصولوں کے مطابق وہ بھی ادبی تخلیق و تنقید میں سرگرم ہیں۔

کیا ہم پوچھ سکتے ہیں کہ اردو ادب کی جدید تخلیق کا تصور ان ہستیوں کا چھوڑ کر کیا جاسکتا ہے؟

کیا وہ تحریک جو ان لوگوں سے وابستہ ہے، اردو کو یا ہماری تحریک کو نقصان پہنچا رہی ہے؟ علامہ ماہر القادری اور

مولانا شکیل بدایونی جواب دیں۔

ہمیں اس بات پر فخر ہے کہ ترقی پسند مصنفین کا گروہ ہی وہ گروہ ہے جو فی زمانہ اردو ادب کی بحیثیت مجموعی سب

سے زیادہ خدمت کر رہا ہے۔

اس کی مخالفت کرنا اردو کی مخالفت کرنا ہے۔

(3) یہ کہنا کہ ترقی پسند مصنفین کی تحریک محض کمیونسٹوں کی تحریک ہے، بالکل غلط ہے۔ ہم اس پر فخر کرتے ہیں

کہ ہمارا ہی واج ادبی ادارہ ہے جس میں مختلف سیاسی خیال اور عقائد کے لوگ بعض مشترک مقاصد کے لیے متحد ہوئے ہیں۔

ترقی پسند، مسلم لیگ، کانگریس، کمیونسٹ اور غیر پارٹی کے لوگ سب ہماری صفوں میں پائے جاتے ہیں۔

جمہوریت اور انسانیت، دوستی اور سرمایہ پرستی غلام اور ظلم کی مخالفت ہر عوامی جماعت کے اندر سے کی جاسکتی ہے اور یہی وہ بنیاد ہے جو ہم سب کو متحد کرتی ہے

(4) ہماری مخالفت کرنے والے یا تو انگریزی حکومت کے طرفدار ہیں یا سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے

حاشیہ نشین ہیں یا پھر وہ ایسے کٹر قدامت پرست ہیں جو ہر نئی چیز سے ڈرتے ہیں جنہیں تبدیلی اور انقلاب کے نام سے نفرت ہے لیکن ظاہر ہے کہ ادب اور تہذیب، اخلاق اور انصاف کے سچے دوست ہمارے مخالف نہیں ہو سکتے ہیں۔ یہی

سبب ہے کہ گیارہ سال کی مختصر مدت میں ہماری تحریک کی روز افزوں ترقی ہوئی ہے اور رجعت پرستوں کا زور گھٹ رہا ہے۔

ماہر القادری اور شکیل بدایونی کو اسی بات پر غصہ آتا ہے لیکن ہم ان کی مشکلات اور رنجش دور کرنے سے قاصر ہیں جب انہوں نے خود ہی زوال پذیری، عوام دشمنی اور سرمایہ پرستی کی صفوں میں شامل ہونا پسند کر لیا ہے تو پھر ان کو آگے چل کر اور بھی مایوسیوں کا منہ دیکھنا پڑے گا۔

اس لیے کہ بیداری جمہوریت کے اس دور میں وہ طاقت جو اس کا مقابلہ کرنے کے لیے کھڑی ہوگی خواہ اپنے آپ کو وہ سب سے بڑی مذہبی جماعت ثابت کرے یا اس کے چہرے پر روایات اور رسوم کا نقاب ہو اس کی شکست لازمی اور یقینی ہے۔

آخر میں یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ترقی پسند مصنفین اس کے دعویٰ دار نہیں کہ ان کی ادبی کاوش میں خامیاں اور غلطیاں نہیں ہوتیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ اردو ادب سے سچی دوستی رکھنے والے دوست ہم پر نکتہ چینی کریں اور ہماری غلطیاں ہمیں بتائیں لیکن دیانتداری اور سنجیدگی کے ساتھ، اس سے ہمارا ادب اور بھی بہتر ہوگا لیکن ماہر صاحب اور شکیل صاحب جب سچائی کو بالائے طاق رکھ کر ہمارے خلاف لوگوں کو جھوٹ موٹ بھڑکانے کی کوشش کریں گے تو اس سے ادبی اور اخلاقی فضا گندی ہوگی۔

بہر حال ہم اسی تضحیح اوقات میں ان کا ساتھ دینے سے قاصر ہیں۔ ہم اردو کے تمام ہی خواہوں سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ معاملہ کے ان پہلوؤں پر غور رک کے خود ہی فیصلہ کریں کہ کس کا راستہ سچا ہے۔ ترقی پسند مصنفین کا یا ان کے اندھے معترضین کا۔

یکم جون 1947ء

اردو ترقی پسند مصنفین کا یہ اجلاس کیفی اعظمی کی صدارت میں منعقد ہوا۔

حاضرین: سجاد ظہیر، سکندر علی وجد، قدوس صہبائی، میراجی، وشوامتر عادل، رفعت سروش، ظ۔ انصاری، ساحر لدھیانوی، مجتبیٰ حسن، ہارون خوشتر، افضل عباس، عماد الدین، رفیق گوالیاری، محمد حسین جعفرانی، محمد مہدی، شوکت خانم، احمد علی علوی، عارف جلالی، محمد صفدر، بشیر رومانی اور دوسرے اصحاب۔

پچھلی میٹنگ کی روداد سنائے جانے کے بعد رفعت سروش نے ”بہار“ کے عنوان سے ایک نظم پڑھی۔ وشوامتر

عادل نے.....

یک قلم مٹ نہیں جاتی ہے گلستاں سے بہار
ہاں خزانوں کے شبستانوں میں کھو جاتی ہے
کے دوسرے مصرعے میں ”خزانوں“ کے لفظ پر اعتراض کیا اور پوچھا کہ خزاں کی جمع ”خزاؤں“ کی بجائے
”خزانوں“ کیوں کی گئی ہے؟

رفعت سروش نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ خزاں کی جمع خزانوں شاید اس سے پہلے کبھی استعمال نہیں
ہوئی۔ انہوں نے اس لیے کی ہے کیونکہ خزاں یا خزاؤں میں صرف پتے جھڑنے کی کیفیت کا تصور سامنے آتا ہے۔ برعکس
اس کے خزانوں میں ایک ہمہ گیری ہے۔

کیفی اعظمی نے کہا..... ”کوئی نیا لفظ یا نئی ترکیب استعمال کرنے سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ یہ سماعت پر
ناگوار تو نہیں گزرتا، جہاں تک خزانوں کا تعلق ہے یہ سماعت پر ناگوار گزرتا ہے۔ اس لیے اسے اس طرح سے استعمال نہیں
کرنا چاہیے۔“

قدوس صہبائی نے کہا کہ جدید فارسی میں ”نون غنہ“ باقی نہیں رہا ہے مثلاً ”فغان“ کی جگہ ”فغان“ استعمال ہوتا
ہے۔ اس طرح ”خزاں“ کی جگہ ”خزان“۔ چونکہ ”خزاں“ فارسی کا لفظ ہے اس لیے اس کی جمع ”خزانوں“ تسلیم کر لی
جائے۔

سجاد ظہیر نے کہا کہ قدوس صہبائی کی دلیل سے انہیں اتفاق نہیں کیونکہ ان کے خیال میں ہمیں فارسی کی طرف
دھیان نہیں دینا چاہیے بلکہ کوئی لفظ آج کل جس طرح اردو میں استعمال ہوتا ہے اس کی رعایت سے اسے اردو کے
محاورے اور صورت کے لحاظ سے استعمال ہونا چاہیے۔

سکندر علی وجد کا بھی یہی خیال تھا۔ انہوں نے کہا کہ فارسی میں ”نون غنہ“ کبھی رہا ہی نہیں مگر اردو میں لفظ
خزاں ہے۔ اس لیے خزانوں کی بجائے خزاؤں ہی استعمال ہونا چاہیے جبکہ خزانوں لکھنے کا کوئی فائدہ بھی نہیں۔
اس سلسلہ میں کیفی اعظمی نے کہا کہ رفعت سروش نے خواہ مخواہ فرض کر لیا ہے کہ خزاؤں میں صرف پتے جھڑنے کی
کیفیت ہے حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے، اس میں خزاں کی پوری کیفیت ہے۔ انہوں نے کہا اس سے پہلے پرویز شاہدی نے
ایک جگہ خزانوں کو اس طرح استعمال کیا ہے.....

خزانوں سے کھیلا بہاروں سے کھیلا

مگر یہ تمام سننے والوں کو ناگوار گزرا تھا۔ اس طرح ناگوار معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے یہاں پر درست نہیں ہے۔

یہاں پر خزاں ہی سے کام چل سکتا ہے۔

وشوا متر عادل نے کہا..... ”میرے خیال میں سب سے زیادہ خیال روایت کا رکھنا چاہیے۔ اس کے علاوہ کیفی اعظمی نے جو یہ کہا ہے کہ خزاں سے کام چل سکتا ہے، مجھے اس سے اتفاق نہیں کیونکہ اگر ضروری ہو تو جمع ضرور بنائی جائے۔“

کیفی اعظمی: بنا تو سکتے ہیں لیکن اس کے لیے کوئی پابندی یا قاعدہ تو ہونا چاہیے۔

میراجی: جیسا کہ سجاد ظہیر نے کہا ہے، ہمیں دوسری زبان کی بجائے اردو کے محاورے اور روایت کا لحاظ رکھنا چاہیے اور اس کی مناسبت سے خزانوں نہیں بلکہ خزاؤں ہونا چاہیے۔

ظ۔ انصاری: خزانوں ویسے بھی بہت گراں گزرتا ہے۔

رفعت سروش: مگر اس سے پیچ و خم سا پیدا ہو جاتا ہے جو خزاؤں کے استعمال سے نہیں ہوتا۔

ظ۔ انصاری: اگر آپ نے پیچ و خم کے لیے استعمال کیا ہے تو رہنے دیجیے (قہقہہ)..... ویسے اچھا نہیں معلوم ہوتا۔

ظ۔ انصاری نے کہا کہ ان کے خیال میں ”خزاؤں کے شبستانوں میں کھو جاتی ہے“ میں شبستانوں کا لفظ کھٹکتا ہے۔

رفعت سروش نے کہا..... ”اگر ”شع شبستان وصال“ صحیح ہے تو یہ بھی صحیح ہے۔“

ظ۔ انصاری نے صاحب صدر کے استفسار پر بتلایا کہ ”شع شبستان وصال“ ان کے خیال میں شاعر نے وصل کی جگہ کے لیے استعمال کیا ہے۔ اسی طرح اس مصرعہ میں استعمال کیا گیا ہے۔

وشوا متر عادل: اس مصرعہ میں رفعت سروش نے خزاں کو شبستان سے تشبیہ دی ہے لیکن شع شبستان سے مراد ہے ایسا شبستان جہاں وصل ہوتا ہے۔

میراجی نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ رفعت سروش نے خزاں کو شبستان یعنی اندھیرا کہا ہے اور بہار کے اس میں کھوجانے سے مراد یہ ہے کہ روشنی اندھیرے میں کھو گئی ہے۔

آخر میں سجاد ظہیر نے کہا کہ ان کے خیال میں خزاں کے لیے شبستان کی تشبیہ ناموزوں نہیں ہے۔

پروگرام کے مطابق اب قدوس صہبائی کو ایک افسانہ ”مہیب سائے“ سنانا تھا۔ افسانہ سنانے سے پہلے انہوں نے کہا کہ اس افسانے میں دو افسانوں کو ایک دوسرے میں اس طرح مدغم کر دیا گیا ہے کہ یہ بظاہر ایک افسانہ نظر آتا ہے۔

افسانہ ختم ہوئے ہی ظ۔ انصاری نے کہا کہ قدوس صہبائی نے بتلایا تھا کہ اس افسانے میں دو افسانے ایک دوسرے میں مدغم ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ افسانہ نگار کو شروع شروع میں ناکامی ہوئی ہے یعنی وہاں تک جہاں وہ ہوٹل

میں بیٹھ کر اپنے بھائی کا قصہ سنانا شروع کرتا ہے۔ قدوس صہبائی نے کہا کہ وہیں سے دوسرا افسانہ شروع ہوتا ہے اور پہلا حصہ وہاں ختم ہو جاتا ہے جہاں وہ اپنے بھائی کی زندگی سنانا شروع کرتا ہے۔

ظ۔ انصاری نے ایک اور اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ اس افسانہ کا مرکزی کردار ڈاکٹر جب اپنے بھائی کا قصہ سنانا شروع کرتا ہے تو وہ اس طرح سے بولتا ہے اور اس طرح سے تجزیہ کرتا ہے جس طرح کہ ایک آدمی کسی دوسرے آدمی کے متعلق بھی بیان نہیں کر سکتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر خود اپنا تجزیہ اور واقعہ پیش کر رہا ہے۔

حمید اختر نے کہا کہ انصاری صاحب کا اعتراض صحیح نہیں ہے کیونکہ افسانے میں یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ ڈاکٹر یہ کہانی مسز عمر دراز کو سنانے کے لیے تیار نہیں مگر اسی شام ٹینس میں ہارنے کے بعد وہ مسز عمر دراز کے ساتھ ہوٹل میں جاتا ہے جہاں وہ اسے شراب پلاتی ہے اور وہ نشے میں ایک دم سے پورے واقعات بیان کر دیتا ہے۔ جس طرح اس کی گفتگو اور اس کے اظہار کا طریقہ اس افسانے میں پیش کیا گیا ہے، وہ ایک شرابی کی فطرت کے عین مطابق ہے اور یہ افسانے کی خوبی ہے۔

محمد مہدی نے کہا کہ ان کے خیال میں اس افسانے میں قرۃ العین حیدریت ہے یعنی انگریزی کے ایسے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جو پڑھنے والے کو ناگوار گزرتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ پلاٹ عام سا ہے اور افسانہ نگار کوشش کے باوجود طارق کے کریکٹر کو ابھار نہیں سکا ہے۔

وشوا متر عادل نے کہا کہ انگریزی الفاظ بہت زیادہ استعمال کیے گئے ہیں جو نہیں ہونے چاہئیں۔ محمد صفدر نے کہا کہ افسانہ میں مسز عمر دراز کے کریکٹر کو کوئی جواز نہیں، اسے کیوں رکھا گیا ہے؟ یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ ڈاکٹر کو شراب کیوں پلاتی ہے؟ یہ کام اس کی بجائے کوئی اور بھی کر سکتا تھا۔

قدوس صہبائی نے ان اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے کہا..... ”انگریزی الفاظ کے متعلق مجھے یہ کہنا ہے کہ میں اپنے افسانوں میں عام طور پر کبھی انگریزی الفاظ استعمال نہیں کرتا۔ اس افسانے کے تعارف میں ہی میں بتا چکا ہوں کہ یہ اوپر کے درمیانی طبقے کی کہانی ہے اور اس کی فضا ایسی ہے جس میں بعض الفاظ مثلاً ڈنر، کلب، تاج کے سیشنل روم، وغیرہ استعمال کرنا ضروری ہو جاتا ہیں۔“

ظ۔ انصاری اور محمد صفدر کے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے قدوس صہبائی نے کہا کہ افسانے میں چار کریکٹر ہیں۔ ڈاکٹر، مسز عمر دراز، طارق اور اس کی بہا بھی۔ افسانے کے شروع میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مسز عمر دراز جو سوسائٹی کی ایک معزز خاتون ہیں، ڈاکٹر کو چاہتی ہیں مگر وہ اس کے ہتھے نہیں چڑھتا۔ مسز عمر دراز موقع کی تلاش میں رہتی

ہیں۔ آج جب وہ ٹینس میں ہار جاتا ہے تو وہ اسے اپنے ساتھ لے جاتی ہیں، اسے شراب پلا کر اس کی افسردگی کی وجہ پوچھتی ہیں۔ وہ بتلانا نہیں چاہتا لیکن نشے میں بتلا دیتا ہے۔ یہاں سے طارق کا کریکٹر جو دوسری کہانی کا کریکٹر ہے شروع ہوتا ہے۔ ڈاکٹر کے بیان سے اوپر کے متوسط طبقے کی زندگی، عادات اور طور طریقوں پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ متوسط طبقے کے عشق کرنے کے طریقے، کھوکھلا پن، بھابھی سے محبت اور اسی قسم کی دوسری چیزیں ہیں جو طارق کے کریکٹر کو Develope کرتی ہیں۔ یہاں خاص بات یہ ہے کہ طارق کی کہانی ختم کرنے کے بعد پہلی کہانی کا نقطہ عروج آتا ہے اور ڈاکٹر خود اتنا متاثر ہو جاتا ہے کہ مسز عمر دراز کو اپنے ہاتھ میں ہاتھ دبانے کا موقع دیتا ہے اور اس ک آگے سپر ڈال دیتا ہے۔ اسی بات کی طرف افسانے کے آخر میں ہلکا سا اشارہ موجود ہے۔

قدوس صہبائی کے افسانے کے بعد سکندر علی وجد نے ”کاروان زندگی“ کے عنوان سے ایک نظم سنائی۔ نظم عام طور پر بہت پسند کی گئی۔ ظ۔ انصاری نے کہا کہ ہماری زبان میں ایسی نظمیں بہت کم لکھیں گئی ہیں۔ صرف جوش صاحب کی نظم ہے۔ چونکہ یہ بہت مشکل کام ہے اسی لیے ہماری شاعری میں اس قسم کی چیزیں نہیں ہیں۔

سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے ظ۔ انصاری نے کہا..... ”نظم کا پہلا حصہ، بہت نازک اور خوبصورت ہے۔ آپ نے نظم کے تین حصے کیے ہیں یعنی عدم، موجود اور بعد از وجود۔ ہر حصہ ختم ہونے کے بعد آہمیں بتلا دیتے ہیں کہ یہاں سے دوسرا حصہ یا فلاں حصہ شروع ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ نظم پڑھنے والوں کی سمجھ میں یہ بات نہ آئے۔ اگر آپ مادہ کی ایک منزل سے دوسری منزل تک کی درمیانی کیفیات بھی بیان کر دیں تو بہت اچھا ہو۔“ ایک مشورہ دیتے ہوئے ظ۔ انصاری نے کہا کہ ”یہی سبک روی ہے پاسبان زندگی“ کی بجائے.....

یہی سبک روی ہے بادبان زندگی

..... کر دیں تو ان کے خیال میں یہ بہتر ہوگا کیونکہ پاسبان کا لفظ کچھ کھٹکتا ہے۔

میراجی نے کہا کہ ظ۔ انصاری کو یہ غلط فہمی ہے کہ نظم صاف طور پر سمجھ میں نہیں آئے گی۔ انہوں نے کہا کہ نظم پڑھنے کے بعد نثر کے ٹکڑوں کی ضرورت نہیں رہے گی بلکہ صاف طور پر سمجھ میں آجائے گی۔

وشو متر عادل نے کہا..... ”نظم بہت اچھی ہے مگر ایک جگہ ”کارواں نئے نئے“ استعمال ہوا ہے جس سے مفہوم غلط ملط ہو جاتا ہے کیونکہ زندگی کا کارواں ایک ہے جسے شاعر بیان کر رہا ہے۔ اس میں کارواں نئے نئے یعنی بہت سے کارواں کا استعمال درست نہیں ہے۔“

آخر میں سکندر علی وجد نے کہا..... ”پہلا حصہ یعنی وجود سے پہلے کے حصے میں میں نے بچپن کے بند کہے تھے مگر

موضوع ایسا ہے کہ ہر لفظ پر گرفت ہونے کا امکان ہے۔ کائنات کے وجود سے پہلے کیا تھا، یہ بیان کرنا بہت مشکل کام تھا۔ اس لیے میں نے جن چیزوں سے زندگی عبارت ہے ان کی نفی کر کے اسے مختصر طور پر بیان کر دیا ہے اور باقی کا حصہ کاٹ دیا ہے۔ یہ نظم میں نے چار سال کی محنت سے لکھی ہے اور اس کے لیے مجھے سینکڑوں کتابیں پڑھنا پڑی ہیں۔ بہت سے سائنس دانوں سے تبادلہ خیالات کرنے کے بعد میں نے یہ کوشش کی ہے کہ میں شاعر کی طرح بیان کر دوں، سائنسدانوں کی طرح نہیں کیونکہ سائنس کی ایک کتاب کے سامنے تو یہ نظم کچھ بھی نہیں ہوگی کیونکہ اس میں جزوی تفصیلات بہت زیادہ ہوں گی۔“

سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے وجد صاحب نے کہا..... ”اس نظم کے ایک ایک بند میں کئی صدیاں گزر جاتی ہیں، اس کے لیے پہلے میں نے چار سو بند کہے تھے مگر بعد میں ایڈٹ کر کے کم کر دیئے ہیں۔“

عدم سے وجود میں آنے کی منزل بیان کرنے کے سلسلے میں انہوں نے کہا کہ عدم سے وجود میں آنے کی کوئی منزل ہے ہی نہیں..... محض ایک لکیر ہے۔

وشو متر عادل کے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ دوسرے ہی مصرعہ میں یہ بات صاف ہو جاتی ہے جہاں پر.....

کارواں در کارواں ہے زندگی

استعمال کیا گیا ہے۔ مجموعی طور پر یہ نظم بہت پسند کی گئی اور اسی پر جلسہ کا اختتام ہوا۔

8 جون 1947ء

اردو ترقی پسند مصنفین کا اجلاس خواجہ احمد عباس کی صدارت میں منعقد ہوا۔

حاضرین: عصمت شاہد لطیف، سردار جعفری، مدھو سودھن، میراجی، وشو متر عادل، مجتبیٰ حسن، مدنی، کامل، جنید،

ہارون خوشتر، انیس احمد، اسد، ارشد، عالی جعفری، انیس گوالیاری، یوسف علی، اطہر سراج اور دوسرے اصحاب۔

میٹنگ سے شروع ہونے سے پہلے حمید اختر نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی مجلس عاملہ کے انتخاب کے لیے

مندرجہ ذیل نام پیش کیے۔

(1) کیفی اعظمی (2) انور (3) مدھو سودھن (4) رضیہ سجاد ظہیر (5) سلطانہ بیگم (6) قدوس صہبائی (7) احمد

علی (8) عالی جعفری (9) مجروح سلطانپوری (10) حمید اختر۔

خواجہ عباس نے دشوا متر عادل کا نام بڑھانے کی تجویز پیش کرتے ہوئے کہا کہ انجمن ترقی پسند مصنفین اور عوامی تھیٹر میں باہمی تعلق قائم رکھنے کے لیے ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم عوامی تھیٹر کے ہندوستانی سیکشن کے سیکرٹری کو انجمن کی مجلس عاملہ میں ضرور رکھیں۔ اس لیے دشوا متر عادل کا نام اس فہرست میں بڑھا دینا چاہیے چنانچہ یہ گیارہ نام با اتفاق رائے منظور کر لیے گئے۔

دوسری تجویز یہ پیش کی گئی کہ انجمن کے ممبروں سے سالانہ چندہ کی بجائے ماہوار چندہ مقرر ہونا چاہیے تاکہ ہر مہینے چندہ دینے سے تنظیم مضبوط ہو سکے اور ممبروں کو زیادہ سے زیادہ ذمہ داری کا احساس رہے چنانچہ یہ تجویز بھی منظور ہوئی اور انجمن کی ممبری کے لیے آٹھ آنے ماہوار چندہ مقرر ہوا۔

اس کے بعد سیکرٹری نے پچھلے ہفتے کی روداد پڑھی۔

دشوا متر عادل نے کہا کہ انہیں کارروائی پر اعتراض ہے۔ ان کا خیال تھا کہ پچھلی سے پچھلی میٹنگ میں جب جوش ملیح آبادی نے یہاں پر ایک نظم سنائی تھی، اس وقت انہوں نے جوش صاحب سے بعض ایسے جملے کہلوائے تھے جو وہ (عادل) سے کہلوانا چاہتے تھے مثلاً جوش صاحب نے عادل صاحب کے اس اعتراض پر کہ بالعموم جوش صاحب اتنی مشکل زبان لکھتے ہیں جو عوام سمجھ نہیں سکتے، یہ کہا تھا کہ ”میں خواص کا شاعر ہوں“۔ عادل صاحب نے کہا کہ ”سیکرٹری نے اس جملے کو چھوڑ دیا تھا حالانکہ یہ جملہ ہے جو میں استعمال کرنا چاہتا تھا“۔

انہوں نے یہ بھی کہا کہ ظ۔ انصاری کے متعلق پچھلی کارروائی میں ایک ایسا فقرہ تھا جو قابل اعتراض تھا اور جسے کاٹ دینے کا فیصلہ میٹنگ میں ہو گیا تھا مگر جب کارروائی چھپی تو یہ فقرہ اس میں موجود تھا۔ آخر میں انہوں نے کہا کہ اس فقرے پر میراجی نے اعتراض کیا تھا اور صدر کی مرضی سے اسے کاٹ دینے کا فیصلہ ہوا تھا مگر اس پر عمل نہیں ہوا جس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں کٹ پتلیاں سمجھا جاتا ہے وغیرہ کیونکہ اس کارروائی کے متعلق انہوں نے یہ بھی بتلایا کہ عادل صاحب کے دو تین فقرے چھپے نہیں حالانکہ میٹنگ میں جب یہ کارروائی سنائی گئی تو بتلادیا گیا تھا کہ یہ فقرے بڑھادیئے جائیں۔ سیکرٹری نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ میٹنگ میں جو کچھ بولا جاتا ہے اسے اس طرح یاد رکھنا یا نوٹ کرنا کسی طرح بھی ممکن نہیں۔ اس لیے اگر جوش صاحب کا فقرہ رہ گیا تو اسے اتفاق سمجھنا چاہیے۔ اس میں نیت پر شبہ کرنا صحیح نہیں ہے۔ ظ۔ انصاری کے متعلق اس جملے کے سلسلے میں سیکرٹری نے کہا کہ میٹنگ میں اس فقرے کے رکھے جانے یا کاٹے جانے کے متعلق فیصلہ خود ظ۔ انصاری پر چھوڑ دیا گیا تھا مگر وہ غیر جانبدار رہے، اس لیے یہ جملہ اس طرح رہنے دیا گیا کہ میٹنگ ختم ہونے پر وہ کارروائی دیکھ لیں اور اپنے جملے بڑھادیں مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ اس لیے ان کی کچھ باتیں شامل

ہونے سے رہ گئی ہیں۔

میراجی نے کہا کہ ظ۔ انصاری نے آخر میں اپنے متعلق اس فقرے کو کاٹ دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس لیے یہ صحیح نہیں ہے کہ وہ غیر جانبدار رہے تھے بلکہ میراجی کا خیال تھا کہ سیکرٹری کی جانبداری تھی۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ بالعموم رپورٹ میں تمام باتیں لکھی جاتی ہیں حتیٰ کہ غزل کا طویل مباحثہ بھی بالکل مکمل کر لیا گیا مگر جوش صاحب کا یہ جملہ چھوڑ دینا جانبداری ہی معلوم ہوتی ہے اور عام طور پر بعض خاص لوگوں کے جملے کارروائی میں شامل نہیں ہوتے۔

حمید اختر نے کہا کہ ایک بات اس سلسلے کی اور بھی ہے جو پہلے نہیں کہی گئی اور وہ یہ کہ کارروائی جب ”نظام“ میں چھپنے کے لیے جاتی ہے تو بعض اوقات جگہ کم ہونے کی وجہ سے ایڈیٹر اس میں سے ایسے حصے کاٹ دیتا ہے جن سے بظاہر کوئی فرق نہیں پڑتا اور چونکہ ”نظام“ ایڈیٹر اس میں سے ایسے حصے کاٹ دیتا ہے جن سے بظاہر کوئی فرق نہیں پڑتا اور چونکہ ”نظام“ ہمارا آفیشیل پرچہ نہیں ہے اس لیے ہم اس کا کوئی علاج نہیں کر سکتے۔ دوسری بات یہ بھی ہے کہ یہاں پر بسا اوقات بعض لوگ صاحب صدر کے توسط سے نہیں بلکہ ایک دوسرے سے خود بخود بحث کرنے لگتے ہیں جس کی وجہ سے لکھنے میں الجھن پیدا ہوتی ہے۔ و شوا متر عادل نے کہا کہ ایڈیٹر ”نظام“ اگر ہماری کارروائی اس شکل میں نہیں چھاپتا جس شکل میں دی جاتی ہے تو کارروائی اس میں نہیں چھپی چاہیے۔ ایڈیٹر کو یہ حق نہیں کہ وہ ہماری مرضی کے بغیر اس میں سے کچھ کاٹ دے۔

آخر میں خواجہ احمد عباس نے کہا کہ یہاں پر جو جملوں کے متعلق بحث ہو رہی ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ ظ۔ انصاری کے متعلق اگر یہ لکھ دیا جاتا ہے کہ سب کی نظریں ان کی طرف اٹھ گئیں تو یہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ خود ان کے متعلق اگر کوئی ایسا جملہ لکھ دیا جائے تو انہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ ایسے فقروں سے کارروائی دلچسپ ہو جاتی ہے۔ سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے انہوں نے کہا کہ اس قسم کی رپورٹ لکھنا بہت مشکل کام ہے۔ یہ میرا ذاتی تجربہ ہے کیونکہ میں خود لکھتا رہا ہوں۔ اس لیے اس میں سیکرٹری کو تھوڑا سا اختیار دے دینا چاہیے اور اگر کبھی کوئی جملہ چھوٹ جائے تو اسے معاف بھی کر دینا چاہیے کیونکہ اعتراض کرنا بہت آسان ہے مگر لکھنا بہت مشکل ہے۔ ایسی صورت میں جو لوگ زیادہ اعتراض کرتے ہیں وہ ایک دو دفعہ خود کارروائی لکھ کر دیکھیں گے تو انہیں اس بات کی صداقت کا یقین ہو جائے گا۔

آخر میں انہوں نے ”نظام“ میں کارروائی نہ دینے کے متعلق کہا کہ یہ فیصلہ کسی طرح بھی درست نہیں ہوگا۔ کوئی ایڈیٹر ایسا نہیں ہے جو مضامین میں کتر بیونت کرنے کا حق چھوڑ دے۔ ایڈیٹر کو اس بات کا پورا اختیار ہوتا ہے کہ وہ مضامین کو پرچے اور ایڈیشنک کے لحاظ سے کتر بیونت کر کے چھاپے۔ اس حالت میں جبکہ ”نظام“ ہمارا آفیشیل پرچہ نہیں ہے، یہ

اس کے ایڈیٹر اور مالک کی مہربانی ہے کہ وہ ہماری کارروائی چھاپتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ قدوس صاحب ہمارے ممبر ہیں اور ہم بعض باتوں کے لیے انہیں مجبور کر سکتے ہیں۔

خواجہ احمد عباس نے کہا کہ کارروائی زور کے کا فیصلہ بالکل غلط ہے کیونکہ لوگ اسے بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ انہوں نے اپنا تجربہ بیان کرتے ہوئے کہا کہ پچھلے دنوں جب وہ لاہور میں تھے تو محض یہ رپورٹ پڑھنے کے لیے ”نظام“ کا انتظار کرتے تھے اور کئی کئی میل چل کر پرچہ ڈھونڈتے پھرتے تھے۔ اسی طرح بے شمار لوگ ایسے ہیں جو اس کو پڑھتے ہیں۔ اس لیے اس کو اسی طرح چھپنا چاہیے۔

پروگرام کے مطابق اب وشوا متر عادل کو ایک نظم سنانی تھی۔

نظم شروع کرنے سے پہلے انہوں نے بتایا کہ اس نظم کا ایک کریکٹر مانجھی ہے جو اپنی اقتصادی مجبوریوں کی وجہ سے پردیس جاتا ہے، دوسرا کریکٹر اس کی بیوی ہے۔ مانجھی زندگی کی جدوجہد کا عکس ہے اور اس کی بیوی سماجی نا انصافیوں کا Symbol ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس نظم میں جو بند مانجھی سے شروع ہوتا ہے وہ مانجھی کی بیوی کے خطوط ہیں اور جو بند ”ہی ہو ہی ہو ہی ہو“ سے شروع ہوتا ہے وہ مانجھی کا ترانہ ہے۔

نظم سننے کے بعد مجروح سلطانپوری نے کہا کہ نظم کے آخری بند میں ”لال سویرا“ کے ٹکڑے کارجائی پہلو غیر متوقع طور پر آجاتا ہے۔ اس لیے اچھا نہیں معلوم ہوتا اور باہر کی چیز معلوم ہوتی ہے۔

محمد صفدر نے کہا کہ یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ جہاں بھی مانجھی کا گیت ہے اس میں اس Motive کی ترجمانی شروع ہو جاتی ہے۔ اس لیے یہ بالکل غیر متوقع نہیں۔

سردار جعفری نے کہا کہ مانجھی کے گیت میں شروع سے آخر تک ایک تسلسل ہے اور اس میں رجائیت کا پہلو موجود ہے۔ بیچ بیچ میں جو اس کی بیوی کے خطوط کے ٹکڑے آتے ہیں ان میں رجائیت کا پہلو پیش ہے مگر مانجھی کے گیت میں شروع سے لے کر آخر تک موجود ہے۔

سلطانہ بیگم نے کہا کہ عادل صاحب نے ”جیتتی جی ہی مر جاتی ہوں“ دو جگہ دو مختلف معنوں میں استعمال کیا ہے۔ پہلا استعمال ٹھیک معلوم ہوتا ہے لیکن جب مانجھی کی بیوی بنگلے والے کی آنکھیں دیکھتی ہے اور پھر بھی ”جیتتی جی مر جاتی ہوں“ کہتی ہے تو اچھا معلوم نہیں ہوتا۔

عصمت شاہد لطیف نے کہا کہ پہلے حصے میں جدائی کی وجہ سے کہتی ہے اور دوسرے حصے میں شرم کی وجہ سے اور یہ دونوں جگہ معلوم ہوتا ہے۔

خواجہ احمد عباس نے بھی کہا کہ یہ اچھا معلوم ہوتا ہے۔

مدھوسودھن نے جیون ناؤ کی ترکیب پر اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ جیون سنسکرت کا لفظ ہے اور ناؤ ہندوستان کا اس لیے یہ ترکیب صحیح نہیں ہے۔ یہاں ”جیون نیا“ ہونا چاہیے۔

سردار جعفری نے کہا کہ ان کے خیال میں ”جیون نیا“ استعمال نہیں ہونا چاہیے کیونکہ یہ ہر ہندوستانی فلم میں اس بری طرح استعمال ہوا ہے کہ وہ بہت گھٹیا معلوم ہونے لگا ہے۔ اس لیے جیون ناؤ ہی رہے تو اچھا ہے۔

مدھوسودھن: مگر یہ ترکیب غلط ہے۔

سردار جعفری: اگر کانوں کا اچھا معلوم ہو تو یہ پابندی ضرورت پڑنے پر توڑی بھی جاسکتی ہے۔ خود انشاء نے دریائے چاندنی استعمال کیا ہے۔

سردار جعفری نے کہا کہ انہیں ایک مصرعہ کے متعلق شبہ ہے۔ اگرچہ یقین نہیں ہے کیونکہ یہ بحر ہی ایسی ہے کہ بسا اوقات پتہ نہیں چلتا۔

ہاں دوپہ کو ڈاک کا ہر کارہ آتا ہے

ان کا خیال تھا کہ اس مصرعہ میں (ہ) گرتی ہے۔

مگر مجروح سلطانپوری اور میراجی کا خیال تھا کہ (ہ) نہیں گرتی اور مصرعہ درست ہے۔ خواجہ احمد عباس نے کہا کہ ن ظم انہیں بہت پسند آئی مگر یہ مصرعہ غیر شاعرانہ معلوم ہوتا ہے.....

ہاتھ وہی ہے، پاؤں وہی ہے، آنکھ وہی ہے، کان وہی ہے

عصمت شاہد لطیف نے کہا کہ مانجھی کی بیوی ایک خط میں لکھتی ہے.....

ان سکوں سے تیری پیار کی یاد آتی ہے

یہاں پر وہ پیار کو سکوں میں تولتی ہے یعنی اگر پیسے آنے بند ہو گئے تو محبت ختم ہو جائے گی چنانچہ اس طرح وہ بعد میں کوٹھی میں چلی جاتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس مصرعہ کے بعد اس عورت سے ہمدردی نہیں ہوتی۔

عادل: یہ کشمیر کا ایک اصلی واقعہ ہے اور اسی طرح ہوا تھا۔

سعید انیس احمد کا خیال تھا کہ اگر وہ سکے نہیں بھیجتا تو اچھا شو ہر نہیں ہے۔

میراجی نے کہا کہ نظم کے اس نکتے کو غلط سمجھا رہا ہے۔ پلاٹ یہ ہے کہ جب سکے اس کی بیوی کو ملتے ہیں تو اس کا

پیاری یاد آتا ہے اور وہ سوچتی ہے کہ وہ پردیس میں اس کا کتنا خیال رکھتا ہے۔

وشوا متر عادل نے کہا:..... ”مجروح کا اعتراض غلط ہے کیونکہ باجی کا کردار میں شروع سے رجائیت ہے۔“
مجروح: مگر مجھے تو کھلتا ہے۔

عادل: تو پھر کیسے لکھا جائے؟

مجروح: اس طرح سے کہ کھٹکے نہیں یا پھر مجھے دیجیے..... میں لکھ دوں گا۔

مگر عادل صاحب نے یہ تجویز منظور نہیں کی کیونکہ ان کے خیال میں مجروح ایسی نظم بالکل نہیں لکھ سکتے تھے۔

وشوا متر عادل نے سلطانہ بیگم سے پوچھا..... ”آپ کے اعتراض کا جواب تو مل چکا ہے۔“

سلطانہ بیگم: ہاں ہاں! مل گیا ہے۔

عادل: آپ تو ایسے کہہ رہی ہیں جیسے کسی مصیبت سے نجات مل گئی ہے۔

صاحب صدر نے فوراً کہا کہ سیکرٹری صاحب اگر دو گلاس پانی کا انتظام کر دیا کریں جو وقتاً فوقتاً مجروح اور عادل

کو پیش کر دیا جائے تو بہت اچھا ہوگا۔

کسی ستم ظریف نے پانی کے دو گلاس صاحب صدر کے سامنے رکھ دیئے مگر وشوا متر عادل دونوں گلاس پی گئے۔

پانی پی کر وشوا متر عادل نے کہا..... ”اس میننگ میں جو چیزیں پڑھی جاتی ہیں، ان کی خوبیاں بھی بیان کی جاتی

ہے۔ کیا یہ پابندی میری نظم پر عائد نہیں ہوتی؟“

سلطانہ بیگم نے کہا..... ”آپ کی نظم بہت اچھی ہے۔“

شاہد لطیف: بڑی خوبی تو یہ ہے کہ سمجھ میں آ جاتی ہے۔

سلطانہ: آپ کی شاعری کے اس موڑ کی وجہ سے آپ سے توقعات بڑھ گئی ہیں۔

سردار جعفری: اور آپ کی اس نظم میں وہ انفرادی گھٹن بھی نہیں ہے جو اب تک آپ کی شاعری میں موجود تھی۔

وشوا متر عادل نے ٹوکتے ہوئے کہا..... ”مجھے اعتراض ہے.....“

صاحب صدر نے احتجاجی لہجہ میں عادل صاحب سے سردار جعفری کی پوری بات سننے کی درخواست کی۔

سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے سردار جعفری نے کہا..... ”عادل کی اس نظم میں زندگی ہے، ایسی زندگی جو شاعر

کے سینے سے باہر ہے۔ اس لیے اس میں رجائیت بھی آگئی ہے۔“

آخر میں سردار جعفری نے کہا..... ”مختصر سی ایک بات اور مجھے کہنی ہے اور وہ یہ کہ آج کل آزاد شاعری میں عام طور

پر دو بحر ہیں یعنی ایک تو..... الٹی ہو گئیں سب تدبیریں، کچھ نہ دوانے کام کیا..... اور دوسری اقبال کے شکوے کی بحر۔

ہمارے یہاں نوے فیصدی شاعران ہی بحروں میں کہہ رہے ہیں۔ چونکہ ایک بحر کی وجہ سے ایک خاص قسم کے الفاظ ہی استعمال ہوتے ہیں اس لیے ڈکشن کم ہو جاتی ہے۔ عادل کی اکثر نظمیں بھی اسی بحر میں ہیں۔ وہ اگر دوسری بحروں میں لکھنے کی کوشش کریں تو اس سے ان کی شاعری میں تنوع پیدا ہو جائے گا۔

و شوا متر عادل نے کہا کہ ان کی ساٹھ ستر نظموں میں سے صرف تین چار نظمیں ہی اس بحر میں ہیں۔ باقی دوسری بحروں میں ہیں۔ سردار کو اس معاملے میں غلط نہیں ہے۔

محمد صفدر نے کہا کہ عادل کے متعلق یہ کہنا کہ یہ نظم انہوں نے اپنی ذات سے علیحدہ ہو کر لکھی ہے، غلط ہے۔ انہوں نے اور بھی بہت سی نظمیں کہی ہیں جن میں انہوں نے دوسرے لوگوں اور خارجی زندگی کے متعلق کہا ہے۔ مثلاً ان کی نظم.....

یہ میں اور تو عناصر کے ایندھن کی چنگاریاں
سردار جعفری: مگر اس نظم میں بھی انفرادی گھٹن ہے۔
محمد صفدر: مگر موضوع انفرادی گھٹن نہیں ہے۔

سردار: اس نظم میں بھی ایک فرد اپنی انفرادیت دوسرے کی انفرادیت سے ٹکراتا ہے۔ یہ بجائے خود گھٹن ہے۔ یہ چیز فیض اور مجاز کے ہاں بھی موجود ہے۔

میراجی نے کہا ”سردار جعفری نے کہا کہ جب تک خارجی احساسات موجود نہ ہوں، نظم میں یا شعر میں انفرادی گھٹن موجود رہتی ہے۔ سردار جعفری ذرا اس کی وضاحت کر دیں کیونکہ میرے خیال میں داخلیت سے شدت بڑھ جاتی ہے۔“
سردار جعفری: میرا اعتراض یہ نہیں ہے کہ داخلیت نہیں ہونی چاہیے کیونکہ داخلیت کے بغیر شاعری ممکن نہیں ہے۔ میرا کہنا یہ ہے کہ داخلیت کو موضوع نہیں بنانا چاہیے۔

میراجی: فیض کی ”چند روز“ اور ”میری جان“ کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

سردار جعفری نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ کچھ ہمارے داخلی اور ذاتی تجربے ایسے ہوتے ہیں جو بہت عام ہیں اور کچھ عام نہیں ہوتے۔ فیض کی نظم میں درمیانی طبقے کے ایک عام تجربے کو پیش کیا گیا ہے۔ خواجہ احمد عباس نے کہا کہ عادل کی شاعری کے متعلق فیصلہ تمام نظمیں دیکھ کر کیا جاسکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ نظم کا موضوع انفرادی گھٹن ہو مگر نظم میں انفرادی گھٹن موجود نہ ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سلطانہ بیگم نے عادل کی صرف دو ہی نظمیں پڑھی ہوں۔ اس حالت میں ان کی شاعری سے متعلق عام رائے دینا صحیح نہیں ہے۔ اس لیے غلط نہیں پیدا ہونے کا امکان ہے۔

سلطان بیگم نے کہا کہ انہوں نے عادل صاحب کی صرف پانچ چھ نظمیں پڑھی ہیں۔ پروگرام کے مطابق اس ظ۔ انصاری کو ایک مضمون پڑھنا تھا مگر چونکہ وقت بہت ہو چکا تھا، اس لیے اگلے ہفتے کے لیے ملتوی کر دیا گیا اور مجروح نے سلطانی پوری نے ایک غزل پڑھی۔

ظ۔ انصاری نے کہا..... ”حسب معمول مجروح سلطانی پوری صاحب کی غزل بہت پاکیزہ ہے۔ اس میں ایک شعر.....

ہماری راہ میں آئے ہزار میخانے
بھلا سکے نہ مگر زیت کے قرینوں کو

دوسرے مصرعہ ”بھلا سکے نہ مگر زیت کے قرینوں کو.....“ سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ میخانے کے پاس بھی نہ بھٹکتا زیت کا قرینہ ہے حالانکہ میکدے کے پاس بھٹکتا ہی زیت کا قرینہ ہے۔

مجروح سلطانی پوری نے کہا کہ اگر یہ ایک ہی شعر ہوتا تو یہ مفہوم نکلتا تھا مگر پورا واقعہ پڑھنے سے مفہوم واضح ہو جاتا ہے جو یہ ہے.....

ہماری راہ میں آئے ہزار میخانے
بھلا سکے نہ مگر زیت کے قرینوں کو
کبھی نظر نہیں اٹھائی سوئے بادۂ ناب
چڑھا گئے کبھی پگھلا کے آبکیوں کو

خواجہ احمد عباس نے کہا کہ پورے قطعے سے یہی مفہوم نکلتا ہے کہ میخانے کے اندر گئے بھی لیکن زیت کے قرینوں کو نہ بھلا سکے۔ میراجی کا خیال بھی یہی تھا کہ دونوں شعروں سے مفہوم واضح ہو جاتا ہے یعنی یہ کہ جب پینے کا موقع ہوتا ہے، پیتے ہیں..... جب نہیں ہوتا، نہیں پیتے۔

خواجہ احمد عباس: اس کا اقتصادی تجزیہ بھی ہو سکتا ہے یعنی کہ جب پیسے ہوتے ہیں تو پی لیتے ہیں جب نہیں ہوتے تو نہیں پیتے۔

ظ۔ انصاری نے ایک اور اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ ”زیت کے قرینے نہیں بھولے“ اچھا نہیں معلوم ہوا۔ اس کی بجائے ہونا چاہیے کہ بادہ نوشی کے قرینے نہیں بھولے۔

مجروح سلطانی پوری نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا..... ”بادہ نوشی کا قرینہ تو یہ ہے کہ خوب پی جائے۔“

صاحب صدر نے وشوا متر عادل سے کہا کہ وہ بھی غزل کے متعلق کچھ فرمائیں۔ وشوا متر عادل نے کہا کہ وہ کچھ نہیں کہیں گے کیونکہ غزل بہت مشکل صنف ہے اور اس پر رائے دینے کے لیے تمام روایتی ادب پڑھنا پڑتا ہے۔ میراجی نے کہا کہ مجھے غزل کے اس شعر کی تعریف کرنی ہے.....

شراب ہو ہی گئی بقدر پیمانہ
بہ عزم ترک نچوڑا جب آستینوں کو

..... اس شعر میں ایک نفسی کیفیت بہت خوبصورت سے بیان کی گئی ہے image کے لحاظ سے بھی بہت خوبصورت شعر ہے اور نپے تلے لفظوں میں بیان کیا گیا ہے۔

آخر میں صاحب صدر نے کہا: چند آدمیوں کے علاوہ باقی لوگ بحث میں حصہ نہیں لیتے، یہ ٹھیک نہیں ہے۔ مجروح، عادل اور ظ۔ انصاری کے علاوہ بھی تو دوسرے لوگوں کو بحث میں حصہ لینا چاہیے۔ مدھوسودھن: مگر یہ تبھی ممکن ہے جب لوگ کم بولیں۔

صاحب صدر نے مجلس برخواست کرنے سے پہلے یہ بھی کہا کہ میٹنگ میں سب لوگوں کو پوری طرح حصہ لینا چاہیے اور نئے لکھنے والوں کو برابر یہاں پر پڑھنا چاہیے۔ اگر ہم نئے لکھنے والے پیدا نہیں کریں تو ہمارا مقصد پورا نہیں ہوگا اور علاوہ ازیں ہمیں بھی زیادہ سے زیادہ لکھنا چاہیے۔

22 جون 1947ء

اردو ترقی پسند مصنفین کا یہ اجلاس مدھوسودھن کی صدارت میں منعقد ہوا۔

حاضرین: عصمت شاہد لطیف، شاہد لطیف، سردار جعفری، ساحر لدھیانوی، کیفی اعظمی، اختر الایمان، خواجہ احمد عباس، ظ۔ انظاری، عالی جعفری، مجتبیٰ حسن، آوارہ، رفیق گوالیاری، افتخار، امجد حسین، جعفرانی، عصمت جاوید، سعید انیس احمد، جنید احمد، طبیب بخاری، عطا الرحمن اور دوسرے اصحاب۔

میٹنگ شروع ہونے سے پہلے حمید اختر نے پچھلے اجلاس کی کارروائی پڑھ کر سنائی۔ اس کے بعد افتخار سلیمی نے ایک نظم سنائی جو کافی پسند کی گئی۔

پروگرام کے مطابق اب عصمت شاہد لطیف کو اپنا مضمون جو انہوں نے اسرار الحق مجاز کے متعلق لکھا تھا، سنانا تھا مگر معلوم ہوا کہ ان کا مضمون سردار جعفری پڑھ کر سنائیں گے.....

مضمون شروع کرنے سے پہلے سردار جعفری نے بتلایا کہ کتب پبلشرز، بمبئی سے بارہ شاعروں اور بارہ افسانہ

نگاروں پر کتابوں کا ایک سیٹ شائع کیا جا رہا ہے۔ یہ مضامین ان ادیبوں کے فن سے زیادہ ان کی ذاتی زندگی سے متعلق ہوں گے اور جس ادیب کو کسی دوسرے ادیب کی زندگی سے زیادہ واقفیت ہے، اسی کا انتخاب مضمون لکھنے کے سلسلے میں کیا گیا ہے چنانچہ یہ مضمون بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ انہوں نے یہ بھی بتلایا کہ سعادت حسن منٹو اور کرشن چندر کے مضامین بھی مکمل ہونے والے ہیں وہ اور دوسرے تمام مضامین وقتاً فوقتاً سنائے جایا کریں گے۔

سردار جعفری نے حاضرین کو اس بات کی اجازت بھی دے دی کہ اگر وہ مضمون کی طوالت سے اکتا جائیں تو صدر کو اطلاع کر دیں، مضمون کو وہیں پر ختم کر دیا جائے گا۔ انہوں نے مضمون پڑھنا شروع کیا تو لوگوں نے شور مچایا کہ عصمت اور مجاز کو جو پچھلے کونوں میں بیٹھے ہوئے تھے، سامنے بٹھایا جائے۔ چنانچہ صاحب صدر کی درخواست پر یہ دونوں سردار جعفری کے برابر میں بیٹھ گئے۔

مضمون کافی طویل تھا اور انتہائی دلچسپ بھی۔ ان دلچسپ جملوں پر سب لوگ خط اٹھا رہے تھے مگر مجاز کرسی پر بیٹھے جھینپتے رہے۔ ہر تیسرے جملے پر لوگوں کی نظریں مجاز پر پڑتی تھی اور وہ گھبرا کر سگریٹ کا ایک لمبا کش کھینچتے اور دھواں چھوڑنے کے بہانے سے آنکھیں بند کر لیتے۔

مضمون کی دلچسپی کی وجہ سے اس کی طوالت سے کوئی اکتایا نہیں۔ مضمون ختم ہونے پر صاحب صدر نے مجاز صاحب سے سب سے پہلے پوچھا کہ انہیں کوئی اعتراض ہو تو بتلا دیں۔ اسرار الحق مجاز نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا..... ”اس مضمون میں میرے پینے کا جو ذکر کیا گیا ہے اس پر تو مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن ایک جگہ پی کر میرے قے کرنے کا ذکر بھی ہے، یہ غلط ہے اور رندی کی توہین بھی ہے۔ اس لیے اس جملے کا کاٹ دیا جائے تو بہتر ہے۔“

عصمت شاہد لطیف نے اس واقعے کی صحت کا یقین دلایا اور فقرہ ویسے ہی رہا۔

ظ۔ انصاری صاحب نے یہ اعتراض کیا کہ عصمت نے کئی جگہ ”آپ دیکھیں گے“ لکھا ہے۔ ان کو ”آپ دیکھیں گی“ لکھنا چاہیے۔ اس لیے کہ مردوں کو مخاطب کر کے لکھنے کے لیے بہت سے مرد ہیں۔ عورتوں نے چونکہ کم لکھا ہے اس لیے لکھنے والیوں کو یہ موقع ہاتھ سے نہیں دینا چاہیے۔

عصمت نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا..... ”آپ دیکھیں گے“ میں مرد عورتیں دونوں شامل ہیں۔“

اختر الایمان: اگر زیادہ وضاحت کی ضرورت ہے تو آدھے مضمون میں آپ دیکھیں گے لکھ دیجیے اور آدھے

مضمون میں آپ دیکھیں گی..... (تہنہ)

ظ۔ انصاری نے دوسرا اعتراض کرتے ہوئے عصمت شاہد لطیف سے پوچھا کہ آپ نے ذومعنی لفظ دو معنی کے لیے استعمال کیا ہے؟ اگر ایسا ہے تو یہ صحیح نہیں ہے۔

عصمت: دو معنی کے لیے میں نے دو دھارے فقرے استعمال کیے ہیں۔ ذومعنی میں میں نے معنی والا یا معنی دار فقرے کے لیے استعمال کیا ہے۔

ظ۔ انصاری: پھر تو ٹھیک ہے۔

آخر میں مجروح سلطانپوری نے اپنی نئی غزل سنائی۔ غزل بہت اچھی تھی اور حاضرین نے بے انتہا پسند کی۔
ظ۔ انصاری نے کہا کہ مجروح کی تازہ غزلوں میں فارسی کی ترکیبیں بہت بڑھ گئی ہیں۔ یہ چیز ان کے لیے اچھی نہیں۔ خصوصاً موجودہ حالات میں جب ہندوستان کے ایک بڑے حصے میں اردو کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔
مجروح سلطانپوری نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ ان کی تمام غزلوں میں ایسا نہیں ہے بلکہ صرف اس غزل میں یہ چیز ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے قافیے اور ردیف ہی ایسے ہیں۔
خواجہ احمد عباس نے کہا کہ مجروح کی یہ غزل بہت خوبصورت ہے۔
مجاز:..... اور غزل کی روایتی خوبصورتی اس میں موجود ہے۔

29 جون 1947ء

اردو ترقی پسند مصنفین کا یہ اجلاس شاہد لطیف کی صدارت میں منعقد ہوا۔

حاضرین: عصمت چغتائی، سجاد ظہیر، خواجہ احمد عباس، اسرار الحق مجاز، ساحر لدھیانوی، مجروح سلطانپوری، رفیق گوالیاری، کامل القادری، چھاری بیگم، یوسف اور دوسرے اصحاب۔

پچھلی میٹنگ کی روداد سنائی جانے کے بعد ظ۔ انصاری نے اپنا مقالہ ”غزل ساتھ نہیں دے سکتی“ پڑھا۔
سجاد ظہیر نے کہا کہ انہیں کچھ تاریخی اعتراضات ہیں مثلاً یہ کہ ظ۔ انصاری صاحب نے لکھا ہے کہ سعدی کا دور حافظ کے دور کے مقابلے میں کم انتشار کا دور تھا۔ یہ غلط ہے بلکہ واقع اس کے برعکس ہے کیونکہ سعدی کے زمانے میں ہلاکو کا فتنہ بڑا فتنہ تھا جو اس زمانے میں ہٹلر کو چھوڑ کر دنیا کا سب سے بڑا فتنہ تھا۔ حافظ کے زمانے میں حالات اس سے کم خراب تھے۔

ظ۔ انصاری نے اب کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ ہلاکو کا حملہ تاتاریوں کا پہلا حملہ تھا۔ اس وقت تک ایرانی حکومت کی بنیادیں نہیں ملی تھیں۔ اس کے بعد سے ایران کی طاقت برابر زوال پذیر ہوتی گئی۔ حتیٰ کہ حافظ کے زمانے میں

چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہو گئے تھے اور شیراز کی آٹھ حکومتیں قائم ہو گئی تھیں۔

سجاد ظہیر نے کہا کہ یہ ایک تاریخی واقعہ ہے اور اس کی باقاعدہ سند پیش کی جاسکتی ہے کہ زوال تاتاریوں کے حملے سے پہلے شروع ہو چکا تھا اور ہلاکو کے حملے سے اسے شدید دھچکا لگا۔ سعدی اس حملے کے بعد تک زندہ رہے۔ اس زمانے میں شہر کے شہرتابہ ہو چکے تھے چنانچہ سعدی اس سے بہت متاثر تھے۔ خصوصاً بغداد کی شکست کا تو انہیں بہت ہی ملال تھا۔ اس کے علاوہ سمرقند و بخارا بھی تباہ ہو رہے تھے چنانچہ یہ پورا دور انتہائی مصیبت اور تباہی کا دور تھا۔

ظ۔ انصاری: میں نے یہی لکھا ہے کہ انتشار حافظ کے زمانے میں عروج پر تھا۔ یہ تو نہیں لکھا کہ سعدی کے زمانے میں نہیں تھا۔

سجاد ظہیر: آپ کے ان جملوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حافظ کے زمانے میں چونکہ انتشار زیادہ تھا اس لیے اس کی شاعری میں بھی زیادہ ہے اور سعدی کے زمانے میں چونکہ کم ہے، اس لیے ان کی شاعری میں بھی کم ہے۔

ظ۔ انصاری: میں نے یہ بتلایا ہے کہ غزل کن ادوار سے گزری اور اس پر وہ چیزیں کس طرح اثر انداز ہوئیں مثلاً سعدی نے قاضی اور محتسب پر حملے کیے کیونکہ یہ چیزیں سامنے کی تھیں اور بعد میں یہ ہماری شاعری کا ایک حصہ بن گئیں۔ اس طرح حافظ کے ہاں وحدت الوجود، فنا کا شعور، فرار اور انفرادیت ہے جو سعدی کے زمانے کے بعد آئیں۔

سجاد ظہیر نے اب کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ مادی حالات کے اثر انداز ہونے کا آپ نے کہا ہے مگر اس میں کچھ اور چیزیں بھی ہوئیں مثلاً یہ کہ ایک ہی عہد میں دو مختلف قسم کے شاعر بھی ہو سکتے ہیں چنانچہ سعدی اور حافظ کے حالات تقریباً یکساں تھے۔ بنیادی چیزیں تقریباً یکساں تھیں مگر اس کے باوجود کچھ چیزوں میں فرق ہے۔

ایک اور جملے پر اعتراض کرتے ہوئے سجاد ظہیر نے کہا کہ ظ۔ انصاری صاحب نے دہلی اور لکھنؤ سکول کا جو ذکر کیا ہے وہ روایت غلط بیانی ہے جس کو دہرایا گیا ہے کیونکہ دہلی اسکول میں بھی ابتدائی مبتذل شاعری نظر آتی ہے اور لکھنؤ میں بھی شروع کے زمانے میں اچھی شاعری کے نمونے ملتے ہیں یعنی اچھی اور بری دونوں قسم کی چیزیں موجود ہیں۔

ظ۔ انصاری: مگر اب ہم رجحان دیکھیں گے۔

سجاد ظہیر: غالب اور مومن کے سوا دہلی میں بھی کون ملتا ہے؟

ظ۔ انصاری: غالب، مومن اور شیفتہ کے ہاں بھرا ہوا رجحان ہے۔

سجاد ظہیر: آپ کا مطلب یہ ہے کہ لکھنؤ میں آتش اور انیس کا پیدا ہونا اتفاقی امر تھا۔

ظ۔ انصاری نے کہا کہا آتش کا رنگ تو انفرادی ہے۔

سجاد ظہیر نے کہا..... ”یعنی وہ اتفاق سے پیدا ہو گئے تھے، یہ غلط ہے۔ اچھے شاعر دہلی اور لکھنؤ میں موجود تھے اور برے بھی دونوں جگہ موجود رہے ہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں جو لکھنؤ اور دہلی دونوں جگہ سے تعلق رکھتے ہیں..... مثلاً میر“۔
مجروح سلطانپوری جواب تک خاموش تھے، بولے..... ”مگر میر لکھنؤ آنے سے پہلے اپنی ایک حیثیت بنا چکے تھے“۔

خواجہ احمد عباس نے ظ۔ انصاری کے اس خیال سے اختلاف کا اظہار کیا کہ غزل اجتماعی تاثرات کے لیے اور نظم انفرادی خیالات کے لیے موثر اصناف ہیں۔

ظ۔ انصاری نے اپنے جملے کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ اس سے ان کی مراد یہ تھی کہ غزل میں کہنے والا اور سننے والا ساتھ ہوتے ہیں مثلاً حسرت کے ہاں ”کوٹھے پہ آنا یاد ہے“ ایک انفرادی تجربہ ہے لیکن پڑھنے یا سننے والے برابر کے شریک ہوتے ہیں۔

سجاد ظہیر نے کہا کہ نظم کے لیے ”انفرادی تاثرات بیان کرنے کا ذریعہ“ استعمال کرنا کسی طرح بھی ٹھیک نہیں ہے۔
شاہد لطیف نے ظ۔ انصاری سے پوچھا کہ انہوں نے اپنے مضمون میں فانی کا ذکر کیوں نہیں کیا؟
ظ۔ انصاری نے سادگی سے جواب دیا..... ”میں بھول گیا“۔

سجاد ظہیر نے کہا کہ ظ۔ انصاری نے غزل میں ابتداء کے پہلو کا سبب بیان نہیں کیا۔

ظ۔ انصاری نے کہا کہ وہ نظم میں بھی موجود ہے مثلاً ریختی میں ہے۔

محمد مہدی: مگر یہ سوال کا صحیح جواب تو نہیں۔

سجاد ظہیر: مگر غزلوں کے زیادہ تر اشعار خراب ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ اساتذہ کے بھی کچھ شعر اچھے ہوتے ہیں بقیہ گھٹیا ہوتے ہیں۔

مجروح سلطانپوری نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا..... ”جس طرح نظموں کے مجموعوں میں اچھی نظمیں کم

اور بری زیادہ ہوتی ہیں، اسی طرح غزلوں میں اچھے شعر کم اور برے زیادہ ہوتے ہیں“۔

سجاد ظہیر نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ شیکسپیر کا زیادہ کلام اچھا ہے مگر میر کا زیادہ کلام بے ہودہ ہے۔

ظ۔ انصاری: یہ پرانی بات ہے۔

حمید اختر: مگر شیکسپیر تو اس سے بھی پرانا ہے اور آج کل کے غزل گوؤں میں جگر کوہی لے لیجیے۔ اس کے ہاں بھی

یہی چیز ہے۔

خواجہ احمد عباس نے ظ۔ انصاری سے پوچھا کہ وہ اس بات کو تسلیم کریں گے کہ غزل نے فرسٹریشن پیدا کی ہے؟
ظ۔ انصاری: میں یہ کہوں گا کہ فرسٹریشن ن غزل پیدا کی۔۔

احمد عباس: مگر غزل گو شعراء ہمیشہ قنوطیت پسند رہے اور پچھلے سو سال میں نظم گو شعراء نے آگے بڑھتی ہوئی زندگی کا سہت دیا..... غزل گوؤں نے نہیں۔ حسرت حالانکہ سیاسی زندگی میں ترقی پسند ہیں مگر غزل میں روایتی انداز اپناتے ہیں۔

یکم جولائی 1947ء

اردو ترقی پسند مصنفین کا یہ اجلاس پطرس بخاری کی صدارت میں منعقد ہوا۔

حاضرین: کرشن چندر، سردار جعفری، کیفی اعظمی، زیڈ۔ اے۔ بخاری، مدھو سو دھن، میراجی، وشوا متر عادل، مجروح سلطانپوری، ظ۔ انصاری، رضیہ سجاد ظہیر، سلطانہ بیگم، شوکت ہارون خوشتر، رفیق گوالیاری، رفعت سروش، اداکار سعید، انیس احمد، محمد حسین جعفرانی، مدنی، خلش عبدالقادر، جنید احمد، عبدالعزیز، عبداللطیف اور صابر۔

میٹنگ شروع ہونے پر سردار جعفری کو ایک مقالہ ”اقبال، اس کے سیرت نگار اور نقاد“ کے عنوان سے سنانا تھا۔ مقالہ شروع کرنے سے پہلے انہوں نے بتایا کہ یہ مقالہ ان کی زیر طبع کتاب ”اقبال اور اس کا پس منظر“ کا ایک باب ہے۔ انہوں نے یہ بھی بتلایا کہ اقبال پر جو کلام کیا گیا ہے اس میں بہت سی خامیاں ہیں۔ ابھی کئی ایسے اور پہلو اقبال کی زندگی اور شاعری کے موجود ہیں جن پر صحیح طریقے سے کام کیا جاسکتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اقبال کی ذاتی اور جذباتی زندگی کے متعلق بہت سی باتیں معلوم نہیں ہو سکیں۔ کچھ ایسے لوگ ہیں جن کو ان کی اس زندگی کے متعلق بہت کچھ معلوم ہے مگر انہوں نے اسے جان بوجھ کر دبا دیا ہے۔ ان کے سیرت نگاروں نے اقبال کو اس طرح پیش کیا ہے کہ:

(1) قوم پرستوں نے اقبال کی رچکت پسند ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر سہنی کی کتاب اس کا ثبوت ہے۔

(2) لیگ والوں نے اقبال کو پیغمبر بنا دیا ہے اور ان کو اسلامی شاعر بنا کر قومیت اور وطنیت کا دشمن ثابت کیا جاتا ہے۔

(3) اس کے علاوہ ان کو اشتراکیت کا دشمن کہا جاتا ہے۔

سردار جعفری نے کہا کہ کتاب کے اس حصے میں جو یہاں پڑھا جائے گا ان ہی چیزوں پر بحث کی گئی ہے۔ مقالہ کافی طویل تھا مگر بہت ہی دلچسپی سے سنا گیا اور بہت پسند کیا گیا۔

زیڈ۔ اے۔ بخاری نے کہا کہ مقالہ میں کہیں کہیں بہت سخت الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جس سے تقابل کارنگ پیدا ہو گیا ہے اور اس حصے سے مقالہ کی علمی حیثیت کو صدمہ پہنچنے کا احتمال ہے۔ اگر ان الفاظ کی جگہ نرم الفاظ استعمال کیے جائیں تو نفس مضمون پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

پطرس بخاری نے کہا کہ وہ اس رائے سے اتفاق نہیں کرتے کیونکہ ان کے خیال میں جہاں بھی مقالہ نگار نے تند لہجہ اختیار کیا ہے وہاں پر اسی لہجہ کی ضرورت تھی۔

ظ۔ انصاری نے سردار جعفری سے کہا کہ اس مقالے میں آپ نے ان لوگوں کا ذکر کیا ہے جن سے آپ کو سیاسی یا سماجی طور پر اختلاف ہے۔ ان نقادوں کا ذکر نہیں کیا جنہوں نے اقبال کی شاعری کو Educational Philosphy بنانے کی کوشش کی ہے۔

اس کا جواب دیتے ہوئے سردار جعفری نے کہا کہ انہوں نے کتاب کے دوسرے باب میں اس پر بحث کی ہے۔ خواجہ غلام السیدین کی کتاب کے متعلق سردار جعفری نے کہا کہ کتاب لکھنے کے بعد انہوں نے مسودہ علامہ اقبال کے پاس بھیجا تھا۔ علامہ اقبال ن کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد ان کو ایک خط کے ذریعہ اطلاع دی تھی کہ آپ نے فلسفہ کو صحیح طور پر سمجھا ہے۔ یہ خط شائع ہو چکا ہے۔

وشوا متر عادل نے کہا کہ اس مقالے میں تنقید نگار نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ پروفیسر عبدالحمید وغیرہ نے اقبال کی پرائیویٹ زندگی کے متعلق من گھڑت قصے بیان کیے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ خیال غلط ہو۔ اس کے برعکس علامہ اقبال پرائیویٹ محفلوں میں اپنی تحریروں کے خلاف اسی قسم کی باتیں کرتے ہوں جیسے پروفیسر عبدالحمید یا ان کے جیسے دوسرے لوگوں نے لکھی ہیں۔

سردار جعفری نے کہا..... ”یہ محض حسن ظن کی بات ہے۔ آپ کو ان لوگوں سے حسن ظن ہے اور مجھے اقبال سے۔ اس لیے میرا خیال یہ ہے کہ ان لوگوں نے یوں ہی ادھر ادھر کی باتیں جمع کر لی ہیں، خصوصاً اس لیے بھی کہ انہوں نے اپنی کتاب کے شروع میں لکھ دیا ہے کہ اس میں سائنس، فلسفہ، آرٹ اور ملی مسائل وغیرہ کا ذکر نہیں کیا جائے گا چنانچہ اقبال کی محفلوں سے انہوں نے حاصل کر کے جو کچھ لکھا ہے وہ طہارت اور استنجے کے مسائل اور ان کا ذکر ہے۔“

عادل: اگر ایسا ہے تو آپ کو چاہیے تھا کہ ایسی کتابوں کی اہمیت ہی نہیں دیتے۔

سردار: میں نے نقاد کا کام کیا ہے اور کچھ چیزیں آپ کے سامنے پیش کر دی ہیں مثلاً گاندھی جی کے متعلق جو کچھ بھی معلوم ہو سکا، میں نے پیش کر دیا ہے۔ یہی نقاد کا کام ہے۔ اب آپ جو چاہیں نتیجہ اخذ کر لیں۔

اس موقع پر ظ۔ انصاری نے کہا کہ یہاں یہ بات ثابت ہو سکتی ہے کہ اقبال کی محفل میں ایسے کلم لوگ موجود رہتے تھے جن سے پرائیویٹ طور پر ایسی ہی باتیں کرتے تھے۔

سردار جعفری نے کہا کہ نکلے لوگ ہر شاعر کی محفل میں موجود ہوتے ہیں۔

میراجی نے کہا کہ سردار جعفری نے ”ملفوظات“ کا ذکر جس طرح سے کیا ہے اس سے انہیں اختلاف ہے کیونکہ انہوں نے پوری کتاب کو ذہن میں نہیں رکھا۔ ”ملفوظات“ میں لاہور کی انجمن نے کوشش کر کے ایسے آدمیوں سے اقبال کی زندگی کے متعلق کچھ باتیں لکھوائیں تھیں جو اقبال سے بہت قریب تھے۔ چونکہ اقبال کی شاعری پر بہت لکھا جا رہا تھا اور ان کی اپنی زندگی پر کچھ نہیں لکھا گیا تھا۔ اس لیے یہ کوشش کی گئی تھی اور اس بات کو واضح طور پر دیا گیا ہے۔

سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے میراجی نے کہا..... ”یہ لوگ مسخرے نہیں ہیں بلکہ پڑھے لکھے لوگ ہیں۔ انہوں نے بہت خلوص سے اقبال کی پرائیویٹ زندگی کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

سردار جعفری نے کہا کہ انہوں نے مجموعی طور پر اس کتاب پر کوئی اعتراض نہیں کیا ہے بلکہ اس میں بعض ایسے واقعات بیان کیے ہیں جن پر اعتراض کیا ہے مثلاً اس قسم کی چیزیں کہ ”حکیم اجمل خاں کانگریسی تھے اور وہ اقبال سے ان کو کانگریس میں شامل کرنے کے لیے بحث کیا کرتے تھے“..... پر اعتراض ہے کیونکہ اجمل خاں مسلم لیگ کے بانی تھے، اس کے علاوہ اور باتیں بھی ہیں اور علمی، ادبی اور ملی مسائل کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا کیونکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگ اقبال کی زندگی کے کچھ پہلوؤں کو چھپانا چاہتے ہیں۔ ان کی جذباتی زندگی کے متعلق جیسا کہ شروع میں کہا گیا تھا، کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے انہوں نے کہا..... ”مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ”اقبال نامہ“ کا پہلا ایڈیشن ایک صاحب نے خرید کر ضائع کر دیا کیونکہ اس میں کچھ ایسے خطوط تھے جن سے اقبال کی زندگی کے جذباتی پہلوؤں کے متعلق کچھ معلوم ہو سکتا تھا اور جن صاحب نے اس خطوط کو نکالا ہے وہ بھی پڑھے لکھے آدمی ہیں اور بہت اچھے عہدے پر فائز ہیں۔“

پطرس بخاری نے کہا..... ”وہ صاحب اچھے عہدے پر تو ہیں مگر پڑھے لکھے نہیں۔ اگر پڑھے لکھے ہوتے تو ایسی حرکت کیوں کرتے؟“

میراجی نے پھر کہا کہ ”ملفوظات“ کے اس سپرٹ کو جو دیا گیا ہے، نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

سردار جعفری: میں نے ملفوظات میں سے چند ایک واقعات لیے ہیں۔ باقی واقعات ”جوہر ریزے“ میں سے

بیان کیے ہیں۔

میراجی: میں نے پچیس تیس کتابوں میں سے یہی (ملفوظات) دیکھی ہے۔

سردار: یہ کتاب ان سب میں سے اچھی ہے۔

میراجی: مگر آپ کا مضمون اس کے برعکس ہوتا ہے۔

سردار: اگر ایسا ہے تو میں اس پر نظر ثانی کر لوں گا۔

کیفی اعظمی نے کہا کہ مضمون میں کہیں کہیں لہجہ اتنا تند ہو گیا ہے کہ ہماری توجہ اصل مضمون سے ہٹ کر لہجے کی

تندی کی طرف چلی جاتی ہے۔ اس لیے اس کو ذرا کم کر دیا جائے تو مضمون کی افادیت میں بہت اضافہ ہو جائے گا۔

اسرار الحق مجاز نے آخر میں صاحب صدر سے درخواست کی کہ وہ اس مقالے اور اقبال کی شاعری اور شخصیت پر

کچھ اپنے خیالات کا اظہار کریں۔

پطرس بخاری صاحب نے اس کا جواب میں کہا کہ انہیں دو تین باتیں بیان کرنی ہیں۔ صدر ہونے کی حیثیت

سے ان کو یہ فائدہ تو ہو گا ہی کہ اس کے بعد ان پر کوئی بحث نہیں ہوگی۔ چنانچہ انہوں نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا

..... ”مجھے جعفری صاحب سے اس بارے میں اتفاق ہے کہ علامہ اقبال پر جس قدر کتابیں اور مضامین آج تک لکھے جا چکے

ہیں، ان میں ایسی کتابوں اور مضامین کی تعداد بہت کم ہے جن کو سیرت نگاری یا تنقید کے نقطہ نظر سے وقیع قرار دیا جا

سکے۔ علامہ اقبال بلند پایہ مفکر اور ہادی تھے لیکن ان کی شخصیت کا اہم ترین پہلو ان کی شاعری تھی۔ ان کے خیالات اور افکار

نے جو ہجان و ولولہ پیدا کیا وہ بہتر شاعری کی وساطت ہی سے پیدا ہوا اور عجیب نہیں کہ اس سحر کاری کے بغیر ان کا پیغام اس

قدر موثر اور دور رس نہ ہوتا۔ باوجود اس بات کے جن اصحاب نے آج تک علامہ اقبال پر قلم اٹھایا ہے ان میں سے اکثر

ایسے ہیں جن کو ادبی تنقید سے دلچسپی نہیں اور کئی ایک تو ایسے بھی ہیں جو اپنے آپ کو ادبی تنقید کے اہل بھی نہیں سمجھتے۔ چنانچہ

ان کے لکھے ہوئے مضامین ایسے ہیں کہ اگر علامہ اقبال شاعر نہ ہوتے اور بجائے شعر کے انہوں نے خشک اور بے کیف نثر

کو اظہارِ مطلب کے لیے اختیار کیا ہوتا تو ان مضامین کی حیثیت میں کوئی فقر نہ آتا یعنی ایسے مضمون نگاروں کے نزدیک

علامہ مرحوم کا شاعر ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ ظاہر ہے کہ اس نقطہ نظر سے جو تنقیدیں لکھی جائیں گی وہ اقبال کے صحیح مرتبے کا

پہنچانے سے قاصر رہیں گی۔

علاوہ برآں چونکہ علامہ اقبال اہل اسلام کے بہت بڑے ہادی تھے اور ہندی مسلمان کئی سال سے ایک

زبردست سیاسی تحریک میں مصروف ہیں، جس کی قوت اور زور فی الجملہ اس بیداری کا مرہون احسانات ہے جو خود علامہ

اقبال نے مسلمان میں پیدا کی، اس لیے ان کے عقیدت مند اس زمانے میں اقبال کے سیاسی مفکر اور ملی رہنما ہونے پر بہ

نسبت ان کی شاعری کے زیادہ زور دیتے ہیں اور انہیں چاہیے کہ جو فیض مسلمانوں کی قومی تحریک کو ان سے پہنچا ہے اور جو ان کے کلام کے درد سے اب بھی پہنچ رہا ہے، اس کو محض ادبی تنقید کی نکتہ سنجیوں سے کسی طرح کا ضعف پہنچے۔ چنانچہ علامہ اقبال کے بعض شاعرانہ بشری پہلوؤں کو باجود ان کی دلکشی کے فی الحاس اس لیے نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ مبادا ان کے بیان سے دلوں میں تشکک پیدا ہو یا ان کا پیغام نکتہ سنجیوں کا شکار ہو کر اپنا زور کھو بیٹھے۔

بعض لوگ جو سمجھتے ہیں کہ نکتہ سنجی سے اقبال کی عظمت کو گزند پہنچے گا ہرگز اجتمالی نہیں بلکہ اس سے مرحوم کا رتبہ اور بھی بلند ہوگا، وہ اس ڈر کے مارے چپ ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ لینے کے دینے پڑ جائیں۔

نتیجہ یہ ہے کہ جہاں ایک طرف علامہ اقبال کے نام اور ان کے کلام سے جوش اور ہیجان اور قوت عمل پیدا ہوتی ہے وہاں ان کی شخصیت کے بعض دلکش اور وقیع پہلو لوگوں کی نظروں سے اوجھل بھی ہو جاتے ہیں۔

سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے انہوں نے کہا..... ”بیشتر تنقیدیں جو آج تک علامہ اقبال پر لکھی جا چکی ہیں، وہ فی الحقیقت نقادوں کی عقیدت کی آئینہ دار ہیں، اقبال کی عظمت کی صحیح ترجمان نہیں۔ ہر ایک عقیدت مند نے اقبال کے کلام اور ان کے اقوال کو اپنے تصور عظمت کے مطابق جانچا ہے اور اپنے حسن عقیدت کی وجہ سے بعض اوقات ایسے ایسے خیالات بھی علامہ سے منسوب کر دیئے ہیں جو ان کی شان کے شایاں نہیں یا جو کم از کم ان کی زندگی اور ان کے کلام کے نمایاں رجحانات کے متوازی نہیں۔

علامہ اقبال فلسفے کے بہت بڑے شاعر تھے۔ ان کا حافظہ بہت عظیم تھا۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور مشرق و مغرب کی حکمت ان کو از بر تھی۔ حکمائے عالم کی صحبت اور اپنی قوت تخلیق اور سالہا سال کے غور و خوص کے بعد انہوں نے انسان کی ترقی اور برتری کے لیے ایک ایسا نقشہ حیات اور لائحہ عمل مرتب کیا جس کے عین مرکز پر انہوں نے اسلام، قرآن اور فلسفہ خودی کو رکھا۔ یہ بیان کا بنیادی فلسفہ یا بقول جعفری صاحب کے ان کا ”حاوی رجحان“ ہے۔

اگر ان کو کسی اور فلسفے میں خواہ وہ مغربی ہو یا مشرقی ایسے خیالات ملتے ہیں جو ان کے وضع کردہ لائحہ عمل سے لگا کھاتے ہوں تو ان کو اپنا لیتے ہیں اور ان سے اپنے فلسفے کی تزئین و آرائش کرتے ہیں لیکن ان کے علاوہ دوسرے فلسفیوں کے بھی بعض خیالات ایسے ہیں جو محض بوجہ اپنی ندرت یا اتج کے ان کو بھائے اور جن پر ان کی شاعرانہ رگ بھڑک اٹھی۔ ایسے خیالات کو بھی انہوں نے شعر میں ڈھال لیا اور کون نہیں جانتا کہ علامہ اقبال دقیق خیالات کو بہت خوبصورتی کے ساتھ شعر میں ڈھال لینے کی پوری قدرت رکھتے تھے۔ ضروری نہیں کہ ایسے خیالات سے علامہ اقبال کو خود بھی اتفاق ہو لیکن چونکہ وہ بصورت شعر ان کے کلام میں موجود ہیں۔ ہر نقاد کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ اس کو بھی کسی نہ کسی طرح اقبال

کے بنیادی فلسفے کی لڑی میں پرو دیا جائے تاکہ کہیں تضاد کی کھٹک باقی نہ رہ جائے۔

میرے خیال میں اس قسم کی کوشش بے سود ہے اور یہی وجہ ہے کہ مختلف حالات کی آپس میں مطابقت ثابت کرنے کے لیے بعض نقاد مضحکہ خیز باتیں بھی کہہ جاتے ہیں اور اپنی بات ثابت کرنے کی خاطر اقبال کے کلام کو عجیب طرح سے توڑتے مروڑتے رہتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسے خیالات کو جنہیں اقبال نے محض ان کی دلکشی اور اپنی طباعی کی وجہ سے اپنے کلام میں شامل کر لیا، ان حالات سے الگ چھانٹ لیا جائے جو اقبال کا اصل ایمان ہیں۔ یہ اہم اور مشکل کام کسی صاحب فہم نقاد کا منتظر ہے اور یقین ہے کہ آج یا کل ہو کر رہے گا۔

اقبال ایشیائی تھا اور مسلمان تھا۔ بحیثیت مسلمان کے اس کا عقیدہ از حد واضح اور اس کے جذبات فدائیان اسلام کے لیے تھے۔ وہ ایسی غلام قوم کا فرد تھا جس پر ایک مغربی سرمایہ دار قوم حکمران تھی۔ اس لیے اس کے دل میں آزادی کی تڑپ تھی اور وہ سرمایہ دار حکومتوں کی عیاریوں سے متنفر تھا۔ ان کے مادی جاہ و جلال کو بے حقیقت اور ان کی باہمی آویزشوں کو ان کے اعمال کی سزا سمجھتا تھا۔ وہ ایک پکا مسلمان تھا اور اسی میں اس کا ایمان تھا کہ جس طرح زندگی کی بدولت بنی نوع انسان کو ذلت سے نجات مل سکتی ہے، اس کی بنیاد اسلام کے فلسفہ حیات اور تصویر سیرت پر ہی قائم کی جا سکتی ہے۔ وہ حب الوطنی سے عاری نہ تھا لیکن وہ اسلام کو وطنیت سے برتر سمجھتا تھا اور اسے یہ ہرگز گوارا نہ تھا کہ ہندی مسلمان ہندوستان کی دوسری قوموں میں منغم ہو جائیں یا ان کی طرز زندگی یا طریق فکر اختیار کر لیں۔ اس لیے اس بات کے العان میں ہمیں کوئی تامل نہ ہونا چاہیے کہ اقبال ہندوؤں کے طریق فکر یا طرز زندگی کو اچھا نہ سمجھتے تھے اور ان کے اثرات کو مسلمانوں کے لیے مضر سمجھتے تھے۔ وہ احیائے اسلام اور اسلام کی وسالت اہل عالم کے لیے عمل، جدوجہد، صفات قلندری اور خودی کو ضروری سمجھتے تھے اور جہاں انہیں یہ صفات نظر آئیں ان کے لیے دل میں امنگ پیدا ہوتی تھی لیکن جہاں ان صفات کو جارحانہ طور پر غلام بنانے کے لیے استعمال کیا جائے وہ غیض و غضب کے ساتھ اس کی مذمت کرتے تھے۔ مسلمان کے افلاس، سنگدستی اور سرمایہ داروں کی چیرہ دستیوں کو دیکھتے ہوئے ان دکھوں کا علاج انہیں اشتراکیت میں نظر آتا تو وہ اشتراکیت کا خیر مقدم کرتے لیکن اگر اشتراکیت کا کوئی پہلو ان کی دانست میں انہیں اسلام کے مطابق معلوم نہ ہوتا تو اس سے اپنی برت کا اظہار بھی ضروری سمجھتے تھے۔ وہ اشتراکیت اور بیسویں صدی کی سیاسیات کو ماہر اقتصادیات کی نظر سے نہیں دیکھتے تھے بلکہ فدائی اسلام اور یہی خواہ اسلام کی نظر سے دیکھتے تھے اور اس کے مطابق اس سے متاثر ہوتے تھے کیونکہ وہ اسلام کے نظریہ حیات کو بنی نوع انسان کی نجات کا ذریعہ سمجھتے تھے۔

آخر میں انہوں نے کہا..... ”جعفری صاحب نے اپنے مضمون میں ان مفروضات اور مسلمات کو نئے سرے

سے پرکھا ہے جو بعض عقیدت مندان اقبال نے قائم کر رکھے ہیں اور اقبال کو تنگ نظر نقادوں کی دستبرد سے بچانے کی کوشش کی ہے۔ یہ پہلا قدم ہے جو اس سلسلے میں اٹھایا گیا ہے۔ اس لیے جعفری صاحب ہمارے شکرے اور مبارکباد کے مستحق ہیں۔“

ابھی پروگرام باقی تھا مگر چونکہ بحث مباحثے اور بخاری صاحب کی تقریر میں کالیف وقت وہ گیا تھا، اس کے بعد یہ مجلس برخاست ہو گئی۔

13 جولائی 1947ء

اردو ترقی پسند مصنفین کا یہ اجلاس خواجہ احمد عباس کی صدارت میں منعقد ہوا۔

حاضرین: جوش ملیح آبادی، عصمت شاہد لطیف، شاہد لطیف، سجاد ظہیر، علی سردار جعفری، ساحر لدھیانوی، کیفی اعظمی، ساحل بلگرامی، سلطانہ بیگم، مجتبیٰ شوکت، ظ۔ انصاری، رضیہ سجاد ظہیر، مجتبیٰ حسن، یزدانی، راشد، جنید، سعید انیس، اسحاق ایوبی، آوارہ، سالک انصاری، غلام مصطفیٰ، عزیز اسلام، طالب گروندھری، سی۔ آر۔ شام۔

میننگ شروع ہونے پر حمید اختر نے پچھلے اجلاس کی کارروائی پڑھ کر سنائی۔ اس کے بعد سجاد ظہیر نے ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس کے متعلق جو انہیں دنوں احمد آباد میں منعقد ہوئی تھی کچھ باتیں بتلائیں۔ انہوں نے کہا کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے ممبروں کا ایک گروہ جس میں جوش ملیح آبادی، کرشن چندر، سردار جعفری، کیفی اعظمی، ساحر لدھیانوی، مجروح، ممتاز حسین، حمید اختر، نیاز حیدر شامل تھے، احمد آباد کی کانفرنس اور مشاعرے کی شرکت کے لیے وہاں پہنچے تھے۔

یہ کانفرنس احمد آباد کے سب سے بڑے ہال میں منعقد ہوئی جو بالکل بھر گیا اور کانفرنس شروع ہونے سے بہت پہلے ٹکٹ فروخت ہو چکے تھے۔ کانفرنس کے پروگرام کے سلسلے میں سجاد ظہیر نے کہا کہ قابل غور بات یہ ہے کہ یہ کانفرنس تقریباً مشاعرے میں بدل گئی تھی جس کا بڑا سبب یہ تھا کہ ہمارے ساتھیوں نے طے شدہ پروگرام کے مطابق مقالے پہلے سے تیار نہیں کیے تھے اور وہاں پہنچ کر لکھنے کی فرصت نہ ملی۔ خود احمد آباد کے ممبروں نے پروگرام بنا کر مقالے تیار نہیں کیے تھے چنانچہ پہلے دن کے سیشن میں مشاعرے کے ساتھ کرشن چندر کا خطبہ صدارت جو مختصر مگر موثر تھا اور سردار جعفری کی تقریر ترقی پسند ادب کے متعلق ہوئی۔ دوسرے سیشن میں سردار جعفری نے اقبال کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر تبصرہ کیا اور میری صدارتی تقریر ہوئی۔ سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے انہوں نے کہا..... ”پہلے دن کوئی ساڑھے بارہ بجے رات تک شعر و شاعری کا دور رہا لیکن اسی رات اور اگلے دن اس بات کی مسلسل یکا پتیں پہنچیں کہ مشاعرہ جلدی ختم کر دیا گیا ہے۔ لوگ ابھی اور سننا چاہتے تھے۔ چنانچہ دوسرے دن اجلاس روع ہونے سے پہلے اعلان کر دیا گیا کہ آج اس وقت تک شعر

سنائے جائیں گے جب تک لوگ سنا چاہیں گے چنانچہ اس رات مشاعرہ صبح ساڑھے تین بجے تک جاری رہا۔ انہوں نے کہا کہ اس کانفرنس کے سلسلے کی خاص بات یہ ہے کہ بمبئی میں بعض رجعت پرستوں کی طرف سے ہماری جو مخالفت شروع ہوئی تھی اس کا اثر احمد آباد میں بھی پڑا تھا چنانچہ وہاں کی کانفرنس ہونے سے دس پندرہ روز پہلے ہی سے بعض لوگوں نے ہمارے خلاف یہ باتیں کہنا شروع کیں کہ.....

”مسلمان ان کے جلسوں میں نہ جائیں کیونکہ یہ ملحد ہیں۔ یہ لوگ کمیونسٹ ہیں اس لیے لیگ والوں کو ان کی بات نہیں سنی چاہیے۔“ چنانچہ یہ بھی کہا گیا کہ مسلم لیگ نے نیشنل گارڈ کو دروازوں پر لے جا کر ہنگامہ کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

یہ بات وہاں کی لیگ نے تنظیم کے لحاظ سے نہیں کی تھی بلکہ بعض افراد کی طرف سے اس قسم کا پروپیگنڈہ ہوا تھا۔ برخلاف اس کے وہاں کی لیگ میں ہمارے ہمدرد بھی تھے۔ حتیٰ کہ وہاں کی لیگ کے بعض سرگرم ممبر ہماری احمد آباد کی شاخ کی مجلس قائم کے ممبر بھی ہیں۔

ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ مقامی عہدے دار (احمد آباد) سخت پریشان اور متوحش تھے کہ کہیں کانفرنس ناکام نہ ہو جائے لیکن اس کا بائیکاٹ اور نعروں کا الٹا اثر ہوا۔ عام لوگوں میں ترقی پسند ادب اور شعر کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ ٹکٹ ایک روپے سے لے کر دس روپے تک تھا۔ پہلے دن ہال بھرا ہوا تھا اور مشاعرہ بخیر و خوبی ختم ہو گیا۔ کوئی ہنگامہ وغیرہ نہیں ہوا۔

مقامی ممبر بہت خوش تھے لیکن دوسرے دن اجلاس شروع ہونے سے پہلے وہ بہت گھبرائے ہوئے تھے اور کہہ رہے تھے کہ کچھ لوگ گڑبڑ کرنے کے ہال میں آگئے ہیں۔

اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے سجاد ظہیر نے کہا..... ”میری صدارتی تقریر ختم ہونے کے فوراً بعد مشاعرہ جوش صاحب کی نظم سے شروع کیا گیا۔ انہوں نے دو تین نظمیوں سنائیں اور ان کے بعد سردار جعفری نے اقبال کی شاعری پر تقریر کرنا شروع کی۔ جعفری اقبال کے فلسفہ عمل کے سلسلے میں کچھ شعر اقبال کے پڑھ کر تقریر کر رہے تھے کہ ایک صاحب جن کا نام بعد میں وحشی معلوم ہوا اٹھ کر بولے..... ”آپ اقبال کا نام لے کر کمیونسٹ پارٹی کا پروپیگنڈہ کر رہے ہیں۔ یہ شعر اپنے نام سے پڑھیے اقبال کا نام نہ لیجیے۔“

سردار جعفری نے ان سے کہا..... ”آپ تشریف رکھیے۔ یہ شعر علامہ اقبال کی کتاب میں موجود ہے اور اپنی تقریر شروع کرنے سے پہلے میں یہ بھی کہہ چکا ہوں کہ میں کمیونسٹ ہوں اور جو لوگ اقبال کو کمیونسٹ ثابت کرنا چاہتے ہیں وہ

غلط کرتے ہیں چنانچہ میں ہرگز کوشش نہیں کروں گا۔ اس کے بعد سردار جعفری نے نہایت اچھی تقریر کی اور وحشی صاحب خاموش بیٹھے تھے۔

سردار جعفری کی تقریر کے بعد مشاعرہ شروع ہوا۔ کچھ شاعروں کے بعد جب مجروح اپنی غزل سنارہے تھے، وحشی صاحب پر پھر وحشت سوار ہو گئی اور انہوں نے کھڑے ہو کر چلانا شروع کیا..... ”اقبال کی روح تڑپ رہی ہے، اس لیے مجھے کچھ کہنے کا موقع دیا جائے۔“ اس کے جواب میں میں نے صدر کی حیثیت سے کہا کہ اب مشاعرہ شروع ہو چکا ہے اور یہاں پر ہم بحث کرنے کے لیے نہیں آئے۔ اس لیے اس وقت اس کا موقع نہیں۔ بہتر یہ ہوگا کہ کل کسی وقت سردار جعفری اور وحشی صاحب مل لیں اور ایک دوسرے کے نظریات کے متعلق باتیں کر لیں لیکن جب انہوں نے اصرار کیا تو میں نے کھڑے ہو کر ووٹ لیے کے جو لوگ وحشی صاحب کو وقت دینے کے حق میں ہیں وہ ہاتھ اٹھائیں چنانچہ ساٹھ ستر کے قریب ہاتھ ان کے حق میں اٹھے اور چھ سات سو کے قریب اس حق میں تھے کہ مشاعرہ جاری رہے چنانچہ وحشی صاحب چپ چاپ بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد انہوں نے پھر کہا..... ”اقبال کی روح تڑپ رہی ہے“ تو میں نے کہا چونکہ اہم اکثریت کو اپنی اکثریت سے فائدہ اٹھا کر اقلیت کو دبانے کے حق میں نہیں۔ اس لیے کثرت رائے کے خلاف ہم بھی تھوڑا سا وقت وحشی صاحب کو دیتے ہیں۔

چنانچہ وحشی صاحب سٹیج پر تشریف لائے۔ پہلے تو لوگوں نے شور مچایا کہ ہم مشاعرہ سننا چاہتے ہیں مگر وحشی صاحب نے کہنا شروع کیا..... ”جعفری صاحب نے یہ بالکل غلط کہا ہے کہ اقبال انسانیت کے شاعر تھے وہ انسانیت کے شاعر قطعاً نہیں تھے صرف مسلمانوں کے شاعر تھے اور جعفری صاحب نے یہ بھی غلط کہا ہے کہ اقبال دنیا کے حسن میں اضافہ کرنا چاہتے تھے۔ اسے بنانا اور سنوارنا چاہتے تھے۔ وہ تو اس دنیا کو بالکل کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے اور بالکل قلندر تھے۔“ اسی سلسلے میں وحشی صاحب نے ایک دو شعر بھی جوش میں آ کر پڑھے جو ان کے دعویٰ کو دلیل نہیں تھے بلکہ اس کے خلاف تھے چنانچہ ہال میں بیٹھے ہوئے لوگوں نے سیٹیاں بنجائیں، ٹوپیاں اچھالیں وحشی صاحب کی طرف دونیاں چونیاں اور پیسے پھینک کر کہا..... ”بھاگ جاؤ بھاگ جاؤ“۔ وہ اسٹیج سے اتر کر چلے گئے۔

اس کے بعد مشاعرہ شروع ہوا اور صبح ساڑھے تین بجے تک جاری رہا۔ آخر میں سجاد ظہیر نے کہا کہ ان تمام باتوں سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ہماری مخالفت کا عکس تھوڑا تھوڑا ہر جگہ موجود ہے۔ اس لیے نہیں کہ ہمارے مخالفوں کا کوئی ادبی مقام ہے بلکہ اس لیے کہ صدیوں کی جعت پرستی ان کیس تاہ ہے چنانچہ ہاں ہم ان کے مشاعروں میں جانے اور انہیں اپنی بات کہنے کا حق دیتے ہیں اور یہ بات ایسی صورت میں ہوتی ہے جب حریف مخالف کی اخلاقی اور منفی پوزیشن

کم ہو جاتی ہے۔ یہ مخالفت بہت معمولی ہے مگر ہمیں اسے ناقابل اعتنا سمجھا کر نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ اس کا صرف ایک علاج ہے اور وہ یہ کہ ہم لوگ زیادہ منظم ہو کر آگے بڑھنے کی کوشش کریں۔ احمد آباد میں بہت اچھا اثر ہوا۔ ہمارے شاعروں نے دستور کے مطابق معاوضہ نہیں لیا بلکہ وہاں کی انجمن نے کچھ پیسے مرکزی انجمن کو دے دیئے۔

اپنی تقریر ختم کرتے ہوئے سجاد ظہیر نے کہا..... ”احمد آباد سے ہم لوگ سورت گئے وہاں پر بہت کامیاب مشاعرہ رہا۔ اسی دن ایک اجتماع رندھیل میں بھی، جو سورت سے چار پانچ میل کے فاصلے پر ایک مقام ہے، ہوا جس میں سب لوگ تو نہیں جاسکے مگر کچھ لوگ گئے تھے۔ سورت میں ترقی اردو نے اس مشاعرہ کا انتظام کیا تھا۔ وہاں پر ابھی تک ہماری شاخ قائم نہیں ہوئی لیکن اس مشاعرے میں انجمن ترقی اردو کے ساتھ کانگریس، لیگ اور کمیونسٹ پارٹی کے لوگ شامل تھے۔ اس دورے میں ہم نے یہ محسوس کیا کہ گجرات میں سورت کے مقام پر سب سے زیادہ سخن فہم لوگ موجود ہیں۔“

سجاد ظہیر کی تقریر ختم ہونے پر سلطانہ بیگم نے کہا کہ اس مشاعرہ اور کانفرنس کی ایک مفصل رپورٹ تیار ہونی چاہیے۔ حمید اختر یہ رپورٹ تیار کریں تو اچھا ہے۔

اس کے بعد سالک انصاری صاحب ن جو مالیگاؤں سے ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کو مدعو کرنے کے لیے آئے تھے، کہا..... ”مالیگاؤں میں یہ کانفرنس جون میں طے ہوئی تھی مگر بعض مجبوریوں اور دفعہ 144 کے نفاذ کی وجہ سے اسے ملتوی کر دیا گیا تھا۔ اب اٹھارہ جولائی کا دن مقرر ہوا ہے۔ اس لیے زیادہ سے زیادہ ساتھی وہاں چلنے کی کوشش کریں۔ دوبارہ انتظامات مکمل ہو گئے ہیں۔ پہلے ٹکٹ لگانے کا خیال تھا مگر اب بعض ہمدردوں کی وجہ سے ہم نے بغیر ٹکٹ کے مشاعرہ اور کانفرنس کرنے کا ارادہ کیا ہے ”چنانچہ مالیگاؤں جانے کے متعلق پروگرام بنا لیا گیا۔“

پروگرام کے مطابق اپنی کتاب کا ایک باب جو قرون وسطیٰ کی اسلامی تاریخ سے متعلق تھا، سنانے سے پہلے ساحل بلگرامی نے کہا کہ وہ سب سے پہلے اپنے متعلق ایک غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کریں گے اور وہ یہ کہ پچھلے دنوں یہ کہا گیا تھا کہ میں حلقہ ارباب فکر میں شامل ہو گیا ہوں۔ یہ خیال ہی میرے لیے مہمل ہے لیکن انجمن ترقی پسند مفکرین کے چار پانچ آدمی میرے پاس ایک دفعہ ضرور آئے تھے۔ جو مجھے اپنے ساتھ لے گئے اور اپنی میٹنگ کا صدر بنا دیا چنانچہ کچھ نظمیں سنائی گئیں اور ایک گھنٹے میں میٹنگ ختم ہو گئی۔ بس یہ واقعہ ضرور ہوا ویسے میرا ان سے کوئی تعلق نہیں۔

ساحل بلگرامی کے مضمون کے بعد پروفیسر ممتاز حسین نے ”غالب کی شکست کا تجزیہ“ کے عنوان سے ایک مقالہ پڑھا۔ مقالہ شروع کرنے سے پہلے انہوں نے کہا کہ مقالہ بہت طویل ہے اور وقت کم ہے۔ اس لیے وہ اس کے تین حصوں میں سے صرف دو حصے پڑھیں گے۔

ان کا مقالہ ختم ہوتے ہی ظ۔ انصاری نے اعتراض کیا کہ اس مقالے میں Wishful Thinking زیادہ ہے۔ اگرچہ مضمون بہت قیمتی ہے اور بعض چیزیں خود انہیں بہت اچھوتی معلوم ہوئیں لیکن اس چیز سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ممتاز حسین صاحب نے پہلے چیزوں کو ترتیب دیا اور پھر اشعار ڈھونڈے۔ چنانچہ آپ نے یہ لکھا ہے کہ غالب خود کشی کی تمنا بھی کر رہا ہے۔ یہ چیز صحیح نہیں ہے۔ ممتاز حسین نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ انہوں نے تو یہ لکھا ہے کہ ایک دفعہ وہ یہاں تک پہنچا اور پھر وہاں سے ہٹا ہوا زندگی کی طرف آتا ہے۔ وہ پرانی چیزوں سے غیر مطمئن تھا۔ نئے سماج کا کوئی خاکہ اس کے سامنے نہیں تھا۔ اس لیے وہ درمیانی راستے پر تھا۔ اس وقت کی کشمکش سمجھے بغیر آپ اسے پوری طرح سے سمجھ نہیں سکتے۔

ظ۔ انصاری: غالب کے متعلق یہ کہنا کہ زندگی سے نجات حاصل کرنے کے لیے وہ تصوف اور فنا کا تصور کرتا ہے، غلط ہے بلکہ فنا کا تصور اس کے ہاں پہلے سے موجود ہے۔

ممتاز حسین: میں یہ کہہ رہا ہوں کہ وہ گھبرا کر تصوف کا سہارا لینے کی کوشش کرتا ہے مگر اس کے تصوف میں دم نہیں ہے نہ ہی اس کا عقیدہ تصوف میں ہے کیونکہ اس کے ہاں تصوف میں بھی فکری اشعار ملتے ہیں۔

صاحب صدر کے استفسار پر جوش ملیح آبادی نے کہا کہ ان کے نزدیک مقالہ میں ربط کی کمی ہے۔ ان باتوں کو زیادہ اجاگر کیا جاسکتا تھا۔ انہوں نے کہا کہ اس کا فیصلہ نہیں ہو سکتا کہ میں خود غیر مربوط تھا جس کی وجہ سے مجھے یہ معلوم ہوا یا واقعی ربط کی کمی ہے۔ ایک بات کی طرف توجہ دلاتے ہوئے انہوں نے کہا کہ عربی فارسی کے الفاظ کی اضافت اردو کے ساتھ نہیں ہونی چاہیے۔ سلوک نیک وغیرہ اسی قسم کی ایک اضافت اس مقالے میں ہے۔

ساحل بلگرامی نے کہا کہ مضمون بہت اچھا ہے اور انہیں پسند ہے۔

سردار جعفری نے کہا کہ چونکہ مضمون کا پہلا حصہ چھوڑ دیا گیا ہے جس کی وجہ سے پورا پس منظر سامنے نہیں ہے، اس لیے کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ غالباً رابط کی کمی بھی اسی لیے معلوم ہوئی۔

خواجہ احمد عباس نے کہا کہ وہ غدر 1857ء کے سلسلے میں کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ممتاز صاحب نے یا تو 57ء کے غدر کا اچھی طرح سے مطالعہ نہیں کیا یا کوئی غلط فہمی ہے جس کی بناء پر انہوں نے یہ لکھا ہے کہ یہ بغاوت جمہور کی نہیں بلکہ جاگیردار طبقے کی تھی۔

ممتاز حسین نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ میرا مطلب یہ ہے کہ پشت پناہی جاگیردار طبقے نے کی تھی۔

خواجہ احمد عباس: اس قسم کے سیاسی حالات اور اتنی سیاسی اور سماجی ترقی کے زمانے میں قشت پناہی ہمیشہ

جاگیردار طبقہ ہی کرتا ہے۔

ممتاز حسین: فرانس میں ایسے ہی حالات میں بورژوازی نے رہنمائی کی تھی۔

خواجہ احمد عباس: غیر ملکی حکومت کے خلاف بغاوت کی رہنمائی میں تو جاگیردار شامل تھے۔ کیا آپ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ غالب نے اس لیے ساتھ نہیں دیا تھا کیونکہ غدر کی پشت پناہی کرنے والوں میں جاگیردار تھے؟

ممتاز حسین: غدر بڑے پیمانہ پر اس لیے نہیں ہو سکا کہ پوری طرح سے لوگ سمجھ نہیں سکے تھے۔ انگریزوں کے آنے اور ان کے ساتھ نئی چیزیں پہنچنے کی وجہ سے عام طور پر چکا چونڈ کی سی کیفیت تھی۔ جن لوگوں کی جاگیریں انگریزوں کے آنے سے ضبط ہو گئی تھیں وہ تو انگریزوں کے سخت خلاف تھے لیکن عام آدمی یہ ضرور سوچتا تھا کہ ان کو بھگایا جائے یا نہیں کیونکہ وہ بری چیزوں کے ساتھ اچھی چیزیں بھی ساتھ لے کر آئے تھے۔

سردار جعفری نے کہا کہ غدر کی اہمیت اس لحاظ سے تو بالکل ٹھیک ہے کہ یہ ایک بیرونی حکومت کے خلاف تھا لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انگریز ہندوستان میں صنعت لے کر آئے۔ انہوں نے جاگیرداری کو ختم کیا اور اس کی جگہ نئی مشینیں اور صنعتیں ملک کو دیں۔

علی گڑھ گروپ یہی کہتا تھا کہ ہم انگریزوں کی تہذیب، تمدن، ان کے علم اور مشینوں سے فائدہ اٹھا کر ہی ان سے ٹکر لے سکتے ہیں۔ رانی جھانسی کے واقعہ میں حسب الوطیت بیرونی حکومت کی وجہ سے تھی لیکن جو طاقت ابھری تھی وہ جاگیرداری تھی اور جاگیرداری اور صنعت کے مقابلے میں اہمیت صنعت ہی کو دی جاسکتی ہے۔ یہ جاگیردار طبقہ غیر شعوری طور پر غیر ملکی حکومت کے خلاف تھا، شعوری طور پر نہیں۔

سجاد ظہیر نے کہا کہ غدر میں رہنمائی جاگیردار طبقے نے کی تھی مگر قوم ابھری تھی۔ حالات ایسے تھے کہ رہنمائی کے لیے اور کوئی طبقہ نہیں تھا مگر اسے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ بغاوت قوم نے نہیں کی تھی۔

خواجہ احمد عباس نے کہا کہ یہ ٹھیک ہے لیکن غالب کے علیحدہ رہنے کی وجہ یہ نہیں تھی۔ وہ تو غدر کے زمانے میں دروازے بند کر کے بیٹھ گئے تھے۔

ممتاز حسین: ان میں انسان دوستی کا جذبہ اس قدر تھا کہ وہ انگریز کے مارے جانے پر بھی افسوس کرتے تھے۔ علاوہ اس کے ان کے خطوط میں یہ ذکر ملتا ہے کہ وہ انگریزوں کے متعلق یہ لکھتے تھے کہ ان کی وجہ سے ہی ریل اور ڈاک کا انتظام نصیب ہوا ہے۔ ان سے پہلے یہ چیزیں نہ تھیں چنانچہ وہ اسی کشمکش میں تھے اور عام طور پر اسی لیے انگریزوں کی مخالفت نہیں کرتے تھے۔

سجاد ظہیر: مگر اس بات کا فیصلہ کیسے کیا جاسکتا ہے کہ وہ انگریز کے مارے جانے پر انسان دوستی کے جذبہ کی وجہ سے افسوس کرتے تھے یا پنشن کے لیے؟
سردار جعفری: پنشن کے لیے۔

خواجہ احمد عباس نے ریل اور ڈاک کے سلسلے میں کہا کہ یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ انگریز نہ آتے تو یہ چیزیں ہندوستان میں نہ آتیں۔ یہ تو انگریزوں کے علاوہ کوئی اور طاقت مثلاً پرتگیز یا فرانسیسی بھی لاسکتے تھے۔ یہ بات بھی ہم نے انگریزوں کی کتابوں سے سیکھی ہے کہ ان کی وجہ سے ہمیں یہ چیز ملی ہے۔ اس کے ساتھ ہی خواجہ احمد عباس نے کہا کہ اس قسم کی تنقید میں نقاد یا تو شاعر کو اتنا بلند دکھاتا ہے کہ اس کی ہر چیز کا پہلو نکال لیتا ہے یا اتنا پست دکھاتا ہے کہ ہر چیز کا برا پہلو سامنے لے آتا ہے۔ یہ کیوں نہیں کہا جاتا کہ شاعری میں بعض اچھی اور ترقی پسند چیزیں تھیں اور بعض معاملات میں وہ رجعت پرست تھا۔

ممتاز حسین نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ یہ بات کافی حد تک صحیح ہے کہ ہمارے اکثر تنقید نگار ایک ہی قسم کی باتیں ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں جہاں تک غالب کا سوال ہے وہ انگریزوں کے خلاف تھے۔
میٹنگ ختم ہونے سے پہلے خواجہ احمد عباس نے حاضرین سے ”نیا ادب“ کے سلسلے میں کہا کہ ”نیا ادب“ آپ کا اور ہمارا پرچہ ہے جو آج کل مالی مشکلات میں گرفتار ہے جس کے لیے آپ لوگوں کے تعاون کی ضرورت ہے۔ آج کل ہماری نئی شاخیں تیزی سے پھیل رہی ہیں اور اس وقت پرچے کا ماہ بہ ماہ شائع ہونا اشد ضروری ہے۔ اس لیے ہر ممبر اور دوست کا فرض ہے کہ وہ ”نیا ادب“ کے زیادہ سے زیادہ خریدار بنائے۔ کیفی اعظمی نے ”نیا ادب“ کے سلسلے میں کہا کہ ہم پوری کوشش کر رہے ہیں کہ پرچہ ہر مہینے کے پہلے ہفتے میں پرچہ چھپ جایا کرے گا لیکن اس کے لیے تمام ممبروں اور ساتھیوں کے تعاون کی سخت ضرورت ہے۔ مرکزی انجمن کی طرف سے ایک سرکلر تمام شاخوں کو بھیج دیا گیا ہے کہ ہر جگہ کی انجمن کے ممبر ”نیا ادب“ کے خریدار بنانے کا کوٹہ اپنے ذمہ لیں چنانچہ بعض جگہ پر عمل بھی شروع ہو گیا ہے۔ اس سلسلے میں یہاں مرکزی انجمن کے ممبروں کو بھی اپنے ذمہ کام لینا چاہیے اور زیادہ سے زیادہ خریدار بنانے چاہیے۔

چنانچہ سب ممبروں نے اپنا کوٹہ مقرر کیا اور ایک ہفتے کے اندر خریدار فراہم کرنے کے وعدے کے بعد یہ مجلس برخاست ہوئی۔

20 جولائی 1947ء

اردو انجمن ترقی پسند مصنفین کا یہ اجلاس یزدانی جالندھری کی صدارت میں منعقد ہوا۔ شروع میں سیکرٹری نے

پچھلے اجلاس کی کارروائی پڑھ کر سنائی۔ اس کے بعد پروگرام کے مطابق مجتبیٰ حسن نے ایک غزل سنائی۔
 ساحر لدھیانوی نے کہا کہ غزل بہت اچھی ہے۔ ایک شعر تو بہت ہی اچھا ہے لیکن درمیان کے دو شعر واضح
 نہیں۔ مثلاً.....

ان کی خاطر مسکرانا ہے ہمیں
 ایک سفر در پیش ہے دور دراز
 میں مفہوم واضح نہیں ہوتا۔

مجتبیٰ حسن نے کہا کہ ان کے خیال میں شعر صاف ہے اور واضح طور پر سمجھ میں آ جاتا ہے۔ ساحر لدھیانوی نے
 پھر اسی بات پر زور دیا کہ شعر بہت مبہم ہے۔

مجتبیٰ حسن نے کہا کہ اس میں یہ بات صاف طور پر سمجھ میں آ جاتی ہے کہ ہمیں ان کی خاطر اس طرح مسکرانا پڑتا
 ہے جیسے دور دراز سفر کرنا ہو یعنی جیسے دل نہ چاہے اور سفر کرنا پڑے۔

مدھوسودھن نے کہا کہ یہ بھی فرض کر لیا گیا ہے کہ دور دراز کا سفر تکلیف دہ ہوتا ہے حالانکہ ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔
 صاحب صدر نے بتلایا کہ ان کے خیال میں بھی دوسرا مصرعہ پہلے مصرعے سے غیر مربوط ہے۔

اب سردار جعفری کو اپنا مقالہ ”اقبال اور اشتراکیت“ سنانا تھا۔ مقالہ شروع کرنے سے پہلے انہوں نے بتلایا کہ
 یہ مقالہ ان کی کتاب ”اقبال کی شاعری کا سیاسی اور سماجی پس منظر“ کا ساتواں باب ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس باب کو
 سنانے سے پہلے کتاب کے پہلے چھ باب کا پس منظر بیان کرنا ضروری ہے۔ اس کتاب میں میں نے اقبال کے تصورات
 اور بنیادی خیالات کو اس زمانے کے حالات کے ساتھ پرکھنے کی کوشش کی ہے اور ان کی شاعری کے ارتقاء کو سنہ وار پیش کیا
 ہے۔ پہلا باب ہے ”اقبال کے سیرت نگار اور نقاد“ جس میں میں نے اس سلسلے کی تقریباً تین کتابوں پر اظہار خیال کیا
 ہے۔

دوسرا تیسرا اور چوتھا باب ان کی شاعری سے متعلق ہے۔ اسے دو ادوار میں تقسیم کیا جا چکا ہے۔ پہلے دور میں
 اقبال اصلاح پسند ہیں جس میں سرسید اور محسن الملک کے ابتدائی نیشنلزم کا بھی دخل ہے۔ اس کی بنیاد تھی جدید علم حاصل کرنا
 اور سائنس کو اپنانا۔ دوسرا دور تجدیدیت کا ہے جس میں سرمایہ داری سے نجات حاصل کرنے کی تڑپ ہے مگر چونکہ اقبال
 کے سامنے نئے نظام کا کوئی واضح دستور نہیں تھا اس لیے وہ ماضی کی طرف جاتے تھے اور خلافت راشدہ کی طرف بھاگتے
 تھے۔ بالکل یہی گاندھی جی کے ہاں رام راج کی شکل میں موجود ہے۔ سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے سردار جعفری نے کہا

کہ 1908ء کے بعد اقبال نے سرمایہ داری کے کھوکھلے پن کو اچھی طرح سے محسوس کر لیا تھا۔ اب وہ تعلیمی اداروں، میڈیا، سسٹم اور اسمبلیوں پر حملے کرتے ہیں لیکن Revivalism ماضی پرستی بن جاتا ہے، اقبال نے نئے تصورات کو اپنانا شروع کیا۔

اس سلسلے میں سردار جعفری نے امیر علی کی کتاب Spirit of Islam کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ امیر علی نے جو لکھا ہے کہ اسلام کی پرانی روایات قرون وسطیٰ میں موجود ہیں اور یہاں تک لکھا ہے کہ ہزار سال پہلے کانٹے چھرے بھی موجود تھے، ایسی ہی چیزوں میں اقبال اور آگے بڑھے۔ انہوں نے ڈراؤن کی تھیوری کو بھی اپنایا اور مارکس کے فلسفے کو بھی۔ تخلیق آدم کے پرانے تصور کی نئی اور ایسی تاویل پیش کیں جو اسلام کے دوسرے مفکروں سے مختلف تھیں۔

سردار جعفری نے کہا کہ اقبال اپنے ہاں کے دونوں رجحانوں میں ایک قومی تحریک کو آگے بڑھاتا ہے۔ 1906ء سے لے کر 1920ء تک اقبال نے جو لکھا ہے وہ مسلمانوں اور غیر مسلموں پر اثر ڈال رہا تھا، اس زمانے میں اقبال قومی شاعر بن رہے تھے، اس زمانے میں جنگ بلقان کے بعد مسلمان بیدار ہو رہے تھے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب اقبال نے ”طلوع اسلام“ لکھی۔

اقبال کا دوسرا رجحان Negative تھا۔ سرمایہ داری کے بعد نظام کے سوال پر وہ Revivalist بن جاتے ہیں جو ان کے ”جاوید نامہ“ سے معلوم ہوتا ہے۔

سردار جعفری نے کہا کہ کتاب کا پانچواں باب اقبال کے فلسفہ خودی سے متعلق ہے۔ اس فلسفے میں تضاد ہے اور یہ تضاد اسلامی فلسفے میں شروع سے ہی موجود ہے۔ ہندو پہلے ہی سے دنیا کو مایا جال کہتے تھے اور نجات حاصل کرنے کے لیے دنیا سے قطع تعلق کر کے پہاڑوں پر جانے اور روح کو بہتر بنانے کا طریقہ بتلاتے تھے لیکن اسلامی فلسفے میں جسے اقبال نے شدت سے پیش کیا، یہ تھا کہ دنیا کا ایک خارجی وجود ہے اور انسان کا ایک وجود روحانی ہے جس سے مادی دنیا کو فتح کرنے کے اس پر قابض رہنا چاہتے تھے۔ یہی تضاد ہے ان دونوں کے درمیان کشمکش اور ٹکر ہے جسے اقبال خودی اور ناخودی کہتے ہیں۔

کتاب کا چھٹا باب ”اقبال اور حب الوطنی“ ہے اور یہ اس لیے رکھا گیا ہے کہ عام طور پر یہ غلط فہمی کہ ”سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا“ کے بعد اقبال کا رویہ ہندوستان کی طرف سے بدل گیا تھا۔ سردار جعفری نے کہا..... ”یہ بات بالکل غلط ہے۔ یہ نظم اقبال کے طالب علمی کے زمانے کی ہے۔ اس میں شعری خوبیاں بھی کم ہیں۔ دوسری نظموں میں مقابلتاً زیادہ خوبیاں ہیں اور حب الوطنی کا جذبہ موجود ہے۔ ہندوستان ہمارا چونکہ ہندوستان کے متعلق پہلی نظم ہے، اس لیے

لیے یہ بہت مقبول ہوئی اور لوگ سمجھنے لگے کہ اس کے بعد اقبال نے حب الوطنی کی اور کوئی نظم نہیں لکھی۔

آخر میں سردار جعفری نے کہا کہ ساتویں باب ”اقبال اور اشتراکیت“ کے تین حصے ہیں..... (1) اقبال نے جو اشتراکیت کی تعریف کی (2) اقبال نے اشتراکیت پر جو اعتراضات کیے (3) میں نے اقبال کے اعتراضات کا تجزیہ کیا ہے۔ اس سلسلے میں میں نے ایک نظم ”عالم نو کا خواب“ چھوڑ دی ہے۔ اس کے متعلق ایک علیحدہ باب ہے جو میری کتاب کا آخری باب ہے۔ ایک دوسری نظر ”لینن خدا کے حضور میں“ کی مثال دیتے ہوئے جعفری نے کہا کہ یہاں پر اقبال کا تصور یہ ہے کہ انسان خود ایک چھوٹا سا خالق ہے اور اس کی روحانی قوت اس کی تخلیقی قوت ہے۔ اس میں انسان اور خدا کا مکالمہ ہے۔ خاص طور پر انسان کے جواب.....

تو شب آفریدی چراغ آفریدم

..... میں انسان کی عظمت بیان کی ہے۔

سردار جعفری نے آخر میں کہا کہ نقش گرازل میں اقبال تکمیل تک پہنچتے ہیں۔ جہاں وہ فرشتوں سے کہتے

ہیں.....

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو

..... یہاں پر اقبال نے خود کو اشتراکیت کے مطابق ڈھال لیا تھا۔

مقالہ سننے کے بعد مدھوسودھن نے کہا کہ مقالے کے پہلے اور دوسرے حصے میں تضاد ہے۔ پہلا حصہ بہت سنجیدہ

ہے لیکن دوسرا حصہ Rhetoric ہو گیا ہے یعنی جہاں سے آپ یہ کہنا شروع کرتے ہیں کہ اشتراکیت کیا ہے۔

سردار جعفری نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ Rhetoric تو کتاب میں شروع سے لے کر آخر تک ہے۔

مدھوسودھن نے کہا کہ آپ نے اقبال اور اشتراکیت کا تعلق بتایا ہے۔ اس میں اشتراکیت کیا ہے؟..... بتلانے

کی کیا ضرورت ہے جبکہ آپ کی کتاب پڑھنے والے لوگ اشتراکیت کے متعلق جانتے بھی ہوں گے۔

سردار جعفری: میرا خیال ہے کمیونسٹوں کے علاوہ ننانوے فیصدی لوگوں کو اشتراکیت کے متعلق کچھ معلوم نہیں

ہوتا۔ اس سلسلے میں سردار جعفری نے اپنے پرانے مقالے کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اس میں انہوں نے ایک پروفیسر

صاحب کا ذکر کیا تھا جو معاشیات کے پروفیسر ہیں اور انہیں دولت اور سرمایہ کا فرق معلوم نہیں اور یہ فرق خود ڈاکٹر اقبال کو

بھی معلوم نہیں تھا۔ اس کا اعتراف انہوں نے ڈاکٹر تاثیر کے پاس کیا بھی تھا اور اس سلسلے میں ان سے کچھ کتابیں مانگی

تھیں۔ اس پر ڈاکٹر تاثیر نے ایک کتاب بھی بھیجی تھی جو میرے خیال میں غلط تھی۔

سردار جعفری نے کہا کہ انہی باتوں کے خیال سے انہوں نے بنیادی چیزیں بھی بیان کی ہیں۔

ظ۔ انصاری نے کہا کہ اقبال کے ہاں جن مسائل پر Confusion تھا، ان پر آپ کی کتاب کا علیحدہ باب ہونا چاہیے ورنہ خود آپ کے ہاں Confusion پیدا ہو جائے گا اور شاید ہو بھی گیا ہے۔ بہر حال آپ اعتدال پر آگئے یعنی آپ اقبال کو پکا مسلمان بھی اور سوشلسٹ بھی بتلاتے ہیں اور یہ توقع کرتے ہیں کہ اگر وہ جیتے رہتے تو سوشلسٹ یا کمیونسٹ ہو جاتے۔

سردار جعفری نے احتجاج کرتے ہوئے کہا کہ انہوں نے یہ بات بالکل نہیں کہی بلکہ صرف یہ بتلایا ہے کہ ان کو دولت اور سرمایہ (Wealth & Capital) کا فرق معلوم نہیں تھا اور اس کا انہوں نے اعتراف بھی کیا تھا۔ ظ۔ انصاری نے ایک اور اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ اقبال اشتراکیت سے اس وقت تک متفق ہیں جب تک اس کی اسلامی بنیادیں موجود ہیں۔

سردار جعفری: آپ میری بات کہہ رہے ہیں۔ آپ ان کے نفی کے رجحان کو سامنے لا رہے ہیں۔

ظ۔ انصاری:..... اور آپ اثباتی رجحان کو کھینچتے ہیں اور اقبال کے ہاں جو ترقی پسندی ہے اسے بڑھاتے ہیں۔

سردار: مجھ میں اور رجعت پرستوں میں یہی فرق ہے۔ میں کہہ دیتا ہوں کہ یہ رجعت پرستی اور یہ ترقی پسندی ہے اور ترقی پسندی کو اس لیے بڑھاتا ہوں کہ رجعت پرستی ختم ہو جائے گی اور ترقی پسندی باقی رہے گی۔

ظ۔ انصاری نے ایک اور اعتراض کیا جو بعد میں معلوم ہوا کہ اعتراض نہیں بلکہ ایک ہی بات ہے جو سردار جعفری نے کہی ہے۔ اس پر سجاد ظہیر نے حیرت سے پوچھا..... ”آپ دونوں ایک ہی بات کہہ رہے ہیں تو بحث کس بات پر ہو رہی ہے؟“

مدھو سودھن نے ظ۔ انصاری اور سردار جعفری کی بحث سے یہ اندازہ لگایا کہ اقبال ایک ایسا کمرہ ہے جس میں روشن اور تاریک دونوں قسم کی کھڑکیاں ہیں۔

سردار جعفری نے کہا کہ ہمارا کام یہ ہے کہ ہم بتلا دیں کہ یہ تاریک کھڑکیاں ہیں اور یہ روشن اور روشن کھڑکیوں سے جس کا جی چاہے کام لے لے۔

10 اگست 1947ء

انجمن ترقی پسند مصنفین کا یہ ہفتہ وار جلسہ سجاد ظہیر کے مکان پر منعقد ہوا۔ اس جلسے کی صدارت جنید صاحب نے فرمائی۔ اس کا پروگرام حسب ذیل تھا۔

وشواتر عادل۔ موت سے پہلے (نظم)

خواجہ احمد عباس: ”جشن آزادی کا پردگراں“۔

وشواتر عادل صاحب اپنی یہ نظم گزشتہ ہفتے میں سنا چکے تھے لیکن حاضرین نے بجز تین آدمیوں کے سمجھنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس پر اچھی خاصی بحث ہوئی تھی لیکن وہ نامکمل رہ گئی تھی۔ اس لیے ان سے درخواست کی گئی کہ وہ اپنی نظم آج کے جلسے میں پھر سنائیں۔ عادل صاحب نے ٹھہر ٹھہر کر نظم سنائی۔

سردار جعفری: میں نے نظم کو کئی بار پڑھا لیکن سمجھنے سے قاصر رہا۔ اس میں تسلسل کی کمی ہے جب ساحر نے سمجھایا

تو کچھ سمجھ میں آیا۔

عادل: میری سات فیصدی نظمیں سمجھ میں نہیں آتی ہیں۔ ممکن ہے اس کا سبب انفرادیت ہو۔

مدھوسودھن: آپ کا مطلب مشکل سے کیا ہے؟

عادل صاحب جلدی سے پھر نظم سنانے لگے۔

مدھوسودھن: اس میں ضمیر کی موت کا پتہ نہیں چلتا ہے۔

عادل: سو فیصدی نہیں مرا ہے۔

جعفری: چونکہ یہ آدمی مرا نہیں ہے، اس لیے ان کا عنوان ہونا چاہیے ”ضمیر کی ملامت“۔

ممتاز حسین: چونکہ یہ آدمی بے حد حساس ہے، اس لیے ملامت قبول نہیں کر سکتا ہے۔

عادل: (جعفری صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے) صاحب میں پوچھتا ہوں کہ یہ نظم ترقی پسند ہے کہ نہیں؟

جعفری: سو فیصد۔

عادل: آپ ہنستے کیوں ہیں؟

جعفری: میں ہنس نہیں رہا ہوں۔ (حالانکہ وہ ہنس رہے تھے)

ممتاز حسین: کیا ان کا یہ کہنا سند ہے؟

عادل: نہیں..... میں سب سے پوچھنا چاہتا ہوں۔

ممتاز حسین: صاحب صدر کی اجازت سے میں کچھ فنی خامیوں کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔ ریٹکتے لمحوں کی

فغاں کیا چیز ہے..... اس میں مرکب استعارہ ہے؟ دوسرے یہ کہ اضافت کے بعد نون کا اعلان غلط ہے۔

جعفری: آپ لوگ استعمال کرتے ہیں۔

عادل: میں بدل دوں گا۔

ممتاز حسین:..... اور یہ ریز کے کنگورے بچوں کی محبت کی طرف ہے؟

عادل: ہاں!

ممتاز حسین:..... کیا کوئی دوسرا ریز کا جانور نہیں مل سکتا تھا؟..... (تہقہہ)

اس کے بعد احمد عباس صاحب نے جشن آزادی کے سلسلے میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا پروگرام بنایا۔

اس جلسے میں یہ حضرات موجود تھے..... عالی جعفری، آوارہ، ساحر لدھیانوی، علی رضا نجم، مریم عارف، مومن محی

الدین، ہارون خوشتر، امین بے راج پوری، مجتبیٰ حسن، جنید احمد، مدھو سوڈھن، محمد صفدر، علی سردار جعفری، مجروح سلطانپوری، ممتاز حسین، وشو امتر عادل، احمد عباس، ساٹھے۔

15 اگست 1947ء

15 اگست 1947ء کو دن کے چار بجے یوم آزادی کے سلسلے میں انجمن ترقی پسند مصنفین (بھوپال) کا جلسہ

عام زیر صدارت وجدی الحسینی شروع ہوا۔ شرکاء میں انجم سلیمانی، ایس۔ ایم۔ کامل، عمران الارشد، ابراہیم یوسف، سندھ لعل، صہبا لکھنوی، راشدی، سلمان الارشد، اشتیاق عارف اور کئی دوسرے فنکاروں نے حصہ لیا۔

آزادی کے جلسے کی ابتداء قرآن کریم کی تلاوت سے کی گئی۔ اس کے بعد صہبائی نے کیفی اعظمی کی ایک نظم ”آفریں کوشش کامیاب“ ترنم کے ساتھ پڑھ کر سنائی۔ اس کے بعد جلسے کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا.....

”آج کا دن ہماری تاریخ میں اثر آفرین دن ہے جس کے لیے ہم دو سو سال سے سرگرداں تھے۔ صہبانے پورے جوش کے ساتھ کہا..... ”آزاد ہندوستان زندہ باد“۔

اس کے بعد انہوں نے ایک ریزولوشن پیش کیا جس میں ہندوستان کی آزاد اور خود مختار دونوں مملکتوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے ان مجاہدین سے ہمدردی کا اظہار کیا جو اس جنگ آزادی میں شہید ہوئے۔

وجدی الحسینی نے ریزولوشن کی تائید کی۔ اس کے بعد اشتیاق عارف نے بھی تائید کی لیکن کامل نے روح سے اتفاق کرتے ہوئے ذرا سی ترمیم چاہی کہ وہ ریاستی تین کروڑ باشندے جو ہمارے ساتھ ہیں لیکن مکمل آزادی ان کو حاصل نہیں ہوگی، ان سے ہمدردی کا اظہار نہ کرنا صحیح نہیں۔ ترمیم منظور کر لی گئی۔

اس کے بعد عمران الارشد نے ایک مختصر سی تقریر کی اور ایک ریزولوشن پیش کیا جو فرانسیسی ہندوستان میں رہنے والوں کے مطالبہ آزادی کی حمایت کرتا تھا۔ انجم سلیمانی نے عمران الارشد کی تائید کرتے ہوئے فرانسیسی ہند کو بھی ہندوستان

کی آزادی کا حصہ دار بنایا۔ اس کے بعد ایم۔ کمال نے ”سیاسی نظام“ کے عنوان پر ایک پرمغز تقریر کی جس میں اس جاگیر دارانہ نظام کو ختم کرنے اور آزاد ہندوستان میں سب کی آزادی کے حقوق پر روشنی ڈالی۔ اس کے بعد مقصود عمرانی نے ایک نظم ”نئے آثار“ سنائی۔

بعد ازاں قمر جمالی نے ایک افسانہ بنایا جس کا عنوان قائم نہ ہوا تھا جس میں ملنے والی آزادی کو ”اجتماعیت“ کے زاویہ نگاہ سے دیکھا گیا تھا۔

عمران الارشد نے ایک افسانہ ”کروٹ“ جو 15 اگست پر ملنے والی آزادی سے متعلق تھا، سنایا جس میں موجودہ ماحول کی بڑی خوبی سے عکاسی کی گئی تھی۔ مطمئن اور غیر مطمئن عوام کا نقشہ کھینچا تھا۔ بعد میں 15 اگست سے متعلق صہبا لکھنوی نے ایک قطعہ سنایا۔

اس کے بعد جلسہ ”آزاد ہندوستان زندہ باد“ کے نعروں پر ختم ہوا اور تمام ممبران نے پورے خلوص اور گرم جوشی کے ساتھ آپس میں معانقہ کیا۔ فضا خوشیوں سے معمور اور قہقہوں سے گونج رہی تھی۔

31 اگست 1947ء

انجمن ترقی پسند مصنفین کا ہفتہ وار جلسہ سجاد ظہیر صاحب کے مکان پر منعقد ہوا۔ اس جلسے کی صدارت مجروح سلطانپوری نے فرمائی۔ پروگرام حسب ذیل تھا.....

(1) اردو ہندی کا مسئلہ: انجمن ترقی پسند مصنفین کا نظریہ

(2) غزل: مجروح سلطانپوری

اردو ہندی زبان کا مسئلہ جو انجمن کے دس گیارہ حضرات کے مشورے سے علی سردار جعفری نے بتایا تھا، ممتاز حسین نے پڑھ کر سنایا اور اس پر اظہار رائے کی دعوت دی۔

انجمن کے تمام حاضرین نے مضمون کے نقطہ نگاہ سے کلی طور پر اتفاق کیا لیکن وشوا متر عادل نے ایک بڑے پتے کی بات بتائی کہ ہمیں اس موقع پر اس کا اعلان ہی کر دینا چاہیے کہ پاکستان کی سرکاری زبان کیا ہوگی۔ اس پر ایک اچھی خاصی بحث چھڑ گئی جس کا خلاصہ یہ تھا۔

ممتاز حسین: انجمن کا نقطہ نگاہ ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں کی زبان کے بارے میں بہت ہی واضح طور سے پیش کیا جا چکا ہے۔ ہر خطے کی زبان نہ صرف برقرار رکھی جائے گی بلکہ اس کو موقع بھی دیا جائے گا کہ وہ سرکاری کاروبار کو بھی اس زبان میں چلائیں اگر ان میں یہ صلاحیت پائی جاتی ہے۔ اس لیے اس موقع پر جبکہ صرف ہندوستان کی سرکاری

زبان کے بارے میں انجمن اپنی رائے پیش کر رہی ہے، پاکستان کے بارے میں مزید توضیح کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔
عادل: فرض کیجیے کہ آپ ہندوستان میں اردو ہندی دونوں کو سرکاری زبان بنا لیتے ہیں اور ادھر پاکستان صرف
اردو کو سرکاری زبان بنالے تو اس سے ہندی کو نقصان پہنچے گا۔

ممتاز حسین: نقصان پہنچے گا کہ نہیں، یہ تو نہیں معلوم لیکن اردو کو جزوی طور سے عائد کرنا نہ صرف نا انصافی ہے بلکہ
دوسری زبانوں کا گلا گھونٹنے کے برابر ہے۔ پاکستان کی سرکاری زبان کیا ہوگی، مجھے ابھی تک اس کا علم نہیں ہے۔
عادل: صاحب..... لاہور سے تمام پروگرام اردو میں ہو رہے ہیں۔

سلطانہ: اردو پاکستان کی سرکاری زبان شاید اس وجہ سے بھی بن سکتی ہے کہ اس علاقے کے تمام خطوں کا رسم الخط
فارسی ہے۔

عادل: اور بنگال.....؟

سلطانہ: بنگال میں بنگالی رہے گی۔

ممتاز حسین: لیکن سرکاری کاغذات جو مرکز سے آئیں گے وہ تو اردو ہی ہوں گے۔

سلطانہ: ہو سکتا ہے کہ انہیں بنگالی میں لکھ کر بھیجا جائے۔

یہ بحث یوں ہی چلتی رہی لیکن معلوم نہیں کیسے پھر ابتدائی نکتے پر آگئی جبکہ عادل صاحب نے اس کا مطالبہ کیا کہ
ان کی ترمیم بذریعہ ڈاک الہ آباد بھیج دی جائے کہ پاکستان میں اردو اور ہندی دونوں زبانوں کو سرکاری بنایا جائے۔
ممتاز حسین: چونکہ یہ مضمون کوئی ریزولوشن نہیں ہے، اس لیے ترمیم پیش کرنا غلط ہوگا۔ دوسرے یہ کہ وہ مضمون
کے تمام خیالات سے اتفاق کرتے ہیں اس لیے اسے ترمیم کہنا اور بھی غلط ہے۔ یہ صرف ایک مشورہ ہے اور جب اردو اور
ہندی کی ملی جلی ہوئی کانفرنس ہوئی تو آپ کو یہ حق ہوگا کہ آپ اپنا مشورہ پیش کریں۔ اس پر وہ رضامند ہو گئے لیکن انجمن کی
تنظیم کے بارے میں ایک دوسرا اعتراض کیا۔ وہ یہ کہ مندوبین کو بھیجنے سے پہلے ایک باقاعدہ جلسہ کرنا چاہیے تھا جہاں پر یہ
مضمون پڑھا جاتا اور مندوبین منتخب کیے جاتے لیکن جب انہیں یہ بتایا گیا کہ یہ سب کام بہت ہی عجلت میں ہوا ہے کیونکہ
وقت بہت تنگ تھا انہوں نے بات مان لی۔ اس کے بعد مجروح سلطانی پوری نے ایک تازہ غزل سنائی۔

اس غزل کے ایک شعر پر کافی بحث رہی جس کا مطلب کچھ اس قسم کا تھا.....

”اے دوست خون ناحق کی تلانی ایک دن ہو کر رہے گی۔ یہ بات اور ہے کہ یہ راز صرف تیری محفل تک

محدود ہے۔“

ممتاز حسین: کیوں.....؟

عادل: بالکل رسمی ہے۔ (مجروح کو مخاطب کرتے ہوئے) آپ یہ بتائیے کہ یہ خون ناحق کس کا ہے، عاشق کا یا

مزدور کا؟

مجروح: ہر اس شخص کا ہے جس کے ساتھ نا انصافی کی گئی ہے۔ اس زمرہ میں عاشق اور مزدور دونوں کو لاتا ہوں۔
ممتاز حسین: عشق کی چہرہ دستیاں اور اقتصادی لوٹ کھسوٹ میں بہت فرق ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ اسے

صرف غزل کا شعر رہنے دیجئے۔

مجروح: غزل میں جو عمومیت ہوتی ہے وہ سب پر حاوی ہے۔

ممتاز حسین: عمومیت زندگی کے صرف ایک پہلو کی ہوا کرتی ہے پھر یہ کہ دوسرے مصرعے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ

معشوق کی نامہربانیوں کی بات ہے۔ ایسی صورت میں عاشق کا خون ناحق کیوں تصور کیا جائے؟

اس کے بعد عاشق معشوق، مزدور اور سرمایہ دار کو غلط ملط کر کے بحث ہونے لگی۔ پر لطف بات یہ رہی کہ مجروح

نے عاشق کو بھی لٹے ہوئے مزدور کی صف میں کھڑا کر دیا اور اس بحث میں عادل صاحب اور مجروح صاحب نے اتنی

باتیں کیں کہ ان کو قلمبند کرنا بہت مشکل ہے۔ مجبوراً اس بحث کو ختم کر کے ان سے دوبارہ غزل سنی گئی جسے ہر شخص نے پسند

کیا۔

اس جلسہ میں یہ حضرات موجود تھے: موہن سہگل، دشو امتر عادل، بھوان گارگا، جے نکیش، ہارون خوشتر،

عبد القادر، شیا م سندر گپتا، عبداللہ، رحمت اللہ، سالک انصاری، عبدالحق انصاری، رمیش گوالیاری، محمد حسین، وارث میر،

فیاض علی، سید احمد علی، رام راکوئی، حنیف محمد علی، محمد یسین، ممتاز حسین، مجروح سلطانپوری، سلطانہ بیگم وغیرہ۔

17 ستمبر 1947ء

اس ہفتہ کا جلسہ خواجہ احمد عباس کے مکان پر منعقد ہوا۔ جلسہ کی صدارت عصمت چغتائی نے فرمائی۔ پروگرام

حسب ذیل تھا:

(1) خواجہ احمد عباس (کہانی) اس کا کوئی عنوان نہیں تھا۔

(2) شباب (آزاد نظم)

عباس صاحب نے یہ کہانی ہندو مسلم فساد سے متعلق لکھی ہے۔ عباس صاحب کی کہانی پر جو اعتراضات ہوئے

اس کا خلاصہ یہ ہے۔

مہدی: میرے خیال میں آپ نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان توازن قائم کرنے کی کوشش کی ہے جس سے یہ میکانگی ہو گئی ہے۔

عباس: ہاں! یہ تو ایک مجبوری تھی۔

عادل: اس سے میرے جذبات میں کوئی ہرجان نہیں پیدا ہوتا اور نہ کچھ رد عمل پیدا ہوتا ہے۔

عباس: میکانگی ضرور ہے۔ میں نے صرف Symbol سے کام لینا چاہا تھا لیکن عادل کا اعتراض داخلی ہے۔

مہدی: آپ کی کہانی ”اجنٹا“ میکانگی نہیں ہے حالانکہ اس وقت کا فساد آج کے فساد کے مقابلہ میں کم پایہ کا تھا۔

عباس: ہاں یہ تو صحیح ہے۔

عادل: ذاتی زندگی کو زیادہ تفصیل سے بیان کرنا چاہیے۔ (کسی ایک خاص جگہ اشارہ کرتے ہوئے۔)

عباس: ہاں! وہاں پر۔

اس کے بعد شباب نے اپنی نظم سنائی اور اس پر کچھ بحث ہو بھی چکی تھی جب میں جلسہ میں حاضر ہوا۔ اس لیے میں اس کے متعلق زیادہ نہیں لکھ سکتا ہوں کیونکہ شاعر نے کوئی نقل بھی نہیں چھوڑی ہے۔ ہاں مجھے اتنا ضروری یاد ہے جب میں وہاں پہنچا تو مہدی Democratic کے لفظ پر بحث کر رہے تھے۔ بحث اس بات پر تھی کہ شباب نے کرشن جی کو جمہوریت کا مبصر بتایا ہے۔ مہدی کو یہ اعتراض تھا کہ جمہوریت کا لفظ موجودہ دور کا لفظ ہے جسے ایک خاص معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ ان کے نزدیک یہ تاریخی غلطی تھی۔ عباس نے بتایا کہ اس کے ادبی معنی ہیں، میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ جمہوریت کا تصور بہت پرانا ہے۔ ہندوستان کے دیہات میں جمہوری زندگی رہ چکی ہے۔ اس لیے کچھ مضائقہ نہیں ہے۔

24 ستمبر 1947ء

اس ہفتہ کا جلسہ مہندر ناتھ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ پروگرام حسب ذیل تھا۔

- (1) کرشن چندر: (کہانی) اندھیرا
- (2) ممتاز حسین: (کہانی) ایک بورڈ اور عورت
- (3) سردار جعفری: ہندی کانفرنس کی رپورٹ۔

ابتداء عرض ہے کہ کرشن چندر نے ہندوستان کے اس زمانہ بربریت میں چھ کہانیاں لکھی ہیں جن میں سے ہر ایک فرقہ وارانہ فساد کے کسی ایک پہلو کی حامل ہے۔ ان کہانیوں کا مجموعہ بعنوان ”ہم وحشی ہیں“ عنقریب چھپ کر آپ کے سامنے آنے والا ہے۔ اس مجموعے کی پہلی کہانی کرشن چندر نے سنائی جب وہ ختم کر چکے تو ہر ایک شخص پر خاموشی کا عالم تھا۔

زیادہ تر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ جب تک پورا مجموعہ نہ پڑھا جائے مکمل اثر قائم نہیں ہوتا۔

اس کے بعد ممتاز حسین نے اپنی کہانی سنائی۔ جو نبی انہوں نے ختم کیا..... کرشن چندر نے کہا..... "Good"

محمد علی: آپ نے لکھا گلہری کی سی شہوانی آواز۔

ممتاز حسین: جی ہاں! آپ گلہری کی آواز ذرا سنیے تو.....

کرشن: مجھے یہ ایکسپریشن بہت ہی پسند آیا۔

اس کے بعد علی سردار جعفری نے ہندی کانفرنس پر تبصرہ کیا جو حال ہی میں الہ آباد میں منعقد ہوئی تھی۔ تبصرہ کرنے سے پہلے انہوں نے ایک غلط فہمی کا ازالہ کیا۔ وہ یہ کہ سردار جعفری اور سجاد ظہیر بحیثیت نمائندے کے نہیں گئے تھے بلکہ ہندی والوں نے انہیں مدعو کیا تھا۔ دوسرے یہ کہ جو پیغام یہاں سے لکھ کر بھیجا گیا تھا اس کی ذمہ داری ان ہی حضرات پر تھی جنہوں نے دستخط کیے تھے۔ رپورٹ یا تبصرے کا خلاصہ یہ ہے.....

1۔ ہندی کانفرنس میں دو گروہ کے لوگ تھے۔ ایک وہ جو اردو کو خالص مسلمانوں کی زبان سمجھتے ہیں اور اس کے

اسی فیصدی الفاظ کو عربی اور فارسی بتاتے ہیں۔

2۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو اسے اسی ملک کی زبان سمجھتا ہے اور جو اردو کو مٹانا نہیں چاہتا ہے۔ اس خیال کی

موافقت پنڈت امر ناتھ جھانے بھی کی۔

اسی گروہ کے چند حضرات آسان اردو اور آسان ہندی کے امتزاج سے ہندوستانی زبان کی بنیاد بھی ڈالنا چاہتے

ہیں لیکن مخالفین سے اس قدر خائف ہیں کہ پہل کرنے کے لیے تیار نہیں۔

ہندی کانفرنس کا یہ فیصلہ رہا ہے کہ انہوں نے فی الحال ایک کمیٹی بنادی ہے جو ہندی اور اردو کے بنیادی مسئلوں

پر ایک رپورٹ تیار کرے گی جس کی بناء پر وہ آئندہ اردو ہندی کے ملے جلے اجلاس میں کوئی فیصلہ کر سکیں گے۔ اس سلسلے

میں کل ہندی اردو کانفرنس بھی لکھنؤ میں ہونے والی ہے جس میں اس مسئلہ پر غور کیا جائے گا۔ بہر حال فضا اتنی ناسازگار

نہیں ہے جتنا کہ بالعموم سوچا جا رہا تھا۔

علی گڑھ کا جلسہ

انجمن ترقی پسند مصنفین علی گڑھ کا یہ جلسہ معین احسن جذبی کی صدارت میں "الحمر" میں منعقد ہوا جس میں رشید

احمد صدیقی، آل احمد سرور، انور انصاری، رشید گورکھپوری، اشعرلیج آبادی، انور میر، قاضی سلیم، مسلم رشید، فرید بخش قادری،

خلیل الرحمن، باقر مہدی، منظور الحسن، نسیم انصاری اور اولاد احمد صدیقی نے شرکت کی۔ یوسف حسن کے روداد سنانے کے

بعد فرید بخش قادری نے ترقی پسند ادب پر مقالہ پڑھا۔

باقر: ایک جگہ آپ نے لکھا ہے کہ سجاد ظہیر اپنی شہرت کے بھی خواہشمند تھے۔ میرے خیال میں آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔

خلیل: سجاد ظہیر کی خدمات کو ہم فراموش نہیں کر سکتے، انہوں نے ایک جماعت کو منظم کیا اور ترقی پسند ادب کی تحریک کو چلانے میں پیش پیش رہے ہیں۔ علاوہ اس کے آپ نے اپنے مقالے میں ڈاکٹر تاثیر کا تذکرہ غیر ترقی پسندوں میں کیا ہے حالانکہ ڈاکٹر تاثیر کو ترقی پسند ادب سے کسی بھی حالت میں خارج نہیں کیا جاسکتا۔

آل احمد سرور: جو اپنے آپ کو ترقی پسند کہتے ہیں، انہیں ظرافت اور مزاح کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔ جو آپ کو کہنا ہے اس میں کوشش نہ کیجیے کہ دلچسپ فقرہ آجائے۔ اس لیے کہ وہ چیز نہایت مشکل امر ہے۔ صاف اور واضح خیال کو صاف اور واضح طور پر ادا کرنا چاہیے۔ دوسری بات یہ کہ ہر دور میں بعض اچھے رجحان رہے ہیں، تشریح سے اس کا جائزہ لینا چاہیے اور ادب کی مختلف اصناف کو تقسیم کر کے اس کا تجزیہ کرنا چاہیے۔ مثلاً افسانہ، مقالہ، غزل، نظم اور آزاد نظم وغیرہ خاص خاص اصناف کے مختلف پہلوؤں پر غور اور مطالعہ کرنا چاہیے۔ کوئی ترقی پسند نہیں کہتا کہ مزدوری، بھوک، روٹی، جنسی میلانات ضروری ہیں۔ ترقی پسندی تو جنسیات سے بالاتر ہے۔ خود جوش کو لے لیجیے۔ جوش کے یہاں بعض اشعار بہت مہمل ہیں اور خاص طور پر کرخنگی کی وجہ سے لیکن ہمیں تو اس کے پورے کارناموں کو بحیثیت مجموعی دیکھنا چاہیے۔ میراجی کی شاعری اچھا تجزیہ ہے لیکن جنسی ابہام ترقی پسندی کے خلاف ہے۔ فرید بخش قادری کا مقالہ میرے خیال میں بہت اچھا ہے۔

اشعریچ آبادی نے ایک غزل سنائی جو پسند کی گئی۔ اس کے بعد یوسف نے ایک افسانہ ”طلوع و غرب“ پڑھا۔

آل احمد سرور: افسانہ کا پہلا حصہ دوسرے سے اچھا ہے۔

خلیل الرحمن نے ایک گیت ”ویرانہ“ سنایا جس پر کسی نے کسی قسم کا کوئی اعتراض نہیں کیا۔ انجمن کے مقررہ پروگرام کے ختم ہونے پر پروفیسر رشید احمد صدیقی نے فرمایا۔

”حضرات! پہلے کچھ سرور صاحب کے بارے میں، پھر کچھ اپنے بارے میں، اس کے بعد آپ لوگوں کے بارے میں۔ آج ہی مجھے معلوم ہوا کہ انجمن ترقی پسند مصنفین یہاں بھی قائم ہے۔ میں بہت خوش ہوں کہ آپ لوگوں نے یہ چیز قائم کی۔ میں اس کی تصدیق سرور صاحب کی وجہ سے کر رہا ہوں کیونکہ جہاں کہیں فتنہ فساد ہوا اور پتہ نہ چلتا ہو تو سرور صاحب کو بلا لیجیے..... معلوم ہو جائے گا۔ اپنے بارے میں یہ کہنا ہے کہ ترقی پسندی کے سلسلہ میں جب سجاد ظہیر میرے یہاں آئے اور اس تحریک پر گفتگو کرنے کے بعد رائے قائم کی گئی کہ ترقی پسند مصنفین پر وہ جو اعلان شائع کریں گے اس

میں میرا بھی نام ہوگا سجاد ظہیر کا جو اعلان شائع ہوا اس میں میرا نام نہیں تھا۔ اب کچھ آپ کے بارے میں..... جب کوئی تحریک شروع ہوتی ہے تو تحریک کو چلانے والے یہ خیال کرتے ہیں کہ ان کے سوا دوسرے اہل نہیں ہیں۔ اس میں میرا عقیدہ اس معرکہ پر ہے.....

غزل اس نے چھیڑی ذرا سا زدینا

صحیح فنکار اور شاعر وہ ہے کہ جب غزل کہے تو اس سے ہم آہنگ ہو، عمر رفتہ کی ان کو ضرورت ہوتی ہے جن کو فن پر

اعتماد نہیں ہوتا۔

ترقی پسند مصنفین کی ابتداء تو بہت شدومد سے ہوئی تھی مگر اب گزری باتوں کا اس طرح ماتم کیا جاتا ہے جس طرح انسانیت ماتم کرتی ہے۔ ترقی پسندی کو ایک لیبل نہ بنائیے مگر یہ دیکھئے کہ آپ کے دل میں وہ حوصلہ ہے یا نہیں۔ لیبل سے بہت سی صلاحیتیں مردہ ہو جاتی ہیں۔

اگر ترقی پسندی پر ایک لیبل نہ لگایا جاتا تو ہمارے مصنف اس راستے سے بہت کامیاب ہوتے۔ ادب وہ ہے جو بڑے آدمی کی پیداوار ہو۔ یہ نہ دیکھئے کہ جب تک مزدوری اور افلاس کو نہ لائیں گے کامیاب نہ ہوں گے۔ یہ نظریہ..... کہ ہر راستہ روم کو جاتا ہے، غلط ہے۔ آپ نو جوانوں کو اپنی استعداد پر بھروسہ اور اعتماد ہے مگر ہر شخص کو ترقی پسند کہنا ضروری نہیں۔ میں اس جماعت کو مخاطب نہیں کر رہا ہوں بلکہ پورے طلباء کو جو میری امانت ہیں۔ آپ اپنی قابلیت کو سمجھیں، ابھی آپ کی ابتداء ہے۔ عمر کے اعتبار سے بھی آپ ابھی بچے ہیں جب تک آپ اپنے پاؤں پر کھڑے نہ ہوں، پریڈ کرانا یا منزل دکھانا بالکل غلط ہے۔ اگر آپ Advance ترقی پسند ہیں تو میں صلاح دوں گا لیکن دوسری چیزوں میں بھی مجھے اعتماد ہے کہ جس لائن کو آپ اختیار کریں گے میں آپ کا ساتھ دوں گا۔

ابھی حیدرآباد میں آپ کے گروہ کے چند اشخاص کی باتیں مجھے پسند نہ آئیں کہ وہ کسی ذمہ دار آدمی کو برا بھلا کہیں۔ یہ ترقی پسندی نہیں ہے۔ اس لیے درخواست کروں گا کہ آپ ابھی طالب علم ہیں۔ آپ نعروں پر نہ جائیے، شہرت وہوس پر نہ جائیے۔ علی گڑھ میں جو تحریک شروع کی جائے خواہ رجعت پسند ہی کیوں نہ ہو، دوسرے کے لیے باعث رشک ہو، اچھے اور نئے لکھنے والے سب کی ابتداء علی گڑھ سے ہوئی اور زوال بھی علی گڑھ سے ہی ہوا۔ آپ کی چیزیں صرف معیاری ہی نہ ہوں بلکہ دوسروں کے لیے نمونہ ہونا چاہئیں۔ آپ کے لیبل پر دوسرے دوڑیں۔ میں چاہتا ہوں کہ علی گڑھ سے جو تحریک شروع ہو وہ سر آنکھوں پر لی جائے۔ آپ دوسروں کی پیروی نہ کیجیے۔ اگر آپ کو کسی سے امید نہ ہو تو مجھ پر بھروسہ رکھیے۔

اس کے بعد آل احمد سرور نے ایک مختصر تقریر کی۔ آپ نے فرمایا..... ”اس کا خیال ضرور رکھنا چاہیے کہ انجمن کے جلسوں میں محض ادبی چیزیں ہی ہوں۔ دوسرے علمی شعبوں کی طرف بھی توجہ ضروری ہے۔ علمی مضامین بھی کبھی رکھے جائیں۔ ترقی پسندی کے لیے یہ چیزیں مفید ہوں گی۔ جو اصحاب جن شعبوں سے تعلق رکھتے ہیں، اس مجلس کو ان سے آگاہ کرائیں۔ استاد نئی نئی کتابوں اور ان کی خصوصیات سے آشنا کرائیں۔ مجلس میں علمی موضوعات پر سوچنا اور بحث بھی کرنی چاہیے تاکہ انجمن کے مصنفین کی معلومات میں اضافہ ہو۔ یہ بھی خیال رکھیے کہ سال میں ایک دو بار عام جلسہ ہونا چاہیے تاکہ آپ کو اپنے کام کا اندازہ ہو۔ علاوہ اس کے آپ کو کسی اچھے شاعر کا یوم بھی منانا چاہیے۔“

آخر میں معین احسن جذبی نے فرمایا کہ آپ لوگوں کو رشید احمد صدیقی صاحب اور آل احمد سرور صاحب کا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ انہوں نے جلسہ میں تشریف لاکر آپ لوگوں کی معلومات میں اضافہ کیا اور انجمن کی ہمت افزائی فرمائی۔

علی گڑھ کا جلسہ

مسلم یونیورسٹی کے ترقی پسند مصنفین کا یہ جلسہ 10 جنوری 1947ء کو معین احسن جذبی کی صدارت میں ہوا۔ معین احسن جذبی، ڈاکٹر مسعود، انور انھار، رشید گورکھپوری، مسلم حیدر آبادی، خلیل الرحمن، باقر مہدی، قاضی سلیم، طالب بدایونی، اشعر علی آبادی، عبدالحق صدیقی، نسیم انصاری اور دوسرے اصحاب نے جلسہ میں شرکت کی۔

یوسف حسین، سیکرٹری انجمن ترقی پسند مصنفین کی روداد سنائے جانے کے بعد معین احسن جذبی نے فرمایا کہ سب سے پہلے ہمیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ ترقی پسند ادب کہتے کسے ہیں؟

جذبی نے کہا کہ ہمارے اکثر نوجوان ادیب غلط فہمی میں مبتلا ہیں اور ترقی پسند ادب کے مفہوم کو ابھی تک پوری طرح سمجھنے سے قاصر رہے ہیں۔ نوجوان شعراء ابہام کے چکر میں اس طرح گرفتار ہیں کہ جو خیال وہ پیش کرتے ہیں، پڑھنے والوں کے لیے ایک معمہ بن جاتا ہے جس سے پرہیز کرنا چاہیے اور ترقی پسند ادب پر مقالے لے بھی پڑھے جائیں تاکہ مفہوم صاف طور پر واضح ہو جائے۔

اس کے بعد مسلم حیدر آبادی نے ایک آزاد نظم سنائی جس کا عنوان تھا ”تخلیق“۔

خلیل الرحمن نے اعتراض کیا کہ نظم مبہم ہے۔

ڈاکٹر مسعود نے جواب دیا کہ پہلا بند حسین اور تراشا ہوا ہے لیکن دوسرے بند میں مسلم صاحب جو کہنا چاہتے ہیں وہ کہہ نہیں پائے۔

مسلم نے نظم پر نظر ثانی کرنے کا وعدہ کیا چنانچہ یہ نظم آئندہ مجلس میں پھر سنائی جائے گی۔ نسیم انصاری نے ایک

معری نظم ”ساتھی“ سنائی۔ نسیم کی یہ پہلی کوشش تھی جیسا کہ انہوں نے اظہار کیا۔

اشعر نے کہا..... ”نظم کا مفہوم فرسودہ ہے، اچھا نہیں ہے۔ الفاظ میں بھی فنکارانہ صلاحیت نہیں ہے مگر چونکہ نسیم صاحب کی پہلی کوشش ہے اس لیے زیادہ اعتراض کا موقع نہیں ہے۔“

نسیم کی نظم میں ایک ترکیب تھی ”گمنام زنجیریں“ جس پر ڈاکٹر مسعود نے کہا کہ اگر گمنام کی بجائے بے نام ہوتا تو زیادہ اچھا ہوتا۔ نسیم نے اس اصلاح کو پسند کیا۔

اشعر نے ایک غزل پڑھی.....

کا رزارِ حیات آگ ہی آگ
آگ میں ہے مگر گلوں کا سہاگ

اس پر جذبی نے یہ اعتراض کیا کہ جب کارزار حیات کو ایک بار آگ ہی آگ تصور کر لیا تو پھر اس آگ میں گلوں کا وجود کیسے ہو سکتا ہے؟

ڈاکٹر مسعود نے اس اعتراض کے جواب میں ”گلزار ابراہیمی“ کی تلمیح کا حوالہ دیا۔

اشعر نے جواب دیا کہ بظاہر کارزار حیات آگ ہی آگ ہے لیکن اگر زندگی سے گریز نہ کیا جائے تو اس میں ایسے پہلو مل جائیں گے جہاں سکون اور آرام نصیب ہو سکے اور اس کو گلوں کے سہاگ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اسی غزل کا ایک اور شعر تھا.....

میری حیرت میری تمنائیں
جیسے افسردہ سی بجھی ہوئی آگ

ڈاکٹر مسعود نے فرمایا کہ اگر ”بجھی ہوئی آگ“ کی بجائے ”بجھی سی آگ“ کر دیا جائے تو شعر میں موسیقیت بڑھ جاتی ہے۔ اشعر نے شکر یہ کے ساتھ اس رائے کو قبول کر لیا۔

اس کے بعد ظفر عمر نے ایک غزل ”نئے جلوے“ سنائی۔ اشعر نے کہا کہ غزل کا انداز بالکل اختر شیرانی جیسا ہے۔ جذبی کا اعتراض یہ تھا کہ غزل میں مواد کے لحاظ سے کوئی جدت اور انفرادیت نہیں ہے۔ انور انصاری نے کئی تراکیب پر اعتراض کیا۔

طالب بدایونی نے ایک نظم پڑھی جس کے دو بند تھے۔ پہلے بند میں قدیم شاعر سے خطاب کیا گیا تھا اور دوسرے بند میں جدید شاعر سے۔

طالب نے جدید شاعر کو ہر جگہ مخاطب کیا تھا کہ وہ مغرب پرست ہے اور خدا کے وجود سے بھی منکر ہے۔ اس پر نسیم بولے کہ اس قسم کی غیر ترقی پسندانہ نظموں کو پڑھا جانا اس مجلس میں مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ حاضرین بھی اس پر رائے سے متفق تھے مگر طالب نے یہ کہہ کر کہ یہ تنقید میں نے اپنے نقطہ نظر سے کی ہے، اعتراض کو نباہ دیا۔ اس کے بعد قاضی سلیم نے ایک نظم ”ادھوری لے“ سنائی۔

نظم کے دوسرے بند میں ڈاکٹر مسعود کا یہ اعتراض تھا کہ مفہوم واضح نہیں ہے اور جذبی کا خیال تھا کہ مصرعوں کی ترکیب ایسی ہے کہ دوسرا خیال پیدا ہو جاتا ہے۔ اس نظم میں ایک ترکیب تھی ”مدہوش شبستاں“ جس سے سلیم کی مراد طفلی کا وہ زمانہ تھا جب انسان محبتوں کی لذتوں سے بے خبر ہوتا ہے۔

اشعر نے اعتراض کیا کہ اس ترکیب سے وہ زمانہ ذہن میں آتا ہے جب انسان محبت میں بدست ہو۔ جذبی کا بھی یہی خیال تھا کہ مدہوشی کا زمانہ اصل میں محبت کا زمانہ ہے۔ سلیم اس ٹکڑے کو بدلنے پر راضی ہو گئے۔

ڈاکٹر مسعود نے غزل کے پانچ چھ شعر سنائے جو پسند کیے گئے۔

جذبی نے ایک نظم سنائی جو بہت پسند کی گئی۔

جب چائے کا دور شروع ہو چکا تھا تو رشید صاحب تشریف لائے۔

اجلاس میں شاہد صدیقی (ایڈیٹر روزنامہ ”صبح دکن“ حیدرآباد) نے حکومت حیدرآباد کے اس فیصلے کے خلاف قرارداد پیش کی جس کی رو سے انجمن ترقی اردو کی گرانٹ بند کی گئی ہے۔ محرک نے تحریک کرتے ہوئے یہ بتایا کہ مسئلہ اتنا اہم ہے کہ اس پر تقریر کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ صدر نے منظوری کے لیے تجویز پیش کرتے ہوئے البتہ کچھ روشنی ڈالی اور بتایا کہ اس گرانٹ کے موجودہ التواء پر سارے ہندوستان میں مہمان اردو سخت زنجیدہ ہیں بلکہ اسے ریاستی نظم کی ایسی بد عنوانیوں کا نتیجہ کہا جاسکتا ہے جن کا پس منظر عموماً ذاتیات ہوتا ہے۔ کچھ عرصہ ہوا کہ حیدرآباد میں سرمرزا اسماعیل وزیر اعظم ہو کر آئے ہیں۔ سرمرزا اسماعیل طبعاً اردو کے دوست نہیں ہیں اور انجمن ترقی اردو نے ہمیشہ ان کی اردو کے ساتھ ایسی حکمت عملی کے خلاف احتجاج کیا ہے۔ ممکن ہے کہ اسی وجہ سے سرمرزانے انجمن ترقی اردو کو اپنا نشانہ بنایا ہو۔

حیدرآباد میں خود اس فیصلے کا رد عمل بہت خراب ہوا ہے۔ حتیٰ کے وہاں کے قدامت پرست اخبار بھی اس پر معترض ہیں اور عام طور پر یہ کہا جا رہا ہے جبکہ بہت سی دوسری غیر ضروری امدادیں جاری ہیں جن کا مصروف کبھی صحیح نہیں ہو سکتا۔ ایک علمی اور ادبی ادارے کی بہت سی حقیر سی یہ امداد محدود کر دینا قطعاً مستحسن فعل نہیں ہے۔ یہ تجویز بھی بالافاق

منظور کر لی گئی۔

اس کے بعد رشیدی نے ایک غزل سنائی.....

جوانیاں لیے ہوئے کہانیاں لیے ہوئے

اشعر نے یہ اعتراض کیا کہ غزل کی تمام تراکیب اور الفاظ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ فراق کارنگ پوری طرح حاوی

ہے اور جس سے رشیدی صاحب کی انفرادیت مجروح ہوتی ہے۔ اشعر نے دو مصرعے سنائے.....

(1) یہ پچھلی رات یہ رگ رگ میں نرم نرم کسک

(2) وہ درد اٹھا فراق کہ میں مسکرا دیا

..... اور بولے کہ رشید صاحب نے یہ دونوں مصرعے صرف ایک دو الفاظ اور ردوبدل کے ساتھ اپنی غزل میں لگا

رکھے ہیں۔ غزل کا ایک مصرعہ جس کا آخری ٹکڑا تھا ”ہولیاں لیے ہوئے“ پر اشعر نے اعتراض کیا کہ وہ بحر سے خارج

ہے۔

ڈاکٹر مسعود نے اس مصرعے کو دوبارہ پڑھا اور کہا کہ کھینچ کر پڑھنے سے مصرعہ موزوں ہو جاتا ہے مگر جذبی نے کہا

کہ شعر میں اتنی کھینچ تان اچھی معلوم نہیں ہوتی۔ اگر ”ہولیاں“ سے پہلے ”یہ“ کا لفظ بڑھا دیا جائے تو اچھا ہے۔ رشیدی

صاحب نے اس اعتراض کو تسلیم کر لیا۔

نظم کی دو ترکیبیں تھیں..... کسماتے گلستان اور کسماتی آنکھیں۔

اشعر کا اعتراض تھا کہ کسماتے اس حرکت کو کہتے ہیں جب کسی چیز کو قابو میں لانے کی کوشش کی جائے اور وہ

چیز گریز پر آمادہ ہو مگر یہاں کسمانے کا استعمال غلط ہے۔ مسعود نے بھی اس رائے سے اتفاق کیا۔

غزل پڑھنے کے بعد رشیدی بولے کہ مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہاں اتنی سخت تنقید ہوتی ہے مگر جذبی نے کہا کہ یہ

تنقید بالکل غیر جانبدارانہ اور دوستانہ ہوتی ہے لہذا اس سے گھبرانا نہیں چاہیے۔ اس کے بعد فرمائش پر رشیدی نے ایک

مسلل غزل بعنوان ”رات“ سنائی جو بہت پسند کی گئی۔

اسی اجلاس میں صدیقہ بیگم سیوہاروی نے اپنا افسانہ اور قدوس صہبائی نے اپنا ایک ادب مقالہ ”نئے ادب کا پس

منظر“ پڑھا۔ نظر حیدر آبادی نے ایک نظم سنائی اور اجلاس برخواست کیا گیا۔

حیدر آباد کل ہند ترقی پسند مصنفین کانفرنس

اکتوبر 1948ء میں کل ہند ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس حیدر آباد (دکن) میں منعقد ہوئی۔ بیرونی مہمانوں اور

شریک ہونے والے شاعروں اور ادیبوں کو اسی وقت احساس ہوا کہ حیدرآباد کی دبی گھٹی صلاحیتیں وہاں کے نظام حکومت اور نوکر شاہی کی غیر ذمہ داری کے نتیجہ میں ذہنی ترقی اور سیاسی فکر کی وسعت سے بڑی حد تک محروم رکھی جاتی ہیں۔ اب ابھر کر رہیں گی۔

یہ خیال غلط ثابت نہیں ہوا اور گزشتہ فروری کے تیسرے ہفتے میں حیدرآباد ترقی پسند مصنفین کی انجمن نے اپنا سالانہ جلسہ منعقد کیا جس میں کانفرنس کے علاوہ یوم نظیر بھی منایا گیا اور ایک مشاعرہ بھی منعقد ہوا۔ ہندوستان کے مختلف مقامات سے ادیبوں اور شاعروں کو دعوت دی گئی جن میں سجاد ظہیر، کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، سردار جعفری، کیفی اعظمی، عصمت چغتائی، رضیہ سجاد ظہیر، ساحر لدھیانوی، حمید اختر، پروفیسر شور، قدوس صہبائی، مجروح سلطانی پوری اور پروفیسر پرویز مدعوت تھے۔ مختلف ذاتی وجوہ کی بناء پر کرشن چندر، عصمت چغتائی، خواجہ احمد عباس اور قدوس صہبائی حیدرآباد نہ پہنچ سکے۔ اس کے باوجود کانفرنس کی کامیابی کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ حیدرآباد کے پریس اور پورے شہر میں ہفتہ مذکورہ کے اندر اسی کانفرنس کا چرچا تھا۔

سالانہ کانفرنس

انجمن ترقی پسند مصنفین حیدرآباد کی سالانہ کانفرنس کا پہلا اجلاس زمرد محل ٹاکنیز میں بصدارت سید سجاد ظہیر منعقد ہوا جس کا افتتاح قاضی عبدالغفار سابق ایڈیٹر پیام و ناظم اطلاعات نے کیا۔ سب سے پہلے محمد فضل الرحمن صدر مجلس استقبال نے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے حیدرآباد کی ترقی پسند تحریک پر تبصرہ کیا اور بتایا کہ حیدرآباد بھی تمام دنیا کی ترقی پسند تحریکوں سے فطری اور عملی طور پر ہم آہنگ ہے۔ ڈاکٹر صادق کی تحریک اور محبوب حسین جگر کی تائید کے بعد سید سجاد ظہیر کرسی بصدارت پر آئے۔ قاضی محمد عبدالغفار نے اپنی افتتاحی تقریر میں بتایا کہ ترقی پسند ادب کس طرح ہندوستان کی ساری ادبی تحریکوں پر چھا گیا ہے۔ کیفی اعظمی کی ایک پر جوش نظم کے بعد ابراہیم جلیس نے ”ادب اور سیاست“ پر ایک مقالہ سنایا۔ اس مقالے میں انہوں نے بتایا کہ ہمارا ادب ہندوستان کی تحریکوں سے کس قدر متاثر ہو رہا ہے۔ اس مقالے کے بعد شور (علیگ) نے ”غریب انقلاب“ کے نام سے ایک نظم سنائی اور علی سردار جعفری نے شاعر انقلاب جوش کی شاعرانہ شخصیت کے بارے میں فیض احمد فیض کے نظریے سے اختلاف کرتے ہوئے یہ بتایا کہ جوش جب رومانی انقلاب کی ترجمانی کرتا ہے تو وہ اس ماحول کا لازمی نتیجہ ہے جس میں اس کی شخصیت نے تشکیل پائی ہے۔ اس لیے کہ اشتراکی تنقید کے معیار پر اس کی انقلابی شاعری کو جانچنا صحیح نہیں ہے۔ مجروح سلطانی پوری کی غزل کے بعد ہندو مسلم اتحاد سے متعلق ایک قرارداد پیش کی گئی۔ قرارداد میں کہا گیا کہ ”ہم ادیب اور فنکار جن سماجی اور انسانی قدروں کی ترویج اور بقا کو ادب کا مقصد

سمجھتے ہیں، وہ اس آگ کی نذر ہوتی جا رہی ہے۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ فرقہ وارانہ فساد کسی طرح ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیے مفید نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے برعکس اس نفاق اور خانہ جنگی سے ہماری قومی تحریکوں کو نقصان اور بیرونی سامراجی حکومت کو تقویت پہنچے گی۔

آخر میں ادیبوں اور فنکاروں سے اپیل کی گئی کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو فساد روکنے کے لیے استعمال کریں اور آخر میں سید سجاد ظہیر نے اپنی صدارتی تقریر میں تفصیلی طور پر ترقی پسند تحریک کا جائزہ لیا اور بتایا کہ اب رجعت پسند مخالفت ختم ہو چکی ہے لیکن نئی رجعت پسندی، حسن عسکری اور میراجی کے روپ میں ہماری تحریک کو نقصان پہنچانے کے درپے ہے۔ اس لیے ہم کو ان سے آگاہ رہنا چاہیے۔ دن کے ایک بجے یہ دلچسپ ادبی اجتماع ختم ہوا۔

یوم نظیر

23 فروری کو نظیر اکبر آبادی کی ادبی خدمات کو خراج تحسین ادا کرنے کے لیے ریڈی ہاسٹل میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی جانب سے ”یوم نظیر“ منایا گیا۔ یہ انجمن مذکورہ کی سالانہ کانفرنس کا دوسرا اجلاس تھا جس کی صدارت پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی، (صدر شعبہ اردو علی گڑھ مسلم کالج) نے کی۔ میکش کی تحریک اور جلیس کی تائید کے بعد رشید احمد صاحب کرسی صدارت پر تشریف لائے۔ لطیف ساجد کی نظم اور یوسف ناظم کے مقالہ کے بعد میکش نے نظم سنائی۔ پروفیسر عزیز احمد صاحب نے نظیر کی غزل گوئی کے عنوان پر مقالہ سناتے ہوئے کہا کہ نظیر نے غزل کو عوامی مذاق کے قابل بنا دیا، اردو شاعری میں نظیر کا خاص مقام ہے۔ علی سردار جعفری نے اپنی تقریر میں نظیر کی شاعری کا ترقی پسند شاعری سے تعلق بیان کرتے ہوئے نظیر کی مقبولیت پر روشنی ڈالی اور کہا کہ زبان کے مسئلہ کو حل کرنے میں ہمیں نظیر کی شاعری سے بہت مدد مل سکتی ہے۔ نظیر نے یہ بتایا کہ ادب کسی خاص گروہ کی ملکیت نہیں بلکہ عوام کی ملکیت ہے۔

مقرر نے اس بات کی تردید کی کہ نظیر کی زبان بازاری ہے۔ سجاد ظہیر نے اپنی تقریر میں کہا کہ نظیر کو خراج تحسین ادا کرنے کا بہترین ذریعہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم ایک کمیٹی تشکیل دے کر نظیر کے جاننے والوں کا تعاون حاصل کر کے نظیر کا کلام ملک میں پیش کریں کیونکہ نظیر کا بہت سا غیر مطبوعہ کلام موجود ہے اور جو شائع ہوا ہے وہ ترتیب کے ساتھ نہیں ہے۔

اس سلسلہ میں اعلان کیا گیا کہ نظیر کے کلام کی اشاعت کے لیے سکندر علی صاحب وجد نے پانچ سو اور نواب میر

اکبر علی خاں (بیرسٹر) اور لکشمی ریڈی بار ایٹ لاء نے ایک ایک سو روپے عطیہ دیا ہے۔

صدر جلسہ نے اپنی تقریر میں کہا کہ نظیر کا ہم پر بڑا احسان ہے۔ نظیر کی زبان ایسی ہے جس کو عوام سمجھتے اور خوش

ہوتی ہیں۔ زبان کے اعتبار سے نظیر نے ادب کو عوام سے قریب تر کر دیا ہے۔

مشاعرہ

انجمن ترقی پسند مصنفین کی سالانہ کانفرنس کا اختتام مشاعرہ پر ہوا جو 23 فروری کی رات علی سردار جعفری کی صدارت میں راجہ پرتاپ گڑھ کی کونھی میں منعقد ہوا تھا جس میں مقامی اور بیرونی شعراء نے حصہ لیا۔ مقامی شعراء میں فضل گلبرگوی، یوسف ناظم، کنور پرشاد میکش، شاہد صدیقی وجد، سلیمان ادیب اور تحسین قابل ذکر ہیں۔

شکور بیگ کا مزاحیہ کلام ”عثمانیہ“ کے مدرسین کا ”شکوہ“ بہت پسند کیا گیا۔ بیرونی شعراء میں کیفی اعظمی، مجروح سلطانپوری اور پروفیسر شوری کی نظموں نے خراج تحسین حاصل کیا۔ صدر مشاعرہ علی سردار جعفری کے کلام پر ات کے ڈیڑھ بجے یہ ادبی صحبت برخواست ہوئی۔

حیدرآباد کا ادبی شعور اور ترقی پسند رجحانات کی یہ مقبولیت تحریک کے لیے ایک بہت ہی مبارک نشان ہے۔ حیدرآبادی ادیب اور شاعر و آرٹسٹ مبارکباد کے مستحق ہیں جنہوں نے رجعت پرستی اور فرسودہ نظام کے ایک مضبوط قلعے میں ذہنی ترقی و فکری بیداری کا چراغ روشن کیا ہے۔

دیودھرا اسکول آف آرٹس میں 23 فروری کو مشترکہ جلسہ کی صدارت زیندر شرمانے کی۔ جلسے کی کارروائی مخدوم کی نظم ”یہ جنگ ہے جنگ آزادی“ سے شروع ہوئی۔ اس کے بعد پریم دھون نے کیفی اعظمی کی نظم ”جہاد یو! سلام لو“ پھر یکے بعد دیگرے شاعروں نے اپنا کلام سنایا جن میں اسرار الحق مجاز، رجعت سروش، زیندر شرما، نیل کٹھ، نیاز حیدر، صابرا شترکی کے نام قابل ذکر ہیں۔

عوامی تھیٹر کے مراٹھی دستے نے اپنے گیتوں سے میٹنگ کو بہت گرمادیا تھا۔ خاص طور پر امر کے آخری گیت پر بہت زیادہ پسندیدگی کا اظہار کیا گیا۔

ترقوی کرنے والوں میں اے۔ ایس۔ چاری نے ایک طویل تقریر کی جس میں انہوں نے نیوی کے نوجوانوں اور شہری عوام کے ایکے اور اتحاد کی کہانی پھر سے دہرائی اور بتایا کہ انریز آقاؤں کے کوچ کی تیاریاں ہو چکی تھیں کہ ہمارے ہی رہنماؤں نے ہم سے دھوکا کیا۔ ان نوجوانوں سے جنہوں نے کراچی، کلکتہ اور بمبئی میں بغاوت کا علم بلند کر کے ملک کو آزادی کی جنگ میں پڑنے کا نیا راستہ دکھایا تھا اور ان عوام اور تین لاکھ مزدوروں سے جو اپنے بھائیوں کے ساتھ شانہ بشانہ لڑنے کے لیے بمبئی کی ملوں سے باہر نکل آئے تھے۔

انہوں نے بتایا کہ کانگریس اور مسلم لیگ کے رہنماؤں نے جہازیوں سے وعدہ کیا تھا کہ ان پر آج نہ آنے دی جائے گی مگر اس کے بعد کیا ہوا اسے ملک کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ تمام باغیوں کو ملازمتوں سے علیحدہ کر دیا گیا۔ ان پر مقدمے

چلائے گئے۔

لیکن جو شمع نیوی کے باغی نوجوانوں نے روشن کی تھی وہ بجھ نہ سکی۔ ملک میں برابر ہڑتالیں اور احتجاج ہوتا رہا ہے۔ ڈاک کی ہڑتال، ٹراونکور کی ہڑتال اور ساؤتھ انڈین ریلوے کی ایک ماہ کی ہڑتال اس کی شاہد ہیں پھر ہمارے لیڈروں کی موقع پرستشی اور سودے بازی نے عوام کو ملک گیر فساد میں مبتلا کر دیا مگر اس کے باوجود کسان اور مزدوروں میں پھوٹ نہ ڈالی جاسکی۔ حیدرآباد کا کھیت مزدور بنگال کی تحریک کی صورت میں دوبارہ ظاہر ہو رہا ہے کہ کسان اور مزدور کس طرح اپنے مفاد اور اپنے حقوق کے لیے لڑ رہے ہیں۔ سب سے آخر میں مرکزی عوامی دستے نے اپنا عوامی ناچ ”نیوی کی بغاوت“ پیش کیا۔ عوامی ناچ دوران فساد تیار کیا گیا تھا جسے اب تک ہزاروں پدمی دیکھ چکے تھے۔ یہ دستہ دو چار روز قبل ہی بمبئی آیا تھا چنانچہ یہ ناچ اس میٹنگ میں خاص اہمیت رکھتا تھا جس سے عام لوگ بے حد متاثر ہوئے۔ جن لوگوں نے اس ناچ کو دیکھا وہ اس کے متعلق بے اختیار کہہ رہے تھے کہ اگر یہی پروگرام عوام کو بھاری اکثریت میں دکھایا جائے تو اس کا بہت اچھا اثر ہو مگر اس ناچ سے قبل ایک ساتھی نے بتایا کہ پولیس کس کس طرح عوامی تھیٹرز کے لیے قدم قدم پر رکھاؤ میں پیدا کر رہی ہے اور ان مشکلات کے باوجود عوامی تھیٹرز اپنے یہ ناچ دو مختلف جگہوں پر دکھائی گئے چنانچہ ان کے پہلے دو شو 2، 3 مارچ کو سندربائی ہال میں ہو رہے ہیں پھر اپیل کی کہ ہمارے ترقی پسند مصنفین کو چاہیے کہ وہ ان ناچوں کو عوام میں زیادہ مقبول بنانے کے لیے ان کے متعلق لکھیں اور اپنے ذرائع استعمال کریں کیونکہ عوامی تھیٹرز کے پاس اتنا روپیہ نہیں کہ وہ ان کی تشہیر کے پورے سامان پیدا کر سکے۔ کارروائی قومی گیت پر ختم ہوئی۔

ملک کے مشہور غزل گو شاعر حضرت جگر مراد آبادی نے جو کسی مجبوری کے باعث جلسے میں شریک نہ ہو سکے

مندرجہ ذیل پیغام بھجوایا.....

”مجھے افسوس ہے کہ پپ کے دعوت نامہ پر ملاحوں کی ہڑتال کی سالگرہ میں وعدہ کے باوجود حاضر نہ ہو سکا تاہم جہاں تک آج کے دن کی یاد کا تعلق ہے میں اس یادگار کو زندگی میں کبھی نہیں بھول سکتا جو ہندو مسلمانوں کے اشتراک اور تعاون و اتحاد کا بے مثال ظاہرہ تھا۔ 22 اور 23 فروری کو میں پچھلے سال بمبئی میں موجود تھا اور یہاں جو کچھ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، اس کے متعلق پچھلے سال ہی یہ شعر لکھ چکا ہوں.....

حکومت کے مظالم جب سے ان آنکھوں نے دیکھتے ہیں
جگر اب بمبئی کو کوچہ قائل سمجھتے ہیں

موہن نگر کا اجلاس

موہن نگر میں 27 اپریل بوقت 6 بجے شام انجمن ترقی پسند مصنفین کا چوتھا جلسہ زیر صدارت فیض انصاری منعقد ہوا۔ حاضرین میں صاحب صدر کے علاوہ ریاض رونی، مرغوب جوہری، شریف عنایت اللہ، طرفہ قریشی مانی، ایوب صدیقی، خیام ہندی، حمید ناگپوری موجود تھے۔

ناظم نے گزشتہ جلسہ کی روداد پڑھ کر سنائی۔ حسب پروگرام طرفہ قریشی نے اپنی غزل سنائی۔ اس کے بعد ریاضی رونی نے اپنا افسانہ ”اور آشیانہ بنتا رہا“ پڑھ کر سنایا جس میں کافی بحث کے بعد شام کی طویل تقریر کو خارج کر کے اسی مفہوم کو اشاروں میں ادا کرنے کی مجلس نے درخواست کی۔

اس کے بعد خیام ہندی نے اپنی نظم ”صبح امید“ پڑھ کر سنائی۔ اس نظم کے بعد شریف عنایت اللہ نے اپنا ڈرامہ ”کانٹوں میں پھول“ سنایا جو کلکتہ کی خانہ جنگی پر لکھا گیا تھا۔ اس ڈرامہ میں چونکہ سٹیج کا لحاظ نہیں رکھا گیا تھا اس لیے جوہری نے درخواست کی کہ اسے افسانہ کے اسلوب میں پیش کیا جائے۔ انہوں نے مزید فرمایا کہ چونکہ اردو ادب میں ایسے ڈراموں کی شدید کمی ہے جو سٹیج کیے جاسکیں لہذا میری ہر اردو ڈرامہ نویس سے درخواست ہے کہ وہ ڈرامہ لکھتے وقت سٹیج کا بھی ضرور خیال رکھیں۔ اس بحث کے اختتام کے بعد مانی نے اپنی ایک غزل پڑھ کر سنائی۔ اس کے بعد مرغوب جوہری نے اپنا افسانہ ”چھ سال بعد“ پڑھ کر سنایا۔ افسانہ کافی پسند کیا گیا۔

بعد ازاں حمید ناگپوری نے اپنی نظم ”ایک پردیسی دوست کا خط دوست کے نام“ سنائی جس کا ایک شعر.....

شبم کے عوض آگ برتی ہے گلوں سے

لپٹا ہوا شعلاؤں میں چمن ہے کہ نہیں ہے

میں ”شبم کا گل سے برسا“ پر مانی نے اعتراض کیا۔ اس کے جواب میں ریاض نے گل کے استعارے پر بحث

کرتے ہوئے مانی کے اعتراض کو بے بنیاد ٹھہرایا۔ آخر میں انجمن کا نیا ترتیب شدہ دستور العمل مجلس کے سامنے بغرض

منظوری پیش کیا گیا جسے مجلس نے متفقہ طور پر منظور کیا۔ اس کے بعد جلسہ برخاست کیا گیا۔



حمید اختر صاحب

اعزاز احمد آذر، یکم اکتوبر 2012ء

یہ شاید 1971ء کی بات ہے مجھے تنویر نقوی صاحب نے خاص طور سے پیغام دے کر بلوایا اور کہا کہ ایک فلم ”پرائی آگ“ کے نام سے آغاز ہوئی ہے۔ یہ ایک سچو ایشن ہے جس پر آپ گیت لکھیں گے۔ ساتھ ہی انہوں نے بتایا کہ پروڈیوسر بلکہ میوزک ڈائریکٹر خواجہ خورشید انور سے میں نے غائبانہ طور پر آپ کا تعارف کروا دیا ہے۔ پھر انہوں نے سچو ایشن بتائی..... اور تین دن میں میں نے گیت لکھ لیا۔ یہ اس دور کی فلموں کی ایک روایتی عمومی سچو ایشن کا گیت تھا جس میں ہیرو ہیروئن کسی باغ یا پارک یا جھیل یا دریا یا سمندر کنارے ایک دوسرے کے گرد منڈلاتے اور ”شرعی فاصلہ“ برقرار رکھتے ہوئے رومانوی گیت گاتے ہیں.....

یہ گہری جھیل نیلا جل

یہ ہنستا ناچتا ہر پل

گواہ ہے اپنی چاہت کا

زمین پہل گئی جنت

مرے بھولے صنم مجھ کو

نہ بھولیں گے حسین لمحے

تیرے سر کی قسم مجھ کو

جبیں پہ زلف کا یہ بل

یہ آوارہ حسین بادل

گواہ ہے اپنی چاہت کا

(یہاں حوالے کیلئے اسی قدر کافی ہے)

کچھ دنوں کے بعد تنویر صاحب نے بتایا کہ تمہارا گیت ہر حوالے سے ہر ایک نے بے حد پسند کیا ہے دھن بن گئی اور اب کسی روز ریکارڈنگ ہوگی۔ پھر نہ جانے کیا ہوا فلم کا کام رُک گیا کافی دنوں بلکہ ہفتوں کے بعد حسب معمول تنویر صاحب کے ہاں گیا تو وہاں ایک بہت دلکش شخصیت کے مالک ایک صاحب بیٹھے تھے تنویر صاحب نے پہلے انہیں بتایا کہ یہ ہے وہ نوجوان شاعر جس نے آپ کی فلم کیلئے گیت لکھا تھا وہ صاحب بہت گرم جوشی اور شفقت سے اٹھ کے باقاعدہ پُر تکلف انداز میں ملے اسی دوران تنویر صاحب کی آواز میرے کانوں سے ٹکرا چکی تھی کہ ”قبلہ اے میں حمید اختر صاحب پرانی اگ وچ کدن والے“ تنویر صاحب کی بذلہ سنجی بہت خوب تھی یہ حمید اختر صاحب سے میرا پہلی رسمی تعارف تھا پھر یہ ہوا کہ کبھی آمنے سامنے ہونے کا موقع ہی نہ ملا، تنویر صاحب بیمار ہو گئے یہ ان کا مرض الموت تھا دراصل بہت بیمار رہے میں نے حنیف رائے (اس وقت وزیر خزانہ پنجاب سے بات کی) وہ میرے ساتھ چل کر تنویر صاحب کے گھر گئے۔ تنویر صاحب کی حالت دیکھ کر ان کا بھی دل بھر آیا پھر حکومت پنجاب نے اپنی ذمہ داری اور خرچ پر میوہ ہسپتال (البرٹ وکٹر وارڈ) میں داخل کروا دیا علاج جاری رہا ہم لوگ ان ہی کی دیکھ بھال میں لگے رہے۔ یکم نومبر 1972ء کو تنویر صاحب راہی ملک عدم ہوئے میرا بھی انڈسٹری سے جو واجبی سارابطہ، واسطہ تھا ختم ہو گیا۔ اکتوبر 1974ء کو میں بطور ریڈیڈنٹ ڈائریکٹر پاکستان نیشنل سینٹریا لکوث تعینات ہوا۔۔۔ اور پھر نیشنل سنٹر ہی کا ہو کر رہ گیا۔

متذکرہ بالا واقعہ کے بعد (تقریباً 30-32 سال بعد) حمید اختر صاحب سے شیخ زید ہسپتال میں اچانک ملاقات ہو گئی میں اپنی والدہ کے علاج معالجہ کے سلسلہ میں اسٹنٹ ایڈمنسٹریٹر (اب ایڈمنسٹریٹر ڈاکٹر اکبر حسین کے کمرے میں بیٹھا تھا کہ حمید اختر صاحب داخل ہوئے انہوں نے دروازے ہی سے سلام اچھا لیا تھا اور ساتھ یہ بھی کہ میں حاضر ہو سکتا ہوں یہ لب و لہجہ اور آواز (اب قدرے بھاری تھی) مجھے مانوس ہی لگی ڈاکٹر اکبر حسب عادت مسکراتے ہوئے اپنی نشست سے اٹھ چکے تھے میں بھی اٹھا۔ دراز قد، دل مین اتر جانے والی شخصیت۔۔۔ حمید اختر میرے بھی سامنے تھے۔۔۔ (ملاقات ہوئی گل بات ہوئی) کے مصداق یادیں تازہ ہوئیں۔ پتہ چلا کہ حمید اختر صاحب کو گلے کا کینسر ہے۔ وہ اس کینسر پر ڈاکٹر اکبر سے گفتگو کرتے ہوئے یوں مسکرا رہے تھے گویا ڈاکٹر انہیں کینسر کی خبر نہیں دے رہا کوئی بہت عمدہ شعر سنار ہے۔

یہ تجدید ملاقات پھر بعد کی تسلسل اور تو اتر کی ملاقاتوں کا پیشہ خیمہ ثابت ہوئی۔ وہ اس عرصہ میں کینسر سے کچھ ریلیف پا چکے تھے مگر یہ موذی مرض جان تو نہیں چھوڑتا۔ مگر حمید اختر جیسے عزم و ارادہ اور حوصلہ و یقین رکھنے والے شخص کو زیر

کرنا اس کے لئے ایسا آسان بھی نہیں تھا۔

تقریبات کا سلسلہ بے کنار تھا، حمید اختر صاحب کا حسن کلام تھا اور میرے لئے یہ سعادت و اعزاز کہ اکثر و بیشتر تقریبات کا کمپیئر میں ہوں۔۔۔ کسی کتاب کی تقریب رونمائی، کسی شاعر و ادیب کے اعزاز میں تقریب، کسی قومی تہوار کے موقع پر سیمینار۔۔۔ یہ بجا طور پر سمجھا جاتا تھا کہ حمید اختر صاحب کی شرکت سے تقریب کا وقار اور اعتبار بڑھ جاتا ہے۔۔۔ حمید اختر صاحب کا سینہ، صحافت، فلم، ادب، شاعری، شخصیات، سیاست، مذہب، معاشرت، ثقافت، موسیقی، مصوری، تعمیرات، ترقی پسند تحریک، عالمی ماضی و حال کے امور غرضیکہ، گویا ایک سمندر تھا جس میں پتہ نہیں کن کن جواہر کا خزانہ تھا۔ کیا یادداشت تھی اور کیا ترتیت (Sequence) تھی!!

وہ جو غالب کا شعر ہے نل ذکر اس پری وش کا۔۔۔ اور پھر بیاں اپنا

تو ذکر کسی شے، انسان، جگہ، واقعہ یا حادثہ کا ہو، حمید اختر اسے واقعی پری وش کا بیان اور اپنے حسن گفتار سے اس کی شان بڑھا دیتے تھے۔ ان کی کتاب ”کال کوٹھڑی“ پڑھیں۔ یہ ان کی ایوب خان کے دور حکومت میں ترقی پسندی اور کمیونزم سے محبت کے جرم میں گرفتاری اور اسیری کے دوران کے حالات و واقعات پر مبنی کتاب ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ پہلے صفحہ کی چند سطور پڑھنے کی جسارت کر لیں پھر تو وہ کتاب کہے گی کہ اب جاتے کہاں ہو۔۔۔؟ کیا واقعات نگاری ہے؟ کیا ساتھ اسیروں (جن میں فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی و دیگر بھی تھے) کا قید کے دوران کا احوال بیان کیا گیا ہے حمید اختر صاحب کی یہ کتاب پڑھ کے ایسے لگتا ہے حمید اختر جیل کاٹنے نہیں بلکہ کوئی میلہ ٹھیلہ دیکھنے گئے تھے۔

ساحر لدھیانوی، امرتا پریتم، فیض احمد فیض، استاد دامن، تنویر نقوی، نور جہاں، سید شوکت رضوی، صبیحہ خانم، سنٹوش کمار کے تذکرے یوں کرتے گویا یہ اس دوران ان لوگوں کے ساتھ گزرے لمحات میں صرف لطیف اور دل پذیر باتوں ہی کو نوٹ کرنے کے لیے ان کے ساتھ ساتھ ہوتے تھے اپنے بیان میں واقعات کا تسلسل نہیں ٹوٹنے دیتے تھے اور گفتگو میں دلچسپی کا عنصر ان کے فن گفتار کا مرکزہ (Nucleus) تھا۔

ایک تقریب ہمارے بہت میٹھے دوست طفیل اختر نے ان کی 85 ویں سالگرہ کے موقع پر سینما کے آڈیٹوریم میں منعقد کی اس تقریب کے کمپیئر ہونے کا اعزاز بھی میرے حصہ میں آیا۔ وہ تقریب شرکاء کی تعداد اور حمید اختر صاحب کے حوالہ سے ہونے والی گفتگو کے تناظر میں ایک تاریخی اور یادگار تقریب تھی۔

زریں پنا جو اپنے زمانے کی نویکلے کتھک ڈانس تھی اور بہت سی فلموں میں بھی فن کا مظاہرہ کر چکی ہیں اس تقریب کی انعقاد کار اور روح رواں تھی۔ طفیل اختر ان کے شریک کار اور ہمیں مدعو بلکہ پابند کرنے والے تھے۔ صبا پرویز،

اظہر جاوید، افتخار مجاز، پرویز حمید، آئی اے رحمان اور دیگر کیسے کیسے نابغہ روزگار لوگ حمید اختر صاحب کو مبارکباد دینے آئے تھے۔ زریں پنا کہہ رہی تھی یہ میرے بوائے فرینڈ ہیں اور حمید اختر کا جواب تھا کہ میں فرینڈ بنا ہی اس لیے ہوں کے اس کے ساتھ لفظ ”بوائے“ لگا ہوا ہے۔

پی ٹی وی میں حمید اختر صاحب کو گھیر گھار کے لانے، بہلا، پھسلا اور درغلا کر پروگراموں میں شریک کرنے کا سارا کریڈٹ افتخار مجاز کا ہے وگرنہ صورت حال یوں ہے جیسے حمید اختر سے شاید کوئی صاحب اقتدار و اختیار صرف یوں واقف ہوں کہ وہ صبا حمید کے والد ہیں۔ افتخار مجاز نے علمی، تاریخی، تہذیبی، قومی، بین الاقوامی، ادبی، ثقافتی، مذہبی غرضیکہ ہر طرح کے پروگراموں میں حمید اختر صاحب کے علم، تجربے، یادداشت، مطالعہ اور مشاہدہ کا بھرپور فائدہ اٹھانے کی کامیاب کوشش کی۔ پی ٹی وی میں حمید اختر صاحب کے ان گنت پروگراموں میں ایسے بھی تھے جن میں کمپیئر ہونے کا اعزاز پھر مجھے ہی ملا۔ حمید اختر بہت محبت اور قدر کرتے تھے۔ دراصل یہ ان کی جانب سے (میں تو کہوں گا) شفقت اور حوصلہ افزائی ہوتی تھی۔ انہیں ایک دو بار کسی دوسرے پروڈیوسر نے بھی اپنے پروگرام میں مدعو کیا اور حسب روایت یہ بھی نہ پوچھا کہ کب آئے اور کیسے گئے۔ حمید اختر بہت بد مزہ بھی ہوئے اور میرے یا افتخار مجاز کیلئے ہمیشہ دل میں نرم گوشہ رکھا بلکہ ایک بار تو اپنے کالم میں بھی لکھ دیا کہ پی ٹی وی کے بعض مہربان مدعو کر کے ایسا سلوک کرتے ہیں کہ آئندہ پی ٹی وی کے احاطہ یا کسی دیگر تقریب میں قدم رکھنے سے توبہ کرنے کو جی چاہتا ہے مگر اعزاز احمد آذر اور افتخار مجاز کی محبتوں کے سامنے سپر ڈالنی ہی پڑتی ہے۔ حمید اختر ہمہ جہت اور ہمہ شخصیت کے مالک تھے اللہ تعالیٰ نے انہیں متنوع ذوق جمالیات اور کثیر الجہات خوبیوں سے سرفراز کر رکھا تھا اور کمال کی بات یہ ہے کہ اپنی ان جہات کا علم بھی تھا اور احساس بھی اور ادراک بھی۔ سوزندگی بھرا نہوں نے اپنے دل، اپنے ذہن، اپنی زبان اور اپنے قلم کا بھرپور استعمال کیا۔ فلمیں بنائیں، ترقی پسند تحریک اور کمیونسٹ پارٹی کو لہو سے سیراب کیا، یادداشتوں کو طاق نسیاں میں نہیں بلکہ بام محبت پر سجایا، کتابیں لکھیں اور کالم نگاری کی۔۔۔ کالم نگاری میں ان کا اسلوب اور زبان و بیان بہت پسندیدہ اور مقبول عام بلکہ مقبول عوام تھے۔ وہ قنوطی نہیں تھے بلکہ ایک قابل رشک حد تک رجائیت پسند فنکار اور انسان تھے بلکہ اس حد تک کہ وہ اپنے کینسر کو بھی پرکاش کی وقعت نہیں دیتے تھے۔ تقریباً 87 برس کی عمر میں وہ حیات مستعار کی ایک بھرپور انگلیز کھیل کر واپس پولین کی طرف لوٹ گئے بلکہ اس پلٹمن کی طرح گئے جو ڈبل سچری کر کے ناٹ آؤٹ واپس جاتا ہے تو پورا اسٹیڈیم اس کے ڈرینگ روم میں داخل ہونے تک تالیوں سے گونجتا رہتا ہے۔ حمید اختر صاحب کو پولین کو لوٹے ایک برس بیت گیا ہے مگر پورا اسٹیڈیم ابھی تک تالیوں سے گونج رہا ہے۔۔۔



حمید اختر

(مطبوعہ ”پچاس نامورا ادبی شخصیات“ مرتب و تحریر ملک مقبول احمد جنوری 2011ء)

حمید اختر کو میں ترقی پسند تحریک کے مخلص ترین رکن کی حیثیت میں پہچانتا ہوں اور ان کی بے پناہ عزت کرتا ہوں کہ انہوں نے اپنی زندگی کو مالی اثاثوں سے بوجھل کرنے کی بجائے اپنی نظریاتی وابستگی کو برقرار رکھ کر اپنی روح کو سرشار کیا۔ مجھے یہ بھی علم ہے کہ جب سجاد ظہیر کو کمیونسٹ پارٹی نے آزادی کے بعد پاکستان میں خدمات انجام دینے کے لئے بھیجا اور انہیں اپنے مشن کی تکمیل کے لئے زیر زمین رہنا ضروری ہو گیا تو اس وقت انہوں نے حمید اختر پر اعتماد کیا اور ان سے اپنے پیغام بردار کا کام لیا۔ پنجاب کے کسی اور ترقی پسند ادیب، حتیٰ کہ اس پارٹی کے سیاسی کارکنوں کو بھی یہ اعزاز حاصل نہیں ہوا اور حمید اختر اس پر جتنا بھی فخر کریں کم ہے۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ حمید اختر ایک لمبے عرصے سے ایک موذی جسمانی مرض میں گرفتار ہیں، وہ اس کا مقابلہ پوری ہمت سے کر رہے ہیں روزانہ صحافت کی مشقت کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ روز نیا کنواں کھودتے ہیں، روز پانی برآمد کرتے ہیں۔ دوست ان کی دوستی پر ناز کرتے ہیں اور دشمن انہوں نے کسی کو بنایا ہی نہیں۔ اکیسویں صدی میں جب وطن عزیز میں ہر طرف خود غرضی اور منافقت کا دور دورہ ہے یہ انفرادیت صرف حمید اختر کو حاصل ہے۔

حمید اختر متحدہ پنجاب کے مشہور شہر لدھیانہ میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم اس شہر میں ہی حاصل کی جو ساحر لدھیانوی اور م حسن لطفی کے بعد اب ڈاکٹر کیول دھیر کی وجہ سے ادبی دنیا میں شہرت رکھتا ہے۔ ابن انشاء جوان دنوں شیر محمد قیصر کے نام سے مشہور تھے ان کے ہم جماعت تھے سکول کے زمانے سے ہی انہیں ادب پڑھنے کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ ساحر لدھیانوی کی دوستی نے اس شوق کو پروان چڑھانے میں مدد کی اور جب روزگار کی تلاش میں بمبئی گئے تو ساحر لدھیانوی نے ہی انہیں فلمی دنیا میں نہ صرف متعارف کرایا بلکہ انہوں نے دو فلمیں پروڈیوس بھی کیں، محترم اظہر جاوید نے مجھے بتایا کہ حمید اختر جب پاکستان آئے تو انہوں نے ایک فلم میں اداکاری بھی کی تھی لیکن ادب کا رجحان انہیں اس مصنوعی

دنیا سے نکال کر لے گیا اور وہ صحافت کی طرف راغب ہو گئے۔ اظہر جاوید نے ہی بیان کیا کہ حمید اختر نے صحافت کی تربیت بمبئی میں حاصل کر لی تھی۔ وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے ہفتہ وار ادبی جلسوں کی روداد ”رسالہ نظام“ بمبئی میں لکھتے کرتے تھے جو اب کتاب کی صورت میں ”روداد انجمن“ کے نام سے چھپ چکی ہے اور یہی ان کی صحافت کا آغاز تھا۔

حمید اختر پاکستان آئے تو انہوں نے اپنا رزق حاصل کرنے لئے صحافت کا پیشہ اختیار کیا۔ انہی دنوں میاں افتخار الدین نے لاہور سے ایک جدید اخبار خوبصورت گیٹ اپ میں ”امروز“ کے نام سے جاری کیا تھا۔ حمید اختر نے بھی اس اخبار میں ملازمت اختیار کی اور سچ یہ ہے کہ اپنے قلم کو خوب رواں رکھا۔ وہ آمریت کے دشمن تھے۔ انسان کی آزادی کے لئے جدوجہد کو اپنا ایمان سمجھتے تھے۔ پاکستان کے دگرگوں حالات پر لکھنے پر آتے تو صرف عوام کے حقوق کی پاسبانی کرتے۔

آمر حکمران کو ان کی یہ دوستی پسند نہ آئی اور ترقی پسند تحریک پر پابندی عائد کی تو حمید اختر کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ اس دور کی یادگار کتاب ”کال کوٹھڑی“ ہے جو جسیاتی ادب میں ایک نمایاں مقام رکھتی ہے۔ اس کتاب کے کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ اخبار ”امروز“ پر آمر ایوب خان نے شب خون مارا تو حمید اختر کو بھی جبراً ملازمت سے فارغ کر دیا گیا لیکن ان کے صحافت کے جنون نے ان کو فارغ نہ بیٹھنے دیا اور اخبار ”آزاد“ جاری کیا جس میں عبداللہ ملک مان کے معاون تھے۔ اس اخبار نے بھی عوام کی حمایت اور آمریت کی مخالفت کا سلسلہ جاری رکھا۔ لیکن بقول اظہر جاوید..... حمید اختر نے ”آزاد“ اخبار کو صحیح معنوں میں آزادی اظہار کا نمائندہ بنا دیا اور صحافت کی تاریخ میں ایک نیا باب رقم کیا۔ لیکن ان کا یہ تجربہ کاروباری لحاظ سے کامیاب نہ ہوا اور اخبار بند کر دیا گیا۔

اپنی بیکاری کا یہ دور حمید اختر نے بڑی جرأت مندی سے گزارا۔ مقبول اکیڈمی پر تشریف لاتے یا ان سے دفتر ”تخلیق“ میں ملاقات ہوتی تو ہمیشہ خندہ پیشانی سے ملتے اور اپنی اقتصادی پریشانیوں کا کبھی ذکر تک نہ کرتے۔ صرف یہ پوچھتے کہ میرے ادارے سے کون کون سی نئی کتابیں چھپی ہیں اور پھر نئے نئے موضوعات بتاتے کہ ان پر کتابیں لکھوائی جانی چاہئیں۔ اچھے مشورے دینے میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔

حمید اختر کی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے ہوا تھا۔ تھوڑے سے عرصے کے لئے قلم سے وابستہ ہوئے اور پھر صحافت کو ہی اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ ”امروز“ اور ”آزاد“ کے دور کو ان کی صحافت کا زریں دور قرار دینا چاہئے۔ تاہم جب لاہور سے ایک نیا اخبار ”دن“ جاری ہوا تو وہ ”کالم نگاری“ کی طرف آگئے۔ روزنامہ ”ایکسپریس“ میں بھی انہوں نے اس سلسلے کو قائم رکھا۔ حمید اختر نے ان دو اخبارات میں ادارہ نگاری کا فریضہ بھی انجام دیا ہے۔ قومی اور بین الاقوامی مسائل پر

ان کے دور رس تجزیوں کو صحافتی اور ادبی حلقوں میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور ان کے ادارتی مشوروں کی صدائے بازگشت حکومت کے ایوانوں میں بھی سنی جاتی ہے۔ ان کے کالموں کے مجموعے ”احوال واقعی“ اور ”پرسش احوال“ کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ حال ہی میں ان کی سوانح عمری جناب احمد سلیم نے تالیف کی ہے۔ یہ کتاب حمید اختر کے حالات حیات پر مبنی ہے لیکن یہ بھی نظر آتا ہے کہ وہ زمانے کو اپنے ساتھ لے کر چل رہے ہیں۔ مشکلات اور صعوبتیں ان کا راستہ روکتی ہیں لیکن وہ اپنی ہمت مردانہ سے جاں ہار مصیبتوں کو بھی عبور کر جاتے ہیں اور ۸۶ ویں میں ساگرہ منالینے کے بعد بھی مستعد اور فعال ہیں۔

حمید اختر کو خود نمائی سے شدید نفرت ہے۔ وہ قریبی دوستوں کی محفل میں بھی اپنے کام کی خود تعریف نہیں کرتے اور ملال کا اظہار کرتے ہیں کہ روزی روٹی کی مصروفیت نے انہیں ادب کا فریضہ پوری طرح انجام دینے کی فرصت نہیں دی۔ تاہم ان کے افسانوں کو ادبی حلقوں میں ہمیشہ پذیرائی حاصل ہوئی۔ ”آشنائیں کیا کیا“ ان کے ایسے خاکوں کا مجموعہ ہے جس میں ان کے نامور دوست مثلاً فقیر احمد فقیر، ساحر لدھیانوی، سید سجاد ظہیر، سبط حسن وغیرہ سب زندہ نظر آتے ہیں۔ گزشتہ برس حکومت پاکستان نے انہیں ”تمغہ حسن کارکردگی“ دیا تو میں نے انہیں مبارکباد پیش کی۔ حمید اختر نے میری مبارکباد خندہ پیشانی سے قبول کی انہوں نے اخبار ”ایکسپریس“ میں اس ”کم عمری“ میں ایوارڈ دینے پر حکومت کا شکریہ ادا کیا اور یہ بھی لکھا کہ ”چلو پچاسی برس“ کی عمر تک قلم گھسانے کے بعد حکمرانوں اور سرکاری ادبی ادارے کو میری صلاحیتوں کا علم تو ہوا، میرے لئے یہی کافی ہے“..... میں سمجھتا ہوں کہ حکومت اور سرکاری ادبی ادارے نے حمید اختر کو تو جواب اپنی زندگی کا ۸۶ واں سال گزار رہے ہیں، تمغہ حسن کارکردگی دے کر دراصل اس ایوارڈ کا کھویا ہوا اعتماد بحال کیا ہے۔ اور غنیمت ہے کہ انہیں یہ ایوارڈ ان کی زندگی میں مل گیا جبکہ اردو کے ممتاز مزاح نگار ادیب اور دانشور پطرس بخاری کو یہ ایوارڈ ان کی وفات سے پون صدی بعد دیا گیا۔

اللہ تعالیٰ انہیں صحت کامل عطا فرمائے اور طویل زندگی دے۔ (آمین)

(یہ مضمون حمید اختر کی زندگی میں شائع ہوا)



خاندانِ اجمیر شریف کا کمیونسٹ

شاہد بخاری تاریخ: 16 ستمبر 2012

حمید اختر ایک نام ور رائیٹر، دانش ور، حریت پسند، مفکر اور معتبر جرنلسٹ، گدی نشین خاندان کے سپوت ہونے کے باوجود اپنے ہاتھ سے روزی کمانے پر یقین رکھتے تھے۔ تا دمِ آخر وہ قلم سے مزدوری کرتے رہے۔ محنت اور دیانت سے کام کرنا ترقی پسندوں کا طرزِ امتیاز رہا ہے اس پر حمید اختر بھی کار بند رہے۔ دورِ آمریت میں روزنامہ ”کوہستان“ والوں کو ان کے واجبات دلوانے میں بھی ان کا بہت حصہ تھا۔ اگر وہ روزنامہ ”آزاد“ نہ نکالتے تو ”مساوات“ بھی نہ نکل سکتا۔ تمام عمر وہ اپنے نظریات سے کمٹڈ رہے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کو انہوں نے ہی Revive کیا۔ لوگوں کے کام کروانے کے آپ ماہر تھے۔ اپنے کالموں کے ذریعے بہت سے مستحقین کی انہوں نے مدد کروائی۔ آپ حافظ قرآن بھی تھے۔ قرآن کی کمائی بھی نہیں کھائی۔

اپنی پارٹی کے لوگوں کو میاں افتخار الدین اپنے اخبارات میں ملازمت نہیں دیتے تھے ان میں اور فیض صاحب میں جو صلاحیتیں تھیں، ان کے پیش نظر دونوں ”امروز“ اور ”پاکستان ٹائمز“ میں رہے۔ آپ ادارہ نویسی میں ریفارمز لائے۔ لوگوں سے ملنا ان سے مکالمہ کرنا وہ اچھا سمجھتے تھے۔ آپ نے نئے نئے موضوعات، صحافت کو دیئے۔ اس کو گلوبلائز کیا۔ آپ نے سیاسی و سماجی کرداروں کو اہم بنایا۔ ان کے کالموں میں افسانوی رنگ ہوتا۔

چیف ایڈیٹر ”ادب لطیف“ صدیقہ بیگم کی ایک دعوت میں انہوں نے یہ دل چسپ بات بھی سنائی کہ ان کے ایک انکل محکمہ پولیس میں ملازم تھے۔ وہ ریٹائرمنٹ کے بعد بہت زیادہ نمازی ہو گئے تھے۔ انہوں نے خاندانی حویلی پر قبضہ کر رکھا تھا اپنے سگے بھائی کو اصطبل میں جگہ دی ہوئی تھی۔ اُسے کہتے تھے کہ نمازیں پڑھے گا تو حویلی میں جگہ دوں گا۔ جواب میں وہ درویش منش کہتا کہ میں کیجا کی اے؟ جو نمازاں پڑھاں۔

حمید اختر بائیں بازو کے سرخیلوں میں سے تھے جنہوں نے مصنفانہ تقسیم سے متصف بہتر سماج کا خواب دیکھا

اور اسے عملی جامہ پہنانے کی تمام عمر کوششیں کرتے رہے۔ بطور صحافی، بطور لیفٹنٹ، بطور جنرل سیکرٹری، انجمن ترقی پسند مصنفین، آپ کے قدموں میں کہیں بھی کبھی بھی لغزش نہیں دکھائی دی۔ ریاستی جبر میں بھی آپ ثابت قدم رہے۔ آپ میں نظریاتی پختگی تھی۔ ساحر سے ابتدائی دور میں اور فیض سے آخری دور میں ان کے گہرے روابط رہے۔ سیاسی کام ان کی افسانہ نگاری پر غالب رہے۔

انسانی مساوات لانے اور سامراج سے برأت کے لئے حمید اختر کو معاشرتی سطح پر مقاطع کا سامنا کرنا پڑا۔ عجز و انکساری آپ میں بہت تھی۔ اپنے کو بڑا نہیں سمجھا۔ آپ میں خود ستائی نہیں تھی۔ دوستوں کے بارے میں کہتے ”میں تو ان کا نیاز مند ہوں“ اپنے تعلقات سے فائدے نہیں اٹھائے۔ نام نہاد مذہبی ٹھیکے داروں سے وہ کبھی نہیں گھبرائے۔ تحصیل لدھیانہ میں ان کا خاندان 5 سوا یکڑ سے زائد اراضی کا مالک تھا۔ یہاں فاتح بھی کئے لیکن گلہ شکوہ کبھی نہیں کیا۔ آپ کا سلسلہ نسب خواجہ قطب الدین بختیارا جمیرئی کے ساتھ جا ملتا ہے۔ اس نسبت سے ساری زندگی بغیر کام کئے عیش و آرام سے گزار سکتے تھے لیکن صبا حمید کے مطابق ”ابانے کبھی ایسا کام نہیں کیا جس پر انہیں ندامت ہوتی“۔ ”آشنائیاں کیا کیا“ (خاکے) ”کال کوٹھڑی“ (رودادِ زندان) ”لامکان“ (افسانے) ”رودادِ انجمن“ (انجمن ترقی پسند مصنفین کی تاریخ) قابل مطالعہ ہیں۔ آپ کے کالمز تہذیبی و ادبی رنگ لئے ہوتے تھے۔



حمید اختر

(مطبوعہ ماہنامہ تخلیق لاہور، اظہر جاوید نمبر جون 2012ء)

ابتدائیہ

حمید اختر سے میرا تعلق بہت گہرا تھا۔ وہ اتنے مرعبان مرعج اور ملنسار تھے، کہ ہر ملنے والا خود کو اُن کے قریب سمجھتا۔ مگر کئی سلسلے شاہد ہیں کہ انہیں مجھ سے لگاؤ تھا اور ہمیشہ مجھے برابری کی سطح پر رکھتے تھے۔ اپنے کئی کالموں میں میرا ذکر کیا۔ ”تخلیق“ کے لیے اور کچھ نہیں تو محبت بھرا خط ہی لکھ دیتے تھے۔ اُن کا آخری افسانہ ”آؤ۔ بیوی باتیں کریں“، ”تخلیق“ ہی میں چھپا اور بستر مرگ سے آخری، بالکل آخری تحریر بھی میرے لئے ہی تھی۔ وہ تحریر شمارہ اکتوبر 2011ء میں چھپی تھی۔ میں نے 1999ء میں ”اخبارِ جہاں“ کے لئے اُن کا انٹرویو کیا تھا۔ یہ بھی اُن کی زندگی کا آخری اور باقاعدہ مکالمہ تھا۔ بلاشبہ حمید اختر ایک انجمن تھے اور اپنے دل و دماغ میں یادوں کا انمول خزانہ رکھتے تھے۔ اُن کے بارے میں، اپنے عجز بیان کے باوجود میں اور بھی بہت کچھ لکھوں گا۔ ان کا یہ انٹرویو قاری نین کی نذر ہے۔

(اظہر جاوید)

ترقی پسند تحریک نے جن اہل قلم کو جنم دیا اور انہیں ابھارا، ان میں حمید اختر کا نام نمایاں ہے۔ حمید اختر بھی ان لوگوں میں سے ہیں جن کی تخلیقی صلاحیتوں کو روزنامہ صحافت کھا گئی، اپنی صحافتی ذمہ داریوں اور سماجی مصروفیات سے بچ کر اور اپنے تخلیقی جوہر کو بچا کر انہوں نے جتنا ادب لکھا، افسانے بنے اور شخصیت نگاری کی، وہ بھی کسی ”کارنامے“ سے کم نہیں، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی اور خواجہ احمد عباس کے بعد جو افسانہ نگاروں کی نسل آئی، ان میں حمید اختر بھی اہمیت رکھتے ہیں۔ حمید اختر سے پہلا سوال ترقی پسند تحریک، اس کے آدرش اور اس کی سوچ سے متعلق تھا کہ اتنے برس گزرنے اور پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہ جانے کے بعد بھی کیا آج اس کے اثرات باقی ہیں؟

حمید اختر نے فوراً اثبات میں جواب دیا۔ ”اگرچہ وہ تنظیمی ڈھانچا ختم ہو گیا ہے مگر وہ نظریہ اور سوچ آج بھی قائم ہے بلکہ اس کی ضرورت زیادہ ہے، اردو ادب میں حقیقت پسندی روشناس ہو چکی تھی مگر 1936ء کی ترقی پسند مصنفین کی

کانفرنس نے اسے مہینہ لگائی اور لکھنے والوں کو ایک پلیٹ فارم مل گیا یہی تحریک بعد میں آزادی کی تحریک کا حصہ بنی، نا انصافیوں اور طبقاتی تقسیم نے لکھنے والوں کو بھی یہ احساس دلایا کہ ان کی منزل آزادی ہے، غیر ملکی استبداد سے چھٹکارا پانے اور ان کے گماشتوں سے نجات پانے کے لیے آزادی اور لوک راج ضروری ہے مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ برصغیر کی آزادی اور پاکستان کے قیام کے دو سال کے بعد ہی یہ معلوم ہو گیا کہ.....

”چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی“

نا انصافیاں بڑھ گئیں، غربت، بیروزگاری اور عدم مساوات زیادہ شدت سے ڈسنے لگے۔ یوں لکھنے والوں میں تلخی بھی آئی اور سچ کڑوا ہو کر سامنے آنے لگا۔ وہی سب کچھ آج بھی تحریر ہو رہا ہے۔ ترقی پسند تحریک اب تنظیم کے طور پر نہیں مگر یہ کوئی اتنا ضروری بھی نہیں، وہ احساس، وہ فکر تو قائم ہے، تنظیم کے بغیر بھی جو کچھ تخلیق ہو رہا ہے، جو تحریر کیا جا رہا ہے، وہ اسی سوچ کا حصہ ہے۔“

”ترقی پسند مصنفین پر یہ بھی الزام ہے کہ وہ صرف پروپیگنڈا ادب پیش کرتے رہے؟ حمید اختر کی بات میں سے ایک اور سوال اٹھایا گیا۔

”یہ بات جزوی طور پر درست ہوگی مگر مجموعی طور پر نہیں..... 1946-47ء تحریک کے عروج کا زمانہ تھا۔“

حمید اختر نے حوالہ دیتے ہوئے کہا ”میں اس وقت بمبئی میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا سیکرٹری تھا۔ وہاں باقاعدگی سے انجمن کے ہفتہ وار اجلاس ہوتے تھے جن میں نامور اہل قلم سجاد ظہیر، علی سردار جعفری، مجروح اور کرشن چندر وغیرہ حصہ لیتے تھے، یہ لوگ اپنی شعری اور ادبی روایات کے امین اور پاسدار تھے، ان سب لکھنے والوں کی جڑیں اپنی دھرتی میں تھیں اور نئے پن کو خوش آمدید کہنے کے باوجود یہ زبان و بیان، اظہار کی سلاست اور روایتی ادبی قدروں کا خاص خیال رکھتے تھے، کسی کی بھی تحریر میں کوئی ایسی کمزوری ہوتی تو فوراً ٹوک دیا جاتا لیکن اس کے ساتھ ساتھ پریم دھون جیسے شاعر بھی تھے جو فلمی نغمہ نگار تھے مگر تحریک کے لیے بھی کام کرتے تھے اور مزدوروں، کسانوں کے جلسوں میں جا کر نظمیں سناتے تھے، وہ عوامی مزاج کو خوب سمجھتے تھے، اسی زمانے میں.....“ حمید اختر نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”یاس یگانہ چنگیزی جیسے کلاسیکی روایت کے شاعر کا مجموعہ سجاد ظہیر نے دارالاشاعت لاہور سے چھپوایا۔“

”ترقی پسندوں پر الزام یہ ہے کہ انہوں نے ہمیشہ باہر کی طرف دیکھا اور اپنے حالات اور ماحول پر نظر نہیں رکھی؟“

”اس الزام کا پس منظر کیا ہے، اس کا ذمہ دار مجھے سمجھیں۔“ حمید اختر نے صاف گوئی سے وضاحت کی۔ ”قیام

پاکستان کے بعد جب کیمپوں میں رُلنے کے بعد میں لاہور آیا تو مجھے انجمن ترقی پسند مصنفین کا سیکرٹری جن لیا گیا، 1949 میں لاہور میں پہلی بڑی ترقی پسند کانفرنس ہوئی جس میں روسی ادیبوں، سہر و توف، رسول زادہ اور موسیٰ ایک نے بھی شرکت کی، وہ اپنے ساتھ اپنے اور دوسرے روسی اہل قلم کی انگریزی اور اردو زبانوں میں چھپی ہوئی کتابیں لائے، سیکرٹری کی حیثیت میں وہ کتابیں میں نے وصول کیں اور رکھنے کے لیے گھر لے گیا، اسی رات خفیہ پولیس نے میرے گھر پر چھاپہ مارا اور وہ سب کتابیں اٹھا کر لے گئی، خفیہ پولیس والوں نے بتایا کہ وہ تو کتابیں ادھیڑ کر یہ تلاش کرتے رہے تھے کہ کہیں کوئی روس سے پوشیدہ پیغام تو نہیں آیا..... ادھر سارے شہر میں یہ دھوم مچ گئی کہ ترقی پسندوں کے پاس روسی لٹریچر آتا ہے۔“

حمید اختر باتوں کے دھنی ہیں، فیض کی محفلوں میں بھی وہی زیادہ تر چمکتے رہتے تھے۔ انہوں نے خود ہی بات کو پھیلاتے ہوئے کہا۔ ”جب تقسیم کے وقت کلکتہ میں بھی فسادات ہوئے تو وہاں سہروردی کی مسلم لیگی حکومت تھی، کامریڈ پی سی جوشی نے مجھے باقاعدہ گریبان سے پکڑ کر جھنجھوڑا کہ ہمیں ہر قسم کی نا انصافی کے خلاف لڑنا ہے، یہ فسادات بھی انسانیت کے خلاف سازش ہیں، ہمیں اس سے بھی نبرد آزما ہونا ہے، ترقی پسند مصنفین نے من حیث الجماعت آزادی اور قیام پاکستان کی حمایت کی تھی۔ پی سی جوشی نہایت جوش سے تقسیم کے حق میں مضامین لکھتے تھے اور ان میں حق خود ارادیت کی بات کرتے ہوئے ٹالسٹائی اور گورکی کے حوالے ہوتے تھے، اس پر اسرار الحق مجاز نے کہا کہ جوشی کے مضامین ذہن تو قبول کرتا ہے مگر دل نہیں مانتا کہ ملک تقسیم ہو۔“ حمید اختر نے اپنی لمبی بات کو خود ہی اصل سوال کی طرف لاتے ہوئے کہا۔

”واقعہ یہ ہے کہ روسی کلاسیکی لٹریچر کے مقابلے میں جو جدید لٹریچر ہے، وہ قطعی متاثر نہیں کرتا تھا، کسی بھی ترقی پسند لکھنے والے کی کسی بھی تحریر سے کوئی ایسا ثبوت نہیں مل سکتا ہاں..... ایک آدھ معمولی سی مثال ہے جیسے عارف عبدالمتین نے نظم لکھی تھی..... عظیم باپ اسٹالین۔“

”کیا آپ محسوس کرتے ہیں صحافت میں جانے کی وجہ سے آپ تخلیقی ادب سے دور ہو گئے؟“

”جی ہاں..... میں تسلیم کرتا ہوں..... صحافت، ادب کو گھا گئی۔“ حمید اختر نے جواب دیا۔ ”لیکن..... کیا

کرتا..... ادھر سے لٹ پٹ کر آئے تو کیا کرتے.....؟ تین ماہ تک نکودر میں مہاجر کیمپ میں پڑاؤ لتا رہا۔“

حمید اختر نے بتایا۔ ”انہوں نے تحریک پاکستان میں بھی باقاعدہ حصہ لیا تھا مگر کبھی شور نہیں کیا یا اسے کیش کرانے (

کوئی مالی فائدہ اٹھانے) کی کبھی کوشش نہیں کی۔ میں نے جس طرح بچوں کو ٹکڑے ٹکڑے ہوتے دیکھا، عورتوں کی بے حرمتی

ہوئی، لوگ حیوانوں کی طرح مارے گئے، اس کا مجھ پر یہ رد عمل ہوا کہ میں سیاسی کام میں لگ گیا اور نہ کوئی کلیم داخل کیا، نہ کسی

حق کا تقاضا کیا..... ادب سے تو روٹی نہیں ملتی، عملی صحافت میں آنے سے پہلے تک 1945-55 تک باقاعدہ کہانیاں

لکھتا رہا مگر سچ پوچھیں عمر عزیز ضائع ہی کر دی ہے۔“ حمید اختر نے بے باکی سے اعتراف کیا۔
 ”آپ کسی سے متاثر ہوئے تھے یا کسی لکھنے والے کا گہرا اثر لیا تھا؟“ حمید اختر کو پھر ادب کی طرف لاتے ہوئے

سوال کیا۔

”یقیناً..... متاثر ہوا۔“ انہوں نے جواب دیا۔ ”کرشن چندر تھے، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو تھے..... میں کرشن چندر کو سب سے بڑا افسانہ نگار تو نہیں کہتا مگر یوں ہے کہ اس زمانے میں ان لوگوں کے افسانوں کا انتظار رہتا تھا، عصمت چغتائی اور غلام عباس بھی انہی کی صف میں شامل تھے ”ان داتا“ اور ”کالو بھنگی“ جیسی کہانیاں آج تک ذہن و دل میں بسی ہوئی ہیں..... اب تو یہ معلوم نہیں ہوتا کون کس کے لیے لکھ رہا ہے..... میں سمجھتا ہوں لاشعوری طور پر میرے گریز کی بھی یہی وجہ ہے، قاری اور لکھنے والے کا رابطہ ٹوٹ گیا ہے، ادبی رسائل ایک بڑا وسیلہ تھے (یا ہیں) مگر ان کی پذیرائی کا سلسلہ نہیں رہا..... ایسے لگتا ہے ادب کسمپرسی کے عالم میں ہے۔“

”آپ کے ہم عصر کون کون تھے؟“ حمید اختر کو پرانے دنوں کی طرف لاتے ہوئے سوال کیا۔

مختصر جواب دیا پھر گرہ لگائی۔ ”انتظار حسین نے بھی اسی زمانے میں لکھنا شروع کیا تھا اور میں سمجھتا ہوں انتظار حسین کے علاوہ اس نسل کے دوسرے لکھنے والوں نے زیادہ محنت نہیں کی اور یہی وجہ ہے کہ کرشن چندر، منٹو اور عصمت چغتائی جیسے لکھنے والوں کا کوئی گروپ ادب میں سامنے نہیں آیا، اس وقت عجیب بات تھی، ”حمید اختر نے بات کو موڑ دیتے ہوئے کہا۔ ”یا تو کہانیوں میں زور تھا..... یا شاید حافظہ جوان تھا، مجھے آج بھی کرشن چندر کی کہانی ”دو فرلانگ لمبی سڑک“ یاد ہے، اوپندر ناتھ اشک اور دیوندر ستیا رتھی کی کہانیاں بھی اثر چھوڑتی تھیں مگر اب تو کسی اچھی سے اچھی کہانی کا بھی اثر دیر پا نہیں ہوتا..... اس دور میں کوئی بڑا کہانی کار پیدا ہی نہیں ہوا..... میرے ہم عصروں میں سے ابرہیم جلیس جب تک حیدرآباد (دکن) میں تھا، بڑی اچھی کہانی لکھتا رہا..... پھر وہ بھی صحافت میں پھنس گیا اور کہانی کار ختم ہو گیا، ظاہر ہے کالم نگار کو پذیرائی زیادہ ملتی ہے۔“

”آپ نے کرشن چندر، عصمت جیسے لکھنے والوں کے گروپ کا ذکر کیا ہے، کیا ان کے بعد کوئی قابل ذکر لکھنے والا

آیا تھا؟“ سوال براہ راست کیا گیا۔

”ان کے بعد اور ہم سے پہلے، ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور اپنا نام، مقام بنا چکی تھیں..... میں نے ابھی اس وقت تک دو کہانیاں لکھی تھیں، جب 1946ء میں ہاجرہ مسرور کے افسانوں کا مجموعہ ”ہائے اللہ“ چھپ گیا تھا، قرۃ العین حیدر، عینی کے ہاں نہیں..... وہ تو ایک طرح سے ترقی پسند تحریک کے مقابلے میں کھڑی تھیں..... عینی کے اسی رویے

کی وجہ سے عصمت چغتائی نے ایک مضمون بھی لکھا تھا ”پوم پوم ڈارلنگ“ جس میں قرۃ العین حیدر کی برزوائی سوچ اور اظہار کا ذکر تھا مگر میں سمجھتا ہوں قرۃ العین حیدر بڑی رائٹر ہیں۔ میں ان کے اسلوب کا قائل ہوں، اگرچہ وہ ترقی پسند نہیں تھیں اور خود انہوں نے بھی کبھی ایسا دعویٰ نہیں کیا۔“

”شاعروں کے ساتھ آپ کی بہت دوستی اور سنگت رہی ہے، آپ نے کبھی شعر کہنے کی کوشش یا خواہش کی ہے؟“
سوال کو ایک اور رخ دیا گیا۔

”کوشش کی، مگر..... کامیاب نہ ہو سکا۔“ حمید اختر نے سادگی سے جواب دیا۔ ”میں بھی ابراہیم جلیس کی طرح اچھے بھلے مصرعے کو بے وزن کر دیتا ہوں، بنے بھائی (سجاد ظہیر) بھی کہتے ”یہ ذرا میری نظم پڑھنا“ پھر خود ہی فوراً کہتے ”نہیں..... نہیں رہنے دو..... تم اسے بے وزن کر دو گے، سچی بات ہے شاعروں پر رشک آتا ہے، نثر لکھنے کے لیے تو بہت مشقت کرنا پڑتی ہے مگر یہ بھی ہے جب فیض صاحب سے ملاقاتیں شروع ہوئیں تو یوں لگا کہ وہ جو کہتے ہیں، وہ ہمارے دل ہی کی کہتے ہیں۔ ساحر اور ابن انشاء کی شاعری بھی ہمیشہ دھڑکنوں میں بسی رہی۔“
”فیض کی شاعری اور ان کے مقام کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟“

”شاعری کی سیدھی، سچی تعریف تو یہی ہے کہ یہ دل میں اتر جائے، اپنی لگے اور یاد رہے۔ حمید اختر نے دو ٹوک جواب دیا۔ ”فیض کو یہ کمال حاصل ہے۔“ انہوں نے بات جاری رکھی۔ ”میں ایسے لوگوں کو بھی جانتا ہوں جن کا شعر و ادب سے کوئی تعلق نہیں مگر انہیں فیض کا پورے کا پورا کلام زبانی یاد ہے، ایک ٹو ہے کے سوداگر ہیں، یہی لاہور میں..... انہیں فیض کا ایک ایک مصرع یاد ہے مگر اور کسی کا نہیں، وہی بات ہے کہ شاعری میں یہی خوبی ہونی چاہیے کہ دل میں اتر جائے..... پیار بن جائے..... ساحر میں بھی یہ خوبی تھی۔“

”کچھ (تک نظر) نقاد کہتے ہیں کہ اگر اردو شاعری میں فیض نہ ہوتے تو ساحر لدھیانوی بھی نہ ہوتے؟ سوال کو تھوڑا سا پلٹا گیا۔

حمید اختر نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ ”یہ بات ابراہیم جلیس نے چلائی تھی..... مگر صرف مذاق مذاق میں..... جب ساحر کی اور جلیس کی آپس میں تکرار بڑھ کر لڑائی بنتی تو ابراہیم جلیس یہ بات کہتے، چند لمحوں کے بعد وہی ابراہیم جلیس ساحر کی سب سے زیادہ تعریف بھی کر رہے ہوتے..... کسی نے کہا یا لکھا ہے کہ ساحر ٹین ایجرز (کسن نوجوانوں) کا شاعر ہے..... اس پر علی سردار جعفری نے بڑی ٹھوس اور مدلل بات کی کہ جو شاعر ہیں، تیس سال تک ٹین ایجرز کا شاعر رہتا ہے، اس کے بڑا شاعر ہونے میں کیا شک ہو سکتا ہے۔“ ساحر نے جو نظم ”پرچھائیاں“ لکھی ہے، حمید اختر نے حوالے

دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ اتنی عظیم نظم ہے کہ اردو شاعری میں اس کی مثال نہیں ملتی اور یہ نظم ساحر ہی کہہ سکتا تھا، اس میں اس کا پورا رنگ ہویدا ہے..... خیدرآباد (دکن) کے ایک مشاعرے میں ساحر نے یہ نظم پڑھی تو مجھے سجاد ظہیر کا خط آیا کہ ساحر کی اتنی طویل نظم جو ایک گھنٹے تک ساحر سنا تا رہا، اس پر تمہارے دوست نے مشاعرہ لوٹ لیا، حاضرین نہ صرف محل سے سنتے رہے بلکہ ساتھ ہی ساتھ داد دے رہے تھے..... چراغ حسن حسرت کی محفل آرائیں تھیں، زندگی سے بھرپور ماحول تھا مگر وہ سب تباہ ہو گیا ہے، اجڑ گیا ہے..... چاروں طرف ایک ویرانی سی ہے، وہ چائے خانے اور ٹھکانے بھی ختم ہو گئے، میرے جیسا بندہ جس کی عمر اب 75 سال ہو گئی ہے، اپنے آپ کو اکیلا اور تنہا محسوس کرتا ہے، وہاں جا کر کتھار سس ہو جاتا تھا، دل کا غبار نکل جاتا تھا، اب تو اپنے آپ میں کڑھنے اور خود ہی سے باتیں کرنے کا سماں ہوتا ہے۔“

قیام پاکستان کے بعد بھی..... چند سال پہلے تک..... ”حمید اختر نے یادوں کا ہنکارا بھرتے ہوئے کہا۔“ ریگل سینما بلڈنگ میں جو میرا دفتر تھا، وہاں بھی احباب کا میلہ لگا رہتا تھا، فیض، سبط حسن، منٹو، خواجہ خورشید انور، حبیب جالب، مزدور رہنما مرزا ابراہیم، اخلاق احمد دہلوی اور مادام نور جہاں..... اب وہ دفتر بھی بھائیں بھائیں کرتا ہے..... کاش، ہم کسی زندہ معاشرے میں ہوتے تو ان مقامات پر ان نامور شخصیات کی تختیاں لگائی جاتیں۔“

”آپ نے دو فلمیں بھی بنائی تھیں ”سکھ کا سپنا“ اور ”پرائی آگ“ یہ فلمیں باکس آفس پر ناکام رہیں، آپ نے ان دونوں کے لیے خود کہانی کیوں نہیں لکھی تھی؟“ سوال اب ادب سے ثقافت کی طرف آ گیا۔

”اب میں محسوس کرتا ہوں، غلطی میری تھی۔“ حمید اختر نے اعتراف کیا۔ ”سکھ کا سپنا“ کی کہانی ایک آسٹریلیا ناول سے اخذ کی گئی تھی مگر کہانی کا موضوع آج کا معاشرہ بنتا ہے..... 37 برس پیشتر آج جیسی پیسے کی دوڑ اور لو بھ نہیں تھا ”پرائی آگ“ کے لیے میری بیوی نے حمیدہ جبین کا ناول پسند کیا تھا..... دونوں تجربے ہر طرح سے ناکام رہے ”سکھ کا سپنا“ اگر آج ”ری میک“ ہو تو یقیناً ہٹ فلم ثابت ہو۔“

حمید اختر کی باتوں کی لہر تو رکنے والی نہیں تھی۔ پوچھا ”کوئی تازہ تخلیق..... کوئی افسانہ.....؟“

”دو تین کہانیاں کلبلا رہی ہیں..... مگر وہی مجبوری..... اخبار کی ادارہ نویسی اور کالم نگاری سے سراٹھانے کی مہلت تو ملے..... تاہم وعدہ ہے، بہت جلد یہ کہانیاں مکمل کر دوں گا۔“

(”اخبار جہاں“ 9 اگست 1999ء)



ہنستے مسکراتے حمید اختر

افتخار مجاز، 30 ستمبر 2012ء، 0300-4328713

یادش بخیر، جناب حمید اختر کی 84 ویں سالگرہ کی تقریب ”سیفما“ لاہور کے زیر اہتمام برپا تھی، لاہور بھر کے تمام ترقی پسند ادیبوں، شاعروں، دانشوروں، صحافیوں، سیاسی کارکنوں اور ٹریڈ یونین لیڈرز سے ہال کچا کھچ بھرا ہوا تھا، مقررین اپنے اپنے مختصر خطاب میں جناب حمید اختر کی حیات و خدمات، خصوصاً سیاست و صحافت اور انجمن ترقی پسند مصنفین و کمیونسٹ پارٹی کے حوالے سے ان کے کردار اور Contribution کا تذکرہ کرتے ہوئے انہیں زبردست خراج پیش کر رہے تھے اور اس امر کا بھی بار بار تقریباً ہر مقرر ذکر کر رہا تھا کہ جناب حمید اختر اس بڑھاپے میں بھی روٹی روزی کمانے کے لیے مسلسل کام اور کالم نویسی کر رہے ہیں جب مقررین کی طرف سے جناب حمید اختر کے بڑھاپے، بزرگی اور ضعفی کا تذکرہ کچھ زیادہ ہی ہو گیا تو حال کی پچھلی نشستوں سے بہت ہی شستہ اور شائستہ لہجے میں ایک آواز ابھری، ”جناب والا! پوائنٹ آف آڈر“ تقریباً سبھی نے پیچھے گردنیں گھما کر دیکھا۔ ٹیلی ویژن کے سینئر آرٹسٹ زبیر بلوچ اپنی نشست سے کھڑے ہو کر کچھ کہنے کے لیے بے تاب نظر آئے۔

پروگرام کے کمپیر یا مہربان، اعزاز احمد آذر نے سٹیج پر موجود مقرر کو چند ثانیوں کے لیے توقف کی درخواست کرتے ہوئے زبیر بلوچ صاحب کو بات کرنے کی دعوت..... گفتگو کی اجازت ملنے پر وہ یوں گویا ہوئے ”جناب والا، تقریباً ہر مقرر نے اپنی گفتگو میں بار بار ان (حمید اختر صاحب) کے بڑھاپے اور بزرگی کا ذکر کیا ہے جبکہ ابھی ان کی عمر صرف 84 برس ہے۔

جناب زبیر بلوچ نے مزید کہا کہ پچھلے دنوں ایک طویل، میرا تھن ریس ہوئی جسے ایک 115 سالہ سکھ، سردار نے جیتا، جب ریس جیتنے کے بعد اس کا انٹرویو نشر ہوا تو اس نے 115 سالہ ہونے کے باوجود ایک مرتبہ بھی اپنے بڑھاپے، بزرگی یا ضعفی کا ذکر تک نہ کیا، اس پر میں نے برجستہ با آواز بلند کہا ”وہ بے چارہ تو سکھ سردار تھا اسے تو پتہ ہی نہیں چلا ہوگا کہ وہ 115 سال کا ہو چکا ہے“ میرے اس Remark پر ہال میں ایک فلک شکاف قہقہہ بلند ہوا۔ لوگ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہونے لگے، خود سٹیج پر بیٹھے جناب حمید اختر بھی ہنستے ہنستے دوہرے ہو گئے اور ہاتھ کے اشارے سے مجھے اس برجستہ اور بے ساختہ لطیف جملے کی داد دی۔

جناب حمید اختر کی یہ داد بلاشبہ میرے لئے کسی اعزاز سے کم نہ تھی، مگر یہ داد اور میرے جملے پر ان کا قبہہ دراصل ان کی شگفتہ مزاجی، بذلہ سنجی اور ہنس مکھ طبیعت کا آئینہ دار تھا، حمید اختر صاحب بلاشبہ ایک کھلے دل، کھلے ذہن اور کھلے مزاج کے ایک کھلے ڈھلے انسان تھے، مایوسی، پڑمردگی، یابوست ان سے چھو کر بھی نہ گزری تھی، ان کی تحریریں، خصوصاً کالم اور یادداشتیں ان کی زندگی اور بیتے دنوں کی عکسی تصویریں ہیں وہ جیسے تھے ویسا ہی اظہار اپنی تحریروں میں کرتے تھے، حمید اختر صاحب کی یادداشت بہت اچھی اور انداز بیاں بہت دلفریب تھا، کسی واقعے کو بیان کرتے ہوئے وہ اپنے قاری کو اس کیفیت میں لے جاتے، جو اس واقعہ کے ظہور کے وقت ان کی اپنی کیفیت ہوتی۔

ایک روز بتانے لگے کہ وہ اپنے ایک دوست کے ہاں جب بھی جاتے وہ یہ تذکرہ لے بیٹھتا کہ ان کا ملازم کھانا یا چائے بناتے اور مہمانوں کو پیش کرتے ہوئے برتن بہت توڑتا ہے۔ کہنے لگے ایک روز ہم اپنے اسی دوست کے گھر بیٹھے تھے اور وہ اپنے ملازم کی ”برتن توڑ“ کارروائیوں کا تذکرہ کر رہے تھے کہ اتنے میں باورچی خانے سے برتن گرنے کی آواز آئی۔ میرے دوست نے بات ادھوری چھوڑ کر با آواز بلند وہیں سے بیٹھے بیٹھے ملازم کو آواز دے کر پوچھا، ”اوے آج کیہ توڑیا ای؟“ (ارے! آج کیا توڑا ہے) ملازم نے وہیں سے جواب دیا ”برتن گرا تھا مگر سرجی! ٹوٹا کچھ نہیں“ حمید اختر کہنے لگے اس پر میرے دوست نے برجستہ کہا، ”برتن نہیں ٹٹا، پر ریکارڈ تے ٹٹ گیا اے ناں“ (برتن نہیں ٹوٹا پر ریکارڈ تو ٹوٹ گیا ہے ناں)

حمید اختر صاحب بلاشبہ ادب، سیاست، صحافت کی چلتی پھرتی تاریخ اور انسائیکلو پیڈیا تھے، میں پہلی مرتبہ ان سے اس وقت ملا۔ جب میں ایم اے او کالج لاہور میں ایف اے کا طالب علم تھا اور وہ جناب عبداللہ ملک اور آئی اے رحمان ودیگر ساتھیوں کے ساتھ پی پی ایل کی احتجاجی تحریک چلا رہے تھے، غالباً یہ 1972ء تھا اس دوران ان لوگوں نے بھوک ہڑتال کیمپ بھی لگایا، جہاں میں بھی رضا کارانہ طور پر اس احتجاج میں شامل ہوا، اور جناب حفیظ کاردار، احمد رضا قصوری، مختار رانا مرحوم کے ہمراہ بھوک ہڑتال کیمپ کا حصہ بنا، فی الوقت یہ سنجیدہ معاملات میرا موضوع نہیں، میں صرف حمید اختر صاحب کے شگفتہ اور دلچسپ واقعات آپ سے شیئر کرنا چاہتا ہوں۔ آپ ان کی اسیری کی داستان ”کال کوٹھڑی“ کا مطالعہ کرب و تلخ، کڑے اور جبر کے حالات میں بھی مردانہ وار کھڑے اور ہنستے مسکراتے نظر آنے کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔

جناب احمد ندیم قاسمی کے ساتھ ان کی دوستی، محبت اور تعلق مثالی تھا ایک روز اپنی اور ان کی داستان اسیری کے حوالے سے یکے بعد دیگرے اتنے دلچسپ اور یادگار واقعات سنائے کہ ہمیں اس عہد کی تاریخ اور حالات واقعات کی خوب تفہیم ہوئی۔ مگر یہ سب کچھ پھر کسی اور وقت کے لئے چھوڑتے ہیں اور جیل کے دنوں کے حوالے سے ان کا بیان کردہ

جناب احمد ندیم قاسمی کا یہ دلچسپ واقعہ ملاحظہ فرمائیں۔

احمد ندیم قاسمی انجمن ترقی پسند مصنفین کے پلیٹ فارم پر سرگرم عمل تھے حکومت وقت کے نقطہ نظر سے یہ سرگرمیاں وطن دشمنی پر مبنی تھیں چنانچہ انہیں گرفتار کر لیا گیا، جب آپ کو جیل لے جایا گیا تو سپرنٹنڈنٹ جیل نے انہیں بند کرنے سے پہلے ان کا سارا سامان نوٹ بک، کتابیں، قلم، مسہری اور اس کے بانس وغیرہ اپنے دفتر میں رکھوائے اور انہیں ہمراہ اندر لے جانے کی اجازت نہ دی، قاسمی صاحب نے اس پر احتجاج کیا تو جیل کے انچارج افسر نے تحکمانہ انداز میں کہا کہ اوپر سے حکم ہے کہ آپ کی یہ سب چیزیں ادھر میرے پاس رہیں گی آپ انہیں اندر نہیں لے جاسکتے۔ مگر قاسمی صاحب یہ سب اشیاء لازماً ہمراہ لے جانے پر مصر تھے لیکن انہیں متذکرہ افسر کا تحکمانہ انداز مخاطب اچھا نہ لگا اس لئے قاسمی صاحب متذکرہ افسر سے کہنے لگے آپ بے شک یہ چیزیں اپنے پاس رکھ لیں، مگر مجھے ان کی رسید دے دیں۔ اس پر متذکرہ افسر نے قاسمی صاحب کو یقین دلایا کہ آپ کی یہ سب اشیاء میری ذاتی تحویل میں رہیں گی لہذا آپ کو ان کے بارے میں متفکر ہونے کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ بات آئی گئی ہو گئی، تاہم کچھ روز بعد جب پابندیاں ذرا نرم ہوئیں تو قاسمی صاحب نے متذکرہ افسر کو ایک منظوم رقعہ لکھا کہ ان کی وہ اشیاء واپس کر دی جائیں، رقعہ کا پہلا شعر تھا:

میں نے دیئے تھے آپ کی تحویل خاص میں
اک نوٹ بک کے ساتھ مسہری کے چاہ بانس

حمید اختر کی یادداشتوں میں ایسے بے شمار دلچسپ اور مزے مزے کے واقعات محفوظ تھے جو وہ حسب موقع دوست، احباب اور اپنے ہم جیسے نیاز مندوں اور مداحوں کو سنا کر محفوظ کیا کرتے تھے۔ بلاشبہ ان کی طبیعت کا یہ رنگ و انداز ان کی ہمہ جہت اور ہفت رنگ شخصیت کا ایک پہلو تھا۔

دہر میں انتخاب تھا وہ شخص

آپ اپنا جواب تھا وہ شخص

جناب حمید اختر اپنی تحریروں اور اپنے مثالی کردار کے باعث ہمارے دلوں اور ذہنوں میں موجود رہیں گے، مگر رضی اختر شوق کے لفظوں میں

نقش پا کچھ رفتگاں کے خاک پر محفوظ ہیں

یہ نشانی دیکھ سکتے ہیں اٹھا سکتے نہیں

اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے (آمین)

☆☆☆

ماخذ/حوالے

- 1 لامکاں 2011ء (افسانے) حمید اختر (مرحوم)
- 2 روداد انجمن 2011ء حمید اختر (مرحوم)
- 3 کال کوٹھڑی 2009ء حمید اختر (مرحوم)
- 4 حمید اختر (سوانح عمری) 2010ء (مرتب احمد سلیم)
- 5 احوال واقعی (حمید اختر)
- 6 آشنائیاں کیا کیا (حمید اختر)
- 7 پرش احوال کالم (حمید اختر)
- 8 مستقبل ہمارا ہے (پاکستان ترقی پسند مصنفین 1949ء کانفرنس) عبداللہ ملک
- 9 داستان دارورسن (پاک و ہند کمیونسٹ تاریخ) عبداللہ ملک
- 10 لاؤ تو قتل نامہ میرا (عبداللہ ملک)
- 11 سید سجاد ظہیر مارکسی دانشور اور کمیونسٹ رہنما (ملک عبدالروؤف)
- 12 آغا خان اول سے چہارم تک (ترجمہ حمید اختر)
- 13 جالب نامہ (مجاہد بریلوی)
- 14 جریدہ ہم شہری لاہور
- 15 روزنامہ "ایکسپریس" لاہور
- 16 روزنامہ "دن" لاہور



ملک مقبول احمد کی مقبول عام خودنوشت "سفر جاری ہے" پر نامور اہل قلم کی آراء

میں سمجھتا ہوں کہ یہ کتاب اردو کی اہم خودنوشتوں میں شمار کی جا سکتی ہے کہ اس میں ایک مکمل خودنوشت کی تمام صفات موجود ہیں۔
ڈاکٹر احسن

"سفر جاری ہے" ایک غیر معمولی دستاویز ہے جس سے رعنائی خیال، عمق فکر اور سادہ بیانی کے ساتھ ماضی کی یاد آفرینی دل میں اتر جاتی ہے۔

نقشبند قمر نقوی
"سفر جاری ہے" میں بچپن، جوانی اور علمی زندگی کی جدوجہد کو انتہائی ذمہ داری سے خوبصورت پیرائے میں ضبط تحریر میں لایا گیا ہے۔ ناصر نقوی

"سفر جاری ہے" ایک بے حد کھلے دل و دماغ کے سادہ مزاج، محبت کرنے والے اور زندگی کی ہر آزمائش سے خوشبو اور رنگ کشید کرنے والے شخص کی داستان ہے۔ سلی صدیقی

اس کتاب میں مصنف نے اپنی بھرپور جدوجہد کو بڑی خوبصورتی سے رقم کرنے کا کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ حمید اختر

ان کا اسلوب نہایت دلچسپ ہے، ان کی زبان و بیان اور طرز تحریر پر ادبی رنگ غالب ہے جو ان کے اعلیٰ ذوق کی عکاسی کرتا ہے۔

ڈاکٹر صفدر محمود (مورخ پاکستان)
یہ کتاب محض آپ بیتی نہیں بلکہ اس میں جگ بیتی اور کتاب کی کہانی بھی شامل ہے۔ اس کتاب کی اشاعت پر ملک مقبول احمد کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ ڈاکٹر وحید قریشی

"سفر جاری ہے" دلچسپ، معلومات افزا، متنوع اور کارآمد کتاب ہے اور اہل ذوق کو مطالعہ کی دعوت دیتی ہے۔ سعید بدر

"سفر جاری ہے" ایک شخص کے پتھر سے ہیرا بننے کی کہانی ہے، خودنوشت کا ہر صفحہ ان کے کثرت مطالعہ و مشاہدہ کا آئینہ دار ہے۔ علی سفیان آفاقی

"سفر جاری ہے" نئی نسل خصوصاً وہ جوان جو اپنی دنیا آپ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے لئے مشعل راہ اور درس گاہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ علامہ عبد الستار مام

خود آگہی ایک ایسی منزل ہے جہاں صرف وہ ہستیاں پہنچ پائیں جو ہمت و استقلال کا پیکر تھیں اس منزل پر پہنچنے والی ان ہستیوں میں "سفر جاری ہے" کے مصنف ملک مقبول احمد شامل ہیں۔ جنس (ر) عباس خان

مقبول صاحب نے اپنے حالات، مشاہدات اور تجربات ایسے انداز میں لکھے ہیں کہ دلچسپی برقرار رہتی ہے، یہ جیون کتھا بہت سے لوگوں کے لئے باعث نفع و افادہ ہو سکتی ہے۔ خواجہ محمد زکریا

"سفر جاری ہے" ایک اعلیٰ پائے کی کتاب ہے اور ملک مقبول احمد کی کہانی ہر شخص کی کہانی بن سکتی ہے ہر شخص کو آگے بڑھا سکتی ہے اور کامیابی کا چہرہ دکھا سکتی ہے۔ مجیب الرحمن شامی

اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ اس میں زیب داستان سے کام نہیں لیا گیا۔ لیکن اس میں افسانے جیسی لطافت موجود ہے۔ ڈاکٹر انور سدید
یہ گونا گوں شخصی مشاہدات اور تجربات کے ساتھ ساتھ اس دور

کے ادیبوں اور ادبی فضا کا احوال اور منظر نامہ بھی بن گئی ہے، جس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ امجد اسلام امجد

یہ خودنوشت "سفر جاری ہے" سچائی، سادگی، سلاست اور کردار کی منہ بولتی تصویر ہے۔ اعتبار ساجد

بحیثیت جمعی "سفر جاری ہے" اردو سوانح نگاری میں ایک اچھا اضافہ ہے اور اس پیش کش میں جس اہتمام کو مد نظر رکھا ہے وہ قابل تحسین ہے۔ ڈاکٹر رشید امجد

"سفر جاری ہے" میں ملک مقبول احمد نے دیہی زندگی کی منظر کشی اس مہارت سے کی ہے کہ پریم چند اور سردرشن کے افسانوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر طارق عزیز

"سفر جاری ہے" بیک وقت کلید کامیابی بھی ہے اور اپنے دائرے کے اندر تاریخ بھی اور آئندہ نسل کیلئے خضر راہ بھی۔ ابوالا امتیاز ع۔ س مسلم

"سفر جاری ہے" غریب و سادہ بھی ہے اور رنگین بھی، اسلوب نگارش میں رومان کا رنگ بھی ہے اور نئی نئی حیات کا رنگ بھی۔ ظفر علی راجا

ملک مقبول احمد کی دیگر تصانیف

"گم شدہ افسانے"

"ارمغان غزل"

"اہل قلم کے خطوط"

"پندیرانی"

"سینیر عالم"

"سیاحت نامہ ترکی"

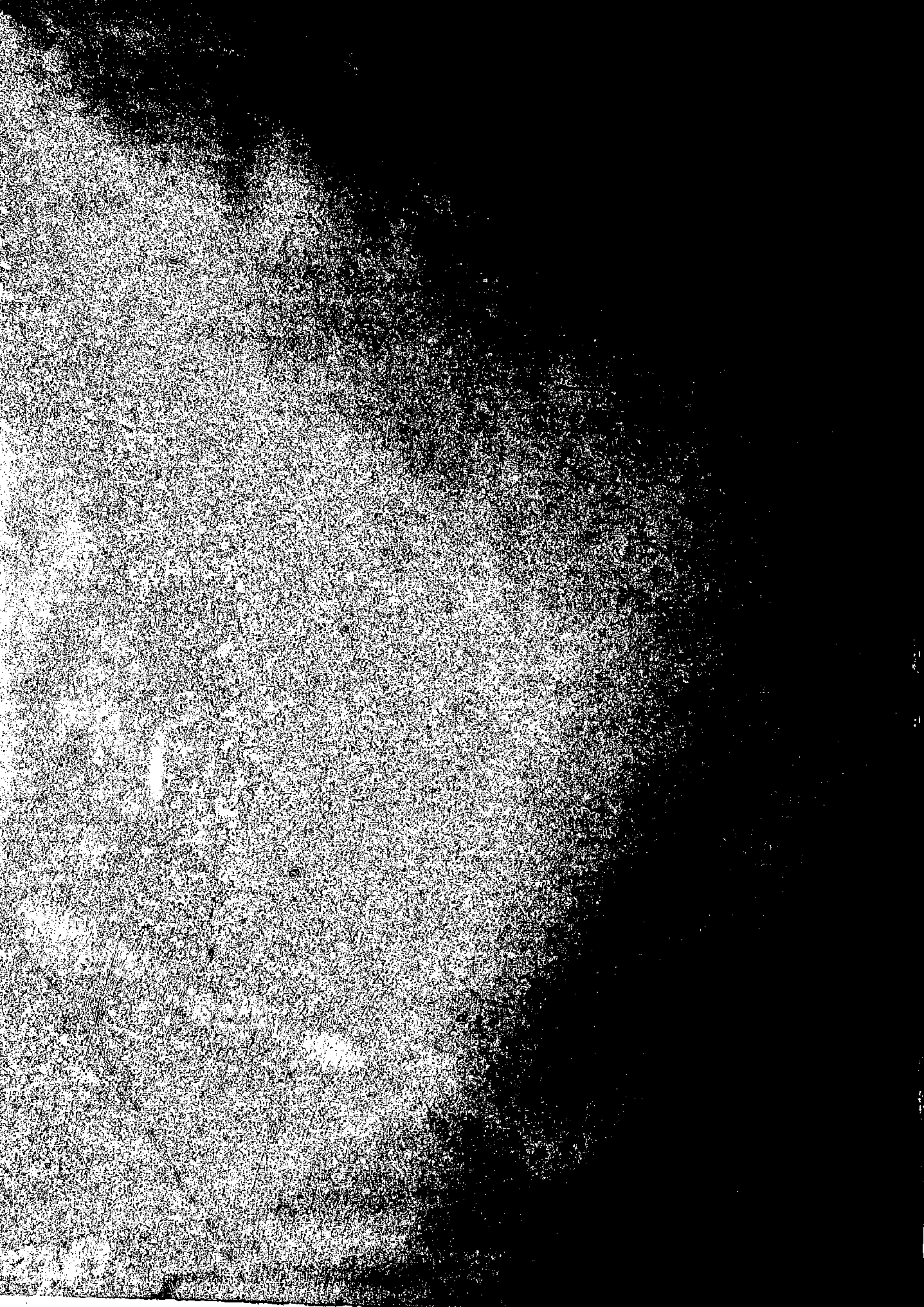
"عیناسائی"

"رہنمائے حج و عمرہ"

"گلشن ادب"

Circular Road Lahore. Ph: 042-37324164, 37233165, Fax: 042-37238241
Ph: 042-37357058, Fax: 042-37238241, Email: maqbool@brain.net.pk

مقبول اکیڈمی





ملا کر عورتوں کو عام کی بجائے خاصیت سے ان
 پروردگار کی حمد اور شکر کی بات کہ ان کے
 اور عورتوں کے لئے تمہاری باتوں کی بات ہے
 کہ وہ تمہارے لئے ہے

انکے لئے ان کی باتوں کی باتوں کی باتوں
 اور ان کے لئے جو ان کے لئے ہے
 اور ان کے لئے جو ان کے لئے ہے
 Sensitivity کا ترجمہ ہے

انکے لئے ان کی باتوں کی باتوں کی باتوں
 اور ان کے لئے جو ان کے لئے ہے
 اور ان کے لئے جو ان کے لئے ہے
 انکے لئے ان کی باتوں کی باتوں کی باتوں

انکے لئے ان کی باتوں کی باتوں کی باتوں
 اور ان کے لئے جو ان کے لئے ہے
 اور ان کے لئے جو ان کے لئے ہے
 انکے لئے ان کی باتوں کی باتوں کی باتوں